ماہی ماہی کوکدی میں

1

ہما کوکب بخاری

پیش لفظ

''ماہی ماہی کوکدی میں'' میرا پہلا ناول ہے۔ آپ میں سے بہت سے قارئین اسے قسط وار صورت میں ماہنامہ ''خواتین ڈائجسٹ'' میں پڑھ ہی چکے ہیں۔ بہت سی وجوہات کی بناء پر میرا اسے کتابی شکل میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن علی میاں پبلیکیشنز کے عبدالغفار صاحب کی مشکور ہوں جن کی کاوشوں کے باعث یہ ناول آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کو لکھتے ہوئے میں نے کوشش کی تھی کہ اس میں ممکنہ حد تک زندگی کے حقیقی رنگ بھروں۔ اس کے کردار وہی ہوں جنہیں آپ اپنے اردگرد چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہوں، وہی رویئے ہوں جنہیں آپ محسوس کر سکتے ہوں اور وہی کہانی ہو جو آپ کے گرد کہیں موجود ہو لیکن زندگی کی ہماہمی میں شاید آپ نے اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ اس ناول میں یہ سبھی کچھ ہے لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ زیبِ داستاں کے لئے کچھ افسانہ بھی ہے۔

یہ ناول پچھلی صدی یا یوں کہہ لیں کہ پچھلے ہزاریئے کی آخری دہائی کے شروع میں لکھا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب آج کی بہت سی ضروریات صرف آسائشات سمجھی جاتی تھیں۔ سو نئے پڑھنے والوں کو بتا دوں کہ ناول میں بہت ضرورت کے وقت بھی سیلولر فون اور انٹرنیٹ کا استعمال اگر آپ کو دکھائی نہ دے تو سمجھ جائیں کہ یہ بیتے وقت کی داستان ہے۔

یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو ہمارے معاشرے میں ایک بلند مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان سے عقیدت اور محبت کو لوگ ایمان کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ وہ صدیوں پرانی خود ساختہ روایات کو محض اس وجہ سے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کے بزرگوں کی روایات ہیں۔ انھوں نے ان روایتوں کو پاؤں کی زنجیر بنا رکھا ہے۔

اسی خاندان کا ایک سر پھرا نوجوان ان روایتوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک بھونچال آ جاتا ہے۔ نفرت اور دشمنی کی ایک نہ بجھنے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ جھوٹی انا کی

جنگ چھڑ جاتی ہے۔ خون کے رشتے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔
نفرتوں کے آکٹوپس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا...... ایسے نازک وقت میں ایک نازک سی لڑکی نفرت اور دشمنی کی آگ کو بجھانے کا عزم کرتی ہے اور اتنی بڑی قربانی دیتی ہے جس کا کوئی عورت تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہی اس کہانی کا کلائمکس ہے۔
یہ ناول تقریباً تین سال تک ''خواتین ڈائجسٹ'' میں چھپتا رہا۔ ان تین سالوں میں زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ ایسے میں اگر میرے گھر والوں، خصوصاً میری امی جان، آپی، ارم اور وجاہت کا سہارا نہ ہوتا تو یہ ناول کبھی بھی مکمل نہ ہو پاتا۔ ابو جان کی وفات کے بعد قلم تو کیا اپنی زندگی سے بھی اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ اس وقت انہی پیارے لوگوں کے سہارے میں نے قلم سے دوبارہ ناتا جوڑا تھا۔
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے جناب محمود ریاض صاحب (مرحوم) اور محترمہ امت الصبور کے تعاون اور محبت کے باعث ہی یہ ناول مکمل ہو پایا تھا۔ میں ان سبھی افراد کی تہہِ دل سے مشکور ہوں۔

ہما کوکب بخاری

زندگی کی راہیں کبھی کبھار بہت پُر پیچ اور پُر خار ہوتی ہیں۔ نہ جانے حقیقت کہاں افسانے میں اور افسانہ کب حقیقت میں مدغم ہو جاتا ہے' جو کسی کو یہ کتھا سنانے بیٹھو تو شاید کوئی یقین ہی نہ کرے لیکن یہی حقیقت ہے' یہی سچ ہے کہ شاہراہ حیات پر یوں بھی ہوتا ہے' جب چلتے چلتے تھک کر ہم کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نگاہ دوڑاتے ہیں تو دور کہیں ٹمٹماتی روشنی دکھائی دیتی ہے لیکن اس تک بڑھتے بڑھتے پتا چلتا ہے کہ یہ تو ممنوعہ علاقہ ہے۔ یہ ہماری نہیں کسی اور کی پناہ گاہ ہے۔ تب یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ان راہوں پر چلنے والے کے لیے گناہ وثواب محض ضمنی باتیں ہوتی ہیں اور اس گناہ وثواب کے درمیان جو حدِ فاصل شیخ و برہمن نے کھینچ رکھی ہے' وہ کتنی بے معنی ہے۔

☆=====☆======☆

کالج میں فیئر ویل کے انتظامات زور و شور سے جاری تھے۔ زیادہ تر کام فرسٹ ایئر کے طلباء کو سونپا گیا تھا۔ ماہ بانو صبح سے اور ساتھیوں کے ساتھ میورل بنانے میں مصروف تھی۔ رنگ' رونق اور خوشبو سے اسے عشق تھا اور کالج ان تینوں چیزوں میں خود کفیل تھا۔ پھر ایک اسے نہ جانے کیا ہوا کہ سب رنگ پھیکے لگنے لگے۔ رونق بے معنی ہوگئی اور خوشبو ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اس نے سرسری نظر سے سب کا جائزہ لیا۔ رنگوں کی شیشیاں فرش پر کھلی پڑی تھیں' گتے بکھرے ہوئے تھے' لڑکوں کے منہ میں جلے ہوئے سگریٹ تھے اور لڑکیاں ایک ہاتھ سے بال ماتھے سے ہٹاتی' دوسرے ہاتھ میں برش پکڑے کام میں مصروف تھیں۔ ایپرن تو پہلے ہی رنگوں اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ایپرن پہننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی' ان کی قمیصوں پر نیلے' پیلے' سرخ اور نہ جانے کن کن رنگوں سے تجریدی آرٹ کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ سب ہی بہت پُر جوش لگ رہے تھے۔ پتا نہیں ماہ بانو کو اچانک کیا ہوا تھا کہ وہ بیزار ہوگئی تھی۔

وہ سب کو اپنے اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر وہاں سے اٹھ آئی اور آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں رکھے کالج کا نظارا کرنے لگی۔ چہرے...... چہرے......

چہرے۔ کتنے چہرے تھے' یہاں بے فکرے' ہنستے بولتے ...... رنگوں میں ڈوبے چہرے' لیکن جس چہرے کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ عبداللہ کا چہرہ...... ریشماں کے عبداللہ کا چہرہ۔

وہ اس خوش قسمت چہرے کی منتظر تھی' جسے ایک بے حد حسین اور نرم و نازک لڑکی بنا دیکھے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ ایسے لوگ خوش قسمت ہی تو ہوتے ہیں' جنہیں محبتیں بے مانگے مل جاتی ہیں لیکن عبداللہ کالج سے ایک سال کی چھٹی پر تھا۔ اسے اس کے بابا نے ورلڈ ٹور پر بھیجا ہوا تھا اور یہاں ماہ بانو اس کا انتظار کر رہی تھی اور اس انتظار کو تقریباً ایک سال ہونے والا تھا۔

اس ایک سال میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ بہت کچھ پایا تھا اور بہت کچھ کھویا تھا۔ اسی سال میں اسے اُما ملی تھی۔ اُما واقعی روشنی اور نور کی مانند تھی۔ وہ ہندو تھی لیکن ماہ بانو اور اس کے بیچ یہ اَن دیکھا' اَن کہا معاہدہ تھا کہ مذہب ان دونوں کی دوستی کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔ پھر عرفان تھا بے حد باتونی' جسے باتوں اور پینٹنگ کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا اور سب سے بڑھ کر سعد تھا۔ دیکھنے میں سعد عام سا لڑکا تھا' جیسے بہت سے لڑکے ہوتے ہیں' جن میں کوئی بھی خاص بات نہیں ہوتی لیکن ماہ بانو کے لیے وہ ان بہت سے عام لڑکوں سے بالکل جدا تھا کیونکہ اتنے سارے لڑکوں کے درمیان سعد وہ واحد لڑکا تھا' جس کے نام پر ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔

اب سے پہلے ماہ بانو نے صرف انارکلی آتے جاتے میوزیم کے پہلو میں ایستادہ اس عمارت کو دور دور سے ہی دیکھا تھا۔ سرخ رنگ کی یہ عمارت اسے ہمیشہ بہت پُر اسرار' بہت گہری لگتی تھی اور لوہے کی سیاہ گرل کے پیچھے واقع اس کی پارکنگ میں چلنے پھرنے والے سب لوگ اسے کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دیتے تھے' جن تک اس کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ سب اسے بہت اعلیٰ بہت منفرد لگتے تھے' جن کے ہاتھ کورے کاغذ پر رنگوں کی مدد سے جان ڈال دیتے تھے' جو زمین پر بکھری ہوئی بے جان مٹی کو پل بھر میں شکل عطا کر دیتے تھے۔

پھر ایف۔ اے کا رزلٹ نکلنے کے بعد ابا جی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اسی جادو کی نگری میں داخل ہو جائے۔ اماں کو اعتراض تھا کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے' نہ جانے وہاں کا ماحول کیسا ہوگا' کچھ اِدھر اُدھر سے بھی انہوں نے سن لیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے ایسے ماحول میں پڑھنا ٹھیک نہیں ہے لیکن ابا جی کے اصرار کے سامنے انہیں ہار ماننا پڑی اور یوں ماہ بانو اس جادو نگری میں چلی آئی۔

وہ ہولے سے ہنس پڑی۔ ''یہ جگہ میرے تخیل سے کتنی مختلف ہے۔ نہ تو یہاں جادوگر رہتے ہیں نہ ہی بہت اعلیٰ اور منفرد لوگ۔ کتنے عام انسان بستے ہیں یہاں میرے جیسے عام سے لوگ۔''

اسے یاد تھا' اب سے بہت سال پہلے وہ اماں اور ابا جی کے ساتھ گھر کے کچے آنگن میں پیڑھی پر بیٹھی رات کا کھانا کھا رہی تھی۔ آنگن کی دیوار کے ساتھ ایک ترتیب میں بہت سی مٹکیاں'

گھڑے' صراحیاں اور مٹی کی ہانڈیاں رکھی تھیں۔ ہولے ہولے چلنے والی نرم ہوا ان کی کچی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چاروں طرف پھیلا رہی تھی۔

''ابا جی!'' ماہ بانو نے مسحور ہو کر کہا۔

ابا جی نے چنگیر سے روٹی اٹھاتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ابا جی! یہ خوشبو کتنی اچھی ہے۔ شاید دنیا کی سب خوشبوؤں سے بڑھ کر مٹی کی خوشبو ہے' کوئی اور خوشبو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

''ہوں۔'' وہ مسکرائے۔

''ابا جی آپ کتنے خوش قسمت ہیں۔'' وہ پھر بولی۔ ''آپ کے ہاتھ میں آ کر تو مٹی کو زبان مل جاتی ہے۔''

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' انہوں نے چنگیر ایک طرف سرکا دی اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

''کیوں؟ کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے؟''

''میرے سمجھنے نہ سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک کمہار کی اُڑان بہت محدود ہوتی ہے۔ اس کی سوچ اور اس کا ہنر دونوں ہی بہت روایتی ہوتے ہیں۔ اتنے ہی محدود اور روایتی جتنا محدود اور روایتی یہ چاک کا چکر ہے' جتنا محدود اور روایتی یہ کچا مکان اور اس کا ماحول ہے اور جتنے محدود اور روایتی اب میرے خواب ہیں۔''

''کیوں ابا جی' آپ زندگی سے کیا چاہتے تھے؟ بہت شاندار بنگلا' لمبی سی چمکتی ہوئی کار' اچھا کھانا اور پہننا' دو چار شوگر اور ٹیکسٹائل ملیں؟'' وہ ہنسی۔ ''نہیں ابا جی اگر یہ سب ہمارے پاس ہوتا تو ہم کتنے محروم ہوتے' پھر مٹی کی یہ خوشبو ہمیں کیسے نصیب ہوتی۔''

ابا جی نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اپنے چھوٹے سے کمرے کی طرح اپنی سوچ کو کبھی محدود نہ ہونے دینا ماہ بانو! میں نے زندگی کے لیے بہت سے خواب بُنے تھے' لیکن نہ تو میرے خوابوں میں کوئی شوگر مل تھی اور نہ ٹیکسٹائل مل...... میرے سب خواب مٹی سے گندھے ہوئے تھے۔''

''کیوں ناشکری کرتے ہیں۔'' اماں جو اب تک خاموش بیٹھی باپ بیٹی کی باتیں سن رہی تھیں' ان سے نہ رہا گیا۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں لاکھوں سے بہتر بنایا ہے' دو وقت کا کھانا آرام سے نصیب ہو جاتا ہے۔ ہماری کتنی جانیں ہیں' تین فرد ہیں گھر میں' ہمیں کس چیز کا لالچ؟ ہمیں اتنا ہی بہت ہے' انسان کو قناعت پسند ہونا چاہیے۔''

''زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کو ناشکری نہیں کہتے۔'' ابا جی بولے۔ ''اور عقل و ہنر میں قناعت پسندی کا مطلب یہ ہوا کہ ہمالیہ کے پانی کو نیچے اتر کر زمین سیراب کرنے کے بجائے وہیں چوٹی پر قید کر کے جوہڑ بنا دیا جائے۔''

''ویری گڈ ابا جی!'' ماہ بانو نے تالی بجائی۔ ''آپ کا ایک پوائنٹ ہوا۔''

پھر وہ اماں سے مخاطب ہوئی۔ ''اگر آپ نے جلد ہی ابا کو اس بات کا جواب نہ دیا تو آپ ہار جائیں گی۔''

اماں نے برتن سمیٹے۔ ''میں ہمیشہ تمہارے ابا جی سے ہار جاتی ہوں' یہ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے کوئی جواب ہی نہیں سوجھتا۔''

اماں کی سادگی پر ابا جی اور ماہ بانو دل کھول کر ہنسے۔

''ہنس لیں جتنا ہنسنا ہے۔'' اماں باورچی خانے میں جاتے جاتے پلٹ آئیں۔ ''میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ ایسی باتیں سن کر شیطان آ جاتا ہے اور بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔''

''ہونہاں مولوی کی بیٹی'' ابا جی بدستور ہنس رہے تھے۔ ''اب میری عمر نہیں رہی کہ شیطان آ کر بہکائے۔''

''آپ سے کیا بحث! آپ تو ہر بات کو گھما پھرا کر نہ جانے کہاں لے جاتے ہیں۔'' وہ پھر باورچی خانے کی طرف پلٹ گئیں۔

''بانو کی ماں! جب مزاج کچھ بہتر ہو جائے تو ایک پیالی چائے لا دینا۔ اپنے سسر بزرگوار کو کہتے سنا ہے کہ جو عورت شوہر کی خدمت کرتی ہے' وہ سیدھی جنت میں جاتی ہے۔ بڑا مقام و مرتبہ ہے ایسی بیویوں کا۔''

جواب میں باورچی خانے سے سوائے برتنوں کی کھنک کے کوئی آواز نہ آئی۔ ابا جی نے ماہ بانو کی طرف دیکھا جو دلچسپی سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''چلو اب چل کر سو جاؤ' صبح جلدی اٹھنے کے لیے ضروری ہے کہ رات کو وقت پر سویا جائے۔''

''ابا جی! مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' اس نے کہا۔ ''میرا دل چاہ رہا ہے' آپ سے باتیں کرنے کو۔''

''ضرور کرو باتیں لیکن یہاں نہیں' پہلے چارپائیاں بچھا دو' میں تھک گیا ہوں' لیٹ کر باتیں کرلوں گا۔''

ماہ بانو نے فٹافٹ آنگن میں چارپائیاں بچھا کر بستر لگا دیئے۔

''ابا جی آ جائیں۔''

ابا جی لیٹے ہی تھے کہ اماں چائے کی پیالی لے کر آ گئیں۔ ''سو گئے کیا؟''

''نہیں سویا نہیں تھا' چائے کا انتظار کر رہا تھا۔'' وہ اٹھ بیٹھے اور پیالی تھام لی۔ ''ہاں تو بانو تمہارا کیا باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا؟'' انہوں نے چائے کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔

وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''ابا جی! اگر آپ کے خواب اتنے اونچے تھے تو پھر

انہیں پانے کے لیے آپ نے جدوجہد کیوں نہیں کی؟ آپ تو کہتے ہیں کہ کوشش کرنے سے انسان سب کچھ پالیتا ہے۔''

''جو کچھ میں اب کہتا ہوں' وہ عمر کے تین چار عشروں کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ جانتی ہو بانو بیٹا! میں کتنی کٹھالیوں سے گزرا ہوں؟ لیکن افسوس کہ کندن بننا میرے نصیب میں نہیں تھا۔'' پھر وہ ایک لمحے کے توقف سے بولے۔ ''میں گاؤں کا ایک سیدھا سادا' جاہل دیہاتی لڑکا تھا۔ میرے باپ دادا' پردادا اور ان کے پردادا تک سب کمہار تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی مٹی اور چاک کا چکر دیکھا تھا...... مٹکیاں اور صراحیاں دیکھی تھیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ کب مٹی کا پیڑا چاک پر رکھا تھا۔ میں تو بس سارا دن مٹی اور چاک سے کھیلتا تھا اور رات کو تھک کر سو جاتا تھا۔ میری دنیا بہت محدود تھی لیکن میں خوش تھا۔ تمہاری طرح' مجھے بھی مٹی کی خوشبو مسحور کر دیتی تھی۔ میری زندگی میں پہلی مرتبہ اس وقت تبدیلی واقع ہوئی جب گھر میں میری شادی کی بات چلی۔ کیوں بانو کی ماں' یاد ہے تمہیں وہ وقت۔''

''ہٹیں' بچی کے سامنے کیا باتیں کرنے لگے' چلو بانو اپنے بستر پر۔'' اماں نے کہا۔

''تم ہم دونوں کے درمیان مت آؤ' ہم دونوں دوست ہیں' کیوں بانو؟''

''جی ابا جی۔'' وہ چہکی۔

''بس اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟'' ابا جی' اماں کی طرف مڑے۔

''میں اعتراض کروں بھی تو آپ کو کیا پروا؟'' اماں احتجاجاً کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔

''کیوں بانو! تمہاری ماں ہم سے ناراض ہو گئی ہے کیا؟''

''ابا جی! آپ اماں کو چھوڑیں' سونے کے لیے کروٹ لی ہے انہوں نے۔'' ماہ بانو جلدی سے بولی۔ مبادا ابا جی' اماں کی ناراضگی کی وجہ سے اس سے بات چیت بند کر کے خود بھی سونے کی تیاری شروع کر دیں۔

''ہوں' تو میں غالباً شادی کی بات کر رہا تھا۔''

''جی ابا جی۔''

''تو میری زندگی میں تبدیلی اس وقت رُونما ہوئی جب میری شادی کی بات چلی۔ ہمارے وقت میں یہ رواج نہیں تھا کہ شادی سے پہلے لڑکا' لڑکی ایک دوسرے کو دیکھیں' نہ ہی ہمارے اماں ابا نے ہم سے پوچھا کہ ہم شادی کہاں کرنا چاہتے ہیں' سب کچھ بالا ہی بالا طے کر دیا۔''

''تو ابا جی! آپ کہیں اور شادی کرنا چاہتے تھے؟'' ماہ بانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ارے توبہ کرو' ہماری یہ مجال کہاں تھی۔'' وہ ہنسے۔ ''میں نے مٹی اور چاک کے چکر کے علاوہ کبھی کسی چیز کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے میری بات کا غلط مطلب

نکال لیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے رشتہ طے ہو جانے کے بعد بھی کتنے دن تک خبر ہی نہیں تھی کہ میری زندگی میں تمہاری اماں رضیہ بیگم تشریف لانے والی ہیں اور جب یہ آئیں تو لگا کہ زندگی میں بہار آ گئی ہے اور مٹی صرف چاک پر دھر کر برتن بنانے کے لیے نہیں ہوتی۔ اسی مٹی میں پھول بھی کھلتے ہیں، لیکن بانو گڑیا! جہاں پھول ہوتے ہیں، وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

گاؤں میں ہم سب مل کر ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ میری بھاوج بیگم کو یہ اچھا نہیں لگا کہ ان کی تین کمروں کی راجدھانی دولتِ مشترکہ بن جائے۔ بس روز روز کی کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ تمہاری اماں کے منہ میں تو زبان ہی نہیں تھی۔ ہاں آنکھوں میں جل تھل رہتا تھا۔''

''آپ کیا خاندان کے سارے بکھیڑے سنا ڈالیں گے؟'' اماں نے کروٹ بدلے بغیر ابا کی بات کاٹی۔

''تو تم جاگ رہی ہو؟''

''آپ لوگوں کی باتیں سونے دیں گی بھلا۔''

''ابا جی! آپ اماں کی باتیں چھوڑیں۔'' ماہ بانو نے جلدی سے مداخلت کی۔ ''یہ بتائیں پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ کہیں اور قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ پہلے تو تمہاری اماں کو گاؤں میں ہی چھوڑ کر آیا' جب حالات بہتر ہوئے تو تم دونوں کو یہیں لے آیا۔ اس وقت تم بہت ننھی منی سی تھیں۔ یہ جو کونے میں چنبیلی کا چھوٹا سا پودا لگا ہوا ہے ناں بالکل اتنی سی تھیں۔''

ماہ بانو ہنس پڑی۔

''لیکن اصل بات میں نے تمہیں اب تک نہیں بتائی۔ تم نے پوچھا تھا ناں کہ میرے خواب اتنے اونچے تھے تو پھر میں نے انہیں پانے کے لیے جدوجہد کیوں نہ کی؟'' ابا جی بولے۔

ماہ بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ان دنوں میں کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا' جب دینو کمہار سے میری ملاقات ہوئی۔ اس بے چارے نے ساری زندگی شادی نہیں کی تھی اور بہت بوڑھا بھی تھا۔ بس سمجھو جیسے آج کل کا مہمان ہو۔ اپنا سب کچھ اس غریب نے کسے دے کر جانا تھا۔ مجھے اپنے ہمراہ رکھ لیا۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ ایسے خدا ترس انسان کی خوب جی جان سے خدمت کرنی ہے' اسی لیے سارا کام سنبھال لیا۔ دن بھر کی مزدوری میں دینو چاچا کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا' وہ آدھا خود رکھ لیتا اور آدھا مجھے دے دیتا تھا۔ یہ تو دینو چاچا کی وفات کے وقت مجھے پتا چلا کہ جو پیسے وہ رکھتا تھا' اس میں سے سوائے کفن دفن کے چند روپے کے' اس نے ساری رقم میرے لیے ہی محفوظ کی ہوئی تھی۔''

''اللہ تعالیٰ جنت بخشے' بہت ہی نیک انسان تھا۔'' اماں بولیں۔

''پھر ابا جی؟''

''جب میں نے پہلے پہل برتن بنانا شروع کیے تو دینو چاچا انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بتا ہے کیا کہنے لگا؟ کہنے لگا کہ لگتا ہے تم نے برتن بنانا کالج میں سیکھا ہے۔ میں اَن پڑھ دیہاتی تھا' مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تعریف کا ایک انداز ہے۔ دینو چاچا کی بات نے مجھے بہت حیران کر دیا۔ میں نے کہا کہ بھلا کالج میں یہ کام کب سکھاتے ہیں۔ کالج میں تو بابو لوگ پڑھتے ہیں جو کتابیں کاپیاں اٹھائے صاف ستھرے کپڑے پہن کر سائیکل دوڑاتے پھرتے ہیں اور میں اَن پڑھ دیہاتی ہوں' میرا ان کا کیا مقابلہ۔

لیکن میری بات سن کر دینو چاچا ہنس پڑا بولا کہ ٹھنڈی سڑک پر کونے میں ایک ایسا کالج ہے جہاں مٹی کی مورتیں بنائی جاتی ہیں اور مٹی کی یہ مورتیں بنانے والے ہماری طرح غریب غربا نہیں' بڑی کوٹھیوں اور گاڑیوں کے مالک ہیں۔ پھر چاچا بولا کہ میں بھی انہی کی طرح بن سکتا ہوں۔ جیسا اچھا کام میرا ہے' ویسا تو وہاں بھی کسی کا نہیں ہوگا۔

اس رات بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کیں تو نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' جس کام کو میں جاہل اور اَن پڑھ دیہاتیوں سے منسوب سمجھا کرتا تھا' وہ تو یہ بابو لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے نیند آئی تو خواب میں مَیں نے خود کو بابو بنے دیکھا' جو پتلون قمیص پہنے مٹی کا پیڑا چاک چکر کے اوپر رکھ رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی اور میں سوچنے لگا کہ میں کوئی عام انسان نہیں ہوں۔ پل بھر میں مَیں نے کالج' کار' کوٹھی...... ہر جگہ کا سفر کیا۔

اگلے دن تمام کام جلدی سے نپٹا کر میں ٹھنڈی سڑک کے کونے پر یہ کالج ڈھونڈنے چل دیا۔ مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ ایک ہی دکاندار سے پوچھنا پڑا۔ اس نے تفصیل سے تمام پتا سمجھا دیا۔ کالج کے پھاٹک سے داخل ہوتے ہوئے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ایک مرتبہ تو دل چاہا کہ بھاگ جاؤں لیکن رات سوتی جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھے تھے' انہوں نے میرا راستہ روک لیا۔ اپنا دل مضبوط کر کے میں آگے چل پڑا۔

لیکن وہ تو کوئی اور ہی دنیا تھی۔ اپنی تہہ بند اور لمبی سی قمیص میں مَیں وہاں موجود سب لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان کوئی عجوبہ دکھائی دے رہا تھا' جو باتیں وہ کر رہے تھے' وہ بھی میرے لیے بالکل نئی تھیں۔ میں ہونق بنا ان سب کے درمیان سے گزرتا رہا۔ کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ سب اپنے آپ میں مگن تھے' مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس سے کیا بات کروں' پھر ایک بابو قسم کا لڑکا الگ تھلگ کھڑا رنگوں سے تصویر بناتا نظر آیا۔ میں خدا کا نام لے کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

''بابو جی!'' میں نے اسے مخاطب کیا تو اس نے تصویر سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔
''ہوں۔'' وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
''یہ وہ کالج ہے ناں' جہاں مٹی کی مورتیں بنانا سکھایا جاتا ہے۔'' میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔
اس بابو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''ہاں۔'' وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
اس کی مسکراہٹ سے مجھے حوصلہ ہوا۔
''میں کمہار ہوں۔'' میں نے اپنی خودی بلند کرنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں برابری کی سطح پر چاہے نہ بات کریں لیکن وہ میری بات کو اہمیت ضرور دے۔
''اچھا۔'' اس کے انداز میں اب بھی دلچسپی تھی۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''
''بابو جی! میں چاہتا ہوں کہ میں اور کام بھی سیکھوں۔ ابھی میں صرف برتن بنانا جانتا ہوں' مجھے مٹی کی مورتیں بنانی نہیں آتیں۔ دینو چاچا نے کہا تھا کہ کوشش کروں تو میں بھی مورتیں بنا سکتا ہوں' آپ مجھے یہاں داخل کر لیں گے۔''
بابو کے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ''کتنا پڑھے ہو؟''
''پڑھا لکھا تو نہیں ہوں' لیکن مجھے کام بہت اچھا آتا ہے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو لا کر دکھا سکتا ہوں۔''
''ہوں۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی یہاں پڑھتا ہوں۔ داخل کرنا یا نہ کرنا میرا کام نہیں ہے لیکن تمہارے سلسلے میں مجھے ایک مسئلہ نظر آ رہا ہے۔''
''کون سا مسئلہ ہے جی؟'' میں اب بھی ناامید نہیں تھا۔
''تمہاری تعلیم کچھ کم ہے۔''
یہ اس بابو کا مہذب انداز تھا' ورنہ میں تو تعلیم کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔
''یہاں یہ مسئلہ ہے۔'' بابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کہ ہنر بعد میں سکھایا جاتا ہے' تعلیم پہلے دیکھی جاتی ہے' لیکن ایک بات ہے۔''
''کیا؟''
''کہ اگر تمہارا کام بہت اچھا ہے تو تمہارے لیے ترقی کے دروازے ضرور کھلیں گے۔ آج نہ سہی' کل سہی۔ اس کالج کے نہ سہی' کسی اور درس گاہ کے سہی۔ نہ تو آج تک خوشبو کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کر سکا ہے اور نہ ہی روشنی کو بیڑیاں پہنائی جا سکی ہیں۔ اچھا کام کسی کالج کی سند کا محتاج نہیں ہوتا' وہ تو دیکھنے میں ہی اچھا نظر آتا ہے۔''
وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ''یقین کرو' تمہارا یہ ہنر کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا

کیونکہ اس کی جڑیں تمہارے وجود سے پھوٹتی ہیں۔ ہر چیز ہم سے جدا ہو سکتی ہے' پر مٹی کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی' لیکن ہنر کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی ضروری ہے۔''
''پھر میں کیا کروں؟'' میں اتنی جلدی اپنے خواب چکنا چور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
''میرا مشورہ ہے کہ تم پڑھنا لکھنا شروع کر دو لیکن اس کے ساتھ ساتھ مٹی کے برتن بنانا مت بھولنا۔''
میں مایوس ہو گیا۔ اس قدر شدید مایوسی تو مجھے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بابو نے شاید مایوسی کی یہ تحریر میرے چہرے پر پڑھ لی۔
''دیکھو مایوس مت ہو۔'' اس نے برش اسٹول پر رکھ کر میرے کندھے تھام لیے۔ ''یہاں اس سے بہتر ہرگز نہیں سکھایا جاتا' جتنا کہ تمہیں آتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تم کمہار کہلاتے ہو اور یہاں ڈپلومہ پر سرامکس لکھا جاتا ہے۔ یہ تو سوچو کہ تم بھی مارکیٹ میں ہو اور یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے بھی اس مارکیٹ میں آ جائیں گے۔ ان کا کام بھی سامنے ہو گا اور تمہارا کام بھی سامنے ہو گا۔ نہ تو تمہارے بنائے ہوئے برتنوں پر یہ لکھا ہو گا کہ تم نے یہ ہنر اپنے باپ دادا سے سیکھا ہے اور نہ ہی یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے اپنے بنائے ہوئے برتنوں کے ساتھ اپنا ڈپلومہ رکھیں گے۔ مارکیٹ میں تم سب برابری کی سطح پر کھڑے ہو گے۔''
اس بابو کی بہت سی باتیں اس وقت میرے سر پر سے گزر گئی تھیں لیکن ان باتوں سے مجھے کسی قدر حوصلہ ضرور ہوا تھا۔
''بابو جی! مجھے پڑھائے گا کون؟ ہماری تو پچھلی سات پشتوں میں بھی کوئی پڑھا لکھا نہیں گزرا۔''
''یہ تمہارے حوصلے کی بات ہے' کوشش سے انسان خدا کو بھی پا لیتا ہے۔'' وہ ایک شیشی سے رنگ نکالنے لگا۔ ''اپنے لیے خود راہیں تلاش کرو۔ زندگی کی دوڑ میں اپنے لیے اپنی قوتِ بازو سے جگہ بناؤ۔ یاد رکھو' یہاں ہر کوئی آگے بڑھنے کی دھن میں سرپٹ دوڑ رہا ہے اور کوئی بھی یہ زحمت نہیں کرتا کہ پیچھے رہ جانے والے لوگوں پر رحم اور ہمدردی کی ایک نظر ہی ڈال لے کیونکہ اتنی دیر میں کارواں آگے نکل جائے گا۔''
میں چپ چاپ واپس چلا آیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ کتنے دن میں بے دلی سے کام کرتا رہا اور جیسے ہی کام ختم کرتا تھا۔ کھاٹ پر پڑ جاتا تھا۔
پھر ایک دن خبر ملی کہ ہمارے گھر سے تین گھروں کے فاصلے پر جو نائی رہتا تھا' اس کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے' تب میں نے سوچا کہ یہ نائی کون سا سات پشتوں کا پڑھا لکھا ہے۔ بات باپ' دادا کی دولت و ثروت اور تعلیم کی نہیں ہوتی' اصل چیز محنت اور ہمت ہے جو انسان کے کام آتی ہے۔

میں نے اس نائی کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ وہیں میری ملاقات اس کے بیٹے ڈاکٹر غلام حسین سے ہوئی۔ وہ پڑھ لکھ کر بابو بن گیا تھا' لیکن اس میں غرور نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ بہت محبت سے ملتا تھا وہ مجھ سے' میں نے اسے اپنا راز دار بنالیا۔ اپنے سب خواب اسے بتا دیئے اور پھر اپنی مایوسیوں کی کہانی بھی اسے سنادی۔ میری باتیں سن کر وہ ہنس پڑا' کہنے لگا۔

''یہ کیا مشکل ہے' میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔''

''سچ!'' میں خوشی سے گنگ ہو کر رہ گیا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''لیکن ایک شرط ہے۔''

''بتائیں ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' میں جلدی سے بولا۔

''بعد میں مکر مت جانا۔''

''آپ کہیں تو نہ مانوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

''میری شرط صرف یہی ہے کہ تم اپنی اولاد کو بہترین تعلیم دلواؤ گے۔''

''منظور ہے۔'' میں جھٹ بولا پھر اچانک مجھے خیال آیا۔ ''لیکن میری تو صرف ایک بیٹی ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہماری کوئی اولاد نہیں ہوگی۔''

''تو؟''

''تو میں اسے کیسے تعلیم دلوا سکتا ہوں؟'' میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

''اولاد تو اولاد ہوتی ہے خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔'' وہ بولا۔ ''تعلیم ہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ میں تمہیں عورت کی تعلیم کے بہت سے فائدے بتا سکتا ہوں' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تمہارا ذہن انہیں قبول نہیں کرے گا۔ جب تم علم حاصل کرو گے تو تمہارے ذہن میں وسعت پیدا ہوگی۔ اس وقت تم خود سمجھ جاؤ گے کہ تمہاری بیٹی کو علم کیوں حاصل کرنا چاہیے۔ بس پڑھنے لکھنے سے پہلے میری یہ تین باتیں یاد رکھنا۔''

''کون سی باتیں؟''

''کبھی کسی مسئلے پر بغیر سوچے سمجھے رائے مت دینا' اگر کوئی تم سے اختلاف کرے تو فوری طور پر اس کی نفی مت کرنا۔ بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اسے جواب دینا۔ اگر یہ سمجھو کہ تمہاری بات غلط اور کسی اور کی بات درست ہے تو اپنی رائے پر اڑے مت رہنا بلکہ اچھائی کو اپنانے کی کوشش کرنا۔ اپنا تعلق روایت سے قائم رکھنا لیکن روایتوں کو پاؤں کی زنجیر مت بننے دینا۔ دنیا بہت آگے بڑھ رہی ہے اس کے ساتھ آگے بڑھنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی سوچ کو کبھی محدود نہ ہونے دینا۔''

میں نے ڈاکٹر غلام حسین کی یہ سب باتیں خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور اس سے پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ علم انسان کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کام میں اتنی تاخیر کیوں کی۔ میں نے نہ صرف ان باتوں اور مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کی جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے بلکہ میں ان مسئلوں پر بھی سوچتا تھا جو کتابوں میں نہیں ہوتے تھے۔

میری پڑھائی عام لوگوں سے بہت مختلف تھی کیونکہ میں ڈگریوں کے حصول کے لیے نہیں پڑھتا تھا۔ میرے نزدیک علم' ذہن کی وسعت کا نام تھا۔ پھر میں نے تمہیں بھی سکول میں داخل کروا دیا۔ شکر ہے' مجھ سے تمہارے سلسلے میں تاخیر نہیں ہوئی' تم سن رہی ہو نا ماہ بانو۔'' ابا جی نے اچانک پوچھا۔

''جی ابا جی۔'' وہ جیسے اس دنیا میں واپس آ گئی۔

''بانو گڑیا! میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں تمہیں اس کالج میں پڑھاؤں گا جس میں پڑھنے کا مجھے ارمان تھا اور جس کے باہر سے گزرتے ہوئے آج بھی میری آنکھوں میں وہی پرانے خواب جاگ جاتے ہیں۔''

''ابا جی! آپ نے پڑھنا شروع کر دیا اور پھر بھی آپ کے خواب ادھورے ہیں۔''

''ہاں' میرے خواب اس لیے ادھورے رہ گئے ہیں کہ میں نے بہت دیر کر دی تھی۔ خواب دیکھنے میں بھی اور ان کے حصول کی جدوجہد کرنے میں بھی لیکن بانو تم ابھی صرف آٹھویں میں ہو' بہت وقت ہے تمہارے پاس' میں تمہیں شہر کے بہترین انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دلوا رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے یہ خواب اب تم پورے کرو۔ میری سب امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔''

''ابا جی! آپ بالکل فکر نہ کریں' میں آپ کے خوابوں کو تعبیر دوں گی۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ ''آپ کے وہ استاد ڈاکٹر غلام حسین کہاں گئے؟''

''میں نے اس سے صرف چھ سال پڑھا تھا پھر وہ اپنے ماں باپ اور بیوی کو لے کر کراچی چلا گیا تھا۔ اس نے بنیاد فراہم کر دی تھی اور میں بھی رکا نہیں' آگے بڑھتا گیا۔''

وہ اور ابا جی کتنی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔

''اب سوئیں گے بھی یا یونہی صبح کر دیں گے؟'' اماں بالآخر تنگ آ کر بولیں۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا' جب ایف۔ اے کے رزلٹ کے بعد ابا جی نے اپنی خواہش پھر دہرائی۔ وہ چاہتے تھے کہ ماہ بانو ٹھنڈی سڑک کے کونے میں واقع اس جادو نگری میں داخل ہو جائے' جس سے بہت سال پہلے وہ خود بے نیل و مرام باہر نکلے تھے۔ خود ماہ بانو بھی اپنے خوابوں میں اسی پُراسرار اور گہری عمارت کو دیکھا کرتی تھی۔ جب وہ بھی وہاں کورے کاغذ اور سپاٹ کینوس پر رنگ بکھیرے گی اور بے جان و بے رنگ مٹی کو خوبصورت شکلیں دے گی۔

یہ سب تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن ماہ بانو کے وہاں داخلہ لینے کی وجہ یہ بھی تھی کہ سرخ اینٹوں کی

وہ عمارت اس کی روح کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ عمارت اور اس کے مکین اس کی زندگی میں کوئی اہم اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کریں گے۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی زندگی کی ڈور اس جگہ سے بندھی ہوئی ہے' جیسے...... وہ بے جان عمارت اس کے دیکھتے ہی سانسیں لینے لگتی ہے' اسے کچھ کہنا چاہتی ہے' کوئی خاص بات' کوئی اشارہ یا نہ جانے کیا۔

داخلہ فارم ابا جی ہی لائے تھے اور پھر انہیں جمع بھی کروا آئے تھے۔ چند دن بعد ٹیسٹ تھے۔ انگریزی...... اور ڈرائنگ کا پرچا تھا اور اسے دونوں کی ہی فکر نہیں تھی۔ اس کی انگریزی پر ابا جی نے خاص توجہ دی تھی اور ڈرائنگ تو یوں بھی اس کی بہت اچھی تھی۔ ایف۔ اے تک اس نے فائن آرٹس پڑھ رکھی تھی لیکن درحقیقت اس میں آرٹ کی پیدائشی صلاحیت تھی۔ اب اس نے اتنا کیا تھا کہ اماں کو بطور ماڈل بٹھا کر لائف ڈرائنگ کی پریکٹس شروع کر دی تھی۔

مقررہ تاریخ کو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ سیکرٹریٹ کے اسٹاپ پر ویگن سے اتری۔ یہ تھوڑا سا فاصلہ وہ پیدل ہی طے کر سکتی تھی۔ جناح ہال کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں تھی۔ گیٹ سے اندر پارکنگ میں داخل ہوتے ہوئے اس کا دل بھر آیا۔

''ابا جی کتنی امیدوں سے یہاں آئے ہوں گے۔'' اس نے سوچا۔ ''اور کتنے دُکھے دل سے یہاں سے باہر نکلے ہوں گے۔''

وہ کالج کی عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

''پتا نہیں وہ لڑکا ابا جی کو کہاں ملا ہوگا۔'' وہ چلتے چلتے سوچ رہی تھی۔ ''شاید اس درخت کے نیچے یا پھر اس کونے کی طرف یا شاید کہیں اور...... خدا جانے خود اب کہاں ہوگا۔ زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں کہیں گم ہو چکا ہوگا یا اتنے بڑے ہجوم آبادی میں اپنے لیے کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔''

چلتے چلتے وہ مین گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر عمارت کی پیشانی کی جانب دیکھا۔

''کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔''

ہاں وہ سچ مچ پاکستان کے بہترین آرٹس کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ مسکرائی اور بسم اللہ پڑھ کر اس نے قدم اندر رکھ دیا۔ اس کی توقعات کے برعکس اندر سنسانی کا راج تھا۔ اکا دکا طالب علم' کچھ ملازمین' چند پرندے اور پھدکتی ہوئی گلہریاں' وہ ہولے سے ہنس پڑی۔

''ہم تو یہ سوچ کے آئے تھے تیری گلیوں میں
کہ یہاں تیشۂ فرہاد کی قیمت ہو گی

بھائی کیوپڈ سے ملیں گے کسی دوراہے پر
کسی بے نام سے اک موڑ پہ جنت ہو گی
ہم اولمپس پہ خداؤں کی زبان بولیں گے
اپنی تقدیر میں وینس کی رفاقت ہو گی۔''

وہ چلتے چلتے گنگنائی پھر خود سے بولی۔

''اونہوں' وینس کی رفاقت کی ضرورت مصطفیٰ زیدی کو ہی ہوگی۔ یہاں وینس کی جگہ کچھ اور لگنا چاہیے۔ مثلاً زوئیس ہاں زوئیس ٹھیک رہے گا یعنی۔

''اپنی تقدیر میں زوئیس کی رفاقت ہوگی۔''

''ویسے ناشکری نہیں کرتی' اگر زوئیس نہ ملا تو پیرس بھی چل جائے گا۔ چلو گولی مارو پیرس کو' منی لوئس بھی چل جائے گا لیکن بس اس سے نیچے نہیں۔''

وہ خود سے بولتی جا رہی تھی لیکن اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

اور آج آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے اسے یہ سب کچھ کتنا نارمل لگ رہا تھا۔ نہ تو اب اس عمارت میں اس کے لیے کوئی اسرار رہا تھا اور نہ ہی یہ جھک کر ماہ بانو کے کان میں سرگوشی کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب تو بس تیزی سے کام نپٹانے کی فکر تھی۔ آج پینٹنگ ہے' کل مجسمہ سازی' پرسوں ڈرافٹنگ اور اس کے بعد ڈیزائننگ اور پھر ڈرائنگ اور ان سب کے بعد بس کام' کام' کام اور صرف کام۔

''سارے کالج میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی اور محترمہ یہاں تشریف فرما ہیں۔''

وہ اُما کی آواز سن کر چونک گئی۔

''تم کب آئیں؟''

''بہت بے خبر بیٹھی ہوئی ہو' میں پچھلے ایک منٹ سے تمہیں دیکھ رہی تھی' کسی مراقبے میں گم تھیں تم؟'' اُما اس کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''بس یونہی سوچ رہی تھی کچھ۔''

''سعد کے بارے میں؟'' اُما نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں ان لمحوں کے متعلق سوچ رہی تھی' جو بیت گئے ہیں' ان کے متعلق نہیں جو ابھی میری مٹھی میں قید ہیں۔''

''بڑی ثقیل باتیں کرنے لگی ہو۔'' اُما ہنسی۔ ''میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ وہ مرغابی کے شوربے کا شوربا ہے ناں' سنا ہے' وہ فیئر ویل پر آ رہا ہے۔''

''مرغابی کے شوربے کا شوربا؟'' ماہ بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مرغابی کے شوربے کا شوربا ہی ہوا ناں' تمہاری کزن یعنی ریشماں کا کزن عبداللہ۔''

''عبداللہ آرہا ہے؟'' ماہ بانو نے خوشگوار حیرت کے ساتھ بہت جوش سے پوچھا۔
''ہاں' لیکن یاد رکھنا سعد کے سامنے اتنے جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کرنا' ورنہ وہ برا مان جائے گا۔''
''بے وقوفی کرے گا ایسا کر کے وہ' میں نے تو آج تک عبداللہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔''
''صرف اپنی کزن کی خاطر تم اتنی بے چین ہو عبداللہ سے ملنے کے لیے' مجھے بعض اوقات تم پر حیرت ہوتی ہے۔''
''تم نہیں سمجھو گی اُما۔'' ماہ بانو نے کہا۔ ''ریشماں اس پر جان دیتی ہے حالانکہ اس نے بھی کبھی عبداللہ کو نہیں دیکھا۔ اس کے پاس میرے ساتھ بات کرنے کے لیے اور کوئی موضوع ہی نہیں ہے کیونکہ میں اس کی واحد راز داں ہوں اور عبداللہ سے محبت اس کا واحد اور اکلوتا راز ہے' وہ صرف مجھ سے شیئر کرتی ہے۔ شروع میں تو میں عبداللہ' عبداللہ کی گردان سن کر چڑ ہی گئی تھی لیکن پھر میں نے اس کے وجود کو قبول کر لیا اور اس کے بعد تو یوں ہونے لگا کہ عبداللہ میرا بھی پسندیدہ موضوع بن گیا۔ ہم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ تھکے بغیر۔''
''وری انٹرسٹنگ۔'' اُما دلچسپی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ''اسے بھی خبر ہے کہ ریشماں اسے اس قدر چاہتی ہے۔''
''شاید نہیں' وہ تو شروع سے ہی برطانیہ میں تھا' اس کے بابا حیدر علی شاہ کو اپنے بڑے بھائی اور ریشماں کے باپ پیر صاحب رجب علی شاہ کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ ان کے اکلوتے بیٹے عبداللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں' اس لیے انہوں نے شروع ہی سے اسے باہر بھیج دیا تھا۔ پھر جب پیر صاحب اور حیدر علی شاہ کے درمیان زمینوں کا جھگڑا عدالت میں چلا گیا تو اسے پاکستان بلا لیا گیا' ورنہ وہ وہیں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آتا۔ یہاں بھی گاؤں میں اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہے' وہ بہت کم گاؤں جاتا ہے' صرف اپنی اماں' بابا اور بہنوں سے ملنے کے لیے۔''
''تو تم اسے ریشماں کی بے قراری بتا دو گی؟'' اُما نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''پتا نہیں۔'' اس نے سیڑھیوں پر پڑا ہوا گھاس کا تنکا اٹھا لیا۔ ''تم ان مسئلوں کو نہیں سمجھ سکتیں اُما۔ ان کے خاندان میں بہت گہری نفرتیں ہیں۔ ان کا آغاز کہاں سے ہوا' یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ اب نفرت کا یہ زہر پوری طرح پھیل چکا ہے۔ ریشماں تو عذاب میں ہے ہی عبداللہ پر یہ عذاب کیوں مسلط کیا جائے۔''
''ضروری تو نہیں کہ وہ بھی ایک ان دیکھی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے' جیسے ریشماں بے وقوفوں کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہے۔''
''ہاں ظاہر ہے' وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہے اس کے خیالات اور سوچنے کا انداز یقیناً یہاں کی روایتی سوچوں سے مطابقت نہیں رکھتا ہوگا۔ محض چچا زاد ہونے یا بچپن کے منگیتر ہونے کا یہ

مطلب تو نہیں کہ وہ اس کی محبت میں بھی گرفتار ہو جائے۔ پتا نہیں بچپن کی منگنی کی اس کی نظر میں اب کیا اہمیت ہوگی جبکہ اب تو نفرتوں نے آکٹوپس کی طرح سب کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے' اسی لیے میں ابھی یہ بات عبداللہ کو نہیں بتاؤں گی۔ مجھے نہ تو ان کے خاندان کی نفرتوں سے کوئی غرض ہے اور نہ مصلحتوں سے' ریشماں میری خالہ زاد بہن ہے' میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ عبداللہ نے ریشماں کی محبت کو اہمیت نہ دی اور ریشماں کو یہ بات معلوم ہو گئی تو اسے بہت دکھ ہوگا۔''
''مجھے بہت حیرت ہے۔ ایسی دیوانگی تو صرف کتابوں اور کہانیوں میں ملتی ہے یا پھر فلموں میں۔''
''تم ریشماں کے حالات نہیں جانتیں' ورنہ ایسی بات کبھی نہ کرتیں۔ وہ ایک بہت عام سے خیالات رکھنے والی لڑکی ہے۔ اس کے لیے بچپن کی منگنی کی وہی اہمیت ہے جو میرے تمہارے لیے شادی کی ہو سکتی ہے۔ ان کے خاندان میں بس مانگ لینا کافی ہوتا ہے۔ یہ تو عزت کا معاملہ ہوتا ہے اور اس پر خون تک ہو جاتا ہے۔''
اُما نے جھرجھری لی۔ ''اتنی خوفناک باتیں نہ کرو پلیز' چلو اٹھو فیئر ویل کی تیاریاں دیکھتے ہیں۔''
وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں اور بلا مقصد کالج میں گھومنے لگیں۔ سارا کالج مصروف تھا۔ آڈیٹوریم میں موسیقی کے پروگرام کی تیاری ہو رہی تھی۔ گرافک اسٹوڈیوز میں سمیر اور سہیل زور و شور سے اپنے تھیسز ڈسکس کر رہے تھے...... پینٹنگ اسٹوڈیو میں ردا' آمنہ اور ظہیر فن فیئر کے لیے سٹال کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ دونوں چلتے پھرتے یونہی بے مقصد کالج کی رونق دیکھ رہی تھیں کہ Scupture اسٹوڈیو سے عدنان برآمد ہوا۔
''کہاں غائب ہو تم دونوں؟'' اس کی ان پر نظریں پڑیں تو ان کی طرف بڑھ آیا۔ ''کتنی دیر سے تلاش کر رہا تھا تمہیں۔''
''ہم یونہی گھوم رہے تھے۔'' اُما بولی۔
''چلو جلدی کرو' ریہرسل کے لیے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ واپس اسٹوڈیو میں مڑ گیا۔
''ابھی ریہرسل کا وقت تو نہیں ہوا۔'' ماہ بانو نے گھڑی دیکھی۔
''یہ کسی کو بخشتا بھی ہے' اسی طرح اکٹھا کر لیا ہوگا سب کو۔'' اُما بولی۔ ''ویسے تم اس سے عبداللہ کے متعلق پوچھ سکتی ہو' اس کے متعلق سب سے زیادہ انفارمیشن ایڈی کے پاس ہی ہوتا ہے۔''
''اونہوں' یہ بات کالج میں صرف مجھ اور تم تک رہنی چاہیے کوئی تیسرا بندہ اس راز میں شریک نہیں ہوگا۔ یہ راز میرے پاس ریشماں کی امانت ہے۔''
عدنان عرف ایڈی کالج کے مائم کلب کا کرتا دھرتا تھا اور بہترین ہدایت کار تھا۔ اس وقت

بھی وہ مائم (چپ سوانگ) میں حصہ لینے والوں کو ان کا رول اور جسم کی حرکات و سکنات کے متعلق بتا رہا تھا۔ ماہ بانو ایک طرف بیٹھی بغور اسے دیکھ رہی تھی

اسے یاد تھا کہ ایڈی نے اس دفعہ کے پروگرام کے لیے کتنی محنت کی تھی۔ پہلے تو پورا ایک مہینہ یہ سوچنے میں گزر گیا کہ مائم کا موضوع اور موسیقی کیا ہوگی۔

''ہندو دیو مالائی کتھا کو سب بہت دلچسپی سے دیکھیں گے۔'' یہ ماہ بانو کا خیال تھا۔

''اور اس کے ساتھ کوئی موسیقی بھی ہے ذہن میں؟'' ایڈی نے پنسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

''Mea Culpa کیسی رہے گی؟''

''ہوں۔'' ایڈی پُر خیال انداز میں بولا۔

''ویسے میرے ذہن میں بھی موضوع ہے' لیکن موسیقی کوئی نہیں ہے۔'' اُما نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''کیا؟''

''انسان کی مشینوں کے خلاف جنگ۔'' اُما نے کہا۔ ''ہم مائم Fall of Man سے شروع کر سکتے ہیں' جب آدمؑ و حوا کو جنت سے نکالا گیا اور انسان زمین پر آباد ہو گیا۔ تب ضرورت ایجاد کی ماں قرار دی گئی اور انسان نے پہیہ بنا کر اپنی زندگی کی سہولت کو رائج کیا' لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ یہ سہولت رفتہ رفتہ انسان کے لیے بلائے جان بنتی گئی اور اب یہ حال ہے کہ انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔''

''ہوں۔'' ایڈی نے پُر خیال انداز میں اسے دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ان مشینوں سے چھٹکارا حاصل کریں' جن کی وجہ سے انسان' انسان سے دور ہوتا جا رہا ہے۔'' اُما بولی۔

''آئیڈیا اچھا ہے' لیکن اس کی نوک پلک سنوارنے کی شدت سے ضرورت ہے۔'' ایڈی نے کہا۔

''اُما! میں تم سے بالکل متفق نہیں ہوں۔'' ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تمہارا جمہوری حق ہے۔'' اُما مسکرائی۔ ''ویسے تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''مشینوں کو اپنی زندگی سے نکال کر ہمارے پاس کیا بچے گا؟'' ماہ بانو بولی۔ ''میرا نہیں خیال کہ ہم پتھر کے زمانے میں جا کر خوش رہ سکتی ہوں کیونکہ وہ Survival of Fittest کا دور تھا' اس دور میں صرف وہی زندہ رہ سکتا تھا' جو زندہ رہنا جانتا تھا' جس کے بازو میں اتنی جان تھی کہ وہ زندہ رہ سکے اور فرینکلی اسپیکنگ مجھے تو سوئی گیس پر کھانا پکانے سے وحشت ہوتی ہے اور تم ہمیں یہ تمام [illegible] چھیننا رہی ہو' بہت مشکل بات کر رہی ہو تم۔''

''تمہیں سوئی گیس پر کھانا پکانے سے اس لیے وحشت ہوتی ہے کیونکہ تمہیں کھانا پکانے سے ہی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اُما ہنسی۔

''تم اُما کی بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔'' ایڈی نے مداخلت کی۔ ''مشینوں کو انسان کا غلام رہنا چاہیے' انہیں دیوتا نہیں بننا چاہیے کہ انسان ان کی پوجا شروع کر دے۔ سہولت کو سہولت رہنا چاہیے' بلائے جان نہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم مشینوں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم انہیں اپنے تابع رکھیں۔ مشینوں نے ہمیں اپنا مطیع بنا لیا ہے۔ تم دیکھ سکتی ہو کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں انسان اور اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ مشینوں کو رفتہ رفتہ انسان کی صورت ملتی جا رہی ہے اور انسان آہستہ آہستہ روبوٹ بن رہا ہے۔''

''میں تمہیں چھوٹی سی مثال دیتی ہوں۔'' اُما بولی۔ ''یہ ٹی وی اور وی سی آر دیکھ لو۔ ان کے دیکھنے میں نہ کوئی برائی ہے اور نہ کوئی پریشانی' جب تک ان کا استعمال ٹھیک اور ایک حد کے اندر رہے جبکہ یہاں یہ حال ہے کہ جس دن ٹی۔ وی پر کوئی خاص پروگرام ہو تو لوگ ملنے ملانے کے لیے ایک دوسرے کے گھر جانے تک سے گریز کرتے ہیں۔ میں اندرون سندھ کے ایک عام سے گاؤں سے تعلق رکھتی ہوں ٹھیک ہے کہ ہم وہاں کبھی کبھار ہی جاتے ہیں لیکن وہاں کی چند باتیں ایسی ہیں' جو جاننے کے لیے وہاں زیادہ دیر تک رہنا ضروری نہیں ہے۔

جب تک وہاں ٹی۔ وی کی وبا نہیں آئی تھی تو سارا گاؤں مل جل کر شام کو کہیں اکٹھا ہوتا تھا۔ دن بھر کی باتیں اور گوسپ ہوا کرتی تھیں۔ مغرب کے وقت رات کا کھانا کھا لیا جاتا تھا اور عشاء کی نماز پڑھ کر سب سو جاتے تھے کیونکہ انہیں سویرے بیدار ہونا ہوتا تھا۔ اب جب سے گاؤں میں چار ٹی۔ وی آئے ہیں' تب سے حالات ہی بدل گئے ہیں۔ پہلے پہل تو ان گھروں میں سارا گاؤں جمع ہو کر ٹی۔ وی دیکھ لیا کرتا تھا پھر بچوں کے شور شرابے سے بیزار ہو کر انہوں نے گاؤں والوں کو اپنے گھر آنے سے منع کیا۔ اس کے بعد لڑائیاں ہوئیں' پرانی مضبوط دوستیاں ٹوٹیں' نئے اور مصنوعی رشتے قائم ہوئے' جن کی بنیاد اخلاص نہیں' مادیت پرستی تھی اور بالآخر پیسے کی دوڑ شروع ہو گئی۔''

''یہ تو ایک قدرتی ردِعمل تھا۔ قصور ٹی۔ وی کا نہیں' ٹی وی دیکھنے والوں کا تھا۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''ظاہر ہے قصور وار کبھی بھی ایک بے جان چیز کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ قصور وار اسے استعمال کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔'' اُما بولی۔ ''لیکن تلخی کی بنیادی وجہ بہر حال وہی اکیس انچ کا بے جان ڈبا ہے۔''

''فرض کرو کہ پورے گاؤں میں ٹی۔ وی آ جائے تو یہ مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔'' ماہ بانو اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ ''جبکہ تمہاری تھیوری اس کے برعکس ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ

سائنس جتنی زیادہ ترقی کرے گی اور پھیلے گی' اتنے ہی مسائل بڑھیں گے۔''

''بنیادی مسئلہ انسان کی انسان سے دوری کا ہے۔ سب گاؤں کوٹی۔ وی مل جائیں گے تو اور قسم کے مسائل جنم لیں گے۔ جس وقت کوئی خاص پروگرام ہوگا تو کوئی کسی سے ملنے ملانے کا روادار نہیں ہوگا۔ جیسے یہاں شہروں میں بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ٹی۔ وی دیکھنے کے اتنے شوقین ہوتے ہیں کہ باہر نکلنا تو کجا وہ گھر والوں کے ساتھ بھی بات چیت کرنے کے بجائے گپ چپ ہوکرٹی۔ وی اسکرین کو گھورتے رہتے ہیں۔ خود سوچو اس میں فائدہ کتنا ہوگا اور نقصان کتنا؟''

''تم لوگ اپنی بحث میں ٹی۔ وی بے چارے کو کیوں دھنک رہے ہو؟'' ایڈی بولا۔ ''تم دونوں ہی غلط ٹریک پر نکل گئے ہو۔ بانو بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے یہاں ہے تو سہی لیکن اس کی بہت شدت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ موجودہ دور کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس مسئلے کا آغاز دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہوا ہے' جب تعمیرِ نو کے لیے ہر شخص کو میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ زندگی اس قدر تیز ہوگئی کہ انسان روبوٹ بن کر رہ گیا۔ فیکٹ اور فگرز کی اہمیت انسانوں کے جذبات اور خود انسان سے بھی بڑھ گئی تھی اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش' خواہش کے بجائے عفریت بن گئی۔ یعنی وہ حالات پیدا ہوگئے' جنہیں ڈکنس نے ہارڈ ٹائمز کہا ہے۔''

وہ خاموشی سے ایڈی کی بات سن رہی تھیں۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ایتھوپیا کی آبادی کے متعلق کیا کہا گیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''کہ وہاں ایک عورت اوسطاً چھ اعشاریہ تین بچے پیدا کرتی ہے۔ کتنی آسانی سے انسان کو فیکٹس اور فگرز میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایسے انسانوں کو جن میں سے ہر ایک سانس لیتا ہے۔ بھوک' پیاس محسوس کرتا ہے' تکلیف محسوس کرتا ہے' جن میں سے ہر ایک نے مقررہ وقت تک زندہ رہنا ہے اور اس وقت کے اختتام پر مر جانا ہے۔ ایک ایسے شخص کو ہم فیکٹس اور فگرز بنا کر Almanics میں کیسے بند کر سکتے ہیں' جس نے اپنی زندگی کی بہت سی خوشیوں پر اپنی ذات کے حوالے سے خوش ہونا اور بہت سے غموں کو اکیلے جھیلنا ہے۔ ایک ایسے شخص کا چھ اعشاریہ تین ہونے سے کیا تعلق؟ اور بانو تم غالباً مشینوں سے مراد فریج' ٹی وی' ٹیپ ریکارڈر قسم کی چیزیں لے رہی ہو جبکہ یہ درحقیقت رویوں کی بات ہے۔''

''گو کہ میں اب بھی تم سے بحث کر سکتی ہوں' لیکن صرف اس لیے چھوڑ رہی ہوں کہ ڈرامیٹک آرٹ نہ پڑھے ہونے کے باوجود بھی تم اس موضوع پر بہترین مائم پیش کر سکتے ہو۔'' ماہ بانو ہنسی۔

''بانو! آئیڈیا تمہارا زیادہ اچھا ہے لیکن میں اسے اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔'' ایڈی نے کہا۔ ''جب تک میں اسے بہت اچھی طرح تمام زاویوں سے پڑھ نہیں لیتا' تب تک اس پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔''

''اس سلسلے میں اُما تمہاری مدد کر سکتی ہے' کیوں اُما؟'' ماہ بانو اس کی طرف مڑی۔

''نہ بابا نہ۔'' وہ ہنسی۔ ''میں نے یہ سب کچھ نہیں پڑھا ہوا' مجھ سے زیادہ تو اس وقت بھی ایڈی ہی جانتا ہے۔''

''کمال ہے۔'' ماہ بانو نے سر ہلایا۔

''اس موضوع کو میں اسٹاک میں رکھ رہا ہوں' اس پر اگلی دفعہ مائم کریں گے۔'' ایڈی بولا۔

''تو پھر طے کہ اس مرتبہ مائم Fall of Man اور پھر انسان کی مشینوں سے جنگ کے متعلق ہوگا۔'' اُما نے کہا۔

''ہاں۔'' ایڈی بولا۔ ''لیکن پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا' کہ انسان کی پیدائش کو مختلف مذاہب اور دیومالاؤں میں کس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔''

''ایک مقبولِ عام نظریہ تو یہی آدم علیہ السلام وحوا کی پیدائش اور پھر ان کا جنت سے نکالا جانا ہے جو آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں درج ہے۔'' اُما بولی۔ ''اور جس پر مسلمان' یہودی اور عیسائی کم وبیش متفق ہی ہیں۔ میرے خیال میں ایڈی تم اسی نظریئے کو Follow کرو۔''

''مشورے کا شکریہ' لیکن یہ میرا فیلڈ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے ہینڈل کیا جانا چاہیے' اگر مجھے اسٹیج پر بیس فیصد پیش کرنا ہے تو میری معلومات پچھتر فیصد ہونی چاہئیں۔''

''آل رائٹ۔'' ماہ بانو جلدی سے بولی۔ ''میری معلومات کے مطابق چینی کہاوت یہ کہتی ہے کہ پہلے یہ کائنات ایک خلا تھی' جس کی شکل انڈے جیسی تھی۔ اس کے پھٹنے سے آسمان اور زمین بنے اور اسی کے ذریعے پہلا مرد اور پہلی عورت یعنی یانگ اور ین پیدا ہوئے۔''

''اور مصری کہتے ہیں کہ گہرے پانیوں کے اندر سے آتم پیدا ہوا تھا۔ اسے کسی نے تخلیق نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود ایک بڑی طاقت تھا۔ اسی آتم کو ''گریٹ ہی ہی'' کہا جاتا ہے اور تمام کائنات بھی اسی آتم نے تخلیق کی۔'' ایڈی نے بتایا۔

''مصریوں کا یہ نظریہ ہم سے ملتا جلتا ہے۔'' اُما بولی۔ ''ہم کہتے ہیں کہ سب سے پہلے برہما پیدا ہوا۔ برہما کی تخلیق کسی نے نہیں کی بلکہ وہ پانیوں کے اوپر تیرتے ہوئے آگ کے گولے سے پیدا ہوا۔ اس وقت اس کے پانچ سر تھے۔ بعد میں صرف چار رہ گئے۔ چار سر رہ جانے کی بہت سی مختلف کہانیاں بتائی جاتی ہیں۔ بہرحال اس وقت تو برہما کی پیدائش کی بات ہو رہی ہے۔ اس نے خود کو درمیان سے کاٹ کر سرسوتی دیوی کو پیدا کیا اور اس طرح دنیا کو مرد اور عورت کا وجود ملا۔ ویسے شیوجی اور وشنوجی کی پیدائش بھی تقریباً اسی طرح بیان کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تخلیق وشنوجی کے کنول کے پھول سے ہوئی۔ خیر کچھ بھی کہا جائے' تخلیق کار برہما کو ہی مانا جاتا ہے جبکہ کائنات کو بچانے کی ذمہ داری وشنوجی اور تباہ کرنے کا کام شیوجی کے ذمے ہے۔''

''اور غالباً سب سے رومانٹک روایت جاپان سے متعلق ہے۔ جاپانیوں کا کہنا ہے کہ ایک

آسمانی مرد اور ایک آسمانی عورت آسمان کی قوس قزح کا پل بنا کر اس پل کے راستے زمین پر اترے۔ اس وقت زمین پر پانی کے سوا کچھ نہیں تھا' لیکن ان آسمانی مرد اور عورت کے اترنے کے بعد اس میں سے ایک جڑا ابھری جو رفتہ رفتہ جزیرے کی شکل اختیار کر گئی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ہوں۔'' ایڈی نے اپنے اسکربل پیڈ پر تیزی سے پوائنٹ نوٹ کیے اور پھر اسے بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اتنی روایتیں کافی ہیں یا اور بھی بتانا ہوں گی؟'' اُمانے پوچھا۔

''کافی ہیں کیونکہ ہم آدم علیہ السلام وحوا کے حوالے سے کام کریں گے۔'' ایڈی آرام سے بولا۔

''اپنا جبڑا خواہ مخواہ تھکایا ہم نے۔'' اُما بیزاری سے بولی۔

''نالج' نالج ہی رہتا ہے' خواہ اسے فوری طور پر استعمال کیا جائے یا نہیں۔'' ایڈی نے کہا۔ ''یہ معلومات مجھے پھر کبھی کام آسکتی ہیں۔''

ماہ بانو کو ایڈی کی یہ بات بہت پسند تھی۔ وہ ہر خاص بات نوٹ کر لیا کرتا تھا۔ وہ باتیں بھی جو بظاہر نہایت غیر اہم لگتی تھیں' لیکن درحقیقت غیر اہم ہوتی نہیں تھیں۔ وہ ایسی سب معلومات کو مناسب وقت پر استعمال کرنے کا فن جانتا تھا۔

مائم کا آئیڈیا منتخب کرنے کے بعد وہ ساؤنڈ ایفکٹ' لائٹ ایفکٹ' سیٹ ڈیزائننگ' ڈائریکشن اور نہ جانے کن کن چیزوں میں الجھ گیا تھا۔ بیک گراؤنڈ موسیقی کی تلاش میں اس نے آف بیٹ' کن الیکٹرونکس اور ورجن ایر سے لے کر اچھرہ' رحمٰن پورہ اور دھرم پورہ قسم کی جگہوں کی چھوٹی چھوٹی آڈیو کیسٹ کی دکانوں تک کو کھنگال ڈالا تھا اور پھر ایک دن وہ بہت خوش خوش کالج پہنچا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' اُمانے پوچھا۔ ''آج وہ تمہارے چہرے پر مستقل چپکی ہوئی بیزاری کہاں غائب ہوگئی؟''

''کیوں ایسے زیادہ بہتر نہیں ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''بہتری تو بعد کی بات ہے' ابھی تو تمہارے چہرے کے ان نئے خدوخال میں سے ہم پرانا ایڈی تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں اتنا ہی بیزار دکھائی دیتا ہوں؟''

''کم از کم جب سے یہ مائم والا چکر شروع ہے' تب سے تو ایسا ہی ہے۔'' ماہ بانو بولی۔

''یعنی تم لوگوں کو میرا یوں سنجیدگی سے کام کرنا پسند نہیں ہے؟''

''کام کرنا پسند ہے' سنجیدگی البتہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔'' یہ اُما کا خیال تھا۔ ''ویسے مائم تو ابھی تک جاری ہے پھر یہ مسکراہٹ تمہارے چہرے پر آنے میں کیسے کامیاب ہوگئی؟''

''اسے کہتے ہیں کہ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔'' وہ بولا۔ ''سارے لاہور میں مارا ماری کرنے کے بعد کل جب تھک ہار کر میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا تو میری چھوٹی بہن کے کمرے سے Passion کی آواز آئی۔ تب میں نے سر پیٹ لیا کہ مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ موسیقی ہو پیٹر گیبرائیل کی اور آواز ہو نصرت فتح علی خان کی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مائم ضرور ہٹ ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن Passion خاصی پرانی بات نہیں ہوگئی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''آرٹ میں کوئی خوبصورت چیز کبھی پرانی نہیں ہوتی' ورنہ بی تھوون کی موسیقی سن کر لوگ آج بھی سر نہ دُھنتے۔'' ایڈی بولا۔

اور اب وہ ریہرسل روم میں سب کو ان کا رول سمجھا رہا تھا۔ شام تک اس نے سب کو ریہرسل میں جوتے رکھا۔

''اُف ایڈی! اب ہمارے حال پر رحم کرو پلیز۔'' اُما تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اتنی جلدی۔'' ایڈی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ''ابھی تو صرف چھ بجے ہیں۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو' ساڑھے دس بجے سے اٹھک بیٹھک کرتے کرتے یہ وقت آگیا ہے۔ ایک نہ دو پورے ساڑھے سات گھنٹوں سے تم ہمارے سروں پر مسلط ہو۔ ہم سے اب اور کچھ نہیں کیا جائے گا۔'' ماہ بانو بھی اُما کی تقلید میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آج ریہرسل کا آخری دن ہے اور پھر میں نے تم لوگوں سے مسلسل کام لیا بھی نہیں ہے۔ وقفے وقفے سے کام کیا ہے تم لوگوں نے۔''

''ہماری ہمتیں بھی جواب دے گئی ہیں۔'' باقی سب نے بھی شور مچا دیا۔

''ہوں۔'' ایڈی نے کندھے اچکائے۔ ''جاؤ پھر' غالباً ایک میں ہی ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے تھکن پروف بنایا ہے۔''

وہ دونوں شکر کا کلمہ پڑھتی باہر نکلیں۔ سعد سامنے سے چلتا ہوا انہی کی جانب آرہا تھا۔

''ہوگئی سزا ختم۔'' ان کے تھکن سے بے حال چہرے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''اُف نہ پوچھو' آج تو ریہرسل کروا کروا کے اس نے مار ہی دیا ہے۔'' ماہ بانو نے اپنے سانولے چہرے پر بہتے ہوئے پسینے کے قطروں کو گلابی کھدر کے بڑے سے چادر نما دوپٹے سے پونچھا۔

''اُما! تمہیں بھی ہوسٹل جانا ہے؟'' سعد نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اور بانو تمہیں گھر جانا ہے؟''

''ظاہر ہے۔''

''چلو میں تم دونوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' سعد نے انگلی میں کار کی چابی گھمائی۔

''شکریہ' میں چلی جاؤں گی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''پلیز بانو' کیا ہماری دوستی کا ایک دوسرے پر اتنا حق بھی نہیں ہے؟''

''جس دن ہماری دوستی کے درمیان تمہاری اکارڈ آ گئی۔ وہ شاید ہماری دوستی کا آخری دن ہوگا۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو' کالج بس تمہیں اس وقت گھر چھوڑ نہیں سکتی' کیسے جاؤ گی پھر؟'' سعد جھنجھلا گیا۔

''جیسے چالیس لاکھ کے اس شہر میں کم از کم تیس لاکھ لوگ سفر کرتے ہیں' یعنی پبلک ٹرانسپورٹ۔'' ماہ بانو نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

''کیوں ضد کرتی ہو بانو؟'' اُما نے اسے ڈپٹا پھر اس کے کان کے پاس منہ لا کر بولی۔

''اور ہوسکتا ہے' اس دوران تمہارے کان وہ بات سننے میں کامیاب ہو جائیں جسے سننے کے لیے تم عرصے سے بے چین ہو۔ یعنی آئی لو یو۔''

ماہ بانو ہنس کر پیچھے ہٹ گئی اور ان دونوں کو خدا حافظ کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

''بانو اچھی خاصی بے وقوف ہو تم۔ اب اوپر والا ہی تمہارے حال پر رحم کرے۔'' پیچھے سے اُما چیخی۔

ماہ بانو ہنستے ہوئے گیٹ سے نکل آئی۔

☆======☆======☆

سیکرٹریٹ سے تین نمبر ویگن میں بیٹھ کر بھاٹی گیٹ جاتے ہوئے اُما کی بات اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''اُما مشکل یہ ہے کہ تم سب مجھے جو سمجھتے ہو' میں وہ نہیں ہوں۔'' ماہ بانو نے سوچا۔ ''میں کھدر اس لیے نہیں پہنتی کہ اپنی بے تحاشا بھری ہوئی وارڈ روب دیکھ کر خوش ہونے کے بعد رفاہِ عامہ کا ڈراما رچاؤں۔ میں کھدر اس لیے پہنتی ہوں کہ مجھے یہ میسر ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ یہی سب بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔

اور پھر سعد کی اکارڈ میرے علاقے کی تنگ اور پُر پیچ گلیوں میں کیسے داخل ہوسکتی ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا ردِعمل ہوگا' جب اسے معلوم ہوگا کہ میں ایک عام سے کمہار کی بیٹی ہوں' جس کا سوشل اسٹیٹس' وہ نہیں ہے جو سعد غلط فہمی کی وجہ سے سمجھتا آرہا ہے۔ ابھی تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں بھی اس کی کلاس کی طرح کھدر پوشی کے فیشن میں مبتلا ہوں سعد اچھا ہے لیکن اس کی اچھائی کی

بھی کچھ حدود ہیں اور بھاٹی گیٹ اس کی ان حدود سے کچھ پرے ہی واقع ہے۔''

ویگن ایک جھٹکے سے داتا دربار کے سامنے رکی تو وہ بھی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ تنگ اور پُر پیچ گلیوں کا طویل راستہ پیدل طے کر کے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اماں اور ابا پیڈسٹل فین کھولے صحن میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

''بہت دیر کردی بانو تم نے؟'' اماں نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

''آج ریہرسل کا آخری دن تھا ناں اماں۔'' اس نے دوپٹا اور شولڈر بیگ ان کی چارپائی پر پھینکے اور گھڑے سے پانی نکال کر پینے لگی۔ ''ایڈی کے ساتھ کام کرنا اپنی مصیبت کو خود ہی آواز دینا ہے۔'' وہ چارپائی پر پنکھے کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

''مجھے تمہارا لڑکوں کے ساتھ پڑھنا ہی پسند نہیں ہے لیکن تمہارے ابا کس کی سنتے ہیں۔ غضب خدا کا اب لڑکوں کے ساتھ ڈراما کرنے کی بھی اجازت دے دی اور بی بی پہنچ رہی ہیں گھر شام کے سات بجے' یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟''

''اماں ابھی تو فرسٹ ائیر ہے' اس لیے جلدی واپسی ہو جاتی ہے۔ اگلے سال سے تو جب گرافکس کی کلاسیں شروع ہوں گی تو تب کالج میں ہی رات کے آٹھ دس بج جایا کریں گے؟''

''استغفار۔'' اماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''کچھ سنتے ہو بانو کے ابا؟''

''بانو کی اماں! تم دنیا کو اپنے ابا کی نظر سے مت دیکھو' وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ بانو میری بیٹی ہے اور مجھے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔''

ماہ بانو ہنستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''میرے ابا بے وقوف نہیں ہیں' میں کہتی ہوں بانو کے ابا! اب کچھ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی بھی فکر کریں۔'' اماں بولیں۔ ''خاندان میں اس کی عمر کی لڑکیاں شادی کر کے دو دو بچوں کی مائیں بھی بن گئی ہیں۔ ایک یہی رہ گئی ہے کنواری کی کنواری' جب کوئی ملنے ملانے کے لیے گاؤں سے آتا ہے تو یہی پوچھتا ہے کہ کب کرنی ہے اس کی شادی' چار رشتے تو یوں سامنے پڑے ہیں خاندان میں' اور جو کسی کو کہہ دیا کہ ہم بانو کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو لائن لگ جائے گی رشتوں کی۔''

''اب یہاں تم زیادتی کر رہی ہو بانو کی اماں۔'' ابا جی بولے۔ ''خاندان میں کون سے اچھے رشتے ہیں' کیا میں گلو مستری سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا یا پھر اس شیدے کمہار سے؟''

''تو کیا حرج ہے' آپ بھی تو کمہار ہی ہیں۔ خاندان کے دیکھے بھالے رشتوں میں جو بات ہوتی ہے' وہ باہر کے رشتوں میں نہیں ہوتی۔''

''مجھے ان کے کمہار یا مستری ہونے پر اعتراض نہیں ہے۔ اعتراض ان کی جہالت پر ہے' اگر وہ صرف ان پڑھ ہوتے تب بھی میں کچھ سوچ سکتا تھا لیکن وہ تو بڑے جاہل ہیں۔''

"ہائے اپنے بھتیجوں کو جاہل کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ان جاہلوں کا چچا ہوں۔"

"تو پھر گھر میں بٹھائے رکھنا اپنی لاڈلی کو یا کسی کھوسٹ پروفیسر کے حوالے کر دینا۔ میری بلا سے اپنی بیٹی ہے چاہے چولہے میں جھونکیں چاہے جہنم میں میرا کیا جاتا ہے۔" اماں بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔

"اُف شکر ہے میرے ابا جی اچھے ہیں ورنہ اماں تو مجھے گلو شیدے یا بالے کے پلے باندھ کر ہی رہتیں۔" ماہ بانو نے شکر کا سانس لیا۔

"بانو!" رات کے کھانے پر اماں بولیں۔ "صبح تیار رہنا ہمیں گاؤں جانا ہے۔"

"گاؤں؟" اس کے ذہن میں عبداللہ کا دھندلا سا سایہ آ گیا۔

"ہاں۔"

"ریشماں کی طرف جائیں گی آپ؟"

"ارے ہاں کیوں نہیں ایک ہی ایک تو میری بہن تھی ظالموں نے بہت برا سلوک کیا اس کے ساتھ۔" اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "اب اس کی پھول سی بچی کو قید کر کے رکھا ہوا ہے نہ بے چاری کہیں جانے کی نہ کہیں آنے کی میں بھی نہ جاؤں اس کے پاس تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے وہاں۔"

"اچھا ہے اسی بہانے اسے عبداللہ کی آمد کے بارے میں بھی بتا دوں گی۔" ماہ بانو نے سوچا۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے اپنے اور اماں کے چند جوڑے بیگ میں ڈالے اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

"پتا نہیں سعد بھی میرے بارے میں ویسے ہی سوچتا ہے یا نہیں۔" اس نے سونے سے پہلے ہمیشہ کی طرح سوچا۔ "یا شاید میں ہی پاگل ہوں کیوں اس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہوں میں۔ اُما کہتی تو ٹھیک ہی ہے اور یہ بھی کہ اتنا پوزیسو تو انسان صرف محبت ہی میں ہوتا ہے لیکن پھر وہ بتاتا کیوں نہیں ہے؟ کیوں نہیں صاف صاف کہہ دیتا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔

شاید وہ اس انتظار میں ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اب اس میں اتنا وقت بھی نہیں رہ گیا ابھی تھرڈ ایئر میں ہے۔ ایک دو مہینوں کی بات ہے پھر فورتھ ایئر میں چلا جائے گا اور پھر اس ایک سال کے بعد وہ عملی دنیا میں قدم رکھ لے گا۔

ابا جی میری اس خواہش کو رد نہیں کریں گے۔ اماں بھی خوش ہوں گی لیکن اصل مسئلہ میرے اماں ابا نہیں سعد اور اس کے گھر والے ہیں۔ کلاس کا یہ فرق اگر فلموں کی اسکرین سے نکل کر ہماری حقیقی زندگیوں میں آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟ پتا نہیں کیا ہوگا پھر؟ میں تو شاید پاگل ہی ہو جاؤں یا

شاید نہ ہوں عجیب سی بات لگتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔"

صبح حسبِ معمول اماں نے اسے سویرے سویرے ہی جگا دیا۔

"جلدی کرو بانو کبھی کالج کے بجائے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے لیے بھی جاگ جایا کرو۔" اماں نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ "ابھی سویرے سویرے نکلیں گے تو شام تک گاؤں پہنچیں گے میں چاہتی ہوں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

نیند سے اس کی آنکھیں پہلے ہی بند ہو رہی تھیں...... جی ٹی ایس کی کھٹیچر سی بس کی گھوں گھوں میں وہ جلد ہی سو گئی۔

قریبی بڑے شہر سے ان کا گاؤں نیاز پور کوئی پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا لیکن کوئی پکی سڑک نہ ہونے کی وجہ سے تانگے کے مدھم سُروں کی ٹک ٹک اور گرد و غبار کے طوفان میں نہاتے ہوئے یہ راستہ کافی طویل لگتا تھا۔

تنگ سی کچی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت پھیلے تھے۔ اس سڑک پر صرف تانگے ہی نہیں موٹر گاڑیاں بھی چلتی تھیں۔ پیر صاحب رجب علی شاہ کی پجیرو اور نسان پٹرول۔

تانگے کا مریل سا گھوڑا جب ٹخوں ٹوں ٹخوں ٹوں کرتا ہوا کماد کے کھیت کے پاس پہنچا تو ایک جیپ تیزی سے ان کے پاس سے گرد اڑاتے ہوئے گزرتی چلی گئی۔ سفید چادر میں سر سے پیر تک لپٹی ہوئی ماہ بانو پہلے ہی گرمی پسینے اور سفر کی تھکن سے بے حال تھی اوپر سے گرد کا یہ طوفان۔

"اُلو کا پٹھا ایسے گیا ہے جیسے باپ کی جاگیر ہو۔" وہ بڑبڑائی۔

"چپ۔" اماں نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ "بکواس کیے جائے گی موقع دیکھتی ہے نہ محل ٹرٹر کیے جاتی ہے۔"

"ٹھیک تو کہتی ہے چھوٹی بی بی۔" بڈھا کوچوان ہنسا۔ "اس کے باپ کی جاگیر ہی تو ہے پیر صاحب رجب علی شاہ کا گدی نشین ہے یہ خادم علی شاہ۔"

"بھائی یہ بچی ہے ناں اسے نہیں پتا۔" اماں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "کبھی کبھار تو آتی ہے یہاں وہ بھی ایک دو روز کے لیے۔"

"بی بی آپ کو جانا کہاں ہے گاؤں میں؟"

"مولوی نعمت اللہ صاحب کے یہاں۔"

"مولوی صاحب کے گھر؟ بہت اچھے ہیں مولوی صاحب بہت عزت کرتا ہے سارا گاؤں ان کی۔ انہی کے دم سے کچھ نہ کچھ مسلمانی باقی ہے اس گاؤں میں ورنہ جاہلوں کو تو دین دنیا کی خبر ہی نہیں اور پڑھے لکھوں کے لیے دین کی اہمیت ہی نہیں رہی۔ ہائے وہ وقت کہاں سے آئے گا۔

جب پیر صاحب جلال الدین مرحوم اس گاؤں کے والی تھے' جیسے ہی انہوں نے آنکھیں بند کیں' رجب علی شاہ پتا نہیں' کس گناہ کی سزا کے طور پر ہمارے سروں پر مسلط ہوگیا۔''

بڈھے کوچوان نے تانگہ گاؤں کی اکلوتی مسجد کی سفید دیوار کے پاس روکا۔ اماں نے بٹوا کھول کر پیسے نکالے۔

''نہ بی بی نہ۔'' کوچوان نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''آپ تو یہاں آتی رہتی ہوں گی۔ ہم مولوی صاحب کے گھر کی سواریوں سے پیسے نہیں لیتے۔''

بڑی اماں اور نانا سے ملنے کے بعد وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی اور دیر تک نہاتی رہی۔ ٹیوب ویل کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بہت فرحت بخش تھا۔ ماہ بانو کی ساری تھکن اتر گئی۔ لان کا ہلکا سا پرنٹڈ سوٹ پہن کر باہر نکلتے ہوئے اس نے اماں سے ریشماں کی طرف جانے کی اجازت مانگی۔

''اس وقت اندھیرا پھیل گیا ہے' کل چلی جانا۔''

''اماں پلیز' دومنٹ کا تو راستہ ہے۔'' وہ ریشماں کو عبداللہ کی آمد کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین تھی۔

''پاگل ہوئی ہے۔'' اماں نے اسے ڈپٹا۔ ''پتا بھی ہے کہ اس کے بھائی کیسے ہیں۔''

''اماں میں چادر لے کر وہاں جاتی ہوں۔ اس پر نقاب بھی ہے۔ پھر میں کون سا مردانے میں جارہی ہوں۔''

''چپ کر کے سو جاؤ بچی۔'' بڑی اماں بولیں۔ ''اس وقت وہ کسی کو ریشماں سے ملنے نہیں دیتے۔ کل میں خود تجھے چھوڑ آؤں گی۔''

''ایسے ماحول میں پاگل نہیں ہو جاتی وہ' میں تو ایک دن بھی نہ رہ سکوں ایسی جگہ پر۔'' ماہ بانو نے جھرجھری لی۔

''بس بیٹا قسمت کی بات ہے سب۔'' اماں نے آہ بھری۔

''ماں بیٹی دونوں ایک سا خراب مقدر لے کر آئی تھیں۔ زرینہ بے چاری کی جان تو اس چخ چخ سے چھوٹ گئی لیکن ریشماں پتا نہیں کب تک پستی رہے گی' اس چکی میں۔'' بڑی اماں افسردگی سے بولیں۔

''اماں! جب آپ لوگوں کو معلوم تھا کہ رجب علی شاہ کی حرکات ایسی ہیں تو کیوں کی زرینہ خالہ کی شادی وہاں؟ کیوں پھینکا انہیں اس جہنم میں؟ دھن' دولت بڑی چیز ہوتی ہے لیکن اتنی بڑی بھی نہیں کہ ایک معصوم عورت کو دولت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ میں تو یہاں کم کم آتی ہوں پھر بھی مجھے معلوم ہے کہ رجب علی شاہ اور اس کے بیٹے...... انسانیت کی سطح سے کس قدر گرے ہوئے لوگ ہیں [illegible] نہیں رہتے تھے' کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دو

بیویاں سالم ہضم کر چکا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی آپ لوگوں نے خالہ کی شادی اس سے کر دی تو ان کے اور ریشماں کے مقدر کی خرابی کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں۔ قسمت کو کیوں برا بھلا کہتے ہیں جبکہ فیصلہ آپ لوگوں کا تھا۔''

''بہت بکنے لگی ہے۔'' اماں نے زمین پر پڑا ہوا چمٹا اٹھالیا۔ ''تعلیم نے یہی سکھایا ہے کہ بڑوں کے سامنے یوں بولتے ہیں۔''

''نہ' نہ پتر!'' بڑی اماں نے ان کے ہاتھ سے چمٹا کھینچ لیا۔ ''جوان بیٹی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔''

''اماں میں گستاخی نہیں کر رہی' صرف حیرت کا اظہار کر رہی ہوں کہ آخر وجہ کیا تھی زرینہ خالہ کی وہاں شادی کرنے کی۔''

''تجھ سے مطلب؟'' اماں چلائیں۔ ''چل اندر' نماز کا وقت ہونے والا ہے' ابھی دس منٹ میں نمازی آتے ہوں گے۔''

''میں چلی تو جاتی ہوں لیکن پلیز آئندہ اپنے اور اپنے بڑوں کے کیے کا مردہ قسمت کے سر نہ منڈھنا۔'' وہ پیچھے مڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

''بک بک کیے جائے گی۔'' اماں نے ڈراوے کے لیے جوتا اٹھالیا لیکن تب تک ماہ بانو اندر جاچکی تھی۔

تھوڑی دیر تک اماں اور بڑی اماں چولہے کے پاس خاموش بیٹھی رہیں پھر اماں نے سر اٹھایا۔

''اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں میری راتوں کی نیندیں اچاٹ ہوگئی ہیں' لیکن بانو کے ابا کی نظر میں کوئی لڑکا اچھا ہی نہیں ہے۔''

''بانو کا باپ سمجھدار ہے' تم جلد بازی مت کرو' سوچ سمجھ کر رشتہ کرو۔ ایک ہی تو بیٹی ہے تمہاری' میں نہیں چاہتی کہ اس کا حال بھی زرینہ والا ہو۔'' بڑی اماں بولیں۔

''اماں اتنے اچھے رشتے ہیں' آخر کب تک کوئی انتظار کرے گا۔ وہ گلو ہے' اچھا بھلا مستری ہے' شہر آجائے تو روزانہ سوڈیڑھ سو نہ سہی' پچاس ساٹھ روپے تو کما ہی لے گا۔ پھر وہ شیدا ہے' میں بانو کے ابا سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں یہ گھر بار قبر میں تو لے جانا نہیں ہے' وہاں تو بس ایک اللہ کا نام جائے گا ہمارے ساتھ۔ شیدے کے ساتھ شادی ہو جائے بانو کی تو جما جمایا کاروبار اس کے حوالے کر دیں گے۔''

''پھر اسے پسند نہیں آئے یہ رشتے؟''

''نہیں اماں' یہ راج ہٹ' بالک ہٹ اور تریا ہٹ تو سنی تھی پر جو ضد بانو کے ابا کی ہے' وہ دیکھی نہ سنی۔'' اماں نے کہا۔ ''چلو گلو اور شیدا تو ان پڑھ جاہل ہیں لیکن بالا تو پانچ جماعت پاس

ہے۔ اتنی اچھی ڈرائیوری کرتا ہے' اس پر بھی وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔''

''دیکھو رضیہ! بانو نے بارہ جماعتیں انگریزی میں پاس کی ہیں اور اب ماشاء اللہ کالج میں ہے۔ شرع میں بھی حکم ہے لڑکی کی مرضی پوچھنے کا۔ وہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہے۔ ان گنواروں کے پلے بندھ گئی تو ہیرا سی بچی کی ناقدری کریں گے یہ لوگ۔''

''اسی غم میں تو گھلی جاتی ہوں میں' اتنا پڑھ لکھ جائے گی تو کہاں سے بر ملے گا۔ خاندان میں تو کوئی لڑکا اتنا پڑھا ہوا نہیں ہے' کہیں کنواری نہ رہ جائے میری بچی۔''

''اُف!'' ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ اپنے بال نوچ لے۔ ''اماں کا بس چلے تو گلو' بالے اور شیدے تینوں سے ہی میری شادی کروا دیں۔ کیونکہ اماں کو تینوں میں ہی ایک سے بڑھ کر ایک خوبی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انتخاب کا حق مکمل طور پر اماں کے ہاتھ میں ہو' تب بھی اماں ان تینوں میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکیں گی۔''

وہ سلاخوں والی کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''کبھی سعد کو دیکھ لیں اماں تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ جو شیدے' گلو اور بالے کو بیک وقت اپنا ملازم رکھ سکتا ہے۔ جس کی کار ہمارے دو کمروں کے گھر سے زیادہ لمبی ہے۔''

''جس کی کار اتنی لمبی ہے' وہ بھلا تمہیں کہاں گھاس ڈالنے لگا۔'' ماہ بانو کے اندر کہیں سے آواز آئی۔

''ممکن ہے تمام مادی آسائشیں اس کی محبت کے سامنے ہیچ ثابت ہوں۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔

''ہاں اور وہ تمام مادی آسائشیں چھوڑ کر بالآخر بھاٹی گیٹ کے اس دو کمروں کے مکان میں مٹی کے برتن بنانے کے لیے چلا آئے گا' ہے نا دلچسپ بات۔'' اس کے اندر کوئی مضحکہ اُڑانے والے انداز میں ہنسا۔

اس نے جلدی سے ان باتوں کی طرف سے اپنا ذہن ہٹانے کی کوشش کی اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی الماری کے پٹ کھول کر اس میں سے زرینہ خالہ کی چھوٹی سی صندوقچی باہر نکال کر چارپائی پر رکھ لی۔

باہر نانا کے حجرے کے پرے سے اذان کی آواز آنے لگی۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھی رہی۔ اذان ختم ہونے کے بعد اس نے آہستگی سے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس سے قبل اس نے اس چھوٹی سی صندوقچی کو بس باہر سے دیکھا ہی تھا' کبھی کھولا نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اماں کبھی اس بات کو پسند نہ کرتیں۔ اسے ہمیشہ اس میں ایک انوکھا' رومانوی سا اسرار نظر آتا تھا لیکن آج اس نے بلاوجہ ہی اس کا ڈھکنا کھول دیا تھا۔

اس میں بہت کچھ تھا۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار بظاہر فالتو چیزیں تھیں لیکن انہیں ایک نظر

دیکھتے ہی ماہ بانو کو احساس ہو گیا تھا کہ درحقیقت ان میں ایک چیز بھی فالتو نہیں تھی۔ وہ سب کسی کے دیئے ہوئے تحفے تھے' سوکھے پھول' پرفیوم کی خالی شیشیاں' ایک لفافے میں بند کچھ کاغذوں کی راکھ' کانچ کی بے شمار ٹوٹی ہوئی چوڑیاں' نیلے رنگ کا مردانہ قمیص کا ایک بٹن' ہار پنوں کے چند ٹوٹے ہوئے سنہری گھنگھرو' گلے میں پہننے والی سونے کی زنجیر کی چند کڑیاں اور ان سب کے نیچے بچھی ہوئی سرخ رنگ کی اوڑھنی جواب اُڑی اُڑی گلابی رنگت اختیار کر چکی تھی۔

اس نے صندوقچی کو چارپائی پر الٹ دیا۔ ان سب چیزوں کے بعد اوڑھنی کے نیچے سے نکل کر ایک ریشمی کپڑا چارپائی پر گرا۔ ماہ بانو نے اسے اٹھا لیا۔ شاید کبھی وہ سفید رنگ کا کپڑا رہا ہو لیکن اب اس میں پیلاہٹ نمایاں تھی۔ اس کے ایک کونے میں اُڑی ہوئی رنگت والے سرخ دھاگے سے انگریزی کے دو حروف بھی کڑھے ہوئے تھے۔

''زیڈ اینڈ ایچ (Z and H)'' ماہ بانو زیرلب بولی۔ ''زیڈ سے تو زرینہ خالہ کا نام بن گیا' یہ ایچ کون ہے؟''

اسے یوں لگا جیسے وہ کسی کی زندگی میں جھانک رہی ہے' جیسے کچھ چوری کر رہی ہے لیکن ان کیفیات سے زیادہ سنسنی خیز محسوسات دوسرے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی کہانی چپکے چپکے اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہے' جیسے کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس میں اسے' ماہ بانو کو مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہ میں اپنے کالج کی سرخ اینٹوں سے بنی عمارت گھومنے لگی۔ سفید روشن مسجد کے مینار اسے کچھ اشارہ دے رہے تھے۔ رجب علی شاہ کی حویلی اسے آواز دے کر بلا رہی تھی۔

وہ جو بھی کہانی تھی اس کا تعلق انہی جگہوں سے تھا۔ کالج کی سرخ اینٹوں' مسجد کے سفید میناروں اور رجب علی شاہ کی قلعہ نما حویلی کی اونچی اونچی دیواروں سے۔

''زرینہ خالہ کی کہانی میں میرا کردار کہاں فٹ ہوتا ہے؟'' ماہ بانو سوچ رہی تھی۔

''بانو!'' کمرے کے باہر سے اماں کی آواز آئی۔

ماہ بانو نے جلدی جلدی سب چیزیں صندوقچی میں رکھنا شروع کیں۔

''بانو!'' اماں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھیں۔

ماہ بانو کے صندوقچی میں چیزیں واپس رکھتے ہوئے ہاتھ خود بخود رک گئے۔

اماں کی نگاہ کھلی ہوئی صندوقچی پر پڑی تو ایک لحظہ کے لیے ان کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا پھر وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

''میرے منع کرنے کے باوجود تم نے صندوقچی کیوں کھولی؟'' وہ چند قدم آگے بڑھ آئیں۔

''یونہی بلاوجہ۔'' اس نے باقی چیزیں بھی جلدی سے واپس رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا۔

"کسی انسان کا ماضی کھنگالنے سے صرف دکھ اور غم ملتا ہے۔" اماں نے صندوقچی اٹھا کر واپس الماری میں رکھ دی۔ "خاص کر ایسے شخص کا جسے مرے ہوئے بھی کئی سال بیت گئے ہوں۔"

"اماں! زرینہ خالہ کو انگریزی آتی تھی؟"

اماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ پھر انہوں نے خود پر بہت قابو پا کر کہا۔

"نہیں۔"

"تو پھر اس رومال پر......"

"ہمیں کسی کا ماضی کھولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" اماں نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن میں اس کہانی کا ایک کردار ہوں۔" اس کے اندر کوئی چلایا۔ "مجھے یہ سب کچھ جاننے کا حق حاصل ہے۔"

"اماں۔" اس نے انہیں پکارا۔

"کیا بات ہے؟"

"اگر اس کے پیچھے کوئی کہانی ہے تو بتا دینے میں کیا حرج ہے اور پھر میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"تم تھکی ہوئی ہو سو جاؤ۔" اماں کمرے سے باہر نکلنے لگیں۔

"پلیز اماں۔" اس نے لپک کر ان کا بازو پکڑ لیا۔

"تم کیوں جاننا چاہتی ہو یہ سب کچھ؟ اس میں دکھ اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں ہے اور تم تو شاید یہ دکھ محسوس بھی نہ کر سکو کیونکہ تم نے زرینہ کو دیکھا نہیں تھا' اس وقت جب اس کی آنکھیں ہر وقت ہنستی رہتی تھیں اور نہ اس وقت جب تقدیر نے آنسو اس کا مقدر بنا دیئے تھے۔"

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کہانی کو سننے کو میری آرزو نہیں بہت اندر سے پھوٹ رہی ہو۔" ماہ بانو نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "جیسے یہ کہانی آپ کی نہیں میری زندگی کا حصہ ہو اور اسے جاننے کا مجھے پورا پورا حق حاصل ہو۔"

اماں نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں اور وقت کا پہیہ چوبیس سال پیچھے چلنے لگا۔

☆=====☆=====☆

یہ کہانی چوبیس برس پیشتر تب شروع ہوئی تھی' جب پیر صاحب جلال الدین کے بڑے بیٹے اور گدی نشین رجب علی شاہ اپنے چھوٹے بھائی حیدر علی شاہ کے ساتھ برطانیہ سے پاکستان لوٹے تھے اور ان کی واپسی کی خوشی میں ان کی والدہ نذری بیگم نے حویلی میں ختم قرآن پاک کا

اہتمام کر رکھا تھا۔ گاؤں میں کوئی دینی یا سماجی تقریب مولوی نعمت اللہ اور ان کے گھرانے کی شمولیت کے بغیر انجام پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سو اس دن بھی حویلی میں ان کا جانا ضروری تھا۔

"جلدی کرو' حویلی سے تانگہ کب کا آیا کھڑا ہے اور کتنی دیر لگاؤ گی؟" مولوی صاحب نے حجرے میں داخل ہو کر دریافت کیا۔

"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" رضیہ بولی۔ "اب تو بخار بھی بڑھ گیا ہے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ابا جی کہ ہم پیر صاحب سے معذرت کر لیں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' ان کے ہم پر اور ہمارے گھر پر بے شمار احسانات ہیں۔"

"لیکن ابا جی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میری فکر نہ کرو۔ یونہی موسم کی تبدیلی سے بخار ہو گیا ہے۔ شام تک بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔" اماں نے کہا۔ "تم دونوں اپنے ابا کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"آپ کو ایسے چھوڑ کر جانے کے لیے دل نہیں مانتا۔" رضیہ بولی۔

اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "زرینہ ایسا کرو کہ تم میرے ساتھ آ جاؤ اور رضیہ تم اپنی ماں کی دیکھ بھال کرو۔"

حویلی کے زنانہ میں بے شمار عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور قرآن پاک پڑھنے کے ساتھ ساتھ گاؤں کے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی کر رہی تھیں۔

"سنا ہے بخشو موچی کی بیٹی ریاضے کے ساتھ بھاگتے ہوئے پکڑی گئی۔ باپ نے بہت مارا بیٹی کو لیکن پھر عزت کے ڈر سے بات چھپا دی گئی۔"

"ہاں' پرسوں رات لڑکی کے رونے چیخنے کی آوازیں میرے گھر بھی آ رہی تھیں۔ ارے میرا گھر کون سا دور ہے کہ یہ باتیں چھپی رہیں۔ ایک دیوار نہ سہی' پر سب سے قریب تو میرا ہی گھر ہے ناں' اچھی بھلی لڑکی پر اس لفنگے نے نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔"

"تعلیم تو بی بی خراب ہی کرتی ہے' اب اس ریاضے کو ہی دیکھ لو' پوری پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی ہیں' بس پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سارا وقت فیشن میں برباد' بالوں میں تیل لگائے آنکھوں میں سرمہ ڈالے کرمو پان والے کی دکان کے سامنے کھڑا ہر آئی گئی عورت کو تاکتا پھرتا ہے۔ میری توبہ جو میں اپنے بیٹے کو پڑھانے کا سوچوں بھی۔"

"ہاں بہن' اچھی بھلی اولاد ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔" ایک اور نے آہ بھری۔

"یہ سب قسمت کی بات ہے۔ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے کہ پڑھ لکھ کر اولاد ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب پیر صاحب کو ہی دیکھ لو۔ دونوں بیٹے ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں۔ جب ولایت جانے لگے تھے تو ڈھکے چھپے سب نے کہا تھا کہ اپنے ساتھ میمیں لے کر ہی لوٹیں

گئے' پھر پیر صاحب کے بڑے بیٹے کے متعلق لوگوں نے کیا کیا نہ کہا کہ وہاں میموں میں گھرا رہتا ہے۔ یہ بھی کہا کہ ایک چٹی چمڑی والی سے شادی بھی کر لی ہے لیکن دیکھ لو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی خالی لوٹ آئے۔ حالانکہ ساری عمر ولایت ہی میں گزاری ہے دونوں نے۔"

"اب تم ہماری اولاد کو پیر صاحب کی اولاد سے تو نہ ملاؤ۔" ایک بولی۔ "پیر صاحب کی اولاد ہم عام لوگوں کی اولاد جیسی تو نہیں ہے۔ ہم اُمتی بھلا کب مقابلہ کر سکتے ہیں ان کا۔"

"اے ہے' حلق کیسا سوکھا پڑ رہا ہے۔ زرینہ بیٹا ذرا دو گھونٹ پانی تو لا دے کہیں سے۔" چاچی نوراں نے گلے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بہت پیاس لگتی ہے چاچی کو۔" زرینہ سوچتی ہوئی اٹھی۔ "ابھی روح افزا کا پورا جگ حلق میں انڈیل بیٹھی ہے پھر بھی پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ چپ چاپ بڑے کمرے سے باہر نکل گئی۔ مختلف چھوٹے بڑے کمرے عبور کر کے وہ لان میں پہنچی جہاں گاؤں کی عورتیں ٹب اور حماموں میں روح افزا بنا رہی تھیں۔ ساتھ ہی زمین پر برف کی سلیں رکھی ہوئی تھیں' جن کا پانی دالان میں ہر طرف پھیل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے مٹی سے اٹے' ننگے پاؤں سے وہیں اچھل کود کر رہے تھے۔ ہر طرف کیچڑ کیچڑ ہو رہی تھی۔

زرینہ نے ایک جگ اور گلاس اٹھایا اور واپس پلٹی۔ کمرے کے دروازے سے گزرتے ہوئے اسے ہلکا سا جھٹکا لگا اور سنبھلنے کی کوشش میں شربت سے بھرا ہوا جگ اور شیشے کا گلاس زمین پر گر گئے۔ زرینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کا بڑا سا ریشمی دوپٹا لکڑی کے بھاری دروازے کی کنڈی میں بری طرح اٹکا ہوا تھا اور دروازے کے بیچوں بیچ ایک اجنبی کھڑا دلچسپی سے اس کی بوکھلاہٹ دیکھ رہا تھا۔ زنان خانے میں ایک مرد کو دیکھ کر اس کی بوکھلاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر قالین میں جذب ہوتے شربت اور بکھرے ہوئے شیشوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اٹکے ہوئے دوپٹے کی جانب۔ وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ پہلے کیا کرے۔ دوپٹے کو کنڈی سے نکالے یا فرش پر بکھرے ہوئے شیشے جمع کرنا شروع کر دے۔ اچھی بھلی عقل اس وقت پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔

"میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" اجنبی نے مہذب انداز میں پوچھا۔

"نہیں' ہاں۔" وہ مزید بوکھلا گئی۔ "میرا مطلب ہے کہ......"

اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔"

وہ آگے بڑھا اور اس کے دوپٹے کا کنڈی میں اٹکا ہوا سرا تھام لیا۔ زرینہ کو اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے جلدی سے دوپٹے کو کھینچ لیا۔ چرر کی آواز کے ساتھ دوپٹا پھٹا اور کنڈی کی قید سے آزاد ہو گیا۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔

لیکن زرینہ اس کی بات کو سنی اَن سنی کر کے وہاں سے بھاگ آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی جوان اجنبی مرد سے یوں براہِ راست بات کی تھی۔

گاؤں میں دو چار ہی تو گھر تھے' جہاں سختی سے پردے کی پابندی کی جاتی تھی اور مولوی نعمت اللہ کا گھرانہ انہی میں سے ایک تھا۔ ان کے ہاں بے پردگی سخت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ کجا یہ کہ کوئی اجنبی' مولوی صاحب کی کسی بیٹی کا دوپٹا پکڑ لے۔

گھر آ کر بھی وہ گم صُم ہی رہی۔ اس کے لیے یہ سب بہت حیران کن اور بہت انوکھا تجربہ تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی ایک خوش باش لڑکی تھی۔ اماں' ابا' رضیہ اور چند سہیلیاں اس کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔

پھر آج یہ کیا ہوا تھا؟ وہ اجنبی اس کی آنکھوں سے جھانکتی دلچسپی' اس کی مسکراہٹ' وہ اس کا زرینہ کو مدد کی پیشکش کرنا اور دوپٹا کنڈی سے نکالنے کے لیے اس کا سرا تھامنا اور پھر زرینہ کا جلدی سے دوپٹا کھینچ لینا۔

وہ دوپٹے کا پھٹا ہوا سرا ہاتھ میں پکڑے بیٹھی یہی کچھ سوچ رہی تھی' جب رضیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کہاں گم ہو؟"

"کہیں نہیں۔" وہ بوکھلا گئی۔ یوں لگا جیسے رضیہ نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کے پھٹے ہوئے سرے کو مٹھی میں بند کر لیا۔

"یہ دوپٹا کیسے پھٹ گیا؟" رضیہ نے اسے پھٹے ہوئے دوپٹے کو مٹھی میں بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"پتا نہیں' میرا مطلب یہ کہ ایسے ہی مجھے نہیں پتا۔" وہ گھبراہٹ میں بے ربطی سے بولی۔

"یعنی دوپٹا پھٹ گیا اور تمہیں خبر نہیں ہوئی۔" رضیہ نے حیرت سے کہا۔ "جانتی ہو کتنا مہنگا دوپٹا ہے۔"

"ہاں نہیں مجھے نہیں پتا چلا' معلوم نہیں کیسے پھٹ گیا۔" زرینہ نے نگاہیں چرائیں۔

"کیا بات ہے؟ لگتا ہے تم کچھ چھپا رہی ہو۔" رضیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں تو۔" اس نے اضطراب سے انگلیاں چٹخائیں۔

"تو پھر اتنی گم صُم کیوں ہو۔ جب سے آئی ہو خاموش بیٹھی ہوئی ہو۔ نہ وہاں کے قصے' نہ کوئی کہانی' نہ یہ بتایا...... کہ کس نے کیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے' نہ یہ کہ کس کس نے اماں کا احوال پوچھا۔"

"سب پوچھ رہے تھے اماں کو۔" وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں سب ہی۔"

''کوئی بات تو ہے۔ چلو تم نہ بتانا چاہو تو میں پوچھ کر کیا کروں گی۔'' رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی تو زرینہ نے سکون کا سانس لیا۔

☆======☆======☆

وہ کوئی عام سی لڑکی تھی یا بادِ صبا کا جھونکا' وہ حُسن تھی' خوشبو تھی' چٹکی ہوئی' بلوریں چاندنی میں مسکراتی ہوئی موتیے کی کلی تھی۔ وہ مہرِ تاباں' وہ ماہِ کامل' وہ بہار شمائل' وہ پری وِش مجسم غزل تھی۔ جب سے حیدر علی شاہ نے اسے دیکھا تھا۔ تب سے وہ اس کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ وہ حیدر علی شاہ جو برسوں ولایت میں گزار کر آیا تھا' جس نے سورج کی کرنوں سی بالوں والیوں کے ساتھ بہت سے غیر سنجیدہ معاشقے بھی کیے تھے' جو کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا اور پہلی نظر کی محبت کو سچ ماننے والوں کا خوب مذاق اڑایا کرتا تھا اور جسے اپنی وجاہت پر اس قدر ناز تھا کہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے آج تک کسی لڑکی کی طرف خود پیش قدمی نہیں کی' اس کے باوجود اس کا کوئی بھی ویک اینڈ تنہا نہیں گزرتا۔

آج وہی حیدر علی شاہ گاؤں کی ایک عام سی لڑکی کو دیکھ کر سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ وہ بار بار خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ محض وقتی جذبہ ہے جو آپ ہی آپ' آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا لیکن اس کی ہر دلیل کے جواب میں اس کے کہیں بہت اندر سے تمسخر آمیز ہنسی کی صدا آنے لگتی تھی۔

''ٹھیک ہے وہ حسین ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹا ہوا خود کو سمجھا رہا تھا۔ ''ہاں اس کی رنگت بھی شہد سے گندھی ہوئی لگتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس کے بال لانبے اور سیاہ ہیں' یہ بھی غلط نہیں ہے کہ اس کی شربتی آنکھیں ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد اور کچھ بھی دیکھنے کی آرزو نہیں رہتی' لیکن اس کے علاوہ کیا ہے اس میں؟ کچھ بھی نہیں۔

وہ یقیناً تعلیم یافتہ نہیں ہوگی۔ ایک نمبر کٹ گیا۔ وہ مہذب بھی نہیں ہے ورنہ میری پیشکش کے بعد یوں اپنا دوپٹا نہ پھاڑتی۔ ایک اور نمبر کٹ گیا۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے' جیسا کہ مجھے یقین ہے تو پھر اس سے سنجیدہ قسم کے عشق کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ تو وہ میرے ساتھ شیکسپیئر پر بحث کر سکتی ہے اور نہ ہی شیلے کے Ode To The West Wind پر۔ اسے تو کیٹس کے نام کا بھی علم نہیں ہوگا اور اگر اسے بائرن کے حالاتِ زندگی کا علم ہو گیا تو مجھے یقین ہے کہ وہیں پٹ سے گر کے ہی اور مر جائے گی۔ یعنی باقی سب نمبر بھی کٹ گئے۔

بھلا ایسی لڑکی سے کوئی سنجیدہ یا غیر سنجیدہ عشق کرنے سے بڑھ کر بھی کوئی Waste Of Time ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق تھوڑا بہت سوچنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انگلینڈ میں شرم و حیا کے یہ نظارے کم یاب ہی نہیں نایاب ہیں۔ اس کی جگہ یہاں کی کوئی بھی لڑکی ہوتی تو اس کا ردِعمل بھی یقیناً یہی ہوتا اور نہ جانے کتنی ہی اور کتنی لڑکیوں سے میری ملاقات بھی ہو جائے۔

ظاہر ہے' میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تو عشق کر نہیں سکتا اور پھر حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی محنت یہاں کی لڑکیوں سے عشق کرنے کے لیے درکار ہوگی۔ کم از کم میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں فارغ وقت میں ایما' جوڈی اور کیٹی کی تصویریں دیکھ کر خوش ہو جایا کروں۔''

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونک اٹھا۔ آنے والا اس کا بڑا بھائی رجب علی شاہ تھا۔ دونوں بھائیوں کی عمر میں بارہ سال کا فرق تھا۔ رجب علی شاہ پیر صاحب کا بڑا بیٹا اور گدی نشین تھا۔ اس کے بعد دو بہنیں زیب النساء اور مہر النساء تھیں۔ پھر حیدر علی شاہ اور اس سے دس برس چھوٹا سخاوت علی شاہ تھا۔ عمر کے اس تفاوت کی وجہ سے حیدر علی شاہ بڑے بھائی کے سامنے ہمیشہ مؤدب رہتا تھا۔

''آیئے۔'' حیدر علی نے مسہری سے اٹھ کر بڑے بھائی کا استقبال کیا۔

''کہو دل لگ گیا یہاں؟''

''آہستہ آہستہ لگ ہی جائے گا۔'' حیدر علی نے کہا۔

''دل لگانے کے سامان کی رئیس زادوں کو کوئی کمی نہیں ہوتی۔ خواہ وہ ولایت ہو یا پاکستان۔'' رجب علی بولا۔ ''بس ایک بات یاد رہے کہ دل لگاؤ دل کو نہ لگاؤ۔ میں اسی لیے بور نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں بھی ہر چیز دستیاب ہے۔''

''نہیں' مجھے ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' حیدر علی نے قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

گو کہ اس کا کوئی ویک اینڈ تنہا نہیں گزرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی تنہائی کی ساتھی ہفتے کے روز ڈنر کرنے کے بعد ''بائے'' کہہ کر چلتی بنتی تھی اور اگر وہ جانے کے موڈ میں نہیں ہوتی تھی تو حیدر علی کسی نہ کسی ترکیب سے اس سے جان چھڑا لیتا تھا۔ اس لیے اس کا کوئی بھی عشق زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

ولایت میں رجب علی شاہ کی اپنی ایک دنیا تھی۔ اسے اس بات کی خبر نہیں تھی اور نہ ہی وہ جاننا چاہتا تھا کہ حیدر علی شاہ کیا کر رہا ہے۔ کہنے کو تو وہ پیر صاحب جلال الدین شاہ سے یہ کہہ کر ولایت میں رہ رہا تھا کہ اس طرح حیدر علی کی دیکھ بھال ہو سکے گی لیکن درحقیقت اسے نہ تو بھائی کی دیکھ بھال سے کوئی سروکار تھا اور نہ اس کی تعلیم سے۔

''اس طرح یہاں کیسے رہ سکو گے تم؟'' رجب علی شاہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''رہ لوں گا۔'' وہ بولا۔ ''بس ایک بات کی اجازت درکار ہے؟''

''کہو۔''

''کیا میں یہاں فوٹو گرافی کر سکتا ہوں؟''

رجب علی شاہ کا قہقہہ بلند ہوا۔

''بس اتنی بے ضرر سی خواہش؟'' اس نے کہا۔ ''اگر کسی اچھی سی لڑکی کی تصویر کھینچو تو مجھے ضرور دکھانا۔''

☆======☆======☆

زرینہ اور رضیہ' خالہ کبریٰ کے گھر جانے کے لیے تیار بیٹھی اچھو کوچوان کا انتظار کر رہی تھیں۔

''اب تک اچھو کو آ جانا چاہیے تھا۔'' رضیہ نے کہا۔ ''اسی لیے اسے رات کو کہلا دیا تھا' اس طرح تو دیر ہو جائے گی۔''

''تھوڑی دیر دیکھتے ہیں' نہ آیا تو پھر مسجد سے کسی بچے کو بھیج کر پتا کروالیں گے۔'' زرینہ نے مشورہ دیا۔

ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ ایک بچے نے حجرے کے دروازے پر آ کر آواز لگائی۔

''باجی! اچھو آ گیا ہے۔''

''اچھا!''

ان دونوں نے برقعے پہنے اور اماں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئیں۔

''سلام بی بی!'' انہیں آتا دیکھ کر اچھو نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا پھر اپنے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''آج راجہ کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی' میں نے کہا کہ مولوی صاحب سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ صبح ضرور آؤں گا' اس لیے سوچا کہ آپ لوگوں کو شہر میں چھوڑ کر ڈنگر ڈاکٹر کو دکھانے لے جاؤں گا اپنے راجہ کو۔''

''بھائی اگر راجہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اطلاع بھجوا دی ہوتی' کوئی ضروری تو نہیں تھا آج خالہ کبریٰ کے گھر جانا' کل چلے جاتے۔'' رضیہ نے کہا۔

''نہ بی بی نہ۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مولوی صاحب سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتے اور پھر خالہ جی بھی تو آپ کا انتظار کرتی ہیں ناں آج کے دن۔''

وہ دونوں تانگے کی پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئیں اور گھوڑا ہولے ہولے چلنے لگا۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ خالہ کبریٰ ساتھ والے گاؤں میں رہتی تھیں۔ بے چاری بیوہ تھیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر دی تھی اور دونوں اپنے اپنے میاں کے ساتھ شہر میں رہ رہی تھیں۔ ایک بیٹا تھا سو وہ کمائی کی غرض سے کراچی چلا گیا تھا اور خالہ کبریٰ بالکل اکیلی ہو گئی تھیں۔ رضیہ اور زرینہ ہفتے میں ایک بار ان کی طرف چکر لگا لیا کرتی تھیں۔ دن بتاتیں اور ان کا بکھرا ہوا کام نمٹا کر شام کو چلی آتی تھیں۔

ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان تانگہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جب اچھو نے ایک دم لگا میں کھینچ کر گھوڑا روکا اور تانگے سے نیچے اتر آیا۔

''کیا ہوا اچھو؟'' رضیہ نے پیچھے دیکھا۔

''بس بی بی! ایک منٹ۔'' وہ بولا۔ ''چھوٹے شاہ صاحب آ رہے ہیں انہیں ذرا سلام کر لوں تو پھر چلتے ہیں۔''

''یہ وہی شاہ صاحب تو نہیں جو ولایت سے آئے ہیں؟'' رضیہ نے منہ قدرے موڑ کر تنگ راستے کی طرف دیکھا۔

''مجھے کیا خبر؟'' زرینہ بے پروائی سے بولی۔

''لگتے تو وہی ہیں...... دیکھو گلے میں ولایتی کیمرا لٹکایا ہوا ہے اور پتلون قمیص پہن رکھی ہے۔'' رضیہ نے متجسس نظروں سے اسے دیکھا پھر زرینہ کو بے پروا پا کر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر متوجہ کیا۔ ''دیکھو ناں۔''

زرینہ نے بھی منہ موڑا۔ سامنے وہی حویلی والا چلا آ رہا تھا۔ رضیہ کے ہاتھ پر زرینہ کی گرفت خواہ مخواہ مضبوط ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟'' رضیہ نے اس کے ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے کہا۔

لیکن زرینہ نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ اس کو دیکھ رہی تھی جو دو رویہ کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر پیدل چلا آ رہا تھا اور جسے سلام کرنے کے لیے اچھو نے تانگہ روکا تھا۔ اسے قریب آتا دیکھ کر اچھو دوڑ کر اس کی جانب بڑھا۔ زرینہ کو چند دن قبل کی اپنی بوکھلاہٹ یاد آ گئی۔ گاؤں کے عام گنوار سے غیر مہذب لڑکے اسے بالکل پسند نہیں تھے' جو بالوں میں تیل لگائے آنکھوں سے بھی باہر سرمے کی دھار نکالے' گردن کے گرد رنگین مفلر لپیٹے' کرمو پان والے کی دکان پر کھڑے ہو کر آئی گئی لڑکی کو تاکتے پھرتے تھے۔ دوسری جانب یہ حویلی والا تھا۔ اچھو کہہ رہا تھا کہ یہ چھوٹے شاہ صاحب ہیں۔ کتنا بانکا سجیلا تھا وہ اور کس قدر مہذب۔ پتا نہیں وہ اس دن زنان خانے میں کیا کر رہا تھا۔ زرینہ کو اس کی آنکھوں میں موجود دلچسپی یاد آئی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

رضیہ نے اسے یوں گم صم بیٹھا دیکھا تو ٹہوکا دیا۔ ''تمہیں ہوا کیا ہے؟''

''آں...... ہاں۔'' وہ جیسے واپس اس دنیا میں لوٹ آئی۔ ''نہیں تو کچھ نہیں ہوا۔''

''مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟'' رضیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کچھ ہو بھی تو بتانے کو۔'' اس نے نگاہیں چرا لیں۔

''ہے تو سہی کچھ' لیکن تم بتانا نہیں چاہ رہیں۔''

''ہے تو نہیں' کاش کچھ ہو جائے۔'' زرینہ نے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھ کر

سوچا۔

اچھو واپس تانگے میں آ بیٹھا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر آہستہ آہستہ اسی راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ چھوٹے شاہ صاحب دور ہوتے گئے حتیٰ کہ موڑ مڑنے کے بعد وہ زرینہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

خالہ کبریٰ حسب معمول گھر میں اکیلی تھیں اور دو دن سے بخار میں پھنک رہی تھیں۔

''ہائے خالہ جی آپ نے اطلاع بھجوا دی ہوتی۔'' رضیہ انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ''کیا حال ہو گیا ہے آپ کا۔''

''بیٹا کس سے کہتی۔ ایک تو یہ گھر بھی گاؤں کے باقی گھروں سے دور ہے۔ دو چار دن میں ایک مرتبہ کوئی نہ کوئی پوچھنے آ جاتا ہے' لیکن روز روز تو کوئی مجھ بڈھی کے لیے اپنے کام کا حرج نہیں کر سکتا ناں۔''

''خالہ! اسی لیے کہتی ہوں صفدر بھائی کی شادی کر دیں۔'' زرینہ بھی برقع اتار کر ان کے قریب آ بیٹھی۔ ''بہو آ جائے گی تو کچھ خیال تو رکھا کرے گی آپ کا۔''

''لے پگلی' بہو آ گئی تو کیا میرے ساتھ رہے گی؟ ظاہر ہے اسے صفدر کے ساتھ رہنا ہو گا۔''

''تو خالہ آپ بھی ساتھ چلی جانا ان دونوں کے۔''

''اس جگہ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ ہزار بار کہا ہے صفدر سے کہ واپس آ جائے۔ اچھا بھلا نوکر تھا یہاں پیر صاحب کے پاس پتا نہیں کیا آئی جی میں کہ کراچی چلا گیا۔ اچھی بھلی آمدنی ہو جاتی تھی یہاں۔ گندم بھی فصل کے فصل مل جاتی تھی لیکن بیٹی جس جوان لڑکے کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو اسے من مانی کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ میں مر گئی تو کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی۔ پتا نہیں کتنے دن لاش پڑی سڑتی رہے گی۔''

''اللہ نہ کرے خالہ جی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔'' رضیہ نے جھرجھری لی۔ ''چلیں میں آپ کو حکیم صاحب کے پاس لے چلتی ہوں۔''

''نہ بیٹی' زرینہ اکیلی رہ جائے گی گھر پر۔''

''خالہ جی آپ فکر نہ کریں۔ یہاں کس نے آنا ہے پھر اپنا ہی گاؤں ہے' یہ سب جانتے ہیں ہمیں۔''

''بچیوں کی فکر تو ہر وقت رہتی ہے چاہے کتنی بھی اپنی جگہ کیوں نہ ہو۔'' خالہ کبریٰ نے کہا۔

''ارے خالہ رہنے بھی دیں میں نہیں جانتی کیا' سب علاج نہ کرانے کے بہانے ہیں۔'' رضیہ بولی۔ ''چلیں اٹھیں۔''

پھر وہ تقریباً زبردستی انہیں اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی۔ زرینہ گھر کے کام کاج میں لگ

گئی۔ گھر میں کام تھا ہی کتنا۔ ایک جان تھی خالہ کی' اس نے جلدی جلدی صفائی کی۔ کپڑے دھوئے' مرغیوں کو دانا ڈالا اور ہنڈیا پکا کر فارغ ہو گئی۔

''اب تک آ جانا چاہیے تھا خالہ کو۔'' زرینہ نے سوچا۔ ''خدا جانے اتنی دیر کیوں کر دی۔'' انہیں گئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ دھوپ میں تیزی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی۔ اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ تیزی سے لپک کر گئی اور کنڈی اتار کر دروازہ کھول دیا۔

''کتنی دیر کر دی تم نے۔'' لیکن جب سامنے رضیہ اور خالہ کے بجائے اس نے اسی حویلی والے چھوٹے شاہ جی کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو کر رہ گئی۔

وہ بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔ گلابی رنگ کے کرتا شلوار پر دوپٹے سے بے نیاز' اپنے لانبے سیاہ بالوں کی چوٹی آگے ڈالے ہوئے گم صم کھڑی وہ لڑکی۔

اور پھر اچانک یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ زرینہ نے پیچھے ہٹ کر جھپاک سے دروازہ بند کر دیا اور اس سے کمر ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔

''بی بی! میں مسافر ہوں' کیا تھوڑا سا پانی مل سکتا ہے؟''

وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دے۔ چند منٹ بعد ایک بار پھر دستک ہوئی۔

''وہ بے چارا خدا جانے کتنا پیاسا ہو گا۔'' زرینہ نے سوچا۔ ''کیا میں اسے ایک گلاس پانی بھی نہیں دے سکتی۔'' پھر وہ جلدی سے بولی۔ ''ایک منٹ ٹھہریں۔'' اور پانی لینے چلی گئی۔

جالی کی الماری سے اس نے المونیم کا گلاس نکالا اور پانی سے بھری صراحی اٹھا کر ڈیوڑھی کی طرف چل پڑی۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر سیاہ ریشمی چادر اوڑھتے ہوئے اسے خیال آیا۔

''حویلی میں کھانے پینے کے اتنے عمدہ برتن ہیں' پتا نہیں وہ اس گلاس میں پانی پینا پسند بھی کریں یا نہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ برا مان جائیں اور پانی پیے بغیر ہی چلے جائیں۔''

اور حیدر علی شاہ کا پانی پیے بغیر چلے جانا زرینہ کے لیے خاصی تکلیف دہ بات ہوتی۔

''پھر کیا کروں؟'' یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گئی۔ خالہ کبریٰ کے گھر شیشے کا ایک برتن بھی نہیں تھا اور چاندی کے جو چند برتن تھے' وہ صفدر نے کراچی جانے سے قبل اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے بیچ دیئے تھے۔

دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔ وہ اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ اس نے المونیم کا گلاس وہیں ایک کونے میں پھینک دیا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر صراحی والا ہاتھ باہر

بڑھا دیا۔

''کیا کوئی گلاس بھی مل سکتا ہے؟''

''نہیں ہے جی۔'' زرینہ نے دروازے کی جھری سے باہر جھانکا۔

''تو پھر اس صراحی سے پانی پینے کا طریقہ بھی بتا دیں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''مجھے پتا نہیں۔'' وہ گھبرا گئی کہ کہیں وہ پانی پیے بغیر ہی نہ چلا جائے۔

''ایک طریقہ ہے لیکن وہ آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔''

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''میں اوک بنا لیتا ہوں' آپ اوپر سے پانی گراتی جائیں۔'' پھر اس کی خاموشی محسوس کر کے چند لمحے کے توقف سے بولا۔ ''ایک مسافر پر اتنا احسان بھی نہیں کریں گی؟''

اس نے جلدی سے سیاہ ریشمی چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی اور پھر اسی چادر سے آنکھوں کے سوا پورا چہرہ بھی ڈھانپ لیا اور دروازے کی اوٹ سے باہر نکل آئی۔

''یہ لیں۔'' حیدر علی نے صراحی اس کی طرف بڑھائی۔ اس کی نظریں زرینہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اس نے چپ چاپ صراحی تھام کر پانی ٹپکانا شروع کیا۔ وہ اوک بنا کر پیتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی پی کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''شکریہ۔'' اس نے کہا۔

زرینہ چپ چاپ واپس مڑنے لگی۔

''سنیے۔''

حیدر علی شاہ کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''اپنا نام تو بتاتی جائیں۔''

زرینہ کی شربتی' حیرت سے بھرپور آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''کیا کریں گے جان کر؟''

''کسی کی ذات کے اندر اترنے کے لیے سب سے پہلے تعارف کی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے اور تعارف کی ابتدا نام سے ہوتی ہے۔''

زرینہ ہولے سے ہنس پڑی۔

حیدر علی شاہ کو یوں لگا گویا کائنات ہنسی کی جلترنگ سے گونج اٹھی ہو۔ وہ ہنستی تو سیاہ ریشمی چادر کے حصار میں موجود اس کی دونوں آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

''روشنی' ہوا' خوشبو اگر ان کے یہ نام نہ ہوتے تب بھی ان کا وجود مکمل تھا' تب بھی انہیں محسوس کیا جا سکتا تھا۔'' وہ بولی۔ ''پھر نام میں کیا رکھا ہے؟''

''کیا آپ نے شیکسپیئر کو پڑھ رکھا ہے؟'' حیدر علی کے انداز میں تحیر تھا۔

''وہ کون ہے؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''وہ ایک بہت بڑا انسان تھا۔ بہت سی اچھی باتیں کہی تھیں اس نے۔''

''اچھی بات کہنے کے لیے بڑا ہونا ضروری نہیں' فقط انسان ہونا شرط ہے۔'' وہ پھر واپس مڑنے لگی۔

''سنو۔''

''کہیے۔''

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

''جو آپ کو اچھا لگے۔''

''گوری! کیا پھر ملو گی۔''

''اگر تقدیر نے ملایا تو۔'' اس نے مڑ کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

حیدر علی شاہ رہٹ کے جھر جھر کرتے پانی اور کنوئیں کے گرد گھومتے بیلوں کی ٹن ٹن بجتی گھنٹیوں کے درمیان ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ گوری اندر جا چکی تھی۔ متکلم دروازہ گونگا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے اوپر لٹکی ہوئی کنڈی بھی ساکت تھی۔ وہ گلابی مخروطی ہاتھ جو کچھ دیر پہلے تک کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ شربتی' مسکراتی آنکھیں جنہوں نے زمین و آسمان کو یک دم روشن کر دیا تھا۔ اس سپاٹ دروازے کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں۔ کائنات پھیکی پھیکی لگنے لگی تھی۔ روشنی کے روپہلے رنگ اچانک ہی بجھ گئے تھے اور تیز دھوپ جسم کو جھلسانے لگی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر مڑا اور آہستہ آہستہ کچے راستے پر رواں دواں ہو گیا۔

دروازے کی جھری سے باہر جھانکتی ہوئی زرینہ اسے تب تک دیکھتی رہی۔ جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ غیر محرم تھا اور اس کے متعلق کسی سوچ کو اپنے ذہن میں جگہ دینا گناہ تھا۔ یہی تو اماں نے شروع سے اسے سکھایا تھا' لیکن اس کے متعلق نہ سوچنا کس قدر مشکل کام تھا۔ وہ جو اس کے دل کے دریچے پر دستک دے رہا تھا۔

کتنا مختلف تھا وہ گاؤں کے عام سے لڑکوں سے۔ نہ ان کی طرح تیل سے چمکتے ہوئے بال' نہ آنکھوں میں سرمے کی دھار' نہ گلے میں رنگین مفلر' نہ منہ میں پان اور نہ ہی انگلیوں میں لوفروں کی طرح پکڑا ہوا بگلا برانڈ سگریٹ۔

ہلکے رنگ کی قمیص اور نسبتاً گہرے رنگ کی پتلون پہنے' گلے میں کیمرا لٹکائے پریشان بال' جنہیں بوقت ضرورت وہ انگلیوں سے ہی سنوار لیا کرتا تھا۔ اس میں واقعی کوئی سحر تھا' یا شاید اس کی انفرادیت تھی جو زرینہ کو اس کی جانب کھینچ رہی تھی۔

باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

''ہو نہ ہو یہ رضیہ اور کبریٰ خالہ ہوں گی۔'' اس نے سوچا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن پھر حفظِ ماتقدم کے لیے اس نے پوچھ ہی لیا' کون ہے؟

''میں ہوں۔'' رضیہ کی آواز آئی۔ ''جلدی کھولو' دھوپ نے ستیاناس کر دیا ہمارا۔''

زرینہ نے کنڈی کھول دی۔

''اُف' اُف! ایک تو دھوپ اور گرمی پھر یہ کالا برقع۔ آج اگر ہم سیخ پر لگے ہوتے ناں تو تم تھوڑی دیر میں روٹی کے ساتھ ہمارے سیخ کباب کھا سکتی تھیں۔'' رضیہ نے آتے ہی برقع اتار کر چار پائی پر پھینکا۔ ''ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو پلانا۔''

زرینہ نے کبریٰ خالہ کو سہارا دے کر چار پائی پر بٹھایا اور خود پانی لینے باورچی خانے میں چلی گئی۔ جب وہ صراحی اور گلاس لے کر کمرے میں آئی تو رضیہ زور زور سے خود کو اور خالہ کو پنکھا جھل رہی تھی۔

گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے حیدر علی شاہ کی شبیہ اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ اسے لگا کہ وہ صراحی سے اوک میں پانی ڈالتی جا رہی ہے اور وہ پیتا جا رہا ہے' وقت کی نبض تھم گئی ہے' زمین نے سورج کے گرد گھومنا بند کر دیا ہے اور چاند اپنی جگہ ساکت ہو گیا ہے۔

''گوری کیا پھر ملو گی؟''

اسے محسوس ہوا گویا ہر چیز اس سے یہ سوال پوچھ رہی ہے' گنگنا رہی ہے۔

''گوری کیا پھر ملو گی؟''

صراحی سے جھر جھر گرتا پانی اس سے پوچھ رہا ہے' رہٹ کے بیلوں کے گلے میں ٹن ٹن بجتی ہوئی گھنٹیاں یہ سوال کر رہی ہیں۔ دھان کی لہلہاتی فصل' آہستہ خرام ہوائیں' فضا میں اُڑتی ہوئی چڑیاں اور صحن میں دانا چگتی مرغیاں سب ایک ہی سوال دہرا رہے ہیں' گنگنا رہے ہیں۔

''گوری کیا پھر ملو گی؟''

''ارے...... اے...... اے...... کیا کر رہی ہو؟'' رضیہ کی آواز اسے ہوش و حواس کی دنیا میں کھینچ لائی۔ وہ کھڑے ہو کر اپنے کپڑوں سے پانی کی بوندیں جھاڑ رہی تھی۔

''اوہ! یہ کیا ہوا ہے؟'' زرینہ گھبرا گئی۔

''یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ کیا ہوا' کہاں گم ہو تم؟'' رضیہ جھلا کر بولی۔ ''سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں میرے۔''

''نہ...... نہ یوں نہیں ڈانٹتے۔'' خالہ کبریٰ نے لیٹے لیٹے کہا۔

زرینہ نے جلدی جلدی گلاس پانی سے بھر کر خالہ اور رضیہ کو دیا پھر بات پلٹنے کی غرض سے بولی۔ ''اتنی دیر کر دی آپ لوگوں نے' میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

''شہر سے ڈاکٹر آیا ہوا تھا۔'' خالہ نے بتایا۔ ''رضیہ نے زور لگایا کہ حکیم صاحب کو دکھانے کے بجائے ڈاکٹر کو دکھاؤں' بس وہیں دیر ہو گئی۔ سارا گاؤں امڈ پڑا تھا۔ اتنی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔''

''تو پھر کیا بتایا ڈاکٹر نے؟''

''یہ دوائیں دی ہیں۔'' انہوں نے پاس پڑے ایک خاکی لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دو قسم کی گولیاں ہیں۔ صبح و شام لینی ہیں اور شربت دیا ہے' تین وقت پینے کے لیے۔''

اس نے کن اکھیوں سے رضیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے تیور بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔ واضح طور پر اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں جلدی سے روٹیاں ڈال دوں۔''

روٹیاں پکاتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ رضیہ کو اس راز میں شامل کرے یا نہیں۔ خدا معلوم یہ جان کر اس کا ردِعمل کیا ہو۔ ظاہر ہے' وہ اس کی حوصلہ افزائی تو نہیں کرے گی بلکہ وہ تمام نصیحتیں اس کے سامنے اکٹھا دہرانے لگے گی جو اماں وقتاً فوقتاً انہیں کیا کرتی تھیں۔ خود زرینہ بھی یہ جانتی تھی کہ اس بات کو زیادہ آگے بڑھانا خطرناک ہو گا لیکن پھر بھی اس کے دل کی خواہش تھی کہ یہ بات آگے بڑھ جائے۔ اتنا تو اسے یقین تھا کہ رضیہ یہ بات اماں کو نہیں بتائے گی۔ اماں کیا کسی کو بھی نہیں بتائے گی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اسے روکنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔

باقی سارا دن رضیہ نے اس سے بالکل بات چیت نہیں کی۔ شام کو جب وہ تانگے پر واپس گھر کی طرف رواں دواں تھیں تو زرینہ سے رہا نہ گیا۔

''کیا ہوا رضیہ' تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں۔''

''کیا ضروری ہے کہ تم سے بات کی جائے؟''

''ناراض ہو کیا؟''

''مجھے ناراض ہونے کا بھلا کیا حق ہے۔''

''تو واقعی ناراض ہو؟'' زرینہ بولی۔

رضیہ بغیر کچھ کہے شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں دھان کے کھیتوں کی طرف دیکھتی رہی۔

''وجہ تو بتا دو ناراضگی کی۔'' زرینہ نے ہمت نہیں ہاری۔

''جس طرح تمہارے گم صم رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے' اسی طرح میری ناراضگی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہیں' صرف گھوڑے کے ٹاپوں کی ٹک ٹک سنائی دیتی رہی پھر

بالآخر زرینہ بولی۔

''گھر چل کر میں تمہیں کچھ بتاؤں گی۔''

اماں ابا کو خالہ کی بیماری اور پھر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا بتا کر جب وہ اپنے کمرے میں پہنچیں تو رضیہ...... متوقع نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں لیکن پہلے مجھ سے وعدہ کرو۔''

''کیا؟''

''کہ اماں ابا سے کچھ نہیں کہوگی۔''

''وعدہ۔'' رضیہ نے بلا تامل کہا۔

''اور یہ بھی کہ جو کچھ میں کروں، مجھے اس سے روکو گی نہیں۔''

''یہ عجیب سی بات ہے، ظاہر ہے تم کنوئیں میں چھلانگ لگانے لگو گی تو میں تمہیں کیسے نہیں روکوں گی۔''

''لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں بھلا کیوں کنوئیں میں چھلانگ لگانے لگی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہے تو سہی، کنواں نہ سہی کھائی سہی لیکن پھر بھی تم مجھے روکنا مت۔''

''کنواں ہے یا کھائی، تم کچھ بتاؤ تو سہی۔''

زرینہ چند لمحے سوچ میں گم رہی پھر بولی۔ ''آج چھوٹے شاہ جی ملے تھے ناں راستے میں۔''

''ہاں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ مجھے ان سے محبت ہوگئی ہے۔''

''کیا؟'' رضیہ چلائی۔

''شش! آہستہ۔'' زرینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اماں! ابا آ گئے تو؟''

''کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئیں۔'' رضیہ نے اس کا ہاتھ ہٹا کر تعجب سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

''تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اسے اب تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''ایسی کیا انہونی بات کہہ دی ہے میں نے۔ کیوں نہیں کرسکتی، میں چھوٹے شاہ جی سے محبت؟''

''کہاں ہم غریب لوگ اور کہاں پیر صاحب کا گھرانہ۔ ان کے گھر سے دو وقت کی روٹی نہ آئے تو ہمیں فاقے کرنے پڑیں۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ وہ ہم سے

عزت سے پیش آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان سے برابری شروع کردیں۔''

''عشق نے یہ سب کب دیکھا ہے۔''

''تم پاگل ہو رہی ہو۔ جانتی ہو اماں، ابا کو خبر ہوئی تو کیا ہوگا؟ چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گی اماں تمہاری اور گاؤں میں جو ناک کٹے گی سو الگ، کتنی عزت ہے ابا جی کی یہاں۔ آج تک کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا ان کی جانب، مثالیں دی جاتی ہیں پورے گاؤں میں ہمارے گھرانے کی، اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو کتنا تھو تھو کریں گے سب ہم پر۔'' رضیہ نے کہا۔ ''اور پھر تم چھوٹے شاہ جی کے عشق میں گرفتار ہو۔ تمہیں کیا معلوم وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتے ہوں؟''

''وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں رضیہ۔'' پھر اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی پرچھائیں دیکھ کر بولی۔ ''قسم سے سچ کہہ رہی ہوں۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''مجھے؟'' زرینہ نے کہا۔ ''کچھ باتیں کہنے کے لیے نہیں ہوتیں، صرف محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ کیا تم روشنی کو قید کرسکتی ہو، خوشبو کو مٹھی میں بند کرسکتی ہو؟ ہوا کو چھو سکتی ہو؟ نہیں، تم صرف ان کا وجود محسوس کرتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ یہ چیزیں ہیں، بغیر کسی سے کچھ کہے سنے، لیکن تم ان کے گرد حصار قائم نہیں کرسکتیں۔ محبت بھی روشنی، خوشبو اور ہوا کی طرح ہے، یہ محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہے، زبان جھوٹ بول سکتی ہے لیکن جذبہ جھوٹ نہیں بولتا۔''

''اُف خدایا۔'' رضیہ نے سر پیٹ لیا۔ ''کہیں تم نے کوئی فلم تو نہیں دیکھ لی؟ ایک تو یہ فلم والے سب کے اخلاق برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''فلم؟ ہوش کی...... بات کرو، کبھی سینما جا سکتی ہوں؟'' زرینہ ہنسی۔

''پھر کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

''عشق۔''

''پاگل پن۔''

''عشق پاگل پن کا دوسرا نام ہی تو ہے۔'' وہ پھر ہنسی۔

''اور پھر بھی تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں نہ روکوں۔''

''ہاں، گو کہ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے ضرور روکو گی۔''

''تم چھوٹے شاہ صاحب سے ملی ہو یا بس صرف انہیں آج صبح ہی دیکھا ہے؟''

''میں ان سے ملی ہوں۔''

''کب؟'' رضیہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہاں؟''

''پہلے حویلی میں اور دوسری مرتبہ آج ہی خالہ کبریٰ کے گھر۔'' اور پھر زرینہ نے اسے ہر بات بتادی۔

''میں نہیں مانتی کہ وہ تم پر مرمٹے ہیں۔'' رضیہ نے تبصرے کا آغاز کیا۔ ''وہ ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں۔ ایک سے ایک اچھی خوبصورت لڑکی بھری پڑی ہے وہاں اور پھر انہیں ادائیں بھی خوب آتی ہیں۔ وہاں کی عورتوں کا بھلا ہم کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ تم سے صرف مذاق کر رہے ہوں گے۔ تمہاری حیثیت وقت گزاری کے لیے استعمال ہونے والے کھلونے سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''رضیہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ کیونکہ تم اس جذبے سے آشنا نہیں ہو۔ تم اپنی زندگی کو چند لگے بندھے اصولوں کے تحت گزار رہی ہو۔ تمہارے لیے گناہ وثواب کے قاعدے بہت واضح اور غیر مبہم ہیں۔ میں بھی جانتی ہوں کہ عافیت اسی میں ہے کہ ہم سب اپنی زندگی رہٹ کے بیلوں کی طرح گزار دیں جو آنکھوں پر بندھی پٹی کے ساتھ ایک ہی محور ایک ہی مرکز کے گرد صبح سے شام تک گھومتے رہتے ہیں لیکن رضیہ میں عافیت کی طلب گار نہیں ہوں۔ بہت مشکل لگنے لگا ہے یوں جینا۔''

''تو تم نے چھوٹے شاہ صاحب سے ملنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''نہیں...... لیکن تقدیر نے ملا دیا تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گی۔''

''تم احمق اور بے وقوف ہو۔ زندگی لفظوں کے سہارے نہیں گزر سکتی۔ ذرا سوچو زرینہ پیر صاحب کے گھرانے کی عورتوں کے درمیان تمہاری کیا وقعت' کیا حیثیت ہوگی۔ تمہیں کبھی وہ رتبہ' وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکے گا جو ان سیّد زادوں کو حاصل ہے۔ ہم کون ہیں ان کے سامنے؟ انہی کے ٹکڑوں پر پلنے والے عام سے لوگ۔ یاد رکھو جب تک تم مولوی نعمت اللہ کی بیٹی کی حیثیت سے وہاں آتی جاتی رہو گی تب تک تمہاری قدر بھی ہوگی اور تمہیں عزت بھی ملے گی لیکن جس دن انہیں معلوم ہوا کہ اب تم چھوٹے شاہ صاحب کی محبت میں گرفتار ہو اور ان کی محبوبہ ہو اسی دن تمہاری حیثیت دو کوڑی کی ہو جائے گی ان لوگوں کے سامنے۔ ابھی تم مہر النساء اور زیب النساء بی بی کے برابر بیٹھتی ہو تب تمہیں ان کے پیروں کے پاس بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

''کتنی بے معنی لگنے لگی ہیں یہ باتیں۔'' زرینہ نے ہولے سے کہا۔ ''ایک اگر صرف چھوٹے شاہ جی ساتھ دے دیں تو۔''

''ان کی مت نہیں ماری گئی۔'' رضیہ چڑ کر بولی۔

''اچھا اس وقت تو سو جاؤ۔ بہت نیند آ رہی ہے۔'' زرینہ نے بحث سے بچنے کے لیے کروٹ لے لی۔

اور آنکھیں موندتے ہی حیدر علی شاہ زرینہ کے خوابوں میں چلا آیا۔

''سنیے' اپنا نام تو بتاتی جائیں۔'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

سارا کمرا حیدر علی شاہ کی آوازوں سے بھر گیا۔ ہر طرف سوال جھنجنانے لگے۔ ہر دیوار پوچھنے لگی۔ جھینگر گنگنانے لگے۔

''گوری' کیا پھر ملو گی؟''

وہ مسکرا دی۔ ''کاش مل سکوں۔''

حیدر علی کے چہرے پر امید وبیم کی کیفیت منجمد ہو کر رہ گئی لیکن پھر دروازہ بند ہو گیا اور امید کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی۔ اس کی نگاہ گونگے دروازے پر تھی۔ اگر وہ غور سے دیکھتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس دروازے کی ایک درز اب بھی متکلم تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ واپس پلٹ گیا۔ اور زرینہ یہ سب سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

پھر دن بہت ہولے ہولے گزرنے لگے۔ اس کے دل میں ایک موہوم امید نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

''خالہ کبریٰ کے گھر جاتے ہوئے شاید وہ پھر دکھائی دے جائیں۔''

اور پھر اسی امید پر وہ دن انگلیوں پر گن گن کر گزار رہی تھی۔ سب کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرتے کرتے وہ اچانک کسی سوچ میں کھو جاتی۔ ہوا کی سرسراہٹ تک پر چونک اٹھتی لیکن اس دن تو انتہا ہو گئی۔ جب وہ توے پر روٹی ڈال کر انہی سوچوں میں گم ہو گئی۔

''اُف کیا جلنے کی بو آ رہی ہے۔'' اماں نے ناک سکیڑی۔

''اماں اپنے ہی گھر سے آ رہی ہے۔'' رضیہ پیڑھی سے اٹھی۔ ''میں دیکھتی ہوں۔''

اور توے پر سیاہ روٹی دیکھ کر وہ جھلا اٹھی۔

''یہی حد رہتی تھی۔'' اس نے جلی ہوئی روٹی اٹھا کر پھینک دی۔

''کیا ہوا؟'' زرینہ اسے غصے میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''اچھا روٹی جل گئی۔ ہاں جل گئی۔ شاید لکڑیاں زیادہ ہیں۔ آنچ تیز ہے اس لیے۔''

''آنچ بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے غصہ دبانے کی کوشش کی۔ ''اٹھو مجھے پکانے دو روٹیاں۔''

''نہیں نہیں' میں پکا لیتی ہوں۔''

''کیا ابا اماں کو ایسی جلی ہوئی روٹیاں کھلاؤ گی؟ اٹھو مجھے پکانے دو۔'' اس نے زرینہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

''غلطی ہو گئی۔ اب نہیں کروں گی ایسا۔'' زرینہ نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

رضیہ کا دل پسیج گیا۔ اسے یوں بھی زرینہ سے بے حد محبت تھی۔

''اگر اب روٹی جلی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ اسے دھمکا کر اماں کے پاس چلی آئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ واپس پیڑھی پر بیٹھی تو اماں نے پوچھا۔ ''کیا جلا دیا؟''

''کچھ نہیں اماں آنچ تیز تھی۔ ایک روٹی ذرا سی جل گئی ہے۔''

''ذرا سی جلنے کی اتنی بو پھیلی ہے۔'' اماں بولیں پھر قدرے آگے جھک کر آہستہ سے بولیں۔ ''تم نے کچھ محسوس کیا ہے؟''

''کیا اماں؟ اماں کے رازدارانہ انداز کو دیکھ کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''زرینہ کو کچھ ہوتا نہیں جا رہا۔''

''کچھ نہیں ہوا' اسے کیا ہونا ہے۔'' رضیہ نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''بہت چپ چپ رہنے لگی ہے۔ کھوئی کھوئی سی۔''

''مجھے تو نہیں محسوس ہوا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ہاں کچھ کم گو ہو گئی ہے۔ آپ ہی تو ہر وقت ٹوکتی تھیں کہ لڑکیوں کو اتنا زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔''

''لیکن اس پر اثر کب ہوتا تھا۔''

''اب تو ہو گیا ناں' اب خوش ہو جائیں۔''

''اب میں یہ بھی نہیں کہتی کہ بالکل ہی گم صم ہو جائے وہ۔ مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے اسے یوں چپ چاپ دیکھ کر۔''

رضیہ کو اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اس نے رضیہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اماں ابا کو کچھ نہ بتائے گی اور خود ہی اپنی حرکتوں سے وہ اپنے راز کا اعلان کرتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کی ایسی حرکتیں جاری رہتیں تو کیا اماں کو علم نہ ہو جاتا اصل بات کا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ابا جی کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا تھا لیکن آج اگر اماں نے یہ بات محسوس کر لی تھی تو کل کو اور لوگ بھی بھانپ جاتے۔ ڈھنڈورا تو وہ خود پیٹتی جا رہی تھی۔

''پتا ہے آج اماں مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں؟'' رات کو جب سب کام نمٹا کر وہ اپنے کمرے میں آئیں تو رضیہ بولی۔

''کیا؟'' رضیہ نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہی تھیں کہ تم روز بروز تبدیل ہوتی جا رہی ہو۔ چپ چپ رہنے لگی ہو۔ گم صم ہو گئی ہو۔''

''کیا؟ سچی اماں یہ کہہ رہی تھیں؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔

''جی ہاں اور اگر تمہاری یہی حرکتیں جاری رہیں تو کسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ تمہارا اصل مسئلہ کیا ہے۔''

''لیکن باتیں تو میں اب بھی کرتی ہوں۔''

''ہاں ادھوری ادھوری باتیں'' رضیہ بولی۔ ''اور بعض اوقات تمہیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا

کہ تم کیا بات کر رہی ہو۔''

''میں کیا کروں رضیہ ایسا میں جان بوجھ کر تو نہیں کرتی۔ بس خود بخود ہی ہو جاتا ہے۔ مجھے تو خود بھی خبر نہیں ہوتی۔''

''اسی لیے کہتی ہوں کہ آگ سے کھیلنا بند کرو' اس کھیل میں تمہارا اپنا دامن بھی جل سکتا ہے۔ کسی اور کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آج اماں نے محسوس کیا ہے کل اور لوگ محسوس کریں گے۔ مجھے منع کرتی ہو اور خود ڈھونڈورا پیٹ رہی ہو۔''

''سچی رضیہ سب کو پتا چل جائے گا اس طرح؟''

''اپنے ہاتھوں سے جو اشتہار لگا رہی ہو۔''

''کیا کروں میں۔ یہ اضطراب تب تک ختم نہیں ہو گا جب تک میں ان سے مل نہیں لوں گی۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ پہلے تم نے کہا تھا کہ تم ان سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

''تبھی تو مضطرب ہوں۔'' زرینہ نے کہا۔ ''پتا نہیں تقدیر کب ملاتی ہے اور ملاتی بھی ہے یا نہیں۔''

''مجھے تم نے پریشان کر دیا ہے۔''

''تم نے خواہ مخواہ پریشانی خود پر مسلط کر رکھی ہے۔'' زرینہ بولی۔

''پتا نہیں تم کیا چاہتی ہو...... اور درحقیقت ہو گا کیا۔'' رضیہ نے ہاتھ ملے۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ صبح صبح کیمرا لٹکا کر ساتھ والے گاؤں کی طرف چل دیا۔

''شاید گوری سے ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے۔'' اس نے سوچا۔ ''ہو سکتا ہے دستک کی آواز پر آج بھی وہی دروازہ کھولے اور کل کی طرح کہے۔

''اتنی دیر کر دی تم نے۔''

اور اس ایک فقرے سے کائنات جھوم اٹھے۔ ہاں دیر تو میں نے کر دی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جسے میں لندن کے کلبوں اور ہوٹلوں میں ڈھونڈتا رہا۔ وہ وہاں نہیں پاکستان کے اس دور افتادہ چھوٹے سے گاؤں نیاز پور میں رہتی ہے۔ کتنی سادہ اور معصوم ہے وہ اور ذہین بھی۔ لگتا ہے کچھ پڑھی لکھی بھی ہے۔ بالکل ہی جاہل گنوار نہیں ہے جیسے کہ یہاں کی بہت سی عورتیں حتیٰ کہ مرد بھی ہیں۔ یہاں کی عام عورتوں کے برعکس اس میں رکھ رکھاؤ بھی ہے۔ گفتگو سے اس کی حسنِ جمال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

وہ چلتا ہوا رہٹ تک پہنچ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر سامنے وہ چھوٹا سا مکان تھا جہاں کل اچانک اس کی گوری سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر بوڑھا برگد سوچوں میں گم

کھڑا تھا۔ اس کی جٹائیں شاخوں سے بل کھا کر زمین پر گر رہی تھیں۔ حیدر علی شاہ اس برگد کے نیچے بیٹھ کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔

اس مختصر سے آدھے کچے آدھے پکے مکان پر بلا کا سکوت طاری تھا یوں جیسے وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ سورج آہستہ آہستہ سر پر آ رہا تھا لیکن درخت کی چھاؤں کے نیچے حیدر علی شاہ سورج کی تمازت سے بالکل محفوظ تھا۔ مکان میں زندگی کی پہلی علامت مرغیوں کی صورت میں نمودار ہوئی جو کٹ کٹ کرتی نہ جانے کہاں سے نکلی تھیں اور مکان کے گرد دانہ چگنے لگی تھیں۔

''یہ مرغیاں شاید عقبی دروازے سے نکلی ہیں۔'' حیدر علی نے سوچا۔

وہ برگد کے نیچے بازو کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا اور آنکھیں موندلیں۔ کافی دیر بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی تیزی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر مکان کی طرف چل دیا۔

''ٹھک ٹھک۔'' اس نے دروازے پر دستک دی۔

کچھ دیر کے بعد توقف سے دروازہ کھلا لیکن اس پری جمال نازنین کے بجائے دروازہ ایک بوڑھی عورت نے کھولا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟''

''خالہ جی، پانی مل سکتا ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اندر آ جاؤ باہر بہت گرمی ہے۔'' انہوں نے دروازہ چھوڑ کر حیدر علی کو راستہ دیا۔

اس کی تو دل کی مراد پوری ہو گئی۔

''کتنی آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو گیا۔'' اس نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔

''یہاں آ جاؤ بیٹا، یہ کمرا ٹھنڈا ہے۔'' وہ اسے اندر کمرے میں لے گئیں۔

کمرے تک جاتے جاتے اس نے مختصر سے گھر کا جائزہ لیا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا سوائے اس مہربان بوڑھی کے۔

''ادھر بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور ہتھ پنکھی اسے پکڑا کر خود باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ المونیم کا گلاس لے کر نمودار ہوئیں۔

''یہ لو۔'' انہوں نے گلاس اسے تھمایا جو لسی سے بھرا ہوا تھا۔

''آپ نے خواہ مخواہ اتنا تکلف کیا۔'' وہ شرمندہ ہو گیا۔

''اس میں تکلف کی بھلا کیا بات؟ یہ شہر نہیں ہے بیٹا جہاں کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ جب خدا بخشے صفدر کے ابا زندہ تھے تب تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی مہمان ہمارے گھر سے ہنسی خوشی رخصت نہ ہو اور پھر آج کل گرمی بھی تو بہت ہے۔ لسی سے جسم میں گرمی نہیں ہوتی۔''

وہ نمکین لسی پیتے ہوئے بھی گھر کا جائزہ لیتا رہا۔

''خالہ جی آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔'' انہوں نے سرد آہ بھری۔ ''دو بیٹیاں ہیں ان کی شادی کر دی ہے۔ وہ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ شہر میں رہتی ہیں اور صفدر ہے وہ روزگار کی تلاش میں کراچی چلا گیا ہے۔ اچھا بھلا پیر صاحب کے گھر نوکر تھا وہ، پتا نہیں کس نے پٹی پڑھائی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گیا۔''

''شادی شدہ بیٹیاں۔'' حیدر علی سوچ میں پڑ گیا۔ ''وہ کسی صورت شادی شدہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر وہ ان کی بیٹی نہیں ہے تو کون ہے؟''

''تم شہر سے آئے ہو نا۔ بیٹا؟''

''جی۔'' وہ بولا۔

''کسی کام سے آئے ہو یا یونہی گھومنے پھرنے؟''

''یہاں تو بس تفریحاً آ گیا تھا۔ مجھے فوٹو گرافی کا شوق ہے۔''

خالہ نے بغیر کچھ سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یعنی تصویریں کھینچنے کا۔'' اس نے کیمرا اتھپتھپایا۔

''اچھا اچھا۔ میں سمجھتی ہوں۔'' ایک دم اس کی بات سمجھ میں آ گئی۔ ''میرے صفدر نے بھی کراچی میں تصویر کھنچوائی تھی۔ دکھاؤں تمہیں؟''

''جی ضرور۔'' اس نے ان کا دل رکھنے کے لیے کہا حالانکہ اسے ان کے بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

خالہ کبریٰ دوسرے کمرے سے ایک فریم شدہ تصویر اٹھا لائیں۔

''یہ دیکھو۔'' انہوں نے دوپٹے کے پلو سے تصویر پر لگا شیشہ اچھی طرح صاف کر کے تصویر اسے تھما دی۔

وہ تصویر ایک نوجوان کی تھی۔ اس جیسے بے شمار نوجوان اس سے قبل حیدر علی اپنے گاؤں میں کرمو پان والے کی دکان پر کھڑے تاک جھانک کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ اس نے تصویر خالہ کو واپس کر دی۔

''بہت خوبصورت ہے آپ کا بیٹا۔'' اس نے ان کا دل رکھنے کے لیے تبصرہ کیا۔

خالہ کھل اٹھیں۔ ''ہے نا؟'' پھر چند لمحے تصویر کو بغور دیکھنے کے بعد بولیں۔ ''بالکل اپنے ابا مرحوم پر گیا ہے۔''

''خالہ جی آپ یہاں تنہا کیسے رہ لیتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''آپ کو تنہائی سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔''

''بس قسمت کا لکھا پورا کر رہی ہوں ورنہ اکیلے کون رہنا چاہتا ہے۔'' وہ افسردہ ہوگئیں۔

''گاؤں کے گھر بھی یہاں سے فاصلے پر ہیں۔ صفدر کے ابا شور شرابے سے گھبراتے تھے اس لیے یہاں مکان بنوالیا ہم نے۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ مجھ بڈھی کو یہاں زندگی کے باقی دن یوں اکیلے ہی کاٹنے ہوں گے۔''

''آپ کے کوئی رشتے دار' ملنے ملانے والے نہیں ہیں؟ میں نے تو سنا تھا کہ گاؤں میں سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔''

''رشتہ دار بھی ہیں اور ملنے ملانے والے بھی لیکن بیٹا اب کون مل جل کر رہتا ہے۔ وہ زمانے گزر گئے۔ ہاں دو چار دن میں کوئی نہ کوئی چکر لگا جاتا ہے پھر میں ان سے خوب باتیں کرتی ہوں۔ کچھ منگوالوں تو وہ بھی لا دیتے ہیں۔ پھر رضیہ اور زرینہ آجاتی ہیں ہفتے میں ایک مرتبہ اور کافی کام نمٹا جاتی ہیں۔''

''رضیہ اور زرینہ۔'' اس نے سوچا۔ ''ہوسکتا ہے وہ انہی میں سے کوئی ایک ہو۔ ان سے براہِ راست سوال بھی تو نہیں پوچھا جاسکتا نا۔''

''تم تصویریں کھینچنے شہر سے یہاں آئے ہو؟''

''خالہ جی میں بھی آپ کی طرح گاؤں کا ہی ہوں۔''

''لگتے تو نہیں ہو۔'' خالہ نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

''یہ دراصل کچھ عرصہ انگلینڈ یعنی ولایت رہنے کا اثر ہے۔ ورنہ میرا مرنا جینا تو اسی مٹی کے ساتھ وابستہ ہے۔''

''تم ولایت سے آئے ہو؟'' خالہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی عجوبے کو دیکھا جاتا ہے۔

''جی ہاں۔''

''مجھے بھی لگ رہا تھا' ولایت تو انسان کو بالکل بدل کر ہی رکھ دیتا ہے۔'' پھر انہوں نے آگے جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ''کوئی میم تو نہیں اٹھا لائے اپنے ساتھ؟''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''خالہ پاکستان میں کوئی کمی ہے لڑکیوں کی۔ اتنی اچھی تو لڑکیاں ہیں یہاں۔''

''جیتا رہ بیٹا۔'' انہوں نے خوش ہوکر کہا۔ ''اللہ سلامت رکھے۔ ہر کوئی تیری طرح نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں کے معصوم معصوم لڑکے جاتے ہیں وہاں اور وہاں کی چتا پرزہ لڑکیاں پھنسا لیتی ہیں انہیں۔ نہ شرم نہ حیا نہ ماں باپ کی عزت آبرو کی پروا۔ اللہ بچائے ایسی لڑکیوں سے۔''

خالہ کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ اتنے معصوم بھی نہیں ہوتے یہاں سے جانے والے لڑکے۔

خالہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں اس کی بات سے ذرا بھی اتفاق نہیں تھا لیکن انہوں نے بحث نہیں کی۔

''پیر صاحب کے دو بیٹے بھی تو پڑھ رہے تھے۔ ولایت میں۔'' وہ بولیں۔ ''وہ کہیں ملے تمہیں؟''

حیدر علی شاہ نے اپنی مسکراہٹ دبالی۔ اگر وہ انہیں بتا دیتا کہ وہ پیر صاحب کا منجھلا بیٹا ہے تو یقیناً ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔

''ان سے تو بہت پرانی واقفیت ہے میری۔'' وہ بولا۔ ''وہ بھی بچپن سے وہیں تھے اور میں بھی۔ ہم اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔''

''اچھا؟'' خالہ کی نظروں میں اس کی قدر ومنزلت اچانک ہی مزید بڑھ گئی۔

''تو اور کیا خالہ۔''

''بیٹا تم اس چارپائی پر بے آرام ہو رہے ہوگے۔'' انہیں اچانک خیال آیا۔

''بے آرامی کیسی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ بے آرام نہیں ہوتیں تو میں کیوں ہونے لگا۔''

''ولایت میں تو لوگ چائے پیتے ہیں۔'' انہیں ایک دم خیال آیا۔ ''لیکن میرے پاس چائے کی پتی نہیں ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔

''چھوڑیں خالہ چائے بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''میں تو وہاں بھی لسی ہی پیتا تھا۔''

''بہت اچھا کرتے تھے بیٹا۔'' وہ خوش ہوگئیں۔ ''انسان کو اندر تک ساڑ کر رکھ دیتی ہے چائے۔ اب تو یہاں بھی چائے کا فیشن ہوگیا ہے۔ میں کہتی ہوں رکھا کیا ہے اس میں۔ یہ تو صاف صحت تباہ کرنے والی بات ہوئی ناں۔''

''جی بالکل۔'' اس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو تم پیر صاحب کے بیٹوں کو جانتے ہو۔'' وہ واپس اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف پلٹ آئیں پھر انہوں نے آگے جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ''کیسے ہیں وہ؟''

''بہت اچھے ہیں خالہ جی اور بہت لائق بھی۔''

''ہاں ہوں گے ہی۔'' خالہ بولیں۔ ''وہ بھی اپنے ساتھ کوئی گوری چمڑی والی میم نہیں لائے۔'' پھر وہ قدرے توقف سے گویا ہوئیں۔ ''لیکن کچھ نہ کچھ بات ہے ضرور۔''

''کیسی بات؟'' حیدر علی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''رہنے دو بیٹا۔ ہم کچھ بولے تو خواہ مخواہ گناہ گار بنیں گے۔'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے جبکہ اندر سے دل ان کا بھی چاہ رہا تھا کہ وہ حیدر علی سے تصدیق کروائیں۔

''کیوں خالہ اس میں گناہگار ہونے والی کون سی بات ہے۔ وہ بھی میری اور آپ کی طرح کے عام انسان ہیں۔'' اس نے اس موضوع میں ان کی دلچسپی بھانپتے ہوئے انہیں اکسایا۔ یہ موضوع خود اس کے لیے بھی باعث دلچسپی تھا۔

''کسی سے کہو گے تو نہیں؟''

''میں کیوں کسی سے کہنے لگا کچھ؟''

''تمہارے دوست ہیں ناوہ۔''

''تو میں نے آپ کو بھی تو خالہ کہا ہے۔ کبھی خالہ کی بھی چغلی لگائی جاتی ہے۔'' اس نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹا۔'' وہ بولیں۔

''آپ کوئی بات بتانے لگی تھیں۔'' اس نے انہیں یاد دلایا۔

خالہ نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا پھر آہستہ آواز میں بولیں۔ ''میں نے رجب علی شاہ کے متعلق عجیب وغریب باتیں سنی ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' اس نے بھی ویسے ہی رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''اللہ جھوٹ نہ بلوائے بیٹا! پتا نہیں سچ ہے یا جھوٹ۔ وہ سائیں سردار علی ہے نا گاؤں کا۔ بھئی وہی جو لام پر گیا تھا فرنگی فوج میں بھرتی ہو کر اور تمغہ بھی لایا تھا۔''

حیدر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس کا بیٹا لاہور شہر چلا گیا ہے پر وہ یہیں رہتا ہے۔ اچھی بڑی سی کوٹھی ہے وہاں اس کی۔ اللہ کا بڑا فضل ہے اس کے ہاں۔ اس کا بیٹا سرور گیا تھا ولایت۔ اس نے واپسی پر باپ اور دادا کو بتایا تھا کہ رجب علی شاہ سارا وقت میموں میں گھرا رہتا ہے۔ خوب لٹا رہا ہے وہاں پیسے۔''

حیدر علی نے ذہن پر زور دیا لیکن سرور نامی کسی لڑکے سے ملاقات اسے یاد نہ آئی لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس کی دی ہوئی یہ اطلاع بالکل درست تھی۔

''یہ بھی کہہ رہا تھا۔'' خالہ بتا رہی تھیں۔ ''کہ وہاں اس نے کسی میم کے ساتھ شادی بھی کی تھی لیکن چھ مہینے بھی نہیں چل سکی وہ شادی۔''

یہ بات بھی سو فیصد درست تھی۔ رجب علی نے کرسٹی سے شادی کی تھی۔ کرسٹی بہت اچھی، بہت سویٹ لڑکی تھی لیکن رجب علی کے مزاج میں جو تندی و تیزی تھی اس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکی۔ اور پھر اگر وہ لندن کے نائٹ کلب میں ملنے والی لڑکی سے یہ توقع کر رہے تھے کہ شادی کے بعد وہ برقع اوڑھ لے اور گھر میں ان کے انتظار میں راتیں جاگ کر گزارے گی۔ تو یہ رجب علی شاہ کی نہ صرف بھول تھی بلکہ زیادتی بھی تھی۔

''اور کچھ بھی بتایا؟'' اس نے پوچھا۔

''بس ایسی ہی باتیں بتا رہا تھا۔ تم تو اس کے دوست ہو تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

''میری زیادہ دوستی حیدر علی شاہ کے ساتھ تھی۔'' وہ بولا۔ ''اس کے متعلق کچھ بتایا سرور نے؟''

''اس سے سرور کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ ویسے یہ باتیں بتائیں تو سرور نے اپنے باپ اور دادا کو تھیں لیکن کانوں ہی کانوں میں یہ سب گاؤں والوں تک پہنچ گئی تھیں۔ اب کچھ سمجھ نہیں آتی۔ دیکھو ناں رجب علی شاہ اور اس کا بھائی بغیر میموں کے واپس آ گئے ہیں پھر بھی زبانیں نہیں بند ہوئیں کسی کی۔'' پھر وہ قدرے توقف سے بولیں۔ ''اب دیکھو نا۔ یاسمین اس کی منگ ہے۔ اتنی خوبصورت ہے وہ سلیقہ شعار بھی ہے اور پھر ہے بھی خاندان کی۔ چچا کی بیٹی ہے۔ پر بے چاری یونہی بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ کی لڑکیوں کے بچے ہو چکے ہیں اور وہ اب تک ڈولی اٹھنے کا انتظار کر رہی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب رجب علی کو گھر بسانے کی فکر کرنی چاہیے۔''

''جی بالکل۔'' وہ بولا۔

اس نے یاسمین کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کے خاندان میں پردے کی بہت سختی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ رجب علی کے عجیب وغریب مطالبات اور ناروا سلوک یہاں کی کوئی لڑکی ہی برداشت کر سکتی ہے۔

''آئے ہائے۔'' خالہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں بھی باتوں میں ایسی لگی کہ تمہیں کھانے کا بھی نہیں پوچھا۔ ٹھہرو، میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔''

وہ باہر والے چولہے میں لکڑیاں جلانے لگیں تو حیدر علی بھی پاس پڑی پیڑھی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تم یوں گرمی میں آ گئے باہر؟''

''آپ بھی تو باہر گرمی میں ہی بیٹھی ہیں۔''

''میں تو روٹیاں پکانے آئی ہوں ناں۔'' وہ ہنسیں۔ ''تم کیوں گرمی کھانے آ گئے۔''

''وہاں اکیلا بیٹھ کر کیا کرتا خالہ۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اور وہ پیڑے بنانے لگیں۔

''آج میں آپ کی مدد کروں گا روٹیاں پکانے میں۔''

''کیا؟'' خالہ نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''یہ بھی بھلا مردوں کے کرنے والے کام ہوتے ہیں؟''

''اس سے میری مردانگی پر کوئی حرف نہیں آتا خالہ۔ ولایت میں ہمیں اپنے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا تھا۔'' حالانکہ حیدر علی نے وہاں بھی کبھی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہاں بھی تمام کام ان

کے پاکستانی ملازم کرتے تھے۔''

''وہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ ہر کام نرالا ہوتا ہے وہاں کا۔'' انہوں نے ناک بھوں چڑھائی۔

''خالہ کو قائل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' حیدر علی نے سوچا پھر بولا۔ ''دیکھیں خالہ جی! اپنے ہاتھ سے کام کرنا تو بہت اچھی بات ہوتی ہے۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ ہم تو ان کی اُمت کے ادنیٰ سے لوگ ہیں۔''

''جیتے رہو، خوش رہو۔'' وہ اس کی بات سن کر نہال ہو گئیں۔ ''شکر ہے موئے فرنگیوں نے تمہیں بالکل ہی فرنگی نہیں بنا دیا۔''

خالہ روٹیاں توے پر ڈالتی گئیں اور وہ سینکتا گیا۔ لکڑیوں کے جلنے سے نکلنے والے شعلوں کی حدت سے بار بار اس کے ہاتھ اور بازو جھلس رہے تھے لیکن وہ ساری تکلیف برداشت کرتا گیا۔ خالہ کی تمام تر ہدایات کے باوجود تین روٹیاں اس نے کہیں کہیں سے جلا دیں اور چوتھی روٹی آدھی کچی رہ گئی۔

تمام وقت خالہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں اور وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ اسے اس زندگی میں مزہ آ رہا تھا۔ عام لوگوں کے درمیان اس سے قبل بھی اس نے زندگی گزاری تھی لیکن وہ پاکستان کے اس دور افتادہ گاؤں کے عام لوگ نہیں تھے۔ برطانیہ کے عام شہروں میں رہنے والے باشندے تھے۔ شام کو جب وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو خالہ اداس ہو گئیں۔

''کتنا اچھا وقت گزرا تمہارے ساتھ۔'' وہ بولیں۔ ''تم نے آ کر صفدر کی کمی پوری کر دی۔ کل سے پھر میں اس گھر میں اکیلی ہو جاؤں گی۔''

''آپ فکر کیوں کرتی ہیں خالہ جی۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ کے پاس آتا جاتا رہوں گا۔''

اور پھر اگلے دن اس نے سویرے ہی خالہ کبریٰ کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''میں سوچ رہی تھی کہ تم نے صرف میرا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ یہاں آتے جاتے رہو گے۔'' وہ بہت خوش تھیں۔

''آپ کے گھر آ کر اتنا مزہ آیا کہ کل بھی یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' وہ اندر چلا آیا۔ ''آپ کیا کر رہی تھیں؟''

''صفائی کر رہی تھی گھر کی۔'' وہ بولیں۔ ''اب تو خیر سمجھو ہو ہی گئی ہے۔''

''آپ اکیلی اتنے کام کرتی ہیں؟''

''میری اکیلی جان کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔''

پھر وہ مختلف کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ مرغیوں کو دانہ ڈھونڈنے کے لیے دڑبہ کھول دیا۔ کنویں سے پانی لا کر مٹکا بھر دیا۔ گھر میں بھی پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔ پھر خالہ کبریٰ ہنڈیا پکانے بیٹھیں تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دوپہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اٹھنے لگا لیکن خالہ نے اسے بازو سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''تم بیٹھو بیٹا میں دیکھتی ہوں۔ یہاں کے لوگ تمہیں کب پہچانیں گے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''پتا نہیں اس وقت کون آ گیا۔ یہاں تو سب کے آنے کے لگے بندھے اوقات ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ متحیر سی اندر آئیں۔

''پیر صاحب کی حویلی سے گندم کی بوری آئی ہے۔'' انہوں نے جوش سے حیدر علی کو بتایا۔

''اللہ تعالیٰ پیر صاحب جلال الدین کو اور بڑا مرتبہ دے اور زیادہ خوشحالی دے۔ یہ تو ان کا احسان ہے ورنہ ہم غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔'' انہوں نے دوپٹے کا پلو اٹھا کر دعا دی پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔ ''میں نے بوری ڈیوڑھی میں رکھوا دی ہے۔''

حیدر علی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ خالہ کبریٰ جیسی مہربان عورت کے لیے گندم کی بوری بھجوا کر اس نے احسان نہیں کیا تھا۔ الٹا وہ ان کا احسان مند تھا جن کے پُرسکون گھر میں آ کر وہ اپنی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر پرورش پانے والی تکلیف دہ روایتوں اور سازشوں کو کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا۔

☆======☆======☆

جمعہ کا سارا دن زرینہ نے یہ سوچنے کی نذر کر دیا کہ وہ اگلے روز کیا پہن کر خالہ کبریٰ کے گھر جائے۔

''نیلا پھولدار سوٹ۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''نہیں اس کا رنگ اب کہیں کہیں سے اُڑتا جا رہا ہے۔ ہاں جب نیا تھا تب بہت شاندار لگتا تھا۔ وہ ہرے رنگ والا ٹھیک رہے گا لیکن نہیں۔ اس کی قمیص دروازے کی کیل میں اٹک کر پھٹ گئی تھی۔ ٹھیک ہے کہ میں نے اسے رفو کر لیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کل پہننے کے لیے ٹھیک نہیں رہے گا۔ ویسے وہ پیلا اور سفید پھولدار سوٹ بھی اچھا ہے لیکن اس کے دوپٹے میں ٹک پڑے ہوئے ہیں۔ ایک تو ہر طرف ٹڈیاں پھدکتی پھرتی ہیں۔ مجال ہے ایک دوپٹا بھی محفوظ رہ جائے۔ ویسے رضیہ کے پیلے سوٹ والا دوپٹا چل سکتا ہے۔ اگر وہ دینے پر آمادہ ہو جائے تو۔ ویسے انکار تو اس نے کبھی نہیں کیا لیکن کل کہیں اس کا وہی کپڑے پہننے کا ارادہ نہ ہو۔''

''اب تو یہ پوچھنا بھی بے کار ہے کہ کس سوچ میں گم ہو۔'' رضیہ ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ کل کون سے کپڑے پہنوں۔''

''ابھی سے کل کی فکر کرنے کی کیا بات ہے۔''

''شاید کل وہ کہیں راستے میں نظر آ جائیں۔''

''اُف خدایا۔'' رضیہ جھلا اٹھی۔ ''اور وہ اسی لمبے سے سیاہ برقعے میں تمہارے لباس کا جائزہ لیں گے۔''

''ہا...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اوپر تو برقع ہوگا۔''

''اب پتا چل گیا ناں اس لیے کپڑوں کے مسئلے پر اپنا دماغ مت خرچ کرو۔''

''تم نے تو سوچنے کا بھی سارا مزہ کرکرا کر دیا۔''

''مزہ تو اس وقت کرکرا ہوگا جب سب کو تمہاری حماقت کی خبر ہوگی۔''

''ایسے تو نہ کہو۔''

''کیوں نہ کہوں۔ جب مجھے معلوم ہے کہ آگے یہ سب کچھ ہوگا۔ تم ہو دسویں پاس اور میں ٹھہری بالکل اَن پڑھ۔ پھر بھی جو کچھ مجھے سمجھ آ رہی ہے وہ پتا نہیں کیوں تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔''

''تم بھی تھوڑا سا پڑھ لکھ جاتیں تو میری بات سمجھ میں آ جاتی۔'' زرینہ نے منہ بنایا۔

''معاف کر مجھے۔ ایک تم ہی پڑھی لکھی کافی ہو۔'' رضیہ چڑ گئی۔

''طعنہ دینا ہے تو مجھے دو' تعلیم کو نہیں۔ میری کسی کتاب میں نہیں لکھا تھا کہ چھوٹے شاہ جی سے عشق کرنا ضروری ہے۔ یہ تو خود بخود ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیسے۔''

''پتا نہیں کیسے۔'' رضیہ نے اس کی نقل اتاری۔ ''سب پتا لگ جائے گا کہ کیسے ہوا عشق جب یہ نشہ اترنے لگے گا۔''

''ابھی تو نشہ چڑھا بھی نہیں کہ تم اترنے کی بات کر رہی ہو۔'' زرینہ ہنسی۔ ''ویسے رضیہ تم نے تو انہیں دیکھا ہے نا۔ تم بتاؤ تمہیں کیسے لگے وہ؟''

''بہت اعلیٰ' بہت ارفع۔ جنہیں دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا۔''

''مانتی ہوں ناں؟'' وہ ہنسی۔

''لیکن تم نہیں مانتیں۔''

''مانتی ہوں لیکن ہار مان کر آہیں بھرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھ میں حاصل کرنے کی لگن اور شوق ہے۔''

''ہر چکوری چاند کو دیکھ کر یہی کہتی ہے لیکن نہ تو چکوری کی پرواز اتنی بلند ہوتی ہے اور نہ ہی چاند اپنی سطح سے نیچے اتر سکتا ہے۔''

''انہونی تو ہے لیکن ہو جائے تو کتنا اچھا ہے۔''

''اور نہ ہو تو؟''

''کم از کم محبت کے جذبے سے محروم تو نہیں رہوں گی۔'' زرینہ نے آنکھیں موند لیں۔

''سنا ہے شہروں میں پاگلوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کچھ عرصے بعد تمہیں بھی پاگل پن کے علاج کی خاطر شہر لے جانا پڑے گا ہمیں۔'' رضیہ جل کر بولی۔

''تو لے جاؤ ناں' انتظار کیوں کر رہی ہو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اللہ کرے اماں ابا آج کل میں کہیں تمہارا رشتہ پکا کر کے شادی کر دیں۔ خود ہی دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔''

''دعا نہیں دے سکتی ہو تو بددعا بھی نہ دو۔''

''کرو بابا۔ جو کچھ کرنا ہے کرو۔ ہمیں کیا۔'' رضیہ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''شکریہ شکریہ۔'' زرینہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''اب مجھے مزید مشکور ہونے کا موقع نہیں دو گی کیا؟''

''سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔'' وہ تو پہلے ہی جھلائی ہوئی تھی۔

''ایک احسان اس بندی پر اور کرو۔''

''بکو۔''

''دیکھ لیں چھوٹے شاہ جی' آپ کے لیے ہمیں کیا کیا سہنا پڑ رہا ہے۔'' اس نے یونہی ہوا کو مخاطب کیا۔

''یہ تو کچھ نہیں ہے۔ یہ تو صرف ابتدا ہے تاکہ تمہیں آگے سب کچھ سہنے میں آسانی ہو۔'' وہ جل گئی۔

زرینہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''تاریخ بتاتی ہے کہ عاشقوں پر ہمیشہ بہت ظلم توڑے جاتے رہے ہیں۔ کتنا ظلم ہوا ہیر پر جسے کھیڑے بیاہ کر لے گئے۔ سسی تھلوں میں دفن ہو گئی۔ سوہنی چناب میں غرق ہو گئی۔ مجنوں کو پتھر مارے گئے۔ فرہاد کو دودھ کی نہر کھودنے پر مجبور کیا گیا اور مرزا کو صاحباں کے بھائیوں نے مار دیا لیکن رضیہ تم چاہو تو تاریخ کا دھارا بدل سکتی ہو۔''

''اس وقت سے الٹی الٹی باتیں کر رہی ہو۔ اب کہہ بھی دو کہ تم چاہتی کیا ہو؟''

''صرف تمہارا پیلا دوپٹا۔''

''پیلا دوپٹا کیوں؟''

''کل میں نے اپنا پیلا اور سفید پھولدار سوٹ پہننا ہے اور اس کے دوپٹے میں جگہ جگہ ٹک لگے ہوئے ہیں اس لیے۔''

''کہا تو ہے تمہیں کہ تمہارے چھوٹے شاہ جی کے لیے تمہارے کپڑوں کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ تم برقعے میں ہو گی۔''

''ہائے پھر کہو۔'' زرینہ شرارت آمیز انداز سے ہنسی۔

''کیا؟''

"وہی یعنی میرے چھوٹے شاہ جی۔"

زرینہ کی شرارت سے چمکتی آنکھیں دیکھ کر رضیہ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"ایک دوپٹے کی تو بات ہے۔" اس نے بہت معصومیت سے کہا۔ "اتنی تو باہر میں نے کسی سے بھیک مانگی ہوتی تو وہ بھی مل جاتی۔"

"بکومت، کبھی تو سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔" رضیہ نے اسے جھڑکا پھر اٹھ کر ٹرنک سے پیلا دوپٹا نکال کر اسے تھمادیا۔

اگلے دن وہ وقت سے کتنی دیر پہلے تیار ہو کر اچھو کا انتظار کرنے لگی۔ پھر تانگے پر بیٹھ کر ہمیشہ کی طرح دھان کے لہلہاتے کھیت دیکھنے کے بجائے اس تنگ سی کچی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

"شاید وہ اس موڑ پر اچانک سامنے آجائیں یا پھر اس درخت کے پیچھے سے نکل آئیں۔ یہ دھان کی فصل اتنی اونچی نہیں ہے کہ اس میں کھڑے ہو کر وہ دکھائی نہ دے سکیں لیکن پھر بھی ہو سکتا ہے۔ امید تو اچھی ہی رکھنی چاہیے۔ شاید کبھی چکوری کے پروں میں اتنی طاقت آجائے کہ وہ اُڑ کر چاند کو پالے یا شاید چاند ہی چکوری کے لیے سب کچھ قربان کر کے زمین پر اتر آئے۔ ہو سکتا ہے ناں۔ امید تو اچھی ہی رکھنی چاہیے۔"

لیکن تمام راستہ طے کر لینے کے باوجود بھی جب وہ کہیں دکھائی نہیں دیا تو زرینہ مایوس ہو گئی اور جب تانگہ خالہ کبریٰ کے گھر کے دروازے پر رکا تو زرینہ بالکل بجھ چکی تھی۔ رضیہ نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ زرینہ چپ چاپ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ زرینہ نے کھلے دروازے کی سمت دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں دروازے میں چھوٹے شاہ جی کھڑے ہوئے تھے۔

"شاہ جی۔" وہ مسرت آمیز انداز میں بولی۔

حیدر علی چونک گیا۔ خالہ کبریٰ کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گوری ہفتے کے روز آتی تھی۔ خدا معلوم اس کی گوری کا نام رضیہ تھا یا زرینہ' بس اس کے لیے تو وہ صرف گوری تھی۔ پورا ایک ہفتہ اس نے اس دن کی آمد کے انتظار میں کاٹا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ اس کی گوری بھی اس کی خاطر بے چین ہوگی' اس کے لیے بھی یہ تمام عرصہ گزارنا مشکل ہوگا۔

اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا گوری کے لیے' پورے ایک ہفتہ تک خالہ کبریٰ کے وہ سب کام کرتا رہا تھا' جو تمام زندگی اس نے کبھی نہیں کیے تھے۔ شروع میں خالہ کی خدمت کی وجہ...... صرف گوری تھی لیکن بعد میں خالہ کی مہربانیوں نے اس کے قدم باندھ لیے تھے۔

اور آج اس کی ہفتہ بھر کی بے چینی اور تھکن گوری کے صرف دو لفظوں نے ایک لمحے میں ختم کر دی تھی۔

"شاہ جی!"

کہنے کو صرف دو لفظ تھے لیکن حیدر علی کے لیے یہ کسی امرت سے کم نہیں تھے۔ گوری کے لہجے میں چھپی مسرت آمیز حیرت نے وہ سب جذبے عیاں کر دیئے تھے' جو صرف محسوس کیے جاتے ہیں' جنہیں کہا نہیں جاتا۔

گویا وہ بھی اس کے لیے سوچتی رہی تھی۔ راتوں کو تاروں کی چھاؤں میں اپنے اور اس کے نام کے ستارے ڈھونڈتی رہی تھی۔ اس نے بھی حیدر علی کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا تھا۔ جاگتی آنکھوں سے اس کے...... خواب دیکھے تھے اور یہ سب کچھ حیدر علی کو فقط ان دو لفظوں سے معلوم ہو گیا تھا۔

"شاہ جی۔"

کائنات جھوم اٹھی تھی' کلیاں چٹک گئی تھیں' پھول مہکنے لگے تھے' رہٹ کا پانی جھر جھر بہہ رہا تھا۔ بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سحر زدہ کر دینے والی موسیقی میں بدل گئی تھی' مرغیاں کٹ کٹ کرتے ہوئے حیدر علی کو مبارکباد دینے لگی تھیں۔

آج اس نے اس لڑکی کو پالیا تھا جسے اس نے برسوں تلاش کیا تھا۔ کبھی لندن کے مضافات میں واقع محل نما کوٹھیوں میں' کبھی نائٹ کلبوں میں' کبھی پکاڈلی اسٹریٹ پر' کبھی سڑکوں پر بے مقصد سائیکلنگ کرتے ہوئے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اپنی من پسند لڑکی پھولی پھولی سفید اسکرٹ پہنے ہوئے کہیں پیانو بجاتی ملے گی یا ندی کے کنارے گھاس پر بیٹھ کر پانی میں خود ہی پتھر پھینکنے کے بعد لہریں گنتے ہوئے یا پھر کسی مضافاتی محل کے بے ترتیب سے باغ میں کینوس ایزل پر لٹکائے کلر پلیٹ تھامے لینڈ اسکیپ پینٹ کرتے ہوئے۔

حیدر علی جدیدیت کا قائل تھا۔ نہ اسے خود گھر میں رہنا پسند تھا اور نہ ہی وہ لڑکیوں کو گھروں میں بند رکھنے کا قائل تھا۔ اس نے ہمیشہ ایک تعلیم یافتہ' خوبصورت اور ماڈرن لڑکی کے خواب دیکھے تھے جو اس کے ساتھ ادب' فلسفہ' نفسیات اور سیاسیات پر بحث کر سکے' جو اس کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے بلکہ وہ دونوں بحث کے دوران ایک دوسرے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتے رہیں اور پھر بالآخر ہنس کر بانہوں میں بانہیں ڈال کر ساری بحث کو چائے یا کافی کی ایک پیالی کے ساتھ اُڑا دیں۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اس کی من پسند لڑکی کہاں ملے گی' لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی دکھائی دی' وہ اسے فوراً پہچان لے گا اور اس کے دل سے صدا آئے گی۔

"یہی ہے وہ۔"

اب وہی حیدر علی حیران تھا کہ اس کا دل یہ صدا ایک ایسی لڑکی کے لیے کیوں دے رہا ہے جو برقعے میں لپٹی ہوئی ہے' جس کی باتیں تو خوبصورت ہیں لیکن اسے شیکسپیئر' کرسٹوفر مارلو' کیٹس

اور شیلے کی کچھ خبر ہی نہیں؛ جس کے ساتھ وہ...... فرائڈ کے نظریات پر بحث نہیں کر سکتا، جسے نہ افلاطون کے مکالموں کی خبر ہے اور نہ ہی سارتر کی وجودیت کی تھیوری کی؛ جس کی مسکراہٹ مونا لیزا سے زیادہ خوبصورت ہونے کے باوجود اسے مونا لیزا کا بھی علم نہیں؛ جسے یہ تک معلوم نہیں کہ مائیکل اینجلو نے اسٹائن چیپل کے میورلز میں آرٹ کا سب سے خوبصورت عہد قید کر دیا تھا اور رافیل نے School of Athenes پینٹ کر کے خود کو دنیا کا سب سے بڑا آرٹسٹ ثابت کر دیا تھا؛ جس کی موسیقی کی حد بی تھون کی سمفنی نہیں؛ بیل کے گلے میں ٹنٹناتی گھنٹیاں تھیں۔

نہ وہ اسے سفید پھولی پھولی سکرٹ پہن کر پیانو بجاتے ہوئے ملی تھی؛ نہ ہی ندی کے کنارے بیٹھ کر پانی میں کنکر پھینک کر لہریں گنتے ہوئے اور نہ ہی کسی درخت کی چھاؤں کے نیچے پھولوں کے بے ترتیب تختوں کے پاس ایزل کینوس پر ٹکائے لینڈ اسکیپ پینٹ کرتے ہوئے۔

ان کی پہلی ملاقات کتنے غیر رومانوی انداز میں؛ کتنے غیر رومانی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اس کے خیالوں سے کتنی مختلف تھی پھر بھی کتنی اپنی اپنی سی تھی۔ اس نے حیدر علی کے ذہن کے کینوس پر چھائے ہوئے رنگوں کو بالکل ہی بدل دیا تھا اور نئے رنگوں سے ایک بالکل نئی اور انوکھی تصویر بنائی تھی۔ ان میں سے ہر رنگ خوشبو سے بھیگا ہوا تھا۔ ہر رنگ روشن اور معطر تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ گوری نے اپنی مخروطی گلابی انگلیوں سے دروازے کو ہولے سے بجایا تھا۔ اس آہستہ روی دستک کو سن کر حیدر علی جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا اسے تکے جا رہا تھا اور گوری اور اس کی بہن کے لیے اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''سوری!'' وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔ ''اندر آ جائیں؛ خالہ کبریٰ گھر پر ہی ہیں۔''

رضیہ نے نقاب کی اوٹ سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ زرینہ نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ وہ ڈیوڑھی میں کھڑا رہ گیا۔ اور وہ دونوں کمرے میں چلی آئیں۔ سلام دعا کے بعد رضیہ بولی۔

''خالہ جی! یہ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' حالانکہ زرینہ کے حوالے سے وہ جانتی تھی کہ حیدر علی کون تھا۔

''تم برقع اتار دو؛ سمجھو بالکل اپنے صفدر جیسا ہی ہے۔'' وہ بولیں۔ ''اللہ اسے خوش رکھے بہت نیک لڑکا ہے؛ میری تنہائی دور کر دی اس نے۔''

''پھر بھی خالہ ہیں کون؟''

''علی نام ہے اس کا۔'' انہوں نے بتایا۔ ''روز آ جاتا ہے میرے ساتھ کاموں میں ہاتھ بھی بٹا دیتا ہے اور باتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ جس دن سے یہ گھر میں آنا شروع ہوا ہے اس دن سے سمجھو اس گھر کے بھاگ ہی جاگ اٹھے ہیں۔ شاہ صاحب کے گھر سے کبھی گندم کی بوری آ جاتی ہے اور کبھی ذبح کیا ہوا بکرا۔ سب اس کے قدموں کی برکت سے ہے اور اب یہ فکر بھی نہیں ہے

کہ کسی دن مر گئی تو لاش دنوں کے حساب سے پڑی سڑتی رہے گی۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ کو معلوم نہیں ہوگا۔'' رضیہ نقاب اٹھا کر بولی۔

''کیا معلوم نہیں ہوگا؟''

زرینہ نے ملتجی نظروں سے رضیہ کی جانب دیکھا اگر وہ خالہ کبریٰ کو شاہ جی کی حقیقت بتا دیتی تو وہ شاید بے ہوش ہی ہو جاتیں۔ ایک پیرزادہ ان کے گھر کا کام کرتا رہا تھا؛ کنویں سے پانی بھر کر لاتا رہا تھا؛ ان کے ساتھ روٹیاں سینکتا رہا تھا اور مرغیوں کو دانا کھلاتا رہا تھا اور وہ اُمتی ہو کر ایک سیّد زادے سے یہ کام لیتی رہی تھیں۔ ان کے نزدیک یہی ایک بات ان کی ساری زندگی کی عبادت اور ریاضت پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔

خالہ جی کو یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد شاہ جی کا وہاں آنا یقیناً ناممکن ہو جاتا اور شاہ جی سے یہاں ملاقات نہ ہوتی تو پھر کہاں ہوتی؟ مانا کہ اس پر کہیں آنے جانے کی کوئی خاص پابندی نہیں تھی لیکن پردے کی سختی ضرور تھی۔ وہ گاؤں کے کسی بھی گھر چلی جاتیں تو گھر کے مکین ان کی خاطر جوان لڑکوں کو کچھ دیر کے لیے باہر بھیج دیتے۔ حویلی میں یوں تو اس کا خاصا آنا جانا تھا لیکن وہاں تو پردے کی پابندی اس کے اپنے گھر سے بھی زیادہ تھی۔

پھر کہاں ملتی وہ شاہ جی سے؟ تقدیر بھی تو ملانے کے لیے راستے تلاش کرتی ہے لیکن اگر سب راستے ہی مسدود ہو جائیں تو؟ نہیں وہ اپنی نظروں کے سامنے یہ راستے مسدود ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی تھی۔

رضیہ اس کی ملتجی نظریں دیکھ کر شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔ اسے متذبذب دیکھ کر زرینہ فوراً بولی۔

''خالہ جی یہی کہ ابا جی کو علم ہو گیا کہ ہم نے کسی غیر کے ہوتے ہوئے نقاب اٹھا دیا تھا تو ہماری خیر نہیں۔''

''تمہارے ابا کی طبیعت کو میں نہیں جانتی کیا۔'' خالہ پوپلے منہ سے مسکرائیں۔ ''لیکن علی کی بات اور ہے۔ تم صفدر سے پردہ نہیں کرتیں اور علی بھی میرے لیے ویسا ہی ہے۔ بہت ہی شریف ہے۔ اب دیکھو کمرے میں بھی نہیں آیا۔ غریب باہر ہی کہیں کھڑا ہوگا۔''

''ابا جی تو یہ سب باتیں اتنی آسانی سے قبول نہیں کریں گے ناں۔ خالہ ایسا کریں کہ آپ انہیں کہیں باہر بھجوا دیں۔''

''باہر بھجوانے کی کیا ضرورت ہے؟'' زرینہ نے اسے گھورا۔ ''اتنی گرمی ہو رہی ہے باہر۔ تھوڑی دیر میں سورج آگ برسانے لگے گا۔''

''تو اُن کا کوئی ٹھور ٹھکانا بھی تو ہوگا۔ وہیں چلے جائیں ہم شام تک یہاں ہیں؛ اس کے بعد جی چاہے تو واپس آ جائیں۔'' رضیہ اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر بولی۔

''خالہ جی! میں باہر جا رہا ہوں کوئی کام ہو تو آواز دے لینا' میں برگد کے پیڑ کے نیچے ہی بیٹھا ہوں گا۔'' کمرے کے باہر سے حیدر علی کی آواز آئی۔

''بس ہو گیا تمہارا دل خوش۔'' زرینہ کی آنکھیں رضیہ سے کہہ رہی تھیں لیکن منہ سے وہ یہی بولی۔ ''اب تم آرام سے برقع اتار سکتی ہو۔''

دونوں بہنیں خاموشی سے کام میں لگ گئیں۔

''زرینہ بیٹا! آج روٹی کے بجائے چاول پکا لینا۔ پیر صاحب کی طرف سے پورے ایک من کی بوری آئی ہے کل۔'' خالہ کبریٰ نے آواز دی۔

''جی اچھا خالہ۔''

''کتنی صفائی رہتی ہے؟'' رضیہ نے اس سے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔ اسے احساس تھا کہ زرینہ اس سے ناراض تھی۔

''ختم ہو گئی ہے۔'' اس نے جھاڑو کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے بے رخی سے کہا۔

''میں نے بھی کپڑے دھو لیے ہیں' ہنڈیا بھی پکا لی ہے۔'' رضیہ نے کہا لیکن زرینہ کوئی بات کہے بغیر باورچی خانے میں گھس گئی۔

''مجھے پتا ہے' تم مجھ سے ناراض ہو۔'' رضیہ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''لیکن تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' زرینہ چاولوں کی بوری سے چاول نکالتے ہوئے پلٹی۔

''تم میری چھوٹی بہن ہو میں تمہیں کسی دلدل میں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''خود بتاؤ' تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔''

''تمہیں صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ پھر بوری سے چاول نکالنے لگی۔

''ہماری آپس میں کبھی ناراضگی نہیں ہوئی تھی۔ ایک تیسرے فرد کی آمد نے ہمارے درمیان اتنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ تم مجھ سے بات بھی کرنا نہیں چاہتیں۔''

''جو لوگ ہمارے دل کے پاس رہتے ہیں ان میں سے کوئی بھی دوسرا یا تیسرا فرد نہیں ہوتا' وہ سب پہلے ہوتے ہیں۔'' وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''پتا نہیں بے چارا علی کتنی گرمی میں بیٹھا ہوا ہوگا۔'' خالہ بولیں۔

زرینہ کے چاول چنتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کو رکے پھر اسی تسلسل سے مصروف ہو گئے۔

''خالہ جی! یہ رہتے کہاں ہیں؟'' رضیہ نے پوچھا تو زرینہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''پورے گاؤں کی سرائے میں رہ رہا ہے اور پتا ہے' پیر صاحب کے بیٹوں کا بہت اچھا

دوست ہے۔''

''یقیناً ہوں گے۔'' رضیہ بولی۔

وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ انہیں شاہ جی کی حقیقت بتا دے یا نہیں۔ اس کے نزدیک شاہ جی کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کی دعا اور بددعا دونوں میں بہت اثر تھا۔ اتنے بڑے مرتبے والے شخص کو اس کے لیے ناراض کرنا ناممکن تھا لیکن زرینہ کو کنویں میں گرتے دیکھنا بھی تو اسے گوارا نہیں تھا' پھر کیا کرے وہ؟ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

اس کے دل میں یہ بات بھی مسلسل کھٹک رہی تھی کہ شاہ جی' زرینہ کی خاطر باہر گرمی اور دھوپ برداشت کر رہے ہیں۔ وہ پیر صاحب کے گدی نشین نہ سہی لیکن برگد کے پیڑ تلے اُگی ہوئی گھاس ان کے مرتبے اور شان کے مطابق تو نہیں تھی۔ ان کی اپنی حویلی' اتنی بڑی اور شاندار تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں کھلی رہ جائیں اور پھر وہ تو ولایت بھی رہ کر آئے تھے' جس کے ساتھ عیش اور آرام کا ہر تصور وابستہ تھا اور اس وقت وہ نیلے آسمان تلے' آگ برسائے سورج کی حدت کا مقابلہ کر رہے تھے۔

''پتا نہیں علی کو بھوک پیاس نہ لگی ہو۔'' خالہ کو پھر اس کا خیال آ گیا۔

''خالہ سرائے میں سبھی کچھ ملتا ہے' یہیں باہر تو نہیں بیٹھے رہیں گے وہ۔'' زرینہ نے اپنے دل کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔ ''اور اگر بھوک پیاس محسوس ہوئی تو دروازہ کھٹکھٹا کر مانگ لیں گے۔''

''اللہ سب کو ایسی اولاد دے۔ میرے دل سے تو اس کے لیے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔'' انہوں نے آہ بھری۔ ''سگی اولاد اپنی ہوتے ہوئے بھی اپنی نہ بنی اور یہ پرائی اولاد خبر نہیں کس کا بیٹا' کس کی آنکھ کا تارا ہوگا' ایسے لگنے لگا ہے جیسے اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہو۔''

زرینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ باورچی خانے میں آ گئی اور کھڑکی کی چق اٹھا کر باہر جھانکنے لگی۔ وہ برگد کے پیڑ تلے ایک بازو سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ واپس خالہ کے کمرے میں چلی آئی۔

''خالہ! یہ کب سے یہاں آ رہے ہیں؟'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو رضیہ پوچھ رہی تھی۔

''بس پچھلے ہفتے' جب تم لوگ آئے تھے' اس سے اگلے ہی دن آیا تھا۔ اسے تصویریں کھینچنے کا بہت شوق ہے ناں' بس کیمرے سے تصویریں اتار رہا تھا کہ گرمی لگی اور پانی پینے یہاں آ گیا۔'' خالہ وہی کہانی بتا رہی تھیں جو اس نے انہیں سنا رکھی تھی۔ ''پھر تو ایسے گھل مل گیا جیسے برسوں سے یہاں رہتا آ رہا ہے۔'' پھر خالہ ان کاموں کی تفصیل بتاتی رہیں' جو وہ ان کی مدد کے لیے کرتا رہتا تھا۔

''اگلے دن جب وہ پانی پینے آئے ہوں گے اور میں ان کو نہیں ملی ہوں گی تو انہیں کتنا

افسوس ہوا ہوگا۔ اسی لیے تو ہفتہ بھر خالہ کے ساتھ ہی ٹھنی رہے۔'' وہ سوچتے سوچتے ہنس پڑی۔
''اگر کوئی ہمیں چاہنے لگے اور ہم بھی اسے چاہنے لگیں تو کتنا اچھا اور خوشگوار احساس ہوتا ہے۔''
''تم بیٹھے بٹھائے کیوں ہنسنے لگیں؟'' خالہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''کچھ نہیں خالہ جی' اپنی سہیلی کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔''

''رضیہ! فٹافٹ چاول ابال لو بے چارا علی بھوکا بیٹھا ہوگا۔ میں تو روز بروز اس کی شرافت کی قائل ہوتی جا رہی ہوں۔ اب یہی دیکھ لو اتنی گرمی میں باہر پڑا ہوگا لیکن پانی مانگنے تک نہیں آیا۔ مجھ سے تو اب چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا ہے۔ بڈھی ہڈیوں میں جان ہی نہیں رہی ورنہ میں ہی اسے پانی کا پوچھ آتی۔''

رضیہ باورچی خانے میں چاول ابالنے چلی گئی۔ کافی دیر تک زرینہ وہیں کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہی پھر وہ بھی باہر نکل کر دوسرے کمرے میں چلی آئی اور کھڑکی کی چق کا سرا تھام کر باہر جھانکنے لگی۔

اب وہ برگد کے درخت سے کمر ٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ سفید کرتا شلوار میں ملبوس تھا۔ سامنے کے بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے اور وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا پھر اٹھ کر رہٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''شاید انہیں پیاس لگی ہو۔'' زرینہ نے سوچا۔ ''اگر ہم یہاں نہ آتے یا پھر رضیہ ہی بیکار کی ضد نہ کرتی تو انہیں اتنے گرم موسم میں یوں باہر نہ بیٹھنا پڑتا۔''
اپنی سوچ سے وہ تب چونکی جب اس نے رضیہ کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کیا۔
''کب تک یوں کھڑی رہوگی؟''
''شاید انہیں پیاس لگی ہے۔'' اس نے رضیہ کی بات نظرانداز کر دی۔
''تمہیں میری باتیں بری تو لگتی ہیں لیکن میں جو کہتی ہوں تمہارے بھلے کو مدنظر رکھ کر کہتی ہوں۔'' رضیہ بولی۔ ''واپس آ جاؤ' ابھی یہ درد برداشت ہو سکتا ہے لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب تم یہ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہوگی۔''

لیکن وہ رضیہ کی بات سن ہی کب رہی تھی' اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ رضیہ نے شاہ جی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اسی کی باتیں سن کر باہر گئے تھے۔
''شاہ جی!'' بے اختیار اس نے حیدر علی کو آواز دی۔
حیدر علی کے رہٹ کے جانب بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔
گوری کھڑکی میں کھڑی بے تابی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کھڑی اس کی بہن گھبرا کر [illegible] پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اس کے قدم کھڑکی کی جانب اٹھنا شروع ہوئے۔
''یہ کیا حماقت ہے؟'' رضیہ نے گھبرا کر کہا۔ ''کیوں دی تم نے شاہ جی کو آواز؟''
''کیوں دی آواز؟'' زرینہ نے جیسے خود سے سوال کیا۔
''تمہاری آواز خالہ جی نے بھی سن لی ہوگی۔''
''میں کیا کروں رضیہ' میرا دل میرے بس میں نہیں ہے۔'' اس نے کھڑکی کی چوکھٹ سے کمر ٹکا لی۔
''اب یہ حماقت کر ہی لی ہے تو ضروری نہیں کہ اسے کھینچ کر لمبا بھی کر لو۔ ہٹو' کھڑکی بند کرو' نہ تم نے چہرہ ڈھانپا ہوا ہے اور نہ سر۔''

دوسرے کمرے سے چارپائی کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی چارپائی سے اتر رہا ہو۔ رضیہ نے ایک نظر قدم قدم آگے بڑھتے شاہ جی کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی سمت۔
''تمہیں سمجھانا بے کار ہے لیکن میں خالہ جی کو تو وہاں روک سکتی ہوں ناں۔'' وہ بولی۔ ''تمہارے لیے نہیں' اباجی اور اپنے گھرانے کی عزت کے لیے۔''
وہ تیزی سے پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔
''گوری!'' اس نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر زرینہ کو پکارا۔
''شاہ جی! آپ کو پیاس لگ رہی ہے؟'' اس نے دوپٹے سے سر ڈھانپتے ہوئے کہا۔
''دید کی پیاس تو مٹ گئی۔'' اس نے زرینہ کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن دل کی تشنگی نہیں مٹی۔''
''آپ اندر آ جائیں۔''
''زرینہ!'' رضیہ کمرے کے اندر چلی آئی۔ اس نے سر اور چہرہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ زرینہ نے پلٹ کر دیکھا۔
''کھڑکی بند کرو اور کمرے سے باہر نکلو۔''
لیکن جب زرینہ اس کی بات سن کر بھی ساکت کھڑی رہی تو وہ تیزی سے اس کے قریب چلی آئی۔ کھڑکی کے دوسری جانب حیدر علی بھی موجود تھا۔ اس نے زرینہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔
''بند کرو کھڑکی۔''
''پلیز بہن جی!'' حیدر علی بولا۔ ''اس کا کوئی قصور نہیں ہے اسے کچھ مت کہیں۔''
''شاہ جی! میں اس کی بڑی بہن ہوں۔'' رضیہ نے کہا۔ ''میں ہاتھ جوڑ کر آپ کی منت کرتی ہوں کہ آپ اپنے قدم یہیں روک لیں۔ ہم اُمتی لوگ آپ کے پاؤں کی خاک ہیں' آپ کی برابری کے مستحق نہیں' جیسے تنکا تنکا جوڑ کر چڑیا گھونسلا بناتی ہے' ویسے ہی صدیوں کی محنت سے

ہم نے یہ عزت اور مقام بنایا ہے' اس عزت کو ہم سے نہ چھینیں۔"

"میرے لیے بھی آپ کی بہن قابلِ عزت ہے۔" حیدر علی بولا۔ "آپ یہ گمان نہ کریں کہ......"

"قابلِ عزت ہے تو سیدھے راستے سے آئیں اور آ کر لے جائیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ بات ناممکن ہے۔"

"محبت میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا' لیکن ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ابھی تو بھائی جان کی بھی شادی نہیں ہوئی' بڑی آپا اور زیبی آپا کی نسبت تک طے نہیں ہوئی۔ کچھ وقت تو لگے گا۔"

"شاہ جی! میری بہن بہت بھولی بھالی ہے لیکن آپ تو سمجھ دار ہیں' آپ کے گھرانے کی سیّد زادیوں میں اسے نہ عزت ملے گی' نہ وہ مقام جس کی یہ مستحق ہے۔"

"اسے عزت اور مقام دلانا میرا کام ہے' آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔"

"میں فکر نہیں کروں گی تو کون کرے گا' یہ مجھے کتنی پیاری ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ میں خود جاہل رہ گئی لیکن اماں ابا سے لڑ جھگڑ کر اسے دس جماعتوں تک پڑھوایا' اس کے منہ سے بات نکلی اور میں نے کسی نہ کسی طرح پوری کی لیکن اب یہ جس اندھے کنویں میں چھلانگ لگا رہی ہے میں اسے کیسے اس میں چھلانگ لگانے دوں گی۔"

"رضیہ! خدا کے لیے ایسا تو نہ کہو۔" زرینہ نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے کہنے دو زرینہ' میں نے بہت مشکل سے اپنے اندر یہ سب کہنے کی ہمت جمع کی ہے۔" وہ پھر حیدر علی سے مخاطب ہوئی۔ "ہم آپ کے ٹکڑوں پر پلنے والے لوگ ہیں۔ ہم آپ کی برابری نہیں کر سکتے' نہ ہی آپ کے خاندان کے مخمل میں ٹاٹ کا یہ پیوند کوئی بھی برداشت کر سکے گا۔ باتیں ہوں گی' بدنامی ہوگی' جگ ہنسائی ہوگی' برسوں اور نسلوں کی کمائی ہوئی عزت پل بھر میں خاک میں مل جائے گی۔"

"آپ کیوں سوچ رہی ہیں ایسا۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں کسی بھی صورت کسی سے اعلیٰ و ارفع ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ خاندانی عزت بہت بڑی چیز ہوتی ہے لیکن یہی واحد چیز نہیں ہے۔ انسان کی ذاتی صفات اسے اچھا یا برا بناتی ہیں۔ میں اس بات کو نہیں مانتا کہ محض خاندانی عزت کو ہی بڑائی ناپنے کا پیمانہ بنایا جائے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بہن کو اپنی بیوی' اپنی عزت بناؤں گا' اسے وہ مقام دلاؤں گا جو میری بیوی کو میرے گھرانے میں ملنا چاہیے۔ اسے یوں راستے میں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"آپ نے وعدہ کیا ہے میں یقین کر رہی ہوں کیونکہ آپ کے گھرانے میں کبھی کوئی وعدے سے پھرا نہیں ہے۔" بالآخر رضیہ نے کہا۔ "بس اتنی گزارش ہے آپ سے کہ اسے ہمیشہ اپنی عزت سمجھنا۔"

"رضیہ۔" خالہ کبریٰ کی آواز آئی۔

"آئی خالہ۔" رضیہ جلدی سے چلائی پھر اس نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ "چلو زرینہ۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹا۔

"چھوڑو مجھے۔" زرینہ نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"چلو میرے ساتھ۔" وہ اسے کمرے سے باہر لے آئی۔

"جی خالہ۔"

"بیٹا کھانا پک گیا ہو تو مجھے کسی برتن میں ڈال دو' میں علی کو دے آؤں۔"

"خالہ جی! یہ برا لگتا ہے کہ ہماری وجہ سے وہ باہر کھانا کھائیں۔" زرینہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا کروں؟ کہاں کھانا کھائے گا وہ؟"

"انہیں اندر بلا لیں۔" رضیہ نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ "ہمیں ان کی شرافت کا یقین آ گیا ہے۔ ہماری وجہ سے وہ باہر گرمی میں کھانا کھائیں' یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔"

"ڈیوڑھی میں کھانا دے دوں؟"

"ڈیوڑھی ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔" زرینہ مضطرب ہوگئی۔

"کیا نہیں ہے؟"

"کچھ نہیں خالہ۔" رضیہ جلدی سے بولی۔ "چاہیں تو کمرے میں بلا لیں۔ آپ نے انہیں کہا ہے' میں انہیں بھائی کہتی ہوں۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے' وہ واقعی بہت شریف اور نیک ہے۔ بہت خاندانی لڑکا ہے۔ ٹھہرو' میں اسے اندر بلا لاؤں۔" وہ باہر نکل گئیں۔

"رضیہ!" زرینہ بولی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "بہت بہت شکریہ۔"

"پرے ہٹو۔" اس نے خود کو چھڑایا۔

"کیسے ہٹوں' شکر ہے تمہیں اُن پر اور ہماری محبت پر یقین آ گیا۔"

"مجھے ان کے وعدے پر یقین آیا ہے کیونکہ ان کے گھرانے میں وعدہ خلافی کی ریت نہیں ہے۔ اگر تم بیاہ کر سیّد خاندان میں چلی جاؤ اور تمہیں وہاں عزت اور مرتبہ مل جائے تو میں تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔"

"اب خوشی سے پاگل ہو جاؤ گی اور جب میں کہتی تھی تو چاند اور چکوری اور نہ جانے کیا کیا مثالیں دے کر سمجھاتی تھیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" زرینہ ہنسی۔

"اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تمہیں کھلی چھٹی مل جائے۔"

"جب چُھٹی چاہیے ہوگی تو تمہیں درخواست دوں گی باقاعدہ اور تم سے دستخط لے کر ہی ہٹوں گی۔" وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔

"اب کھی کھی، کھی کھی ہی کیے جاؤ گی یا برتن بھی لگاؤ گی۔" رضیہ نے اسے ڈپٹا۔

"آج تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ خوب ہنسوں اور میرے ساتھ ساتھ آسمان اور زمین پر رہنے والے سب پرندے، سب پھول، سب جگنو، تتلیاں اور ستارے ہنسیں۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آج تو ساری دنیا کے رنگ ہی بدل گئے ہیں۔ یوں نکھر آئے ہیں جیسے بوندیں پڑنے کے بعد ہر شے نکھر جاتی ہے۔ آسمان دُھل جاتا ہے، پتے شفاف ہو جاتے ہیں، پھولوں کے رنگ شوخ ہو جاتے ہیں، خوشبو کے بوجھ سے ہوا کی کمر جھکی جاتی ہے۔"

"اُف...... اُف...... اُف......" رضیہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "یہ شاعری چھوڑو اور برتن لگاؤ۔"

"یہ شاعری کہاں ہے میری اَن پڑھ بہن، یہ سو فیصد نثر ہے۔"

"برتن لگاتی ہو یا تمہاری پٹائی کروں؟" رضیہ نے اسے دھمکایا۔

"اتنا شوق ہے برتن لگانے کا تو خود لگالو۔" وہ بے تعلقی سے بولی۔

"عشق و عاشقی تم کرو اور خدمت گزاری میں کروں، یہ بھی خوب رہی۔"

"محترمہ! آپ نے ہی کچھ دیر قبل اعلان نیاز پور جاری کیا تھا کہ وہ آپ کے بھائی ہیں اپنے بھائی کی خدمت کرنا آپ کا فرض ہے ہمارا تو کوئی بھائی ہے نہیں اس لیے ہم یہاں بیٹھ کر آرام فرمائیں گے اور آپ اپنے بھائی کی خاطر داری کرنے کے لیے برتن لگائیں گی۔"

"تم سے اللہ پوچھے۔" وہ چڑ کر اٹھ گئی۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو زرینہ بھی رضیہ کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں بھاگ آئی۔

"اب کیا ہوا؟"

"وہ آرہے ہیں؟"

"ظاہر ہے اندر بلایا ہے تو آئیں گے ہی۔"

"مجھے شرم آ رہی ہے۔"

"تھوڑی دیر پہلے جب کھڑکی میں ننگے سر، ننگے منہ کھڑی تھیں۔ تب تو شرم نہیں آرہی تھی۔ یہ اچانک ہی کہاں سے ٹپک پڑی۔"

"اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھی، اب آگئی ہوں۔"

"تو پھر یہیں باورچی خانے میں ٹھہر جاؤ کمرے میں مت جاؤ۔" رضیہ نے کہا۔

"کتنی ظالم ہو تم۔" پھر وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔ "تم میرے ساتھ کمرے میں چلو

نا۔"

"مجھے کیوں درمیان میں گھسیٹتی ہو، خالہ آ کر کھانے لے جائیں گی، میں یہیں رہوں گی۔"

"تم سچ مچ بہت ظالم ہو، آ جاؤ گی تو تمہارا کیا جائے گا، ہاں میرا بھلا ہو جائے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات میں تمہارا بھلا ہے اور کس میں برا، میں تو بس تمہیں اس راستے پر چلتے ہوئے دیکھ رہی ہوں جو سامنے دکھائی دے رہا ہے، کہاں روڑے آئیں گے اور کہاں رکاوٹ، یہ مجھے ابھی نظر آ رہا ہے اور یہ بھی کہ ان رکاوٹوں کو عبور کرنے کے لیے تمہارے پاس صرف چھوٹے شاہ جی کے کیے ہوئے وعدے کی لاٹھی ہے، وہ اپنے وعدے پر قائم رہے تو تم سربلند رہو گی اگر وعدے سے پھر گئے تو پھر کبھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہو گی۔"

"کیا تمہیں شک ہے اُن کے وعدے پر؟" زرینہ نے اضطراب سے کہا۔

"مجھے وعدے پر نہیں تقدیر پر شک ہے۔" رضیہ بولی۔ "پتا نہیں کیوں زرینہ مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ کہیں کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا...... نہ تمہارے لیے اور نہ چھوٹے شاہ جی کے لیے۔"

"تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتیں۔"

"میں خود سمجھ نہیں پا رہی کہ یہ اشارہ کس بات کا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں گی، بس یہ سب محسوسات کی بات ہے۔"

"رضیہ بیٹا!" خالہ نے باورچی خانے میں جھانکا۔ "کھانا نہیں تیار؟"

"بس لا رہی ہوں۔" اس نے جلدی سے ڈونگے میں سالن نکالا۔

رضیہ ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی تو زرینہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کے دوپٹے کا کونہ پکڑے اندر چلی آئی۔ کھانے کے دوران تقریباً خاموشی ہی رہی۔ بس خالہ اور حیدر علی کے درمیان اکا دکا باتوں کا سلسلہ کبھی چلتا اور کبھی رک جاتا۔ کھانا کھا کر خالہ تو آرام کرنے لیٹ گئیں۔ رضیہ ان کی ٹانگیں دبانے لگی اور زرینہ برتن دھونے لگی برتن تھے ہی کتنے۔ چند منٹوں میں فارغ ہو کر ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ مڑی۔ دروازے میں حیدر علی کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

"مجھے اندر بلا کر خود غائب ہو گئیں۔" اس نے کہا۔ "پھر میرے آنے کا کیا فائدہ؟"

"میں نے تو آپ کو اس لیے اندر بلایا تھا کہ باہر گرمی پڑ رہی ہے۔"

"اپنے لیے نہیں بلایا تھا؟"

"اپنے لیے؟" اس نے حیدر علی کی جانب دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اپنے لیے کیوں بلاتی میں آپ کو؟"

"تو میں چلا جاؤں؟"

''بے شک! لیکن پانی پی کر جائیں' کہیں پھر واپس نہ آنا پڑے۔'' اس نے نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکنے کی کوشش کی لیکن حیدر علی کے ہونٹوں پر ابھرتی مسکراہٹ دیکھ کر اس سے اپنی ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور پھر وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

''شی۔'' اچانک زرینہ کو خیال آیا کہ صحن کے کونے میں ہونے کے باوجود ان کی آوازیں خالہ کبریٰ تک پہنچ سکتی ہیں۔ ''آہستہ۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' حیدر علی نے بھی ویسے ہی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''خالہ نے سن لیا تو؟''

''تو کیا ہوگا؟''

''غضب ہو جائے گا اور تو کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہ تو تمہیں محبت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' وہ مزے سے بولا۔ ''محبت تو یوں بھی آگ کا دریا ہوتی ہے اور اس آگ میں صرف اسی کو کودنا چاہیے' جو اس سے گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔''

''صلاحیت تو بہت ہے' کبھی آزما کر دیکھ لینا بے شک۔'' وہ بولی۔ ''مجھے تو بس ایک ہی خوف ہے۔''

''کیا خوف؟''

''عزتِ سادات نہ سہی لیکن تھوڑی بہت عزت ہمارے پاس بھی ہے۔ کبھی حالات بگڑے تو آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا۔ مردوں کا تو کبھی کچھ نہیں جاتا۔ ہاں عورت اپنا سب کچھ کھو دیتی ہے۔ اعتماد' عزت اور بعض اوقات زندگی بھی۔ مجھے زندگی کھو دینے سے ڈر نہیں لگتا لیکن اعتماد اور عزت کا جانا مجھے گوارا نہیں۔''

''وہ مرد' مرد نہیں ہوتا جو اپنی محبت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟''

''مجھے تو آپ پر اعتماد ہے لیکن کیا کروں' رضیہ خود بھی ڈرتی ہے اور مجھے بھی ڈراتی رہتی ہے۔''

''بہن ہے ناں تمہاری' اس کی فکر بھی بجا ہے لیکن کچھ عرصے میں جب وہ مجھے جاننے لگے گی تو وہ بھی فکر مند ہونا چھوڑ دے گی۔'' پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔ ''کیا خیال ہے باہر برگد تلے نہ بیٹھیں' بہت ٹھنڈا میٹھا سایا ہے۔''

''کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''صبح سے میں وہاں بیٹھا ہوا تھا...... ایک بلی' دو کتوں' تین گلہریوں اور خالہ کبریٰ کی مرغیوں کے علاوہ جو جاندار مجھے وہاں دکھائی دیئے ہیں وہ رہٹ کے دو بیل ہیں' لیکن میرے خیال میں یہ کسی سے تمہاری وہاں موجودگی کا ذکر نہیں کریں گے۔''

خالہ اس وقت سو رہی تھیں اس لیے زرینہ کو کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ رضیہ کو وہ منا سکتی تھی۔ ہاں باہر دیکھ لیے جانے کا خدشہ تھا لیکن حیدر علی کی موجودگی میں اسے یہ خدشہ بھی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''فصل کھڑی ہوئی ہے' کھیتوں کے ان آخری سروں پر اس وقت کون آئے گا۔'' اس نے اپنے دل کو تسلی دی اور حیدر علی کے ساتھ باہر چلی آئی۔

وہ دونوں برگد کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔

''تمہارا حویلی آنا جانا ہے؟''

''جی۔'' وہ بولی۔ ''آپ کی بہنوں سے اکثر ملنے جاتی ہوں۔''

''لیکن وہاں ملنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔''

''میں آپ کے ساتھ آپ کے بھروسے پر آ تو گئی ہوں شاہ جی لیکن یوں ملنا اچھی بات تو نہیں ہے۔'' وہ گھاس کے تنکے توڑتے ہوئے بولی۔

''جب تک شادی نہیں ہوتی تب تک تو ایسے ہی مل سکتے ہیں۔''

''اور......'' وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی۔

''اور کیا؟''

''میرا مطلب ہے کہ کب تک ہم یونہی ملتے رہیں گے؟''

''یعنی شادی کب ہوگی؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ ''ابھی تو بھائی جان کی شادی ہونی ہے' بڑی آپا اور زیبی آپا کی شادی ہونی ہے۔ میرا نمبر بہت بعد میں آئے گا۔''

''تو پھر محبت اتنی جلدی کیوں کی؟'' وہ شکایت آمیز انداز میں بولی۔

''اتنی جلدی؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو حیران تھا کہ اب تک تم سے الگ کیسے تھا؟ اب سے پہلے تم کہاں تھیں' مجھے ملی کیوں نہیں؟''

وہ ہنس پڑی۔ ''مجھے بنائیں مت۔'' پھر بولی۔ ''آپ کے بھائی جان تو اتنے بڑے ہیں پھر انہوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''انہوں نے شادی کیوں نہیں کی؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا بتائے۔

رجب علی کی حرکتیں ابھی تک یہاں کے لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھیں اور وہ اسے پیر صاحب کے گدی نشین کی حیثیت سے بہت عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے ولایت میں رہنے کے دنوں میں یہاں اس کی حرکتوں کی کچھ نہ کچھ بازگشت سنائی تو ضرور دی لیکن کانوں کانوں میں ہونے والی باتوں نے اس وقت دم توڑ دیا تھا۔ جب وہ دونوں بغیر میموں کے ایئر پورٹ پر اترے تھے۔ رجب علی بگڑے ہوئے رئیس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اسے شادی کی ضرورت صرف نسل چلانے کے لیے تھی' گھر بنانے کے لیے نہیں۔ ''گھر'' کا تصور اس کے لیے

بالکل بے معنی تھا۔ اسے تو گھر کی اتنی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی جتنی ایک مسافر کو رات بسر کرنے کے لیے کسی سرائے کی ہوتی ہے۔ سو ایسے شخص کو شادی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

''ان کی منگیتر بھی تو ہے۔'' زرینہ کی بات اسے سوچ کے سمندر سے باہر کھینچ لائی۔ ''کتنا انتظار ہے اسے شادی کا' پھر بھی وہ شادی نہیں کرتے۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ ان کی منگیتر کو شادی کا انتظار ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''یہ بھی بھلا بتانے کی بات ہوتی ہے۔ یہ سب تو سمجھنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ویسے مجھے یہ بات بڑی بی بی نے بتائی تھی۔''

''بڑی بی بی کون ہے؟''

''آپ کی بڑی آپا مہرالنساء۔''

''ہوں۔'' پھر وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ''اصل میں بھائی جان کو شادی کا شوق نہیں ہے لیکن آج کل بابا جان اور اماں جان ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں' بس کچھ ہی دنوں میں ان کی شادی ہو جائے گی۔''

''اور بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کی شادی کب ہوگی؟''

''جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ ملا فوراً شادی کر دیں گے۔''

''ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔''

''ایک نہیں سو باتیں کہو' تمہاری کسی بات کے برا ماننے کا کیا سوال۔''

''سب کہتے ہیں کہ آپ کی بہنوں کی شادی نہیں ہوگی۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا۔

''کہتے ہیں کہ اس طرح جائیداد تقسیم ہو جائے گی۔''

''ایسے ہی کہتے ہیں لوگ' بھلا ایسے بھی کبھی ہو سکتا ہے۔''

''پتا نہیں۔'' زرینہ نے ایک دم دفاعی انداز اختیار کیا۔ ''یہ تو لوگ کہتے ہیں۔''

☆======☆======☆

''زبانِ خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے۔'' مہرالنساء کی ذاتی ملازمہ پندرہ سالہ حمیدہ اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھی۔ ''میرے بھائی کو یہ بات اس کے ماسٹر نے بتائی تھی۔''

''ہاں۔'' مہرالنساء سوچ میں ڈوب گئی۔

''کیا سوچنے لگی ہیں بڑی بی بی؟'' اس نے پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں کہ اتنی بڑی حویلی میں اگر تمہارا ساتھ بھی نہ ہوتا تو میں کہاں جاتی؟ کس سے بات کرتی' کس سے اپنے غم کہتی۔''

''آپ پورا بھروسہ رکھیں مجھ پر۔'' وہ اس کے پاؤں دباتے ہوئے بولی۔ ''ان شاء اللہ

آپ کی باتیں اپنے اندر دفن کر دوں گی میں۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ آپ اپنے دکھ سکھ مجھ سے کہتی ہیں۔''

''مجھے بتاؤ حمیدہ اور کیا کہتے ہیں لوگ؟''

''کیا ہوا جو خاندان میں آپ کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں ہے۔ آخر خاندان کے باہر بھی تو سیّد زادوں کی کمی نہیں ہے' لیکن بی بی جائیداد کے بٹوارے کا خوف ہے جو آڑے جاتا ہے۔''

''لیکن مجھے زمین' جائیداد کسی چیز میں سے حصہ نہیں چاہیے۔ میں نے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا' کچھ نہیں مانگا مجھے اس حویلی کی نہیں' ایک چھوٹے سے گھر کی ضرورت ہے۔ زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت۔''

☆======☆======☆

زیب النساء مسہری پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ زندگی کتنی اداس کتنی بوجھل ہے کب تک یوں تنہائی برداشت کی جا سکتی ہے۔ ہر چیز ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ کٹورے میں بھی ایک حد تک پانی بھرا جاتا ہے۔ زیادہ ڈالنے کی کوشش کی جائے تو وہ چھلک جاتا ہے۔ کٹورا تو چھلک کر بھی محفوظ رہتا ہے لیکن انسان کی چھلکن سارے سماج اور اخلاق کے سب قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یا خدا مجھے اس وقت سے محفوظ رکھنا۔ میں نے اب تک اپنے اوپر جو بند باندھ رکھے ہیں انہیں قائم رکھنا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ''ٹھک ٹھک۔''

''کون ہے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔

''زیبی آپی میں ہوں۔'' حیدر علی کی آواز آئی۔

زیب النساء نے جلدی سے اپنی بڑی سی چادر ٹھیک طرح سے سر پر جمائی اور مسہری سے اتر آئی۔

''آ جاؤ۔''

حیدر علی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''تم سارا دن کہاں ہوتے ہو علی؟'' وہ اندر آ کر بیٹھ گیا تو زیب النساء نے پوچھا۔

''میں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں ایک بہت خوبصورت' بہت اچھی جگہ جاتا ہوں۔''

''ہاں تم تو جا سکتے ہو۔'' زیب النساء نے دکھ سے سوچا' لیکن منہ سے صرف اتنا بولی۔ ''ہریالی میں؟''

''جی آپی' وہاں ہریالی بھی ہے۔ رہٹ بھی' بہت سی مرغیاں بھی ہیں اور ایک بہت بوڑھا برگد بھی' یہ دیکھیں۔'' اس نے ایک خاکی لفافہ زیب النساء کی جانب بڑھایا۔ ''یہ تصویریں ہیں

اس جگہ کی۔''

زیب النساء نے لفافہ کھول کر تصویریں نکالیں اور پھر ایک ایک کر کے سب تصویریں دیکھ لیں۔''اس میں ہریالی تو نظر نہیں آ رہی۔''

''آپی یہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں ہیں ناں' اچھی ہیں؟''

''ہاں بہت اچھی۔'' اس نے تصویریں واپس لفافے میں ڈالیں۔

''آپی مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔''

''کہو۔''

''آپ میرے لیے بالکل ماں جی کی طرح ہیں' آپ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا میں نے۔'' اس نے ایک نظر بہن کی طرف دیکھا جو اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔'' بلکہ آپی آپ ہی میری واحد راز دار ہیں۔''

''ایسی کون سی راز کی بات ہے۔''

''ابھی کسی سے کہنا مت۔''

''پگلے! میں نے کبھی بھی کسی کو تمہاری کوئی بات بتائی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''آپی! مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔''

''وہ تو ولایت میں بھی تمہیں کتنی لڑکیوں سے ہوئی تھی۔''

''نہیں آپی! یہ ویسی محبت نہیں ہے۔'' وہ اس کے سامنے ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

''ارے تم اوپر بیٹھو ناں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولا۔'' آپ جلدی سے میری بات سنیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں سب سے یہ بات شیئر کروں' ہر کسی کو اپنے اس راز میں شریک کروں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فوری طور پر کسی کو یہ بات نہیں بتا سکتا۔ صرف آپ ہیں جن سے میں ہر بات کہہ سکتا ہوں۔''

''اب کہہ بھی دو کہ اب تمہیں کس سے محبت ہوئی ہے؟''

''یہ اب اور تب والی محبت نہیں ہے آپی۔ یہ سچ مچ کی محبت ہے' جو ہمیشہ رہنے والی ہوتی ہے۔''

''ہمیشہ رہنے والی محبت تو بہت پریشان کن بات ہے۔'' زیب النساء نے تبصرہ کیا۔''وہ محبت نہیں رہتی روگ بن جاتا ہے۔''

''چھوڑیں بھی آپی! میں محبت کو روگ بنانے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے خستہ حال قسم کے عاشقوں سے وحشت ہی نہیں ہوتی بلکہ نفرت محسوس ہوتی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو معاشرے کی چند فرسودہ سی روایات میں خود کو جکڑ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو در حقیقت محبت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے کہ وہ بزدل ہوتے ہیں اور بزدلوں کو میں بھی

پسند نہیں کرتا۔''

''یہ تقریر بند کرو اور بتاؤ کہ تمہاری ہمیشہ رہنے والی محبت کس سے ہوئی ہے؟'' وہ اب بھی حیدر علی کے عشق کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی۔'' کیا گاؤں کی ہی کوئی لڑکی ہے؟''

''ہاں! وہ گاؤں کی ہی گوری ہے۔''

''تم گوری سے نیچے نہیں آ سکتے؟ وہاں ولایت میں تو گوریاں یوں بھی تھوک کے بھاؤ ملتی ہیں لیکن تمہاری محبت کو داد دینے کو جی چاہتا ہے' جس نے یہاں بھی گوری ڈھونڈ لی۔''

''نہیں آپی! یہ ویسی گوری بھی نہیں ہے' اس کی رنگت تو شہید آ گیں ہے۔ وہ ولایت کی گوریاں تو اس رنگت کے لیے مرتی ہیں کتنے کتنے پونڈ اور ڈالروں کی کریمیں اور لوشن لے کر اپنی رنگت ٹین میرا مطلب ہے شہد آ گیں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسے تو یوں لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی خاص سانچے میں ڈھال کر نکالا ہو۔ اتنے لمبے سیاہ بال ہیں اس کے۔'' اس نے گھٹنوں تک اشارہ کیا۔'' اور ہر وقت ہنستی ہوئی بڑی بڑی شربتی آنکھیں' یوں لگتا ہے کہ بہت فرصت کے وقت تخلیق کیا گیا ہے اسے۔''

''ایسی کون سی لڑکی ہے گاؤں کی؟'' زیب النساء نے اپنے ذہن پر زور دیا۔

''اور پتا ہے آپی' وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''کیا؟'' وہ حیران رہ گئی۔''تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔''

''خبر کیوں نہ ہوتی۔ ایک تو میں ہوں ہی اتنا اسمارٹ' پھر آپی دل کو بھی تو دل سے راہ ہوتی ہے ناں۔''

''اسے معلوم ہے کہ تم حیدر علی شاہ ہو۔ اس حویلی اور ان زمینوں کے مالک۔ پیر صاحب جلال الدین شاہ کے منجھلے بیٹے؟''

''ہاں۔''

''پھر بھی وہ تمہارے قریب آ گئی؟''

''کیوں نہ آتی۔'' وہ بولا۔'' آپی کبھی زمینیں اور جائیدادیں بھی انسانوں اور رشتوں کا نعم البدل ہوئی ہیں؟ اصل چیز تو انسان اور یہ محبتیں ہیں' باقی سب کچھ تو جھوٹ ہے۔''

''اسے نہیں پتا کہ اس کشادہ حویلی میں......'' زیب النساء گہرا سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

''اس کشادہ حویلی میں کیا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولی۔''تم بتاؤ اپنی گوری کے بارے میں۔''

''یہ بہت مصیبت ہے کہ وہ پردہ کرتی ہے' پھر بھی آج کتنی دیر تک ہم بوڑھے برگد کی چھاؤں تلے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آپی! وہ اتنی سادہ ہے اور اس کی باتوں میں اتنی معصومیت

ہے کہ بعض اوقات مجھے ہنسی آ جاتی ہے پتا ہے آج کیا کہنے لگی۔''

''کیا؟''

''کہ میں اتنی اونچی حویلی میں رہنے کے باوجود وہاں ایک چھوٹے سے گھر میں سارا دن کیسے گزارا کر لیتا ہوں اور کانچ اور چاندی کے بجائے المونیم کے گلاس میں پانی کیسے پی لیتا ہوں۔'' وہ ہنسا۔ ''ہے ناں دلچسپ بات۔ پیاسا اس بات کی پروا کب کرتا ہے کہ وہ اوک سے پانی پی رہا ہے یا سونے چاندی کے کٹورے میں۔''

''وہ پردہ کرتی ہے؟'' زیب النساء پُرخیال میں بولی پھر کچھ سوچ کر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن وہ نہیں ہو سکتی۔''

''اتنا سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے' میں اس کا نام بتا دیتا ہوں۔''

''تو بتاؤ۔''

''لیکن اس نے منع کیا تھا' وہ ڈرتی ہے۔ اصل میں اس کی بڑی بہن نے اسے ڈرا دیا ہے۔''

''تم کہیں......؟'' وہ چپ ہو گئی۔

''آپ اسے جانتی ہیں!'' وہ بولا۔ ''یہیں کی مسجد کے امام کی بیٹی ہے۔''

''زرینہ؟''

''جی آپی! مجھے اس کا نام کچھ اچھا نہیں لگا' لیکن وہ خود بہت اچھی ہے۔''

''تم سنجیدہ ہو علی؟'' زیب النساء نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس سے پوچھا۔

''تو آپ کیا سمجھ رہی ہیں' اس وقت سے میں مذاق کر رہا ہوں؟ نہیں آپی! آپ سے تو مذاق نہیں کروں گا ناں؟''

''تم مجھ سے نہیں زرینہ سے مذاق کر رہے ہو۔ تمہاری باتوں سے مجھے شک تو محسوس ہوا تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زرینہ جیسی لڑکی عشق و عاشقی کے معاملوں میں پڑ سکتی ہے' وہ تو خاصی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔''

''سلجھی ہوئی ہے تبھی تو اسے آپ کے بھائی نے پسند کیا ہے آپی! میری پسند کوئی معمولی تو ہو نہیں سکتی اور پھر یہ آپ کو کس نے بتا دیا ہے کہ سلجھی ہوئی لڑکیاں محبت نہیں کر سکتیں۔ آپ یہ بھی غلط سمجھ رہی ہیں کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔ قسم لے لیں میں بالکل سنجیدہ ہوں۔''

''اف خدایا۔'' وہ پریشان ہو گئی۔

''کیوں آپی؟'' وہ تشویش سے بولا۔ ''آپ پریشان کیوں ہو گئیں؟''

''تم جانتے ہو کہ بابا جان تمہاری نسبت طے کر چکے ہیں؟''

کیا؟ ایک لمحے کو تو اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ ''کب کر چکے ہیں' کس سے

کر چکے ہیں؟''

''ماموں جان کی بیٹی فوزیہ سے۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے آپی! مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا فیصلہ' نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔''

''ایسا کرنے کے لیے تم سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ بابا جان سارے گاؤں کے فیصلے خود کرتے ہیں۔ سب کی شادیاں بابا جان کی مرضی سے طے ہوتی ہیں پھر ان سے ان کی اولاد کے لیے یہ حق کوئی کیسے چھین سکتا ہے؟''

''مجھے نہ سارے گاؤں کی پروا ہے اور نہ میں نے سب کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ مجھے صرف اپنی اور گوری کی پروا ہے۔ آپی میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گا اور یہاں بغیر مجھ سے کوئی بات کیے بغیر میری مرضی معلوم کیے' میری منگنی بھی کر دی گئی۔'' وہ غصہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''کب ہوئی میری یہ منگنی جس کی مجھے بھی خبر نہیں ہے۔''

''برسوں پہلے جب تم ولایت میں تھے۔''

''کمال ہے یہ بھی خوب رہی مجھے پڑھایا لکھایا۔ اس قابل بنایا کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی بھی راستے کا تعین کر سکوں۔ مجھے قوتِ فیصلہ ملی لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ملا۔ ہونہہ لیکن آپی! میں بتا رہا ہوں کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا' کبھی نہیں۔'' وہ غصے سے بولا۔

''دھیرج علی...... دھیرج۔'' زیب النساء نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا۔ ''غصے اور زور زبردستی سے کوئی معاملہ سلجھتا نہیں ہے۔ اب تم کیا بابا جان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گے؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ کچھ دن خاموشی سے انتظار کرو' جب تک بھائی جان کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک تمہاری شادی کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس وقت تک کوئی نہ کوئی راہ شاید نکل آئے۔''

''اور ماں جی اور بابا جان ان کی شادی میں تاخیر پر کسی صورت رضامند نہیں ہیں۔'' وہ بولا۔ ''خیر مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ ان کی شادی کب اور کہاں ہوتی ہے۔ مجھے صرف اس بات کی پروا ہے کہ مجھے کہاں شادی کرنی ہے۔''

''اس بارے میں کچھ نہ کچھ سوچیں گے' تم ابھی سے جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔''

''آپی! بھائی جان کی منگنی کے متعلق سب کو معلوم تھا' خود بھائی جان کو بھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری منگنی کی مجھ سمیت کسی کو خبر بھی نہ ہو۔''

''بس تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ اب بھائی جان کی شادی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی اعلان ہو جائے گا۔''

''آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے آپی۔''

''میں تمہیں کسی بھی بڑی پریشانی سے بچانا چاہتی ہوں۔'' زیب النساء نے پیار سے کہا۔ ''کیاتم زرینہ کو مجھ سے ملواسکتے ہو؟''

''آپ کیوں ملنا چاہتی ہیں اس سے؟''

''میں اسے فوزیہ کے متعلق نہیں بتاؤں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''آل رائٹ! میں اس سے کہوں گا کہ وہ آپ سے مل لے۔''

''اب تم اپنے کمرے میں جاکر آرام کرواور اپنے ذہن کواس مسئلے میں مت الجھاؤ۔''

''اب آرام کیسا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں گوری کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ زمینیں' جائیداد' یہ حویلی سب کچھ .....''

''علی!'' وہ آزردگی سے بولی۔ ''مجھے تمہاری آمد کا کتنا انتظار تھا۔ جب تم ولایت میں ہوتے تھے تو میں دنوں تمہاری چٹھی کا انتظار کرتی تھی۔ میں کتنی اکیلی ہوتی تھی لیکن تمہاری چٹھی کے آجانے سے مجھے لگتا تھا جیسے میری تنہائی ختم ہوگئی ہو' جیسے تم میرے پاس ہو۔ تمہارے آنے کی کتنی شدت سے دعائیں مانگی تھیں میں نے۔ اب تم آگئے ہو تو پھر چھوڑ کر جانے کی باتیں کرتے ہو۔''

''زیبی آپی!'' حیدر علی نے اس کی آنکھ سے ڈھلکتا ہوا آنسو اپنی انگلی سے پونچھا۔ ''پلیز روئیں مت' میں آپ کو یوں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ کی شادی ہوگی۔ پیار کرنے والا شوہر ہوگا۔ پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ آپ تنہا کب ہوں گی۔''

زیب النساء نے آنکھیں موندلیں۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوگا علی۔'' اس نے اپنے دل میں کہا۔

''زیبی آپی! یہ تنہائی آپ نے خود پر کیوں مسلط کی ہوئی ہے۔ آپ نے بھی اور بڑی آپا نے بھی۔ آپی پردہ یہ تو نہیں کہتا کہ آپ گھر سے باہر بھی نہ نکلیں لوگوں سے بھی نہ ملیں جلیں ٹھنڈی ہوا میں چند سانس بھی نہ لیں۔''

''یہ گھر کب ہے علی' یہ تو حویلی ہے حویلی۔ پیر صاحب کی حویلی اور ہم عام پردہ دار لڑکیاں نہیں۔ پیر صاحب جلال الدین کی سیّد زادی بیٹیاں ہیں۔ ہمارا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی حویلی سے نکل کر کسی کے گھر ملنے جائیں۔ یہ ہم سے کمتر لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ہمیں سلام کرنے آئیں۔

علی آسمان سے بھی زمین کا منظر دکھائی تو دیتا ہے لیکن ہمیں عظمت کے ایسے آسمان پر بٹھا دیا گیا ہے' جہاں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا سوائے دیواروں کے۔ ان دیواروں میں سانس لینے تک کے لیے کوئی روزن نہیں ہے۔ یہاں کی دیواریں اتنی بلند ہیں کہ باہر سے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اتنی موٹی ہیں کہ دم گھٹنے سے نکلنے والی چیخیں بھی کسی کو سنائی نہیں دیتیں اور اتنی مضبوط ہیں کہ آج تک [illegible] میں نقب نہیں لگ [illegible]

حیدر علی دم بخود اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بہن نے پہلی مرتبہ اس کے سامنے اپنے لیے زبان کھولی تھی' ورنہ وہ اس کے سامنے صرف اسی کے متعلق باتیں کرتی تھی۔ وہ کتنی تنہا تھی' اس کشادہ سجے سجائے کمرے میں کتنی گھٹن تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا آیا۔

☆======☆======☆

''شاہ جی! بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔'' گھر آکر سونے سے پہلے زرینہ نے رضیہ کو مخاطب کیا۔

''اور کوئی وہاں تم دونوں کو دیکھ لیتا تو؟''

''وہاں آتا ہی کون ہے' وہ بھی تپتی ہوئی دوپہر میں' کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعے بھی اس وقت پیڑوں تلے آرام کرتے ہیں اور پھر اب تو فصل بھی کھڑی ہوئی ہے۔ اس دور افتادہ آخری سرے پر آکر کسی نے کیا کرنا ہے۔''

''فرض کرو کہ کوئی آجائے تو؟''

''تم کیوں الٹی الٹی باتیں فرض کروانے پر تلی ہوئی ہو .... بدفال منہ سے نہیں نکالنی چاہیے۔ کیا پتا کون سی گھڑی قبولیت کی ہو۔''

''یہ تمہیں الٹی بات لگتی ہے؟ اس دور افتادہ آخری سرے پر آکر کسی نے کیا کرنا ہے۔ مان لیا لیکن اگر کسی کو کچھ کرنا ہوا تو کیا وہ تم سے پوچھ کر کرے گا کہ زرینہ بی بی! مجھے فلاں کام ہے' آپ ہٹ جائیں تاکہ میں آپ کو نہ دیکھ سکوں۔''

زرینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اگر کسی نے مجھے دیکھ بھی لیا تو وہ پہچانے گا کیسے؟ میں تو پہچان لوں گی کیونکہ برقعے کے اندر سے میں نے سب کو دیکھا ہوا ہے لیکن کسی نے مجھے نہیں دیکھا ہوا۔ پھر بھلا کسی کو کیا خبر ہوگی کہ یہ طوطا مینا کون ہیں۔''

''یہ میں نے کب کہا ہے کہ گزرنے والا کوئی مرد ہی ہوگا' وہ کوئی عورت بھی تو ہوسکتی ہے' جو تمہیں پہچانتی ہو۔'' رضیہ چڑ گئی۔ ''اور ایک ان چند گاؤں والوں پر کیا موقوف' شہر تک کے لوگ چھوٹے شاہ جی کو پہچانتے ہیں۔ کم از کم مرد تو سب ہی پہچانتے ہیں ناں انہیں۔''

''اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے۔''

''کیا؟''

''کہ تم مجھے پکڑوانے پر تلی ہوئی ہو۔''

''اب تم مجھ سے مار کھاؤ گی زرینہ' میرا دل ہول رہا ہے اور تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم آگ میں کود رہی ہو۔''

''کود رہی کہاں ہوں' کود چکی ہوں' اب تو یا جلنا ہے یا پھر کندن بننا ہے۔''

''میرے خدا۔'' رضیہ کا دل سر پیٹنے کو چاہا۔

''اور ہاں یہ دوپٹا رکھ لو اپنے پاس۔'' اس نے رضیہ کا پیلا دوپٹا اسے پکڑایا۔ ''ہمیں نہیں چاہیے۔''

''ہمیں نہیں چاہیے۔'' اس نے چڑ کر زرینہ کی نقل اتاری۔ ''یاد ہے کتنی منتیں کر کے لیا تھا۔ دیکھ لینا جواب میں نے تمہیں اپنا ایک بھی جوڑا یا دوپٹا دیا۔''

''نہ دو' اگلی دفعہ کے لیے تو میں نے سوچ بھی لیا ہے کہ میں نے کیا پہننا ہے۔''

''یعنی اگلی دفعہ بھی یہ بے وقوفی دہرانے کا ارادہ ہے؟''

''اب میں' شاہ جی سے کیا ہوا وعدہ تو نہیں توڑ سکتی۔ ویسے آج تم نے دیکھ لیا ناں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کل رات دوپٹا دیتے ہوئے کس طرح بار بار کہہ رہی تھیں کہ اتنے بڑے برقعے کے اندر وہ میرے کپڑے کیسے دیکھ سکیں گے۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ اکٹھے ایک نہیں دو پاگلوں سے میرا واسطہ پڑے گا۔'' رضیہ بستر پر لیٹ گئی۔ ''اور اب چپکے سے سو جاؤ' ورنہ صبح نہیں اٹھ سکو گی۔''

☆======☆======☆

''پورا ایک ہفتہ گزارنا ہو گا گوری کے بغیر۔ ایک ہفتہ یعنی پورے سات دن۔'' حیدر علی مسہری پر نیم دراز سوچ رہا تھا۔ کیسے گزرے گا یہ ایک ہفتہ۔ اس کے بغیر تو ایک پل رہنا بھی مشکل ہے۔ کائنات کا تمام حُسن' ساری کشش گویا اس میں اتر آئی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی ہوتی لیکن خیر یہ زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے پڑھا لکھا تو میں بھی سکتا ہوں۔ اصل مسئلہ تو اس منگنی کا ہے جو مجھ سے پوچھے بغیر ہی نہ جانے کب طے کر دی گئی اور اب زیبی آپی بھی گوری سے ملنا چاہتی ہیں۔''

زرینہ کے متعلق سوچتے ہوئے اس کے خیال کی رو زیب النساء کی جانب چلی گئی۔

بڑی آپا اور زیبی آپا کتنی اداس اور کتنی تنہا ہیں۔ یہ کس نوع کا انصاف ہے کہ ایک جیتے جاگتے' سانس لیتے ہوئے انسان کو بغیر کسی جرم کے دیواروں کے درمیان قید کر دیا جائے۔ ان سے روشنی' ہوا اور کائنات کے سب رنگ چھین لیے جائیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔''

''صاحب آپ کو بڑی بیگم یاد کر رہی ہیں۔''

''میں آ رہا ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں جی دن میں ایک مرتبہ اسے اور رجب علی کو ضرور بلاتی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ماں جی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''بیٹا تھوڑا سا وقت اپنی ماں کے ساتھ بھی گزار لیا کرو۔''

''ماں جی!'' اس نے ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''میں آپ کے بلاوے کا ہی منتظر تھا۔''

''کہاں رہتے ہو سارا دن۔ تمہارے بابا جان بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔''

''بس یونہی گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں زمینوں پر' کچھ فوٹو گرافی بھی کرتا ہوں۔''

''رجب علی کا گھر بس جائے تو کچھ تمہاری بھی فکر کروں۔''

''ماں جی!'' وہ بولا۔ ''میری فکر چھوڑیں۔ مجھ سے پہلے بڑی آپا اور زیبی آپی...... ہیں۔ ان کی شادی سے پہلے میری شادی ممکن نہیں ہے۔''

''ان دونوں کی طرف سے میرا دل بھی بہت کٹتا ہے لیکن کیا کروں' خاندان میں ان کا جوڑ موجود ہی نہیں ہے۔''

''ماں جی' خاندان ہی تو حرفِ آخر نہیں ہے۔''

''خاندان ہی حرفِ آخر ہے۔'' رجب علی' بابا جان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

حیدر علی نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔

''تمہاری ولایت کی تعلیم یہاں نہیں چلے گی ہمارے اپنے رسم و رواج اور طور طریقے ہیں۔'' رجب علی نے کہا۔

''آیئے بابا جان!'' حیدر علی تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

پیر صاحب بیٹھ گئے لیکن رجب علی کھڑا ہی رہا۔

''بابا جان! میں بہت ادب سے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' حیدر علی نے انہیں مخاطب کیا۔

''کہو۔''

''میں ماں جی سے کہہ رہا تھا کہ بھائی جان کے بعد جلد ہی بڑی آپا اور زیبی آپی کی بھی شادی کر دیں۔''

''جب ان کی شادی کا مرحلہ آیا وہ بھی ہو جائے گی۔''

''لیکن کب بابا جان۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے علی۔'' رجب علی نے کہا۔ ''تم اپنے کام سے کام رکھو' یہ بابا جان اور ان کے بعد میرا مسئلہ ہے۔''

''بھائی جان! یہ مسئلہ نہیں ذمے داری ہے۔''

''تم کیا چاہتے ہو کہاں کریں ان کی شادی؟'' رجب علی فوراً ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''ہے کوئی لڑکا خاندان میں؟ اگر ہے بھی تو ہمارے برابر کا نہیں ہے۔ کس کے پاس اتنی زمینیں اور جائیداد ہے؟''

''یہ کس صحیفے میں اترا ہے کہ ان کی شادیاں خاندان سے باہر نہیں ہوسکتیں۔'' حیدر علی ضبط سے بولا۔ ''اور یہ برابری والی بات نئی منطق ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔ آپ کے نزدیک برابری کا کیا معیار ہے؟ حویلیاں' زمینیں' جائیداد؟ نہیں بھائی جان' کاغذ کے چند کرنسی نوٹ اور اینٹ گارے سے کھڑی ہوئی دیواریں بڑائی یا برابری کا معیار نہیں ہوتیں۔''

''سن لیا بابا جان آپ نے۔'' رجب علی' پیر صاحب کی جانب مڑا۔ ''اب برابر کا جوڑ ڈھونڈنا نرالی منطق ہوگئی ہے۔'' پھر وہ حیدر علی کی جانب مڑا اور سختی سے بولا۔

''ایک بات سن لو علی۔ بہنوں کی شادیاں خاندان میں ہوں گی' کسی ہم پلہ گھرانے میں ہوں گی' ورنہ نہیں ہوں گی۔ اس بات کو دوبارہ کبھی موضوع گفتگو نہ بنانا۔''

''بابا جان! آپ بھی اس ناانصافی پر خاموش ہیں؟ آپ تو کچھ کہیے بھائی جان سے۔''

''رجب علی جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' پیر صاحب بولے۔

''کیا' بابا جان آپ بھی؟''

''ہاں' خدا ندان کی جائیداد تقسیم نہیں ہوسکتی اسے خاندان میں رہنا ہوگا۔''

''صرف جائیداد کی خاطر آپ لوگ میری بہنوں کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ یہ جائیداد انہیں کون سا سکھ دے گی۔''

''حیدر علی! وہ صرف تمہاری بہنیں ہی نہیں میری بیٹیاں بھی ہیں۔'' پیر صاحب جلال سے بولے۔ ''اور میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ انہیں کیا چیز دینی ہے اور کیا نہیں۔''

''تم کیا چاہتے ہو کہ ہم اپنی بہنیں اور زمینیں غیروں کے حوالے کر دیں' یہ بے غیرتی تم برداشت کر سکتے ہو ہم نہیں۔''

''او مائی گاڈ!'' حیدر علی کا دل سر پیٹنے کو چاہا۔ ''اس میں بے غیرتی کی کیا بات ہے۔ ہم شادی کریں گے ان کی' رخصت کریں گے انہیں' اپنے ہاتھ سے' اس میں بے عزتی اور بے غیرتی کہاں سے آ گئی؟''

''یہ بے غیرتی نہیں تو اور کیا ہے۔ بیٹی دے کر ناک نیچی ہو جاتی ہے۔ ہر ایرے غیرے کی اچھی بری چپ چاپ سننی پڑتی ہے۔ سر جھکا کر چلنا پڑتا ہے اور ہم ہمیشہ سے سر اٹھا کر چلنے کے عادی رہے ہیں۔ کسی لڑکی کی خاطر ہم سر نہیں جھکا سکتے۔'' رجب علی رعونت سے بولا۔

''حیدر علی! میں نے تمہیں ولایت اس لیے بھجوایا تھا کہ ملکوں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا تھا ورنہ مجھے تمہاری پڑھائی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی میں تمہیں اس بات کی اجازت دے سکتا ہوں کہ تم ولایت کی تعلیم کو تلوار بنا کر بزرگوں کی قائم کی ہوئی روایات سے لڑو۔'' پیر صاحب کہہ رہے تھے۔ ''اور یہ ہماری روایت ہے کہ ہم اپنے گھر کی زمین اور عورت دوسرے [illegible] بے غیرتی کی اس انتہا سے پہلے مر جانا بہتر ہے۔''

''بابا جان! آپ جیتی جاگتی' سانس لیتی ہوئی لڑکیوں اور زمین کو ایک ہی مقام دے رہے ہیں؟ وہ زمین' جائیداد اور بینک بیلنس کی طرح نہیں ہیں' وہ محسوس کر سکتی ہیں' ہر دکھ اور ہر تنہائی کو۔ بابا جان! آپ ان کے لیے صدر دروازہ نہیں کھولیں گے تو چور راستے اپنے آپ ہی کھل جائیں گے۔ کٹورے میں گنجائش سے زیادہ پانی ڈالا جائے تو وہ بھی چھلک جاتا ہے۔ ان کے صبر اور ضبط کو ان کے لیے آزمائش مت بنائیں۔ اس دن کو آنے سے روک دیں بابا جان' جس دن چور دروازے کھل جائیں گے اور کٹورے سے پانی چھلک جائے گا۔''

''حیدر علی شاہ!'' پیر صاحب جلال سے کانپنے لگے۔ ''نکل جاؤ اسی وقت دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔''

''میرے چلے جانے سے کیا ہوگا۔ صرف آپ کا جلال اور غصہ ختم ہو جائے گا' لیکن آپ کے کندھوں پر ذمہ داری کی جو گٹھڑی پڑی ہے اس کا بوجھ کم نہیں ہوگا۔''

''نذری بیگم!'' وہ دھاڑے۔ ''اپنے بیٹے سے کہہ دو کہ میری نظروں سے دور ہو جائے' کہیں میرا ہاتھ اس پر نہ اٹھ جائے۔''

ماں جی نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''علی! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

وہ چپ چاپ سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یہ کیسی نرالی منطق ہے بابا جان اور بھائی جان کی۔'' وہ اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگا۔ ''میں انہیں کیا سمجھاؤں۔ ایک تو ادب مانع آتا ہے اور پھر ان میں سے کوئی بھی میری بات سمجھنا نہیں چاہتا اور جب کوئی کچھ بات نہ سمجھنے کی قسم کھا لے تو آپ تمام تر کوششیں کر لیں تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ انہوں نے اپنے ذہن اور اپنے کان دونوں بند کیے ہوئے ہیں' ایسے میں کوئی انہیں کیا سمجھا سکتا ہے۔''

☆======☆======☆

حیدر علی خلافِ معمول بہت سنجیدہ تھا اور زرینہ اسے سنجیدہ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

''کچھ تو کہیں' بات کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ برگد کی جٹاؤں کو ہاتھ سے جھلاتا ہوا بولا۔

''کچھ تو ہے' کیا مجھ سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ میں نے کوئی غلطی کی ہے' جو مجھ سے ناراض ہیں؟''

''تم تو اتنی اچھی ہو گوری کہ تم سے میں کبھی ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بولا۔

''تو پھر اس قدر چپ چاپ کیوں ہیں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم باتیں کرو اور میں سنتا رہوں۔''

''میرا تو تجربہ نہیں ہے لیکن میری ایک سہیلی اس معاملے میں خاصی تجربہ کار ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مردوں نے جب کوئی بات نہ بتانی ہو تو وہ بہت اطمینان سے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور عورت کی توجہ خود اس کی اپنی جانب مبذول کروا دیتے ہیں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''وہی ہوتا ہے جو نرگس کے ساتھ اس وقت ہوا تھا جب اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھا تھا۔'' وہ بولی۔ ''ہر انسان اپنی ذات سے عشق کرتا ہے۔ عورت بھی پھر خود میں اپنے اور اپنے محبوب میں گم ہو جاتی ہے اور اصل بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔''

''تمہاری یہ سہیلی واقعی تجربہ کار لگتی ہے۔'' حیدر علی ہنسا۔

''یعنی یہ بات درست ہے۔''

''ہاں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ضرور کسی الجھن میں ہیں۔''

''ہوں' الجھن بھی ہے۔'' اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

''پھر مجھے بھی اپنی الجھن میں شریک کر لیں۔''

''گوری! اب تک تمہیں کوئی تحفہ تو دیا نہیں ہے۔ اپنی الجھنیں کیوں دوں۔''

''میرا تحفہ تو آپ کا پیار اور آپ کی محبت ہے شاہ جی! اور اسی پیار اور محبت کی وجہ سے آپ کی سب خوشیاں اور آپ کے سب غم میرے ہیں۔ میں آپ کے حصے کے غموں کو اپنے کندھے پر لاد تو نہیں سکتی لیکن آپ کو حوصلہ تو دے سکتی ہوں ناں۔''

''تم کتنی اچھی ہو گوری۔ تمہیں میری الجھنیں اور میرے غم بانٹنے ہیں تو پتا ہے کیا کرو؟''

''کیا؟'' زرینہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''مجھ سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ تم سے مل کر میں سب الجھنیں بھول جانا چاہتا ہوں۔''

زرینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یوں لگا جیسے ویران جنگل کے کسی معبد میں گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ حیدر علی اسے تکنے لگا۔

''یہ بتائیں شاہ جی! کہ آپ کی زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی اور لڑکی بھی آئی تھی؟''

''تم سے پہلے... کیوں پوچھا تم نے؟''

''ولایت میں تو بہت خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ مجھ سے زیادہ گوری' سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں' کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں تو ان لڑکیوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں پھر آپ کی نگاہِ انتخاب مجھ پہ کیسے ٹھہری؟''

حیدر علی چند لمحے اسے تکتا رہا پھر بولا۔ ''یہ شاعر کہتا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ وہاں واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ان میں سے کسی سے بھی ملتے

ہوئے میرے دل سے یہ صدا نہیں آئی تھی کہ وہ لڑکی میری ہے۔ تمہیں دیکھا تو میرے دل نے صدا دی کہ میں تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ لندن کے کلبوں میں سڑکوں پر' لائبریری میں کتابوں کے ریک کے پیچھے' خاموش ندیوں کے ویران اور بے آباد کناروں پر' کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان۔ میرے وہم میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے یہاں ملو گی۔''

''پھر میں آپ سے زیادہ خوش قسمت رہی۔'' وہ ہنسی۔ ''مجھے آپ کو ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ آپ مجھے خود بخود مل گئے۔ بغیر کسی تگ و دو بغیر کسی تردد کے۔ ہاں ایک ہفتے تک میں بہت تڑپی تھی آپ کے لیے۔ جس دن آپ نے خالہ کبریٰ کے گھر پانی پیا تھا۔ اس دن ہی میں نے اپنا دل آپ کو دے دیا تھا۔ پھر میں نے خدا تعالیٰ سے کتنی دعائیں کی تھیں کہ آپ مجھے مل جائیں۔ نیاز پور سے یہاں تک کے راستے کے درمیان آپ کو کتنا ڈھونڈا تھا اور اس وقت کتنی حیران ہوئی تھی جب خالہ کبریٰ کے گھر کا دروازہ آپ نے کھولا تھا۔ میری ایک ہفتے کی تڑپ میں اتنی سچائی تھی کہ آپ مجھے فوراً ہی مل گئے۔''

''اب نہیں تڑپتیں مجھ سے ملنے کے لیے؟''

''اب تڑپ نہیں بے قراری ہوتی ہے۔ یہ پورا ہفتہ بھی آپ کے متعلق سوچتے ہوئے ہی بیت گیا۔''

''گوری میری ایک خواہش پوری کرو گی؟''

''آپ حکم دیں شاہ جی۔''

''حکم نہیں' بس خواہش ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''تم اچھی اچھی کتابیں پڑھا کرو۔''

''میری دسویں کی کتابیں تو اماں نے بیچ دیں ردی میں۔ ہمارے پاس گھر میں زیادہ جگہ نہیں ہے ناں چیزیں رکھنے کی۔''

''میں ان کتابوں کی بات نہیں کر رہا۔''

''پھر کن کتابوں کی بات کر رہے ہیں؟''

''تم نے شاعری پڑھی ہے؟''

''ہمارے کورس میں حالی اور علامہ اقبال کی شاعری تھی۔''

حیدر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں اس شاعری کی بات نہیں کر رہا۔''

''اور تو میں نے کوئی شاعری نہیں پڑھی۔''

''اچھا میں تمہیں کتابیں لا کر دوں گا۔''

''ایک ایک کر کے لانا اور پھر لے جانا۔''

''کیوں؟ تمہیں چاہیے کہ تم کتابیں جمع کرو' چھوٹی سی ہی سہی اپنی لائبریری بناؤ۔''

"رہنے دیں' اماں سب کتابیں ردی میں بیچ دیں گی۔" وہ بولی۔ "اور پھر اماں جیسا تفتیشی افسر تو کوئی بھی نہیں ہوگا۔ انہیں تو کسی تھانے کا تھانے دار ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے مجھ سے اگلوا کر ہی دم لینا ہے کہ روز روز میں کہاں سے کتابیں لاتی ہوں۔"

"ایک تو یہ بھی بہت مسئلہ ہے۔" وہ بولا۔ "خیر یہ بھی دیکھ لیں گے۔ میں تمہیں کوئی بہت اچھا سا تحفہ دینا چاہتا ہوں...... بتاؤ کیا لاؤں تمہارے لیے؟"

"تحفہ بھی کبھی پوچھ کر دیا جاتا ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح ہنسی۔ "تحفہ دینے والے کی پسند پر ہوتا ہے اور اس کا ذوق ظاہر کرتا ہے۔ لینے والا تو بس لے لیتا ہے۔"

"پھر بھی کسی چیز کی خواہش تو ہوگی۔"

"شاہ جی صرف آپ کے ساتھ کی خواہش ہے' آپ کا ساتھ مل جائے تو پھر کوئی آرزو باقی نہیں رہے گی۔"

حیدر علی کے ذہن میں زیب النساء کے الفاظ گونجنے لگے۔ "تم جانتے ہو کہ بابا جان تمہاری نسبت طے کر چکے ہیں؟"

اور پھر وہ چلایا تھا۔ "کیا؟ کب کر چکے ہیں؟ کس سے کر چکے ہیں؟"

"ماموں جان کی بیٹی فوزیہ سے۔" تب زیب النساء نے اسے بتایا تھا۔

"کہاں گم ہو گئے آپ؟" زرینہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

وہ چونک اٹھا تو زرینہ ہنس پڑی۔ "اتنے گم کہاں تھے میں تو یہاں آپ کے سامنے ہوں۔"

"ہمیشہ میری نظروں کے سامنے ہی رہنا گوری۔" وہ ہولے سے بولا۔

"آپ نے مجھ سے میری خواہش پوچھی تھی۔ میں نے آپ کو بتا دی لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔" اس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "اس جنم میں بھی اور اگلے جنم میں بھی۔"

"بس شاہ جی! یہی میرا تحفہ ہے۔ اس کے بعد کوئی حاجت' کوئی تمنا نہیں ہے۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔

"گوری!" تھوڑی دیر بعد حیدر علی نے اسے پکارا۔

"ہوں۔"

"میں نے تمہارے متعلق بات کی تھی۔"

"کس سے؟" وہ گھبرا گئی۔

"اپنی زیبی آپی سے' ان سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔"

"میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا۔" وہ گھبراہٹ سے بولی۔ "کسی کو خبر ہو گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"ظاہر ہے آج نہیں تو کل مجھے گھر والوں کو بتانا ہی تھا۔ زیبی آپی سے میں کچھ نہیں چھپا سکتا۔"

"پھر کیا کہا انہوں نے؟" زرینہ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"مجھ سے؟" وہ پریشان ہو گئی۔ اس کے ذہن میں رضیہ کی آواز گونجنے لگی۔

"تم احمق اور بے وقوف ہو۔ زندگی لفظوں کے سہارے نہیں گزر سکتی۔ ذرا سوچو زرینہ پیر صاحب کے گھرانے کی عورتوں کے درمیان تمہاری کیا وقعت' کیا حیثیت ہوگی؟ تمہیں کبھی وہ مرتبہ وہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکے گا جو ان سیّد زادوں کو حاصل ہے۔ ہم کون ہیں ان کے سامنے؟ انہی کے ٹکڑوں پر پلنے والے عام سے لوگ۔ یاد رکھو' جب تک تم مولوی نعمت اللہ کی بیٹی کی حیثیت سے وہاں آتی جاتی رہو گی تب تک تمہاری قدر بھی رہے گی اور تمہیں عزت بھی ملے گی لیکن جس دن انہیں معلوم ہوا کہ اب تم چھوٹے شاہ جی کے عشق میں گرفتار ہو اور ان کی محبوبہ ہو۔ اس دن تمہاری حیثیت دو کوڑی کی ہو جائے گی ان لوگوں کے سامنے۔ ابھی تم مہر النساء اور زیب النساء کے برابر بیٹھتی ہو۔ تب تمہیں ان کے پیروں کے پاس بھی جگہ نہیں ملے گی۔"

لیکن اس وقت اس نے رضیہ کی بات کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔ آج جب حیدر علی نے اس سے زیب النساء سے ملنے کے لیے کہا تو اس کے ذہن میں کتنے ہی خدشات جاگ اٹھے۔

"اب تم کہاں گم ہو؟" حیدر علی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"نہیں' کہیں نہیں۔" وہ واپس آ گئی۔

"تم گھبراؤ نہیں۔ زیبی آپی بہت اچھی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شاہ جی! میں انہیں جانتی ہوں' وہ واقعی بہت اچھی ہیں لیکن اگر انہیں میری جرأت بری لگی تو؟"

"وہ میری خوشیوں کو اپنی خوشیاں سمجھتی ہیں' تم فکر مت کرو۔"

☆======☆======☆

حویلی میں قدم رکھتے ہوئے پہلی مرتبہ وہ ڈگمگا رہی تھی۔ ساری رات وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ کل کیا ہوگا اور ساری رات اسی پریشانی میں گزر گئی تھی۔

"خیر کچھ بھی ہو' میں چھوٹے شاہ جی کو نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے تہیہ کیا ہوا تھا۔

قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے اس نے حیدر علی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔

''خدا کرے کہ میری وکالت کے لیے وہ وہیں زیب النساء کے کمرے میں ہوں۔'' اس نے سوچا۔

لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کشادہ کمرے میں لکڑی کے بھاری فرنیچر اور زیب النساء کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ جھجک کر دروازے میں ہی رک گئی تھی۔

''اندر آ جاؤ باہر کیوں کھڑی ہو؟'' زیب النساء کے ہونٹ ہلے۔

زرینہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر چلی آئی۔ زیب النساء مسہری سے اٹھ کر دروازے تک گئی پھر دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔

''تم حیدر علی سے محبت کرتی ہو؟'' اس نے بند دروازے کے سامنے کھڑے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے تو زرینہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اسے اتنے واضح اور غیر مبہم سوال کی توقع نہیں تھی۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔''

''جی۔'' اس نے ہمت کر کے جواب دیا۔

زیب النساء ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی زرینہ کو عام ہنسی سے بہت مختلف لگی۔ اس ہنسی میں عجیب سی وحشت اور جنون تھا۔

''بہت بھولی ہو تم۔'' زیب النساء کی ہنسی تھمی تو وہ بولی۔ ''یہ حویلی کتنی بڑی ہو گی؟''

زرینہ کو اس کی بات کا مطلب بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ ''جی۔''

''میں نے پوچھا ہے کہ یہ حویلی کتنی بڑی ہو گی؟''

''بہت بڑی۔'' اس نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔

''اور اس میں رہنے والے کتنے بلند مرتبہ لوگ ہیں؟''

''بہت بلند جیسے آسمان پر ٹکے ہوئے چاند اور تارے۔''

''ہاں چاند اور تارے بہت خوشنما ہوتے ہیں' لیکن بس دور دور سے' کہنے والے کہتے ہیں کہ چاند میں داغ ہے' ہو گا' مجھے نہیں معلوم کیونکہ اس حویلی کی عورتیں اتنی بلند مرتبہ ہیں کہ چاند کی چاندنی کو بھی انہیں چھو کر آلودہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تم بہت خوش قسمت ہو زرینہ' جو چاند اور ستاروں کو دیکھ سکتی ہو۔ بادلوں اور فضا میں اُڑتے پنچھیوں کو گننے کی کوشش کر سکتی ہو۔ اپنا بھائی مجھے جان سے بھی پیارا ہے اور تم میرے بھائی کی پسند ہو اس لیے زرینہ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے' یہاں انسان نہیں تقدس اور تکریم کے سائے بستے ہیں اور تقدس و تکریم کی اس فضا میں دم گھٹنے لگتا ہے۔

یہ دیوار دیکھ رہی ہو؟'' اس نے زور سے ایک دیوار پر ہاتھ مارا۔ ''یہ اتنی مضبوط ہے کہ اس

میں آج تک نقب نہیں لگ سکا۔ یہ اتنی موٹی ہے کہ تمہاری چیخوں کی آواز بھی باہر نہیں جا سکتی اور اتنی اونچی کہ یہاں تازہ ہوا کا گزر بھی ممکن نہیں ہے۔

یہ بستر دیکھ رہی ہو؟'' اس نے مسہری کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہاں میری پھوپھو نے اٹھارہ سال کی عمر میں دم توڑا تھا اور اب ان کی روح اس کمرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ پوری حویلی میں بھٹکتی رہتی ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔ مجھے حویلی سے نکل بھاگنے کو کہتی ہیں۔

زرینہ! بھول جاؤ کہ تم نے حیدر علی شاہ سے محبت کی تھی۔ اول تو تم اس بلند و بالا حویلی میں داخل نہیں ہو سکتیں اور اگر تم اس میں آ گئیں تو یہاں تمہارا دم گھٹ جائے گا' جیسے میرا دم یہاں گھٹتا ہے۔ کوئی تمہاری چیخیں سننے والا نہیں ہو گا' جیسے میری چیخیں اس کمرے میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چلی جاؤ' بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ سب راستے بند ہو جائیں گے اور تم ان دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے تنہا رہ جاؤ گی۔ جیسے میرے لیے سب دروازے بند ہیں۔ جیسے میں دیواروں سے سر ٹکراتی ہوں۔ چلی جاؤ یہاں انسانوں کا نہیں سایوں اور روحوں کا بسیرا ہے۔''

''بھاگ جاؤ چلی جاؤ یہاں انسانوں کا نہیں سایوں اور روحوں کا بسیرا ہے۔'' کمرے میں زیب النساء کی آواز بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔

زرینہ کے منہ سے خوف کے مارے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ اس نے بند دروازے کے سامنے کھڑی زیب النساء کو دھکا دیا اور پاگلوں کی طرح باہر بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆======☆======☆

حویلی میں رجب علی شاہ کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ یوں تو شادی مہینہ بھر بعد ہونا طے پائی تھی لیکن ابھی سے حویلی کے در و دیوار کو سجایا جا رہا تھا۔

سجاوٹ کا تمام تر سامان لاہور سے منگوایا گیا تھا۔ گاؤں کی کئی عورتیں اور مرد کام میں جتے ہوئے تھے' فرش چمکائے جا رہے تھے۔ چھت اور دیواروں کو بجلی کے قمقموں سے روشن کیا جا رہا تھا۔ پرانا سامان کام کرنے والوں کو عنایت کر کے کمروں کو نئے سامان سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ نئے قالین' نئے پردے' نئے صوفے اور نئے برتن غرضیکہ ہر چیز نئی اور چمکدار تھی۔

غریبوں کے لیے لنگر کھول دیا گیا تھا۔ شام کو مردانے میں بھانڈوں اور ہیجڑوں کی محفل جم جاتی تھی اور گاؤں کے تقریباً سبھی مرد تماشا دیکھنے کے شوق میں وہیں جمع ہو جاتے تھے۔ ہر طرف میلے کا سا سماں تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ آخر پیر صاحب جلال الدین شاہ کے سب سے بڑے فرزند اور گدی نشین رجب علی شاہ کی شادی ہونے والی تھی۔

کتنے برسوں بعد اس گھر میں ایسی کوئی خوشی آئی تھی۔ کتنا ارمان تھا نذری بیگم کو اپنے فرزند اکبر کی شادی کا' کتنا چاؤ تھا بہو کا اور کتنی خواہش تھی پوتوں کو اپنے ہاتھ میں کھلانے کی۔ یاسمین میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جن کی وہ آرزومند تھیں۔ خوبصورت' سلیقہ مند' پردے کی پابند'

خاموش طبع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پانچ سو مربع اراضی کی واحد وارث۔

پیر صاحب یوں بھی خوش تھے کہ وہ ان کے چھوٹے بھائی کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہوں نے رجب علی اور یاسمین کا رشتہ یاسمین کی پیدائش سے پہلے ہی طے کر دیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کرے۔ اس کے لیے ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ حرفِ آخر کا درجہ رکھتے تھے۔ خاندان سے باہر تو یوں بھی رشتہ دینے کا سوال ہی نہیں تھا' پھر رجب علی شاہ تو ان کا بھتیجا تھا اور پیر صاحب کا گدی نشین بھی۔ ان کی بیٹی کے لیے اس سے اعلیٰ گھرانہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔

یاسمین کے والد اور پیر صاحب کے چھوٹے بھائی نے اپنی سی تمام کوشش کر ڈالی تھی لیکن ان کی قسمت میں اولادِ نرینہ نہیں تھی۔

یاسمین ان کی اکلوتی اولاد تھی' اس لیے تمام زمین اور جائیداد اسی کے نام تھی۔

رجب علی شاہ کی گردن مزید اکڑ گئی تھی۔ اسے یاسمین یا اپنی شادی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی اس جائیداد میں تھی جو وہ جہیز کی صورت میں اپنے ساتھ لا رہی تھی۔

دادا کی وفات کے بعد جو جائیداد دو بھائیوں میں تقسیم ہو گئی تھی' وہ پھر واپس اسی گھرانے میں آ رہی تھی۔ حویلیاں دگنی ہونے والی تھیں' زمینیں اور موٹریں دگنی ہونے والی تھیں اور اس کی رعیت بھی دگنی ہونے والی تھی۔ یہ سب باتیں اس کی دستار میں نئے چمکتے ہوئے ستاروں کا اضافہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل تک اس کی گردن میں جو ہلکا سا خم باقی تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی وہ بھی نکل گیا تھا اور اب اس کی گردن میں مزید کلف لگ گیا تھا۔

حیدر علی شاہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لاہور سے کپڑے لتے کی خریداری' کمروں کی سجاوٹ کے لیے نئے ساز و سامان کی پسند ناپسند' حویلی کی آرائش کے لیے بجلی کا سامان ان سب چیزوں کی ذمہ داری اسی کے سر تھی۔ اس کی ایک ٹانگ نیاز پور میں ہوتی تو دوسری لاہور میں' اسے اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ خالہ کبریٰ کو اپنی مسلسل غیر حاضری کی کوئی معقول سی وجہ بتا کر ان سے معذرت کر لے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے زرینہ کا خیال بھی ستا رہا تھا۔ اسے بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بھائی کی شادی کی وجہ سے وہ مصروف ہے اور فی الحال اس سے ملنے نہیں آ سکتا۔

''کیا سوچتی ہو گی گوری۔'' اپنی کار کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے لاہور کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ ''میں اس قدر غیر ذمہ دار ہوں کہ اسے اپنے نہ آنے کی اطلاع بھی نہ دے سکا۔ پتا نہیں کیا کچھ سوچا ہو گا اس نے میرے بارے میں۔ سنگدل' بے وفا' وعدہ خلاف اور نہ جانے کیا کیا۔''

اس کے ہونٹوں پر خود ہی مسکراہٹ آ گئی لیکن اسے منانا مشکل نہیں ہو گا بس پیار کی ایک

نظر ہی کافی ہو گی' اسے راضی کرنے کے لیے...... اس کے سب گلے شکوے ساری شکایات پل بھر میں ختم ہو جائیں گی اور پھر اس کی محبت بھری نگاہ سے میری تمام تھکن بھی اتر جائے گی۔

اس کے لبوں سے بے تابی سے نکلنے والے لفظ ''شاہ جی'' سے کائنات کے تمام رنگ بدل جائیں گے۔ پھول کھل اٹھیں گے' سورج کی چمک بڑھ جائے گی' پرندے چہچہا اٹھیں گے' صبح کا دیوتا ساری دنیا پر رنگوں کی بارش کرے گا۔ تتلیوں کے رنگ روپہلے ہو جائیں گے' ساری کائنات مہک اٹھے گی۔ فقط ان دو چھوٹے سے الفاظ سے۔

''شاہ جی!''

اس کے لبوں سے محبت کی شیرینی میں رچے ان لفظوں سے بڑھ کر بھی بھلا کائنات میں کوئی اور چہکار ہو گی۔

حیدر علی نے تیزی سے ایک بس کو اوورٹیک کیا اور ونڈ اسکرین سے پار نظر آنے والی لمبی سیدھی سڑک پر نظریں گاڑ کر پھر زرینہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

''پتا نہیں وہ زیبی آپی سے ملی یا نہیں۔ شاید نہ ہی ملی ہو' وہ تو اس تصور سے ہی گھبرا رہی تھی۔ سامنا کرنے کا تو اس میں حوصلہ ہی نہیں ہو گا۔ بے کار کی جھجک اور شرم و حیا' لیکن خیر میرے ساتھ رہے گی تو خود ہی حوصلہ اور جرأت بھی آ جائے گی اور جھجک بھی ختم ہو جائے گی۔ ہاں شرم و حیا ایک حد تک ہونی چاہیے لیکن اتنی بھی نہیں کہ وبالِ جان بن جائے۔

اگر گوری' زیبی آپی سے ملی ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتیں کہ وہ آئی تھی۔ کس طرح گھبرائی اور جھجکی تھی اور بالآخر یہ جان کر کہ زیبی آپی کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے وہ کس طرح ہنسی تھی۔

زیبی آپی جس طرح مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہیں' اسی طرح مجھ سے منسلک ہر چیز سے بھی ویسی ہی محبت کرتی ہیں۔ میری ہر خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی ہیں اور میری ہر پسند کو اپنی پسند۔ مجھے یقین ہے کہ اب جب گوری ان سے نئے رشتے کے حوالے سے ملے گی تو زیبی آپی وہ سب محبتیں اس پر نچھاور کر دیں گی جو ان کے پاس پہلے صرف میرے لیے تھیں۔ وہ اسے میری پسند ناپسند کے متعلق بتائیں گی' میری بے قراریوں کی داستان اسے سنائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ میرے وہ سب غیر سنجیدہ معاشقے بھی اسے سنا ڈالیں جو انگلینڈ میں مَیں نے بہت شوق سے کیے تھے۔ وہ اس کا تصور کر کے ہی ہنس دیا تھا۔

اور جب گوری کو خبر ہو گی کہ اس سے پہلے بھی کم از کم تین گوریاں میری زندگی میں آ چکی ہیں تو وہ غصے سے منہ پھلائے گی اور جب میں اسے منانے کی کوشش کروں گا تو وہ رخ بدل لے گی' پھر جب میں اسے یہ بتاؤں گا کہ ایماء کٹی اور جوڈی تو صرف مسافر تھیں جو تمہاری تلاش کے سفر میں چند لمحوں کے لیے میرے قدموں سے قدم ملا کر چلی تھیں' میری منزل تو صرف تم ہو

گوری..... تو وہ ایک دم سے کھل اٹھے گی' ہنس پڑے گی اور کائنات میں تمام زندگی ایک مرتبہ پھر رواں دواں ہو جائے گی جیسے Sleeping Beauty (سلیپنگ بیوٹی) کے جاگتے ہی سویا ہوا سارا محل جاگ اٹھا تھا۔ پھر وہ میرے بازوؤں میں آ کر کہے گی۔

''شاہ جی اب آپ کی تلاش تمام ہوگئی ہے' اب آپ کی زندگی میں ہمسفر کی گنجائش ہے کسی مسافر کی نہیں۔''

☆======☆======☆

جس دن سے رجب علی شاہ ولایت سے واپس آیا تھا تب سے زمینوں اور جائیداد کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ تمام معاملات جو اس سے قبل پیر صاحب یا ان کے خاص آدمیوں کے ہاتھ میں تھے۔ اب رجب علی شاہ نے پیر صاحب کی مرضی سے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ یوں بھی وہ اسے اپنی گدی پر بیٹھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے اس لیے اب اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ انہیں اس سے بہت سی توقعات تھیں۔

''ہمیں یقین ہے کہ کچھ ہی عرصے میں رجب علی سب انتظام بہ حسن و خوبی سنبھال لے گا۔'' وہ نذری بیگم سے کہہ رہے تھے۔

''ماشاءاللہ آخر ولایت کا تعلیم یافتہ ہے۔'' نذری بیگم صدقے قربان ہو جانے والے لہجے میں بولیں۔

''تعلیم تو حیدر نے بھی وہیں سے حاصل کی ہے لیکن وہ اپنی تہذیب اور روایتیں ہی بھول گیا ہے' ہر بات میں جرح کرنے کی عادت ہوگئی ہے اسے۔''

''ابھی بچہ ہے' شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا' خود ہی۔'' وہ جلدی سے بولیں۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو' لیکن ہمیں اس کے کچھ زیادہ آثار نظر نہیں آتے۔'' پیر صاحب بولے۔ ''اس دن اس نے ہم سے گستاخی کی۔ نہ صرف گستاخی کی بلکہ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ بھی نہیں ہوا۔''

''آپ اپنا دل برا نہ کریں' اندر سے وہ یقیناً شرمندہ ہوگا۔'' انہوں نے جلدی سے بیٹے کا دفاع کیا۔

''ایسی شرمندگی کا کیا فائدہ کہ اس نے ہم سے معافی مانگنے کی زحمت بھی نہیں کی۔'' پیر صاحب نے کہا۔ ''جو بات جو اس نے کہی' اگر کسی اور نے کہی ہوتی تو ہم اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتے۔ حیف کہ ایسی بے ہودہ بات ہمارے اپنے بیٹے نے اپنے منہ سے نکالی اور ہماری بے بسی کہ ہم غصے سے کھول کر رہ گئے۔ کچھ کہہ ہی نہیں سکے اسے۔ اولاد انسان کی بہت بڑی کمزوری اور آزمائش ہوتی ہے۔''

''میں اسے سمجھا دوں گی' اتنا سا بچہ تو تھا جب یہاں سے گیا تھا۔ اسے کیا خبر کہ یہاں کے

طور طریقے اور رسم و رواج کیا ہیں۔ یہاں رہے گا تو سمجھ آتی جائے گی اور جب اس کی اپنی اولاد ہوگی تو پھر کسی کے کچھ کہنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔ وہ خود ہی اس رنگ میں رنگ جائے گا۔ جس کے پاؤں میں جوتا ہوتا ہے اسی کو خبر ہوتی ہے کہ وہ کہاں سے اور کتنے زور سے کاٹ رہا ہے۔ ابھی اس کے پاؤں میں وہ جوتا ہی نہیں ہے لیکن آپ فکر نہ کریں' ایک نہ ایک دن یہ جوتا وہ بھی پہنے گا۔''

''کاش حیدر علی بھی رجب علی کی طرح فرمانبردار اور روایتوں کو قائم رکھنے والا ہوتا۔'' انہوں نے آہ بھری۔

''اللہ کے واسطے آپ علی کی طرف سے اپنا دل میلا نہ کریں' وہ بھولپن کی وجہ سے ایسا سوچتا ہے' آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''رجب علی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس گدی کا بالکل درست جانشین ہے۔'' وہ بولے۔ ''آتے ہی اس نے زمین اور جائیداد کے سب انتظام سنبھال لیے ہیں اور اب تو شادی کے بعد اس کی ذمہ داری بڑھ جائے گی۔''

''وہ سب ذمہ داریاں نبھانے کا اہل ہے۔''

''ہاں۔'' پیر صاحب کے انداز میں طمانیت تھی۔ ''بس اس کی شادی ہو جائے تو علی کے پاؤں میں بھی شادی کی بیڑیاں ڈال دینی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے ہی ہماری اولاد کے گھر بس جائیں اور ہم انہیں اپنے اپنے گھروں میں شاد اور آباد دیکھ سکیں۔''

''آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے پیر صاحب! میں تو چاہتی ہوں کہ علی کے بعد سخاوت کی نسبت بھی طے کر دی جائے۔''

''صرف نسبت ہی طے نہیں کرنی اس کی بھی شادی کر دینی ہے۔ ہم نے رجب علی کو ڈھیل دے رکھی تھی کہ کچھ عرصہ آزادی کے ساتھ رہ لے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس عمر میں شادی کر رہا ہے وہ۔ حیدر علی کو تعلیم کے لیے باہر بھجوایا کہ پڑھائی کے بعد اس کی شادی ہوتی رہے گی لیکن وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اب ہم سخاوت کو یہ ڈھیل دینے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔''

''درست فرمایا آپ نے۔''

''ہم سوچ رہے ہیں کہ سخاوت کے لیے کون سا گھرانہ مناسب رہے گا۔''

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو بڑے بھائی جان.....''

ابھی نذری بیگم کی دبے دبے لہجے میں کی جانے والی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیر صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

''وہاں سے حیدر علی کی دلہن فوزیہ آ رہی ہے' ہم نہیں چاہتے کہ ایک ہی گھر کی دو بہنیں ہماری بہوبنیں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' سدا کی اطاعت گزار نذری بیگم نے اب بھی ان سے کوئی بحث کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کی بات رد کرنے کے لیے کوئی دلائل دیے لیکن انہیں اس بات کا قلق ضرور تھا کہ ان کے بھائی کی دوسری بیٹی اور ان کی بہت پیاری بھتیجی اس حویلی میں دلہن بن کر نہیں آسکتی۔

''سخاوت کے لیے میں کچھ سوچوں گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بات ختم کر دی۔

☆======☆======☆

منشی فضل دین، رجب علی شاہ کے سامنے کھڑا گھگھیا رہا تھا۔

''شاہ صاحب! حساب کتاب میں ایک پیسے کی گڑبڑ بھی نہیں ہے' آپ بے شک سب کاغذوں کی پڑتال کر لیں۔''

''کاغذات چیک کر لیے ہیں' میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔'' رجب علی شاہ نے اسے ڈپٹا۔ ''کیا نام ہے تمہارے اس بیٹے کا جو تانگہ چلاتا ہے؟''

''سرکار نام تو اس کا محمد اسلم ہے لیکن سب اسے اچھو ہی کہتے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے ایک فائل میں لگے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''وہ تانگہ کہاں سے آیا اس کے پاس؟''

''سرکار! پیر صاحب نے خوش ہو کر اچھو کو عنایت کیا تھا۔''

''ایسی کیا خوشی تھی کہ انہوں نے اس کی کمین کو سالم تانگہ بخش دیا؟'' اس نے میٹھی نظروں سے منشی کی طرف دیکھا۔

''حضور پشتوں سے آپ کے گھرانے کی خدمت کرتے چلے آرہے ہیں' اچھو نے پوری آٹھ جماعتیں پاس کی ہوئی ہیں۔ وہ کمانے کے لیے شہر جانا چاہتا تھا۔ پیر صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے اسے رک جانے کا حکم دے دیا اور گاؤں میں ہی اسے روزگار فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔''

''اور پھر اسے تانگہ بخش دیا۔'' رجب علی نے تمسخر سے کہا۔

''پیر صاحب کی عنایت ہے سرکار۔''

''ان کاغذات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تمہارے بیٹے کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں پر ایسی ہی عنایت کی ہے۔'' رجب علی صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''پیر صاحب کو اللہ تعالیٰ لمبی زندگی دے' وہ بہت دریادل اور فیاض ہیں۔''

''ہونہہ۔'' اس کے ہونٹ تمسخر سے سکڑ گئے۔ ''تم لوگ چکنی چپڑی باتیں کر کے ان سے مختلف چیزیں ہتھیاتے رہے اور خوشامد کے لیے انہیں دریادل اور فیاض ہونے کا خطاب دے دیا۔''

''سرکار ایسی بات ہرگز نہیں ہے' یہ سب کچھ انہوں نے اپنی خوشی سے' ہمیں بخشا ہے۔'' منشی جلدی سے بولا۔

''بکواس بند کرو' میری بات کاٹتے ہو۔'' اس نے منشی کو ڈپٹا۔ ''آئندہ کسی نے میری بات کاٹی تو کھال میں بھس بھر دوں گا' اس کی۔''

''غلطی ہوگئی سرکار۔'' اس نے گھبرا کر رجب علی کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''جس' جس نے ہماری یا ہمارے خاندان کی خدمت کی ہے اسے حق محنت ملتا رہا ہے' تم بھی یہاں کے تنخواہ دار ملازم ہو۔ جتنی خدمت کی اس کا معاوضہ لیا۔ اور چاول کی جو بوریاں تم لوگ ہتھیا چکے ہو' چاہیں تو ہم تمہاری ناک کے راستے وہ سب باہر نکال سکتے ہیں' لیکن پھر بھی اس کے لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ پر یاد رہے کہ آئندہ یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔''

''جی حضور!''

''اور جو تانگہ تمہارے بیٹے کو ملا ہے آئندہ سے وہ ہمارے استعمال میں رہے گا۔ ہاں تم پر اتنا کرم کیا جاسکتا ہے کہ ہم تمہارے بیٹے کو اپنا ملازم رکھ لیں اور وہ تانگہ بدستور وہی چلاتا رہے۔''

☆======☆======☆

''یہ کہاں کا انصاف ہے ابا کہ پہلے چیز دی اور اب واپس لے رہے ہیں۔'' اچھو غصے سے بل کھا رہا تھا۔ ''مجھے ساری دنیا سے بڑھ کر عزیز ہے اپنا تانگہ اور گھوڑا۔ دیکھ لیں اس گاؤں میں کیا اردگرد کے بیس گاؤں میں آپ کو میرے راجا جیسا گھوڑا اور میرے تانگے جیسا تانگہ نہیں ملے گا۔ پیر صاحب کے اصطبل میں بھی میرے راجا جیسا کوئی گھوڑا نہیں ہے۔ مجھے محبت ہے اپنی اس چھوٹی سی دنیا سے' میں یہ تانگہ ہرگز ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔''

''بکواس کیے جائے گا۔'' منشی فضل دین نے حقہ کونے میں رکھا اور خود بان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ''اچھو کی ماں! اسے سمجھاؤ' یہ شاہ صاحب کا حکم ہے۔''

''شاہ صاحب کا حکم ہے کوئی قرآن کا حکم نہیں ہے کہ اس پر ضرور عمل کیا جائے۔ آخر ہمیں بھی جینے کا حق ہے۔''

''ہائے بیٹا! ایسی بات نہیں کرتے۔'' اچھو کی ماں دہل کر رہ گئی۔ ''منہ سے بھی نہیں نکالتے ایسی بات' فرشتے سن لیں تو آگ کے گرز تپانے لگتے ہیں۔''

''فرشتوں کو اس کے علاوہ بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ وہ سارا دن اس انتظار میں نہیں رہتے کہ ہم شاہ جی یا پیر صاحب کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالیں اور وہ گرز آگ پر تپانے لگیں۔''

''ہائے میرے مولا۔'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''ماں' اب وہ وقت نہیں رہا جب ہماری حیثیت محض ہاتھ باندھے غلام کی سی تھی۔ یہ کوئی اندھیر نگری نہیں ہے' ہمارے منہ میں بھی زبان اور بازوؤں میں طاقت ہے۔ دیکھتا ہوں کون میرے راجا کو لے جاتا ہے۔''

''دیکھ لیا۔'' منشی فضل دین چلایا۔ ''دیکھ لیا اپنے بیٹے کو اچھو کی ماں' یہی دن دیکھنا رہ گیا تھا کہ یہ شاہ صاحب کی حکم عدولی کرے۔''

''نہ بیٹا ایسا نہیں کہتے' کیوں اپنی عاقبت خراب کرنے پر تلا ہوا ہے۔''

''کیوں' کیا قیامت کے دن لوگوں کو جنت جہنم میں بھیجنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے رجب علی شاہ نے؟''

''کفر کی باتیں نہ نکالا کر منہ سے۔'' اماں اس سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولیں اور پھر اچھو سے مخاطب ہوئیں۔ ''اور تو کیوں خدا رسولؐ کی ناراضگی لینے پر تلا ہوا ہے؟''

''خدا' رسولؐ نے کہیں نہیں کہا کہ کوئی تمہارے جھکے ہوئے سر پر جوتے لگائے تو وہ چپ چاپ کھالو۔''

''تیرے سر پر تو میں لگاؤں گا سو جوتے اور گنوں گا ایک' جا دفع ہو جا یہاں سے' جہنمی۔'' منشی نے ڈراوے کے لیے پاس ہی فرش پر پڑا ہوا جوتا اٹھا لیا۔

''ہونہہ!'' اچھو غصے سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''آٹھ جماعتیں کیا پڑھ لیں' خوفِ خدا ہی نہیں رہا دل میں' اہل بیت پر چڑھ دوڑنے لگا۔'' منشی بڑبڑائے جا رہا تھا۔ ''تعلیم نے مت ماردی ہے اس کی' ابھی کل ہی خط لکھتا ہوں سلیم کو کہ کالج چھوڑ کر گھر واپس آجائے۔ اس کے آٹھ جماعتیں پڑھ کر یہ لچھن ہیں تو وہ چودہ پڑھ کر کیا گل کھلائے گا۔ باپ دادا کا نام یہی بھائی مٹی میں ملائیں گے۔''

''ہونہہ! باپ دادا کا نام۔'' اچھو صحن سے ابھرتی باپ کی بڑبڑاہٹ سن کر مزید جھلا گیا۔ ''نام کیا ہیں باپ' دادا اور پردادا کے فجو' مجو اور دینو کہنے کو ہیں فضل دین...... عبدالمجید اور دین محمد لیکن گاؤں بھر میں کسی کو یہ نام یاد بھی ہیں ان کے؟ کسی سے پوچھو کہ دین محمد کا آبائی محل کہاں ہے تو ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگا اور پوچھو کہ دینو کی بارگاہِ عالیہ کون سی ہے تو لا کر اس ٹاٹ کے پردے والے عالیشان محل پر چھوڑ جائے گا۔

اور میں محمد اسلم عرف اچھو' باپ دادا اور پردادا کے عظیم ناموں کا محافظ ہوں واہ واہ دینو' مجو' فجو اور اب اچھو! اور پھر میرے آدھ درجن بچے آجائیں گے یہ آبائی نام سنبھالنے اور حویلی کے کام نمٹانے کے لیے۔''

وہ دھپ سے بستر پر بیٹھ گیا' جس کی چولیں پہلے ہی ہلی ہوئی تھیں۔ ''میرے راجا کو لے جانے آئے تو سہی کوئی ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں پکڑا دوں گا اس کی۔ ایک ہی محبت کی ہے' میں نے پوری زندگی میں کسی قیمت پر کسی کو اپنی یہ محبت چھیننے نہیں دوں گا۔''

اس کی نظروں کے سامنے تقریباً سال بھر پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب وہ منشی فضل دین سے شہر جانے کے لیے لڑ رہا تھا۔

''کیا رکھا ہے اس گاؤں میں ابا' سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے ہیں آپ اور ملتا کیا ہے؟ دو وقت کی سوکھی روٹی۔ کبھی پیر صاحب کو ترس آجائے تو ڈھائی سو مربعوں پر اُگی گندم کی پوری فصل میں سے ایک بوری بخش دیتے ہیں۔ دنیا میں بھی کما رہے ہیں اور آخرت کا انتظام

بھی پورا ہے۔ ہم تو وہ بد بخت ہیں جنہیں نہ دنیا میں کچھ مل رہا ہے اور نہ ہی آخرت میں کچھ ملنے کی امید ہے۔''

''تجھے تو سچ مچ کچھ نہیں ملے گا آخرت میں۔ دنیا بھی اپنے ہاتھوں برباد کر رہا ہے اور عقبیٰ بھی۔'' منشی جو پیر صاحب کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا گھر میں شیر کی طرح دھاڑتا تھا۔

''میں نے نہیں درخواست دی تھی اللہ میاں کو اس پھٹے پرانے گھر میں پیدا کرنے کے لیے جہاں دو وقت کی روٹی بھی باتیں سن کر ہی کھانے کو ملتی ہے اور نہ ہی رجب علی' حیدر علی اور سخاوت علی نے ایسا کوئی کارنامہ کیا تھا کہ ان کے حصے میں اتنی اونچی حویلی آجاتی۔''

''اسی لیے تیری دنیا نہیں سنورتی کہ اہل بیت پر بات کرنے سے باز نہیں آتا۔''

''آپ تو بات نہیں کرتے ان پر پھر آپ کی دنیا کیوں خراب ہے؟'' وہ جل کر بولا۔

''میری دنیا بہت اچھی ہے' بہت خوش ہوں میں یہاں۔ اللہ پاک دو وقت کی روٹی عزت سے دے رہا ہے' اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''تو آپ اپنے اس دیمک زدہ گھر میں خوش رہیں' میں جا رہا ہوں شہر دنیا اور آخرت میں سے کوئی ایک تو ہاتھ آئے۔''

''ہر پھر کر شہر جانے کی بات کرتا ہے' تو ہلا بھی یہاں سے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''شکر ہے ابا کہ باہر کسی نے یہ بات نہیں کی' خواہ مخواہ میرے اوپر قتل کا کیس بن جاتا۔ آپ کو پتا ہے ناں کہ آپ کی مار میں سر جھکا کر کھا لوں گا' ورنہ ابھی میری ٹانگیں توڑنے والا پیدا ہی کوئی نہیں ہوا۔''

''بڑا آیا پہلوان کی اولاد۔'' منشی بڑبڑایا۔

''شیخی نہیں بگھارتا' لیکن گاؤں کا کوئی جوان بھی پیٹھ نہیں لگا سکتا میری' جو ہاتھ میری طرف بڑھے گا اس کی ہڈیاں نہ چُرمرا کر رکھ دوں موم کی طرح۔''

''تب دیکھوں جو اپنے باپ کی ہڈیاں موم کی طرح چُرمرا دے۔'' منشی کو بھی تاؤ آگیا تھا۔

''ایک آپ سے ہی تو نہیں لڑ سکتا۔'' وہ ہار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''اب ہلنا نہیں ہے یہاں سے رات تک۔'' منشی نے حکمیہ انداز میں کہا۔

''ابا مجھے کسرت کرنے جانا ہے شام کو۔'' اس نے گویا فریاد کی۔

''میں نے کہا ناں ہلنا نہیں ہے۔'' منشی ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر گلی میں نکل گیا۔

پیر صاحب کے پاس جا کر اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔

''دو ہی تو بیٹے ہیں میرے پیر صاحب اول پر پتھر رکھ کر سلیم کو پڑھنے کے لیے بھجوایا ہے۔ اب اچھو بھی جانا چاہتا ہے شہر میں۔ جوان اولاد پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کیسے روکوں گاؤں میں۔''

''اس کا دل کیوں نہیں لگتا گاؤں میں؟'' پیر صاحب نے پوچھا۔

''حضور کمانے کی دھن میں شہر جانا چاہتا ہے۔''

''کما تو یہاں بھی سکتا ہے وہ۔'' پیر صاحب بولے۔

''اسے جنون ہو گیا ہے تانگہ چلانے کا۔ کہتا ہے شہر جا کر محنت مزدوری کروں گا پھر پیسے جمع کر کے ایک شاندار سا تانگہ خریدوں گا۔ سوچتا ہوں' اس کی جلدی سے شادی کر دوں شاید اس طرح ٹک جائے یہیں۔''

''کہاں شادی کرنا چاہتا ہے تمہارا بیٹا؟''

''سرکار مسئلہ تو یہی ہے کہ شادی پر بھی راضی نہیں ہوتا۔'' پھر خوشامدانہ انداز میں ان کے گھٹنے پکڑ کر بولا۔ ''حضور آپ اسے فوری شادی کا حکم دے دیں۔ میں دو دن میں اس کی بات پکی کر کے بارات بھی لے جاؤں گا۔''

''اپنے بیٹے کو ہمارے پاس بھیجنا۔'' یہ کہہ کر پیر صاحب اٹھ گئے۔

شام کو منشی خوشی سے سرشار گھر پہنچا تو اچھو اسی چارپائی پر بیزاری کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔

''یہ کہیں باہر تو نہیں گیا تھا؟'' اس نے آتے ہی اچھو کی ماں سے سوال کیا۔

''بیڑیاں پہنا کر جایا کریں ابا تاکہ یہ سوال کرنے کی زحمت نہ ہو۔'' وہ جل کر بولا۔

''بیڑیاں تو میں ایسی ڈالوں گا تیرے پاؤں میں کہ ساری زندگی ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

اچھو کے کان کھڑے ہو گئے۔

''پیر صاحب سے بات کی؟'' ماں بھی لپک جھپک باہر صحن میں نکل آئیں۔

''ہاں' انہوں نے طلب کیا ہے اسے۔''

''کیوں؟'' اچھو کا تحمل جواب دینے لگا۔

''تیرے لیے گوند کا انتظام کر رہے ہیں تاکہ چپکا رہ اس گاؤں سے۔''

''ابا! یہ اچھا نہیں کیا آپ نے۔'' وہ پاؤں پٹختا کمرے میں گھس گیا۔

ماں کی نظریں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک کمرے میں داخل ہو کر اس نے زوردار آواز کے ساتھ لکڑی کا بوسیدہ سا دروازہ بند نہیں کر دیا۔

''بھلئے لوکے! جلدی سے سوچ کوئی لڑکی تاکہ پیر صاحب کو بتا کر اس کی بات پکی کروں۔''

''اللہ جانے شادی کے نام سے اتنا بدکتا کیوں ہے' ورنہ لڑکیاں تو کتنی ہی ہیں۔ گاؤں کے سارے لڑکے ٹیڈی بن کر کرمو پان والے کی دکان پر کھڑے رہتے ہیں لیکن اسے اکھاڑے میں کشتیاں لڑنے اور ڈنڈ پیلنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔''

''کسرت کرنے والوں کے دماغ ذرا موٹے ہوتے ہیں لیکن کوئی حرج نہیں ہے۔ بہو آ کر سب کچھ سنبھال لے گی۔ ابھی تو لڑکیوں کو دیکھ کر بدکتا ہے جب دولہا بن کر کمرے میں جائے گا تو اپنی دلہن کو دیکھ کر ساری کسرت اور پہلوانی بھول جائے گا۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔''

اور پھر منشی اس کے تمام تر احتجاج کو نظر انداز کر کے کان سے پکڑ کر اسے حویلی میں لے آیا۔

''ابا میری یہ بے عزتی کسی اور نے کی ہوتی تو مزہ چکھا دیتا اسے۔'' اچھو غصے سے زیر لب بولا۔ ''سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا کہ جس جوان کی پیٹھ دور نزدیک کے کسی گاؤں کا کوئی فرد نہیں لگا سکتا اسے اس کا باپ کان سے پکڑ کر چوہے کی طرح گھسیٹ رہا ہے۔''

''بچو! ابھی تو وہ آئے گی جو تجھے کان سے بھی پکڑے گی اور مزہ بھی چکھائے گی۔''

اچھو دانت پیس کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر میں پیر صاحب تشریف لے آئے۔ دونوں باپ بیٹا ان کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''یہ ہے تمہارا بیٹا؟'' انہوں نے منشی کو مخاطب کیا۔

''جی سرکار'' منشی نے ہاتھ باندھے۔

''کیوں برخوردار شہر کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''جناب بہتر روزگار کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے ادب سے کہا۔

''روزگار یہاں بھی بہت ہے، تم کھیتوں میں کام کر سکتے ہو۔ حویلی میں بہت سے کام ایسے ہیں جن کے لیے تم جیسے نوجوان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، پھر کیوں بھاگنا چاہتے ہو یہاں سے؟''

''ان کاموں میں میرا دل نہیں لگتا۔'' وہ دبے دبے انداز میں بولا۔

''کیوں، کہاں دل لگایا ہوا ہے تم نے؟ اگر کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو نام بتاؤ۔ تمہارے باپ کی برسوں کی خدمت کے عوض ہم تمہاری شادی اس جگہ کروا دیں گے۔'' پیر صاحب کی آواز میں رعب اور دبدبا تھا۔

''شادی صرف ابا کی ضد ہے سرکار......'' وہ جلدی سے اپنی صفائی میں بولا۔ ''میں نے تو آج تک گاؤں کی کسی لڑکی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چاہے سارے گاؤں سے پوچھ لیں آپ۔''

''حضور یہ ٹھیک کہتا ہے، اس کم ذات کو شادی کا شوق بھی نہیں ہے۔''

''تم چپ رہو منشی ہمیں لڑکے سے بات کرنے دو۔'' پھر وہ اچھو سے مخاطب ہوئے۔

''مجھے بتاؤ کہ تمہارا کس کام میں دل لگتا ہے۔ شہر جا کر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟''

''جناب تانگہ چلانا چاہتا ہوں۔'' اس کے خواب اس کی جاگتی آنکھوں میں اتر آئے۔

تانگہ چلانے کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا۔ دن رات اس کے خوابوں میں ایک تانگے کا بسیرا رہتا تھا، جس کا گھوڑا خود اس کی طرح جاندار اور طاقتور ہوتا تھا۔ لمبی ایال اور خوبصورت دُم والا مشکی گھوڑا، جس کی لگامیں اچھو کے ہاتھ میں ہوتی تھیں اور وہ بانکی چال چل رہا ہوتا تھا۔

''ہوں، تانگہ!'' پیر صاحب چند لمحوں کے لیے سوچ میں گم ہو گئے پھر منشی سے کہہ کر اپنے اصطبل کے سائیس کو بلوایا۔

''اس لڑکے کو اصطبل میں لے جاؤ اور جو گھوڑا اسے پسند آئے، وہ اس کے حوالے کر دو۔''

''جی!'' سائیس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔''

اچھو کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں بیٹھے بٹھائے ایک دن اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ وہ تو خوشی کے مارے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ابھی وہ سائیس کے پیچھے بے تابی سے کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ پیر صاحب کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

''اچھو!''

''جی حضور!'' وہ پیچھے مڑا۔

''یہ گھوڑا اور تانگہ ہم تمہیں ایک شرط پر دیں گے۔''

اچھو کے چہرے پر مایوسی کے سائے لرزنے لگے۔

''شرط بہت آسان ہے۔'' انہوں نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

''جی حضور۔'' اس نے اپنے لہجے میں جھلکتی مایوسی چھپانے کی کوشش کی۔

''تم شہر تانگہ چلانے جانا چاہتے تھے ناں؟''

''جی۔''

''اب جب تمہیں یہاں تانگہ مل رہا ہے تو تم یہیں گاؤں میں رہو گے کمائی کی غرض سے شہر نہیں جاؤ گی۔''

وہ کھل اٹھا۔ شہر تو وہ اس لیے جانا چاہتا تھا کہ محنت مزدوری کر کے پیسے جمع کرے اور ایک اچھا سا تانگہ خریدے اب جب اس کی یہ خواہش یہیں رہتے ہوئے پوری ہو رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی شہر جانے کی۔

''حضور مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔'' وہ خوشی خوشی بولا تھا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔''

اچھو نے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔

''آپ پر میری اور میری اولاد کی جان قربان' آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے' وہ میری آنے والی نسلیں کبھی نہیں اتار سکیں گی۔'' منشی پیر صاحب کے قدموں میں گر گیا۔

''تم ہمارے جدی پشتی نوکر ہو اس لیے ہم نے تمہاری اور تمہارے خاندان کی خدمت سے خوش ہو کر تمہارے بیٹے کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔''

''اللہ پاک آپ کو اور آپ کی اولاد کو لمبی زندگی دے میری اور میرے بیٹے کی بھی عمر آپ کو لگ جائے۔''

''فی الحال تمہارا بیٹا گاؤں میں ٹک گیا ہے' جب گھوڑے اور تانگے سے اس کا دل بھر جائے گا۔ اس وقت ہمیں بتا دینا تب ہم اس کی شادی طے کر دیں گے۔''

''اللہ پاک آپ کو دنیا اور آخرت میں ہیروں کے محل دے۔''

پیر صاحب اٹھ کر اندر چلے گئے۔

اصطبل میں پہنچ کر اچھو نے کتنے ہی گھوڑے دیکھے اور رد کیے تھے۔

''تمہارے لیے کیا آسمان سے کوئی خاص گھوڑا اترے گا؟'' سائیس چاچا نے تنگ آ کر کہا تھا۔

''مجھے آسمانی گھوڑے کی نہیں اپنے خوابوں کے گھوڑے کی تلاش ہے۔'' اچھو بولا۔

''لو جی' جوان آدمی گھوڑوں کے خواب دیکھتا ہے۔'' سائیس نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تو کیا ان ٹیڈی لڑکوں کی طرح سرخ مفلروں کے خواب دیکھوں؟'' وہ تنک کر بولا۔

''میرا ایک ہاتھ برداشت نہ کر سکیں یہ ٹیڈی۔''

''اچھا' اچھا جلدی سے ان میں سے کوئی ایک گھوڑا پسند کر لو اور اپنا راستہ ناپو۔''

''چاچا! ان کے علاوہ بھی تو گھوڑے ہیں اصطبل میں۔''

''کن گھوڑوں کی بات کر رہے ہو تم؟'' سائیس نے اسے گھورا۔

''یہ تو یہاں کے گھوڑے ہیں' مجھے عربی نسل کے گھوڑے دکھاؤ جو قد آور اور مضبوط ہوں۔''

''واہ' واہ! کبھی شکل دیکھی ہے اپنی شیشے میں۔'' سائیس چمک کر بولا۔ ''وہ گھوڑے تم جیسے کم ذاتوں کے لیے نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں تانگے میں جوتا جاتا ہے۔''

''مجھے تو ویسا ہی گھوڑا چاہیے۔'' اچھو بھی اڑ گیا۔ ''پیر صاحب نے کہا تھا کہ مجھے جو گھوڑا بھی پسند آ جائے' وہ میں لے سکتا ہوں۔''

''اتنا عمدہ گھوڑا میں تمہیں دیکھنے تک نہ دوں گا۔ کجا یہ کہ تم اسے گھٹیا سے تانگے میں جوتو۔''

''لیکن میں تو عربی نسل کا گھوڑا ہی لوں گا۔''

دونوں میں تکرار اس حد تک بڑھی کہ معاملہ ایک مرتبہ پھر پیر صاحب کے سامنے پیش ہوا۔

''ہم نے حکم دیا تھا کہ یہ لڑکا اپنی پسند کا گھوڑا لے گا تمہیں حکم عدولی کی جرأت کیسے

ہوئی؟''

اور سائیس پورے پندرہ منٹ تک جھاڑ کھانے کے بعد کان دبا کر واپس آیا اور اچھو کو عربی نسل کے گھوڑوں کے پاس لے گیا۔

ان گھوڑوں کو دیکھ کر اچھو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ابلق' چکتے دار اور مشکی' خوبصورت طاقت ور اور قد آور گھوڑے اپنے اپنے تھان پر ہنہنا رہے تھے۔ ان کے تھان صاف ستھرے تھے اور وہ ان پر کسی فوج کے سپہ سالاروں کی طرح گردن تانے کھڑے تھے۔

''اب دیکھتے ہی رہو گے یا گھوڑا بھی لو گے۔'' سائیس نے بیزاری سے کہا۔

''آں...... ہاں ہاں۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

پھر قدم قدم آگے بڑھ کر اس نے لمبی ایال اور خوبصورت دُم والے چمک دار مشکی گھوڑے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا؟'' یوں لگا جیسے سائیس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔ ''یہ پورے اصطبل کا بہترین گھوڑا ہے۔ تم اتنی اعلیٰ نسل کا اور ایسا بہترین گھوڑا تانگے میں جوتو گے؟ احمق یہ سواری کا گھوڑا ہے۔''

''تمہیں کیا پتا چاچا' یہ تو میرے خوابوں کا راجا ہے۔'' اس نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ ''آج سے اس کا نام راجا ہے۔''

اچھو اپنے خیالات کی دنیا سے واپس پلٹ آیا۔ کتنا خیال رکھا تھا اس نے اپنے راجا کا اپنے اہم کاموں کو چھوڑ کر وہ راجا کی خاطر مدارت میں لگا رہتا تھا اور راجا بھی تو یوں چلتا تھا جیسے اس کے قدم زمین پر نہ پڑتے ہوں بلکہ وہ ہوا میں تیرتا ہو' ارد گرد کے سبھی گاؤں میں اس کا گھوڑا اور تانگہ سب سے شاندار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔ راجا اس کا دوست اور اس کا غمگسار تھا۔ اچھو کے یار دوست راجا کو ''بھابی بیگم'' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ ہنس پڑتا۔

''بے وقوفو! یہ تمہاری بھابی نہیں' تم لوگوں کا بھتیجا ہے۔ میری اولاد کی طرح ہے یہ۔''

''اتنے نخرے بیویوں کے اٹھاتے ہیں میری جان' اولاد کے نہیں۔'' وہ بھی ہنستے۔

اور اب رجب علی شاہ اس کی متاعِ عزیز' اس کی پہلی محبت اس کا دوست' محبوب اور اولاد' اس کا راجا' اس سے چھیننا چاہتا تھا۔

''میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ چلایا۔ چاہے وہ میرے جسم سے روح کھینچ لیں' لیکن اپنی زندگی میں مَیں راجا کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔''

☆======☆======☆

کتنے دنوں تک زمین' جائیداد کے کاموں میں الجھے الجھے رجب علی شاہ کے اعصاب پر تھکن سوار ہو گئی تھی۔ شہر کی رونقوں سے دور ایک عام سے گاؤں میں رہتے ہوئے جہاں نہ کسی

نائٹ کلب کا شور ہنگامہ تھا اور نہ ہی کسی حسینہ کی سنہری زلفوں کا سایہ۔

پینے کا شغل تو جاری تھا لیکن اپنے کمرے میں رہتا...... پینے میں نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ کشش۔ بس روز کی ایک روٹین تھی جسے وہ پورا کرتا رہتا تھا۔

گھر میں ہونے والی تیاریوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ سارا کام حیدر علی نے بخوبی سنبھال رکھا تھا' اس لیے زمینوں کے مسئلے سلجھا کر اب وہ فارغ تھا اور اس فراغت کے ساتھ ہی اس کے اندر وہ تمام خواہشات انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں جو اب تک کام کے بوجھ کی وجہ سے اونگھ رہی تھیں۔ ایسے ہی میں اس نے اپنے معتمد خاص شکورے کو طلب کیا۔

''جی حضور!'' شکورا اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

رجب علی نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ شکورا وہ تنومند اور قد آور جوان تھا جسے آتے ہی رجب علی شاہ نے اپنے ذاتی نوکر کی حیثیت سے پسند کیا تھا' اس میں وہ سب کچھ تھا جو رجب علی اپنے ذاتی خدمت گار میں دیکھنا چاہتا تھا...... طاقت' جرأت' راز داری اور وفاداری۔ تب سے اب تک وہ رجب علی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

''جلدی سے کار تیار کرو۔'' اس نے شکورے سے کہا۔

''جی سرکار۔'' وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کار میں بیٹھ کر لاہور کی طرف رواں دواں تھے۔

''میں جب سے آیا ہوں' تب سے اب تک لاہور جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' وہ بولا۔ ''تم تو جاتے رہتے ہو گے وہاں؟''

''بس سرکار' دو مرتبہ اتفاق ہوا ہے جانے کا۔'' شکورے نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' اس نے ہنکارا بھرا پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''اس خاص کوچے کا تو پتا ہو گا ناں تمہیں۔''

''اس کا کسے نہیں معلوم سرکار' لاہور کے تمام سینما اور سب کوٹھوں کو جانتا ہوں میں۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''آج کل نمبر ایک کون جا رہی ہے؟''

''چندا بائی۔'' وہ بلا تامل بولا۔ ''بڑی قیامت خیز چیز ہے وہ۔ جیسا نام ہے اس سے کہیں بڑھ کر حسین ہے وہ۔ اب تو سنا ہے کہ اس نے فلموں میں کام کرنے کی ہامی بھی بھر لی ہے۔ بڑی چلتا پرزہ ہے حضور! کتنے رئیس زادے اس کی بیٹھک میں گھنٹوں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ تمام لوگوں کی طرف تو دیکھتی بھی نہیں ہے وہ' اپنی قیمت اچھی طرح جانتی ہے ناں' اس لیے بڑے بڑوں کو تڑپاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' ہمیں چندا بائی کے کوٹھے پر ہی چلنا ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

اتنے دنوں کی تھکن کے بعد چندا بائی کی اتنی ذرا سی تعریف نے ہی اس کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔ کار کے ایکسیلریٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ لاہور' لندن کی طرح الس...... نہ سہی لیکن نیاز پور سے کہیں بہتر تھا۔ وہاں برطانیہ کی طرح چندے آفتاب' چندے مہتاب نہ سہی لیکن چندا بائی تو موجود تھی۔

چند گھنٹوں بعد ہی رجب علی شاہ' چندا بائی کے کوٹھے میں داخل ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ بھائی اور بھابی کی نئی زندگی کی شروعات کے لیے ہر بہترین چیز ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھی کر رہا تھا۔ (بہنوں کے لیے بھی اس نے ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی) لیکن ایسے میں بھی وہ گوری کو نہیں بھولا تھا۔ گوری جو اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت اور دل کش باب تھی۔

جیولر کی دکان میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ بہت خوبصورت' نازک اور نفیس سونے کی چین پر پڑی۔ اس کے تصور میں گوری کا سراپا اترتا چلا آیا۔

اس کی شہد رنگ' صراحی دار گردن میں یہ چین کتنی اچھی لگے گی۔ اس نے سوچا۔

تصور ہی تصور میں اس نے یہ سنہری چین گوری کی گردن میں پڑی دیکھی اور اگلے ہی لمحے فوراً اس نے وہ چین گوری کے لیے خرید لی۔

یہ جدائی کے ان لمحوں کا مداوا تو نہیں کر سکتی لیکن اس سے گوری کو یہ احساس ضرور ہو گا کہ تمام تر مصروفیات کے باوجود بھی میں اسے بھولا نہیں ہوں۔ میں کہیں بھی جاؤں' میری گوری میرے ساتھ ہے۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

اب تک اس نے گوری کے لیے تین چیزیں لی تھیں۔ خوبصورت سرخ اوڑھنی' پرفیوم اور سونے کی زنجیر۔

کتنی سندر' کتنی دلکش لگتی وہ جب خوشبو میں بھیگی اوڑھنی لیے' سنہری زنجیر گردن کی زینت بنائے حیدر علی کے سامنے آتی۔ رنگ' خوشبو اور حسن یکجا ہو جاتے۔ وقت سہج سہج' تھم تھم کر چلنے لگتا۔ زندگی اپنے مدھم سُروں کے ساتھ ہوا کے دوش پر وصل کی وہ گھڑیاں لاتی جو زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہوتیں۔ ہمیشہ رہنے والی لافانی ساعتیں۔

گاؤں کی کچی سڑک پر اترتے ہی حیدر علی کو اپنی کار کی رفتار آہستہ کرنا پڑی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر اندھیرا پوری طرح پَر پھیلا چکا تھا۔ سڑک کچی اور ناہموار تھی۔ یہی نہیں اس ماحول' ویران سڑک پر اس وقت کتوں کا راج تھا۔ دن میں جس جگہ کی بادشاہت اس کے گھرانے کے پاس تھی' رات میں اسی جگہ کی حکومت ان آوارہ کتوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔

ہچکولے کھاتی، آہستہ روی سے آگے بڑھتی کار گاؤں کے قریب پہنچی تو ہوا کے دوش پر تیرتی ایک پُرسوز مردانہ آواز حیدر علی کی سماعت سے ٹکرائی۔ کوئی شخص درد میں ڈوبی آواز میں ہیر وارث شاہ گا رہا تھا۔

"ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک بازتوں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی"

(ہیر نے جوگی سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، روٹھے ہوئے سجن کو کوئی راضی نہیں کرسکتا۔ میں تو ایسے شخص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی جو دور گئے سجن کو واپس لے آئے۔ جو میرے دل کا درد مٹادے، وہ چاہے میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کو سچا رب کب واپس بھیجتا ہے۔ لوگ یونہی دل رکھنے والی باتیں کرتے ہیں، ورنہ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے کو کوئی نہیں ملا سکتا۔ اگر باز سے کوا کونج چھین لے تو تم دیکھنا کہ وہ باز خاموش ہوکر اپنی چونچ پروں میں دبا لیتا ہے یا چلاتا ہے۔)

حیدر علی نے کار حویلی کی سمت موڑنے کے بجائے آواز کی جانب سفر جاری رکھا۔ درد میں بھیگی اس آواز کا اثر وہ اپنے جسم کی تہوں تک محسوس کررہا تھا۔

دور کھیتوں کے پاس ایک ہیولا سا تھا۔ آسمان پر پھیلے تاروں کی ٹمٹماتی مدھم روشنی اسے دیکھنے کے لیے ناکافی تھی۔ پھر کار کی ہیڈ لائٹس اس ہیولے پر پڑیں۔

پیلاہٹ مائل سفید تہہ بند اور قمیص میں ملبوس جھکی ہوئی کمر والا شخص جس کی پشت کار کی جانب تھی، کار کی روشنی میں خود کو محصور دیکھ کر اس نے مڑ کے دیکھا اور پھر تیز روشنی کے باعث آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے منہ موڑ لیا اور تیزی سے کھیتوں کے درمیان غائب ہوگیا۔

حیدر علی گہرا سانس لے کر رہ گیا اور کار حویلی کی جانب موڑ لی۔ روشنی میں وہ صرف اسی قدر دیکھ سکا تھا کہ اس شخص کے چہرے پر بے ہنگم انداز میں پھیلی ہوئی گھنی داڑھی تھی اور چال میں قدرے لنگراہٹ تھی۔

"نہ جانے کون شخص ہے۔" حیدر علی سوچ رہا تھا۔

آج سے قبل اس نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن یہ بھی تو تھا کہ رات کے اس پہر وہ کبھی باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی باہر نکلنے کی اور حویلی کی بلند و بالا اور موٹی

دیواروں سے گزر کر اس کی آواز کا اس تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔

گاؤں میں تو یوں بھی رات بہت جلدی ہو جاتی تھی۔ پورے گاؤں میں صرف حویلی میں بجلی کا انتظام تھا۔ باقی گھروں میں لالٹینیں جلتی تھیں اور وہ بھی مغرب کی اذان کے ساتھ رات کا کھانا کھا کر بجھا دی جاتی تھیں۔

حیدر علی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے گیارہ بجے تھے لیکن گلیوں میں پھیلا سناٹا دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آدھی رات کا سماں ہو۔

حیدر علی اپنی سوچ پر خود ہی ہنس پڑا۔ آدھی رات ہونے میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا، صرف آدھ گھنٹہ، لیکن اس کی رات کی تو ابتداء بھی بارہ بجے سے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوتی تھی، جب باقی گاؤں والے اپنی تین چوتھائی نیند پوری کر چکے تھے۔

گاؤں کی اکلوتی سفید مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دایاں پاؤں خود بخود بریک پر جا ٹھہرا۔ مسجد اور اس کے ساتھ بنے ہوئے حجروں پر بھی تاریکی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ یہیں اس کی گوری تھی جسے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار تھا جس سے ملنے کے لیے اس کا دل مچل رہا تھا۔

"شاید ابھی کوئی دریچہ، کوئی روزن اس کے حُسن سے روشن ہو جائے۔" اس نے سوچا۔

"شاید اسے بھی یہ بے قراری باہر کھینچ لائے۔"

حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا اور کار میں بیٹھے بیٹھے حجروں میں کوئی روزن، کوئی دریچہ کھوجنے لگا لیکن مدھم مدھم چاندنی میں وہ عمارت کے نقوش الگ الگ کرنے سے قاصر تھا۔

ہاں دیوار سے ایک بلی کودی تھی اور کودنے سے پہلے اس نے رات کے اندھیرے میں چمکنے والی اپنی روشن آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا تھا اور بس۔ اس کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

اور اس دوران جو آوازیں اس کی سماعت سے ٹکراتی رہی تھیں، ان میں نہ تو گوری کی رس بھری آواز تھی اور نہ اس جھکی ہوئی کمر والے بوڑھے کی پُرسوز، درد میں ڈوبی ہوا کے دوش پر تیرتی آواز...... اب یہاں ہر طرف جھینگروں کی مسلسل ابھرتی ہوئی کوتھی اور گلیوں میں راج کرنے والے کتوں کی بھوں بھوں۔

پھر لمحہ لمحہ سرکتا گیا۔ سگریٹ ختم ہوگیا اور حیدر علی نے اس کا بقیہ حصہ کار کے شیشے سے باہر اچھال دیا، لیکن کوئی روزن، کوئی دریچہ گوری کے حُسن سے منور نہ ہوا۔ کوئی رس بھری آواز اس کی سماعت سے نہ ٹکرائی۔ کسی نے پیار سے اس کے کان کے پاس سرگوشی نہ کی۔

"شاہ جی۔"

اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور کار آگے بڑھا دی۔ یہاں آکر یہاں ٹھہر کر، یہاں انتظار کرکے اس کی بے قراری میں کمی نہیں، اضافہ ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے دل پہلے سے کہیں

زیادہ مچل رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ کم از کم ہفتے کے دن تک وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا' سوائے اپنی اس بے قراری کے ساتھ انتظار کرنے کے۔

صبح ناشتے کے دوران حیدر علی کو کل والے بوڑھے کا خیال آیا۔ اس کا ذاتی خدمت گار نواز دین وہیں اس کے کمرے میں کھڑا تھا۔

''کل رات جب میں یہاں پہنچا تو کوئی شخص ہیر گا رہا تھا۔'' حیدر علی نے اس سے کہا۔ ''جانتے ہو وہ کون شخص ہے؟''

''سرکار بہت پہنچا ہوا بابا ہے۔'' وہ بولا۔ ''پتا نہیں کہاں سے آیا ہے' اب تو برسوں بیت گئے اسے یہاں رہتے ہوئے۔''

''پہنچا ہوا کیا مطلب؟''

''سرکار۔'' نواز دین ایک دم گھبرا گیا۔ ''میں کسی برابری کی بات نہیں کر رہا۔ اس قدر پہنچا ہوا نہیں ہے' بس چپ چاپ رہتا ہے' بولتا نہیں ہے۔ ہاں رات ہوتی ہے تو ہیر گانے لگتا ہے۔ اللہ لوک ہے سرکار' سب گاؤں والے اسے سائیں بابا کہتے ہیں۔ نذر نیاز لے لیتا ہے لیکن صدقہ خیرات نہیں لیتا۔ پیر صاحب نے اس کا حصہ مقرر کیا ہوا ہے' ان کی وجہ سے اب تک جی رہا ہے۔''

''کوئی شخص کسی کی وجہ سے نہیں جیتا۔ زندگی اور موت کا اختیار کسی انسان کے پاس نہیں' صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔'' حیدر علی بولا۔

''آپ سے سائیں بابا نے کچھ کہا؟'' نواز دین نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں' تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ بولتا نہیں ہے۔''

''زیادہ نہیں بولتا' پر جب کبھی بات کرتا ہے تو وہ سچ ثابت ہوتی ہے۔''

حیدر علی کو اس کی بات پر کچھ زیادہ یقین نہیں آیا۔

''آپ کے اور بڑے شاہ صاحب کے آنے سے پہلے بھی سائیں بابا نے کہا تھا کہ حویلی میں رونق آنے والی ہے۔'' اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''میں حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے' اب سے پہلے نہ کبھی دیکھا نہ ذکر سنا۔''

''حضور! آپ کے لیے پیر صاحب نے پیغام بھجوایا تھا۔''

''کیسا پیغام؟''

''فرما رہے تھے کہ ناشتہ کر کے آپ ان سے مل لیں۔''

''اچھا!'' حیدر علی نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

پیر صاحب اس وقت مزارعوں کی فریاد سن رہے تھے جب حیدر علی ان کے پاس پہنچا۔

''سرکار ہم تو تھک ٹوٹ کر خوب گہری نیند سو جاتے ہیں ہمیں پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ

ہماری بھینس لے گئے۔'' ایک بوڑھا مزارع گڑگڑا رہا تھا۔

''جی حضور! رات کو کھیتوں میں پانی بھی وہی لگا رہے تھے۔'' ایک اور نے جلدی سے کہا۔

''منشی۔'' پیر صاحب نے رعب سے پکارا۔

''جی سرکار۔'' وہ جلدی سے آگے بڑھا۔

''بندے بھیج کر پتا کرو کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا نہیں یہاں یہ رسہ گیری نہیں چلے گی۔''

وہ مزارعے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے تو پیر صاحب' حیدر علی کی جانب مڑے۔

''بابا جان! آپ نے یاد فرمایا تھا؟''

چند لمحے وہ اس کی طرف دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔ ''واقعی اولاد انسان کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑا امتحان ہوتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں بابا جان!''

''ہمارا خیال تھا کہ تم ہم سے اپنے کیے کی معافی مانگو گے' اس پر اظہارِ ندامت کرو گے لیکن اظہار تو دور کی بات ہے تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم اپنی بات پر شرمندہ تک نہیں ہو۔''

''میں سمجھا نہیں کہ آپ کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟'' حیدر علی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم نے تمہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت بھیجا۔ اولاد جب جوان ہوتی ہے تو باپ کا بازو بنتی ہے مگر تمہیں تمہاری تعلیم نے باپ کے بازو کاٹ دینے کی تربیت دی ہے۔''

''کیسی بات کر رہے ہیں آپ بابا جان! میں آپ پر اور اس گھر پر اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں' آپ حکم تو کریں۔''

''ہمیں تمہاری جان لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ایک شیر دل اور جری بیٹے کی ضرورت ہے جو ہماری زندگی میں اور اس کے بعد بھی اس خاندان اور اس کی روایات کی حفاظت کر سکے۔''

ایک دم ساری بات حیدر علی کی سمجھ میں آ گئی۔ بابا جان اب تک اس گفتگو کے حوالے سے بات کر رہے تھے جو بہت دن قبل ان کے درمیان مہر النساء اور زیب النساء کی شادیوں کے متعلق ہوئی تھی۔

''میں نے آپ سے بہت ادب کے ساتھ بات کی تھی۔ میرا مقصد آپ کو دکھ دینا یا تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو آپ میں سے کسی کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا' اسی لیے بہنوں کی تکلیف وہ تنہائی محسوس کر کے میں نے آپ سے بات کی تھی۔''

''قسم ہے اس ذات پاک کی کہ اگر یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور نے کی ہوتی تو ہم اپنے

ہاتھ سے اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتے۔"

"اپنی عقل کے مطابق میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کو اس میں سے کیا بات بری لگی تھی۔"

"تمہاری عقل، روایتوں کو کاٹنے والی دو دھاری تلوار بننے لگی ہے علی۔ ہماری بات غور سے سنو بیٹا۔ ہر بات عقل کی کسوٹی پر رکھ کر نہیں جانچی جاتی ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے ہاتھ سے بیٹے کے گلے پر چھری نہ رکھ دیتے اور نہ ہی آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں میں بلا تامل کود پڑتے۔ عقل کی لگامیں تھام کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں تو کوئی آگ گل و گلزار نہیں بنتی۔"

"درست کہا آپ نے۔ میں ارشاد خداوندی کو عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھ رہا، لیکن بابا جان بڑی آپا اور زیبی آپی کی شادی کے بارے میں بھی کیا ایسا ہی کوئی ارشاد ہے؟"

حیدر علی کو اپنے سوال کی ساخت سے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بات پیر صاحب کو گراں گزرے گی، لیکن کلاس روم اور لیکچر تھیٹرز میں اپنے پروفیسرز سے کھل کر بحث کرنے والے حیدر علی کے لیے یہ مرحلہ بہت دشوار ہوتا تھا۔ جب وہ بابا جان سے اختلاف کرنا چاہتا تھا، ان سے اپنے ہر "کیوں" کا جواب حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن کھل کر سیدھے لفظوں میں سوال نہیں پوچھ سکتا تھا اور اپنے ہر سوال پر "کیوں" کو ادب کے دبیز پردوں میں لپیٹ دیتا تھا ایسے میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جو کچھ وہ جاننا چاہتا ہے، اس کا پانچ فیصد بھی وہ ان سے نہیں پوچھ پا رہا۔ تب غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ ادب میں ملفوف سوالوں کے اوپر سے وہ احترام کی تہہ بہ تہہ جمی ہوئی پٹیاں کھولتا جاتا تھا اور اس کا ہر "کیوں" واضح ہوتا جاتا تھا۔

پیر صاحب کو اس کے سوال پر غصہ تو آیا لیکن انہوں نے نہایت تحمل سے اسے مخاطب کیا۔

"اپنے سے کمتر لوگوں میں شادی کرنا ہمارے منصب اور روایتوں کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اونچا مرتبہ عطا کیا ہے۔ ہم نے کبھی بھی اپنے اس مرتبے سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ اپنے سے کمتر لوگوں کی بھلائی کے بارے میں ہی سوچا ہے۔ صدقہ خیرات میں کمی نہیں کی۔ غریبوں کی خاطر حویلی کا جو چولہا ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں جلا تھا وہ آج تک سرد نہیں ہوا، لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے اس منصب اور مرتبے کی حفاظت کریں، اپنے خاندان کے خون کو خالص رکھیں اور یہ گدی بچا کر رکھیں۔"

"اور ایسا ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ آپ بڑی آپا اور زیبی آپی کی شادی کبھی نہ کریں۔" حیدر علی بولا۔ "یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟"

"بیٹی بیاہی جاتی ہے تو جائیداد تقسیم ہوتی ہے، عزت تقسیم ہوتی ہے اور یہ بیٹیاں جہیز میں صرف زمینیں، مزارعے اور خدمت گار ہی نہیں باپ اور بھائیوں کی عزت بھی ساتھ لے جاتی ہیں،

پھر یہ ان کے سسرال والوں کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس عزت کو ماتھے پر سجا کر رکھیں یا اپنے قدموں میں رول دیں اور علی! بیٹیاں جو عزت اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں انہیں ماتھے پر سجانا کم ہی نصیب ہوتا ہے، اس لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر عزت اور سکون کی زندگی گزار دیں۔" پیر صاحب کہہ رہے تھے۔ "اس گدی پر بیٹھنے والے ہمارے آباؤ اجداد میں سے کسی کی بیٹی کبھی نہیں بیاہی گئی۔ کیونکہ یہ اس گدی کے منصب اور شان کے خلاف ہے۔ صدیوں کی عزت کو محض اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی خاطر کسی نے خاک میں آلودہ کرنا گوارا نہیں کیا، ہم بھی یہ نہیں کر سکتے۔"

حیدر علی چند لمحے تک حیرت کے ساتھ باپ کی جانب دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"بابا جان! ان بیٹیوں نے کبھی بغاوت نہیں کی؟"

یہ سوال درحقیقت بیسویں صدی کے ایک متجسس طالب علم کا سوال تھا، لیکن پیر صاحب کو اس بات پر طیش آنا لازمی تھا۔

"ہماری بیٹیوں اور ولایت کی بے حیا عورتوں کے درمیان اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان۔ یہ جراثیم اور گندگی ہماری بیٹیوں میں کبھی نہیں آ سکتی۔ زمین سے جتنی بھی خاک اُڑتی رہے وہ آسمان کو آلودہ نہیں کر سکتی۔"

"بابا جان! زندہ انسانوں کے رہنے کی جگہ یہ زمین ہے، آسمان نہیں ہے۔ آپ نے میری بہنوں کو مُردہ کیوں تصور کر لیا؟ وہ زندہ ہیں بابا جان، سانس لیتی ہیں، غم اور خوشی کی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہیں۔ تنہائی کے عفریت کو جبڑے پھیلا کر اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ سکتی ہیں۔ سکون کی زندگی وہ نہیں ہوتی جو ماں باپ کے گھر تنہا رہ کر گزار دی جائے۔ سکون کی زندگی وہ ہوتی ہے، جس میں ماں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلاتی ہے اسے لوری دیتی ہے۔ اسے اپنے سامنے پروان ہوتے ہوئے دیکھتی ہے۔ آپ بڑی آپا اور زیبی آپی کو اس حویلی میں بند کر کے یہ سکون دے سکتے ہیں؟ آراستہ کمرے اور بہترین ملبوسات شوہر کی محبت اور اولاد کی خوشیوں کا نعم البدل نہیں ہوتے۔"

"بس علی! اتنا کافی ہے۔" پیر صاحب نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا۔ "جن عورتوں کی بات تم کر رہے ہو، وہ عام کمی کمین عورتیں ہوتی ہیں، جو ماں باپ سے بغاوت کرتی ہیں، جو باپ کی دستار پر سیاہ دھبے لگاتی ہیں جو باپ اور بھائیوں کی عزت سسرال والوں کے قدموں میں ڈالنے کے لیے شادی کا انتظار کرتی ہیں۔

لیکن اس حویلی میں ہماری بیٹیاں ہیں، پیر جلال الدین شاہ کی بیٹیاں، رجب علی شاہ کی بہنیں، وہ لڑکیاں جن کے کمرے کا رخ باہر چلنے والی ہوائیں بھی نہیں کرتیں کہ کہیں ان ہواؤں کے دوش پر ان کے نام کسی غیر مرد کے کانوں میں نہ پڑیں۔ وہ کوئی عام لڑکیاں نہیں، سیّد زادیاں

ہیں، جن کی آواز بھی کسی نامحرم کان میں نہیں پڑی، جن کی شرافت اور پاکیزگی کی قسم کھائی جاسکتی ہے اور ہماری یہ قابلِ فخر بیٹیاں کسی غلط سوچ کو بھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دے سکتیں۔''

''وہ سیّد زادیاں ہیں۔ آپ کی یعنی پیر جلال الدین شاہ کی بیٹیاں، رجب علی، حیدر علی اور سخاوت علی کی بہنیں لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان سب سے پہلے وہ انسان بھی ہیں، جنہیں ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔ ہاں ہوا بھی ان کے کمرے کا رخ نہیں کرتی۔ تب ہی تو ان کمروں کی فضا اتنی بوجھل اور کثیف ہے، انہیں اتنی بڑی آزمائش میں مبتلا مت کریں۔ پلیز بابا جان! کوئی کھڑکی کھول دیں، ان کے لیے تاکہ وہ بھی تازہ ہوا میں سانس لے سکیں۔ اس طرح ان کے وجود کی نفی کرنے اور انہیں ان قبر نما کمروں میں زندہ درگور کرنے سے بہتر تھا کہ آپ انہیں پیدا ہوتے ہی ختم کر دیتے۔''

''علی! تم ہماری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔'' پیر صاحب مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

''نہیں بابا جان! میں آپ کو اس حقیقت سے آشنا کر رہا ہوں جو کسی بھی وقت رونما ہو سکتی ہے لیکن آپ نے اس جانب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اگر بڑی آپا اور زیبی آپی کسی کھائی میں گر گئیں تو اس کے ذمہ دار آپ اور بھائی جان ہوں گے، اگر ایک مرتبہ باہر نکلنے کا خیال دل میں آ جائے تو دروازے اپنے آپ کھلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں صدر دروازہ مقفل ہو تو چھوٹا سا روزن بڑھتے بڑھتے چور دروازے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر طوفان کی آمد کو کوئی نہیں روک سکتا۔''

''حیدر علی!'' پیر صاحب کے لیے غصے پر قابو پانا اب ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ ''ہم نے تمہیں اس لیے طلب کیا تھا کہ تمہارے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر تمہیں اپنے گلے سے لگائیں گے لیکن تم نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اپنی بہنوں کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تمہاری زبان نہیں لڑکھڑائی۔ بھائی ہو کر تم ان کی شرافت اور پاکیزگی پر شک کر کے ان کی تذلیل کر رہے ہو۔ جاؤ دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے، چلے جاؤ یہاں سے۔''

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ بابا جان کو وہ کیا سمجھا سکتا تھا، جبکہ انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا تھا کہ ان کی بیٹیوں کے کمروں کا رخ تو باہر چلنے والی ہوائیں بھی نہیں کرتیں۔ وہ اپنے اس فخر سے بھلا کیسے دستبردار ہو سکتے تھے۔ وہ تو خیر انہی روایتوں کے درمیان پلے بڑھے تھے، حیرت تو اسے رجب علی پر تھی جو ولایت سے آیا تھا۔

مانا کہ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ برسوں اس ماحول میں رہا تو تھا۔ رجب علی جو مردانہ وجاہت میں حیدر علی سے کسی طور کم نہ تھا اور مائل بہ کرم بھی رہتا تھا اس لیے اس کے گرد ہمیشہ پری جمالوں کا ہجوم اکٹھا رہتا تھا۔ سچ مچ دل ہار جانے والی، کچھ وقت گزاری کی خواہش مند اور کچھ دولت بٹورنے کی شائق۔ رجب علی ان میں سے ہر ایک کی خصلت سے واقف تھا پھر بھی پیسہ لٹانے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔

پھر پتا نہیں کیوں اس نے کرسٹی سے شادی کر لی تھی اور تب پہلی مرتبہ حیدر علی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

کرسٹی، حیدر علی کی کلاس فیلو اور بہت اچھی دوست تھی۔ بس صرف دوست اور یہ دوستی بھی اتنی ہی تھی جتنی ایک کلاس فیلو کی دوسرے کلاس فیلو سے ہو سکتی ہے۔ وہ دونوں ہی کلاس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ خوب زور و شور سے ایک دوسرے کی بات کی تردید کرنے کے لیے پوائنٹ پہ پوائنٹ نکالتے تھے۔ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چلا چلا کر بحث کرتے تھے اور لائبریری میں بھی پاس پاس بیٹھ کر مدھم آوازوں میں بحث جاری رکھتے تھے پھر جب یہ آوازیں بلند ہونے لگتیں اور ارد گرد بیٹھے طلباء انہیں گھورتے تو وہ لائبریری سے کھسک لیتے تھے۔

آتی سردیوں کی ایسی ہی شام کو وہ دونوں جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لندن کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے برٹرینڈ رسل کی Conqust of Happiness پر بحث کرنے میں مصروف تھے، جب اچانک کرسٹی کو خیال آیا۔

''سردی بڑھتی جا رہی ہے، کیا خیال ہے کسی نائٹ کلب میں نہ چلا جائے؟''

''ویسے تو وہاں گرمی کا زور کچھ زیادہ ہی ہوگا لیکن چلو چلتے ہیں۔'' حیدر علی نے کہا۔

''اچھے خاصے بونگے ہیں ہم دونوں۔ ساری دنیا ویک اینڈ پر عیش کر رہی ہے اور ہم لارڈ برٹرینڈ رسل سے مغز ماری میں مصروف ہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''اور اگر ہماری یہ بحث وہاں نائٹ کلب میں بھی جاری رہی تو لوگوں نے ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دینا ہے۔''

''یہ طے ہے کہ ہم دونوں کا ساتھ صرف نائٹ کلب کے دروازے تک ہوگا۔ اندر داخل ہوتے ہی تمہارا راستہ الگ اور میرا الگ ہو جائے گا۔''

''منظور ہے۔'' وہ ہنستی گئی۔ ''یوں بھی میرا بور ہونے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہم دونوں اکٹھے رہے تو بال روم میں بھی لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔''

اور پھر دروازے سے داخل ہوتے ہی حیدر علی دائیں جانب مڑ گیا اور کرسٹی اسے بائے کہہ کر بائیں جانب۔

ایک میز پر بیٹھ کر اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی رجب علی بھی اکثر اسی کلب میں آیا کرتا تھا اور پھر یہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ وہ اور کرسٹی محوِ گفتگو ہیں۔

یہ رجب علی کی کرسٹی سے پہلی ملاقات تھی۔

ویک اینڈ کے بعد حیدر علی نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس دن اس کی ملاقات حیدر علی کے بھائی سے ہوئی تھی اور پھر جلد ہی ان دونوں کی ایک اور ملاقات ہو گئی۔

اس دن سائیکلنگ کرتے ہوئے وہ دونوں پولیٹیکل فلاسفی پر بحث کر رہے تھے۔ یہ بحث

اس قدر بڑھی کہ دونوں نے اپنی سائیکلیں سڑک کے کنارے ایستادہ درختوں سے ٹکا کر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ابھی وہ اسی کوشش میں مصروف تھے کہ رجب علی شاہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں چلا آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے حیدر علی کو مخاطب کیا۔

''ابھی میں لندن سے یہاں پہنچا تھا' پتا چلا کہ تم اس طرف آئے ہو تو تمہیں ڈھونڈنے چلا آیا۔''

رجب علی بات تو اس سے کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں کرسٹی کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔

اور پھر پتا نہیں دو ہی دن میں کیا ہوا کہ رجب علی اور کرسٹی نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے ان کے اس فیصلے پر بہت حیرت ہوئی تھی۔ کرسٹی کی تعلیم ابھی نامکمل تھی اور پھر یاسمین بھابی بھی تو تھیں۔

''یاسمین بھابی کا کیا ہوگا؟'' اس نے حیرت سے رجب علی سے پوچھا۔

''کیوں کرسٹی بطور بھابی اچھی نہیں ہے؟'' وہ ہنسا۔

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔ کرسٹی بہت اچھی ہے لیکن یاسمین بھابی کا کیا ہوگا؟''

''فی الحال تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر اطمینان سے بیٹھی ہے۔ یوں بھی مجھے گدی کے وارث کی پیدائش کے سلسلے میں کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھا۔ ''کیا آپ کی نظروں میں یاسمین بھابی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں؟ ان کی وقعت صرف اتنی ہے کہ وہ گدی کا وارث پیدا کر دیں؟''

''یہ کم وقعت اور اہمیت ہے۔'' رجب علی ہنس پڑا۔ ''اور ہاں تم شادی پر ضرور آنا' کوئی بہانا نہیں چلے گا۔''

''کیا بابا جان کو اس شادی کی خبر ہے؟'' اس نے دبے دبے انداز میں پوچھا۔

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود بھی وہ شادی والے دن نہ پہنچ سکا۔ اگلے دن جب اس نے رجب علی کے اپارٹمنٹ کی بیل بجائی تو دروازہ کسی ملازم کے بجائے خود رجب علی نے ہی کھولا۔ وہ اس سے بہت گرمجوشی سے ملا۔ شادی کا تحفہ قبول کیا اور بہت تپاک سے اسے اندر لایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد حیدر علی نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

''کرسٹی کہاں ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے دلہن بنے نہیں دیکھ سکا اور مجھے حیرت بھی ہے کہ وہ بحث کیے بغیر دلہن کیسے بن گئی۔''

''اب کرسٹی تمہاری کلاس فیلو نہیں بھابی ہے۔'' رجب علی کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ''تمہاری بھابی اس وقت اپنے کمرے میں ہے۔''

''اسے معلوم نہیں کہ میں آیا ہوا ہوں؟ اس قدر بے مروتی کہ ملنے کے لیے بھی نہیں نکلی۔''

''تم غالباً بھول رہے ہو۔ ہمارے ہاں کی عورتیں غیر محرم مردوں کے سامنے نہیں آتیں' جانتے ہو ناں یہ ہمارا دستور نہیں ہے کہ بھابیاں دیوروں یا بیٹوں کے سامنے آئیں۔'' رجب علی نے کہا۔

چند لمحوں کے لیے تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کرسٹی پردہ کرنے لگی ہے۔'' رجب علی نے مطمئن انداز سے کہا۔

''کرسٹی' پردہ!'' وہ زیر لب بولا۔

سنہرے خوبصورت بالوں اور نیلی آنکھوں والی کرسٹی جو ہر وقت کلاس میں آگے بڑھنے کی کوشش میں اس کے ساتھ بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتی تھی۔ اس کرسٹی کے ساتھ پردے کا تصور بہت عجیب اور حیران کن بات محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں؟''

''فی الحال نہیں کر رہا۔'' اس کے اطمینان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ ''اب اتنی تکلیف کرو کہ ملازم کچن میں ہے۔ اسے چائے کا کہہ آؤ اور بھوک لگی ہو تو فریج کھول کر دیکھ لو کافی کچھ مل جائے گا۔''

''مجھے نہ تو اس وقت بھوک محسوس ہو رہی ہے اور نہ چائے کی طلب ہے۔'' وہ بولا۔ ''بھائی جان! میں حیران ہوں کیا یہ فیصلہ کرسٹی نے خود کیا ہے یا آپ نے اس کے لیے کیا ہے؟''

''ہمارے گھرانے میں عورتیں فیصلے نہیں کیا کرتیں۔'' اس نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

''یعنی یہ فیصلہ آپ نے اس پر مسلط کیا ہے؟''

''لفظ مسلط کرنا کے معنی منفی انداز میں لیے جاتے ہیں بھئی یہ ہماری خاندانی روایت ہے' اس میں مسلط کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔''

''کیا شادی سے پہلے اسے ان روایات کا علم تھا؟''

''یہ بات تم یہاں لندن میں بیٹھ کر پوچھ سکتے ہو۔'' اس نے پائپ سے کش لگایا۔ ''کبھی یہ بات وہاں نیاز پور میں نہ پوچھنا۔''

حیدر علی نے گہرا سانس لے کر صوفے کی بیک سے پشت ٹکالی۔

''مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ پہلے کیا تھی اور کیسے رہتی تھی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اب وہ میری بیوی ہے اور اسے ویسے ہی رہنا ہے جیسے میں پسند کروں گا۔''

''یہ زیادتی والی بات ہوگی۔ آپ اسے پردے میں لے کر تو نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہ آپ کو برقعے میں ملی تھی۔ اگر آپ نے اپنی بیوی کو ایسی ہی پابندیوں میں رکھنا تھا تو ایسے ہی

ماحول کی کسی لڑکی سے شادی کرتے جو اس بات کو اس رویئے کو قبول تو کر سکتی۔ کرسٹی کوئی چابی کا کھلونا نہیں ہے' جس میں آپ اپنی مرضی سے چابی بھریں اور اس کے لیے اپنی مرضی سے راستے کا تعین کریں۔ بیوی' شوہر کی ملازمہ اس کی باندی تو نہیں ہوتی' اس کی نصف بہتر ہوتی ہے۔''

رجب علی تمسخر سے ہنس پڑا۔ ''برٹرینڈ رسل کی زبان میں باتیں مت کرو۔ رسل' کرسٹی اور تمہاری تکون اس نائٹ کلب کے باہر والی اسٹریٹ پر ختم ہو چکی ہے' جہاں تم دونوں ملے تھے' اب کرسٹی صرف اور صرف میری ملکیت ہے۔''

''کوئی جیتا جاگتا باشعور انسان کبھی کسی کی ملکیت نہیں ہوا کرتا۔ آپ کی باتوں نے مجھے بہت اَپ سیٹ کیا ہے اور اب تک میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ جب آپ نے اپنی بیوی کے ساتھ یہی سلوک کرنا تھا تو پھر شادی کے لیے کرسٹی کا انتخاب کیوں کیا؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ ان پابندیوں کو قبول نہیں کر سکتی۔ ہاں یاسمین بھابی ایسا کر سکتی ہیں کیونکہ وہ شروع سے ایسے ہی ماحول میں رہی ہیں۔ ان کے لیے یہ پابندیاں اور روایات نئی نہیں ہیں۔ اچھا نہ ہوتا کہ اس بے جوڑ شادی کے بجائے آپ اپنی بچپن کی منگیتر کا ہاتھ تھام لیتے۔''

''اصل مزہ اڑیل گھوڑے کو رام کرنے میں ہے۔ سدھے سدھائے جانور پر سواری کرنے میں کوئی چیلنج نہیں ہے۔ غربت انسان کو دولت کی طرف دھکیلتی ہے اور دولت طاقت کی جانب اور میں وقتاً فوقتاً اپنی طاقت آزما کر اس بات کا یقین کر لینا چاہتا ہوں کہ یہ ابھی میرے قبضے میں ہے۔''

وہ رجب علی کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرسٹی نے اتنی جلد بازی میں اتنا بڑا اور احمقانہ فیصلہ کیوں اور کیسے کر لیا تھا؟ آخر اسے رجب علی میں کیا دکھائی دیا تھا۔

لیکن ان سوالوں کا جواب باوجود کوشش کے بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

اس کے بعد جب بھی اسے ویک اینڈ پر یا کسی اور دن لندن آنے کا اتفاق ہوتا تو اپنے اپارٹمنٹ کے بجائے وہ کسی دوست کے پاس ہوٹل میں رہنے کو ترجیح دیتا۔ رجب علی کو پسند نہیں تھا کہ اس کی بیوی کسی کے سامنے آئے اور خود وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اب اس کی کرسٹی سے ملاقات ہو جبکہ تین کمروں کے اس لگژری اپارٹمنٹ میں ایک دوسرے سے سامنا ناگزیر تھا' سوائے اس صورت کے کہ کرسٹی اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ جائے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کھلی فضاؤں میں چہکنے والی اس پیاری سی لڑکی کی بقیہ دو کمروں اور کچن میں گھومتے پھرنے کی آزادی بھی سلب کر لے۔

لندن کے نائٹ کلب اور ایسی ہی دوسری جگہوں پر اکثر اس کی ملاقات رجب علی شاہ سے ہو جاتی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح نازنینوں میں گھرا رہتا تھا اور ساری ساری رات باہر گزار دیتا تھا۔ اسے اس آزادی سے آوارہ گردی کرتے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر بہت کڑھتا تھا لیکن کچھ

کر نہیں سکتا تھا۔

پھر ایک دن اسے کرسٹی کا خط ملا۔ بے حد مختصر سا۔ اس نے حیدر علی سے فوری طور پر ملنے کی درخواست کی تھی۔ اگلے دن جمعہ تھا' اس لیے اس نے سوچا کہ کلاسز کے فوراً بعد لندن چلا جائے گا۔ اس تمام عرصے میں وہ یہی سوچتا رہا کہ اسے کرسٹی سے ملنا چاہیے یا نہیں۔ ایک طرف مدت کی دوستی تھی اور دوسری طرف یہ نیا رشتہ جو روایتوں اور پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے کرسٹی سے مل لینا چاہیے۔ اس کی شادی کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور اس دوران یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے حیدر علی کو یاد کیا تھا۔

اگلے دن شام کے وقت وہ رجب علی کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجا رہا تھا۔ دروازہ ملازم نے کھولا۔ رجب علی گھر پر نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ویک اینڈ کی دلچسپ شام گھر میں گزار کر برباد کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔ حیدر علی بھی اس وجہ سے ایسے وقت آیا تھا تا کہ کرسٹی سے بات کرنے کے لیے اسے رجب علی کو دلیل سے قائل نہ کرنا پڑے اور خود کرسٹی بھی کھل کر اس سے بات کر سکے۔

''بی بی کہاں ہیں؟'' اس نے لونگ روم کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے پاکستانی ملازم سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔''

''اور بڑے شاہ صاحب؟''

''باہر گئے ہیں۔''

''بی بی کو اطلاع کرو کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔''

''بڑے شاہ صاحب کا حکم نہیں ہے سرکار۔''

''کیا؟'' حیدر علی کو اس کا یوں انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔ ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ انہیں اطلاع کرو' تمہیں انکار کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

''میں بلا دیتا ہوں سرکار لیکن بڑے شاہ صاحب بہت ناراض ہوں گے۔'' اس نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''ان سے پہلے میں تم سے ناراض ہوں گا۔'' وہ قدرے سختی سے بولا۔

ملازم الٹے قدموں پلٹ کر خواب گاہ کے دروازے کی جانب بڑھا اور مدھم سی دستک دے کر کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کرسٹی اسی دروازے سے برآمد ہوئی۔ حیدر علی چند لمحے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کتنی مرجھا گئی تھی۔ اس کے سنہری بال نئے سرے سے تراشے جانے کے قابل ہو رہے تھے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ذہانت کی جگہ دکھ' غصے اور بغاوت کے سائے تیر رہے تھے اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر جو شگفتگی' شادابی

اور نکھار ہوا کرتا تھا' وہ ماند پڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کی رسمی گفتگو کے بعد کرسٹی خاموش ہو گئی۔

''تم نے مجھے بلایا تھا۔'' وہ جلد از جلد اصل موضوع پر بات کر کے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہاں آ کر اسے رجب علی کی عدم موجودگی کا احساس شدت کے ساتھ ستانے لگا تھا' جس کی اجازت کے بغیر وہ اس کی بیوی سے ہمکلام تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ ان حالات میں وہ کرسٹی کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہا تھا۔ وہ اگر اس سے رجب علی کے متعلق کوئی شکوہ شکایت کرتی تو وہ بھلا کیا جواب دیتا اسے۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے نیلی آنکھوں سے حیدر علی کی جانب دیکھا۔

''کیسی مدد؟''

''میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں لیکن ہر راستہ بند ہے۔ تمہیں خط لکھنے کے بعد مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ وہ تم تک پہنچ جائے گا لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ خط تمہیں مل گیا تو تم آؤ گے اور میری مدد بھی کرو گے۔''

''میں آج تک یہ بات نہیں سمجھ پایا کہ تم نے اتنا بڑا اور اہم فیصلہ اتنی جلدی کیوں کیا؟ اور اب تم مجھ سے مدد چاہتی ہو۔ کیا شادی سے پہلے اتنی سی زحمت بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ مجھ سے اس شادی کے بارے میں مشورہ کر لیتیں۔''

''اب ایک غلطی ہو گئی ہے' میں ماضی کو واپس نہیں لا سکتی' حال تباہ کر چکی ہوں' لیکن مجھے اپنے مستقبل کی تباہی قطعاً گوارا نہیں ہے۔ جو ہو گیا' وہ بہت تلخ تھا' میں اسے دہرانا نہیں چاہتی۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ اپنے اگلے سانس آزادی کی کھلی فضا میں لوں۔''

''مجھے تم نے عجیب پریشانی میں گرفتار کر دیا ہے۔'' حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''بہت بڑی امید وابستہ کر لی ہے تم نے مجھ سے۔''

''تم علی...... تم میری مدد کر سکتے ہو' اپنے بھائی کو قائل کر سکتے ہو کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔'' وہ جلدی سے اسے قائل کرنے والے انداز میں بولی۔

''تم نہیں جانتیں کرسٹی' ہمارا سیٹ اَپ بہت مختلف ہے میں آخری بندہ ہوں گا جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکے۔''

''گویا تم میری مدد نہیں کرو گے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا لیکن کیسے' یہ مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔''

''میں نے بہت کوشش کی اس کے خیالات بدلنے کی۔'' وہ آزردگی سے بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ دلیل سے ہر ایک کو قائل کیا جا سکتا ہے لیکن نہیں' جس نے نہ ماننے کی قسم کھائی ہو اسے کوئی بھی قائل نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات اس کا رویہ اتنا نامعقول ہو جاتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

وہ اچھے طریقے سے تصور کر سکتا تھا کہ رجب علی نامعقول ہونے پر آئے تو کن حدوں کو چھو سکتا ہے' لیکن وہ خاموش رہا۔

''اس کے نزدیک بیوی کسی جیتے جاگتے وجود کا نام نہیں کسی کھلونے کا نام ہے جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات تسلیم کرے' اس کی آنکھوں کے اشارے کے ساتھ اٹھے اور آنکھوں کے اشارے کے ساتھ بیٹھ جائے۔ اسے طلب ہو تو بن کہے اس کے پاس آ جائے ورنہ کونے میں کسی بت کی طرح ٹکی رہے لیکن علی! میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔

یہ میری ذات کی نفی ہی نہیں تذلیل بھی ہے۔ میں کوئی ضرورت کی شے تو نہیں ہوں' میں سوچ سکتی ہوں' محسوس کر سکتی ہوں' میری بھی کوئی مرضی ہے لیکن اس کے نزدیک میں کچھ نہیں ہوں۔ بس جو کچھ ہے' وہ ہی وہ ہے۔ وہ موجود ہو یا نہ ہو' اس سارے گھر میں ہر طرف اس کی شخصیت بکھری ہوئی ہے۔ اس کے وجود سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ یہ اپارٹمنٹ! مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس سے' اس کے وجود سے' تنگ آ گئی ہوں میں ان تین کمروں کی دیواریں دیکھ دیکھ کر۔

کچھ عرصہ اور مجھے اس جگہ رہنا پڑا تو میں یقیناً پاگل ہو جاؤں گی۔ تم یقین کرو گے کہ پچھلے چار مہینے سے میں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا' اخبار تک نہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ختم ہوتی جا رہی ہوں' میرے ذہن کو زنگ لگ رہا ہے' میں تو ہر وقت خوش رہنے والی لڑکی تھی' لیکن اب میں اس قدر چڑچڑی ہو گئی ہوں کہ مجھے خود ہی اپنی اس حالت سے خوف آنے لگا ہے۔''

حیدر علی چپ چاپ اس کی تمام گفتگو سن رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کرسٹی اپنے دل کا سارا غبار نکال کر ذہنی طور پر ہلکی ہو جائے' اس لیے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''ہر انسان کی زندگی کے دو حصے ہوتے ہیں علی' ایک دوسرے کا اور ایک اپنا لیکن رجب علی شاہ یہ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے گرد بسنے والے تمام افراد کی زندگی سمیٹ کر اپنے نام کرنا چاہتا ہے۔ ان کی زندگی بھی خود بسر کرنا چاہتا ہے۔'' وہ خاموش ہو گئی۔

''کاش! تم نے شادی سے پہلے مجھ سے کوئی بات کی ہوتی۔'' حیدر علی نے افسوس سے کہا۔ ''مجھے اس قدر پابندیوں کا اندازہ تو نہیں تھا پھر بھی رجب علی میرا بھائی ہے اور جس حد تک میں اسے جانتا ہوں اس کے بعد میں تمہیں کبھی اس شادی کا مشورہ نہ دیتا۔''

''میں پاگل ہو گئی تھی' اس کی باتوں میں آ گئی تھی' پتا نہیں کیوں' شاید اس لیے کہ وہ صرف اسمارٹ اور ہینڈسم ہی نہیں ہے بلکہ اس میں شاہی غرور بھی ہے۔ اس کی ذات کا یہی غرور اسے تم سے اور باقی لڑکوں سے جدا کرتا ہے۔ ہاں یہی بات تھی۔ وہ اپنی طرف مائل کر کے بے نیاز ہونے کا فن جانتا ہے اور میں اس کی اسی بے نیازی اور اسی غرور سے ہاری تھی۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''حالانکہ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ صرف اور صرف اپنی ذات کی محبت میں گرفتار ہے

اور میں یہ سمجھتی رہی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ محبت ایسے تو نہیں کی جاتی علی' ہیں ناں؟'' اس نے حیدر علی کی طرف دیکھا۔ وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

''محبت تو ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا سکھاتی ہے' ایک دوسرے کی تکلیف پر اکٹھے رونا اور خوشی پر اکٹھے ہنسنا سکھاتی ہے۔ On Jesus میں نے چھوٹی سی بے وقوفی کی بہت لمبی سزا کاٹی ہے۔''

''تم نے ان سے طلاق مانگی ہے کیا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے کرسٹی کی جانب دیکھا۔

''ہاں لیکن شاید وہ بہت اذیت پسند ہے۔ وہ مجھے ایسے ہی رکھنا چاہتا ہے۔ طلاق دینے پر بالکل آمادہ نہیں ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے کہ میری مدد کرنا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ جسے تم دلائل سے قائل نہیں کر سکیں' اسے میں قائل کرلوں گا۔'' حیدر علی نے جھلاہٹ سے کہا۔ ''تم تو ہر بات چلا کر بھی کہہ سکتی ہو' لیکن مجھے جو بھی بات کرنی ہو گی' اسے ادب واحترام کی کتنی ہی تہوں میں لپیٹنا پڑے گا اور اتنی تہوں میں لپیٹ کر اصل بات اندر ہی کہیں گم ہو جائے گی۔ بات کا مفہوم ہی بدل جائے گا۔''

''مجھے اتنا پتا ہے علی کہ مجھے اس قید سے رہائی نہ ملی تو میں خود کو ختم کرلوں گی' یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہے۔'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

''تمہارے بھائی نے اپنی بیوی کو ایسے ہی رکھنا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرتا جو اسی قسم کے ماحول میں پلی بڑھی ہوتی۔ چڑیا گھر کے جانور کو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں لے جایا جا سکتا ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آزاد فضاؤں میں تیرتے پنچھی کو ہم رنگ زمین دام میں گرفتار کر کے باقی ساری زندگی کے لیے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔ مجھے یہاں سب کچھ میسر ہے...... وہ سب کچھ کہے بغیر لا کر میرے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے لیکن پنجرا سونے کا بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے' رہتا تو وہ پنجرا ہی ہے۔ مجھے اتنی بے شمار اور قیمتی چیزوں کا کیا کرنا جب وہ مسلسل میری ذات کو رد کرتا رہتا ہے' مجھے وہ شکل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس میں مَیں ڈھل ہی نہیں سکتی۔ اسے تو درحقیقت ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جس کی ذات مائع کی طرح ہو' جس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہ ہو۔ میری طرح کی کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جو عقل وشعور رکھتی ہو' جو اس کے نظریات کو دلیل کی تلوار کی دھار پر رکھنا جانتی ہو۔ اس بے جوڑ شادی کو کبھی نہ کبھی ختم ہونا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس کا اختتام میری خودکشی پر ہو۔''

''تم مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو۔'' اس نے صوفے کی پشت سے کمر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ دونوں چپ چاپ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ بیرونی دروازہ کھول کر رجب علی

اندر داخل ہوا۔ انہیں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر آگے بڑھ آیا۔ حیدر علی ایک دم سے گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ......؟'' اس کے منہ سے اسی قدر نکل سکا۔

''ہاں۔'' وہ اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''بیٹھو۔''

حیدر علی بھی اپنے صوفے پر ٹک گیا۔

رجب علی نے کرسٹی کو مخاطب کیا لیکن اس انداز میں جیسے حیدر علی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

''تم نے طلاق مانگی تھی؟''

''ہاں۔'' وہ مضطرب انداز میں بولی۔

''آل رائٹ! میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں' تمہیں جلد ہی کاغذات مل جائیں گے۔''

حیدر علی اور کرسٹی اچنبھے میں رہ گئے۔

وہ بات جو بظاہر اتنا بڑا مسئلہ نظر آ رہی تھی' یوں اچانک پل بھر میں طے ہو گئی تھی۔

لیکن حیدر علی اس کا بھائی تھا اور بہت زیادہ نہ سہی پھر بھی کسی قدر اپنے بھائی کو جانتا تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ کہیں رجب علی اس پر اور کرسٹی پر کسی شک کے باعث تو طلاق نہیں دے رہا۔

یہ خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ رجب علی جیسا بھی تھا اس کا بھائی تھا اور کرسٹی بہرحال اس کی بھابی تھی۔ کم سے کم اس وقت تک تو بھابی ہی تھی جب تک رجب علی اسے طلاق دے دیتا۔ اس نے تو اس سے پہلے کبھی کرسٹی کے متعلق ایسا نہ سوچا تھا۔ اب بھائی سے اس کی شادی کے بعد ایسا کیسے سوچ سکتا تھا۔

وہاں سے جاتے وقت کرسٹی بہت خوش تھی لیکن حیدر علی کے سینے میں پھانس اٹکی ہوئی تھی۔ کتنی دیر تک لونگ روم میں بیٹھ کر وہ سگریٹ پھونکتا رہا۔ رجب علی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ کافی دیر کے بعد تمام تر ہمت مجتمع کر کے وہ اٹھا اور خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔

''یس!'' اندر سے رجب علی کی آواز آئی۔

حیدر علی اندر داخل ہو گیا۔

''تم......! آؤ آؤ۔'' رجب علی نے مسکرا کر کہا تو اسے کچھ ہمت ہوئی اور وہ اندر داخل ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' بہت ہمت کر کے وہ بولا۔

''کہو۔'' اس نے پائپ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں اور کرسٹی صرف دوست تھے۔'' اس نے بہت محتاط انداز میں کہا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو میرا اور اس کا ملنا اچھا نہیں لگا۔ خاص طور پر اس لیے کہ آپ مجھے شادی کے فوراً بعد اس

بات سے منع کر چکے تھے اور شاید آپ نے اسے طلاق بھی اسی لیے دی ہے لیکن پلیز آپ یقین کریں کہ میں اس سے محض ایک دوست اور دیور ہونے کی حیثیت سے ملتا تھا' اس سے ہم دونوں کا ہی کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔''

''میں جانتا ہوں تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رجب علی نے پائپ میں تمبا کو بھرتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھے ایک فیصد بھی یہ شک گزرتا تو میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر تم دونوں کو شوٹ کر دیتا۔ اسے جھوٹ یا مذاق نہ سمجھنا۔ تمہارے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے ولایتی لوگ میری یہ بات سن کر یقیناً مجھے سفاک ہونے کا خطاب دیں گے لیکن مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے۔ میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو اس معاشرے نے ابھی سفید نہیں کیا۔ غیرت کے پیچھے میں کسی کو بھی رعایت نہیں دے سکتا۔''

حیدر علی کا دل تو بہت چاہا کہ اس سے پوچھے کہ وہ کس غیرت کی بات کر رہا ہے۔ جو غیرت اپنی بیوی اور بھائی کے لیے کسی بھی وقت پھوٹ سکتی ہے' اس غیرت پر خود اپنے لیے اس نے کیوں بند باندھ رکھے ہیں۔ غیرت صرف بیوی یا بہنوں کو غیر محرم کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کیوں ابلنے لگتی ہے۔ وہ اس وقت کیوں نہیں ابلتی' جب خود رجب علی غیر عورتوں کے ساتھ ساری ساری رات گھر سے باہر گزار دیتا ہے اور اس کی بیوی تنہا بیٹھ کر رات کو اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ غیرت اور بے غیرتی کے یہ دہرے معیار کیوں؟ لیکن کہنے کی باری آئی تو...... صرف اسی قدر پوچھا۔

''پھر آپ نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟''

''وہ قابلِ اعتبار نہیں تھی اور کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے اسے غیر محرم مردوں سے ملنے جلنے سے منع کیا ہوا تھا پھر بھی وہ تمہارے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ میں تمہیں جانتا ہوں علی' یہ بھی جانتا ہوں کہ تم محض پرانی دوستی کا پاس کر کے یہاں آئے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم دونوں کے درمیان کوئی غلط بات نہیں ہوئی' لیکن یہ بے اعتباری کی پہلی سیڑھی تھی' قصور تمہارا نہیں اس کا تھا۔ میری نظروں میں دوبارہ کبھی اسے پرانا مقام نہیں مل سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے فوری طور پر طلاق دے دی۔''

عجیب منطق تھی رجب علی کی۔ اور عجیب تر معیارِ اخلاق تھا۔ حیدر علی کے ذہن میں بیک وقت بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ وہ اس نرالی منطق اور عجیب و غریب معیارِ اخلاق کے فلسفے کی دھجیاں بکھیرنا چاہتا تھا' لیکن پاسِ ادب آڑے آ رہا تھا اور اس صورتِ حال میں خود اس کی اپنی پوزیشن بھی کمزور تھی۔

''آپ کا دل میری طرف سے میلا تو نہیں ہے۔'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' رجب علی نے پائپ کا کش لگا کر دھواں باہر چھوڑا تھا۔ ''میں نے کہا ناں

کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تم اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے یہاں موجود نہ ہوتے۔''

حیدر علی ماتھے کو ہاتھ سے رگڑ کر مسہری پر لیٹ گیا' اصولاً حیرت کے اس پہلے جھٹکے کے بعد اسے سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن ہوتا یہ تھا کہ رجب علی کی باتیں اور اطوار ہر مرتبہ نئے سرے سے اسے حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ بعض اوقات وہ الجھ بھی پڑتا تھا اور بعض مرتبہ جھلا کر اس جگہ سے دور چلا جاتا تھا' جہاں رجب علی اپنے نادر خیالات کا اظہار کر رہا ہوتا تھا۔

اور اب اس کے سامنے بہنوں اور ان کے مستقبل کا مسئلہ تھا۔ بابا جان تو اس سلسلے میں کچھ سننے پر آمادہ ہی نہیں تھے۔ تکلیف دہ بات تو یہ تھی کہ رجب علی بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اگر ایک رجب علی اس کا ساتھ دیتا تو وہ بابا جان پر دباؤ ڈال بھی سکتا تھا۔ انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا' لیکن افسوس تو اس بات کا تھا کہ وہ اس معاملے میں ان سے کہیں زیادہ سخت تھا۔

ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ اٹھ کر باہر نکل گیا اور پیدل چلتا رہا۔

گاؤں کی گلیوں میں چہل پہل تھی۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر کچھ لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ یہ بازار گاؤں کی سب سے پُر رونق اور دلچسپ جگہ تھی۔ یہاں وہاں بچے کھیلتے پھر رہے تھے۔ کچھ بالکل ننگ دھڑنگ اور کچھ صرف لمبی سی قمیص میں ملبوس مٹی سے اٹے یہ بچے ہر طرف کود رہے تھے۔ عورتیں اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ سر ڈھانپے اور بقیہ چادر کو گلے میں لٹکائے ہوئے' ان کے اطوار میں گنوار پن نمایاں تھا۔ کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ آنکھوں اور چال میں جوانی کی شوخی لیے جب وہ ان دکانوں کے پاس سے گزرتیں تو وہاں وقت گزاری اور نظر بازی کے ذوق میں کھڑے لڑکوں کی نگاہیں دور تک ان کا پیچھا کرتیں۔ ان کے تعاقب میں جاتیں۔ رنگین فقرے اچھلتے' سینے پر ہاتھ رکھ کے دردِ دل کے واسطے دیئے جاتے' کہیں سے ہائے ہائے اور کہیں سے وائے وائے کی صدائیں آتیں اور پھر دور جاتی مہ جبینوں کی دبی دبی ہنسی ابھرتی۔ کبھی کبھار بظاہر بے نیازی میں ہوا کے دوش پر کاغذ بھی اُڑتے جاتے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ کاغذ کس ہاتھ سے نکلے ہیں اور انہیں کس تک پہنچنا ہے۔

حیدر علی کے وہاں پہنچنے پر بازار کی رونق نصف سے بھی کم ہو گئی۔ وہاں سے گزرنے والے بھی لوگ مؤدب ہو گئے۔ دکانوں پر کھڑے نوجوان کھسکنے لگے۔ لڑکیوں کی مستانی چال میں تیزی آ گئی۔ ہاں کن اکھیوں سے وہ حیدر علی کا جائزہ لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ کاغذوں' فقروں اور شوخ نگاہوں کا کھیل بند ہو چکا تھا۔ بچے البتہ ویسے ہی اچھل کود میں مصروف تھے۔

وہ چلتا ہوا وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ مسجد کے سفید مینار اسے آوازیں دے رہے تھے۔ اس کی گوری اسے بلا رہی تھی' پکار رہی تھی اس سے ملنے کی بے قراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مسجد کے اطراف میں بہت سکون اور بہت خاموشی تھی۔ یہاں مکان بھی بہت کم اور قدرے فاصلے پر تھے۔

حیدر علی' مسجد کے مقابل ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ سلگا کر رات والے روزنوں اور دریچوں کی ڈھونڈ کے کھیل میں مصروف ہو گیا۔ شاید یہ روزن منور ہو جائیں یا وہ دریچہ کھل جائے۔ ایک بے معنی آنکھ مچولی...... بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کی تلاش کی بے کار کوشش لیکن وقت گزرنے کے باوجود بھی تبدیل نہ ہوا۔ مسجد بالکل خالی تھی۔ یہاں تک کہ سپارہ پڑھنے والے بچے بھی وہاں موجود نہیں تھے۔

تھک ہار کر اس نے خالہ کبریٰ کے گھر کا راستہ لیا۔ فصل تیار کھڑی تھی اور وہ دونوں طرف لہلہاتے کھیتوں کے بیچ چلتا جا رہا تھا۔

گوری کی خالہ کبریٰ کے گھر موجودگی کی کوئی امید نہیں تھی اور اسی لیے اس کی چال میں بھی کوئی تیزی نہیں تھی۔ خالہ کبریٰ کا گھر بھی ویسے ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہی کسی فلسفی کی طرح سر جھکائے غور و خوض کرتا برگد کا بوڑھا درخت' وہی رہٹ کے پانی کی جھر جھر' وہی خاکستری کچا پکا مکان اور وہی کٹ کٹ کر کے دانہ چگتی مرغیاں اس نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ خالہ کبریٰ دروازے کا کنڈا تھامے کھڑی تھیں۔

''تم!'' اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ تم شہر چلے گئے ہو گے۔''

''گیا تھا' پر اب لوٹ آیا ہوں۔''

''آؤ' اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے اس کے لیے راستہ چھوڑا۔

وہ دونوں اندر کمرے میں چلے آئے۔ گو کہ اسے...... وہاں گوری کی موجودگی کی توقع نہیں تھی پھر بھی اس نے امید بھری نظروں سے اِدھر اُدھر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ گھر میں صرف خالہ تھیں۔ اپنی تنہائی کے ساتھ۔

''آپ کیسی ہیں خالہ؟'' اس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بس بیٹا! دن پورے کر رہی ہوں۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔ ''اب تو یہی خواہش ہے کہ اللہ پاک عزت سے بلا لے۔''

''خدا خیر کرے' ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی زندگی دے اور آپ اولاد کی ڈھیروں خوشیاں دیکھیں۔''

''اولاد کی خوشی میرے مقدر میں کہاں۔ بڑی بیٹی ہے سدا سے بیماری اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ چھوٹی ہے تو وہ اپنے گھر میں خوش نہیں۔ پتا نہیں کب یہاں واپس آ جائے کچھ جو امید تھی تو وہ صفدر سے تھی لیکن اس نے بھی اپنی مرضی چلا لی۔ ماں کو پوچھا تک نہیں۔'' ان کا لہجہ دکھی ہو گیا۔ ''بس تقدیر کی بات ہے' پھر انہوں نے بات پلٹی۔ ''میں بھی کیا دکھڑے سنانے بیٹھ گئی۔ تم اپنا حال چال سناؤ' گھر والوں سے مل کر آئے ہو کیا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بس شہر میں بھی یہی افسوس رہا کہ آپ کو بتائے بغیر چلا گیا۔''

''پہلے تو میں فکرمند ہو گئی تھی پھر خیال آیا کہ تم شہر چلے گئے ہو گے' مجھے تمہاری واپسی کی امید نہیں تھی۔ یوں بھی یہاں دھرا ہی کیا ہے تم جیسے جوان کے لیے۔''

وہ سوچنے لگا کہ خالہ سے گوری کے متعلق کیسے دریافت کرے۔ ابھی وہ موزوں الفاظ کی تلاش ہی میں تھا کہ خالہ نے صفدر کا ذکر چھیڑ دیا۔

''کتنی محبت سے کتنی جان مار کر پالا تھا میں نے صفدر کو' بیٹیاں بے شک اللہ کی رحمت ہوتی ہیں لیکن ارمان تو بیٹے کا ہی ہوتا ہے ناں' پہلے اولاد بچتی ہی نہیں تھی پھر صفدر کے ابا نے شہر کی ڈاکٹرنی سے علاج کروایا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دی تو سیدھے دو لڑکیاں پلے پڑ گئیں۔ میں تو رو رو کے بے حال ہو گئی۔ تب صفدر کے ابا پیر صاحب کے والد صاحب کے پاس لے گئے۔ ان کی دعا سے میرا صفدر پیدا ہوا۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''باپ کا سایہ تھا تو یہ بھی ٹھیک تھا جیسے ہی انہوں نے آنکھیں بند کیں بس یہ میرے ہاتھ سے نکل گیا کتنے جتن کیے میں نے تعویذ بھی کرائے لیکن بے فائدہ۔''

وہ ان کی بات بے توجہی سے سن رہا تھا۔ اس کے حواسوں پر اس وقت گوری کا قبضہ تھا اور وہ صرف اور صرف اس کے متعلق دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہر چیز اسے بے حد بے کار اور بور لگ رہی تھی۔

''اس سے تو اچھا تھا کہ میں زیبی آپی کے پاس چلا جاتا۔ ان سے کم از کم میں گوری کے متعلق کھل کر بات تو کر سکتا ہوں۔'' اس نے سوچا۔

لیکن خالہ کبریٰ اس کی سوچوں سے بے خبر بولے گئیں۔ ان کا پسندیدہ موضوع صفدر کے ابا اور صفدر تھا۔ سارے دن کی تنہائی میں اگر چند لمحے کے لیے کوئی آ جاتا تھا تو وہ اس سے سب باتیں کہہ دینے کی کوشش کرتی تھیں۔

''اسے چھینک بھی آتی تھی تو میں حکیم صاحب کے پاس دوڑی جاتی تھی۔ ٹھنڈ لگ جاتی تھی تو اپنی رضائی بھی اس کے اوپر ڈال دیتی تھی' تاپ چڑھتی تھی تو اس کے سرہانے سے ہلتی نہیں تھی' لیکن اسے ماں کا خیال نہ آیا۔ غیروں کو بلا لیا' اپنی شادی پر اور مجھے شادی کے بھی کتنے دن بعد اطلاع دی۔''

''کیا صفدر نے شادی کر لی؟'' اس نے ان کی دلچسپی کے پیشِ نظر پوچھا۔

''ہاں بیٹا! اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔ کیا کیا ارمان تھے میرے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی میں نے اس کی شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ خاندان کیا گاؤں کی بھی کوئی لڑکی میری نظروں میں نہیں جچتی تھی۔ پھر ایک دن اللہ نے میری سن لی اور بھانجی کی پیدائش کے ساتھ ہی میں نے سوچ لیا کہ اسی کو صفدر کی دلہن بناؤں گی لیکن......''

انہوں نے آہ بھر کر بات ادھوری سی چھوڑ دی۔

''کب کی اس نے شادی؟''

''مہینہ بھر ہو گیا ہے۔''

''یہاں گاؤں کی کسی لڑکی سے تو نہیں کی ہوگی۔''

''یہاں کی کوئی لڑکی پسند کر لیتا تو بات ہی کیا تھی' چلو میری پسند کی ہوئی لڑکی کو دلہن نہ بناتا میں دل پر پتھر رکھ لیتی' لیکن جو بھی دلہن لاتا کم از کم اپنی تو ہوتی۔ اس نے تو وہاں کراچی میں کسی شہری لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ جو تھوڑی بہت امید اس کے واپس آنے کی تھی' اب تو وہ بھی نہیں رہی۔ لڑکی یہاں کی ہوتی تو آج نہیں کل وہ ضرور واپس پلٹتا' میرے لیے نہ سہی بیوی کی خواہش پر ہی سہی لیکن اب وہ وہیں کا ہو کر رہ جائے گا۔ پتا نہیں میرے جنازے کو کندھا دینے بھی آئے گا یا نہیں۔''

''اللہ تعالیٰ خیر کرے گا خالہ۔''

''تم ہی بتاؤ بیٹا! کیا خرابی تھی زرینہ میں۔ تم نے تو اسے دیکھا ہوا ہے' کس چیز کی کمی تھی اس میں' لیکن صفدر کے سر پر تو شہری لڑکی سوار تھی۔''

حیدر علی سناٹے میں رہ گیا۔

گویا خالہ کا انتخاب زرینہ تھی۔ اس نے سوچا۔

''اس کے ماں باپ سے بھی کر لی تھی' میں نے بات لیکن اس کے ابا نے کہا کہ صفدر کے آنے پر دیکھا جائے گا۔ شکر ہے کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی' ورنہ میری ناک تو کٹوا ہی دی تھی اس نے۔''

''جی۔'' اس نے اسی قدر کہا۔

''سب سے زیادہ دکھ تو مجھے زرینہ کا ہے۔ میں نے مارے شرمندگی کے ان کے گھر اطلاع بھی نہیں بھجوائی لیکن بیٹا! یہ خبر بھی بھلا چھپ سکتی ہے۔ سنا ہے کہ جس دن سے زرینہ کو اس بات کا علم ہوا ہے اس دن سے وہ ایسی بیمار پڑی ہے کہ چارپائی سے اٹھ بھی نہیں سکی۔''

''کیا؟'' اس کی بات پوری طرح سمجھ میں نہ آنے کے باوجود وہ چلایا۔

اس کی زرینہ' اس کی گوری بیمار تھی' اتنی زیادہ کہ چارپائی سے لگ کر رہ گئی تھی لیکن آخر کیوں؟ اس کی بیماری کی وجہ صفدر تو نہیں ہو سکتا تھا پھر کیا ہوا تھا اسے؟ وہ تو گوری کو ہنستے ہوئے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر بہت رسان سے الوداع کیا تھا پھر اچانک یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔

''آپ کو کس نے بتایا کہ وہ بیمار ہے؟'' حیدر علی نے اضطراب سے پوچھا۔

چند لمحے تک خالہ اسے تکے گئیں۔ اس کا اضطراب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

''جس طرح صفدر کی شادی کی بات نہیں چھپی' اسی طرح یہ بات کیسے چھپ سکتی تھی۔''

''ہوا کیا ہے اسے؟'' حیدر علی کو اب اس بات کی پروا نہیں تھی کہ خالہ اس بارے میں کیا سوچیں گی۔ اس کی گوری اتنے دن سے بیمار تھی اور وہ اس قدر بے خبر تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہو سکا۔

''معلوم نہیں۔'' خالہ نے سرد مہری سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''خالہ پلیز مجھے بتائیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟'' وہ ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ وہ ان سے تسلی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اصرار میں خود بخود معمولی سی سختی آ گئی تھی۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' انہوں نے پلٹ کر کہیں زیادہ سختی سے پوچھا۔

''کیونکہ۔'' اس نے تیزی سے کہنا چاہا کہ وہ گوری سے محبت کرتا ہے لیکن پھر بمشکل زبان پر قابو پایا۔ اسے اپنی نہیں گوری کی فکر تھی۔ جس طرح صفدر کی شادی کی بات نکل سکتی تھی ویسے ہی یہ بات بھی تو باہر نکل سکتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہر خاص و عام کی زبان پر ان کا قصہ ہو اور ہر فرد اس قصے میں اپنی پسند کی کلیاں ٹانک کر اس سے چسکا لے۔ اس بات سے اس کا تو کچھ نہ بگڑتا گوری اپنا سب کچھ کھو دیتی۔

خالہ کی نظروں میں اب تک یہ سوال تھا۔ اسے چپ دیکھ کر وہ گویا ہوئیں۔

''تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں کہ آئندہ اپنی زبان پر زرینہ کا نام بھی نہ لانا۔ اس کے باپ کی بہت عزت ہے گاؤں میں۔ بہت بے داغ پگڑی ہے مولوی صاحب کی۔ وہ ہزار نرم دل سہی لیکن یہ بات کبھی برداشت نہیں کریں گے' اپنی سفید پگڑی پر داغ لگنے سے پہلے ہی پیر صاحب سے کہہ کر وہ تمہیں اور زرینہ کو ذبح کروا کے رکھ دیں گے چاہے قصور کسی ایک ہی کا ہو۔''

کرسٹی کے بقول اس میں رجب علی کی طرح کا شاہی غرور تو نہیں تھا لیکن اس کی رگوں میں خون تو وہی دوڑ رہا تھا۔ گرم گرم تیزی سے گردش کرنے والا لہو جسے اپنی توہین گوارا نہیں تھی۔

''کس کی جرأت ہے کہ پیر صاحب کی اولاد کی گردن پر چھری چلا سکے؟''

''اللہ پیر صاحب کی اولاد کو سلامت رکھے انہیں ہزاروں خوشیاں دکھائے۔ میں اس کی نہیں تمہاری بات کر رہی ہوں۔'' خالہ کبریٰ نے سمجھے بغیر تیزی سے کہا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ ابھی کسی کے ہاتھوں میں اتنی جان نہیں ہے کہ میری گردن پر چھری چلا سکے اور نہ ہی کسی میں اتنی ہمت ہے کہ میری پسند کو مجھ سے الگ کر سکے۔''

''کک' کیا کہہ رہے ہو؟'' خالہ گھبرا گئیں۔ ''تم کون ہو؟''

خالہ کو گھبراتے دیکھ کر وہ اپنے الفاظ اور لہجے پر پریشان ہو گیا۔

''گھبرائیں نہیں خالہ' میں اب بھی آپ کا بیٹا ہوں۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔

''مجھے بتاؤ تم کون ہو اور پیر صاحب سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' ان کے ہاتھ پاؤں پھول

رہے تھے۔

''اس گھر میں' میں صرف آپ کا بیٹا ہوں۔''

''میرا دم نکلنے کو ہے' جلدی بتاؤ تم کون ہو؟'' ان کی سوئی ایک ہی سوال پر اٹکی ہوئی تھی۔

''میں حیدر علی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

چند ثانیے تک خالہ بے یقینی سے اس کی جانب دیکھتی رہیں پھر ''ہائے'' کہہ کر انہوں نے دو ہتڑ اپنے سینے پر مارا۔

''یہ کیا غضب ہوگیا۔ کیا گناہ کر بیٹھی میں انجانے میں۔''

''کیا ہوگیا ہے خالہ آپ کو۔'' حیدر علی انہیں سہارا دے کر کمرے میں لایا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ ''ٹھہریں میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔''

''شاہ صاحب! مجھے اور گناہگار نہ کریں۔ ہم اُمتی تو آپ کے پاؤں کی خاک ہیں۔ ہماری جگہ آپ کے قدموں میں ہے آپ کے برابر نہیں۔''

''خالہ میں آپ کو ماں جی کی طرح سمجھتا ہوں اور ماں کی جگہ پاؤں میں نہیں ہوتی۔'' وہ انہیں تسلی دیتا رہا۔

☆======☆======☆

اس دن زرینہ صبح سے ہی کچھ گم صم تھی۔ اماں نے بھی اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ حویلی جاتے ہوئے اس کے چہرے پر ہمیشہ والی شادابی نہیں تھی لیکن انہوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔

''ہو جاتا ہے ناں ایسا کبھی کبھار۔'' انہوں نے سوچا تھا۔ ''کبھی نیند پوری نہیں ہوتی اور کبھی یونہی گھر بیٹھے بیٹھے بندہ اکتا جاتا ہے۔ پھر موسم بھی تو اچھا نہیں ہے۔''

یہی سوچ کر انہوں نے اسے حویلی جانے کی اجازت دے دی تھی کہ اس کا دل بہل جائے گا۔ یوں بھی انہوں نے اس پر زیادہ روک ٹوک نہیں رکھی تھی۔ وہ تھی بھی تو ایسی کہ اس کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر بے اختیار پیار آجاتا تھا اور یہ بھی تھا کہ وہ بہت سلجھی ہوئی تھی۔ گلی سے گزرتی تو ناک کی سیدھ میں چلتی جاتی تھی۔ گاؤں کی اور لڑکیوں کی طرح اِدھر اُدھر مسکراہٹیں تو نہیں اچھالتی تھی۔ حالانکہ حُسن وخوبصورتی میں اس گاؤں کی کیا اردگرد کے کسی بھی گاؤں کی کوئی لڑکی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں بھی اس پر بہت اعتماد تھا۔

لیکن اس دن جب وہ گھر واپس آئی تھی' تو آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا۔ گلابی رنگت ایسی زرد ہو رہی تھی جیسے پیلا ریشم ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ پتا نہیں گھر تک کیسے پہنچی تھی وہ کیونکہ گھر کی دہلیز عبور کرکے دو قدم بھی نہیں چلی ہوگی کہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ اسے گرتے دیکھ کر اماں اور رضیہ بھاگ کر اس تک پہنچے تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی ان دونوں نے اٹھا کر

اسے اندر بستر پر ڈالا۔ رضیہ پانی لے آئی۔ کچھ منہ پر ٹپکایا اور کچھ ہونٹ کھول کر پلانے کی کوشش کی۔ مولوی صاحب کام سے چند دن کے لیے شہر گئے ہوئے تھے اس لیے اماں کو ہی برقع سر پر ڈال کر حکیم صاحب کی طرف دوڑنا پڑا۔ ان کی کوشش سے اس نے آنکھیں تو کھول دیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

''وہاں روح تھی۔ ہاں' میں نے خود دیکھا تھا۔ زیب النساء انسان نہیں روح ہے۔'' ہوش میں آنے کے بعد وہ چلانے لگی تھی۔ ''میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے۔''

اماں مزید گھبرا گئیں اس کی یہ بہکی بہکی باتیں سن کر۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ کس وجہ سے زیب النساء کے پاس جا رہی تھی۔ وہ ہر وہ بات جانتی تھی جو شاہ صاحب اور زرینہ کے درمیان ہوتی تھی۔ زرینہ اس سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔

اس کے حویلی جانے سے پہلے رضیہ کے ذہن میں کتنے ہی خدشات نے سر ابھارا تھا۔ اس نے منع بھی کیا تھا زرینہ کو بہت روکا بھی تھا اسے حویلی جانے سے لیکن وہ رکی نہیں تھی۔

''شاہ جی نے کہا تھا میں ان سے ضرور ملوں اور شاہ جی کا کہا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔'' زرینہ نے کہا تھا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو زرینہ' اگر بات باہر نکل گئی تو غضب ہو جائے گا۔'' وہ زچ ہوگئی تھی۔

''آج نہیں تو کل اس بات کو نکلنا ہی ہے اور یاد رکھو میری ڈھال بہت مضبوط ہے۔ سارے وار اپنے اوپر سہہ لیں گے شاہ جی' مجھ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔'' اس کے لہجے میں مان تھا' فخر تھا۔

اور اب رضیہ' زرینہ کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اماں کو ابھی تک اس کی باتوں سے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ زیب النساء سے ملنے کیوں گئی تھی لیکن زرینہ اپنے حواسوں میں کب تھی۔ اگر وہ زیب النساء کا ذکر چھوڑ کر چھوٹے شاہ صاحب کا ذکر شروع کر دیتی تو اماں کو خبر ہونی یقینی تھی۔ رضیہ اسی پریشانی کے عالم میں اس کے سرہانے بیٹھ کر مسلسل اسے تسلی دے رہی تھی۔

''میں نے خود دیکھا ہے رضیہ۔'' وہ اس کے سینے پر سر ٹکائے بے آواز روتے ہوئے اسے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''زیب النساء بھاگ جائے گی۔ تم دیکھ لینا' پھر تمہیں میری بات کا یقین آئے گا۔ وہ پاگل بدروح ہے۔ نہیں۔ اس کے کمرے میں پاگل بدروح ہے۔ اس کی پھوپھو اس بستر پر مری تھیں ناں۔ لاش چلی گئی' روح وہیں رہ گئی۔''

''کچھ نہیں ہے' سب تمہارا وہم ہے۔'' رضیہ نے اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''تم سو جاؤ۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں تم مانتی کیوں نہیں ہو۔'' وہ بار بار اپنی بات کی نفی ہوتے دیکھ کر زچ

ہو چکی تھی۔

''اچھا اچھا وہاں بدروح ہے لیکن یہاں تو نہیں ہے۔ مسجد پاک صاف جگہ ہوتی ہے۔ بدروحیں ایسی جگہ کا رخ نہیں کرتیں۔ تم آرام سے سو جاؤ' وہ یہاں نہیں آئیں گی۔'' وہ اسے بچوں کی طرح تھپک کر سلانے لگی۔

''میں اب وہاں نہیں جاؤں گی' کبھی نہیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

گویا عشق کا بھوت اتر گیا لیکن آخر زیب النساء نے ایسا کیا کہہ دیا کہ چند منٹ میں ہی اس کی کایا پلٹ گئی۔ رضیہ اسے تھپکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

روتے روتے رضیہ اور اماں کو اپنی بات کا یقین دلاتے ہوئے وہ سو گئی تھی۔ اسے سوتا دیکھ کر اماں نے رضیہ کو ہاتھ کے اشارے سے باہر آنے کے لیے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے اچانک میری بچی کو۔'' ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ''شکر ہے تمہارے ابا گھر پر نہیں ہیں ورنہ میں ان کو کیا جواب دیتی۔''

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔'' رضیہ ہولے سے بولی۔

''یہاں سے جاتے ہوئے بھی مجھے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی لیکن پتا نہیں وہاں کیا ہوا کہ اس کی حالت اتنی بگڑ گئی۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' اس نے نظریں چرا لیں۔

''وہ تو گھرانہ بھی ایسا نہیں ہے کہ ان پر شک کیا جا سکے۔ پتا نہیں کیا کیا دیکھ سن آئی ہے کہ بدروح بدروح لگی ہوئی ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولیں۔

''کچھ نہیں اماں جان ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔''

''اللہ کرے۔'' انہوں نے کہا۔ ''مجھے لگتا کہ کچھ دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ طبیعت پہلے بھی ٹھیک نہیں تھی اس لیے زیادہ اثر ہوا ہے۔ سو کر اٹھے گی تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔''

یہ مفروضہ قائم کر کے وہ کام کاج میں مصروف ہو گئیں لیکن ہوا یہ کہ اس کی طبیعت مزید خراب ہو گئی اور وہ تیز بخار میں پھنکنے لگی۔ اکثر سوتے میں چیخ مار کر جاگ پڑتی اور جاگتے میں ڈر کر رضیہ کو تھام لیتی۔

مولوی صاحب گاؤں واپس آئے تو اماں کو بحالت مجبوری انہیں ساری بات بتانا پڑی۔ اگر وہ ٹھیک ہو گئی ہوتی تو شاید وہ سرسری سا تذکرہ کر کے یہ بات مولوی صاحب کے کانوں میں ڈال بھی دیتیں اور اس باب کو بند بھی کر دیتیں لیکن اب تفصیل بتانا ناگزیر تھی۔

''ڈر اور خوف سے اس قدر بخار۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رضیہ کی ماں سچ کہہ رہی ہو کہ یہی بات ہوئی ہے؟''

''قسم سے میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولیں۔

''تم نے اسے صفدر کی شادی کا تو نہیں بتایا؟ کہیں اس صدمے سے۔''

انہوں نے سوالیہ انداز میں اماں کی جانب دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیں بھلا اسے صفدر سے کیا دلچسپی کہ وہ اس بات کو اپنے دل سے لگا لے۔'' اماں نے جلدی سے اس کی وکالت کی۔ ''کہہ تو رہی ہوں میں آپ کو کہ وہ چھوٹی بی بی اور اس کی پھوپھو کی بدروح کا ذکر کر رہی تھی۔ ان کا صفدر سے کیا تعلق؟''

''پیر صاحب کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں اور ان کی وفات بہت برس پہلے عالم جوانی میں ہوئی تھی لیکن کسی بدروح کا کیا کام؟'' اماں کی بات مولوی صاحب کے حلق سے اتر نہیں رہی تھی۔

''یہ مجھے کیا پتا لیکن جب وہ گھر آئی تھی تو پیلی ہلدی ہو رہی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ پہلے تو اللہ معاف کرے شیطان کے کان بہرے' میرے ذہن میں کوئی اور خدشہ آیا تھا لیکن پھر اس کا خوف دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر کم از کم یہ خدشہ ڈھل گیا۔''

''نہیں نہیں۔ پیر صاحب کی حویلی میں ایسی بات کے رونما ہونے کے متعلق سوچنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''زرینہ کہیں اور بھی تو نہیں گئی تھی؟''

''نہیں۔ وہ تو حویلی میں بھی زیادہ دیر نہیں رکی۔ جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی تھی۔ میں حیران ہوں کہ واپس بھی کیسے آئی' گھر میں داخل ہوتے ہی گر گئی تھی۔ شکر ہے کہیں راستے میں بے ہوش نہیں ہو گئی۔''

''میری تو عقل حیران ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''آخر اتنا کیا ڈر خوف۔''

''چڑیا جتنا تو دل ہے میری بیٹی کا۔ اتنی معصوم اور اتنی بھولی ہے۔'' اماں بولیں۔ ''یہ ٹھیک ہو جائے تو میں پیر صاحب کے والد اور حضرت صاحب کے مزار پر گھی کے چراغ جلاؤں گی۔ ورد یٰسین کا ختم کراؤں گی۔ بس یہ ٹھیک ہو جائے۔''

بیماری نے زرینہ کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ اس کی رنگت سنولانے لگی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑنے لگے تھے اور اب چیخنے چلانے کے بجائے وہ کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں نہ جانے کیا تکتی رہتی تھی۔

''یہ دودھ پی لو۔'' رضیہ نے اس کی چارپائی پر بیٹھ کر پیار سے اسے کہا۔

اس نے ایک نظر رضیہ کو دیکھا اور پھر ہوا میں تکنے لگی۔

''پی لو ناں۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں اصرار کیا۔ ''چلو میں خود ہی پلا دیتی ہوں۔''

رضیہ نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا لیکن اس نے ہاتھ سے گلاس پرے کر دیا۔

''میری بات بھی نہیں مانو گی؟ بس صرف دو گھونٹ ہی لے لو۔''

''رضیہ' شاہ جی کو بلا دو۔ کہیں سے انہیں ڈھونڈ لاؤ۔'' کتنے دن بعد اس نے لب کھولے تھے۔ آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

رضیہ نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا پھر آہستہ سے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگالی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس دن زیب النساء سے ملنے کے بعد زرینہ پر کیا بیتی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ چھوٹے شاہ صاحب کے عشق کا بھوت یقیناً اتر چکا تھا۔ وہ جو بار بار کہہ رہی تھی کہ اب کبھی حویلی میں قدم نہیں رکھے گی۔ ظاہر ہے اس بات سے رضیہ اور کیا مطلب اخذ کر سکتی تھی لیکن اب اس کے لہجے اور آنسوؤں سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اب تک شاہ صاحب کو بھولی نہیں تھی۔

''میں نے تمہیں کتنا سمجھایا ہے زرینہ۔'' وہ دکھ سے بولی۔ ''ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھو۔ تم اپنے آپ کو پہچان نہیں پاؤ گی اور تمہارا یہ حال صرف اور صرف چھوٹے شاہ صاحب کے سبب ہوا ہے۔ خدا کے لیے زرینہ' اب بھی وقت ہے واپس پلٹ آؤ۔''

''تم مجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہو؟ تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ تو خدا کے لیے شاہ جی کو ڈھونڈ لاؤ۔'' وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر بری طرح سے رو پڑی۔

رضیہ حیران پریشان تھی کہ کیا کرے۔ کیا کہہ کر زرینہ کو تسلی دے۔ اسے حویلی میں پیش آنے والے واقعے کا بھی تو علم نہیں تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ زرینہ کا یہ حال کیسے ہوا؟ وہ کیسے شاہ صاحب کو ڈھونڈے انہیں کیسے یہاں لائے؟ یہ تو ناممکنات میں سے تھا۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

کتنی محبت تھی اسے زرینہ سے' کتنی خواہش تھی اسے کہ وہ خوش رہے لیکن زرینہ تو اسے ان حدود میں قدم رکھنے کو کہہ رہی تھی جہاں داخل ہوتے ہی رضیہ کے پَر جل جاتے۔ اس کی اڑان ختم ہو جاتی۔

بات صرف رضیہ کی ذات کی ہوتی تب بھی وہ پرواز کرتی لیکن جو کچھ زرینہ چاہتی تھی اس کی لپیٹ میں تنہا اس کی ذات نہیں آتی تھی۔ اس میں اماں' ابا اور پیر صاحب کے گھرانے سمیت ان دونوں گھرانوں کی عزت بھی آتی تھی۔

اس نے ایک نظر گھٹنوں پر سر رکھے روتی ہوئی زرینہ کی جانب بے بسی سے دیکھا پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے چپ کرانے لگی۔

جیسے جیسے رات بھیگتی جا رہی تھی ویسے ویسے زرینہ کا تکیہ بھی بھیگتا جا رہا تھا۔ پھر دور سے سائیں بابا کی پُرسوز اور درد میں ڈوبی آواز آنے لگی۔

''ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی

بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک بازتوں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

(ہیر نے جوگی سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو' روٹھے ہوئے سجن کو کوئی راضی نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسے شخص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی جو دور گئے سجن کو واپس لے آئے۔ جو میرے دل کا درد مٹا دے' وہ چاہے میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کو سچا رب کب واپس بھیجتا ہے۔ لوگ یونہی دل رکھنے والی باتیں کرتے ہیں' ورنہ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے کو کوئی نہیں ملا سکتا۔ اگر باز سے کوے نے کونج چھین لی ہے۔ دیکھو اس باز نے خاموش ہو کر اپنی چونچ پروں تلے چھپا لی ہے یا وہ کوک رہا ہے۔)

درد میں بھیگی یہ آواز سیدھی زرینہ کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے سبزے میں جھینگروں سمیت ساری کائنات یہ راگ الاپنے لگی ہے۔

''ایہا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیا نوں موڑ لیاوندا ای
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے ایویں جیوڑا لوک ولاوندا ای''

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر وہی منظر گھوم گیا زیب النساء کا جذبات سے عاری چہرہ اور سب ساکت چیزوں کے درمیان اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ۔ اسے جھرجھری آ گئی۔

کمرے میں پھیلی مدھم سی چاندنی میں اس نے قریب کی چارپائی کی جانب دیکھا۔ رضیہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے بھی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی لیکن آنکھیں بند کرتے ہی شاہ جی کا تصور اسے بے چین کر دیتا تھا۔

''کہاں ہیں آپ؟'' اس نے دُکھے دل کے ساتھ سوچا...... ''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کی رہی آپی آپ کی خوشیوں میں خوش ہوتی ہیں لیکن یہ کیا کیا انہوں نے میرے ساتھ؟ اور آپ کہاں چلے گئے؟ میری پرواز محدود ہے لیکن آپ پر تو کوئی پابندی نہیں لیکن نہیں۔ آپ تو آئے ہوں گے خالہ کبریٰ کے گھر۔ میرا انتظار بھی کیا ہوگا' کھیتوں کے درمیان بنے کچے راستے پر کسی تانگے کے پہیوں اور گھوڑے کے سموں کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی لیکن آپ کو دھول اڑاتے راستے پر کچھ نہیں ملا ہوگا۔'' اس نے آہ بھری۔ ''میں وہاں نہیں ملی تھی تو مجھے تلاشتے ہوئے کھوجتے ہوئے یہاں آ جاتے۔ خدا کی قسم' آپ کی خاطر میں اس آگ میں بھی کود جاتی۔ سب کو بھلا کر' سب کی پروا کیے بغیر آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتی۔ کہیں سے آ جائیں شاہ جی خدا کے لیے۔''

رات کے سناٹے میں موٹر کی مدھم سی آواز ابھری۔ وہ اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی۔ پورے گاؤں میں موٹر صرف حویلی ہی میں تھی۔ آواز آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ زرینہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اندر ہی اندر کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔

''یہ شاہ جی ہیں جو تمہاری خاطر آئے ہیں۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر۔ اپنی گوری کی خاطر۔ وہ بھی ویسے ہی بے چین ہیں جیسے تم۔''

موٹر کی آواز مسجد کے سامنے یک لخت ختم ہوگئی تھی۔ وہ تیزی سے بستر سے اتر کر کھڑکی کی جانب لپکی لیکن دو قدم بھی نہ چلی کہ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے چکرا کر زمین پر گر پڑی۔

گرنے کی آواز سن کر رضیہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن پھر کمرے میں پھیلی مدھم سی چاندنی میں اسے زرینہ کا بستر خالی نظر آیا تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''زرینہ کہاں ہو تم؟'' اس نے کمرے میں ہر طرف نگاہ دوڑائی۔

بستر اور کھڑکی کے درمیان زرینہ گری پڑی تھی اور شاید بے ہوش تھی۔

''اوہ خدایا۔'' رضیہ اس کی طرف لپکی۔

گھبراہٹ میں اسے لالٹین جلانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے زرینہ کو اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ وہ واقعی بے ہوش تھی۔ رضیہ اسے ہلا جلا کر ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگی لیکن جب اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو وہ صحن میں پڑے گھڑے سے پانی کا کٹورا بھر لائی۔

''زرینہ میری جان آنکھیں کھولو۔'' اس کے منہ پر پانی چھڑکتے ہوئے وہ گھبراہٹ میں اسے پکار بھی رہی تھی۔

زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی لمحے باہر موٹر کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی۔

''رضیہ مجھے کھڑکی تک لے چلو۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''باہر شاہ جی آئے ہیں۔''

''شاہ جی آئے ہیں۔'' وہ تعجب سے بولی۔ ''تمہیں کس نے بتایا کہ وہ آئے ہیں؟''

''دیر مت کرو مجھے پتا ہے وہ آئے ہیں۔ میرے لیے آئے ہیں۔ کہیں وہ چلے نہ جائیں۔'' اس نے ملتجی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

رضیہ تذبذب کے عالم میں تھی۔

''وہ جا رہے ہیں۔'' زرینہ نے بستر سے اترنا چاہا۔

موٹر کی آواز ایک مرتبہ پھر دور ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اترتا دیکھ کر رضیہ نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے کھڑکی تک لے آئی۔

زرینہ نے بے تابی سے باہر جھانکا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ سوائے دور جاتی موٹر کی سرخ بتیوں اور جھینگروں کی آوازوں کے۔ مایوسی اس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

پیر صاحب مزارعوں کے تصفیہ طلب امور نمٹا رہے تھے۔ رسہ گیری، نہری پانی کی چوری، لڑکیوں کے والدین کی گاؤں کے لڑکوں کے خلاف شکایات اور نہ جانے کیا کیا۔

''حضور! کھوجی نے کھرا نکالا ہے، انہی کے گھر کی طرف جاتا ہے نشان۔'' ایک فریاد کرتا۔

''سرکار! رحمٰن نگر والے مسلسل ہمارا پانی چوری کر رہے ہیں۔'' دوسرا رپورٹ پیش کرتا۔

''پیر صاحب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں، بہت پریشانی میں آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔ یہ نور محمد کا لڑکا سارا دن گاؤں کی لڑکیوں کو تاکتا رہتا ہے۔ میں نے سمجھایا تو میری ہی کے پیچھے پڑ گیا۔'' کوئی اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر روتا۔

ان سب کی تسلی تشفی کر کے ان کے مسائل نمٹا کر وہ منشی فضل دین سے مخاطب ہوئے۔

''رجب علی واپس آیا؟''

''نہیں حضور ابھی تو نہیں آئے۔''

''کچھ خیر خبر آئی، بتا کے کب تک آنے کا ارادہ ہے؟''

''لاہور سے ٹیلی فون آیا تھا سرکار، شکورے نے بتایا ہے کہ آج رات تک پہنچ جائیں گے۔'' منشی نے بتایا۔

''رجب علی نے سب کچھ اتنی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد ہمیں کافی دقت محسوس ہو رہی ہے۔''

''حضور چھوٹے شاہ صاحب یہیں موجود ہیں کہیں تو انہیں بلا بھیجوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولے۔ ''یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے۔''

''حضور! ایک درخواست کرنی تھی۔'' منشی دبے دبے انداز میں بولا۔

''کہو۔''

''بڑے شاہ صاحب نے کچھ حکم دیئے ہیں، میں نے سوچا آپ سے تصدیق کروا لوں۔'' اس نے پہلے والے انداز سے کہا۔

''رجب علی کا ہر حکم ہمارا حکم ہے، جو کچھ اس نے کہا ہے بالکل ویسے ہی ہونا چاہیے۔ تم لوگوں پر اس کی اطاعت ویسے ہی فرض ہے جیسے ہماری اطاعت۔''

''جی سرکار۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اگر رات کے وقت وہ لاہور سے یہاں پہنچا تو اسے بتا دینا کہ اگلی صبح کو ہم سے ملاقات کر لے۔''

☆======☆======☆

عورتوں کو اسیر کرنے کا فن رجب علی سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا۔ تبھی بھری بیٹھک میں

بیسیوں رئیں زادوں کے درمیان چندا بائی رجب علی کی اسیر ہوگئی تھی۔ پھر وہی شاہی غرور' وہی تمکنت' وہی سر اٹھا کر چلنے کا انداز اور لٹانے کو بے تحاشہ دولت۔ شیرا اتنا گاڑھا ہو تو بھلا مکھی کی کیا مجال کہ ایک مرتبہ بیٹھ کر پھر اٹھ بھی سکے۔ مردانگی کی ظاہری خصوصیات تو یہی تھیں اور پھر مائل بہ کرم ہونے کے بعد یک لخت بے نیاز ہو جانا۔

عورت تو عورت ہوتی ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے والی اور چندا بائی تو ان عورتوں میں سے تھی جو جھوٹ کو سچ سمجھنے کی شعوری کوشش میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں۔ ہر ایک آ کر کہتا ہے چندا بائی سے محبت ہوگئی ہے اور وہ ہر ایک کی بات کو سچ سمجھنے لگتی۔ شروع میں تو اس بات سے نگینہ بائی کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

چندا بائی محبت کے الفاظ کو سچ سمجھنے کی کوشش تو اب بھی کرتی تھی لیکن اب اس کے نزدیک محبت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اس سے محبت کرنے والا اپنی محبت کے حساب سے بٹوے سے نوٹ نکال نکال کر اسے دیتا جائے' جو جتنے نوٹ نکالتا تھا وہ اس کے الفاظ کو اسی درجے کے میزان پر تولتی تھی۔

الفاظ اب بھی اسے خوش کرتے تھے' لیکن صرف وقتی طور پر' اسے احساس ہو چکا تھا کہ اگر وہ ان الفاظ سے صرف خوشی نچوڑتی رہی تو بھوکی رہ جائے گی۔ روٹی کھانے کے لیے چند روپے بھی نہیں ہوں گے اس کے پاس اور جس ہار سنگھار کے سہارے وہ اپنے گرد بھیڑ لگائے رکھتی ہے' یہ ہار سنگھار ختم ہو کر رہ جائے گا۔ ایک مرتبہ یہ حقیقت ذہن نشین کر لینے کے بعد اس نے ہر سچ کے درجے متعین کر دیئے تھے۔ اس کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ بیٹھک بھی بھری رہتی تھی' کاروبار بھی چلتا رہتا تھا اور جھوٹ اور سچ کے اس کھیل میں مگن ہو کر وہ خوش بھی رہتی تھی۔

لیکن رجب علی نے چندا بائی کو عجیب مصیبت میں گرفتار کر دیا تھا۔ اس کی میزان کے مطابق تو وہ اس کا سب سے سچا عاشق تھا ہی لیکن صرف سچ نے اس سے پہلے اس پر یہ اثر تو نہیں کیا تھا۔ شروع میں یہ سچ اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتا تھا۔ ایک انوکھی لذت پیدا ہو جاتی تھی' یہ ایک فقرہ سن کر۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔"

لیکن آہستہ آہستہ اس سچ کا اثر صرف اتنا رہ گیا کہ یہ سنتے ہی اس کے دل کی کلی کھلنے لگی ہونٹ مسکانے لگے' گردن پُرغرور انداز میں تن گئی۔ آنکھوں میں بے نیازی کی چمک اتر آئی۔ کمر میں لچک پیدا ہو گئی اور چال میں شوخی آ گئی۔

اس دفعہ پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ رجب علی شاہ سے مل کر اس کی باتیں' اس کی سرگوشیاں سن کر وہ پگھلنے لگی تھی' چٹخنے لگی تھی' اس کے وجود کی ساری بے نیازی بہہ رہی تھی۔ وہ اسے سمیٹ کر پھر سے چندا بائی کی شکل دینا چاہتی تھی لیکن بہتے ہوئے خیال کو کہاں تک قابو کرتی۔ اپنا جسم تو اس

نے بہت سے لوگوں کے حوالے کیا تھا لیکن اپنی شخصیت اور روح تک کسی کو بھی نہیں پہنچنے دیا' اپنے اندر دفن کیا ہوا تھا اسے۔

لیکن رجب علی شاہ نے صرف اس کا جسم نہیں لیا تھا' اس کے اندر سے اس کی شخصیت اور روح تک کو باہر کھینچ لایا تھا۔ وہ اس سے بچ نکلنا چاہتی تھی' بھاگ جانا چاہتی تھی' لیکن اس کی ان کی صلاحیت تو وہ سلب کر چکا تھا۔

دولت لٹانے کے لیے تو اس کے پاس آنے والا ہر شخص بے قرار ہوتا تھا اور سب ہی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے لیکن ان کے پاس بھی صرف دولت ہی تھی۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ عجیب سی مقناطیسی کشش نہیں تھی جو رجب علی شاہ کی شخصیت کا حصہ تھی۔

وہ اسے اپنے گلبرگ والے محل نما بنگلے میں لے آیا تھا۔ جس چیز پر اس نے ہاتھ رکھا تھا' جس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا اس نے چندا بائی کے آگے ڈھیر کر دی تھی۔

خود چندا بائی کو بھی مدت بعد سجنے سنورنے میں مزہ آیا تھا۔ اس نے بہت اہتمام کیا تھا۔ اودی بلیو ساڑھی زیب تن کر کے' کانوں میں بالی پتا ڈالے' بانہوں میں ایک قطار میں درجنوں کھنکتی ہوئی چوڑیاں اور کنگن اور پاؤں میں پائل ڈال کر اس نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا۔ وہ حسین تھی لیکن آج حسین تر لگ رہی تھی۔ آئینے کے سامنے سے ہٹنے سے پہلے اس نے ماتھے پر چمکتی ہوئی بندیا لگائی اور خوبصورت سی مسکان خود بخود ہی اس کے رنگین ہونٹوں پر پھیل گئی۔ رجب علی شاہ کو دیوانہ بنانے کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو چکی تھی وہ...... تصور ہی تصور میں وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔

"مجھے دیکھ کر وہ ہوش وخرد سے دیوانہ نہ ہوا تو میں بھی چندا بائی نہیں۔" اس نے سوچا۔ "جب وہ دیوانہ وار میری جانب بڑھے گا تو میں اٹھلا کر شکوہ کروں گی کہ آپ نے ہمیں پھول تو لا کر ہی نہیں اور وہ ہر رنگ اور ہر خوشبو کا پھول میرے سامنے ڈھیر کر دے گا۔"

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر ڈرائینگ روم کی جانب چلی آئی' جہاں رجب علی شاہ موجود تھا۔ چندا بائی نے دروازے میں کھڑے ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ پائپ کے کش لیتے ہوئے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔

چندا بائی نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور نزاکت سے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے ملبوس کی خوشبو کی لپٹیں اور اس کے وجود کی مہک رجب علی شاہ تک پہنچی تو ضرور ہو گی پھر بھی اس کی نگاہیں رسالے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ چندا بائی کو تعجب ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی اس کی موجودگی سے یوں بے خبر رہے۔ اس نے کھنکھار کر رجب علی کو اپنی طرف متوجہ کیا لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

"شاید سنا نہیں ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

اور پھر وہ اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب کے رجب علی نے اپنی نگاہیں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ اس کے رنگین ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی، لیکن ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں اس مسکراہٹ نے دم توڑ دیا کیونکہ رجب علی اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر سے پائپ کے کش لینے اور رسالے کے مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا۔

تعجب تو چندا بائی کے تاثرات کو بیان کرنے کے لیے بہت چھوٹا سا لفظ تھا۔ چند لمحے تو وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ اس کے دل میں کیا تھا جو ٹوٹ گیا۔ اس کی انا اور اس کا غرور یا کچھ اور، اتنی بے نیازی اور اتنی بے مروتی تو اس کے تصور سے بھی باہر تھی۔ اس کی دو گھنٹے کی تیاری اور صرف ایک اچٹتی نگاہ۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا اس کے ساتھ۔ اس کا واسطہ تو ہمیشہ جنبشِ ابرو کے غلاموں سے پڑا تھا پھر یہ آج کیا ہوا تھا؟ اس کی روح تک بلبلا اٹھی تھی۔ کیا اس کی خوبصورتی اور اس کا نکھار اس بات کا مستحق بھی نہیں تھا کہ وہ اسے غور سے دیکھ تو لیتا۔ صرف ایک نظر، ایک ستائش بھری نظر۔ وہ اچٹتی سی نگاہ اسے اندر تک کاٹ دینے کے لیے کافی تھی۔

اس نے رجب علی کی جانب دیکھا۔ ان دونوں کے درمیان دھوئیں کی ایک باریک سی تہہ موجود تھی اور اس دھوئیں کے پیچھے وہ مطمئن انداز میں دائیں ہاتھ میں پائپ تھامے کسی انگریزی رسالے پر نظریں جمائے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا تھا۔

چندا بائی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہوں۔" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

"کہاں گم ہیں آپ؟" اس نے ایک ادا کے ساتھ شکایتی لہجے میں کہا۔

اس نے چندا بائی کی طرف دیکھا، لیکن وہ ایسی سپاٹ نظروں کی متمنی تو نہیں تھی۔

"کاغذوں کے اس ڈھیر میں کیا رکھا ہے۔" وہ آنکھوں میں چمک بھر کر بولی۔ "چلیے کہیں باہر چلتے ہیں، یہاں کمرے میں ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔"

"ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔" وہ پھر پائپ اور رسالے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

یہ انتہا تھی، پھر بھی چندا بائی نے ہار نہ مانی اور ایک کے بعد ایک کتنے ہی جتن کر ڈالے، لیکن رجب علی کی بے نیازی کا خول نہ ٹوٹا۔ اس نے اپنا سب کچھ سونپ کر رجب علی کو پانے کی کوشش کی لیکن وہ اسے نہ پا سکی۔ وہ پیسہ لٹانے کو تیار تھا پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ چندا بائی کی میزان کے مطابق وہی اس کا سچا عاشق تھا لیکن اس نے تو چندا بائی کی میزان بھی الٹا دی تھی۔ اچانک ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ پیسے کے ساتھ ساتھ اسے رجب علی کے لفظوں کی بھی ضرورت ہے لیکن رجب علی جتنی بے دردی سے اور جس قدر بے دریغ دولت لٹا رہا تھا، محبت کے الفاظ کے بارے

میں اتنا ہی کنجوس تھا وہ ہر روز پہلے سے بڑھ کر اس کی اسیر ہو رہی تھی۔

وہ خود کو ایسے سیارے کی مانند محسوس کر رہی تھی جو انجانے میں سورج کی کشش کے تابع ہو گیا تھا اور اب اس کے گرد تیزی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اس کے قریب جانے کی خواہش تھی لیکن اس کی حدت کی وجہ سے پاس جانے کی جرأت نہ تھی اور اس سے دور ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ بس ایک محور تھا جس کے گرد چکر کاٹنے پر مجبور تھی۔ وہ اس کی ذات کے پنجرے میں محبوس ہوتی جا رہی تھی اور جانتی تھی کہ رجب علی شاہ کی شخصیت اسے اپنے اندر قید کرتی جا رہی ہے اسی لیے وہ اس کے پاس سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کہیں دور نکل کر اس طلسم سے رہائی پانا چاہتی تھی لیکن ہر مرتبہ صرف پھڑپھڑا کر رہ جاتی، بے بس ہو جاتی تھی وہ۔ اس کے سامنے اسے لگتا تھا جیسے اس کی روح رجب علی نے اپنے پاس رکھ لی ہے، کبھی نہ لوٹانے کے لیے۔

اس کا دل شدت سے چاہتا تھا کہ وہ نہیں تو رجب علی جلد یہاں سے چلا جائے، کہیں بھی، بس یہاں نہ رہے۔ اس طرح شاید وہ اس قید سے رہا ہو جائے، لیکن جس دن رجب علی نے اسے اس کی رہائی کا مژدہ سنایا اس دن اس کی بے کلی اور بڑھ گئی۔ اس نے کتنی منتیں کی تھیں اس سے رک جانے کے لیے، اس کا فیصلہ تبدیل نہیں ہوا تھا اور وہ اسے واپس وہیں چھوڑ آیا تھا، جہاں سے اسے لایا تھا۔ جسم اسے لوٹا گیا تھا، روح اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

☆======☆======☆

رجب علی نے شکورے اور دوسرے ملازمین کو پہلے ہی گاؤں بھیج دیا تھا اور اب خود بھی اپنی شوامپالا میں نیاز پور کی طرف رواں دواں تھا۔ اسے گاؤں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے کار کی رفتار درمیانی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک پر پڑے ریت کے ذرات چمک رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بس قریب سے گزرتے ہوئے ہارن بجاتی تو سڑک پر زندگی کے آثار دکھائی دیتے ورنہ بس وہ تھا، کار کے انجن کی آواز تھی یا اس کی لامتناہی سوچیں۔

"اچھی تھی چندا۔" اس نے سوچا۔ "بس صرف اچھی، حسن اور خوبصورتی تو موجود تھی، جادوگری نہیں تھی اس میں، پاؤں زمین کے ساتھ جکڑنے کا منتر نہیں آتا تھا اسے۔ ہاں کرتی تھی، ان بے شمار لڑکیوں سے بہتر جو میری زندگی میں آئیں لیکن بہترین نہیں تھی۔ بہترین کوئی بھی نہیں تھی۔ دیکھتے رہنے اور لوٹ آنے پر مجبور کرنے والی کوئی نہیں تھی۔ ایک دلچسپ دن اور ایک رنگین رات کے بعد اپنی دلکشی کھو دینے والی کھلی کتاب کی طرح کی عورتیں جنہیں پڑھ لینے کے بعد ان کے اندر کچھ بچتا ہی نہیں ہے۔ عورت میں تو اسرار ہونا چاہیے، بھول بھلیاں ہونی چاہئیں، کسی ایسی کتاب کی طرح جسے بار بار پڑھنے کو دل چاہے۔ جس میں روز ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ ہو، جس کا روز ایک نیا مفہوم سامنے آئے۔ چندا جیسی عورتیں وقت گزاری کے لیے ٹھیک ہیں، منزل بنا کے ڈیرے ڈالنے کے لیے نہیں۔

پتا نہیں وہ بھی کبھی ملے گی جسے دیکھتے ہی منزل مل جانے کا احساس دل میں کروٹیں لے گا۔ ڈھونڈ ختم ہو جائے گی۔ تلاش کا سفر تمام ہوگا' زندگی میں ٹھہراؤ آ جائے گا' جس کے لیے دل خود یہ صدا دے گا کہ یہی ہے وہ جس کی تلاش میں برسوں میں نے مارا ماری کی ہے۔ ہزاروں لڑکیوں کو آزمایا ہے اتنی لڑکیوں' اتنی بہت سی لڑکیوں میں کوئی ایک تو ایسی ملتی جو اسیر ہو جانے کے بجائے اسیر کر لینے کا فن جانتی' منتر پڑھ کر پتھر بنا لینے کا فن جانتی اور پھر ہمیشہ کے لیے وہیں بسیرا کر لیتی۔''

اس نے کار جی ٹی روڈ سے نیاز پور کے کچے راستے پر اتار دی۔ ہچکولے کھاتی جہازی سائز شوامپلا آہستہ روی سے حویلی کی سمت بڑھ رہی تھی۔

جب سائیں بابا کی درد میں ڈوبی آواز رجب علی شاہ کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اک باز توں کانگ نے کونج کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

ادھیڑ عمر سائیں بابا کھیتوں کے قریب بنے ہوئے کچے راستے پر لنگڑا کر چلتے ہوئے گا رہا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی اپنے اوپر پڑتے ہی وہ کچے راستے سے اتر کر کھڑی فصل میں غائب ہو گیا۔

رجب علی اسے نظر انداز کر کے آہستہ روی سے گاڑی چلاتے ہوئے حویلی میں پہنچ گیا۔

☆======☆======☆

مہر النساء اور زیب النساء ماں جی کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''درزن بٹھا کر اب شادی کے کپڑے سلوا لو۔'' ماں جی ان سے کہہ رہی تھیں۔ ''دن کتنے رہ گئے ہیں شادی میں' سستی سے کام مت لو۔''

''جی اچھا۔''

''میں دیکھ رہی تھی علی بہت اچھے کپڑے لایا ہے' جو تم لوگوں کو پسند آئیں وہ تم رکھ لو۔''

''ہمارے لیے جو کپڑے لایا ہے علی' وہ ہم لے چکے ہیں۔'' زیب النساء نے کہا۔

''ان میں سے بھی کوئی اچھا لگے تو رکھ لو یاسمین کے لیے اور آتے رہیں گے۔'' ماں جی نے پیار سے کہا۔

پھر مہر النساء سے مخاطب ہوئیں۔ ''حمیدہ کہاں ہے؟ اس سے کہو کپڑوں کا صندوق یہاں

لے آئے۔''

''ماں جی! اس کی کیا ضرورت ہے' اتنے بہت سے کپڑے تو علی لایا ہے ہمارے لیے اور کی کیا ضرورت ہے؟'' مہر النساء نے کہا۔

''بات ضرورت کی نہیں میری اور تمہارے بابا جان کی خوشی کی ہے۔ اولاد کو خوش دیکھ کر ماں باپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔''

پھر انہوں نے صندوق کھلوا کر ڈھیر سارے رنگ برنگے جھلملاتے ملبوسات ملازماؤں کے ہاتھوں کمرے میں ہر طرف رکھوا دیئے۔ بڑی بہو کو ملنے والے خاندانی زیورات ہٹا کر باقی سب زیور بھی ان کے سامنے رکھ دیئے۔

''یہ سب تمہارے سامنے ہے۔'' ماں جی نے کہا۔ ''جو اچھا لگے بلا تکلف اٹھا لو۔''

اُن کی بات منہ ہی میں تھی کہ دروازے کے باہر سے پیر صاحب کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہونے والے ہیں۔ مہر النساء اور زیب النساء نے جلدی سے چادروں کے پلو سر پر ڈالے اور احترام کی خاطر کھڑی ہو گئیں۔

''ٹھیک ہیں آپ دونوں؟'' انہوں نے شفقت سے باری باری دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ بیٹیوں کو انہوں نے کبھی بھی 'تم' کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔

''جی بابا جان۔''

''کھڑی کیوں ہیں' بیٹھ جائیں۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بھی بیٹھ گئیں۔

''گویا شادی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔'' انہوں نے چاروں طرف جگمگاتے ملبوسات اور زیورات کی جانب دیکھا۔

''جی بابا جان!''

''میں ان سے کہہ رہی تھی کہ انہیں جو چیز اچھی لگے' اپنے لیے منتخب کر لیں۔'' ماں جی نے بتایا۔

''بالکل' بالکل' اس گھر کی ہر چیز پر پہلا حق آپ دونوں کا ہے۔'' وہ بولے۔

''ہم دونوں کا؟'' مہر النساء یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ ''اس سے بڑا مذاق بھی ہو سکتا ہے کوئی۔ گدی بھائی کی' جائیداد بھائی کی' زمینیں اُن کی' حویلیاں اُن کی' سب دولت اُن کی' گھی کے چراغ اُن کے اور بالآخر یہ سب کچھ اُن کی اولاد کا۔ ہمارا کیا ہے یہاں؟ زندگی میں دو کمرے اور مرنے کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں دو دو گز زمین' پھر ہمارے یہی کمرے بابا جان کی بیٹیوں کے حصے میں آ جائیں گے جیسے ہم سے پہلے اس خاندان میں گزرنے والی عورتوں کے کمرے ہمارے حصے میں آئے ہیں۔ ہاں قبر کے لیے سب کا حصہ اپنا اپنا ہے۔''

''چپ کیوں ہیں بیٹا! اپنی پسند کی چیز اٹھالیں۔'' انہوں نے پاس بیٹھی زیب النساء کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''یہ پسند نہیں تو بتائیں ہم کل ہی علی کو لاہور بھیج کر آپ کی پسند کی چیز منگوادیں گے۔ بس ہماری ایک ہی خواہش ہے بیٹا کہ آپ دونوں خوش رہیں اور اپنی پسند اور خواہش کا اظہار کرتے وقت جھجکیں بالکل مت' ہمیں کھل کر بتادیں' جس چیز کی خواہش یا ضرورت ہو' بس ایک اشارہ کردیں۔''

''کھل کر بتادیں' اشارہ کردیں۔'' کوئی بہت تلخ اور کڑوی سی چیز اس کے حلق میں اترتی چلی گئی۔ ''ہونہہ! زبانی جمع خرچ' کیا سب کچھ کہہ دینا ضروری ہوتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''ہماری اظہار کی طاقت سلب کر کے اب کہتے ہیں کہ ہم سب کچھ کہہ دیں' کس منہ سے کہیں بابا جان' آپ نے تو ہمیں پاکیزگی کی سفید چادروں میں لپیٹ کر فرشتوں کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ اچھائی اور نیکی کو ہمارے اوپر اس قدر مسلط کردیا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو کچھ نہیں بول سکتے اور اگر بول ہی پڑیں بابا جان تو بھی کیا ہوگا۔ تاروں کے ٹوٹنے سے بھی کبھی سکوتِ شب میں دراڑ پڑ سکتی ہے؟

یا میں کہہ دوں کہ مجھے ایک گھر کی ضرورت ہے' شوہر کے پیار محبت کی ضرورت ہے' اس اولاد کی ضرورت ہے جسے میں اپنے ہاتھوں میں کھلا سکوں' جسے اپنی آنکھوں کے سامنے جوان ہوتے دیکھ سکوں۔

لیکن یہ کہنے سے کیا ہوگا؟ کیا آپ یہ سب کچھ مجھے دے دیں گے؟ نہیں ناں' تو پھر کہنے کا فائدہ؟ کہ یہ مقام بھی نہ رہے جو آج ملا ہوا ہے اور خلش ساری زندگی کے لیے رہ جائے۔''

لیکن یہ سب باتیں وہ کہہ نہیں سکتی تھی' ہاں سوچ سکتی تھی کیونکہ اس کی سوچ پر کوئی پہرے نہیں تھے۔ بابا جان' ماں جی' بھائی اور مہرالنساء کسی کی رسائی بھی تو نہیں تھی اس کی سوچ تک۔

تھوڑی دیر بعد وہ بابا جان اور ماں جی سے معذرت کر کے اپنے اپنے کمرے میں آگئیں۔

مہرالنساء اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو حمیدہ اس کے جھلملاتے ملبوسات پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی' اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھو حمیدہ' بیٹھو۔'' مہرالنساء پیڑھے پر بیٹھ گئی۔

''بڑی بی بی! کتنے اچھے کپڑے ہیں آپ کے' ایمان سے آپ کے مقابلے میں کوئی لڑکی نہیں ٹھہر سکے گی جب آپ یہ پہنیں گی۔'' وہ جوش سے بولی۔ ''بس اب جلدی سے یہ سب سلوا لیں۔''

''تمہیں اچھے لگ رہے ہیں یہ کپڑے؟''

''اچھے نہیں بہت اچھے لگ رہے ہیں یہ دیکھیں نیلے رنگ کا جوڑا۔'' حمیدہ نے نقرئی ڈبا اٹھا کر اس کے سامنے رکھا۔ ''اور یہ ہرا اور یہ پیلے جوڑے کا دوپٹا کتنا اچھا ہے ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ اتنے بڑھیا کپڑے میں نے نہیں دیکھے۔'' وہ جوش سے بولے جارہی تھی۔ ''اور یہ سونے کے زیور تو لگتا ہے' خاص طور پر آپ کے لیے بنے ہیں۔''

''تمہیں جو جوڑا' جو کپڑا اچھا لگے' وہ لے لو۔''

''جی!'' اس نے تعجب سے مہرالنساء کی جانب دیکھا۔

اس سے قبل بھی وہ اسے کپڑے دیتی رہی تھی۔ عمدہ عمدہ بڑھیا کپڑے جنہیں پہن کر وہ اپنی سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں کے سامنے خوب شو مارتی تھی' لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنا عمدہ کپڑا نہیں تھا۔ زیادہ تر تو اسے اترن ہی ملتی تھی اور جب کبھی مہرالنساء خوش ہو کر اسے نیا کپڑے دیتی تھی تو اماں فوراً ہی اسے جہیز کے نام پر بڑے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیتی تھی۔

پر ایسے کپڑے' وہ بھی بالکل نئے' اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

''کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟'' مہرالنساء بولی۔

''بی بی! اللہ تعالیٰ یہ کپڑے آپ کو مبارک کرے' میری تعریف کا یہ مطلب نہیں تھا۔'' حمیدہ گڑبڑا کر بولی۔

''لے لو حمیدہ! میں جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ میں ان کپڑوں کا کیا کروں گی؟'' اس کے لہجے میں دکھ کی پرچھائیاں اتر آئیں۔ ''تم پہنو گی تو کوئی دیکھے گا' سراہے گا۔ تمہاری تعریف کرے گا۔ میرے لیے تو ہر کپڑا کفن جیسا ہے' جس کی طرف کوئی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتا' جسے کوئی نہیں سراہتا' کوئی تعریف نہیں کرتا۔''

''بی بی! اللہ پاک سے دعا کریں' وہ ہر ایک کی سنتا ہے۔''

''میری دعا میں تاثیر نہیں ہے حمیدہ' میں تو دعا کر کے ہار گئی لیکن شاید اوپر کے دروازے میرے لیے بند ہیں۔ یہاں کے سب لوگ بابا جان سے دعا کرواتے ہیں اور سب کی دعائیں وہ اوپر والا سنتا ہے' لیکن میں ایسی بدقسمت ہوں کہ ان کی اولاد ہوتے ہوئے بھی ان سے دعا کرنے کو نہیں کہہ سکتی۔

لوگوں نے اولاد مانگی' ترقی مانگی' اچھی فصل مانگی' بیٹیوں کے بر مانگے اور بابا جان نے سب کے لیے اس اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلائے' سب کی دعائیں باریاب ہوئیں۔ اولاد بھی ملی' ترقی بھی ملی' اچھی فصل بھی ملی اور بیٹیوں کے بر بھی' لیکن ہمیں کیا ملا اپنے بابا جان سے؟ صرف ان کے نام کے طفیل آئندہ کے لیے آبائی قبرستان میں چند گز زمین سیّدہ مہرالنساء کے نام کی۔''

حمیدہ چپ چاپ وہ سب جھلملاتے ہوئے رنگین کپڑے تہہ کر کے واپس صندوق میں رکھنے لگی۔

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں بیٹھی رضیہ منتیں کر رہی تھی زرینہ کی کہ وہ کچھ کھا پی لے لیکن وہ مان کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

''میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا' قسم سے۔'' زرینہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

اس کے آنسو رضیہ کے اندر تک دکھ کی لہریں اتار دیتے تھے۔

''تھوڑا سا میرے ہاتھ سے' بس صرف دو نوالے۔'' رضیہ نے روٹی' سالن میں ڈبو کر اس کے ہونٹوں کے قریب کی۔

اس سے قبل کہ وہ ہونٹ وا کرتی مسجد سے متصل دروازہ کھول کر مولوی نعمت اللہ صحن میں داخل ہوئے۔

''رضیہ کی ماں' رضیہ کی ماں؟'' انہوں نے اونچی آواز میں اماں کو پکارا۔ حالانکہ باآوازِ بلند بولنا' ان کی عادت نہیں تھی۔

''ابا جی! اونچا کیوں بول رہے ہیں؟'' وہ کھانا بھول کر اُن کی جانب متوجہ ہوگئی۔ اب تو ذرا سا کھٹکا بھی اسے ڈرا دیتا تھا۔

''اماں کو آواز دے رہے ہیں' تم جلدی سے کھانا کھاؤ۔''

''تم باہر نکل کر دیکھو ناں رضیہ۔''

اس سے پیشتر کہ رضیہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلتی ابا جی نے دروازے کے قریب آ کر آواز دی۔

''رضیہ! تمہاری اماں کہاں ہیں؟''

''میں دیکھتی ہوں۔'' وہ روٹی کی چنگیر اور سالن کی پلیٹ وہیں چارپائی پر چھوڑ کر باہر کی طرف لپکی۔ ''تھوڑی دیر پہلے تو نماز پڑھ رہی تھیں کمرے میں' شاید ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں۔''

''کیا ہوا؟'' اماں جاء نماز لپیٹتی گھبرا کر کمرے سے باہر نکلیں۔ ''خیریت تو ہے' چلا کیوں رہے تھے۔''

''زرینہ کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' وہ برآمدے میں بچھے لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئے۔

''ویسی ہی ہے' بخار تو ختم ہوگیا لیکن کمزوری نہیں جا رہی' کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں ہے' جسم میں جان کیسے آئے۔'' اماں نے تہہ کی ہوئی جاء نماز تخت پر رکھی۔ ''لیکن آپ کیوں اتنی اونچی آوازیں دے رہے تھے؟''

''میں بہت پریشان ہوں رضیہ کی ماں۔'' وہ بولے۔

''اللہ خیر کرے۔'' وہ پاس ہی بیٹھ گئیں۔ ''کیا ہوا؟''

''نہ جانے کس نے خاندان بھر میں مشہور کر دیا ہے کہ زرینہ' صفدر کی شادی کے متعلق سن

کر اتنی دلبرداشتہ ہوئی ہے کہ چارپائی سے لگ گئی ہے۔''

''کیا؟'' اماں نے تعجب سے کہا۔ ''کیسی کیسی باتیں مشہور کر دیتے ہیں لوگ' اللہ ان سے پوچھے۔''

''بددعا نہیں دیا کرتے۔'' وہ بولے۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ آج تک کسی کو میری بیٹیوں کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت بھی نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں کس نے یہ سب کچھ مشہور کر دیا۔''

''ارے وہ بے چاری تو حویلی سے آنے کے بعد بیمار ہوئی ہے۔ بیمار بھی کیا ہوئی' خوفزدہ ہو گئی۔ پتا نہیں کس نے کیا کہہ دیا۔ میری پھول جیسی بچی بالکل ہی مرجھا کر رہ گئی لیکن لوگ تو موقع ڈھونڈتے ہیں' بات کو بتنگڑ بنانے کا۔ ناس پٹے ایسے لوگوں کا۔''

''سوچتا ہوں کہ بات کے مزید پھیلنے سے پہلے ہی جلد از جلد اس کی شادی کر دوں۔''

کمرے میں بیٹھی زرینہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر زور سے بھینچ دیا ہو۔

''شادی! جلد از جلد۔'' وہ زیرِ لب بولی۔

''میں تو کب سے کہہ رہی ہوں کہ اب دونوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کریں۔'' اماں نے کہا۔ ''پر بڑی سے پہلے چھوٹی کی بات چلائی تو نہ جانے اور کیا کیا باتیں سننا پڑیں پہلے رضیہ کے متعلق سوچیں۔''

لیکن اماں کی بات بھی زرینہ کی تشفی نہ کر سکی۔

''نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بڑبڑائی۔

شادی کا ذکر سن کر رضیہ اندر کمرے میں چلی آئی۔ روٹی کی چنگیر اور سالن ویسے ہی دھرا ہوا تھا اور زرینہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔

''تم نے کچھ کھایا نہیں۔'' وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''ابا کی بات سنی رضیہ؟'' اس نے بڑی بڑی شربتی آنکھوں کو مزید پھیلایا۔

''کچھ نہیں ہوگا' جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہوگا' تم آرام سے کھانا کھاؤ۔''

''وہ یہ کر گزریں گے رضیہ' خدا کے لیے کہیں سے شاہ جی کو بلا لاؤ۔'' اس کی آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں۔

''آہستہ بولو۔'' رضیہ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر گھبرا کے دروازے سے باہر دیکھا لیکن تخت پر بیٹھے اماں اور ابا اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

''میں کیا کروں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''سب سے پہلے تو تم کھانا کھاؤ تا کہ یہ کمزوری دور ہو اور اس ہفتے کے روز ہم خالہ کبریٰ

کے گھر جاسکیں' وہاں چھوٹے شاہ صاحب سے بھی تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ اتنی آسان سی بات ہے۔'' رضیہ نے کہا۔ ''تم کھانا نہیں کھاؤ گی تو یہیں چارپائی پر پڑی رہو گی۔ وہاں پیر صاحب چھوٹے شاہ صاحب کا رشتہ کہیں طے کر دیں گے اور یہاں اماں ابا تمہاری بات پکی کر دیں گے۔''

''ایسی بات تو نہ کرو رضیہ۔''

''اور کیا بات کروں۔ ظاہر ہے چھوٹے شاہ صاحب کو میں یہاں لانے سے تو رہی اور تم ایسی بے ہمتی کا مظاہرہ کرو گی تو اس کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا؟''

رضیہ کی اس بات نے کام کر دکھایا اور وہ کھانا کھانے پر تیار ہو گئی۔

''اب ذرا اپنے چہرے کے زاویے بھی ٹھیک کر لو اور کمرے سے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لو تاکہ تم پر اُداسی کا جو دورہ پڑا ہوا ہے' اس سے تمہیں نجات مل سکے۔'' رضیہ نے چنگیر اور سالن کی پلیٹ اٹھالی۔ ''اس کا اضافی فائدہ یہ ہو گا کہ ابا جی کی تسلی ہو جائے گی اور تمہاری شادی کے سلسلے میں وہ جلد بازی نہیں کریں گے۔''

''سچ کہہ رہی ہو ناں؟'' اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''میں اَن پڑھ ہو کر یہ بات سمجھ سکتی ہوں اور تم پڑھی لکھی لڑکی یہ بات نہیں سمجھتی۔''

''میری تو عقل ہی کام نہیں کر رہی' پتا نہیں کیا ہو گا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا جب تم اپنی طبیعت بہتر کر لو گی۔''

رضیہ کے دلائے ہوئے خیال نے اس میں نئی روح پھونک دی تھی اور کتنے ہی دن بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اماں تو اسے باہر نکلتے دیکھ کر نہال ہو گئی تھیں۔

''آ جا میری بیٹی۔'' انہوں نے اپنے قریب ہی اسے تخت پر بٹھالیا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں اماں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''بالکل ٹھیک ہو جائے گی میری بچی۔'' انہوں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''بس اب خوب پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ تاکہ نقاہت دور ہو جائے۔''

''جی اماں۔''

''اور بال دیکھو کیسے روکھے ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے دو دن سے کنگھی بھی نہیں کی۔'' انہوں نے رضیہ کو آواز دی۔

''رضیہ! کنگھا اور تیل تو لانا۔''

''ابھی لائی۔'' رضیہ نے کہا۔

وہ کنگھا اور تیل کی بوتل اٹھا لائی اور پھر خود بھی وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔

''ادھر دو میں اپنی بیٹی کے سر میں خود مالش کروں گی۔'' انہوں نے اس کے الجھے بالوں والی لمبی سی چوٹی کھول کر اس میں کنگھی شروع کی۔

''دیکھو' کتنے بال ٹوٹ رہے ہیں' بال تو گریں گے ہی کھاتی پیتی جو کچھ نہیں ہو۔ اب رات کو دودھ پی کر سونا ہے۔''

''میں تو روز لاتی ہوں اماں' پر یہ پیتی ہی نہیں ہے۔'' رضیہ نے شکایت کی۔

''کیسے نہیں پیئے گی۔ اب' نہ پیئے تو مجھے بتانا' زبردستی پلاؤں گی۔ حالت دیکھی ہے اس کی کتنی مرجھا گئی ہے چند دن میں۔'' اماں نے ڈھیر سارا تیل بالوں میں ڈال کر سر کی مالش کرنا شروع کی۔ ''اب ٹھیک ہو جاؤ جلدی سے' بڑے شاہ صاحب کی شادی قریب آ رہی ہے' وہاں یہ مردوں جیسی پیلی شکل لے کر نہ جانا۔''

''بڑے شاہ صاحب کی شادی ہے؟'' اس نے سننے کے باوجود تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''ہاں حمیدہ بتا رہی تھیں کہ ایک سے ایک عمدہ چیز اکٹھی کی ہے شادی کے لیے' کیا حویلی کا سامان کیا کپڑے لتے۔ ایسا بڑھیا سامان ہے کہ آنکھیں کھل جائیں۔'' اماں مالش کرنے کے ساتھ ساتھ بتا رہی تھیں۔ ''یہ تو تم بیمار ہو گئی تھیں' میرا دل اِدھر اٹکا ہوا تھا' نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا ورنہ بڑی بیگم کو مبارکباد دینے بھی جانا تھا۔ آخر بڑے شاہ صاحب کی شادی ہے برسوں بعد تو ایسی رونق آئی ہے۔''

''اماں! آپ حویلی مت جانا۔'' وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

اماں نے ایک نظر رضیہ کی جانب دیکھا لیکن اس نے نظریں چرا لیں۔

''آخر بات کیا ہے زرینہ!'' بالآخر اماں نے پوچھا۔ ''ہوا کیا ہے تجھے؟''

''مجھے...... مجھے تو کچھ نہیں ہوا؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''اپنی اماں سے بھی اپنا آپ چھپائے گی؟'' وہ بولیں۔ ''کہہ دے بیٹا! سب کچھ کہہ دے' کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''اماں!'' اس نے ان کے گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔ ''کتنی بڑی ہے ناں حویلی۔''

''ہاں بڑی تو ہے۔''

''اور اماں! اندر کو باہر کی خبر نہیں ہوتی' باہر کو اندر کی نہیں۔''

''پیر صاحب بہت پہنچے ہوئے ہیں' انہیں اندر باہر کی سب خبر ہوتی ہے' یہ ہم جیسے عام لوگ ہیں جو بے خبر ہیں۔''

''انہیں پتا ہے اماں کہ زیب النساء بی بی کے کمرے میں روح رہتی ہے؟''

''پگلی! اس کے کمرے میں کہاں سے روح آ گئی؟'' اماں ہنس دیں۔

''نہیں اماں' وہاں سچ مچ روح ہے انہوں نے خود بتایا تھا مجھے۔'' اس نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''اس کی پھوپھو کی روح ہے وہاں اور پتا ہے وہ کیا کہتی ہے اس سے؟''

''کیا کہتی ہے؟'' اماں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر پوچھا۔

''وہ زیب النساء کو حویلی سے بھاگ جانے کو کہتی ہے۔''

''استغفار!'' اماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ایسی بہکی بہکی باتیں نہیں کرتے۔''

''اماں یہ میں تو نہیں کہہ رہی۔ مجھے خود بتایا ہے اس نے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ روح پوری حویلی میں پھرتی ہے' پر رہتی اس کے کمرے میں ہے۔ بس اماں آپ وہاں نہ جانا۔'' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''وہموں کو دل میں جگہ نہیں دیتے چندا' وہ پاک روح تھی' جنتی تھی۔ یہ جو ویرانوں کھنڈروں اور جنگلوں میں پھرتی ہیں' یہ بد روحیں ہوتی ہیں' جن کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''وہ اتنی جلدی مری کیسے تھیں؟''

''بس بیٹا' بے چاری کی زندگی اللہ پاک نے اتنی ہی مختصر لکھی تھی۔'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ''حویلی کی بیبیاں بہت ضرورت کے علاوہ حویلی سے باہر نہیں نکلتیں۔ اونچی شان والی سیّد زادیاں ہیں ناں اس لیے' ہماری تمہاری طرح یوں گلیوں میں پھرنا انہیں زیب نہیں دیتا لیکن یہ پیر صاحب کی شادی کی بات ہے۔

سکینہ بی بی ان کی بہت لاڈلی بہن تھیں اور بارات کے ساتھ ہی گئی تھیں۔ جاتے ہوئے ہلکا ہلکا بخار تھا' لیکن بھائی کی شادی کی خوشی میں پروا نہیں کی اور چلی گئیں۔ سفر اتنا لمبا تو نہیں تھا لیکن وہ اور بیمار ہو گئیں تو انہیں بڑی بیگم کے والد کی حویلی میں ٹھہرنا پڑا۔

چند دن بعد بخار اتر گیا اور وہ بھلی چنگی ہو گئیں' لیکن پتا نہیں کیا ہوا' واپس آئیں تو بالکل گم صُم تھیں۔ بظاہر کچھ نہیں تھا لیکن اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھیں اور بس ایک دن چپ چاپ ختم ہو گئیں۔''

''انہوں نے چپ چاپ جان نہیں دی ہوگی' وہ روئی ہوں گی' چلائی ہوں گی' لیکن حویلی کی دیواریں بہت موٹی اور بہت بلند ہیں ناں' ان سے کسی کی آواز باہر نہیں جاتی۔ زیب النساء بی بی کے رونے اور چلانے کی آواز بھی باہر نہیں جاتی۔''

''پگلی کہیں کی' وہ بھلا کیوں رونے لگیں رونا ان کی قسمت میں ہوتا ہے' جن کو کسی چیز کی کمی ہو' انہیں بھلا کس چیز کی کمی ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''اماں ٹھیک کہتی ہیں رونا تو میرے مقدر میں ہے جسے نہ معلوم پر بتانے نہ ے لیکن انہوں نے خود ہی تو کہا تھا کہ وہاں ان کا دم گھٹتا ہے' ان

کی چیخیں کوئی نہیں سنتا اور وہ دیواروں سے سر ٹکراتی ہیں پتا نہیں کیوں؟''

''کس سوچ میں گم ہو گئی؟'' اماں نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔

''پھر بھی اماں! آپ وہاں نہ جانا' وہ بہت اونچی حویلی ہے ناں' کہیں آپ کا دم نہ گھٹنے لگے۔''

اماں ہنس پڑیں۔ ''میرا دم کیوں گھٹنے لگا' ایسی جگہ میں کسی پاگل کا ہی دم گھٹے گا۔''

''لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

''اچھا نہ جانا' لیکن بال تو بندھوا لو۔'' انہوں نے پراندہ اٹھا کر اس کے بال اکٹھے کیے۔

اسے کمرے سے باہر نکل کر صحن میں رکھے گملوں میں لگے موتیے کے پودوں کو پانی دیتے دیکھ کر ابا جی بہت خوش ہوئے۔

''رضیہ کی ماں' اب تو زرینہ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے اماں کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک کہاں ہے' بس چل رہی ہے' ذرا حالت تو دیکھیں اس کی' سوکھ کر لکڑی ہوئی جا رہی ہے۔''

''چلو چارپائی تو چھوٹی' کمزوری آہستہ آہستہ ہی جائے گی۔''

رضیہ اس کے کھانے پینے پر خوب توجہ دے رہی تھی اور وہ بھی اس لیے سب کچھ چپ چاپ کھا لیتی تھی کہ شاہ جی سے ملنے کا موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک خالہ کبریٰ کا گھر ہی تو تھا اس کی امیدوں کا مرکز تھا۔

گھر کے کاموں میں بھی اسی لیے اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا تا کہ ابا جی کو تسلی ہو جائے کہ اسے صفدر کی شادی سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور اماں کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ بات ہو چکی ہے اور وہ اسے گھر سے باہر نکلنے سے نہ روکیں۔

رضیہ چولہے کے پاس بیٹھتی تو وہ بھی وہیں آ جاتی۔ جلدی جلدی پیاز کاٹ دیتی' لہسن چھیل کر کے پیس دیتی اور لکڑیاں بھی جلا دیتی۔ رضیہ چیختی رہ جاتی' اسے بار بار آرام کرنے کو کہتی لیکن وہ ان کاموں میں مگن رہتی شعوری کوشش سے بات بات پر ہنسنے لگتی۔

لیکن جمعہ والے دن سچ مچ وہ بہت خوش تھی ہفتے کے روز اسے شاہ جی سے جو ملنا تھا۔ اتنے دن کے بعد ملاقات کا تصور ہی اسے خوشی سے پاگل کر رہا تھا۔ مسرت کی کرنیں اس کی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھیں' ہونٹ بے وجہ مسکرا رہے تھے۔ کتنے دن بعد اسے خوش دیکھ کر اماں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

رات کو ہمیشہ کی طرح وہ کپڑوں کا ٹرنک کھول کر بیٹھ گئی اور ایک ایک سوٹ نکال کر اور رد کر کے دوسری طرف رکھتی گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' رات کے برتن دھو کر ہاتھ پونچھتی ہوئی رضیہ کمرے میں داخل ہوئی تو

اسے کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں دیکھ رہی تھی کہ کل کون سے کپڑے پہنوں لیکن عین وقت پر ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ملتا۔'' اس نے سب کپڑے واپس ٹرنک میں ٹھونس دیئے۔

''کیسا جوڑا چاہیے تمہیں؟'' رضیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''ایسا جسے پہن کر جب میں شاہ جی کے سامنے جاؤں تو وہ پلکیں جھپکنا ہی بھول جائیں۔''

''تم پیوند لگے کپڑے پہن کر بھی ان کے سامنے چلی جاؤ تب بھی وہ پلکیں جھپکنا بھول جائیں گے۔''

''اب میں اتنی بھی خوبصورت نہیں ہوں۔''

''تم تو چاند کا ٹکڑا ہو زرینہ' زمین پر ہی جنت کی حور ہو۔ کیا کبھی شاہ صاحب نے تمہیں نہیں بتایا کہ تم کتنی حسین ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''کہتے تو وہ بھی یہی ہیں۔''

''پھر یقین کیوں نہیں آتا تمہیں؟''

''اپنی چیز تو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے ناں۔ میں کتنی بھی بدصورت اور بدشکل ہوتی تم مجھ سے اتنا ہی پیار کرتیں ناں جتنا اب کرتی ہو' اس لیے کہ میں تمہاری بہن ہوں۔''

''لیکن پھر شاید شاہ صاحب تم سے اتنا پیار نہ کرتے۔''

''سچ!'' اس نے اپنی شربتی آنکھیں پھیلائیں۔ ''وہ مجھ سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں۔''

''پتا نہیں' لیکن تم بدصورت ہوتیں تو شاید نہ کرتے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' رضیہ نے ٹانگیں بستر کے اوپر کر لیں۔

''سوچ رہی ہوں کہ اگر انہیں خوبصورتی ہی چاہیے تھی تو ولایت میں اس کی کیا کمی تھی؟ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں مجھے دیکھتے ہی ان کے دل نے صدا دی تھی۔ ان سے کہا تھا کہ انہیں اب تک میری تلاش تھی اس لیے انہیں مجھ سے محبت ہوئی۔''

''بہت بھولی ہو تم زرینہ۔''

''اچھا اب ان سے ملوں گی تو پوچھوں گی۔'' وہ بولی۔ ''اور تمہاری بات آزمانے کے لیے کل میں اپنا وہ ہلکے دھانی رنگ والا جوڑا پہن کر جاؤں گی۔''

''وہ تو اتنا پرانا سا ہے اور دھو دھو کر اس کی رنگت بھی اُڑ چکی ہے۔''

''تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔ دیکھوں گی کہ میں سچ مچ چاند کا ٹکڑا اور زمین پر جنت کی حور ہوں یا تم میرا دل بہلا رہی تھیں؟'' وہ ہنسی۔

''آج تمہارا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟'' رضیہ بولی۔ ''مجھے تو نیند آ رہی ہے۔''

''مجھے تو بالکل نہیں آ رہی نیند! لیکن تم لالٹین بجھا دو۔''

رضیہ بتی نیچے کر کے لیٹ گئی۔

''رضیہ!'' ساتھ والے بستر سے زرینہ نے اسے پکارا۔

''ہوں۔''

''سو تو نہیں گئیں۔''

''نہیں' بولو۔''

''مجھے ایک مشورہ دو۔''

''کیا مشورہ دوں' پہلے کون سے مشورے مانے ہیں تم نے میرے جو ایک اور مشورہ دوں۔''

''نہیں قسم سے رضیہ' یہ والا مانوں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''پوچھو! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''میں ملنے پر شاہ جی کو حویلی والا واقعہ بتا دوں یا نہیں؟''

رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔

''بتاؤ ناں۔'' زرینہ بولی۔

''سوچنے تو دو' اپنے اردگرد مصیبتیں تم خود کھڑی کرتی ہو اور دُکھڑے میرے سامنے روتی ہو۔''

''ناراض تو مت ہو۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''میں ناراض نہیں ہو رہی۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ تم سے کوئی ناراض نہیں ہو سکتا۔'' رضیہ ٹھنڈی پڑ گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''میرا خیال ہے نہ ہی بتاؤ۔''

''وجہ بتاؤ گی؟''

''جیسے مجھے اور اماں کو تمہاری بات کا یقین نہیں آیا تھا' ویسے ہی وہ بھی یقین نہیں کریں گے۔ سمجھیں گے کہ تمہارے دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہو گئی ہے۔ پھر کیا فائدہ بتانے کا؟''

''تمہیں یقین کیوں نہیں ہے' میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ جھلا اٹھی۔

''مجھے یقین ہے بابا صرف اس لیے کہ تم یہ بات کہہ رہی ہو' ورنہ یہ بات میری عقل سے باہر ہے کہ حویلی میں اتنی پاک بی بی کی روح کیوں منڈلاتی پھر رہی ہے کیوں کہتی ہے زیب النساء سے بھاگ جانے کے لیے؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''یوں بھی تم کس منہ سے ان سے کہو گی کہ ان کی پھوپھو کی روح زیب النساء کو حویلی سے

بھاگ جانے کے لیے کہتی ہے کیا اپنی بہن کے متعلق وہ ایسی بات برداشت کر سکیں گے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اور یہ بھی سوچو کہ شاہ صاحب ولایت سے انگریزی تعلیم لے کر آئے ہیں' جو لوگ انگریزی تعلیم لیتے ہیں' وہ جن بھوت اور روح' بدروح والی باتوں کو نہیں مانتے۔ وہ سمجھیں گے کہ تم پاگل ہو گئی ہو' جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔''

''پھر کیا کہوں ان سے کہ حویلی میں کیا ہوا تھا؟''

''کسی ترکیب سے ٹال دینا انہیں۔''

''بہت مشکل ہوگا یہ کرنا۔''

''خود کو پاگل کہلوانے سے بہتر ہے کہ بات ٹال دو۔'' رضیہ بولی۔

زرینہ چند ثانیے خاموش رہی پھر بولی۔ ''لیکن میں اُن سے کہہ دوں گی کہ میں حویلی بھی نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا کہہ دینا' لیکن اب سونے دو' اتنی سخت نیند آ رہی ہے۔'' رضیہ نے کروٹ بدل لی۔

زرینہ' شاہ جی کے خیالوں میں گم ہو گئی۔ کل کی متوقع ملاقات کا اسے اتنی بے چینی سے انتظار تھا۔ کہ وہ لمحہ لمحہ گن گن کر گزار رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت پر لگا کر اُڑ جائے اور وہ شاہ جی کے روبرو پہنچ جائے۔ پھر وہ ہو' شاہ جی ہوں اور گنگناتا ہوا رہٹ ہو۔

ساری رات اس نے سوتے جاگتے میں گزاری تھی۔

صبح کو ابھی ابا جی مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ وہ بستر سے اتر آئی' ورنہ ہمیشہ وہ اذان کے ساتھ جاگا کرتی تھی۔

''بہت جلدی آنکھ کھل گئی آج۔'' ابا جی نے اسے دیکھا تو بولے۔

''بس نیند نہیں آ رہی تھی' سوچا کیا ایسے ہی بستر پر پڑی رہوں گی' اس لیے اٹھ گئی۔'' وہ حمام کھول کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

''کچھ دن اور آرام کرو اچھی طرح' اس طرح تھک کر پھر بیمار نہ پڑ جانا۔''

''نہیں ابا جی! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ انہیں تسلی اور یقین دلانے کی غرض سے ہنس کر بولی۔ ''بالکل پہلے کی طرح اچھل کود سکتی ہوں۔''

ابا جی مسکرا کر مسجد میں چلے گئے۔ وہ جلدی سے اندر آئی اور ٹرنک کھول کر دھانی رنگ کا جوڑا نکال لیا۔ ٹرنک کے کھٹنے' کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز پر رضیہ کسمسا گئی۔

''کیا صبح صبح کھڑ کھڑ لگائی ہوئی ہے۔'' وہ غنودگی کے عالم میں بولی۔

''اب اٹھ جاؤ' اذان ہونے ہی والی ہے۔'' زرینہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

رضیہ نے ان سنی کر کے کروٹ بدل لی۔

زرینہ کو جانے کی اتنی جلدی تھی کہ جلدی جلدی کوئلے دہکا کر بڑی سی بھاری استری میں ڈالے اور کپڑے استری کرنے لگی۔

''یہ اتنی صبح صبح کہاں کی تیاری ہے؟'' اماں نے اسے کپڑے استری کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''آج ہفتہ ہے ناں' خالہ کبریٰ کے گھر نہیں جانا کیا؟''

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ تمہارے ابا جی منع کر گئے ہیں۔'' اماں نے کہا۔

''منع کر گئے ہیں' لیکن کیوں؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''آگے ہی خاندان والے کمبخت طرح طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں خود تمہاری خالہ بھی ہر آئے گئے کے سامنے رونا رو رہی ہیں کہ صفدر کی وجہ سے تم بیمار پڑی ہو۔''

''لیکن اماں میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا تو ان باتوں کو اور ہوا ملے گی' سب یہی سمجھیں گے کہ جو بات پھیلی ہے وہ درست ہے۔'' اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تمہارے ابا تم سے بہتر سمجھتے ہیں' ہم چپ رہیں گے تو کوئی کب تک بولے گا۔ خود ہی سب خاموش ہو جائیں گے لیکن تم وہاں گئیں تو سب کے ہاتھ پھر سے یہ نیا موضوع آ جائے گا۔ ہم نہیں...... کہیں اور جانے سے نہیں روکتے بس وہاں مت جاؤ۔''

''اماں ایک مرتبہ' آخری مرتبہ بھی نہیں؟'' اس نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

''کرنا کیا ہے تمہیں وہاں جا کر؟ تمہیں بھی تمہاری خالہ یہی دکھڑا سنانے بیٹھ جائیں گی۔ بس ہم سے جس قدر ہو سکتا تھا ہم نے ان کے ساتھ کیا۔ تمہاری شادی ہو جائے' بات پکی ہو جائے تو شوق سے جانا وہاں پر۔ اس سے پہلے میں ان کی خیر خیریت پتا کر کے آتی رہوں گی۔ تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اماں نے حتمی لہجے میں بحث ختم کر دی۔

وہ کپڑے اور استری چھوڑ کر وہیں چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔ شاہ جی کی خاطر انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی خاطر ہی تو اس نے اپنا آپ سنبھالا تھا۔ انہی سے ملاقات نہ ہو پائی تو کیا فائدہ؟

''اب کیا ہوگا؟'' یہ وہ سوال تھا جو اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

☆======☆======☆

کتنی دیر گزر گئی تھی اسے برگد تلے بیٹھ کر گوری کا انتظار کرتے ہوئے لیکن دھول سے اٹا وہ کچا راستہ پہلے کی طرح ویران تھا۔ حیدر علی شاہ نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بجنے ہی والے تھے۔

''وہ بیمار ہے کیسے آ سکتی ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''پتا نہیں کیا ہوا اسے اور کتنی بیمار ہے وہ۔ کوئی راستہ بھی تو نہیں مل رہا اس سے ملنے کا۔ نہ معلوم میری غیر حاضری میں یہ سب کیا ہوا۔ اتنا غیر متوقع ملاپ اور اس قدر اچانک جدائی۔''

ایک مرتبہ پھر وہ اس کچے راستے کی طرف بڑھا جس پر صبح سے وہ کتنے ہی چکر لگا چکا تھا لیکن بے سود۔ اس مرتبہ کے چکر میں صرف اتنا ہوا کہ ایک گلہری پھدک کر اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سے دوسری سمت کے پودوں میں گم ہوگئی۔

کوئی پریشانی سی پریشانی تھی۔ ایک ہی تو راہ تھی گوری سے ملنے کی' وہ بھی بند ہوئی جا رہی تھی۔ سب سے زیادہ فکر تو اسے گوری کی بیماری کی تھی۔ ایسا کیا ہوگیا تھا اسے کہ وہ چارپائی سے ہی لگ کر رہ گئی تھی۔ خدا معلوم کتنا یاد کرتی ہوگی وہ اسے۔

اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ تو ہفتے کے روز صبح صبح وہاں آ جاتی تھی اور اس کے بعد وہاں آنا بھی مشکل تھا۔ خالہ کبریٰ کی طرف وہ جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے واپس نیاز پور کی طرف چل پڑا۔

خالہ کبریٰ کے لیے یہ انکشاف بم دھما کا ثابت ہوا تھا کہ وہ پیر صاحب کا منجھلا بیٹا ہے۔ اسے بعد میں خود پر غصہ بھی آیا تھا اور افسوس بھی ہوا تھا کہ وقتی جذبے اور غصے کے زیر اثر اس نے انہیں اپنا اصل روپ اور اپنی محبت بتا دی تھی۔ پھر انہیں تسلی دینے اور سمجھانے میں کتنا وقت لگ گیا تھا۔ انہوں نے تو اعلان کر دیا تھا کہ وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گی۔ اور اللہ میاں جو سزا دے گا سو الگ۔

کتنی مشکل سے اس نے انہیں سمجھایا تھا کہ اللہ میاں انہیں کچھ نہیں کہے گا اور ساتھ ہی ساتھ منتیں بھی کی تھیں کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھیں۔ گوری سے محبت کی تشہیر اسے گوارا نہیں تھی۔ خالہ کبریٰ نے اپنے گناہوں کا درجہ کم کرنے کی خاطر اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گی لیکن حیدر علی شاہ نے ان کے اس وعدے سے زیادہ امید باندھنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی خالہ کے اندر اس وقت تک کلبلاتی رہتی ہے جب تک وہ اسے کسی کے گوش گزار نہ کر دیں۔ صرف یہ بات اسے کچھ حوصلہ دے رہی تھی کہ خالہ کبریٰ اس کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہ کرنے پر بہت پشیمان تھیں اور اب ہر طرح سے اسے خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف تھیں' پھر کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا ناں کہ کب ان کے منہ سے بات نکل جائے۔

حویلی پہنچ کر اس نے زیب النساء کے کمرے کا رخ کیا۔

"ان سے کم از کم دل کا حال تو کہا جا سکتا ہے۔" اس نے سوچا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ زیب النساء کے کمرے میں اس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ہوا علی؟ بہت چپ چپ لگ رہے ہو؟" زیب النساء نے اس کا جائزہ لیا۔

"بہت دن ہو گئے گوری سے ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ بولا۔ "سنا ہے وہ سخت بیمار ہے۔"

"اوہو...... کیا ہوا اسے؟"

"پتا نہیں۔ میں تو یہاں تھا نہیں' بس مجھے اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت شدید بیمار ہے۔ سمجھ نہیں آتا آپی کے اسے ہو کیا گیا ہے۔ بالکل ٹھیک تو تھی وہ جب میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔"

"فکر کیوں کرتے ہو' بیماری تندرستی سبھی کچھ انسان کی جان کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ۔"

"میں فکر نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں' اسے ذرہ بھر بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تو اس سے محبت کیوں کی تھی؟" زیب النساء نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ نہیں سمجھا۔

"تمہاری محبت سے اسے تکلیف کے سوا کیا ملے گا علی؟" وہ بولی۔ "تمہاری منگنی طے ہو چکی ہے۔"

"میں اس منگنی کو نہیں مانتا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اور میں باقی سب سے بھی یہ بات منوا کر رہوں گا۔"

"فرض کرو سب نے تمہاری بات مان لی تب بھی کیا ہوگا؟" وہ بھی تیزی سے بولی۔ "یہی ناں کہ تم اس سے شادی کر کے اسے اس عالیشان پنجرے میں قید کر دو گے۔ یہ محبت ہوتی ہے علی کہ اپنے پیاروں کے پَر کاٹ دیئے جائیں؟ انہیں جیتے جی ان قبر جیسے کمروں میں بند کر دیا جائے؟ نہیں علی محبت اسے نہیں کہتے۔ یہ زیادتی ہے جو تم زرینہ کے ساتھ کر رہے ہو۔"

"نہیں زیبی آپی! میری بیوی ویسے نہیں رہے گی۔ جیسے اس خاندان کی اور بہوئیں رہتی ہیں۔ اگر میں نے بھی یہی حرکتیں شروع کر دیں تو میری اس اعلیٰ تعلیم کا کیا فائدہ؟ میں اس پر روشنی' ہوا رنگ اور زندگی کے دروازے بند نہیں کروں گا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کس حد تک درست ہوں اور بابا جان اور ان کی روایتیں کس حد تک لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ میری عقل اور میری تعلیم مجھے کون سا راستہ دکھا رہی ہے اور میں اسی راستے پر چلوں گا۔"

"چل سکو گے؟" زیب النساء کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

"اتنا کم ہمت نہیں ہوں۔"

"تو پھر علی تم زرینہ کو کہیں دور لے جاؤ۔ بہت دور۔ اتنی دور کہ اس پر اور تمہاری آنے والی اولاد پر اس حویلی اور اس کے مکینوں کا سایہ بھی نہ پڑے۔ یہ حویلی ان لوگوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے جن کے دل میں جینے کی امنگ ہو۔ جو ہنسی خوشی زندگی گزارنا چاہتے ہوں۔" وہ ہولے سے بولی۔ "بس اتنا ذہن نشین کر لو علی کہ یہاں رہتے ہوئے نہ تم گوری تک پہنچ پاؤ گے اور نہ وہ تم تک۔ ان دیواروں میں راستہ نہیں بن سکتا یہ بہت مضبوط ہیں۔ ہاں اگر ہمت ہو تو انہیں پھلانگ جاؤ۔"

"کبھی میں سوچتا ہوں آپی۔" وہ قدرے توقف سے بولا۔ "کہ ہم سب کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بسر بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ لگتا ہے درحقیقت یہ ہماری زندگی نہیں ہے' اسے ہم نے بابا جان سے ادھار لے رکھا ہے اور وہ ہم سے اس زندگی کے لمحے لمحے کا سود وصول کر رہے ہیں۔ ہر حکم' ہر فیصلہ ان کا ہے۔ جیسے ہم انسان نہ ہوں کوئی کٹھ پتلی یا کسی مداری کے بندر ہوں۔"

زیب النساء اس کی بات سن کر ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو علی۔" وہ بولی۔ "تم جو اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اپنے حقوق کے لیے لڑ سکتے ہو۔ اونچی آواز میں ہی سہی بابا جان کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہو۔ تم جو بلا روک ٹوک اس حویلی سے اندر باہر جا سکتے ہو۔ کہیں بھی جا سکتے ہو۔ تمہیں تو یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں بہت کچھ میسر ہے۔"

چند ثانیے تک وہ زیب النساء کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ "آپی میں نے اپنے لیے تو لڑنا شروع بھی نہیں کیا میں تو آپ کے اور بڑی آپا کے لیے لڑ رہا ہوں۔ آواز بلند کر رہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی۔" اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "تمہارے چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ نہ تو ان دروازوں میں کوئی درز نمودار ہوگی اور نہ ہی ان دیواروں میں دراڑیں پڑیں گی۔ ہاں تم اپنا مرتبہ کھو دو گے۔ اس لیے علی مت کرو ایسا۔"

زیب النساء کے پاس بیٹھ کر دل کا بوجھ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ اتنی ساری الجھنیں' اتنی ساری پریشانیاں اکٹھی ہو گئی تھیں اور ان پریشانیوں کی ڈوری اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھا' گوری تھی' زیبی آپی اور بڑی آپا تھیں اور وہ فوزیہ بھی تھی جو نہ جانے کب اور کیسے اس کی منگیتر بن گئی تھی۔ پھر ماں جی بھی تھیں جو یقیناً بھائی کی بیٹی کو بہو کی صورت میں اس حویلی کی دہلیز پر لانا چاہتی ہوں گی۔ نہ وہ گوری کو دکھ میں مبتلا کر سکتا تھا اور نہ ہی ماں جی اور دونوں بہنوں کو......

یہی سب سوچتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھنے سے قبل ہی وہ جان چکا تھا۔ اس طرح اس کے کندھے پر صرف رجب علی ہی ہاتھ رکھ سکتا تھا۔

"بھائی جان آپ؟"

"بھئی کہاں گم ہو تم۔" وہ بولا۔ بھائیوں سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں حاکمانہ پن کی سختی نہیں رہتی تھی۔ "صبح سے ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔" وہ اسے لے کر بڑے کمرے میں آ گیا۔

"میں زیبی آپی کے پاس تھا۔ اس سے پہلے باہر گیا ہوا تھا۔ کہیے آپ کو کوئی کام ہے؟"

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

"کیا اب بہرِ ملاقات کسی تقریب کا اہتمام کرنا پڑے گا۔" رجب علی نے ٹانگ پر ٹانگ

رکھ لی۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی کام ہو تو آپ حکم کریں۔"

"کوئی کام نہیں۔ بس ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔" اس نے پائپ میں ایمفورا کا تمباکو بھر کر اسے سلگایا۔ "اس ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے ہماری اتنی ملاقات نہیں ہوتی جتنی پہلے الگ الگ شہروں میں رہنے کے باوجود ہو جاتی تھی۔"

"مصروفیت ہی کچھ اس نوعیت کی تھی۔ جب میں لاہور گیا تھا تو آپ یہاں تھے اور جب آپ وہاں گئے تو میں یہاں آ گیا۔"

"بابا جان سے آج صبح میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں تم سے بہت شکوے ہیں آج کل۔"

"میں جانتا ہوں لیکن ان کے شکوے اور شکایتیں دور کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

"ینگ مین۔ ایسی چھوٹی چھوٹی سی باتوں کو اپنے دل پر مت لیا کرو۔ بابا جان زیادہ دن تک تم سے ناراض نہیں رہ سکتے۔" اس نے پائپ کا کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑا۔ "تم بھی علی اور ان کی گفتگو میں غور طلب نکتے مت شامل کیا کرو۔"

"میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بات انہوں نے شروع کی تھی۔"

"بات یہ ہے علی کہ ہر جگہ رہنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ زندگی گزارنے کا کوئی ایک کلیہ نہیں ہوتا جسے ہر جگہ استعمال کیا جا سکے۔ زندگی گزارنے کا طریقہ جگہ اور ماحول کے ساتھ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ یہاں نائٹ کلب کھول دیں۔" وہ جھلا گیا۔ "میں نے تو ان کی ایک ایسی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا وجود ہر جگہ ہے۔"

"میں نے پہلے ہی کلیئر کر دیا تھا علی کہ آئندہ اپنی گفتگو میں یہ نکتہ مت لانا۔" رجب علی کے لہجہ میں تنبیہہ تھی۔

"آپ کے ساتھ بھی یہ بات میں نے نہیں شروع کی لیکن اب اگر گفتگو کا یہ رخ آ ہی گیا ہے تو صرف ایک مرتبہ میری بات سن لیں۔ بابا جان کے گدی نشین کی حیثیت سے نہیں' میرے بڑے بھائی بن کر۔"

رجب علی مسکرایا۔ "کہو لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میں قائل نہیں ہوں گا۔"

"تو پھر کہنے کا فائدہ؟" وہ لحظہ بہ لحظہ مزید جھنجھلا رہا تھا۔

"کہہ دو۔ اس طرح کتھارسس ہو جائے گا۔" رجب علی ویسے ہی اطمینان سے پائپ سے کش لگاتے ہوئے بولا۔

"میرا کتھارسس تو ہو جائے گا کیونکہ آپ لوگ میرا چیخنا اور چلانا برداشت کر لیں گے لیکن

مجھ سے زیادہ فرسٹریشن تو بہنوں کو ہوگی جو کسی صورت کتھارسس بھی نہیں کر سکتیں۔ جو نہ چیخ سکتی ہیں اور نہ چلا سکتی ہیں۔ بس اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہیں۔ آپ لوگ ان کے لیے زندگی کو اتنا بوجھل کیوں بنا رہے ہیں۔ نہیں اٹھا سکیں گی وہ اس زندگی کا بوجھ اور کسی دن اچانک ہی تھک کر گر جائیں گی۔'' اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ''آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ جس چیز کی ضرورت ہمیں ہے' اس کی ضرورت انہیں نہیں ہے' جن خوشیوں سے ہم اپنے گھروں کو آباد دیکھنا چاہتے ہیں کیا ان خوشیوں کی خواہش انہیں نہیں ہوگی؟ اوہ گاڈ! میں سمجھ نہیں پا رہا کہ کس زبان میں گفتگو کر کے آپ لوگوں تک اپنے دل کی بات پہنچا سکتا ہوں۔''

''دینے کو تو میں بھی بہت سی دلیلیں دے سکتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہم تو بریڈنگ سے قبل گھوڑے کا بھی شجرہ دیکھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ نسل کا بھی ہے یا نہیں۔

اگر وہ نسل دار ہے تو Byerly Arabian اور Darley Arabian میں سے کس گھوڑے کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر ہم اپنے اصطبل کا اتنا خیال رکھتے ہیں تو یہ تو پھر ہماری حویلی ہے اور اس کا تعلق ہماری نسل کے خالص رہنے سے ہے۔ اس کا خیال تو ہمیں اپنی جان پر کھیل کر رکھنا پڑے تو یہ بھی کر گزرنا چاہیے۔ لیکن علی! میں اس وقت تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ آج میں تم سے خوشگوار موڈ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جانتا ہوں میں آپ کی دلیلیں' لیکن پلیز انسانوں اور گھوڑوں کو ایک صف میں شامل مت کریں۔ بہت سی دلیلیں تو میں بابا جان سے بھی سن چکا ہوں۔ انہوں نے بھی بہت سی بے جان دلیلوں کا سہارا لیا تھا مجھے قائل کرنے کے لیے۔ وہ تو یہاں تک بھی کہہ چکے ہیں کہ اس گدی کے کسی بھی وارث کی کوئی بھی بیٹی کبھی بیاہی نہیں گئی کیونکہ یہ اس گدی کی شان کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ پیر گھرانے کی بے عزتی سمجھی جاتی ہے کہ ان کی بیٹی کسی کمتر گھرانے میں جائے۔''

''کہتے تو ٹھیک ہیں بابا جان!''

''تو میرے متعلق کیا حکم ہے؟ میں جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا' جسے بچپن میں آپ نے گود میں اٹھایا' کھلایا۔ جس کی ذرا سی تکلیف کو آپ نے اپنی تکلیف سمجھا۔ کیا کل میں اتنا کمتر ہو جاؤں گا کہ آپ کی بیٹی کی میرے گھر میں شادی آپ کی سبکی بن جائے؟ میں اتنا غیر ہو جاؤں گا کہ آپ کی بیٹی کو اپنی بہو نہ بنا سکوں؟ میرے بیٹے سے آپ کی بیٹی کی شادی آپ کے گھرانے کی انسلٹ ہوگی کیا؟''

پوری گفتگو میں پہلی مرتبہ رجب علی کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت نظر آئی۔

''اپنے خون کے رشتے کے حوالے سے میں یہ حق رکھتا ہوں کہ آپ سے اپنے ان سوالوں کا جواب طلب کر سکوں۔''

''تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ تم کمتر ہو جاؤ گے۔'' اس نے حیدر علی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ

رکھ کر محبت سے کہا۔ ''بھائی تو بھائیوں کی طاقت ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ایک دوسرے سے ہی قائم رہتا ہے۔ پھر کبھی یہ بات مت کرنا۔ بھتیجے اور بھتیجیاں سگی اولاد سے کم نہیں ہوتے لیکن مہر النساء اور زیب النساء کے لیے چچا جان کے گھر میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ رہ گئی تمہاری بات تو یقین کرو کہ اگر میری کوئی بیٹی ہوئی اور تمہارا کوئی بیٹا ہوا تو میں کسی قسم کی تاخیر کے بغیر اپنی بیٹی کو تمہاری بہو بنا دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسا ہی رشتہ سخاوت کے ساتھ جوڑا جا سکا تو اس کے ساتھ بھی جوڑ دوں گا۔ اب خوش ہو؟''

''میرا دل مت رکھیں۔ جو وعدہ انسان پورا نہ کر سکے اسے شروع میں ہی نہیں کرنا چاہیے۔''

''تمہارا یہ بھائی آج تک کبھی اپنی کہی ہوئی بات سے پھرا ہے؟'' رجب علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''میں آپ کو جھٹلا نہیں رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ابھی آپ بابا جان کی گدی پر نہیں بیٹھے۔ یہ بات اگر آپ نے اس دن دہرا دی جس دن آپ بیٹھے' تب میں اس کا یقین کروں گا۔''

''اوہ' تم تو بہت شاکی لگ رہے ہو۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''لیکن میں اپنے الفاظ نبھانا جانتا ہوں۔ بھئی میں تو کہتا ہوں کہ جس دن میری بیٹی پیدا ہوئی اسی دن تم اسے اپنے گھر لے جانا۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔''

حیدر علی بھی مسکرا دیا۔ ''گویا میرے ہونے والے بیٹے کی آپ کی ہونے والی بیٹی سے منگنی ہوگئی۔''

''بالکل ہوگئی۔ کہو تو سب کا منہ بھی میٹھا کروا دوں؟''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے کہہ دیا' یہی کافی ہے۔''

''اپنے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی نہ کروا دوں؟'' رجب علی بولا۔

حیدر علی پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ''فی الحال میری شادی کو رہنے دیں۔''

''خیریت تو ہے۔ ایسی شکل انسان کی تب بنتی ہے جب اسے عشق کا بخار ہوا ہو۔'' رجب علی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

حیدر علی سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو بتا دوں یا نہیں۔'' اس نے سچ سچ کہہ دیا۔

''کہہ دو۔ مجھے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو بتانے سے کچھ فائدہ بھی ہوگا یا نہیں۔''

''اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔'' رجب علی نے کہا۔ ''لیکن پھر وہی بات۔

تمہارا کتھارسس ہو جائے گا۔''

''مجھے واقعی محبت ہوگئی ہے۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ محبت بھی نہیں جنوں خیز عشق کہیں۔''

''آں۔'' وہ مسکرایا۔ ''کس سے؟''

''گوری سے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''ہوں۔ سچ مچ کا عشق ہے یا محض وقت گزاری؟''

''میں نے کہا ناں کہ جنوں خیز عشق ہے۔ محض وقت گزاری نہیں ہے۔''

''بہت خوبصورت ہے کیا وہ؟''

''خوبصورت لفظ اس کے حُسن کو بیان کرنے کے لیے بہت چھوٹا ہے لیکن میں نے محض حسین ہونے کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا۔ اس میں ایک عجیب سی کشش ہے میں بیان نہیں کر سکتا اس کشش کو۔''

''پھر مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اب جب میں گوری کے عشق میں گھٹنوں گھٹنوں غرق ہو چکا ہوں تو پتا چلا ہے کہ بابا جان میرا رشتہ کہیں اور طے کر چکے ہیں۔''

''ہاں مجھے بتایا تھا بابا جان نے صرف رشتہ طے نہیں ہوا باقاعدہ منگنی ہوئی ہے۔'' اس نے پائپ منہ میں ڈال لیا۔

''آپ کو بتایا تھا؟ کب؟ اور مجھے کیوں نہیں بتایا جس کی منگنی ہوئی ہے۔''

''ایزی۔ ایزی۔'' رجب علی بولا۔ ''تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''آپ تو بتا سکتے تھے؟ سب کو پتا تھا اس بات کا سوائے میرے۔''

''کیا ہو جاتا بتانے سے؟ پتا تو تمہیں اب بھی چل ہی گیا ہے۔''

''بہت کچھ ہوتا۔ کم از کم گوری تو اس کا شکار نہ ہوتی اور تب میں بھی اس کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھتا۔''

''نہیں علی! تم پھر بھی اسے دیکھتے۔ جن میں کشش ہوتی ہے وہ لوگ دیکھنے اور پھر دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تم تب بھی کچھ نہ کر سکتے۔ محبت پلاننگ کے ساتھ نہیں کی جاتی۔''

''اب تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ ہولے سے بولا۔ ''ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔''

''یعنی وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟''

''اس کی محبت تو سمندر سے زیادہ گہری اور آسمان کی وسعتوں سے بھی زیادہ بیکراں ہے۔ اس کے مقابلے میں میری محبت شاید کچھ کم ہی ہو۔''

''دیکھو علی، یوں بھی ہوتا ہے کہ لڑکیاں دولت کے پیچھے آنے کے لیے محبتوں کو سیڑھی بناتی ہیں۔''

''ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں لڑکیاں لیکن وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ تو اتنی معصوم اور بھولی ہے کہ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔'' پھر قدرے توقف سے وہ بولا۔ ''میں بہت پریشان ہوں۔ آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔''

''تم کیسی مدد چاہتے ہو؟''

''ظاہر ہے، میں گوری کو پانا چاہتا ہوں۔''

''بہت آسان بات ہے۔ دوسری شادی کر لو اس سے۔'' رجب علی نے اطمینان سے کہا۔

''دوسری شادی؟ میرا دو شادیاں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسا مجھے ہی گوارا نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی میں گوری کے علاوہ کسی کو بھی شامل نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری بات یہ کہ میں جانتا ہوں کہ گوری کی موجودگی میں، میں کسی اور سے انصاف نہیں کر سکوں گا۔''

''اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ فوزیہ تمہاری منگ ہے تمہارے ساتھ منسوب ہوئی ہے وہ۔ تمہارا نام اس کے نام کا حصہ بن چکا ہے۔ تمہارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ تم جانتے ہو اس معاملے پر تو خون بہہ جاتے ہیں یہاں۔''

''بھائی جان میں کسی کا خون نہیں بہانا چاہتا۔ میں نے آپ کو یہ بات بتائی ہی اس لیے ہے کہ آپ میری مدد کریں۔''

''کچھ چیزیں ایسی ہیں علی جو میرے اختیار میں نہیں ہیں جس طرح بیوی عزت ہوتی ہے اسی طرح منگیتر بھی عزت ہوتی ہے۔ تمہاری محبت اپنی جگہ لیکن اب فوزیہ اس گھر اور اس حویلی کی عزت ہے۔ بہو ہے وہ، بھابی ہے۔ اسے عزت سے اس حویلی میں لانا ہی ہوگا۔ منگنی کے دن سے ہی اس کا تعلق اپنے ماں باپ کے گھر سے ختم ہو کر اس گھر سے جڑ گیا ہے۔ جس دن سے تم دونوں کی منگنی ہوئی ہے اس دن سے اس نے اپنے ماں باپ کے گھر کا ہاتھ کا ایک تار بھی نہیں پہنا۔ اس گھر کے اناج کا ایک دانہ نہیں کھایا۔ وہ اب ان کی نہیں ہماری عزت ہے اور اس حویلی کی عزت مٹی میں ملنے سے پہلے ہمیں خود مٹی میں مل جانا چاہیے۔ اسے اس گھر میں لے آؤ۔ اس کے بعد تم آزاد ہو۔ چاہو تو اگلے ہی دن گوری سے شادی کرلو۔ عدل انصاف کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہاری بیوی ہوگی۔ اسے ایسے ہی رہنا ہوگا جیسے تم چاہو گے۔ اس کا اس حویلی میں آ جانا ضروری ہے اور بس۔ اس سے اور تم اسے نہیں دو گے تو بھی تم سے پُرسش کی جرأت کوئی نہیں کر سکے گا۔ بعد میں چاہے تم اپنا تمام پیار، ساری محبت گوری کو دے دو لیکن پہلے فوزیہ کو یہاں لے آؤ۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کسی عورت پر ظلم کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے

نفی میں سر ہلایا۔

''اس میں ظلم کی کیا بات ہے۔فوزیہ کو محبت دینے کی ضرورت نہیں ہے اور گوری کو اولاد۔ حساب خود ہی برابر ہے۔''

''کیا؟'' اس نے حیرت سے رجب علی شاہ کی جانب دیکھا۔''آپ کا مطلب ہے کہ......''

''میرا مطلب بہت سادہ ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔''اولاد صرف خاندان کی عورت سے اور جائیداد خاندان میں۔''

''یعنی مجھ سے شادی کی صورت میں گوری کو اولاد کی پیدائش کے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ایسا ہوا کرتا ہے۔اور میرا خیال ہے کہ تمہاری گوری واقعی تم سے محبت کرتی ہے تو اسے اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔باقی جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے تو اسے یہاں ہر طرح کی آسائش ملے گی۔جو منہ سے مانگے گی وہ اس کے سامنے ڈھیر کر دیا جائے گا۔سونا' چاندی' زیور' کپڑے' ہر چیز۔''

''بھائی جان! مجھے شادی کرنی ہے سودا نہیں۔''

''تم نے مجھ سے مدد مانگی تھی۔اور میں نے تمہیں اس صورتِ حال سے نمٹنے کا واحد حل بتا دیا۔بابا جان تو یہ بھی پسند نہیں کریں گے کہ تم اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلو لیکن اس مسئلے کو میں سنبھال لوں گا۔مجھے پتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کیسے قائل کرنا ہے۔اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکوں گا تمہارے لیے۔''

''مشورہ اور اس حد تک مدد دینے کا شکریہ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

مسہری پر نیم دراز سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک دے کر سخاوت اندر داخل ہوا۔

''علی بھائی! آپ تو ملتے ہی نہیں ہیں۔'' اس نے اندر آتے ہی شکوہ کیا۔

''گویا سب کو مجھ سے یہ شکایت ہے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کوئی ایسی ویسی۔مجھے تو بہت سخت شکایت ہے آپ سے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آل رائٹ۔تم شکایت کردو میں سن رہا ہوں۔'' وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

''آپ کا وقت یقیناً بہت قیمتی ہے لیکن میرے لیے اس کی قیمت تھوڑی سی کم کردیں۔''

''[illegible] تو وقت تم لے لو لیکن اس طرح مجھ سے ناراض مت ہو۔'' وہ مسکرا کر سخاوت کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' سخاوت خوش ہو گیا۔''میں آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔''

''کس چیز کی؟''

''گھڑسواری کی۔سنا ہے آپ بڑے زبردست قسم کے شہسوار ہیں۔میں بھی دیکھوں کہ اس تعریف میں کس قدر سچ ہے۔''

''شہسوار نہیں صرف گھڑسوار ہوں۔وہ بھی بس عام سا اتنا زبردست بالکل نہیں ہوں جتنا تم نے کہا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''یہ میں نے نہیں کہا۔بھائی جان سمیت سب ہی کہتے ہیں۔''

''بھائی تو بھائیوں کی تعریف یوں بھی بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں۔تم بھائی جان کی تعریف کو سنجیدگی سے مت لو۔''

''خیر! یہ تو کل پتا چل ہی جائے گا۔اگر آپ کل صبح سویرے جاگ گئے۔''

''تمہارا شکوہ دور کرنے کے لیے جاگنا تو پڑے گا ہی۔''

''میں نے بھائی جان کو بھی دعوت دی ہے۔وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔'' سخاوت نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔''

''آپ کون کون سے کھیل کھیلتے ہیں گھوڑوں سے متعلق؟ مجھے تو صرف سادہ گھڑسواری ہی آتی ہے۔جس قدر تیز ممکن ہو سکے گھوڑا دوڑا سکتا ہوں لیکن باقی کھیلوں کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی۔بابا جان چاہتے ہیں کہ میں اور کھیل بھی کھیلوں لیکن یہاں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس سے میں سیکھنا پسند کروں۔''

''کیا سیکھنا ہے؟ میں سکھا دوں گا۔''

''جو کچھ آپ کو آتا ہے' وہ سب سکھا دیں۔'' سخاوت جلدی سے بولا۔

''میں پولو کھیل لیتا ہوں۔Tent Pegging بھی مجھے بہت پسند ہے۔ایک جنوبی امریکہ کا کھیل ہے Pats وہ بھی کھیل لیتا ہوں۔Steeple Chase یعنی رکاوٹوں والی ریس بھی میری پسندیدہ ہے۔وہاں انگلینڈ میں تو میں نے Hunt Club (شکاری کلب) بھی جوائن کر رکھا تھا۔''

''بس علی بھائی یہ سب باری باری سکھا دیں۔'' وہ جوش سے بولا۔

''تیار رہو لیکن ایک بات ہے کہ میں بہت سخت ٹریننگ دیتا ہوں۔'' حیدر علی مسکرایا۔

''کوئی پروا نہیں ہے۔میں بھی سخت تربیت ہی لینا چاہتا ہوں۔'' سخاوت اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اب چلتا ہوں لیکن کل صبح کا پروگرام یاد رکھنا۔''

☆======☆======☆

صبح سویرے حسبِ معمول کسرت سے فارغ ہوتے ہی اچھو راجہ کے پاس چلا آیا۔

''کیسا ہے میرا یار؟'' اس نے راجہ کی گردن تھپتھپائی۔

راجہ نے ہنہنا کر اسے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔

''بھوک تو تمہیں لگی ہوگی لیکن کھانا کھانے سے پہلے نہانا دھونا بہت ضروری ہوتا ہے۔'' اچھو نے اپنی شلوار کے پائنچے چڑھا لیے اور راجہ کو کھریرا کرنے لگا۔ ''اب مستی بالکل نہیں چلے گی۔ آرام سے صاف ستھرا ہو کر پھر ناشتہ کرنا۔'' وہ حسبِ معمول اس سے باتیں کرنے لگا۔ ''گھوڑا صاف ستھرا ہو تو شوز یادہ پڑتی ہے۔ کبھی دیکھے ہیں فضلو اور رشیدے کے گھوڑے۔ قریب سے ناک بند کر کے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے گھوڑے کی طرف کوئی نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ ساری شوشا ماری جاتی ہے۔ گھوڑے کو تو کسی جرنیل کی طرح ہونا چاہیے۔ قدم زمین پر پڑیں تو دشمن کا کلیجہ بھی ہل جائے۔ گردن یوں تنی ہوئی جیسے ابھی ابھی دشمن کی فوج کو کاٹ کر آ رہا ہو۔ قد کاٹھ ایسا کہ دیکھنے والے کی نظر نہ ٹکے اور نرمی ایسی کہ ہر ایک سے محبت سے پیش آئے۔ سوار کو اپنی پیٹھ پر ایسے بٹھائے جیسے پھول اپنے اوپر تتلی کو جگہ دیتا ہے۔ چلے تو یوں لگے جیسے ہوا میں تیر رہا ہو۔''

راجہ یوں ہنہنایا جیسے اس کی تمام بات سمجھ گیا ہو۔

''شاباش میرے شیر۔ اب ذرا منہ کھولو تاکہ میں تمہارے دانت بھی صاف کر دوں۔ مجھے پتا ہے کہ گندے بچوں کی طرح تمہیں بھی دانت صاف کرانا پسند نہیں ہے لیکن دانت تو تمہیں صاف کرانے ہی ہوں گے۔'' باتوں کے ساتھ ساتھ وہ بڑے سے برش کی مدد سے اس کے دانت بھی صاف کرتا جا رہا تھا۔ ''بدتمیز بچوں اور جنگلی گھوڑوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے والدین سے تربیت کے سلسلے میں کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے اور انہوں نے اپنی اولاد پر توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے تمہارے میلے دانت دیکھ لیے تو لوگ کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ میں تم پر توجہ نہیں دیتا۔ تم سے محبت نہیں کرتا۔ بری بھلی تو سب مجھے سننا پڑے گی ناں۔ تمہیں اچھا لگے گا جب سب مجھ سے ایسی باتیں کریں گے؟ نہیں ناں؟ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ضد کیے بغیر دانت صاف کروا لیا کرو۔''

''اچھو۔'' اندر سے ماں کی آواز آئی۔

''کیا بات ہے۔'' وہ وہیں باہر سے چلایا۔

''کب تک اس کی ناز برداری کرے گا۔ اب آ جا اندر۔''

''بس آتا ہوں۔ اسے دانہ تو دے دوں۔''

''مت کر اب اس پر زیادہ خرچا۔'' منشی نے بھی اندر سے چلا کر کہا۔ ''واپس تو جانا ہی ہے اسے پھر اس پر پیسہ خرچ کرنے کا فائدہ؟''

''کوئی مائی کا لال ہاتھ تو لگائے میرے راجہ کو۔ ہاتھ توڑ کر بھجوا دوں گا واپس۔'' اسے غصہ آ گیا۔ ''اور ابا آپ جیسی بے مروتی دیکھی نہ سنی۔ کتنا ساتھ دیا ہے راجہ نے ہمارا۔ سلیم کی پڑھائی کا خرچا اسی نے اٹھا رکھا ہے ورنہ میں پوچھتا کیسے اسے شہر بھیجتے۔ اب اور کچھ نہیں تو اس بے چارے کے دانے پر تو نظر نہ رکھیں۔ کتنا کھا جائے گا یہ غریب۔''

اس نے پیار سے راجہ کے سر پر ہاتھ پھیرا جو ناند میں منہ گھسائے ان کی باتوں سے بے پروا دانہ کھانے میں مصروف تھا۔

''میں بتا رہا ہوں تجھے آج خود ہی اسے حویلی واپس لے جانا۔'' منشی اپنا تہبند سنبھالتا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر باہر نکلا۔ ''بڑے شاہ صاحب کو دوبارہ نہ کہنا پڑے۔''

اچھو نے ایک نظر باپ کی طرف دیکھا اور پھر راجہ کو دانہ کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''کچھ سنا ہے یا نہیں؟''

''آپ کی طرف والے کان سے سن بھی لیا ہے اور دوسری طرف والے کان سے نکال بھی دیا ہے۔''

''ایسا جھانپڑ دوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔''

''مجھے جتنا چاہیں مار لیں لیکن میرے راجہ کو کچھ نہ کہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اب تم دونوں چونچ ہی لڑاتے رہو گے یا اندر بھی آؤ گے۔'' ماں بھی باہر نکل آئیں۔ ''چلو اندر چلو دونوں۔''

''ابا کو اندر لے جائیں ماں۔ ورنہ بول بول کر میرے راجہ کا بھی سکون برباد کریں گے۔ مجال ہے ایک دن بھی اسے ڈھنگ سے دانہ کھانے دیا ہو۔''

''بڑا آیا راجہ کا باپ۔'' منشی کو تاؤ آ گیا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے اس دو کوڑی کے جانور کے دانے پر نظر رکھنے کی۔''

''دیکھیں ابا۔ اسے دو کوڑی کا جانور نہ کہیں۔''

''تھا تو نہیں یہ دو کوڑی کا جانور پر جب سے تیرے پاس آیا ہے ناں تب سے دو کوڑی کا ہو گیا ہے۔ آج سورج چڑھتے ہی یہ حویلی میں واپس کر کے آنا ہے۔''

''اماں! ابا کو منع کریں۔ بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہے ہیں۔ کسی مائی کے لال میں ہمت ہے تو آ کر لے جائے۔ جو آگے بڑھے گا اسے ایسا دھوبی پٹڑا دوں گا کہ اٹھنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''تو کسی کو کیا دھوبی پٹڑا دے گا۔ اس سے پہلے ہی تیری چمڑی الگ نہ کر لی تو کہنا۔''

''اب بس بھی کرو گے یا نہیں۔'' ماں کو غصہ آ گیا۔ ''صبح صبح انسان اللہ رسول کا نام لیتا ہے لیکن یہاں تم دونوں کی چیخ چیخ شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے تو سوکنیں بھی نہیں لڑتیں۔ جیسے تم باپ

بیٹا آپس میں لڑتے ہو۔"

"میں کب لڑتا ہوں' یہ ابا کی زبان میں ہی کھجلی ہوتی رہتی ہے۔"

"میری زبان میں ہی نہیں ہاتھ میں بھی کھجلی ہوتی ہے۔" منشی نے اس کے سیاہ بالوں سے بھرے ہوئے سر پر اپنے ہڈیوں بھرے ہاتھ سے چپت رسید کی۔

"دیکھ لیا ماں۔" وہ چلایا۔ "قسم سے ابا یہ ہاتھ کسی اور نے اٹھایا ہوتا تو توڑ کر رکھ دیتا ابھی۔"

"تم باز نہیں آؤ گے۔" ماں جھلا گئی۔ پھر پہلے اچھو کو گھر کے اندر دھکیلا اور پھر منشی کو بھی اندر گھسیٹ لائی۔

"اب کوئی بولا تو میں جھانپڑ لگاؤں گی۔ سمجھے تم دونوں۔" ماں نے انہیں گھورا۔

"ایسی عورت پورے گاؤں میں نہیں ہوگی جو شوہر سے یہ بات کہے۔" منشی بڑبڑایا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے ماں کیونکہ میں فالتو بولنا پسند ہی نہیں کرتا۔ ذرا ابا کی طرف دھیان رکھنا۔ یہ جنگ بندی کی پروا نہیں کرتے۔" اچھو چارپائی پر بیٹھ گیا۔

منشی بھی اسی چارپائی پر اس کی پشت کی جانب پشت کر کے بیٹھ گیا۔ "مجھے باؤلے کتے نے نہیں کاٹا کہ خواہ مخواہ میں اس سے لڑتا پھروں۔ اچھا ہے اس کی بھیڑی شکل نظر ہی نہیں آئے گی تو دل بھی نہیں جلے گا۔"

"بس ماں دیکھ لیا۔" وہ چلایا اور پھر منشی کی جانب مڑا۔ "سارا گاؤں کہتا ہے کہ میری شکل...... آپ پر گئی ہے۔"

"اپنے کرتوت چہرے پر آ جاتے ہیں کمبخت۔ تیری بھیڑی شکل تیرے اپنے کرموں کا صلہ ہے۔ شکل ملنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"میں نے کیا برائی کی ہے ابا؟"

"تُو چپ نہیں رہ سکتا اچھو۔" ماں پراٹھا توے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا چپ ہوگا اس نے تو قبر میں بھی فرشتوں کے ساتھ جھگڑا کرنا ہے۔" منشی کب چپ ہونے والا تھا۔

اچھو غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"کہاں جا رہا ہے اچھو؟" ماں چلائی۔

"میرا میٹر پھرنے لگا ہے ماں۔ میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔" وہ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا۔

"پراٹھا تو کھاتا جا۔"

"ابا کو کھلا دیں تاکہ زیادہ طاقت سے مجھ پر حملہ آور ہو سکیں۔" وہ راجہ کی طرف بڑھتے

ہوئے چلایا۔

اسے آتا دیکھ کر راجہ ہنہنانے لگا۔

"چل میرے یار سیر کو چلتے ہیں۔" اس نے راجہ پر زین کسی۔ "یہاں تو مجھے کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ ایک تُو ہی ہے جس سے میں دل کی ہر بات کہہ سکتا ہوں۔ یہ ابا ہیں ناں' میری صورت کے ہی بیری ہیں۔ کہتے ہیں میری شکل بھیڑی ہے۔ تُو بتا میری شکل بھیڑی ہے کیا؟"

راجہ نے پھر ہنہنا کر اچھو سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اچھو نے پیار سے اس کی گردن سہلائی اور "بسم اللہ" کہہ کر اس کے اوپر بیٹھ گیا۔

صبح کی سپیدی ہر طرف پھیلنے لگی تھی۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ اس نے راجہ کو ہلکی سی ایڑھ دی اور وہ خوبصورت ڈلکی چال چلنے لگا۔ صبح کا یہ وقت اچھو کا پسندیدہ وقت ہوتا تھا جب وہ راجہ پر سوار ہو کر سیر کے لیے نکلتا تھا۔ سیر کی سیر ہو جاتی تھی اور سب کام پر جانے والوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔

☆=======☆=======☆

رجب علی' حیدر علی اور سخاوت علی صبح صبح گھڑسواری کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ تینوں بھائی Breeches میں ملبوس رائیڈنگ بوٹس پہنے اپنے اپنے گھوڑے کو کینٹر کراتے ہوئے باہر میدان میں آ گئے۔ میدان میں ان کے اصطبل کے اور گھوڑے بھی موجود تھے۔ سخاوت علی کی دعوت اپنی جگہ' رجب علی کا اپنا بھی خیال تھا کہ زمینوں اور جائیداد کے کاموں سے فراغت پاتے ہی اس طرف اپنی توجہ مبذول کر لے گا۔ اچھی گاڑی' اعلیٰ نسل کا کتا اور گھوڑا۔ جدید اسلحہ' پرانی شراب اور نیا شباب اس کی کمزوری تھی۔ یہ سب گھوڑے بھی اسی لیے کھیتوں سے باہر بڑے میدان میں جمع تھے کیونکہ اب اس کا ارادہ اپنے اصطبل کو بہترین بنانے کا تھا۔

میدان میں پہنچ کر وہ تینوں اپنے اپنے گھوڑے سے اتر آئے۔ وہاں کھڑے ملازمین نے گھوڑوں کی باگیں ان کے ہاتھ سے لے لیں۔

"مجھے معلوم نہیں تھا سخاوت کہ تم اتنی اچھی رائیڈنگ کرتے ہو۔" حیدر علی نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔

"ابھی آپ کو پتا کیا ہے جناب! کچھ ہی عرصے میں آپ کو پیچھے چھوڑ دوں گا۔"

"مجھے شدت سے اس دن کا انتظار رہے گا جس دن میرا چھوٹا بھائی مجھے اپنے سے پیچھے چھوڑ دے۔" حیدر علی ہنس پڑا۔

"ویسے علی بھائی گھڑسواری میں واقعی آپ کا جواب نہیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو پریکٹس کرتے بھی نہیں دیکھا۔ یہاں تو آپ صبح کو سوئے رہتے ہیں یا پھر باہر نکل جاتے ہیں۔"

"یہ تو میں یہاں آ کر کچھ سست ہو گیا ہوں اور کچھ اور چکروں میں پڑ گیا ہوں۔ وہاں

انگلینڈ میں، میں بہت باقاعدگی سے رائیڈنگ کیا کرتا تھا۔‘‘

’’ابھی تو تم نے اس کی رائیڈنگ دیکھی ہے، کبھی اس کی شو جمپنگ اور Tent Pegging دیکھنا۔‘‘ رجب علی نے کہا۔ ’’گھوڑے کو نوفٹ تک تو آسانی سے جمپ کرالیتا ہے اور Tent Pegging کرتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا کہ اس کے نیزے نے میخ نہ اکھاڑی ہو۔‘‘

’’میری کتنی خواہش ہے کہ Tent Pegging میں میرے مقابلے کا کوئی شخص نہ ہو۔‘‘ سخاوت بولا۔

’’تو آج سے ہی علی کی شاگردی میں چلے آؤ۔‘‘

باتیں کرتے ہوئے وہ تینوں میدان کے وسط میں کھڑے گھوڑوں کے پاس پہنچ گئے۔

’’مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے یہ گھوڑے دیکھتے ہوئے۔‘‘ رجب علی نے کہا۔ ’’ان میں سے کتنے گھوڑے تو ایسے ہیں جو میرے معیار سے بہت کم ہیں اور تربیت کسی کی بھی اچھی نہیں ہے۔‘‘

’’بابا جان کو تو گھوڑوں سے بس واجبی سی دلچسپی ہے انہیں جنون نہیں ہے گھوڑوں کا۔ یہ جو تھوڑا بہت اصطبل ہے یہ بھی میری وجہ سے ہی قائم ہے۔‘‘ سخاوت بولا۔ ’’سائیس بڈھا ہو چکا ہے۔ ٹھیک سے دیکھتا بھی نہیں ہے لیکن بابا جان اس لیے الگ نہیں کر رہے کہ وہ بہت پرانا ملازم ہے۔ باقی نوکر چاکر دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی کرنی چاہیے۔‘‘

’’سائیس۔‘‘ رجب علی نے اسے آواز دی۔

تھوڑے فاصلے پر کھڑا بڈھا سائیس ہاتھ باندھ کر اس کی جانب چلا آیا۔ اس کی نگاہیں اس چابک پر ٹکی ہوئی تھیں جو رجب علی نے دائیں ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ اخروٹ کی منقش لکڑی کے ہینڈل اور اس سے منسلک چمڑے کا کوڑا جو تہہ بہ تہہ جما کر اس نے پکڑا ہوا تھا۔ سائیس کی روح فنا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس سے قبل وہ اس بات کا عادی نہیں تھا۔ پیر صاحب نے سجاوٹ کے لیے پرانے ہتھیار اور کوڑے ضرور رکھے ہوئے تھے لیکن وہ انہیں ہاتھ میں پکڑ کر بات کرنے کے عادی نہیں تھے، پھر اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ رجب علی شاہ بہت سخت گیر ہے۔ اور کسی شخص کو رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہے اس لیے اس کے سامنے پہنچ کر وہ کچھ زیادہ ہی مؤدب اور فرض شناس دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

’’جی حضور۔‘‘ اس کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔

’’یہ کون ہیں؟‘‘ اس نے ہاتھ میں پکڑے چابک سے گھوڑوں کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

’’حضور یہ گھوڑے ہیں۔‘‘

’’گدھے۔‘‘ وہ دھاڑا۔ ’’تم نے انہیں اپنے سے بڑا گدھا بنا دیا ہے۔‘‘

’’ج جی...... جی حضور۔‘‘ وہ گھگھیایا۔

’’ہمیں اپنے اصطبل میں گدھے نہیں گھوڑے چاہئیں۔ سمجھے تم؟ ایسے گھوڑے جن کا خون ابل رہا ہو۔ جو نیزہ بازی کرتے ہوئے میخ کی طرف اسی طرح دوڑیں جیسے چیتا اپنے شکار کی طرف بڑھتا ہے۔ ہمیں یہ جھکے ہوئے سر والے گھوڑے نہیں چاہئیں۔‘‘

’’جی حضور۔ ایسے گھوڑے بھی ہیں جو اپنی کمر پر زین نہیں کسنے دیتے۔‘‘

’’ایڈیٹ۔ ہم گرم لہو والے گھوڑوں کی بات کر رہے ہیں جنگلی اور غیر مہذب گھوڑوں کی نہیں۔‘‘

’’جی سرکار۔‘‘ وہ مزید بوکھلا گیا۔

’’ابھی ہم تم سے کہیں کہ ان میں سے رائیڈنگ اور پولو کے گھوڑے الگ کرو تو تم وہ بھی نہیں کر سکو گے۔ تمہیں تو مہذب اور غیر مہذب گھوڑے کے درمیان فرق کا بھی نہیں پتا۔ احمق بڈھے، کسی اصطبل میں جنگلی گھوڑے کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہاں کا سائیس تم جیسا گدھا ہے۔‘‘

’’حضور عربی گھوڑوں کو سدھانا آسان کام نہیں ہے لیکن میں پوری کوشش کرتا ہوں۔‘‘ اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

’’ایڈیٹ۔ عربی گھوڑے سب سے زیادہ آسانی سے سدھائے جا سکتے ہیں۔‘‘ پھر وہ حیدر علی کی جانب مڑا۔ ’’ذرا اس احمق کی طرف دیکھو۔ یہ کہتا ہے کہ عربی گھوڑے نہیں سدھا سکتا۔‘‘ وہ دوبارہ سائیس کی جانب متوجہ ہوا۔ ’’عربی گھوڑا سدھائے جانے کے لیے سب سے زیادہ آمادہ رہتا ہے اور سب سے زیادہ عقلمند بھی ہوتا ہے۔ جو سائیس ایسے گھوڑے کو نہ سدھا سکے اسے چلے جانا چاہیے۔ شکورے!‘‘ اس نے ملازموں کے درمیان کھڑے شکورے کو آواز دی۔ ’’اس بڈھے کو اس کے گھر کا راستہ دکھا دو۔ اور تم۔‘‘ اس نے ایک اور ملازم کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

’’جی سرکار۔‘‘ فرض شناسی کے اظہار کے لیے وہ دوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔

’’یہ جو ریوڑ اس ایڈیٹ نے جمع کر رکھا ہے، اس میں سب سے بدمعاش گھوڑے پر زین کسو۔‘‘

اس کا یہ حکم سنتے ہی تمام ملازمین میں ہلچل مچ گئی۔ سخاوت نے زوردار قہقہہ لگایا۔

’’انہیں ایسے ہی کسی ڈنڈے کی ضرورت تھی۔ یہ قوم ڈنڈے کے بل پر ہی کام کر سکتی ہے۔ ہمارے بابا جان کی نرم خوئی سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔‘‘ وہ ان کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ’’ویسے بھائی جان کیا آپ کا ارادہ واقعی کسی سرکش گھوڑے پر سواری کرنے کا ہے؟‘‘

''کسی سرکش کو سدھانا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ میں اپنے سامنے کسی کی اکڑ اور سرکشی برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ اکڑ اور سرکشی کسی جانور کی ہو یا انسان کی۔''

''یہ جو ہمارا ایور گریٹ ہے ناں۔'' سخاوت نے گھوڑے کی جانب اشارہ کیا جسے تین ملازمین نے سنبھالا ہوا تھا اور چوتھا اس پر زین ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''یہ یہاں کا سب سے سرکش گھوڑا ہے۔''

حیدر علی نے ایک نظر سفید رنگ کے قد آور گھوڑے کی سمت دیکھا جو خود پر زین کسوانے کے لیے کسی طور آمادہ نہیں تھا۔ پھر سخاوت کو مخاطب کیا۔

''جانتے ہو یہ کس نسل کا گھوڑا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کسی قدر شرمندہ ہو کر کہا۔

''یہ Through Bred ہے اس نسل کے گھوڑے باقی ہر نسل سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ نسل عربی اور برطانوی گھوڑوں کے ملاپ سے وجود میں آئی ہے۔ یورپ میں جو گھوڑے جنگوں میں استعمال ہوتے تھے وہ بھاری بھرکم ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ یورپی جنگجو سر سے پیر تک زرہ بکتر اور بھاری ہتھیاروں سے لیس ہوتے تھے اور اتنا بوجھ بھاری بھرکم گھوڑے ہی اٹھا سکتے تھے۔ دوسری طرف عرب میں زرہ بکتر وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ عرب لوگ تو لڑائی کے دوران بعض اوقات گھوڑے پر زین بھی نہیں کسا کرتے تھے اس لیے ان کے گھوڑے قد میں چھوٹے اور بے حد پھرتیلے ہوا کرتے تھے۔ عرب میں گھوڑے کو گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا تھا اور گھر کے فرد کی طرح ہی برتاؤ بھی کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کے گھوڑے حساس اور عقلمند ہوتے تھے۔

یورپ کے لوگوں نے عربی اور یورپی گھوڑوں کی خصوصیات اکٹھا کرنے کے لیے یہ مخلوط نسل پیدا کروائی۔ اس نسل کے گھوڑے یورپی گھوڑے کی طرح قد آور اور عربی گھوڑوں کی طرح پھرتیلے حساس اور عقلمند ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر نسل تین گھوڑوں سے وجود میں آئی ہے جو سولہویں صدی میں عرب سے برطانیہ برآمد کیے گئے تھے اور ان گھوڑوں کے نام ہیں۔

Godophin arab, Byerly arabian, Daley arab.

''علی بھائی آپ کو تو بہت معلومات ہیں گھوڑوں کے بارے میں۔'' سخاوت نے رشک سے اس کی جانب دیکھا۔

''جو چیز انسان استعمال کرتا ہے اس کے بارے میں اسے اتنی معلومات ضرور ہونی چاہئیں۔'' پھر وہ رجب علی سے مخاطب ہوا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس گھوڑے ایور گریٹ پر سواری کرنا چاہوں گا۔''

رجب علی کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ حیدر علی اس سے کہیں بہتر گھڑ سوار تھا لیکن گھوڑا سرکشی پر آمادہ تھا اور حیدر علی کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

''نہیں علی۔''

''پلیز بھائی جان یہ آپ کے مرتبے اور شان کے خلاف ہے یہ مجھ سے بے قابو ہو گیا تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر آپ اسے سنبھال نہ سکے تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

رجب علی مسکرا دیا۔ ''مانا کہ میں تم سے بہتر گھڑ سوار نہیں ہوں لیکن اتنا کمزور بھی نہیں ہوں۔''

''چھوڑیں بھائی جان! علی بھائی کو شوق پورا کر لینے دیں۔ میں بھی دیکھوں ان کی تعریفوں میں کس حد تک صداقت ہے۔'' سخاوت نے جلدی سے کہا۔

''بس بھائی جان فیصلہ ہو گیا کہ سواری میں کروں گا۔'' حیدر علی بولا۔ پھر وہ سخاوت سے مخاطب ہوا۔ ''تم وہاں جا کر زین ڈالنے کا منظر دیکھو۔''

سخاوت سمجھ گیا کہ وہ اسے وہاں سے تھوڑی دور بھیجنا چاہتا ہے۔ تاکہ رجب علی سے علیحدگی میں بات کر سکے اس لیے ایور گریٹ کی طرف چلا آیا۔

''آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔'' سخاوت کے دور جانے کے بعد اس نے رجب علی کو مخاطب کیا۔

''کہو۔''

''آپ کو سائیس کو یوں نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔'' وہ بولا۔ ''یوں اچھا نہیں لگتا۔ مانا کہ وہ رائج الوقت معیار کے حساب سے ہم سے کمتر ہے لیکن بہرحال بوڑھا ہے۔ ہمیں اس کے سفید بالوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔''

''تم تو ابا جان سے بھی زیادہ نرم خو ہو۔ ایک بہت پتے کی بات آج ذہن نشین کر لو۔ حکمرانی کا پہلا اصول سخت گیری ہے۔ یہ سائیس جو تمہارے سامنے گھگھیا رہا تھا' اس کی وجہ کوئی رائج الوقت معیار نہیں' یہ چابک تھا۔'' اس نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا جس میں اس نے چابک تھام رکھا تھا۔ ''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان کا سد باب کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ کوئی تمہارے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو سکے' اس شخص کی ٹانگیں ہی کاٹ دو۔''

''علی بھائی۔'' سخاوت نے اسے پکارا۔ ''گھوڑا تیار ہے۔''

حیدر علی گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔

ایور گریٹ' سفید رنگ کا وہ قد آور گھوڑا واقعی بہت سرکش تھا۔ پہلے تو اس نے حیدر علی کی اپنی کمر پر بیٹھنے کی کوشش ناکام بنانے کی جدوجہد کی لیکن جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور علی اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا تو اس نے اپنی پچھلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر کک ماری اور پھر وقفے وقفے سے مارتا ہی چلا گیا۔ حیدر علی بھی اس کی پشت کے ساتھ جما ہوا تھا۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر ایور

گریٹ الف ہوگیا پھر بھی حیدر علی کو اپنی پشت سے نہ گرا سکا۔

اس کے بعد حیدر علی نے اسے بھگانا شروع کیا اور کچھ دیر اس کی سواری کرنے کے بعد اتر آیا۔

''مان گئے آپ کو علی بھائی۔'' سخاوت کی خوشی دیدنی تھی۔

ابھی وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ رجب علی کی نگاہ کچے راستے پر پڑی جہاں ڈلکی چال چلتے ہوئے ایک قد آور مشکی گھوڑا نمودار ہوا تھا جس کی پشت پر گاؤں کا ایک جوان سوار تھا۔

''واؤ۔'' اس کے منہ سے سیٹی بجانے والے انداز میں نکلا۔ ''بلیک بیوٹی۔''

ابھی وہ اس کی جانب دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی گھڑونچی اٹھائے موڑ سے سامنے اس کچے راستے پر نکل آئی۔ اس کے خدوخال بہت بہت واضح تو نہیں تھے لیکن اس کی چال میں جوانی کی شوخی اور بانکپن تھا۔

لڑکی کے قریب پہنچ کر گھڑ سوار رک گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ بات چیت کے دوران لڑکی قہقہہ مار کر ہنسی بھی۔ اس کے ہنسنے کی مدھم سی آواز رجب علی کے کانوں میں بھی پڑی۔ پھر لڑکی اپنی راہ پر چل دی اور گھڑ سوار اپنی۔

''شکورے۔'' رجب علی نے آواز دی۔

''جی سرکار۔'' وہ دوڑا آیا۔

رجب علی نے مڑ کر باقی سب کا جائزہ لیا۔ حیدر علی اور سخاوت مختلف گھوڑوں اور ان کی تربیت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ جبکہ باقی ملازمین ان کے گرد مستعد کھڑے تھے۔

وہ مطمئن ہو کر شکورے سے مخاطب ہوا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

''حضور۔ یہاں کے نائی کی بیٹی ہے۔ ہے تو نائی کی بیٹی لیکن بہت مغرور ہے۔ نسیم نام ہے اس کا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ حالانکہ گاؤں میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکیاں موجود ہیں۔ پھر بھی سب سے زیادہ آہیں اسی کے پیچھے بھری جاتی ہیں۔ اچھا بھلا ڈانٹ کر رکھ دیتی ہے سب کو اس لیے بہت سے لڑکے تو اسے دیکھ کر ہی گھبرا جاتے ہیں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ رجب علی کو ایسی باتوں میں تمام تر تفصیل درکار ہوتی ہے۔ ''بس ایک اچھو ہی ہے جس سے اچھی طرح ملتی ہے۔''

''اس سے اچھی طرح کیوں ملتی ہے؟''

''وہ پہلوان آدمی ہے' لڑکیوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سارا گاؤں اسے شریف سمجھتا ہے اس لیے اس سے اچھی طرح مل لیتی ہے۔''

''اور وہ گھوڑا کس کا ہے؟''

''یہ اچھو کا ہی ہے سرکار۔ منشی مغل دین کا بیٹا..... اسے یہ گھوڑا پیر صاحب کی سرکار

سے عنایت ہوا تھا۔''

''بابا جان نے ایسا عمدہ گھوڑا اسے دے دیا۔ اس کے پائے کا کوئی گھوڑا تو ہمارے پورے اصطبل میں نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''بہرحال آج دوپہر تک یہ گھوڑا اصطبل میں اور رات تک یہ لڑکی ڈیرے پر ہونی چاہیے۔'' وہ بھائیوں کی جانب مڑ گیا۔

☆======☆======☆

جی ٹی (GT) روڈ سے نور محمد کے مہمانوں کو اس کے گھر چھوڑ کر اچھو دوپہر کے کھانے کے لیے گھر کی جانب تانگہ بڑھا رہا تھا۔ جب شکورا رجب علی کے ایک اور ملازم کے ساتھ راستے کے درمیان آ گیا اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''کیا بات ہے؟'' اچھو نے باگیں کھینچ لیں۔ ''خیر تو ہے؟''

''خیر ہی ہے۔'' شکورا چند قدم آگے بڑھ آیا۔

''گھر چلنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''ویسے تو ماں کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی لیکن چلو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

''تانگے سے اترو۔'' اس نے اچھو کی فراخدلانہ پیش کش یکسر نظرانداز کر دی۔

''خیر تو ہے شکورے۔'' وہ نیچے اتر آیا۔ ''گھر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔''

''کہاناں سب خیر ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں راجہ کو لینے آیا ہوں۔''

''راجہ کو لینے آیا ہے؟'' اچھو کے کان کھڑے ہو گئے۔

''ہاں بڑے شاہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ دوپہر تک راجہ کو ان کے اصطبل میں ہونا چاہیے۔''

''اچھا آ آ۔'' اس نے اچھا کو کافی لمبا کھینچا' پھر ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ''تو شاہ صاحب نے راجہ کو منگوایا ہے۔''

''ہاں۔'' اس کے جارحانہ انداز کو دیکھ کر شکورے نے بھی سینہ پھلا لیا۔

''تو ان سے کہنا کہ اس کام کے لیے تجھ جیسے مریل چوہے کے بجائے کسی جوان مرد کو بھیجیں جو مجھ سے راجہ کو چھین کر لے جا سکے' کیونکہ میں اپنا راجہ کسی کو نہیں دینے کا۔''

وہ دوبارہ تانگے پر جا بیٹھا۔

''چل اتر نیچے۔'' شکورا غصے سے چلایا۔ ''شاہ صاحب کی حکم عدولی کرتا ہے؟''

''ہمت ہے تو لے جا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔''

شکورے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ملازم کی طرف غصے سے دیکھا۔ جو چپ چاپ کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا' اور اپنی خودی بلند کرنے کی کوشش کی۔

''گھوڑا کھول دو۔''

''نہ نہ مت کھولنا' ورنہ بہت پٹے گا میرے ہاتھوں۔'' اچھو نے اسے تنبیہ کی۔

گاؤں کا بچہ بچہ اچھو کی شہ روزی کو جانتا تھا' ملازم تذبذب میں مبتلا تھا کہ کیا کرے' اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر شکورا خود ہی آگے بڑھا' لیکن جونہی اس نے راجہ کی گردن پر ہاتھ رکھا' اچھو نے نیچے چھلانگ لگا کر اسے گردن سے دبوچ کر پیچھے کھینچا اور پھر ان دونوں پر پل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سوجے چہروں کے ساتھ رجب علی شاہ کے سامنے کھڑے تھے۔

''گویا تم دونوں جوانمردی دکھا کر آ گئے۔'' وہ اندر سے غصے سے کھول رہا تھا لیکن بظاہر پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ ''لیکن ہمیں حیرت ہے کہ اسے ہمارے حکم سے سرتابی کی مجال کیسے ہوئی۔''

''سرکار گھوڑے کو تو اس نے اپنی اولاد کی طرح رکھا ہوا ہے۔'' شکورا دبے دبے انداز میں بولا۔

''ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' وہ دھاڑا۔ ''ہمیں صرف اس بات سے غرض ہے کہ وہ گھوڑا حویلی کے اصطبل میں ہونا چاہیے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ملازموں کا وہ ریوڑ جو ہم نے اس کام کے لیے بھرتی کیا ہوا ہے' وہ بھیڑیئے کی کھال میں بھیڑیں ہیں۔ جو ایک گھوڑا نہیں لا سکے' وہ بھی ایک کمی کمین منشی کے بیٹے سے۔ دفع ہو جاؤ اور منشی کو میرے پاس بھیجو۔''

''جی سرکار۔'' وہ الٹے پاؤں پیچھے مڑے۔

منشی فضل دین رجب علی کے سامنے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا' گو کہ ابھی تک اسے اچھو والے واقعے کی خبر نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس ملاقات سے خائف تھا۔ رجب علی ملازمین سے خاصا سختی کا برتاؤ کرتا تھا اور ملازمین کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ حتیٰ المقدور اس کی نظروں سے بچے رہیں۔

''جی حضور۔'' اس کے سامنے پہنچ کر منشی نے عاجزانہ انداز میں ہاتھ باندھے۔

''تمہارے بیٹے نے اب تک گھوڑا کیوں نہیں لوٹایا؟'' اس نے پائپ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''حضور! میں اسے کہہ آیا تھا۔ آج نور محمد کے مہمانوں کو اس کے گھر چھوڑ کر وہ گھوڑا حویلی میں دیتا جائے گا۔'' منشی نے جلدی سے جھوٹ گھڑا۔

''بہت بدمعاش ہے تمہارا بیٹا؟'' رجب علی دھاڑا۔

''جی نہیں' جی ہاں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''ہم اس کی ساری اکڑ نکال دیں گے' سمجھے؟''

''جی حضور!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شکورے۔'' رجب علی نے پکارا۔

''جی سرکار۔'' دروازے کے ساتھ کھڑا شکورا جلدی سے آگے بڑھا۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے منشی کو شکورے کے سوجے ہوئے چہرے کی طرف متوجہ کیا۔ ''اس کا یہ حال تمہارے بیٹے نے کیا ہے۔''

''حضور غلطی ہو گئی' معاف کر دیں۔'' منشی نے جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''آئندہ کبھی ایسا نہیں ہو گا۔''

''یہ اس کی پہلی بے وقوفی ہے' اس لیے معاف کر رہے ہیں' لیکن اسے بتا دو کہ تیسری بے وقوفی کرنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے گا' اس کے بعد کسی بے وقوفی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کا دل زیادہ مچلے تو ایک کوشش کر دیکھے۔''

''نہیں حضور ایسا نہیں ہو گا۔'' منشی گڑگڑایا۔

''آئندہ ہمارے خاص آدمیوں پر ہاتھ اٹھانا تو درکنار اس نے آنکھ بھی اٹھائی تو ہم اس کی آنکھیں نکلوا دیں گے' اور چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے سمجھے؟'' اس کی آواز بتدریج اونچی ہوتے ہوئے کافی بلند ہو گئی تھی۔

''جی حضور!'' وہ اب بھی اس کے پاؤں پکڑے ہوئے تھا۔

رجب علی نے پاؤں جھٹک کر اسے پرے کیا اور بولا۔ ''ابھی اور اسی وقت جاؤ اور اپنے بیٹے کو ہمارے سامنے پیش کرو۔''

''جی حضور!'' وہ الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

''اور تم شکورے!'' اس نے غصے سے اسے گھورا۔ ''یہ تمہاری بھی پہلی حماقت ہے کہ تم چہرے پر ناکامی سجائے ہمارے سامنے آ گئے ہو' دوبارہ ایسی حماقت نہ ہو' ورنہ تم بھی تیسری حماقت کی حسرت لیے مٹی تلے چلے جاؤ گے' ہم ناکام ہو جانے والے کو پہلے سزا دیتے ہیں' حکم عدولی کرنے والے کو بعد میں۔''

''حضور آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

''ہمارا دوسرا حکم یاد رکھنا۔ اس پر عملدرآمد میں ذرا سی کوتاہی ہوئی تو ہم تمہاری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔''

''حضور آپ فکر نہ کریں' لڑکی آپ کے آنے سے قبل ہی ڈیرے پر ہو گی۔''

☆======☆======☆

جس وقت منشی تیزی سے چلتے ہوئے گھر پہنچا اچھو راجہ کو دانا کھلا رہا تھا اور ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

''بڑے آئے تھے میرے راجہ کو لے جانے' ہاتھ نہیں لگانے دیا میں نے انہیں اور وہ شکورا سب سے زیادہ اچھل کود کر رہا تھا۔ اس کی ناک تو پسے ہوئے آلو جیسی کر دی ہے' ہفتہ بھر منہ چھپاتا

پھرے گا۔''

منشی کچھ دور کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔

یہ ایسے گھوڑا دینے پر راضی نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا۔ سختی کرنے سے کہیں شہر ہی نہ بھاگ جائے۔ کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ یہ گھوڑا بھی دے دے اور اسے زیادہ بک بک کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

جلد ہی منشی کے ذہن میں ترکیب آگئی اور وہ اچھو کے قریب چلا آیا۔

''تُو اب تک واپس کام پر نہیں گیا؟''

''ابا آپ؟'' اس نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ آپ حویلی میں ہوں گے۔''

''کام سے آیا تھا' ابھی واپس بھی جانا ہے۔ اچھا ہوا تُو اب تک گھر پر ہے۔ اب میری بوڑھی ہڈیوں میں جان نہیں رہی مجھے واپس حویلی چھوڑ دینا۔ پیدل چلنا مشکل لگتا ہے۔''

''ابا میں تو کہتا ہوں' اب آرام کریں۔ میں جو ہوں گھر کا خرچ چلانے کے لیے۔''

''کیا بات ہے آج تیرے منہ سے بہت پھول جھڑ رہے ہیں۔''

''میرے منہ سے تو پھول ہی جھڑتے ہیں۔ پتا نہیں آپ کو کیوں کانٹے لگتے ہیں۔''

''اچھا اب جلدی کر' مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''بس پانچ منٹ۔'' وہ گھوڑے کو تانگے میں جوتنے لگا۔

منشی اپنے خوبرو جوان بیٹے کی طرف دیکھے گیا' جس نے شکورے کا حشر برا کر دیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ شکورے کی اس پٹائی پر اس کی پیٹھ ٹھونکتا لیکن ابھی تو اس کے کانوں میں رجب علی شاہ کی آواز گونج رہی تھی۔

''اسے بتا دو کہ تیسری بے وقوفی کرنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کے بعد کسی اور بے وقوفی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کا دل زیادہ مچلے تو ایک کوشش کر دیکھے' آئندہ ہمارے خاص آدمیوں پر ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات اس نے آنکھ بھی اٹھائی تو ہم اس کی آنکھیں نکلوا دیں گے اور چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے۔''

''ابا جی تانگہ تیار ہے۔''

اچھو کی بات سن کر منشی چونک گیا۔ اور جلدی سے تانگے میں اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

گھوڑا گردن اٹھائے آہستہ آہستہ حویلی کی جانب رواں دواں تھا اور اچھو ہیر وارث شاہ گا رہا تھا۔

منشی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے تکے گیا۔ اچھو سے! اسے بے تحاشا محبت تھی' لیکن بہت انوکھی قسم کی۔ اس نے کبھی اس محبت کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ منشی ہونے کے

اسے پیر صاحب کے مزارعوں پر رعب جمانے کی ایسی عادت پڑی تھی کہ اب رعب جمائے بغیر اس کا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کے اس رعب داب کا شکار اچھو بھی ہوتا رہتا تھا۔

کیسا گھبرو جوان تھا اس کا بیٹا۔ اونچا لمبا' کسرتی جسم والا اس کے سیاہ گھنگھریالے بال ماتھے پر پڑے ہوئے تھے اور اپنے فولاد کی طرح مضبوط ہاتھوں میں گھوڑے کی لگامیں تھامے وہ ہر چیز سے بے خبر تھا۔

منشی نے اپنی ہی نظر لگ جانے کے خوف سے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

''کیا ہی اچھا ہو اب یہ شادی کے لیے راضی ہو جائے۔ پیر صاحب سے کہہ کر چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے اس کا۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''چاندسی بہو گھر میں آجائے تو کیسا اجالا ہو جائے ہر طرف۔ گھر میں بچوں کی ہنسی گونجے اور یہ بھی کچھ ذمہ دار ہو جائے۔ کتنے ہی لوگ اس کے رشتے پر نظر جمائے بیٹھے ہیں۔ شادی کرے تو اس کی ضدی طبیعت میں بھی کچھ ٹھہراؤ آجائے' ابھی تو دل دھڑکتا ہی رہتا ہے کہ کچھ کر نہ گزرے۔''

''ابا حویلی آگئی۔''

اچھو اسے خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لایا۔

''چل تُو بھی اتر۔'' منشی نیچے اترتے ہوئے بولا۔

''مجھے بڑی سڑک پر جانا ہے' گاڑی آنے والی ہوگی۔ نور محمد کے کچھ اور مہمانوں کو اس گاڑی سے آنا ہے۔ اس نے سختی سے تاکید کی تھی' کہ میں ٹھیک وقت پر سڑک تک پہنچ جاؤں۔''

''کم بخت یہاں تک آ گیا ہے تو کیا پیر صاحب کو سلام کیے بغیر چلا جائے گا۔''

''ابا! سلام اگلی دفعہ ہو جائے گا۔'' وہ اترنا نہیں چاہتا تھا۔

''اب بک بک نہ کر جلدی سے اتر' ورنہ کان سے پکڑ کر لے جاؤں گا۔''

وہ بادل نخواستہ اتر آیا۔

رجب علی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی اور سامنے میز پر چابک رکھا ہوا تھا۔

''سلام شاہ صاحب!'' رجب علی کو دیکھ کر وہ خائف ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے نظریں جھکا کر ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اسے آہستہ سے سلام کیا۔

''ہوں۔'' رجب علی نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔

''...ں یہ...... یہ ہے تمہارا بیٹا؟''

''جی حضور! آپ سے معافی مانگنے آیا۔''

''ابا!'' اچھو اس بات کے لیے تیار نہیں تھا' اس لیے باپ کے اچانک اس جھوٹ پر حیران ہو گیا۔

''قریب آ جاؤ۔'' رجب علی نے رعب دار آواز میں اسے حکم دیا۔

اچھو کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

''بہت غرور ہے اپنی اس جان پر؟'' اس نے اچھو کے چہرے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں اور اچھو کو یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ نظریں پتھر کی طرح اس کے چہرے میں پیوست ہوئی جا رہی ہیں۔

اس نے رجب علی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''بدمعاشی کرتے ہو گاؤں میں؟''

''نہیں سرکار میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ میں تو بس سارا دن اپنا گھوڑا تانگہ چلاتا ہوں' یا اکھاڑے میں چلا جاتا ہوں' میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

''تم نے ہماری حکم عدولی کی ہے۔ ہمارے خاص آدمی کو مارا پیٹا ہے' پھر بھی کہتے ہو کہ کچھ نہیں کیا۔''

''میں نے شکورے کو اس لیے مارا ہے کہ یہ میرے عزیز ترین راجہ کو لے جانے آیا تھا۔ راجہ میرا دوست' میرا بھائی' میرا بیٹا' میرا سب کچھ ہے۔ میں اپنا راجہ کسی کو نہیں دے سکتا۔''

''کسی کو نہیں دے سکتے۔'' رجب علی کے لہجے میں ٹھہراؤ اور آنکھوں میں غضب تھا۔

پھر پلک جھپکتے میں اس نے میز پر پڑا ہوا کوڑا اٹھایا اور اچھو کو رسید کر دیا۔

وہ اس ناگہانی افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا' جیسے کوئی سانپ لہراتا بل کھاتا ہوا اس کی جانب بڑھا چلا آیا ہے' جس کے جسم کو چھوتے ہی تیز آگ اس کے وجود میں بھرتی چلی گئی' اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ بلند ہوئی۔ اور پھر جسم پر پڑنے والے ہر کوڑے کے ساتھ اس کی چیخیں مزید بلند ہوتی گئیں۔ ہر بار کوڑا سانپ کی طرح لہراتا لہلہاتا اس کی جانب بڑھتا اور اس کی ہر ضرب اچھو کے بدن پر گہرے زخم کا نشان چھوڑ جاتی۔

برآمدے میں موجود تمام لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی کو بھی توقع نہ تھی' کہ رجب علی اس قسم کا اقدام کر گزرے گا۔ منشی فضل دین آنکھیں پھاڑے اسے اور اچھو پر مسلسل برستے کوڑوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اچھو کے حلق سے نکلنے والی چیخیں اس کا کلیجہ چیر رہی تھیں۔ یہ صورت حال اس کے لیے اتنی اچانک تھی کہ کتنی دیر تک وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ جب کچھ حواس بحال ہوئے تو دوڑ کر رجب علی کے قدموں میں گر گیا۔

''حضور! اسے معاف کر دیں' خدا کے واسطے بخش دیں اسے۔ آئندہ یہ ایسی گستاخی نہیں کرے گا۔'' وہ رجب علی کے پاؤں پر سر رکھ کے چلا رہا تھا۔ ''اس دفعہ معافی دے دیں سرکار' مجھ بوڑھے پر رحم کریں۔''

رجب علی نے ہاتھ روک دیا لیکن منشی اس کے قدموں پر سر ٹکائے ویسے ہی دہائی دے رہا

تھا۔ ''گھوڑا باہر کھڑا ہے سرکار ہم واپس کرنے ہی لائے تھے' ہمیں نہیں چاہیے' ہم کمی کمین کے پاس اس کا کیا کام۔ حضور اسے بخش دیں۔ یہ آئندہ آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔''

رجب علی نے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر سے منشی کو پرے کیا۔

''اپنے اس بیٹے کو لے کر دفع ہو جاؤ۔ ہمیں اس طرح کے سو گھوڑوں کی بھی پروا نہیں ہے لیکن حکم عدولی ہم کسی بھی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔''

اچھو زخمی حالت میں زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے لیکن جسم سے زیادہ اس کی روح پر تازیانے لگے تھے۔ آج تک گاؤں کا کوئی پہلوان اس کی پشت زمین سے نہیں لگا سکا تھا۔ وہ ہمیشہ سر اٹھا کر اور سینہ تان کر چلا کرتا تھا۔ ان لوگوں کو دو ہاتھ لگا کر وہ زمین چاٹنے پر مجبور کرتا تھا' آج انہی لوگوں کے سامنے بری طرح سے پٹ کر لاچاری اور بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

اسے نہ اپنے جسم سے مسلسل رستے ہوئے خون کی پروا تھی اور نہ ہی ان سے اٹھتی ہوئی درد کی لہروں کی' گھاؤ تو درحقیقت اس کی روح کو لگے تھے۔ جسمانی زخم تو بھر سکتے تھے' لیکن رجب علی نے اس کی روح پر جو تازیانے لگائے تھے' وہ کسی صورت بھر نہیں سکتے تھے۔ وہ بے بس تھا' لاچار تھا' غریب تھا۔ اس لیے اپنے زخموں کو دل میں دبائے ماتم کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے جسم پر پڑنے والے زخموں کا نہیں۔ بلکہ اپنی بے بسی' لاچاری اور غربت کا ماتم۔

اس کے دل میں رجب علی شاہ کے لیے نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر رجب علی کی ہڈیاں سرمہ کر دے' اس کے جسم کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالے۔ اس کی صورت مسخ کر دے' سب کو یہ باور کرا دے کہ پانسہ پلٹنے والا رجب علی کا زورِ بازو نہیں بلکہ اس کا کوڑا تھا۔ اگر رجب علی اپنے بازوؤں کی طاقت کے بل پر اس کے مقابل آیا ہوتا تو وہ کبھی بھی اس کی پشت زمین پر نہیں لگا سکتا تھا۔

لیکن اس کی روح اتنی گھائل ہو چکی تھی کہ اس کے اندر کے لاوے کو باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل سکا۔ اپنے اوپر اس کا مان ختم ہو چکا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اب چاہے وہ رجب علی کی ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالتا' اس کی بوٹیاں نوچ لیتا یا اس کا سر کسی بھاری پتھر سے کچل دیتا۔ اپنی بے عزتی کے لمحات کو اپنی کتابِ زندگی سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ ان لمحوں کو اس کے ساتھ رہنا تھا۔ ہمیشہ کے لیے اس کے دل و دماغ کے لیے ناسور بن کر۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں موند لیں' دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر آ گئے۔

''رجب علی شاہ یاد رکھنا' تُو نے میری روح کو گھائل کیا ہے۔ میں بھی تیری روح کو ہی گھاؤ لگاؤں گا۔ ایسا گھاؤ جو تیرے لیے ناسور بن جائے گا۔ تُو ہر کروٹ پر تڑپے گا' لیکن تجھے چین نہیں ملے گا۔ تُو نے مجھے میرے مان سے محروم کیا ہے خدا تعالیٰ تجھے تیرے مان سے محروم کر دے۔

ان شاءاللہ۔" اچھو کے دل کی ہر ایک دھڑکن سے رجب علی شاہ کے لیے بددعا نکلی تھی۔

"حضور! آئندہ کبھی حکم عدولی نہیں ہوگی' یہ نادان ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سکھی رکھے۔ آپ نے اسے معاف کر دیا۔" منشی' رجب علی کے پاؤں سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے اسے مسلسل دعائیں دے رہا تھا۔

پھر وہ تیزی سے اچھو کی طرف بڑھا اور اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کے کسرتی جسم کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ برآمدے میں ملازمین کی کافی بڑی تعداد موجود تھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی منشی کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اچھو نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا' جس کی موٹی سی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی اور جو اپنے ناتواں ہاتھوں سے اسے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ یہ عمر تھی جب اولاد باپ کا سہارا بنتی ہے' یہاں باپ اپنے بیٹے کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خود ہی آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ منشی نے سہارا دینے کی غرض سے اس کی کمر میں بازو ڈال دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ دونوں باہر کی جانب بڑھ گئے۔

بڑے پھاٹک سے نکلنے سے پہلے اچھو نے مڑ کر دیکھا۔ برآمدے میں ڈھیر سارے ملازمین کے درمیان رجب علی اور حیدر علی کھڑے تھے۔ رجب علی کی اس کی جانب پشت تھی۔ جبکہ حیدر علی اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"رجب علی میں خود سے کیے ہوئے وعدے کو نبھانے کے لیے زندہ رہوں گا۔" اس نے عزم کے ساتھ سوچا۔

☆======☆======☆

اماں نے خالہ کبریٰ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا' اور ملاقات کی جو رہی سہی امید تھی۔ وہ بھی دم توڑ گئی تھی۔ زرینہ بہت افسردہ تھی۔ رضیہ نے اسے یوں چپ چاپ تخت پر بیٹھے دیکھا تو لپے سے منہ ہاتھ پونچھتی اس کے پاس چلی آئی۔

"خیر تو ہے منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟"

رضیہ کی ہمدردی پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ رضیہ بھی اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

"اب کیا ہوا؟ کچھ تو کہو؟"

"جانتی تو ہو تم... میں کیا بتاؤں۔" اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر رضیہ کی جانب دیکھا۔

"ہوں۔" رضیہ نے گہرا سانس لیا۔

"میں مر جاؤں گی ان کے بغیر اتنے دن تک میں نے کل کا انتظار کیا تھا' لیکن کل آیا اور

گزر گیا' میری جھولی میں یہ چھوٹی سی خوشی ڈالے بغیر۔" آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

"خدا کے لیے زرینہ روؤ مت۔" رضیہ نے اس کے پاس بیٹھ کر دوپٹے کے پلو سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔ "اس طرح رونے سے کبھی مسئلے حل نہیں ہوتے۔ مجھے سوچنے دو کہ اب کیا کیا جائے۔"

"مجھے پتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا' میری تو قسمت ہی خراب ہے۔"

"کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ مجھ جیسی جاہل لڑکی یہ بات کرے تو کوئی حرج نہیں' لیکن کسی پڑھی لکھی لڑکی کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔" وہ بولی۔

"ایسا کرو رضیہ تم وہاں چلی جاؤ اور شاہ جی ملیں تو انہیں میرا پیغام دے دینا۔" زرینہ کو اچانک خیال آیا۔

"اماں نے تمہیں وہاں جانے سے منع کیا ہے تو کیا مجھے جانے دیں گی؟ نہیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"مجھے نہیں پتا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر مجھے شاہ جی نہ ملے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ رو پڑی۔

"میں نے کہا ہے ناں کہ میں کچھ سوچتی ہوں۔" رضیہ گھبرا گئی۔ زرینہ جیسی جذباتی لڑکی سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ یہ حماقت کر بھی گزرتی۔

کچھ دیر تک وہ اس مسئلے کا حل سوچتی رہی لیکن زرینہ کی سسکیاں بار بار اسے پریشان کر رہی تھیں۔

"اُف خدایا' تم خاموش ہوگی تو میں کچھ سوچ سکوں گی ناں۔" وہ جھنجھلا گئی۔

زرینہ نے شاکی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"دیکھو تم یونہی روتی رہیں تو میں کچھ نہیں سوچ سکوں گی۔" اس نے نرمی سے کہا۔

زرینہ بستر سے اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں زمین پر جا بیٹھی اور چہرہ گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کی اس حرکت نے رضیہ کو مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس نے اس کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ فائدہ بھی کیا تھا اس بات کا زرینہ نے مزید دھواں دھار رونا شروع کر دینا تھا۔

وہ اپنا ذہن اس طرف سے ہٹا کر یہ سوچنے لگی' کہ زرینہ کی چھوٹے شاہ صاحب سے ملاقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے' کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔

"زرینہ!" اس نے آواز دی۔

زرینہ نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''ایک ترکیب ذہن میں آئی تو ہے لیکن پھر ہمیں اس راز میں کسی اور کو بھی شریک کرنا ہو گا۔''

''ترکیب کیا ہے؟'' وہ جلدی سے رضیہ کے قریب آ بیٹھی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ کہیں اس سے کوئی نقصان نہ ہو۔'' وہ متذبذب تھی۔

''بتاؤ تو۔'' زرینہ کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''نقصان ہوسکتا ہے۔'' رضیہ نے زور دے کر کہا۔

''رضیہ میں ہر نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے شاہ جی مل جائیں۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آنکھوں میں پھر ڈھیر سارے آنسو اتر آئے۔

رضیہ کچھ دیر خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی' پھر اس نے اٹھ کر دروازے کے باہر کا جائزہ لیا۔ ابا جی مسجد ہی میں تھے اور اماں اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ واپس پلٹ آئی۔

''کہو ناں' کیا ترکیب ہے؟'' زرینہ نے اضطراب سے انگلیاں چٹخائیں۔

''حمیدہ کے متعلق کیا خیال ہے؟'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''حمیدہ؟ وہ کیا مدد کر سکتی ہے؟''

''کر سکتی ہے۔'' رضیہ بولی۔ ''اگر تم اسے اس راز میں شامل کر لو تو۔''

زرینہ سوچ میں پڑ گئی۔

''اس سے تمہاری خاصی دوستی ہے۔'' رضیہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور اس میں راز کو راز رکھنے کی صلاحیت بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے' اسے راز میں شامل کر لیا ہے پھر؟''

''پھر یہ کہ اسے مناسب ترامیم کے ساتھ ساری بات بتا دو اور اپنا موجودہ مسئلہ بھی۔ اور اس سے کہو کہ وہ شاہ جی سے کہے کہ اب دیر مت کریں اور جلد از جلد رشتے کی بات کریں۔'' رضیہ بولی۔ ''آخر روز ہی تو حمیدہ حویلی جاتی ہے اور پردہ بھی نہیں کرتی' دن میں سو موقعے مل جاتے ہیں ایسے کام کے لیے بس گھر کا بھیدی ہونا چاہیے۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔'' زرینہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میں حمیدہ کو کہہ دوں کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائے تو وہ مرتے دم تک کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دے گی لیکن رضیہ' شاہ جی کو میرے مسئلے کی خبر ہو بھی گئی تو کیا ہوا؟ ابھی رشتہ بھیجنا کسی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں اس رشتے کے لیے انہیں کیا لڑنا پڑے سب سے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ہم دونوں کہیں مل سکیں' میری آنکھیں ترس گئی ہیں ان کی صورت دیکھنے کے لیے۔''

''چاہے سب سے انہیں لڑنا پڑے یا جھگڑنا لیکن وہ تم سے شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس بات سے انکار کیا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ فوری طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں اور میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ اتنے عرصے تک ان سے نہ ملوں۔''

''تم ایسا کرو کہ......'' رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔

''میری سمجھ میں آ گیا۔'' زرینہ چہکی۔

''کیا؟''

''ایسا کرتی ہوں کہ میں حمیدہ کے ہاتھ شاہ جی کے نام خط بھجوا دیتی ہوں اور انہیں کہیں باہر ملنے کو کہتی ہوں۔''

''کہاں ملو گی؟''

''یہ سوچنا پڑے گا۔'' پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''پرانا کنواں ٹھیک رہے گا۔''

''کیا؟ پرانا کنواں؟ ایک تو وہ آسیب زدہ ہے اور پھر اس کے قریب کے کھیتوں میں تو دن بھر میلے کا سماں رہتا ہے۔''

''لیکن میں دن میں کب ملوں گی؟''

''تت......تو کیا رات کو؟'' رضیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

زرینہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو۔ جانتی نہیں ہو' وہ بھوت پریت کا مسکن ہے۔''

''پاگل تو تم ہو...... بھلا شاہ جی کی موجودگی میں کسی بھوت پریت کی کیا مجال ہے کہ وہ میرے قریب بھی آئے۔''

''زرینہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ رات کے وقت یوں گھر سے چوری چھپے نکلنا حماقت ہے۔'' رضیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تم کس طرح اکیلی وہاں تک جاؤ گی اور یہ تو سوچو کہ کسی کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟ قیامت آ جائے گی۔''

''شاہ جی کی جدائی سے بڑھ کر کیا قیامت ہوگی۔ میں تو قیامت سے گزر رہی ہوں۔ اب تو اس قیامت کو عبور کرنا ہی ہوگا۔ میں ساری زندگی جدائی کی آگ میں نہیں جل سکتی۔ شاہ جی کی جدائی میں' میں اندر سے راکھ ہو جاتی ہوں۔ میرا اپنا آپ میرے اختیار میں نہیں ہے رضیہ۔''

''جانتی ہو کہ تمہاری ان حماقتوں کا انجام کیا ہوسکتا ہے۔''

''جسے جلنے کا خوف ہو' وہ اس آگ میں کودتا ہی نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم بے کار میں مجھے سمجھا رہی ہو رضیہ۔ میرے اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ نہ دل' نہ دماغ' نہ اپنا آپ۔''

رضیہ مضطرب ہو گئی۔ ''جانتی ہو پورے گھر کی عزت خاک میں مل سکتی ہے۔''

''میں شاہ جی کی محبت ہوں اور محبت کی بنیاد عزت ہوتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ شاہ جی

میری عزت خاک میں مل جانے دیں گے؟''

''افوہ......'' رضیہ کی عقل میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ کون سی دلیل اسے قائل کر سکتی ہے۔

''ہوسکتا ہے تمہارے بلانے کے باوجود شاہ صاحب نہ آئیں۔''

''میں یہ تو مان سکتی ہوں کہ آج سورج مشرق سے نہیں نکلا' لیکن یہ نہیں مان سکتی کہ میرا پیغام ملنے کے باوجود شاہ جی نہ آئیں۔''

''تم جاؤ گی کیسے؟''

''اس کھڑکی کے راستے۔'' اس نے کمرے کی واحد کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس پر بوسیدہ سے کپڑے کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کھڑکی میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔

''اماں ابا کو خبر ہوگئی تو؟ وہ تمہیں زندہ گاڑ دیں گے۔''

''پروا نہیں۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ میں مر جاؤں گی لیکن میرے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ اُف تک نہیں۔''

''کہنا آسان ہوتا ہے کرنا بہت مشکل...... زبانی کلامی تو میں بھی بہت سے دعوے کر سکتی ہوں' لیکن مجھے معلوم ہے کہ حقیقتاً میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

''تب ہی تو میں آگ کے دریا میں کود گئی ہوں' لیکن تم کنارے پر ہونے کے باوجود اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔ مجھے صرف ایک ڈر رہتا ہے اب۔ وہ ہے جدائی کا ڈر۔ اس کے علاوہ کوئی خوف نہیں میرے دل میں۔''

وہ طاقچے میں رکھی گلابی کاغذوں والی رف کاپی اور پنسل اٹھا لائی۔

''دیکھو زرینہ یہ خط کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا ہے۔'' رضیہ خوف زدہ تھی۔

''لگ بھی گیا تو کوئی حرج نہیں۔ میں اس طرح لکھوں گی کہ کسی کو اصل بات کا پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''دیکھو زرینہ! دھیان سے۔'' وہ بولی۔ ''بلکہ میرا مشورہ مانو تو اپنی اس اضافی ترکیب پر نظرِ ثانی کر لو۔ اپنی محبت کو درمیان سے ہٹا کر۔''

وہ ہولے سے ہنس پڑی۔ ''یہ محبت تو مرنے پر ہی درمیان سے ہٹے گی۔''

رضیہ اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کاپی کا درمیانی صفحہ کھول کر لکھنا شروع کیا۔

''پرانے کنویں کے پاس۔ جب سب سو جائیں۔''

اور صفحہ پھاڑ کر اسے تہہ کر دیا۔

''بس اتنا سا؟''

''ہاں وہ سمجھ جائیں گے۔''

''کیا لکھا ہے؟'' رضیہ آگے ہو کر بیٹھ گئی۔

''رضیہ......'' زرینہ کے کچھ بتانے سے قبل ہی باہر سے اماں کی آواز آئی۔

زرینہ نے ایک لمحے کے اندر ہی تہہ شدہ کاغذ تکیہ کے خلاف کے اندر ڈال دیا۔

''جی اماں۔'' رضیہ جلدی سے بولی۔

''نماز پڑھ لی ہے تو ناشتہ تیار کر دو۔ تمہارے ابا آتے ہی ہوں گے۔''

''جی اماں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ اور جاء نماز اٹھا کر باہر نکلی۔ ''بس اماں...... ابھی نماز پڑھ لوں تو بناتی ہوں۔''

''اس وقت سے نماز بھی نہیں پڑھی تم نے۔'' انہوں نے اسے گھورا۔

''بس اماں! فجر کی نماز چھوٹی سی تو ہوتی ہے۔ ابھی پڑھ کر فارغ ہو جاؤں گی۔'' اس نے جاء نماز بچھا کر جلدی سے نیت باندھ لی۔

اماں تسبیح لے کر تخت پر بیٹھ گئیں۔

زرینہ اپنے کمرے میں بے کل بیٹھی تھی۔ جب رضیہ ناشتہ لیے کمرے میں آئی تو اس کی بے چینی فوراً محسوس کر لی۔

''خیریت ہے ناں؟''

''ہاں...... بالکل خیریت ہے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ حمیدہ کو حویلی جانے سے پہلے یہ خط کیسے پہنچایا جائے۔''

''آج شام کو اسے دے دینا۔ کل صبح حویلی جاتے ہوئے وہ لے جائے گی۔''

''نہیں۔ میں اور انتظار نہیں کر سکوں گی۔'' پھر اس کے ذہن میں خیال آیا۔ ''مسجد میں اس کا چھوٹا بھائی سپارہ پڑھنے آتا ہے۔ کیوں نہ اسے کہہ دوں کہ حمیدہ حویلی جانے سے پہلے یہاں سے ہو جائے۔''

''زرینہ خدا کے لیے اب بھی پلٹ آؤ۔''

''تم ایسی بات کرتی ہو تو میرا دل بہت دکھتا ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں مان سکتی۔'' پھر قدرے توقف سے وہ بولی۔ ''اس کا بھائی ابھی یہیں ہوگا ناں۔''

''ہاں......'' رضیہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

زرینہ نے چارپائی سے اتر کر چپل میں پاؤں ڈالے اور باہر کی طرف لپکی۔

''ابا جی!'' وہ ان کے پاس آگئی۔

''ہوں۔'' انہوں نے ناشتہ کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

''ابا جی! حمیدہ کا بھائی پڑھنے آیا ہے؟''

''ہاں آیا ہوا ہے لیکن بہت نکما ہے وہ لڑکا۔ اب تک قاعدے پر ہی اٹکا ہوا ہے۔''

''اس سے کام تھا۔''

''کچھ منگوانا ہے بازار سے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''حمیدہ کو پیغام بھجوانا تھا کہ حویلی جانے سے تھوڑی دیر کے لیے یہاں آ جائے۔'' ایسا اکثر ہو جاتا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو یوں پیغام دے کر بلا لیتی تھی اس لیے مولوی صاحب کو اس پیغام پر حیرت نہ ہوئی۔

''اچھا کہہ دوں گا۔''

''ابا جی! یاد سے۔''

''کہہ دوں گا۔'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''شکریہ!'' وہ کھل اٹھی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد حمیدہ اس کے سامنے تھی۔

''ہمیشہ مجھے بلواتی ہو کبھی خود بھی ہمارے گھر آ جایا کرو۔'' اس نے آتے ہی شکوہ کیا۔

''ہاں آؤں گی' ابھی تو تمہیں کام سے بلوایا ہے۔''

''ہاں ہاں کہو' کوئی کام تھا تو چھوٹے سے کہہ دیا ہوتا۔''

''نہیں' یہ کام تو تمہیں ہی کرنا ہے۔'' وہ مدھم آواز میں بولی۔

''خیر تو ہے ناں؟''

''ہاں بالکل خیر ہے۔'' زرینہ چپ ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ رضیہ کی جانب مڑی۔ ''تم لوگوں نے تو تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔''

''بتاتی ہوں۔'' زرینہ نے رضیہ کی جانب دیکھا جس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

''چھوٹے شاہ صاحب کو جانتی ہوناں۔''

''انہیں کون نہیں جانتا۔ بہت اچھے ہیں وہ جبکہ بڑے شاہ صاحب۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''توبہ توبہ...... انہیں دیکھ کر ہی سب کی جان نکل جاتی ہے۔'' پھر اسے اچانک خیال آیا۔ ''لیکن تم اتنے پُراسرار انداز میں ان کے متعلق کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''وہ۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ ''تم وعدہ کرو کہ میری بات کو راز ہی رکھو گی۔''

''وعدہ۔'' اس نے بلا تامل ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''کتنے ہی لوگوں کے کتنے راز ہیں میرے پاس لیکن میں نے آج تک کسی کو ان میں شریک نہیں کیا میں ہر ایک کے راز کو اس کی امانت سمجھتی ہوں جس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' وہ ہنسی۔ ''کہتے ہیں کہ عورت میں بات چھپانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ ابھی تک مجھ سے نہیں ملے ورنہ یہ کبھی نہ کہتے۔''

''مجھے تم پر اعتماد ہے...... حمیدہ اس لیے تو اس وقت تم سے مدد طلب کر رہی ہوں۔''

''تم بلا جھجک مجھ سے سب کچھ کہہ دو۔''

''اب میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گی وہ خاموشی سے سننا حیران ہو کر چیخ مت مارنا۔''

''تم کہنا تو شروع کرو۔''

''میں اور چھوٹے شاہ جی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ زور سے چلا پڑتی اگر رضیہ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیا ہوتا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ چلانا مت۔''

''تم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں حیران رہ گئی۔'' حمیدہ کے انداز میں اب بھی حیرت تھی۔ ''لیکن یہ سب ہوا کب؟ گاؤں میں تو ہر بات اتنی تیزی سے پھیلتی ہے پھر اتنی بڑی بات ہو گئی اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔''

''خبر اس لیے نہیں ہوئی کہ یہ راز اب تک کسی غیر ذمہ دار شخص کو نہیں معلوم۔''

پھر زرینہ نے مناسب ترامیم کے ساتھ ساری بات اسے بتا دی۔

''ہوں۔'' وہ بولی۔ ''رقعہ تو میں انہیں دے سکتی ہوں۔ دن میں دو تین مرتبہ وہ بہنوں یا بی بیگم سے ملنے وہاں ضرور آتے ہیں۔ نہ آئیں تب بھی رقعہ تو میں دے ہی دوں گی لیکن اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو؟''

''تم احتیاط رکھنا اور ان کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں نہ دینا۔ یوں بھی میں نے ایک سطر لکھی ہے کسی نے پڑھ لی تب بھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

''مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے لیکن میں تمہارا یہ کام ضرور کروں گی۔''

''بہت شکریہ حمیدہ۔'' وہ واقعی ممنون تھی۔ ''بس تم ایک مرتبہ رابطہ بحال کر دو پھر میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔''

''دوستی میں تکلیف کیسی۔ میں تو صرف اس لیے ڈر رہی ہوں کہ یہ کھیل خاصا خوفناک ہے۔ کسی کو خبر ہو گئی تو تمہاری خیر نہیں۔''

''میری فکر چھوڑو' صرف یہ کام کر دو میرا میں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔'' اس نے رقعہ حمیدہ کو تھما دیا۔

''ایسی بات مت کرو' میری دوستی تمہارے کسی کام آ گئی تو اس میں احسان کیسا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''حویلی سے واپس آنے کے بعد مجھے اطلاع کر دینا۔''

''اچھا؟''

وہ چلی گئی۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ پیر صاحب اور ماں جی کے پاس بیٹھا رجب علی کی شادی کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔

''کچھ زیورات ابھی ہفتہ بھر میں جیولر خود ہی بھجوا دے گا۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''چلو شکر ہے' یہ مرحلہ تو طے ہوا۔ اس کے بعد بری کا سامان مکمل ہو جائے گا۔'' ماں جی بولیں۔

''بچیوں کے جوڑے سل گئے؟'' بابا جان نے ماں جی سے پوچھا۔

''جی درزن کو بٹھا دیا ہے۔ میں تو کہتی رہی لیکن مہرو اور زیبی نے سستی دکھائی۔ اب بھی میں زبردستی نہ کرتی تو شادی کے دن تک ان کے جوڑے نہ سلتے۔''

''بچیاں ہیں ناں کبھی کبھار کوتاہی بھی کر سکتی ہیں لیکن ان سے سختی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو باپ اور بھائیوں کے گھروں کے پھول ہوتی ہوں۔'' پیر صاحب کے لہجے میں شفقت ہی شفقت تھی۔

حیدر علی شاہ انہیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا کتنی متضاد شخصیت تھی ان کی۔ بیٹیوں کے لیے پیار اور محبت کا سمندر موجزن تھا ان کے اندر لیکن وہ ان کی نفسیات اور ضروریات سے بے خبر تھے۔ ان کی محبت کا طریقہ بالکل مختلف تھا۔ وہ دنیا کی ہر مادی آسائش ان کے سامنے ڈھیر کر دیتے تھے لیکن ان کی روحانی ضروریات کو تسلیم کرنے سے قاصر تھے۔

یہ کیسا عجیب امتزاج تھا ان کی شخصیت کا۔ انہوں نے بیٹوں کو اپنے کلف لگے اونچے شملے کی طرح رکھا ہوا تھا سب کی نظروں کے سامنے پوری شان کے ساتھ اور بیٹیوں کو دل کے بہت اندر سب سے چھپا کر۔

اس نے مزارعوں کے ساتھ ان کا سلوک دیکھا' جن کے ساتھ وہ ایک باپ کی طرح مہربانی سے پیش آتے تھے' ان کے مسئلے سنتے تھے اور جب تک انہیں حل نہیں کر لیتے تھے تب تک آرام سے نہیں بیٹھتے تھے۔ گاؤں بھر کے رشتے ان کی مرضی سے طے ہوتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کوئی بے جوڑ شادی نہیں کروائی تھی۔ ماں باپ کے علاوہ اولاد کی رضا بھی حاصل کر کے رشتے طے کرتے تھے۔

لیکن اپنے گھر میں وہ ہر معاملے سے بے خبر تھے۔ یہاں انہوں نے اپنی اولاد سے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ بذات خود کیا چاہتے تھے۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ خیالات کی دنیا سے واپس حقیقت میں چلا آیا۔ ایک ملازمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''حضور مردان خانے میں بڑے شاہ صاحب غصے میں اچھو کوچوان کو کوڑے سے پیٹ رہے ہیں۔'' اس نے گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا؟ رجب علی اچھو کو پیٹ رہا ہے؟'' پیر صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی سرکار' انہوں نے مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی ہے۔ منشی دہائیاں دے رہا ہے لیکن بڑے شاہ صاحب بہت غصے میں ہیں۔''

''کیا کیا ہے اچھو نے؟'' پیر صاحب نے اپنے مخصوص دبدبے کے ساتھ پوچھا۔

''یہ تو سرکار مجھے نہیں معلوم۔'' وہ اپنی معلومات کی کمی پر قدرے نادم ہو گئی۔ ''میں گئی تو وہ اچھو پر کوڑے برسا رہے تھے۔ مجھے اتنا ڈر لگا کہ میں بھاگ آئی۔''

''حیدر علی۔'' پیر صاحب اس کی جانب مڑے۔

''جی بابا جان۔''

''تم جا کر پتا کرو یہ کیا معاملہ ہے اور مجھے اطلاع کرو۔''

''جی بابا جان۔'' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

مردان خانے کی طرف بڑھتے ہوئے جب وہ مہر النساء کے کمرے کے پاس سے گزرنے لگا تو دروازے سے باہر جھانکتی ہوئی حمیدہ اسے دیکھتے ہی کوریڈور میں نکل آئی۔

وہاں عورتوں کی آمد و رفت جاری تھی پہلے تو وہ جھجکی لیکن پھر ہمت کر کے پاس سے گزرتے حیدر علی شاہ کو آہستہ سے آواز دی۔

''چھوٹے شاہ صاحب۔''

''ہوں۔'' وہ رک گیا۔

اس نے کن اکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ عورتیں بظاہر اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کے کان اور آنکھیں کتنی تیز ہیں۔

''کہو۔'' وہ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر بولا۔ ''گھبراؤ نہیں جو کہنا ہے کہہ دو۔''

''جی وہ۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اوڑھنی کے پلو میں بندھا ہوا رقعہ کھولنے لگی۔

اسے ہر طرف سے عورتوں کی نگاہیں اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''یہ آپ کے لیے۔'' اس نے مدھم آواز میں کہہ کر رقعہ اس کی جانب بڑھایا۔ ''زرینہ نے دیا ہے۔''

''کیا؟'' اس نے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اتنے لوگوں کی موجودگی محسوس کر کے خود پر قابو پا لیا۔

''اچھا!'' حیدر علی نے رقعہ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔

''بڑی بی بی کہہ رہی تھیں کہ ان رنگوں کے جوڑے ضرور منگوانے ہیں لاہور شہر سے۔'' اس نے اونچی آواز میں عورتوں کو سنانے کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے میں منگوادوں گا۔"

حیدر علی نے بھی اس کا مقصد سمجھ کر اونچی ہی آواز میں جواب دیا اور آگے کی طرف چل دیا۔ حمیدہ کمرے میں مڑنے کے بجائے ان عورتوں کی طرف بڑھ گئی جو اس کے خیال میں کن سوئیاں لے رہی تھیں تاکہ انہیں تسلی دلا سکے کہ کاغذ کا جو ٹکڑا اس نے حیدر علی کے حوالے کیا تھا اس پر لاہور سے منگوانے والے کپڑوں کے رنگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

حیدر علی تیز تیز چلتا ہوا مردانے میں پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ رجب علی اور اچھو کی خبر بابا جان کو دے دے۔ پھر اطمینان سے گوری کا رقعہ پڑھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر رقعہ کھول لے لیکن اچھو والا معاملہ بھی اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رجب علی معاف کرنے یا رعایت دینے کا قائل نہیں ہے چاہے بات کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو پھر پتا نہیں اچھو سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا جس کی پاداش میں وہ کوڑے سے پٹ رہا تھا۔

جس وقت وہ برآمدے میں پہنچا تب تک رجب علی کارروائی مکمل کر چکا تھا اور منشی اپنے بیٹے کو سہارا دیئے باہر لے جا رہا تھا۔

"آؤ آؤ علی کہاں سے آ رہے ہو؟" اسے دیکھ کر رجب علی کے چہرے پر خوشگواری پھیل گئی۔ حیدر علی نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی نگاہیں اچھو پر ٹکی ہوئی تھیں جس کے سفید کپڑوں پر تازہ خون کے بے شمار چھینٹے تھے۔ وہ قد آور جاندار مرد تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔

اس نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ ان آنکھوں میں زہر تھا۔ پھر وہ پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

"کہاں گم ہو؟" رجب علی کی آواز اسے سوچ کے سمندر سے باہر نکال لائی۔

"کہیں نہیں۔" وہ بولا۔ "آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔ اگر ممکن ہو تو اندر چلتے ہیں۔"

"اندر۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "یہیں بات کر لیتے ہیں کیا خیال ہے؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

رجب علی نے ملازمین کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "بیٹھو۔"

وہ دونوں آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تمہاری ضروری بات یقیناً تمہاری گوری کے متعلق ہوگی۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔

"مجھے بابا جان نے بھیجا ہے۔" وہ بولا۔ "کچھ دیر پہلے انہیں اطلاع ملی تھی کہ آپ منشی کے بیٹے کو بری طرح پیٹ رہے ہیں۔"

"انہیں کس نے بتایا؟"

واضح طور پر اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ کوئی پیر صاحب سے اس کی شکایت کرتا۔

"پتا نہیں۔" علی جان بوجھ کر اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ "مجھے انہوں نے خود حکم دیا ہے کہ میں جا کر اصل بات کا پتا کروں۔"

"میں خود انہیں بتا دوں گا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"آل رائٹ۔"

"تم سناؤ تمہاری گوری کا کیا حال ہے؟"

"وہ بیمار تھی اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔ شاید اب ہو جائے۔"

"چلو اچھا ہوا، تمہیں ایسی لڑکی مل گئی جس نے منتر پڑھ کر تمہیں جکڑ لیا تمہارے پاؤں زمین سے باندھ دیئے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں ایک دوسرے سے محبت ہوتی ہے۔"

"پتا نہیں میرے خیال میں تو وہ خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں محبت مل جاتی ہے۔"

"تم اتنے ناامید کیوں ہو؟"

"میں ناامید کبھی نہیں ہوتا۔ صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"تم خواہ مخواہ فکر مند ہو۔ فوزیہ اگر تمہارے راستے کا پتھر ہی ہے تو اسے ٹھوکر مار کر اپنی گوری کی طرف بڑھ جاؤ۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تم سے اس سلسلے میں سوال جواب کر سکے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

وہ چند ثانیے رجب علی شاہ کی صورت دیکھتا رہا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" بالآخر اس نے کہا۔ "جن سے انسان محبت کرتا ہے انہیں سب کچھ دے دینا چاہتا ہے۔ میں ماں جی کی محبت میں بندھا ہوا ہوں۔ فوزیہ کو انکار کر کے انہیں دکھ نہیں دے سکتا۔ پھر گوری ہے جو میرے لیے سب کچھ ہے۔ اسے بٹی ہوئی تنہا زندگی دینا مجھے کسی صورت گوارا نہیں۔"

"تمہاری اپنی سوچ تمہارے لیے پریشانی پیدا کر رہی ہے ورنہ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے حل نہ کیا جا سکے۔ مرد بنو مرد بن کر سوچو۔ تم سخت سے سخت فیصلہ کر لو تب بھی کسی کو مجال نہیں ہونی چاہیے۔"

حیدر علی ہنس پڑا۔ "میری مردانگی کا ہدف عورتیں نہیں ہوتیں کیونکہ میں مردوں کے ساتھ مقابلہ کرنا جانتا ہوں۔ عورتوں پر مردانگی ثابت کرنے کی کوشش صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو مردوں سے مقابلے میں صفر ہوتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ بابا جان سے ضرور مل لیں، مجھے کچھ ضروری کام ہے اس لیے باہر جا رہا ہوں۔"

گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ بہت خوش تھا۔ گوری کا خط اس کی جیب میں تھا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے خود گوری اس کے ساتھ ہے۔

چلتے چلتے وہ مولسری کے درخت کے پاس رک گیا اور اس کے تنے سے ٹیک لگا کر زرینہ کا رقعہ نکال لیا۔

ہولے ہولے چلنے والی ہوا...... مولسری کے پھولوں کی خوشبو چار سُو پھیلا رہی تھی۔ حیدر علی نے گہرا سانس لے کر خوشبو کو اپنے اندر اتارا اور رقعہ کھول لیا اس پر صرف ایک سطر لکھی ہوئی تھی۔

''پرانے کنویں کے پاس جب سب سو جائیں۔''

وہ کھل اٹھا اور بے اختیار گوری کی تحریر کو چوم لیا۔ درخت کے اوپر ایک پپیہا بولا اور پھڑ پھڑاتا ہوا نیلے آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔

''مغموم پپیہا ہے کہ بھٹکا ہوا شاعر۔

جو پوچھتا پھرتا ہے کہاں ہے تُو؟ کہاں ہے؟'' حیدر علی آسمان کی وسعتوں میں پپیہے کو کھوجتا ہوا گنگنایا۔

گوری سے ملنے کے خیال نے ہی اس میں ایک نئی تازگی بھر دی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ملائم گلابی کاغذ پر لکھی وہ ایک سطر پڑھی' کاغذ کو اسی طرح تہہ کیا اور گنگناتا ہوا واپس چل دیا۔

کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پگڈنڈیوں اور گاؤں کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے خوشدلی سے گنگنا رہا تھا۔ آج ساری دنیا اچھی لگ رہی تھی یہاں تک کہ سورج کی حدت بھی ناگوار محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پرانے کنویں کے قریب پہنچ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور خوشدلی سے ہنس دیا۔

یہ کنواں کب کا متروک ہو چکا تھا۔ بہت بوڑھے سے برگد کی جٹاؤں نے کنویں پر سایہ پھیلایا ہوا تھا۔ کنویں کے اردگرد میلے کا سا سماں تھا۔ کھیتوں میں کام ہو رہا تھا۔ کچھ لڑکے بیکار...... اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ بچے سائیکل کے پہیے میں لکڑی پھنسا کر اسے بھگا رہے تھے' کچھ بنٹے کھیلنے میں مصروف تھے اور کچھ یونہی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں سر کھجاتی' بڑی بڑی چادریں سنبھالتی گیٹیوں سے سٹاپو کھیلنے میں مگن تھیں۔

لیکن بوڑھے برگد کے نیچے کوئی نہیں تھا۔ اس کے گرد جتنی بھیڑ تھی' سائے تلے اتنی ہی تنہائی اور ویرانی۔

حیدر علی نے آگے بڑھ کر کنویں میں جھانکا لیکن اسے اندھیرے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ برگد نے پہلے ہی اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ پتوں سے چھن کر آتی سورج کی روشنی کنویں کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی تھی۔

وہ پلٹ آیا۔

☆======☆======☆

وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ حیدر علی گوری سے ملنے کے لیے جتنا بے چین تھا گھڑی کی سوئیاں اسی قدر سست رفتاری سے چل رہی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔''

اس کا ذاتی خدمت گزار اندر چلا آیا۔

''شاہ صاحب آپ کو اندر زنان خانے میں بلایا گیا ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بلاوا مہر النساء نے بھیجا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔ زیب النساء بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم زیبی اور ماں جی سے مل کر چلے جاتے ہو' میرے پاس نہیں آتے۔'' مہر النساء نے شکوہ کیا۔

''آپ مجھے بلا لیا کریں ناں جیسے آج بلایا ہے۔'' وہ خوش دلی سے ہنس پڑا۔

''یعنی میرے بلانے سے آؤ گے خود سے نہیں آؤ گے۔''

''آپا آپ سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ یاد ہے بچپن میں کیسے ڈانٹتی تھیں آپ اور ایک مرتبہ تو کان بھی کھینچا تھا دو دن تک دُکھتا رہا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولا تو مہر النساء بھی ہنس پڑی۔

''اب نہیں ڈانٹوں گی تم یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

''پہلے پکا وعدہ کریں۔'' وہ دور کھڑے کھڑے بولا۔

''پکا وعدہ ہے اب آ بھی جاؤ۔''

وہ منقش صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''کہیں' آج آپ کو میرا خیال کیسے آ گیا؟''

''تمہارے کان کھینچنے کا ارادہ ہے۔''

''میرے کان؟ تب ہی اتنے پاس بٹھایا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''لیکن یاد ہے ابھی آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

''وہ وعدہ تھا' نہ ڈانٹنے کا' کان کھینچنے سے متعلق کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔''

''خطا جان سکتا ہوں اپنی؟''

''یہ تم آج کل کن چکروں میں ہو؟''

''میں؟ کسی بھی چکر میں نہیں۔''

مہر النساء نے مسہری پر بیٹھی زیب النساء کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اوڑھنی کے پلو سے کھیل رہی تھی۔ مہر النساء کی نظروں کے تعاقب میں حیدر علی نے بھی اسی کی طرف دیکھا۔ ایک

لمحے سے بھی کم وقت میں وہ سمجھ چکا تھا کہ زیب النساء نے گوری کے متعلق سب کچھ مہر النساء کو بتا دیا تھا۔ اب اس سے کچھ چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔

''کیا میری خطا اتنی ہی ناقابلِ معافی ہے؟'' اس نے بات کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ ''اتنی سی غلطی پر کان کھینچنا کچھ زیادہ بڑی سزا نہیں ہوگی؟''

''یہ اتنی سی غلطی ہے؟''

''اتنی سی ہی ہے ناں۔ میرا اور گوری کا اچانک آمنا سامنا ہوا' یقین کریں اس طرح آمنے سامنے آنے میں ہماری کسی کوشش کو کوئی دخل نہیں تھا اور یہ ٹکراؤ واقعی اچانک تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ بیٹھے...... اب اتنی چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا دینا بہت ظلم کی بات ہے۔''

''واقعی یہ تو بہت ننھی منی اور معصوم سی غلطی ہے لیکن وہ جو ملاقاتیں ہوئیں ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا پسند کرو گے؟''

''وہ۔'' اس نے سر کھجایا۔ ''ہاں وہ ایسا ہے کہ ہم نے باہمی تعاون کو فروغ دینا چاہا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کام ایک دوسرے سے بالمشافہ ملاقات کیے بغیر سرانجام دینا ممکن نہیں۔''

''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے علی! جانتے ہو تم کتنی مشکل میں پڑ سکتے ہو۔''

''پڑ سکتا نہیں پڑ چکا ہوں لیکن مشکلوں کو عبور کرنا ہی تو زندگی ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''تم کرنا کیا چاہتے ہو اب؟'' مہر النساء نے پوچھا۔

''ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ میں بھی حل ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔''

''تم فضول کے مشغلوں میں پڑ گئے ہو علی' محبت وغیرہ سب فارغ وقت کے بے کار مشاغل ہیں۔ کوئی کام کرو گے تو خود بخود ہی تمہارے ذہن سے یہ خیال نکل جائیں گے۔''

''بڑی آپا۔'' حیدر علی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''محبت فضول چیز نہیں ہوتی لیکن آپ نہیں سمجھیں گی۔ کہتے ہیں دل کی اپنی منطق ہوتی ہے جسے عقل کی منطق کبھی نہیں سمجھا سکتی۔ یہ سب صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ محبت کیا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے کچھ کام ہے میں چلتا ہوں۔''

وہ دونوں چپ چاپ اسے باہر جاتا دیکھتی رہیں۔ اس کا کہا ہوا فقرہ کسی ہتھوڑے کی طرح ان کے دل و دماغ پر برس رہا تھا۔

''آپ نہیں سمجھیں گی' یہ صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ محبت کیا ہے۔''

''آپ نہیں سمجھیں گی۔''

کہنے کو تو یہ محض چار لفظ تھے لیکن ان الفاظ میں درحقیقت پشتوں سے آباد اس حویلی کی

دلوں کی آہوں کی ایک طویل داستان چھپی ہوئی تھی۔ یہ الفاظ ان کے لیے اعتراف بھی تھے اور بھی اور احساسِ محرومی بھی۔

وہ یہ بات سمجھ بھی کیسے سکتی تھیں۔ محبت کہانی کی صورت میں سامنے آئے تو سننے دیکھنے والا محض تماشائی ہوتا ہے' واقعہ بن کر بیتنے لگے تو اس سمندر میں آنے والے کا بال بال بھیگ جاتا ہے۔

وہ محض تماشائی تھیں پھر کیسے جان سکتی تھیں کہ محبت کے سمندر کے اندر اترنے والے کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں گم صم بیٹھی سوچتی رہیں۔ پھر مہر النساء نے سر اٹھا کر زیب النساء کی جانب دیکھا۔

''مجھے مردوں سے نفرت ہے شدید ترین۔''

زیب النساء نے چونک کر اسے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''انہوں نے کائنات پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' مہر النساء نے ہولے سے کہا۔ ''غاصبانہ قبضہ۔ ہمیں ہمارے پھیپھڑوں میں اترنے والی ہوا ان کے تابع کیوں نہیں ہے۔ اگر یہ ان کے قبضے میں ہوتی تو ہم اسے بھی حاصل نہ کر سکتے۔''

''پتا نہیں مرد کیسے ہوتے ہیں۔'' زیب النساء نے بھی مدھم آواز میں کہا۔ ''شاید سب بھائیوں اور بابا جان جیسے ہوتے ہیں۔''

''اور کیسے ہوں گے ان جیسے ہی ہوں گے۔''

''میں سوچتی ہوں کہ ہم کیوں پیدا ہوئے؟ نہ ہوتے تب بھی کوئی فرق تو نہ پڑتا۔'' وہ دونوں پھر خاموش ہو گئیں۔

''آپا اگر مرد علی جیسے ہوتے ہوں تو بہت اچھے ہوں گے لیکن اگر بھائی جان جیسے ہوتے ہوں تو پھر یقیناً......'' زیب النساء چپ ہو گئی۔ ''کتنا اچھا ہو اگر سب علی جیسے ہوتے ہوں۔''

''کیا علی' کیا بڑے بھائی جان یا بابا جان تھوڑے سے فرق سے سب ایک جیسے ہیں۔ جیسے علی زرینہ سے ملاقاتیں کر رہا ہے اور تمہیں سب قصے بھی سنا دیتا ہے اگر ویسے ہی ہم کریں۔ تو اس کی غیرت جاگ جائے گی شرم سے اس کا سر جھک جائے گا۔ اس سے محبت کرنے والی زرینہ چھپ چھپ کر اس سے ملنے کے باوجود بھی شرافت کا مجسمہ ہے لیکن کیا ہم صرف رنگ ہوا اور دشمنی کی خاطر بھی قدم حویلی سے باہر نکال سکتے ہیں؟'' مہر النساء نے کہا۔ ''سب ایک سے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''ایسا ہی ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''پہلے میں بھی تمہاری طرح سوچتی تھی لیکن اب

نہیں۔ مجھے شدید نفرت محسوس ہوتی ہے سب مردوں سے۔''

زیب النساء نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں کسی خاص شخص کی شبیہہ نہیں تھی لیکن مردوں کے لیے نفرت بھی نہیں تھی بھائیوں اور بابا جان کے متعلق سوچتے ہوئے نفرت جیسے لفظ کو خیالوں میں لانے کی بھی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''مرد'' لفظ میں اسے ہمیشہ ایک انوکھا اسرار محسوس ہوا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں پہلے تو دونوں بھائی مسلسل ولایت ہی میں رہے۔ بابا جان سال میں ایک مرتبہ جا کر ان سے مل آتے تھے۔ اب جب وہ واپس آئے تھے تب بھی ان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ بابا جان اور بھائیوں سے بعض اوقات دن میں صرف ایک مرتبہ اور کبھی کبھار دن بھر ایک بھی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں وہ کیا جان سکتی تھی کہ مرد کیسے ہوتے ہیں؟

کبھی تو یوں بھی ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع پر سوچنے لگتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سوچ اس کی نظروں کے سامنے کوئی شبیہہ ڈھال دیتی تھی۔ اس شبیہہ کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا' بس وہ مرد ہوتا تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے وہ خود بخود نمودار ہوتی تھی اور بے اختیار اس شبیہہ کی جانب بڑھنے لگتی تھی۔

اور ابھی اس سمت میں وہ چند ہی قدم بڑھ پاتی تھی کہ احساسِ گناہ جاگ جاتا تھا۔ خوابوں اور خیالوں کی دھند چھٹ جاتی تھی اور اس کے سامنے اس کا اداس ویران کمرا آ کھڑا ہوتا تھا۔ ایک طرف کمرے کی تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور دوسری جانب خوابوں کا احساسِ گناہ کچوکے لگانے لگتا تھا۔ کمرے کی تنہائی اسے خواب بُننے پر مجبور کرتی تھی اور احساسِ گناہ خوابوں میں بھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔ تب وہ جلدی سے مصلیٰ بچھا کر نوافل پڑھنے لگتی تھی یا کلام پاک اٹھا کر تلاوت شروع کر دیتی تھی۔ شروع میں تو کچھ دیر اسے سکون ملتا تھا لیکن پھر غائب دماغی اس پر مسلط ہونے لگتی تھی۔ اس کی نظریں کلام پاک پر ہوتی تھیں ہونٹ ہل رہے ہوتے تھے مگر دماغ کہیں اور گم ہوتا تھا۔

بابا جان اس کی عبادت گزاری سے بہت خوش تھے اور اکثر کہا کرتے تھے۔

''زیب النساء ہماری قابلِ فخر بیٹی ہے۔ اپنے پانچوں بچوں میں سے یہ مجھے سب سے پیاری ہے۔''

وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس کی عبادت اطاعت کے لیے کم' فرار کے لیے زیادہ ہے۔ بس سر جھکائے تعریف سنتی رہتی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' مہر النساء اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکال لائی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ چوری سی بن گئی۔ کبھی کبھار تو اسے یوں لگتا تھا جیسے سب اس کی سوچ پڑھ سکتے ہیں اور اگر وہ نہیں پڑھ سکتے تو بھی اس کی سوچ کے تمام رنگ اس کے چہرے پر ضرور آتے

ہیں۔

''مجھے نماز پڑھنی ہے۔'' وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد حمیدہ کمرے میں آ گئی۔ مہر النساء کو گم صم بیٹھے دیکھا تو اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہیں بڑی بی بی؟''

''حمیدہ!'' وہ بولی۔ ''مرد بہت برے ہوتے ہیں ناں؟''

سوال کا انداز بتا رہا تھا کہ مہر النساء اس سے اثبات میں جواب چاہتی ہے۔ اس لیے اس نے زور و شور سے گردن ہاں میں ہلا دی۔

''کوئی ایسے ویسے بالکل فتنے منہ ہوتے ہیں۔''

''تم تو ملتی ہو گی ان سے۔''

''ہاں جی کیوں نہیں۔ ہمیں تو صبح سے شام تک کام ہی ایسے ہوتے ہیں کہ سارا وقت کوئی نہ کوئی سر پر سوار رہتا ہے۔''

''اچھے نہیں ہوتے ناں؟ بس ساری چیزوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ عورتوں پر۔ دنیا کی ہر چیز کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔''

''سولہ آنے ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ میرا ابا ہے اسے ہر وقت یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں میں کھڑکی میں تو نہیں کھڑی' راستے میں چلتے ہنس تو نہیں پڑی' آج روٹی چھوٹی کیوں پکی ہے کہیں پکاتے ہوئے میرا دماغ کسی اور طرف تو نہیں تھا۔

چھوٹی سی بات ہو جائے تو اماں کو دُھن کر رکھ دیتا ہے۔ بس سارا دن یہی تماشہ چلتا رہتا ہے۔ میں تو یہاں آ جاتی ہوں اس لیے میری بچت ہو جاتی ہے ورنہ ابا بہت سخت ہے۔''

''ہوں وہ تمہاری اماں کو کیوں مارتا ہے؟''

''کہتا ہے بیوی کو مارنا شوہر کا حق ہے۔ اس سے بیوی تیر کی طرح سیدھی رہتی ہے۔'' وہ خود ہی ہنس پڑی۔ ''پر اماں نے کیا سیدھا ہونا ہوا۔ ابا گھر سے نکلتا ہے تو یہ موٹی موٹی گالیاں پڑتی ہیں اسے اماں سے۔ سامنے کم بولتی ہے اور بولے تو مار کھاتی ہے لیکن پیچھے خوب صلواتیں سناتی ہے۔''

''پتا نہیں سب عورت کو ہی کیوں تیر کی طرح سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔'' مہر النساء بولی۔

''میرے خیال میں سیدھا ہونے کی مردوں کو زیادہ ضرورت ہے۔''

''بس جی' سب ایسے ہی چلتا ہے۔''

''پتا نہیں یہ دنیا کب ان کے قبضے سے بچ کر نکلے گی۔ کون اسے مردوں کے چنگل سے آزاد کرائے گا۔''

''ایسا کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ مخلوق تو کیڑے مکوڑوں کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی ہے لیکن دھاڑتی شیر کی طرح ہے۔ میں تو ابا کی آواز سن کر ہی سہم جاتی ہوں۔''

''حمیدہ! تم شادی مت کرنا۔'' مہر النساء نے کہا۔

''جی؟'' وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی۔

''ایک مرد کے چنگل سے نکل کر دوسرے کے چنگل میں پھنس جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ پہلے میں سوچتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اب سوچتی ہوں کہ اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اب بھی میرا کچھ نہیں ہے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔

ہماری ماں کو شادی کر کے کیا ملا؟ بابا جان کے سامنے زبان کھولنا تو درکنار نظریں بھی نہیں اٹھا سکتیں۔ چاہتی تھیں کہ سخاوت کے لیے بھی بھائی کی بیٹی ہی لائیں لیکن بابا جان نے صرف ایک 'نہیں' کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ اپنی اولاد کا نام خود رکھیں۔ تکلیف انہوں نے جھیل کر ہمیں پیدا کیا' پرورش پر انہوں نے جان ہلکان کی لیکن انہیں اپنے ہی بچوں کے نام رکھنے کا اختیار نہیں تھا۔ ہم تین بڑوں کے نام دادا جان نے رکھے علی اور سخاوت کے بابا جان نے۔

ہونہہ۔ کتنی بے بس ہیں ماں جی۔ چھوٹی سی بات کرنے کے لیے بھی پہلے بابا جان کے ماتھے کی طرف دیکھتی ہیں۔ اس پر شکنیں پڑی ہوں تو خاموش ہو جاتی ہیں اور اگر مزاج بہتر ہو تو دبے دبے انداز میں بات کرتی ہیں۔'' وہ گویا یہ سب باتیں خود سے کہہ رہی تھی۔

''بی بی یہی ہوتا ہے۔ عورت تو قسمت پھوڑنے کے لیے ہی اس دنیا میں آئی ہے۔ جب اچھی طرح پھوٹ جاتی ہے قسمت تو واپس آسمانوں میں بلالی جاتی ہے۔''

''یہ سارا قصور مردوں کا ہے میرے دل میں اب مردوں سے نفرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

☆======☆======☆

زرینہ کو وقت گزارنے کی جتنی جلدی تھی وقت اسی قدر تھم تھم کر گزر رہا تھا۔ دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا حالانکہ کرنے کو کتنے ہی کام تھے اس نے تو دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ عصر کے کچھ بعد بالآخر حمیدہ چلی آئی۔ زرینہ اس وقت دالان میں لگے گملوں میں پانی ڈال رہی تھی۔ حمیدہ کو آتے دیکھا تو لوٹا چھوڑ' اس کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے اپنے کمرے میں لے گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے دروازہ بند کر کے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا میرا خط دے دیا؟ کچھ کہا انہوں نے؟ پہنچ جائیں گے ناں وقت پر۔''

''دم تو لے لو۔ ایک ایک کر کے سوال پوچھو۔'' وہ چارپائی پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

''بتاؤ ناں ہوا کیا؟''

''ہوا یہ کہ مجھے کافی دیر بعد انہیں رقعہ دینے کا موقع ملا۔ میں یہ چاہتی تھی کہ کسی ایسے وقت انہیں تمہارا خط دوں جب ارد گرد کوئی نہ ہو۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تمہیں تو پتا ہے ناں کہ وہاں ہر وقت میلہ لگا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔''

''تم یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟'' وہ بولی۔ ''مجھے اتنی لمبی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''سنو تو۔'' حمیدہ نے آرام سے کہا۔ ''وہ پیر صاحب اور بڑی بیگم کے پاس بیٹھے تھے۔ اب باہر نکلنے لگے تو مجھے یقین ہو گیا...... کہ اب کم از کم رات تک وہ دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کریں گے۔ تب اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان ہی انہیں خط دینا پڑا۔''

''پھر؟'' زرینہ کی بے تابی عروج پر تھی۔

''پھر یہ کہ وہاں موجود سب عورتوں نے کان لگا لیے وہ تو اچھا ہوا کہ سب کو معلوم ہے کہ مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا ورنہ جانے کون کون سی باتیں پھیلاتی پھرتیں۔''

''تم نے شاہ جی سے کیا کہا؟''

''پہلے تو میں نے آہستہ سے انہیں بتا دیا کہ یہ تمہاری طرف سے ہے۔ پھر سب کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں ان سے کہا کہ کاغذ پر رنگوں کے نام لکھے ہیں۔ بڑی بی بی نے کہا ہے کہ ان رنگوں کے جوڑے چاہئیں۔ ظاہر ہے وہ عورتیں بڑی بی بی سے پوچھنے سے تو رہیں کہ انہوں نے واقعی کوئی جوڑے منگوائے ہیں یا نہیں۔''

''اور وہ عورتیں مان گئیں؟''

''آج میرا ان پڑھ ہونا کام آ گیا۔ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ بی بی نے کون سے رنگوں کے جوڑے مانگے ہیں۔ میں نے کندھے اچکا کر کہہ دیا کہ کیا خبر مجھے پڑھنا کب آتا ہے۔ ویسے گلابی اور ہرے رنگ کی بات کر رہی تھیں مجھ سے۔ اس بات پر سب مطمئن ہوئیں۔''

''ان کا ردِعمل کیا تھا؟''

''جب میں نے انہیں آہستہ سے بتایا کہ یہ تمہاری طرف سے ہے تو یکدم کچھ کہنے لگے۔ لیکن انہوں نے بیچ میں ہی خود کو روک دیا۔ پھر خط جیب میں ڈال کر باہر چلے گئے۔''

''بتایا نہیں آنے کا؟''

اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''پڑھا ہی نہیں انہوں نے۔ اتنے لوگوں کے سامنے پڑھ بھی کیسے سکتے تھے۔''

''ایک سطر تو لکھی تھی میں نے پڑھ لینے میں کیا حرج تھا۔'' اس کے انداز میں مایوسی تھی۔

''پاگل کہیں کی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ کاغذ پر ایک سطر لکھی ہے یا زیادہ۔'' حمیدہ ہنسی۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

''آج بے چارے اچھو کے ساتھ بہت برا ہوا۔'' حمیدہ نے کتھا کی تمہید باندھی۔

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔ ''حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ یہ بڑی سڑک یوں بھی بہت بری ہے۔ اندھوں کی طرح بسیں اور لاریاں چلاتے ہیں لوگ۔''

''یہ میں نے کب کہا ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔''

''تو پھر؟''

''اسے تو بڑے شاہ صاحب نے چابک سے پیٹا ہے۔'' وہ آگے ہو کر راز داری سے بولی۔

''کیا؟ لیکن کیوں؟ کیسے؟''

حمیدہ مزید راز داری کی خاطر اس کے زیادہ قریب ہو بیٹھی اور مدہم آواز میں اسے پوری بات بتا دی۔

☆======☆======☆

نسیم کچھ ہی دیر پہلے لسی کی گڑوی لے کر خالہ جی کے گھر سے نکلی تھی۔ خالہ جی اس کی سگی خالہ نہیں تھیں۔ وہ پورے گاؤں کی ہی خالہ جی تھیں۔ نسیم کو لسی بہت پسند تھی۔ خالہ رات کو پینے سے منع بھی کرتی تھیں لیکن اسے لسی کے بغیر کھانا ادھورا لگتا تھا۔ خالہ کے گھر کی لسی تو یوں بھی اس کی پسندیدہ تھی۔ گڑوی میں لسی تو لاتی ہی تھی۔ چاٹی کا مکھن بھی کتنا سارا لے آتی تھی۔

وہ جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی۔ کیونکہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اور اماں نے گھر واپس آنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ ابا کو تو اس کے خالہ جی کے گھر رہ جانے پر کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا لیکن اماں کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ورنہ اماں کا پارا اونچا ہونے لگتا۔ یوں بھی اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ تنور کی گرم گرم روٹی پر مکھن چپڑ کر لسی کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کا تصور اسے تیز چلنے پر مزید اکسا رہا تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ جب سامنے سے چار ہیولے نمودار ہوئے۔ ان کا آنا اتنا اچانک تھا کہ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

''ک ک کون ہو تم؟'' اس نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔

''واہ، ہمیں نہیں جانتی۔ اتنے گمنام بھی نہیں ہیں ہم۔'' اس نے شکورے کی آواز پہچان لی۔

''کبھی نظرِ کرم ڈالی ہو تو پتا چلے ناں۔'' ایک اور بولا۔

''دفع ہو جاؤ' راستہ چھوڑو میرا۔''

''اب تو ہم راستے میں آ گئے ہیں۔ یوں بے مراد کیسے جا سکتے ہیں۔''

''نہیں جاتے؟'' وہ غصہ سے چلائی۔ ''چیخ چیخ کر سارے گاؤں کو اکٹھا نہ کر لیا تو میرا نام بھی نسیم نہیں۔''

''تو چل تبدیل کر اپنا نام۔''

شکورا سرعت سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اسے اپنی کمر پہ لاد لیا۔ نسیم نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن سب کوششیں بے کار گئیں۔ طاقت میں وہ اس

سے کہیں بڑھ کے تھے۔

☆======☆======☆

لالٹین کی مدھم روشنی میں زرینہ نے صحن کی طرف کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگادی اور واپس مڑی۔

''خدا کے لیے زرینہ یہ حرکت مت کرو۔ میرا دل دہل رہا ہے۔'' رضیہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

''اور تم خدا کے لیے ''نہ'' مت لگاؤ۔ جس کام میں ''نہ'' لگ جائے وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔''

''اگر ابا' اماں میں سے کوئی جاگ گیا پھر؟''

''تم شور نہیں کرو گی تو نہیں جاگیں گے۔'' وہ چڑ گئی۔ ''پہلے کبھی جاگے ہیں جو آج جاگیں گے۔''

''اباجی تہجد کے لیے اٹھتے ہیں۔ اگر انہوں نے کمرے میں جھانک لیا تو؟''

''تب تک میں آجاؤں گی۔'' اس نے ہلکے دھانی جوڑے پر سیاہ چادر لپیٹ لی۔

''زرینہ اللہ کے واسطے رک جاؤ۔ ایک مرتبہ قدم اس نیت کے ساتھ گھر سے نکل جائیں تو واپسی کا ہر راستہ بند ہو جاتا ہے۔''

زرینہ نے ایک لمحے کے لیے مڑ کے اسے دیکھا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ کھڑکی کے چھجے پر ہاتھ رکھ کر باہر کود گئی۔ رضیہ بے اختیار کھڑکی کی جانب بڑھی۔ زرینہ کچھ فاصلے پر صرف ایک ہیولے کی صورت میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ چلا کر اسے واپس آنے کے لیے کہے لیکن پھر بات پھیل جانے کے خیال سے رک گئی۔ زرینہ نے اس کے دل کو بہت ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ عجیب...... دوراہے پر کھڑی تھی۔ جب زرینہ روتی تھی تو وہ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے بے چین ہو جاتی تھی۔ اور جب زرینہ کو راہ سجھائی دے جاتی تھی تو وہ معاشرے اور زمانے کے خیال سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کی حالت عجیب سی تھی۔ پریشانی کے عالم میں وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی اندھیرے میں زرینہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

کتنی دیر گزر چکی تھی۔ حیدر علی شاہ کو وہاں انتظار کرتے ہوئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی گوری وعدہ کر کے اسے بلا کر وہاں نہ آئے۔ باتوں باتوں میں اس نے سخاوت سے تصدیق کر ڈالی تھی کہ یہاں زیادہ تر لوگ سرِ شام ہی سو جانے کے عادی ہیں۔ مغرب کے بعد بہت کم لوگ جاگا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے اختتام کے ساتھ ہی ہر گھر میں سناٹا چھا جاتا تھا اور گلیوں میں آوارہ کتوں کی حکومت قائم ہو جاتی تھی۔

مغرب کے فوری بعد گوری کا آنا مشکل تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب عشاء کی نماز کی امامت کے بعد ہی اپنے حجرے میں جاتے تھے۔ یقیناً گوری ان کے سونے کے بعد ہی نکلتی اور اس میں کچھ وقت لگنا لازمی تھا۔

بوڑھے برگد سے کمر ٹکائے وہ مسلسل اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے گوری کو آنا تھا۔ وہ اس کے لیے خریدے ہوئے تمام تحفے بھی ساتھ لایا تھا۔ سونے کی زنجیر' سرخ خوبصورت چنری' پرفیوم کی بوتل اور میراجی کی نظموں کی کتاب۔

دور سے ایک ہیولا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خدوخال واضح نہیں تھے لیکن چال کسی لڑکی کی تھی۔

''ہو نہ ہو' یہ گوری ہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔'' حیدر علی نے سوچا اور اس کی جانب بڑھا۔

وہ گوری ہی تھی۔ حیدر علی کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکی اور پھر دیوانہ وار اس کی جانب بھاگی۔

''شاہ جی۔'' وہ اس کے ہاتھوں کے ساتھ سر ٹکا کر رو دی۔ ''کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میری یاد نہیں آئی آپ کو؟ مجھے پوچھا تک نہیں' کھوجا تک نہیں۔ کیا میں اتنی جلدی بھول جانے والی چیز تھی؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہو گوری' تم تو میری جان ہو' میری زندگی ہو' تمہیں بھول سکتا ہوں میں؟'' اس نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''پھر مجھے یوں اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟ میں نے کتنی آوازیں دیں آپ کو۔ کتنا یاد کیا۔''

''یاد تو میں نے بھی تمہیں بہت کیا تھا۔ ایک ایک لمحے ایک ایک پل۔'' اس نے زرینہ کی آنکھوں سے بہتے آنسو اپنی انگلی کی پور سے صاف کیے۔

''تو پھر آئے کیوں نہیں؟''

''کیا سب شکوے یہیں کرو گی؟'' وہ رسان سے بولا۔ ''وہاں کنویں کے پاس آجاؤ پھر دونوں مل کر باتیں کریں گے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنویں کے پاس ٹوٹے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں ہوا کیا تھا؟ خالہ کبریٰ نے بتایا تھا کہ تم بیمار تھیں۔''

''خالہ نے اور بھی کچھ کہا ہوگا۔ کہیں آپ نے ان کی بات کو سچ تو نہیں سمجھ لیا تھا؟''

''میں تمہیں اتنا ہی احمق لگتا ہوں؟''

''میں نے سوچا شاید آپ یہ سن کر ناراض ہو گئے ہوں۔ میں دل میں ڈر گئی تھی۔''

''اگر مجھے تمہاری وفا کا یقین نہ ہوتا گوری تو میں کبھی تمہاری سمت نہ بڑھتا۔ تم تو میرے

دل میں رہتی ہو اور میرا دل میرے ساتھ بے وفائی کیسے کرسکتا ہے؟''

زرینہ نے سکون کے ساتھ کمر پیچھے برگد کے درخت کے تنے کے ساتھ ٹکا لی۔

''میں تو تمہیں بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے اچانک لاہور جانا پڑ گیا اور میں تمہیں اطلاع بھی نہیں دے سکا۔ اگر مجھے ذرا سی بھی خبر ہوتی کہ ہجر کے یہ لمحے اتنے طویل ہو جائیں گے تو یقین کرو کہ میں کبھی بھی لاہور نہ جاتا۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''وہاں بھی یہ خیال مسلسل مجھے ستاتا رہا کہ گاؤں میں میری گوری میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

''اب مجھ میں جدائی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے شاہ جی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''محبت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اپنے لیے تو انسان کی صرف ایک زندگی اور ایک موت ہوتی ہے لیکن اپنے پیاروں کے لیے اسے کتنی مرتبہ مرنا جینا پڑتا ہے۔''

''اچھا یا برا' ہر وقت بالآخر کٹ ہی جاتا ہے۔'' اس نے زرینہ کا سر اپنے کندھے کے ساتھ ٹکا لیا۔ ''اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ جدائی کا یہ وقت بھی ختم ہوا۔''

''ابھی کہاں ختم ہوا ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''یہ سب صرف دل کو تسلی دینے کی باتیں ہیں۔''

''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ مجھ پر اعتماد نہیں ہے تمہیں؟''

''آپ پر تو اپنے آپ سے بڑھ کر اعتماد ہے۔ بس تقدیر پر اعتماد نہیں ہے۔ کہیں جیسے کوئی میرے اندر ہی اندر کہتا ہے کہ میرا مقدر کہیں اور جڑا ہوا ہے۔''

''یہ سب تمہارے ماحول اور ذہن کا خوف ہے' جو تمہیں دہلاتا رہتا ہے۔ تم اپنے قدم یقین کے ساتھ زمین پر رکھو گی تو راستہ خود بخود بنتا چلا جائے گا۔ پھر میں ہوں تمہارے ساتھ' خوف کس بات کا ہے؟''

''ہوں!'' پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''یہ خوف تو تب ہی ختم ہوگا جس دن ہمارے راستے میں کوئی دیوار نہیں رہے گی' جس دن قانون' اخلاق اور شریعت کی نظر میں ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔''

''وہ دن بھی ضرور آئے گا۔ حویلی میں اس سے پہلے کسی بھی دلہن کا اتنا شاندار استقبال نہیں ہوا ہوگا۔ جتنا تمہارا ہوگا۔'' حیدر علی نے اسے تسلی دینی چاہی۔

''حویلی!'' زرینہ نے سر حیدر علی کے کندھے سے اٹھا لیا۔ یوں لگا جیسے اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔

''کیا ہوا؟ تم پریشان کیوں ہو گئیں؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''شاہ جی میں حویلی میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔'' خوف ایک مرتبہ پھر اس کی رگوں میں منجمد ہو گیا تھا۔

''کیوں؟''

حیرت زدہ انداز میں پوچھے گئے اس سوال کا جواب وہ سچائی میں نہیں دینا چاہتی تھی۔ مبادا وہ اسے پاگل سمجھ بیٹھتا یا زیب النساء کے متعلق بھاگ جانے والی بات کہہ دینے پر غصے میں ناراض ہو جاتا۔ اس کی ناراضگی زرینہ کو کسی صورت گوارا نہیں تھی۔

''مجھے حویلی کو دیکھ کر وحشت ہونے لگتی ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے میرا۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہاں کمرے نہیں۔'' تیزی سے بولتے بولتے وہ اچانک چپ ہو گئی اور برگد کے پتوں کے درمیان سے آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے کھوجنے لگی۔

''کمرے نہیں تو کیا ہیں؟''

''رہنے دیں۔''

''کہو گوری۔ مجھ سے سب کچھ کہہ دیا کرو' ہمیں تو زندگی کی سب سانسیں اکٹھی گزارنی ہیں پھر چھپانا کیا مطلب؟''

چند ثانیے تک وہ ملگجے اندھیرے میں حیدر علی کے چہرے کے خدوخال دیکھتی رہی' پھر ہولے سے بولی۔ ''آپ کو برا لگے گا۔''

''تمہاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگ سکتی۔ تم مجھ سے وہ سب کہہ دیا کرو جو تم کہنا چاہتی ہو۔ اپنی ساری مشکلیں سب تکلیفیں اور غم میرے حوالے کر دو' میں ان سب کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔''

''مجھے وہ کمرے نہیں قبریں لگتی ہیں۔ زندہ انسانوں کی قبریں۔ جہاں لاشیں چلتی پھرتی ہیں۔ لگتا ہے یہ قبریں اتنی گہری ہیں کہ ان میں ہوا روشنی اور آزادی کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ لگتا ہے کہ ہر کمرے میں روحیں پر پھڑپھڑا کر اپنی موجودگی کا اعلان کرتی ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے وہاں۔ خدا کے لیے شاہ جی' مجھے وہاں کبھی مت لے جانا۔''

''میری ہر خوشی تمہاری خوشی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہم الگ اپنا گھر بنائیں گے گوری۔ جہاں سب اکٹھے ہوں گے۔ میں بڑی آپا اور زیبی آپی کو بھی لے آؤں گا۔ وہ حویلی میں اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان بھی کتنی تنہا رہتی ہیں۔''

''بس شاہ جی آپ کو پا لینے کے بعد یہی ایک خواہش ہے میری' میں حویلی نہیں جانا چاہتی۔ اس کے علاوہ میری کوئی تمنا نہیں ہے۔''

''اب بتاؤ اگر تمہارے شکوے ختم ہو گئے ہوں تو میں تمہیں کچھ دکھاؤں؟''

''آپ مل گئے تو سب شکوے خود ہی ختم ہو گئے۔''

''لاہور جانا بہت مجبوری تھی لیکن وہاں میں تمہیں بھولا نہیں تھا۔ تم ایک ایک پل میرے ساتھ تھیں۔'' اس نے گلے کی زنجیر کی گہرے [illegible] دیا' اس کے نرم و نازک گورے ہاتھ

پر رکھ دی۔ ''یہ جدائی کے لمحوں کا مداوا تو نہیں کرسکتی لیکن تمہیں یہ ضرور بتائے گی کہ تم بھولنے والی چیز نہیں ہو' تم تو گوری خوشبو کی طرح ہر وقت میرے وجود کا احاطہ کیے رکھتی ہو۔''

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

''یہ کیا ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے لیے ہے' کھول کر دیکھ لو۔''

''دیکھ لوں؟ اچھا۔'' اس نے ڈبیا کھولی اور سنہری چمکتی ہوئی زنجیر ڈبیا سے باہر نکال لی۔

''یہ کیا؟'' اس نے اپنی خوبصورت شربتی آنکھیں حیرت سے پھیلائیں۔

''یہ تمہارے لیے ہے۔''

''میرے لیے؟ لیکن اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو یہ سونے کی زنجیر ہے۔'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔

''اس سے تمہیں کیا؟''

''لیکن شاہ جی یہ بہت قیمتی ہے۔ آج تک میں نے اتنی قیمتی چیز نہیں پہنی۔'' وہ متذبذب تھی۔

''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں گوری۔'' وہ رسان سے بولا۔ ''ادھر مجھے دو۔''

زرینہ نے زنجیر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔ حیدر علی نے اپنے ہاتھوں سے وہ چین اسے گلے میں پہنا دی۔

''شکریہ شاہ جی۔'' وہ ممنونیت سے بولی۔ ''مجھے پوری زندگی کبھی اتنا اچھا اور خوبصورت تحفہ نہیں ملا۔''

''ایک چیز اور بھی ہے۔''

''کیا؟'' اس نے شوق سے پوچھا۔

''یہ۔'' حیدر علی نے کھلتے ہوئے سرخ رنگ کی چنری اس کے سر پر رکھ دی۔

''کتنی خوبصورت ہے یہ؟'' اس نے خوشی سے چنری کو ہاتھ لگایا۔

''اونہوں۔ ابھی ایک کمی ہے۔''

''کس چیز کی؟'' اس نے خوابناک آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''اس کی۔'' حیدر علی نے پرفیوم کی شیشی کے اسپرے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔

مسحور کن خوشبو چاروں طرف بکھر گئی۔ زرینہ نے خوشی سے قہقہہ لگایا اور پرفیوم کے مسلسل اسپرے سے خود کو بچانے کے لیے ہاتھ اپنے سامنے کر لیے۔

''بس کریں شاہ جی۔'' وہ ہنسنے لگی۔

بجائے بس کرنے کے حیدر علی نے اور شدت سے بٹن دبانا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے اس کھیل میں تب تک مگن رہے۔ جب تک پوری بوتل خالی نہیں ہوگئی۔

''بس کریں اب۔'' وہ ہنستے ہوئے چلائی۔

''اب تو بس کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ بھی ہنس رہا تھا۔ ''پرفیوم ختم ہوگیا ہے۔''

''اُف خدایا۔'' زرینہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''ہر طرف کتنی خوشبو پھیل گئی ہے۔''

''یہ ہماری محبت کی خوشبو ہے۔'' اس نے بوتل پر ڈھکن لگایا۔

''خاصی تیز ہے۔'' وہ گلے میں پڑی زنجیر سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''ویسے شاہ جی چار پانچ ماہ تک یہاں سے گزرنے والے ہر شخص کے کپڑوں سے یہ خوشبو ضرور آئے گی اور پتا نہیں ہوا کے دوش پر کتنے گھروں تک بھی پھیل جائے۔''

''ہوا ہر گھر میں جاتی ہے' لیکن اسے بھید بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ کسی سے کچھ نہیں کہتی ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''ویسے اردو کے شاعروں اور محاوروں کو میری اس بات سے اختلاف ضرور ہوگا لیکن سائنس دان میری بات کی تائید کریں گے۔''

''اب تو آپ کو کوئی کمی نہیں لگ رہی ناں؟''

''ہوں۔'' وہ چند ثانیے اسے بغور دیکھتا رہا۔ ''ہاں ایک اور بھی ہے۔''

''اب کیا ہے؟''

''کتاب۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ ایک اچھی کتاب۔'' اس نے میرا جی کی نظموں کا مجموعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''آپ کو بہت شوق ہے کہ میں پڑھوں؟''

''بہت نہیں' بہت زیادہ۔''

''پھر میں ضرور پڑھوں گی۔'' وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی' پھر سر اٹھا کر بولی۔

''بڑے شاہ صاحب کی شادی ہو رہی ہے؟''

''ہاں۔''

''پیر صاحب نے آپ کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔''

تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا پھر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ باقی سب کیا کہتے ہیں۔ اپنی زندگی کا فیصلہ میں خود کرسکتا ہوں۔''

''پیر صاحب کی اجازت کے بغیر کیسے کرسکتے ہیں؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ جو میرے کام ہیں وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔''

''سنا ہے' بڑے شاہ صاحب بہت سخت ہیں۔''اس نے جھجک کر پوچھا۔
''اپنوں کے ساتھ وہ بہت اچھے ہیں۔ بہت محبت کرنے والے' بہت خیال رکھنے والے۔''
''اب تو سنا ہے کہ ہر فیصلہ انہی کا چلتا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو؟''
''تم کیوں اپنا ذہن پریشان کرتی ہو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا ہوا ہوں؟ ان سے بات کر چکا ہوں میں۔''
زرینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔''آپ نے کہہ دیا ان سے؟''
''تم خود بھی تو جانتی ہو کہ ان کے فیصلے کی کتنی اہمیت ہے۔ ظاہر ہے انہیں بتانا تو تھا ہی۔''
''انہیں غصہ تو نہیں آیا؟''
''نہیں۔ غصہ کیوں آتا؟''
''پھر؟''
''پھر یہ کہ انہوں نے کچھ شرائط رکھ دیں۔''
زرینہ کا دل ڈوبنے لگا۔''کیسی شرائط؟''
''تم نہیں سمجھو گی۔ بس اتنا جان لو کہ مجھے تمہیں غیر مشروط طور پر اپنانا ہے اور ایسا میں ضرور کروں گا۔ اول تو میں چاہتا ہوں کہ میرے اس فیصلے کو سب دل سے تسلیم کر لیں اور میری خوشی میں سب خوش ہوں لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میں خود کو آزاد سمجھوں گا۔''
''پتا نہیں کیا ہوگا۔''وہ اٹھ کر کنویں کے پاس کھڑی ہو گئی۔
حیدر علی بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔
''مجھے بتاؤ۔ تمہیں میری بات کا یقین کیسے آئے گا؟''
''پتا نہیں یقین کیا ہوتا ہے۔ میرے گرد تو خوف نے گھیرے ڈال رکھے ہیں۔ جدائی کے خوف نے۔ تقدیر نے کیا لکھا ہے۔ میں اس بات کو کیا جانوں۔''پھر اس نے فوراً بات پلٹی۔ وہ ماحول کو خوشگوار رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے شگفتگی سے بولی۔''کچھ اندازہ ہے شاہ جی کہ یہ کنواں کتنا گہرا ہوگا۔''
''اندازہ ہے تو نہیں لیکن ابھی لگا لیتے ہیں۔''اس نے جھک کر ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اسے کنویں میں پھینک دیا۔
''یہ کیا کیا آپ نے؟''زرینہ خوفزدہ ہو گئی۔
کنویں کی تہہ میں پتھر گرنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔
''کیوں؟ کرنا کیا ہے۔ پتھر پھینکا ہے۔ اس طرح گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''
''آپ کو نہیں پتا۔ پرانے کنوؤں میں پتھر نہیں پھینکتے ان میں بلائیں رہتی ہیں۔''
''تم اَن پڑھ گوری ان میں بلائیں نہیں انسان کے وہم رہتے ہیں۔''

''یہ جگہ یوں بھی آسیب زدہ ہے۔''اس کا خوف بدستور موجود تھا۔''بڑے بوڑھے منع کرتے ہیں' یہاں پتھر پھینکنے سے کہتے ہیں۔ بلائیں جاگ جاتی ہیں۔''
''کچھ نہیں کہیں گی تمہیں یہ بلائیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں تو ڈرتی کیوں ہو۔''حیدر علی نے زرینہ کا ہاتھ تھام کر اسے ٹوٹے ہوئے بنچ پر بٹھا دیا۔''بلائیں جاگیں تو میں ان سے نمٹ لوں گا۔''
اس کی بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ فضا میں ایک نسوانی چیخ گونجی۔ خوف کے مارے زرینہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔
''یہ کیسی چیخ تھی۔''حیدر علی نے گویا خود سے پوچھا۔
''میں نے کہا تھا ناں شاہ جی۔''وہ خوف کے مارے اس کے قریب آ گئی۔
''پاگلوں والی باتیں مت کرو' تم پڑھی لکھی لڑکی ہو' یہ کسی بلا کی نہیں عورت کی چیخ تھی۔''
''بلائیں آوازیں بدل بدل کر چیختی ہیں۔''چیخ ایک مرتبہ پھر گونجی۔
''لیکن یہ بلا کنویں کی نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''حیدر علی نے اسے تسلی دی۔''آواز ڈیرے کی سمت سے آ رہی ہے۔''وہ جو کوئی بھی تھی۔ اب اس کی چیخوں میں تسلسل آ گیا تھا۔
''گوری کوئی عورت مصیبت میں ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔''اس نے زرینہ کو بتایا۔''یہ کنویں کی کوئی بلا نہیں ہے۔ تم آرام سے بغیر کسی خوف کے یہاں بیٹھو میں دیکھتا ہوں کہ یہ عورت کون ہے۔ اور اس پر کیا افتاد ٹوٹی ہے۔''
''نہیں۔''وہ چلائی۔''آپ کہیں نہیں جائیں گے' کہیں نہیں۔''
زرینہ نے اس کا بازو سختی سے تھام لیا۔
''گوری سمجھنے کی کوشش کرو۔''
''میں کچھ سننا کچھ سمجھنا نہیں چاہتی۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ اگر آپ گئے تو میں اس کنویں میں کود کر جان دے دوں گی۔''
''او گاڈ۔ گوری پلیز' صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ کسی جن بھوت یا بلا کی آوازیں نہیں ہیں۔ تمہاری جیسی کسی لڑکی یا عورت کی چیخیں ہیں جو کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں یا کوئی اور پریشانی ہوا سے۔''
''میں کچھ نہیں جانتی۔''وہ رو پڑی۔''آپ نہیں جائیں گے۔ ہم دونوں بھی اس کنویں کے پاس نہیں بیٹھیں گے۔''
یک لخت چیخوں کی آوازیں تھم گئیں اور فضا میں صرف جھینگروں کے بولنے کی آوازیں رہ گئیں۔

☆======☆======☆

ڈیرے کے قریب واقع گھر بھی اس سے کافی فاصلے پر تھے' پھر بھی چیخوں کی مدھم مدھم آوازیں ان گھروں تک پہنچ گئی تھیں۔ دن کا وقت ہوتا تو شاید ان گھروں کو خبر بھی نہ ہوتی لیکن رات کے سناٹے میں یہ آوازیں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگوں کی نیندیں اتنی گہری تھیں کہ زیادہ تر لوگوں کو کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ چند ایک جاگ گئے' لیکن کچھ کو ان کی ضعیف الاعتقادی اور کچھ کو بیویوں نے باہر نکلنے سے روکا۔ یا کسی نے تجسس کے مارے دروازے کی درز سے باہر دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر سامنے پھیلی تاریکی میں ان کی آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہی ہیں۔ کنڈی کسی بھی گھر کی نہ کھلی۔

☆======☆======☆

چلو' میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔'' حیدر علی نے زرینہ سے کہا۔

''مجھے گھر چھوڑنے کے بعد آپ وہاں تو نہیں جائیں گے؟'' اس نے اس سمت اشارہ کیا جہاں سے چیخوں کی آواز آئی تھی۔

''اب جانے کا کیا فائدہ۔ بھلی یا بری مصیبت بہر حال گزر چکی ہے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔

''کل یہیں مل سکتی ہو؟'' چلتے چلتے حیدر علی نے پوچھا۔

''جی ضرور۔''

''زیادہ تردد کی ضرورت نہیں ہے اگر نہ آ سکو تو پریشان مت ہونا۔ میں سمجھ جاؤں گا کہ تمہیں موقع نہیں مل سکا۔''

''ہوں۔''

چلتے چلتے مسجد کے سفید میناروں کے دھندلے ہیولے دکھائی دینے لگے' زرینہ رک گئی۔

''کیا ہوا؟''

''میں زنجیر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔'' اس نے گلے میں پڑی سونے کی زنجیر اتار دی۔

''کیوں؟''

''اس چنری کو تو میں اپنے کپڑوں میں چھپالوں گی لیکن۔''

''اس زنجیر کو چھپانا تو زیادہ آسان ہے۔''

''اماں کی نظروں سے کچھ بچنا ممکن نہیں۔ چنری اور خوشبو کی خالی بوتل کے لیے تو کوئی سا بہانہ کیا جا سکتا ہے لیکن سونے کی اتنی قیمتی زنجیر کے لیے میں کوئی بہانہ نہیں کر سکوں گی۔ ہمارے گھر سونے کا صرف ایک زیور ہے' اماں کی بالیاں' چند ماشوں کی ہوں گی۔ انہوں نے یہ زنجیر

دیکھ لی تو بہت برا ہوگا۔''

''یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔ تاکہ سدا تمہاری مرمریں گردن میں چمکتی رہے۔''

زرینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی' پھر زنجیر اس کی جانب بڑھا دی۔

''اس کی چند کڑیاں الگ کر کے مجھے دے دیں۔ باقی اپنے پاس رکھ لیں۔

''وہ کس لیے؟''

''تاکہ آپ کی نشانی میرے پاس رہے۔ پھر جب ہم دونوں مل جائیں گے تو ان کڑیوں کو جوڑ کر دوبارہ زنجیر مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد میں اسے کبھی اپنے سے الگ نہیں کروں گی۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''ایسا ہی سہی۔''

حیدر علی نے ذرا سا زور لگا کر زنجیر دو حصوں میں تقسیم کر دی۔ چھوٹا حصہ زرینہ کو تھما دیا اور بڑا حصہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''شکریہ۔'' زرینہ بھی مسکرا دی۔

''یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ شادی کی رات تمہیں تمہاری یہ امانت مل جائے گی۔''

وہ ہولے سے ہنس پڑی اور وہ دونوں ایک بار پھر چل پڑے۔

''تم گھر میں کیسے داخل ہوگی؟''

''میرے کمرے میں کھڑکی ہے۔ زمین سے زیادہ بلند بھی نہیں ہے اور اس میں سلاخیں بھی نہیں لگی ہوئیں۔ اسی سے جاؤں گی۔''

کھڑکی میں رضیہ بے چینی سے کھڑی ہوئی تھی۔ زرینہ کو واپس آتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ چھوٹے شاہ صاحب اسے چھوڑنے کے لیے خود آئے تھے' یہ دیکھ کر اسے مزید تسلی ہوئی۔ اب تک وہ شدید پریشانی اور اعصابی کشیدگی کا شکار تھی۔ ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزرا تھا۔

کھڑکی سے قدرے فاصلے پر زرینہ نے رک کر شاہ صاحب سے بات کی اور آگے بڑھ کر کھڑکی پھلانگ لی۔ وہ وہیں کھڑے اسے اندر جاتے دیکھتے رہے۔ جب زرینہ نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کا اشارہ کیا تو وہ واپس چل پڑے۔

زرینہ کے کمرے میں آتے ہی خوشبو کا جھونکا بھی اندر آ گیا۔

''شکر ہے تم آ گئیں۔'' رضیہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کا ماتھا چوما۔ ''تم تھوڑی دیر تک اور نہ آتیں تو میں خوف سے مر ہی گئی ہوتی۔''

''پاگل ہو۔'' وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ ''پتا ہے رضیہ آج میں بہت خوش ہوں یہ دیکھو۔''

اس نے بند مٹھی کھولی۔ لالٹین کی زرد مدھم روشنی میں اس کی نرم ہتھیلی پر گلے کی زنجیر کی چند

کڑیاں جگمگا اٹھیں۔

''یہ کیا؟''

''یہ شاہ جی نے دی ہے اور یہ بھی۔'' اس نے چنری دکھائی۔

''تمہارا تو پورا وجود خوشبو میں ڈوبا ہوا ہے۔''

''یہ مہک بھی شاہ جی کی بدولت ہی ہے۔'' اس نے پرفیوم کی خالی شیشی اسے دکھائی۔

''اماں اور ابا کو کیا جواب دو گی؟ یہ خوشبو صبح تک بھی تمہارے وجود سے الگ نہیں ہو گی۔''

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا لیکن خیر میں کچھ بھی بہانا کر دوں گی۔''

''میں تمہاری جلدی واپسی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ دیکھ میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔'' زرینہ نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''تم مت گھبرایا کرو۔ آج تو اتنا مزہ آیا۔ پتا ہے کیا ہوا۔'' اس نے جوش کے ساتھ سب باتیں رضیہ کو بتانی شروع کیں۔

☆======☆======☆

''نسیم کے ابا! اتنا دن چڑھ آیا ہے۔ ذرا جا کر خالہ جی سے پتا تو کرو کہ وہ اب تک کیوں نہیں آئی۔'' نسیم کی ماں نے کہا۔

''آ جائے گی تُو کیوں گھبراتی ہے۔ خالہ جی کی طبیعت خراب ہو گی اس لیے رک گئی ہو گی۔''

''تم نے ہی اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ رات کو وہاں نہ رکے' لیکن تم باز نہ آئے۔ کہہ ہی دیا کہ بے شک رات وہیں رہ جائے۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ جوان جہان لڑکی ہے۔ کل کلاں کچھ ہو گیا تو کتنی بدنامی ہو گی۔''

''تم بھی حد کرتی ہو۔ سارا گاؤں دیکھا بھالا ہے۔ کیا ہو گا اسے۔'' وہ استرا تیز کرتے ہوئے بولا۔

''میری بات یاد رکھو۔ سیانے کہتے ہیں کہ درانتی کے ایک طرف دندانے ہوتے ہیں لیکن دنیا کے دونوں طرف۔''

''یہ سیانا ضرور تمہارا باپ ہی ہو گا۔ کرنے کو اس کے پاس کچھ تھا نہیں۔ سارا دن حقہ گڑگڑاتا تھا اور فرمان جاری کرتا تھا۔ یا پھر سیانی تمہاری ماں تھی۔ جب نصیحتوں کی پٹاری کھول لیتی تھی تو اس سے نئی نصیحتیں مسلسل برآمد ہوتی تھیں۔''

''خبردار جو میرے ماں باپ کو برا بھلا کہا۔ تمہارے ماں باپ کیا تھے؟ جاہل مطلق۔ مرتے مر گئے پر کبھی عقل کی کوئی بات نہ کی۔''

دروازہ زوردار آواز میں بجا۔

''اس وقت کون سی مصیبت نازل ہو گئی۔'' نسیم کا باپ استرا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا اور کنڈی کھول دی۔ سامنے گاؤں کے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ تم سب بہت پریشان لگ رہے ہو؟''

''کوئی پریشانی سی پریشانی ہے۔ کل رات چیخوں سے گاؤں کے در و دیوار لرزتے رہے۔ کوئی بلا بری طرح چیخ رہی تھی۔ تمہیں نہیں پتا چلا کیا؟''

''نہیں۔'' وہ ہونقوں کی طرح ان کی جانب دیکھنے لگا۔

گاؤں والوں نے چیخوں کا قصہ خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ کتنی کلیاں لگائی گئیں۔ کوڑوں کے برسنے کی آوازیں۔ کتوں کے رونے یہاں تک کہ زمین کے ہلنے کی شہادتیں بھی سامنے آئیں۔

''اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پرانے کنویں کے اندر سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔''

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ محسوس تو مجھے بھی ہوا تھا کہ کچھ ہو رہا ہے۔'' نسیم کا باپ جوش سے بولا۔ ''چارپائی ہلنے کا تو مجھے پتا چلا تھا پر نیک بخت نے کہا کہ زلزلہ آیا ہو گا۔''

''نسیم کے ابا تماشا دیکھنے مت کھڑے ہو جانا۔ جلدی آنا بلکہ جاتے جاتے خالہ کے گھر نسیم کا پتا کرتے جانا۔'' اس کی ماں اندر سے چلائی۔ ''سارا کام بکھرا ہوا ہے' کہنا جلدی آئے۔''

''اچھا۔ اچھا۔''

''نسیم خالہ کے گھر کب ہے۔ ابھی میں انہی کے گھر سے آ رہا ہوں۔'' ہجوم میں سے ایک نے کہا۔

''وہیں اندر ہو گی' تمہیں خبر نہیں ہوئی ہو گی۔'' اس کا باپ بولا۔ ''کل شام گئی تھی ماں نے منع کیا کہ رات وہاں نہ ٹھہرے پر میں نے کہا کیا حرج ہے۔''

''مگر چاچا! وہ تو شام کو ہی وہاں سے چل پڑی تھی۔ میں نے کہا بھی آپا نسیم میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں پر وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی کہ خود ہی چلی جائیں گی۔''

''کیا؟'' نسیم کے باپ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ''لیکن وہ تو رات کو گھر نہیں پلٹی۔''

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر سب اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔ نسیم کی ماں بھی گھبرا کر باہر نکل آئی۔

''ہاں چاچا! لسی اور مکھن لیتے لیتے اسے دیر ہو گئی تھی لیکن خالہ جی کے اصرار کے باوجود بھی وہ رکی نہیں۔ کہنے لگی کہ اماں ڈانٹے گی۔''

''ہائے میری بچی کہاں گئی۔'' اس کی ماں نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا۔

''میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' اس کا باپ بوکھلا گیا۔ پھر نسیم کا بتانے والے لڑکے کے سر پر

چپت رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کم بخت کون سا سچ کہہ رہا ہوگا۔ تُو اندر جا میں ابھی خالہ جی کے گھر دیکھ کر آتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ساتھ سب ہی خالہ کے گھر کی طرف بڑھے۔ جس راستے سے گزرے، جس شخص سے ملے سب کو خبر ہوگئی۔ ہجوم بڑھتا گیا۔

خالہ جی نے بھی وہی بتایا جو اس لڑکے نے بتایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورے گاؤں میں ڈھنڈیا پٹ گئی۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی گھر سے اچانک غائب ہو جائے لیکن ایسی صورت میں کسی اور گھر سے کوئی لڑکا بھی ضرور غائب ہوتا تھا۔ اور لوگوں کے لیے معاملہ کی تہہ تک پہنچنا مشکل نہیں ہوتا تھا لیکن ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ لڑکی اکیلی غائب ہوئی تھی۔ گاؤں بھر کے لیے یہ ایک معمہ تھا۔

ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد نسیم کی لاش پرانے کنویں کے قریب کھیتوں میں مل گئی۔

☆======☆======☆

''میں نے تم سے کہا تھا کہ لاش کنویں میں پھینکنا اور تم باہر کھیتوں میں پھینک آئے۔'' شکورا اپنے ماتحتوں پر برس رہا تھا۔ ''جانتے ہو لاش مل گئی ہے۔''

''ہم تو وہیں لے جا رہے تھے لیکن کنویں کے قریب سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور وہ جگہ آسیب زدہ۔ ہمیں کچھ ہو جاتا تو بال بچوں کا کیا بنتا' انہیں کون سنبھالتا۔''

''مجھے تو لگتا ہے۔'' ان میں سے ایک راز داری سے بولا۔ ''کل کنویں سے کوئی بلا نکل آئی ہوگی۔ بہت دن تک سوتی ہیں بلائیں۔ اب ان کے جاگنے کا وقت ہوگیا ہے۔''

''نہیں۔'' ایک اور نے اسے گھورا۔ ''نسیم بے گناہ تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر فرشتوں نے اس کی بے گناہی کا اشارہ دیا ہوگا۔ وہ کوئی عام خوشبو نہیں تھی۔ بالکل جنت کی خوشبو لگتی تھی۔ ہو نہ ہو فرشتے اس کی روح لے جانے آئے ہوں گے۔''

''کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' شکورے نے خوفزدگی کے عالم میں کہا۔

''کیوں نہیں۔'' اس کے لہجے میں ویسا ہی یقین تھا۔ ''تم میں سے کسی نے پہلے ایسی خوشبو سونگھی ہے۔''

''نہیں۔'' ان سب نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہ عطر گلاب کی ایسی خوشبو ہے نہ چنبیلی کی۔''

ان کی باتوں نے شکورے کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ وہ بھاگا بھاگا رجب علی شاہ کے پاس پہنچا اور اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

''لاش مل جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' رجب علی نے بے نیازی سے کہا۔ ''کیونکہ لاش

ائیں نہیں کرتی۔''

''وہاں دور دور تک اب بھی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی خوشبو تو پہلے کبھی کسی نے نہیں سونگھی۔''

''سب تمہارا وہم ہے۔''

''معافی چاہتا ہوں شاہ صاحب' لیکن یہ وہم نہیں ہے۔ خوشبو اب ہلکی ضرور ہوگئی ہے۔ لیکن موجود ہے۔ دوسری طرف گاؤں والوں نے عجب تماشا مچا رکھا ہے۔''

''کیوں وہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کہہ رہے ہیں رات بھر گاؤں چیخوں اور سسکیوں کی آوازوں سے لرزتا رہا ہے۔ کوڑوں کی شائیں شائیں کی آوازیں آرہی تھیں اور کوئی عورت چلا رہی تھی۔ گاؤں کے کتے بھی رو رہے تھے۔ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے۔'' اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ ''ہاں کہہ رہے تھے کہ رات کو زلزلہ آیا تھا اور چارپائیاں بھی ہلی تھیں۔''

''سٹوپڈ' ایڈیٹ احمق لوگ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

پرانے کنویں کے پاس لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ نسیم کا باپ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہجوم سے کچھ فاصلے پر رجب علی شاہ کی اوپن ٹاپ جیپ رکی۔ اسے آتا دیکھ کر سب نے سلام کر کے راستہ چھوڑ دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے رعب سے پوچھا۔

گاؤں کا ایک بزرگ سب کے نمائندہ کی حیثیت سے سامنے آیا اور بہت سے الٹے سیدھے واقعات جوڑ کر اور مفروضے قائم کر کے اپنی طرف سے ایک کہانی سنا دی۔

وہ شکورے کی طرف مڑا۔ ''لڑکی کی میت گھر پہنچانے کا انتظام کرو۔''

پھر آگے بڑھ کر نسیم کے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔''

بڑے شاہ صاحب کو اپنے ساتھ ہمدردی کرتے دیکھ کر وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''میری بچی کو ظالموں نے مار دیا۔ شاہ صاحب میری بچی۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

''یوں اپنی بچی کی لاش کو تماشہ مت بناؤ۔ ہم نے میت گھر پہنچانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ کفن دفن کا انتظام بھی ہماری طرف سے ہوگا۔ باقی مرنا جینا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ رونے کے بجائے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔''

اسے تسلی دلاسہ دے کر وہ کنویں کے قریب پہنچا۔ خوشبو اب بھی تھی لیکن کافی ہلکی ہو چکی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لیے خوشبو مانوس سی تھی۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگا۔

''یہ کسی پرفیوم کی خوشبو ہے۔''

کچھ اور گہرے سانس لینے پر اس کے ذہن میں جھکا سا ہوا۔

”Intimate (انٹی میٹ)“

کچھ دن قبل Intimate (انٹی میٹ) کی بھری ہوئی شیشی اس نے حیدر علی شاہ کے ڈریسنگ ٹیبل پر دیکھی تھی۔

☆======☆======☆

زرینہ کے لیے اماں کے سامنے خوشبو کی وضاحت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”کل رات سونے سے پہلے تو نہیں تھی، ہمیں کیا پتا کہاں سے آئی؟“

”سونے سے پہلے تو واقعی نہیں تھی۔“ وہ بولیں۔ ”جب میں آیت الکرسی پڑھ کر پھونکنے آئی تھی، تب بھی نہیں تھی۔“ وہ کھڑکی کی طرف بڑھیں اور باہر جھانکا۔

”کک..... کیا دیکھ رہی ہیں اماں؟“ زرینہ کو اپنا دم حلق سے اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔

باہر کچے میں اس کے اور حیدر علی کے قدموں کے نشان ہو سکتے تھے۔

”دیکھ رہی ہوں کہ کہیں کوئی بچہ عطر کی شیشی تو نہیں پھینک گیا۔“ وہ مڑیں۔

”یہی ہوا ہو گا اماں۔“ زرینہ نے ان کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

”گویا، انہیں قدموں کے نشان دکھائی نہیں دیئے، ہو سکتا ہے بہت مدھم ہو گئے ہوں۔“ اس نے سوچا۔

”مگر یہاں کوئی شیشی نہیں ہے۔“ وہ اس کی سوچوں سے بے خبر بولیں۔ ”اور خوشبو کمرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے، باہر نہیں۔“

رضیہ نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں چرالیں۔

”ہمیں کیا پتا اماں۔“ وہ اپنے آپ میں چور سی بن گئی۔ ”اور پھر خوشبو تو اتنی زیادہ ہے کہ سمت کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا۔ ہم نے کتاب میں پڑھا تھا کہ بعض اوقات ہوا خوشبو یا بدبو کی سمت ہی بدل دیتی ہے۔“

اماں بولیں تو کچھ نہیں، لیکن ان کی تشفی بھی نہیں ہوئی تھی۔

زرینہ چور نظروں سے اپنی چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے جست کے بکس کی طرف دیکھ رہی تھی، جس میں سرخ چنری آدھی سے زیادہ باہر لٹک رہی تھی۔ رات کو لالٹین کی روشنی میں وہ اپنے کپڑے ٹھیک طرح سے اندر نہیں رکھ سکی تھی۔

اماں کمرے سے باہر نکلیں تو رضیہ لپک کر زرینہ کے پاس آگئی۔

”اب کیا ہو گا؟“

”شش!“ زرینہ نے انگلی ہونٹوں پر رکھی۔ ”اماں کو پتا چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”میں کپڑے بکس کے اندر کر دوں، آدھے باہر لٹک رہے ہیں۔“

”رہنے دو بکس گھسیٹنے کی آواز اماں تک ضرور پہنچے گی۔“

”رات کو بھی تو رکھے تھے، بکس نہیں گھسیٹنا پڑا تھا..... چارپائی اٹھالی تھی۔“

”پگلی، وہ رات کا وقت تھا، ابھی ہم چارپائی اٹھا رہے ہوں اور اوپر سے اماں پہنچ جائیں تو۔“

”ہاں یہ تو ہے، اب کیا کروں؟ کسی بھی وقت اماں کی نظر اس پر پڑ سکتی ہے۔“

”اوں!“ رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”ایسا کرو چارپائی پر کروشیے والی بڑی چادر ڈال دو۔ وہ سامنے آجائے گی تو بکس پر کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ زرینہ جلدی سے باہر والی الماری سے چادر نکال لائی۔

”لڑکیو! اپنے ابا کے لیے پراٹھا بنا دو، آتے ہی ہوں گے مسجد سے۔“ اماں نے آواز دی۔

”اچھا اماں۔“ رضیہ جلدی سے بولی۔

مولوی صاحب مسجد سے آئے تو رضیہ نے جلدی سے ناشتہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

”ابا جی، ناشتہ!“

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

”کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”ہاں طبیعت ٹھیک ہے۔“

”پھر ناشتہ کیوں نہیں کر رہے؟“

”دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ بولے۔ ”آج مسجد میں عجیب وغریب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔“

”اللہ خیر کرے۔“ اماں بولیں۔

زرینہ ان کے برابر تخت پر آبیٹھی۔ رضیہ نے بھی پیڑھی گھسیٹ لی۔

”جو بھی مسجد میں داخل ہوا اس کے ہونٹوں پر یہی قصہ تھا۔ میں نے تو کچھ نہیں سنا، لیکن سب مصر تھے کہ رات بھر گاؤں میں چیخ و پکار مچی رہی۔“

زرینہ کے اعصاب ایک دم سے کشیدہ ہو گئے۔ رضیہ سر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن کھرچنے لگی۔

”آوارہ کتے روتے رہے۔“ ان کی بات جاری تھی۔ ”کوڑوں کی شائیں شائیں کی آوازیں سنائی دیں اور زمین بھی ہلی۔“

”کیا ہم اتنے بے ہوش پڑے ہوئے تھے کہ ہمیں خبر نہ ہوئی؟“ اماں بولیں۔

”پتا نہیں، مجھ تک نہ تو کوئی آواز پہنچی، نہ زمین کے ہلنے کا پتا چلا۔ سب کا خیال ہے کہ یہ پرانے کنوئیں کی بلاؤں کی کارستانی ہے۔“

”اللہ خیر کرے۔“ اماں بول اٹھیں۔

"مجھے تحقیقات کی خاطر گاؤں والوں کے ساتھ جانا ہے۔"

"ابا جی! ناشتہ تو کرتے جائیں۔" رضیہ نے کہا۔

"گاؤں بھر پریشان ہے' میرے حلق سے نوالہ بھی نہیں اترے گا۔"

"احتیاط رکھنا رضیہ کے ابا۔" ان کے جاتے جاتے اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

زرینہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی' اس کے پیچھے پیچھے رضیہ بھی چلی آئی۔

"ایسا سب تو نہیں ہوا تھا۔" زرینہ نے ہولے سے کہا۔

"تم آ گئی تھیں کیا پتا ہوا بھی ہو۔"

"یہ سب کسی نے یونہی اُڑائی ہے۔ بلائیں نہیں چیخیں' صرف ایک بلا تھی وہ بھی تب جب شاہ جی نے کنویں میں پتھر پھینکا تھا۔ مجھے ذرا بھی خیال ہوتا کہ وہ یہ کر گزریں گے تو میں کبھی بھی کنویں کی گہرائی کے متعلق استفسار نہ کرتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ پرانے کنویں میں پتھر نہیں پھینکتے۔"

"اگر تمہاری اور چھوٹے شاہ صاحب کی بات کھل گئی تو؟" رضیہ بھی ہول رہی تھی۔

"کیسے کھلے گی' خود سے کھل جائے گی کیا؟ ہمیں کسی نے دیکھا ہے وہاں؟" زرینہ چڑ گئی۔

وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں اور صحن میں ایک ایک کر کے گاؤں کی کتنی ہی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ہر کوئی اپنے ساتھ نئی باتیں اور انوکھے قصے لا رہی تھی۔ جب اماں تک عجیب و غریب خوشبو اور نسیم کے مرنے کی اطلاع پہنچی تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

"رضیہ' زرینہ!" وہ وہیں سے چلائیں۔

"کیا ہوا اماں؟" وہ دونوں جلدی سے کمرے سے باہر نکلیں۔

"اندر چلو۔" اماں خود بھی پاؤں چپلوں میں گھسیڑ کر اندر کی طرف لپکیں۔

"ہوا کیا اماں؟"

"شش!" انہوں نے دونوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "اللہ خیر کرے۔ گاؤں پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ کل رات کنویں کی بلائیں جاگ گئی ہیں۔ انہوں نے نسیم کو بھی مار دیا ہے۔ پرانے کنویں کے پاس سے ایسی خوشبو آ رہی ہے جو اس دنیا کی لگتی ہی نہیں ہے۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ سب بلاؤں کی کارستانی ہے۔ میرا دل ہولا جا رہا ہے۔ تم لوگوں کے کمرے سے بھی عجیب و غریب خوشبو آ رہی ہے۔ کہیں بلاؤں نے تم لوگوں کو تاک تو نہیں لیا؟" اماں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"اماں انسان کو وہم نہیں پالنے چاہئیں اچھی اور بری تقدیر تو اللہ کی طرف سے ہوتی

ہے۔" زرینہ نے جلدی سے کہا۔

"اماں! آپ خواہ مخواہ فکر کرتی ہیں۔" رضیہ نے بھی فوراً اس کی تائید کی۔ "مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہوتی ہے' یہاں انسان' شیطان کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔"

انہوں نے اماں کو تسلی دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ انہیں خوشبو کی حقیقت کا علم تھا' لیکن وہ اماں کو یہ بتا نہیں سکتی تھیں۔

"تم دونوں غور سے میری بات سنو۔" اماں نے کہا۔ "کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم لوگوں کے کمرے سے بھی خوشبو آ رہی ہے' سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟"

"جی اماں۔" انہوں نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"اب کہیں سہیلیوں کو بتاتی نہ پھرنا۔"

"نہیں اماں۔"

"ملانی جی۔" باہر سے ایک عورت نے آواز دی۔ "آپ کو مولوی صاحب بلا رہے ہیں' کہہ رہے ہیں نسیم کے گھر پر سادے آئیں۔"

"میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔" وہ باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ "تم دونوں اپنے کمرے میں قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہنا اور ہاں پانی پر دم کر کے کمرے میں چھڑک بھی لینا۔"

اماں کے ساتھ عورتوں کا ہجوم بھی نسیم کے گھر کی طرف چل پڑا اور وہ دونوں گھر میں تنہا رہ گئیں۔

"اُف خدایا! یہ کیا ہو گیا ہے' کیا کیا کہانیاں بن گئی ہیں ایک چھوٹی سی بات کی۔" زرینہ دھم سے تخت پر بیٹھ گئی۔

"لیکن نسیم کو کیا ہوا؟"

"پتا نہیں' سب کہہ رہے ہیں کہ اسے بلاؤں نے مارا ہے۔"

"مگر وہ اتنی رات گئے باہر کیا کر رہی تھی؟"

"تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"تم ڈر رہی ہو؟" رضیہ نے الٹا سوال کیا۔

"پتا نہیں' مجھے لگتا ہے رضیہ! کہ یہ کچھ اور گڑبڑ ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ شاہ جی بھی کہہ رہے تھے کہ بلائیں ولائیں کچھ نہیں ہوتیں۔"

"بلائیں ہوتی ہیں یا نہیں' لیکن زرینہ تم آج باہر مت نکلنا۔"

"میری فکر چھوڑو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "افوہ! ابھی تک گھر کی صفائی بھی نہیں ہوئی' میں

جلدی سے جھاڑو لگا دوں۔''

☆======☆======☆

نسیم کی موت پر گاؤں بھر میں چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ کسی کا خیال تھا کہ اس کی موت میں پرانے کنوئیں کی بلاؤں کا ہاتھ ہے اور کوئی اس بات پر مُصر تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے آنے کا اشارہ ہے' تب ہی تو وہاں عجیب اور انوکھی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ گاؤں بھر کے بچے بوڑھے' جوان اور عورتیں نسیم کے گھر جمع تھے سوائے ایک شخص کے۔ اچھو۔

جو اپنے کمرے میں چارپائی پر چت لیٹا چھت پر لگے شہتیروں کو گھور رہا تھا۔ ہتک' سبکی' توہین اور ذلت کا احساس اس کے وجود کے ایک ایک ریشے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بے لباس ہو گیا ہو اور سارا گاؤں' یہ زمین آسمان' درخت اور سبزہ زمین پر رینگتے کیڑے مکوڑے' پھدکتی چڑیاں' دُم ٹانگوں میں دبا کر دوڑتے ہوئے کتے' رہٹ کے گرد گھومتے بیل' سب کے سب اس پر ہنس رہے ہوں۔ اس کا مذاق اُڑا رہے ہوں' انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔

اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا' اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔

''اچھو۔'' ماں نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر پکارا۔

وہ ویسے ہی چھت پر نظریں جمائے رہا۔

''اچھو بیٹا! کچھ تو کھا پی لے۔'' اس نے اندر آ کر منت بھرے انداز میں کہا۔

اس کے وجود میں پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔

''کچھ تو بول اچھو؟'' انہوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ''کچھ تو بول......؟''

اچھو کے دماغ میں ایک ساتھ بہت سے دھماکے ہوئے۔ زمین آسمان اور اس کے درمیان کی سب چیزیں تلپٹ ہو گئیں۔ بے شمار سیاہ کوڑے لپلپاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے' لیکن اس کے قریب پہنچ کر وہ سانپوں میں بدل گئے۔ دو شاخہ زبانوں والے سانپ۔

''کچھ تو بول اچھو...... کچھ تو بول......'' ماں اسے جھنجھوڑ کر تھک گئی تو بے اختیار رو پڑی۔

اس نے نظریں گھما کر آنسو بہاتی ماں کی طرف دیکھا۔ رجب علی شاہ کے لیے اس کے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی۔

''کیا بولوں ماں؟'' اس کے ہونٹ ہلے۔ ''کیا بولوں؟ میرا جسم زخمی نہیں ہوا' روح گھائل ہوئی ہے۔ میرا مان ٹوٹ گیا ہے۔''

''اچھو کے ابا!'' ماں چلائی۔ ''جلدی آ۔ اچھو بولنے لگا ہے۔''

منشی بھاگا بھاگا آیا۔

''اچھو بولنے لگا ہے تو نے یہی کہا ہے ناں؟''

''ہاں...... ہاں! اچھو اپنے ابا سے بات کرناں۔'' وہ منت بھرے انداز میں بولی۔

اچھو اٹھ بیٹھا۔

''میں ختم کر دوں گا سب کچھ' زندہ نہیں چھوڑوں گا...... رجب علی شاہ کو۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اس کی بات سن کر منشی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

''نہ بیٹا نہ ایسا نہیں کہتے۔'' پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تو نے میری بات مان لی ہوتی تو کاہے کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔ کتنا کہا تھا کہ وہ دو کوڑی کا جانور واپس کر دے' تجھ سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھا وہ' ہوا کچھ فائدہ تیرے اَڑنے کا؟''

''کیوں دیتا میں اپنا راجہ اسے؟'' اچھو چلایا۔ ''وہ کون ہوتا ہے میرے راجہ کو مجھ سے جدا کرنے والا۔ آپ اپنی اولاد کسی کے حوالے کر سکتے ہیں؟ مجھے یا سلیم کو مالکوں کے کہنے پر کہیں پھینک سکتے ہیں۔

راجہ میرا بیٹا ہے' میری اولاد ہے' میرا دوست' ساتھی' غمگسار سبھی کچھ تو راجہ ہے میں کیوں اپنے سب رشتے کھو دیتا۔

اور وہ سانپ جیسی زبانیں رکھنے والے لوگ' یہ گاؤں والے' کیا میں مر گیا تھا کہ ساری شام آنگن میں بیٹھے آپ دونوں کو دلاسا دیتے رہے۔ ان کی زبانیں اور بات کر رہی تھیں' آنکھیں اور...... وہ تسلی دینے نہیں تماشا دیکھنے آئے تھے۔ یہ دیکھنے آئے تھے کہ گاؤں کا سب سے بڑا شہ زور کس طرح اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ اس کی پیٹھ جو مکر اور فریب سے زمین کے ساتھ لگی تھی' اس کا نظارہ کرنے آئے تھے وہ سب' مجھے نفرت ہے ان سب سے آخ تھو۔''

''مجھ پر رحم کر اچھو' میرے بڑھاپے پر رحم کر' میرے بازوؤں میں اور بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں ہے۔ اتنا بار نہ ڈال میرے اوپر۔'' منشی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''اولاد ماں باپ کے بے روح جسم دیکھ سکتی ہے' لیکن ماں باپ کے وجود کو اسی دن دیمک لگ جاتی ہے جس دن انہیں اولاد کے بے روح جسم دیکھنے پڑتے ہیں۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں ہمارے بڑھاپے پر رحم کرو۔''

رجب علی شاہ کے لیے اس کے دل میں نفرت کی ایک اور لہر اٹھی پہلے سے زیادہ شدید۔

اس نے مٹھیاں بھینچ کر اپنے جذبات اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور بمشکل بولا۔

''تو پھر ابا! کبھی مجھے بولنے کے لیے نہ کہنا۔ میری نفرت مجھے کچھ اور بولنے نہیں دیتی۔''

☆======☆======☆

''یہ سب کیا ہو رہا ہے رجب علی؟'' پیر صاحب غصے اور پریشانی میں مبتلا تھے۔
''کیا بابا جان؟'' اس نے یوں کہا جیسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔
''رجب علی! تم وارث ہو اس گدی کے' تمہیں خبر ہونی چاہیے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''
''آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ گاؤں والے جاہل ہیں اور نہ جانے کیا کیا بک رہے ہیں۔ ان کی باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''کیسے کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نسیم اس گاؤں کی بیٹی تھی اور گاؤں کی ہر بیٹی کی عزت اور جان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے' ہمارا فرض ہے۔''
''بابا جان! یہ عورتیں گاؤں کی گلیوں میں بے پردہ دندناتی پھرتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال کا نتیجہ اس سے کیا مختلف ہوگا۔''
''یہ اس لیے بے پردہ رہتی ہیں کہ برقعے اوڑھ کر کھیتوں میں کام نہیں کیا جا سکتا اور ان کا کھیتوں میں کام کرنا ہماری معاشی مجبوری ہے۔''
''مجبوری ہے یا نہیں' مجھے اس سے بحث نہیں ہے بابا جان! جس ماحول میں یہ لڑکیاں رہ رہی ہیں' اس ماحول میں یہی سب کچھ ان کے ساتھ ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''باقی رہا اس گھرانے کی تسلی تشفی کا کام تو وہ میں نے کر دیا ہے۔ چالیس دن تک کھانا انہیں حویلی سے ہی جائے گا۔ کفن دفن کے خرچ کی ذمہ داری بھی میں نے لے لی ہے' اس کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے؟ خود سوچیں وہ لڑکی اتنی رات گئے باہر کیا کر رہی تھی۔ اس سارے معاملے میں وہ بھی یقیناً قصوروار تھی۔''
''ہوں' اتنی رات گئے اسے گھر سے باہر نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' پیر صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔

''میں نے پتا کروایا تھا' اپنے گھر سے وہ یہ کہہ کر گئی تھی کہ رات گاؤں کی خالہ جی کے گھر گزارے گی۔ حالانکہ اس کی ماں نے اسے منع بھی کیا تھا' جبکہ خالہ جی کے گھر وہ بمشکل آدھا گھنٹہ رکی تھی اور یہ کہہ کر چلی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔'' رجب علی نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو میں مزید تحقیقات کر لیتا ہوں۔ میں اس لیے خاموش ہو گیا تھا کہ خواہ مخواہ مری ہوئی لڑکی کی بدنامی ہوگی۔''

''کسی بچی کی بدنامی نہیں ہونی چاہیے' نہ اس کی زندگی میں نہ زندگی کے بعد۔''
''جی بابا جان! اسی لیے میں نے گاؤں والوں کی ان فضول کہانیوں کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''ایسی بچیوں کے متعلق سوچ کر ہمارا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ ابھی تمہاری شادی کے بعد گاؤں کے جن بچوں اور بچیوں کے رشتے ہمیں طے کرنے تھے' یہ بچی بھی انہی میں شامل تھی۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا پھر قدرے توقف سے بولے۔ ''اور یہ اچھو والا معاملہ کیا ہے؟ ہم

نے علی کو تاکید کی تھی کہ تم سے پوچھ کر ہمیں بتائے' لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ دن بدن پہلے سے زیادہ غیر ذمے دار ہوتا جا رہا ہے۔''
''آئی ایم سوری بابا جان! اس غیر ذمے داری کا مظاہرہ علی نے نہیں میں نے کیا ہے۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''علی نے مجھ تک آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔''
''پھر؟''
''پھر میں نے کہا کہ میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا؟''
''اس بات سے ہمیں بہت دھچکا لگا ہے۔ یہ گاؤں والے پشتوں سے ہمارے خاندان کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کبھی ان سے سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔''
''بابا جان! میں آپ کے رویوں پر تنقید نہیں کرنا چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نئے دور کو اسی کے تقاضوں کے مطابق ہینڈل کرنا پڑے گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں کی آنکھوں میں شرم باقی تھی' مگر اب یہ لوگ بے دیدے ہو گئے ہیں' اپنی مرضی چلانے لگے ہیں' کسی کو اس کے ظرف سے زیادہ مل جائے تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ آپ کی نرم خوئی کی وجہ سے یہ لوگ سر پر چڑھ گئے ہیں' یہاں کی ہر چیز تلپٹ ہو چکی ہے' سارا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا' کوئی شخص حویلی کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ سب اپنا اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں۔''
''نہیں بیٹا' ایسا نہیں ہے اب بھی سب ہمارے اشارے پر گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہیں۔''
''مجھے افسوس ہے بابا جان کہ آپ نے ان لوگوں سے غلط توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ میں نے سب کاغذات کا جائزہ لیا ہے۔ ہر فصل سے ان لوگوں نے اپنے حصے سے زائد حصہ وصول کیا ہے' کسی کو دو چار بوری گندم زیادہ چلی جانے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا' غصہ مجھے اس بات پر آتا ہے کہ آپ کے مزارعوں نے ہمیں احمق سمجھتے ہوئے یہ دھاندلی کی ہے' وہ مانگ کر لے جائیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں' مگر جب وہ ہمیں بے وقوف سمجھتے ہوئے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ حرکت کریں گے تو ہمیں بتانا پڑے گا کہ ہم احمق نہیں ہیں۔ سب سے برا حال تو اصطبل کا ہے' آپ کہتے ہیں بابا جان کہ یہ لوگ ہمارے اشارے پر جان تک قربان کر سکتے ہیں' مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے آپ کی نرم مزاجی نے ان کے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر دیا ہے کہ ہماری بات ان کے لیے بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔''
''کیسی بات کر رہے ہو رجب علی؟''
''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بابا جان۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ ''اچھو کے پاس اتنا

بہترین گھوڑا تھا جتنا ہمارے پورے اصطبل میں نہیں ہے۔ اس احمق نے رائیڈنگ کے لیے بہترین گھوڑے کو تانگے میں جوت رکھا تھا۔''

''یہ گھوڑا ہم نے اسے عنایت کیا تھا۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''درست بابا جان لیکن اس کے ساتھ وہی ہوا' اس کا ظرف اتنا نہیں تھا کہ آپ کی عنایت کو سنبھال سکتا۔ بجائے اس کے کہ وہ کوئی عام سا گھوڑا منتخب کرتا' ایسا گھوڑا جو ایک واہیات تانگے کے قابل ہوتا' اس نے آپ کی نرم خوئی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بہترین گھوڑے کا انتخاب کیا' یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کی چیز حویلی کی چیز سے کمتر ہونی چاہیے' الٹا وہ ہمارا مقابلہ کرنے لگا۔''

''نہیں رجب علی! وہ بہت اچھا اور بہت پیارا جوان ہے' اس کا گھوڑا اس کا خواب تھا' اس کے خوابوں کو چکنا چُور نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''اس نے میری حکم عدولی کی جرأت کی۔ اس حویلی کی عزت قائم رکھنا میرا فرض ہے' میں کسی بھی جگہ کسی کو اس سے آگے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ گھوڑا اس شخص کے قابل نہیں تھا' اس پر اس کا ردعمل جو میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا' آئندہ گاؤں میں کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہیں ہوگی۔''

پیر صاحب گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

''بیٹا! کسی کو ایسا حکم نہیں دینا چاہیے' جسے پورا کرتے ہوئے اسے تکلیف ہو۔''

''یہ تو چھوٹا سا امتحان تھا' جس میں اچھونا کام رہا' وہ سر کیا کٹواتا' اس کے لیے تو ایک گھوڑا واپس کرنا مشکل تھا۔''

''تم اس سے سر طلب کرتے' وہ دے دیتا لیکن تم نے اس سے اس کے خواب طلب کیے تھے' جن پر ہمارا کوئی حق نہیں تھا۔ انسانوں کی نفسیات سمجھو رجب علی۔''

''آپ کا منصب بہت بلند ہے بابا جان اور میں آپ سے بحث کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر وہ گھوڑا اس کا خواب تھا تو میری بھی عزت تھی۔''

''ہمیں تمہاری عزت بہت پیاری ہے۔'' بالآخر انہوں نے کہا۔ ''لیکن بیٹا کوشش کرو کہ اس گاؤں میں پیار محبت بانٹو۔ ہم اچھو کی دلجوئی کرنا چاہتے ہیں مگر اس طرح کہ اس سے تمہاری عزت اور وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔''

''آپ حکم دیں بابا جان۔''

''اچھو بہت کام کا جوان ہے' منشی کو اپنی طرف سے بلاؤ اور اسے کہہ کر اچھو کو اصطبل میں لگوا دو۔ گھوڑے اسے بہت پسند ہیں پھر وہاں اس کا اپنا گھوڑا بھی ہوگا' نہ تمہاری آبرو پر حرف آئے گا اور اس کی خلش بھی جاتی رہے گی۔''

''جو آپ کا حکم۔''

☆======☆======☆

حیدر علی اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس۔'' اس نے اخبار منہ کے آگے سے ہٹایا۔

دروازہ کھلا اور رجب علی اندر داخل ہوا۔

''بھائی جان آپ؟'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ نے کیوں زحمت کی' مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''غرض میری تھی' اس لیے خود ہی چلا آیا۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ نے صرف حکم دیا ہوتا۔''

رجب علی نے پائپ میں تمبا کو بھر کر اسے سلگایا پھر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''چند دن پہلے میں نے تمہاری ڈریسنگ ٹیبل پر انٹی میٹ کی بوتل دیکھی تھی۔ کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟''

''وہ تو نہیں ہے' لیکن اور بہت سے پرفیومز ہیں' آپ چاہیں تو میں حاضر کروں؟''

''نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ ''یہ بتاؤ کہ انٹی میٹ کی بوتل کہاں ہے؟''

حیدر علی چند ثانیے خاموش رہا پھر بولا۔

''وہ میں نے گوری کے لیے خریدی تھی۔''

''ہوں۔'' وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر پائپ کا کش لے کر بولا۔ ''پرانے کنویں کے پاس اسی پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔''

''آں۔'' حیدر علی نے مناسب الفاظ سوچنے کی کوشش کی۔ ''کل رات ہم وہاں ملے تھے۔''

''چلو ایک الجھن تو رفع ہوئی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن علی! اگر تمہیں وہاں گوری سے ملنا تھا تو مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ تمہیں کوئی ناخوشگوار صورتِ حال بھی پیش آ سکتی تھی۔''

وہ خاموش رہا۔

''یہ زیادہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس فضول جگہ کے بجائے کسی بہتر جگہ کا انتخاب کرتے' مثلاً ڈیرے پر بلا لیتے۔''

''ہمارے لیے وہی جگہ بہتر ہے۔'' وہ قدرے تامل سے بولا۔

''اگر تم راز داری کے خیال سے انکار کر رہے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈیرے پر موجود کوئی ملازم زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

''درست کہہ رہے ہیں آپ' لیکن یہ گوری کا اصرار ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو' آئندہ رات کے وقت کوئی بھی وہاں کا رخ نہیں کرے گا۔''

''شکریہ۔'' وہ مسکرایا۔

''تم باہر بھی نکلا کرو' کچھ زمینوں کی دیکھ بھال اور دوسرے مسائل پر نظر رکھا کرو۔''

''مجھے ان چیزوں سے ایک فیصد بھی دلچسپی نہیں ہے انہیں آپ ہی سنبھالیں۔''

''ابھی تو میں سنبھال لوں گا' لیکن کچھ عرصہ بعد ذمہ داریاں تمہارے کاندھوں پر بھی آئیں گی' اس وقت کے لیے تیاری تو کرلو۔''

''ہوجائے گی تیاری بھی۔ ابھی کچھ عرصہ میں ان جھمیلوں سے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا ہے آزاد رہو۔'' رجب علی نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں ہوں ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔''

''آج یہ کیا عجیب و غریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں؟'' اس نے قدرے توقف سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا' وہ ایک لڑکی اٹھوالی تھی' اس نے حماقت میں اپنی جان گنوائی' اس پر یہ فضول کہانیاں مشہور ہوگئی ہیں۔'' رجب علی نے بیزاری سے کہا۔

''کس نے اٹھوائی تھی لڑکی؟'' حیدر علی ایک لمحے کے لیے تو کچھ بھی نہ سمجھا۔

''میرے حکم پر اٹھائی گئی تھی اور کون اٹھواتا۔''

''کیا؟'' اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تم اس قدر حیران کیوں ہو؟''

''یہ نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''تمہاری اخلاقیات کے دائرے خاصے تنگ ہیں علی' تمہارا دم نہیں گھٹتا ان میں؟''

''میں اخلاقیات کا علمبردار نہیں ہوں' لیکن کچھ چیزیں میرے لیے تکلیف دہ ضرور ہیں اور پھر میری...... میرا مطلب ہے' گوری بھی اسی گاؤں کی ہے۔''

''تم اس لیے پریشان ہوگئے ہو۔'' رجب علی مسکرایا۔ ''تمہاری گوری کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ اس طرف سے تم بالکل پریشان مت ہو۔''

''میں صرف اسی لیے پریشان نہیں ہوں' گاؤں کی سب لڑکیوں کی عزت کی حفاظت کی ذمہ داری اس حویلی پر عائد ہوتی ہے۔''

''حویلی کی ذمہ داری انہیں برقعہ اوڑھانا نہیں ہے۔ بے پردہ عورتوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہی کرتا ہے۔'' رجب علی نے اطمینان سے کہا۔

''درست فرمایا آپ نے لیکن کیا بحیثیت مرد آپ یا مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم بے پردہ عورتوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب بن کر ضرور نازل ہوں؟'' حیدر علی نے اپنا غصہ دبانے کی کوشش کی۔

رجب علی کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

''یہ تمہارے معاملات نہیں ہیں علی' تمہاری گوری کو کچھ نہیں ہوگا' باقی سب کی فکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔''

''انسان اپنی تسلی کے لیے سو بہانے گھڑ لیتا ہے' سو دلیلیں دے دیتا ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

رجب علی بدمزگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے۔''

''او گاڈ!'' اس کے جانے کے بعد حیدر علی نے سر پکڑ لیا۔ ''یہ میں کس جگہ پھنس گیا ہوں؟ ان تنگ اور نامعقول رویوں کے بیچ' کتنے سکون سے انگلینڈ میں رہ رہا تھا۔ نہ کوئی فکر تھی نہ پریشانی۔ دن رات اپنے تھے' پتا نہیں کیوں یہ جگہ میرے لیے دلدل بنتی جارہی ہے۔ اور معلوم نہیں رات کو گوری آئے گی بھی یا نہیں۔ گاؤں کی اور لڑکیوں سے زیادہ پڑھی لکھی ہے پھر بھی انہی فضول سے وہموں کو خود سے چمٹائے ہوئے ہے۔ مگر میں اس پر غصہ بھی تو نہیں ہوسکتا۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری' اتنی اچھی کہ اسے دیکھ کر بے ساختہ دل میں محبت ابھر آتی ہے۔ غصے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اب تو اس کے بغیر ایک پل رہنا بھی محال ہے۔''

☆======☆======☆

''خدا کے لیے زرینہ آج رات رک جاؤ۔'' رضیہ نے اس کی منت کی۔ ''میرا دل ڈوب رہا ہے' مجھے لگتا ہے کہ آج رات پھر کچھ ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔''

''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' رضیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''نسیم کے ساتھ کیا ہوا۔ ایک دن میں ہی بھول گئیں۔''

''اس کے ساتھ کچھ اور ہوا ہے رضیہ' وہ نہیں ہوا جو سب سمجھ رہے ہیں۔''

''یہ یا وہ کچھ تو ہوا ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا تم چپ کر کے سو جاؤ۔'' زرینہ جلدی سے کھڑکی پھلانگ گئی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جب وہ پرانے کنویں کے قریب پہنچی تو حیدر علی پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔

''شکر ہے تم آگئیں۔''

''آپ کو توقع نہیں تھی؟''

''تھی بھی اور نہیں بھی۔'' وہ کنویں کے قریب ٹوٹے بنچ کی طرف بڑھے۔

''وہ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ تم بہت وہمی ہو۔ میں سوچتا رہا کہ آج کی کہانیاں تم پر نہ جانے کیا اثر ڈالیں گی۔''

''میں سوچ رہی ہوں۔'' وہ حیدر علی کے برابر بیٹھ گئی۔ ''کل رات آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ نسیم کی موت کی وجہ بلائیں نہیں ہیں۔ بلائیں کنویں سے نکلتیں تو پہلے ہم پر جھپٹتیں۔ نسیم کے چلانے کی آواز تو بہت دور سے آ رہی تھی جبکہ اُس کی لاش کنویں کے قریب سے ملی ہے۔ سارا گاؤں اسی لیے غلط فہمی کا شکار ہو رہا ہے' کیونکہ اس کی لاش ان کھیتوں سے ملی ہے۔'' اُس نے قریبی کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور اس لیے بھی کہ یہاں خوشبو پھیلی ہوئی تھی' لیکن ہم جانتے ہیں کہ خوشبو کی وجہ کیا تھی اور یہ بھی کہ نسیم کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی ڈیرے کی سمت سے۔''

''تھینک گاڈ! کہ تم نے اپنے وہموں سے چھٹکارا پا کر اپنی عقل کو بھی استعمال کیا۔''

''مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ایک مرتبہ پھر کنویں میں پتھر پھینکیں۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''نہیں اب نہیں پھینکوں گا۔''

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ نسیم کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اتنی رات گئے تک گھر سے باہر رہتی۔''

''نسیم کے ساتھ کیا ہوا کو چھوڑ' یہ پوچھو کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟'' وہ اس کا ذہن اس واقعے کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔

''کیا ہوا آپ کے ساتھ؟''

وہ ہنسی تو اس کے موتیوں کی لڑیوں سے سفید دانت چمک اٹھے۔ حیدر علی چند ثانیے تک اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔'' وہ شرما گئی۔

''دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی حسین' کتنی سندر ہو۔ ایک مرتبہ مجھے یونان جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں میں نے ایفروڈائنا کا مجسمہ دیکھا تھا۔''

''کس کا؟''

''قدیم یونانیوں کی حُسن' محبت اور جنگ کی دیوی ایفروڈائنا کا۔'' وہ بولا۔ ''اسے دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ اس سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں ہو سکتا' لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد میں نے اپنا یہ خیال بدل دیا۔''

''میں بہت خوبصورت ہوں شاہ جی؟''

''نہیں' تم بے حد حسین اور دلکش ہو گوری۔''

''اگر میں پیوند لگے کپڑے پہن لوں' تب بھی بہت حسین لگوں گی؟''

''چاند تو چاند کہلاتا ہے' اپنے داغ کے ساتھ بھی۔''

''اگر میں ایسی نہ ہوتی تو؟'' اس نے اپنی شربتی آنکھیں حیدر علی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں بہت حسین نہ ہوتی تب؟''

''تب بھی کیا فرق پڑتا؟''

''پھر بھی آپ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے' اسی طرح میرا انتظار کرتے۔''

''تمہیں کیوں شک ہے؟''

''رضیہ کہتی ہے کہ میں بدصورت اور بدشکل ہوتی تو پھر شاید آپ مجھ سے اتنا پیار نہ کرتے۔'' اس نے کہا۔ ''شاہ جی! آپ مجھ سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں۔''

وہ چند ثانیے خاموش رہا۔

''بتائیں گے نہیں۔''

''سچ سچ بتا دوں؟'' اس نے کہا۔

''جی۔''

''شروع میں تو یہ تمہارا حُسن ہی تھا جس نے مجھے تمہاری طرف بڑھنے پر مجبور کیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر خیال آیا تھا کہ تم ہی وہ منزل ہو جس پر مجھے ڈیرے ڈالنے ہیں۔ پھر دوسری ملاقات پر تمہاری باتیں سنیں تو تمہارا حُسن ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ یاد ہے تمہیں وہ ملاقات؟''

زرینہ نے آنکھیں موند لیں اور وہ سارا منظر جزئیات سمیت اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

''اب میں تم سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ تم محبت کیے جانے کے قابل ہو' کیونکہ میرا دل صدا دیتا ہے کہ تم میری ہو بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔''

''اگر بدصورت ہو جاؤں پھر بھی آپ مجھ سے اسی طرح پیار کرتے رہیں گے۔''

حیدر علی کو اس کی معصومیت پر بے اختیار پیار آ گیا۔

''خوبصورتی اور بدصورتی انسان کے اندر ہوتی ہے گوری۔ خوبصورت شکل وصورت تو انسانی خوبی ہوئی ناں تم اندر باہر حُسن سے رنگی ہوئی ہو۔ اگر تمہاری شکل خوبصورت نہ رہی' تب بھی تمہارے اندر کی خوبصورتی تمہارے چہرے پر حُسن بن کر چھا جائے گی۔ تم تب بھی میری ہی رہو گی۔''

''سچ؟'' وہ کھل اٹھی۔ ''آج میں بہت خوش ہوں۔''

''تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔''

''بڑے شاہ صاحب سے پھر کوئی بات ہوئی؟''

''ہوں' ذرا ان کی شادی کا ہنگامہ سرد پڑ جائے تب کچھ کروں گا۔''

''ابا جی چاہتے ہیں کہ بڑے شاہ صاحب کی شادی کے بعد پیر صاحب سے کہہ کر ہم دونوں بہنوں کی شادی بھی کروا دیں۔''

''یہ کس نے کہا تم سے؟''

''اُڑتے اُڑتے سنا ہے۔''

''تم فکر مت کرنا' میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''

''اب میں کوئی فکر نہیں کرتی۔''

''وہ کتاب پڑھی تم نے جو میں نے دی تھی؟''

''تھوڑی سی۔''

''کیسی لگی؟''

''بہت اچھی۔''

''کچھ یاد ہے کیا پڑھا تھا؟''

''ایک نظم بہت اچھی تھی لیکن وہ جدائی کی نظم تھی۔''

''میرا جی کی زندگی میں وصل کے لمحے آئے ہی نہیں تھے انہوں نے جو کچھ لکھا' وہ سب جدائی اور دوری کے متعلق ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''مجھے جدائی اور دوری کے ذکر سے وحشت ہوتی ہے پر وہ نظم بہت خوبصورت ہے۔''

''سناؤ گی؟''

چند لمحے زرینہ نے اپنے ذہن میں نظم کو دہرایا پھر بولی۔

''کلیاں چٹکیں' غنچے مہکے
رنگ برنگے پنچھی چہکے
اپنی اپنی باتیں کہہ کے
کون بتائے کہاں گئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
چھیڑی ہوئی ہے کتھا سہانی
ایک کہانی سب کی زبانی
کچھ انجانی' کچھ من مانی
پل پل' چھن چھن رنگ نئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
دکھ کے دن اور سکھ کی راتیں
ہونی یا انہونی باتیں

کس کی جیتیں کس کی ماتیں
آنکھ سے اب تک بھید چھپے ہیں۔
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے۔''

''گڈ۔'' حیدر علی نے اسے داد دی۔ ''تمہیں تو یہ زبانی یاد ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''آپ کو اچھا لگتا ہے ناں کہ میں پڑھوں' اس لیے اب میں ضرور پڑھوں گی۔''

''تم زیبی آپی سے ملی نہیں۔'' حیدر علی نے موضوع پلٹا۔ ''انہوں نے تمہیں بلایا بھی تھا۔''

زرینہ مضطرب ہوگئی۔

''گویا زیب النساء نے انہیں اپنی اور میری ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے سوچا پھر حیدر علی کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں پہلو بدل کر بولی۔

''شاہ جی' میں وہاں جانا نہیں چاہتی' کچھ اس لیے کہ وہاں قدم رکھتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے' میری ہمت جواب دے جاتی ہے اور کچھ اس لیے کہ وہاں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

''چند دن رہ گئے ہیں بھائی جان کی شادی میں۔ ایسا کرو' اس شادی میں ان سے مل لینا۔''

''میں شاہ جی؟'' پل کے پل میں اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔''

''او ہو! ٹھیک ہے مت جاؤ۔ روتی کیوں ہو؟'' اس نے اپنا رومال اس کی طرف بڑھایا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے' تھوڑی دیر میں ابا جی تہجد کے لیے جاگ جائیں گے۔'' اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔

''چلو میں چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر واپسی کے راستے پر چل پڑے۔

☆======☆======☆

حویلی ویسے تو ہمیشہ ہی پُر رونق رہتی تھی' مگر ان دنوں اس کی رونق دیکھنے والی تھی۔ عرصے بعد حویلی کے در و دیوار ایسی خوشیاں دیکھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مسرت نذری بیگم کو تھی۔ کتنی خواہش تھی انہیں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی۔ اتنی دفعہ پیر صاحب سے دبے دبے انداز میں کہا بھی کہ اب رجب علی کی شادی کر دینی چاہیے' لیکن ان کی طرف سے ہر دفعہ یہی سننے کو ملتا تھا کہ کچھ دن آزادی سے گزار لینے دو اسے۔ نذری بیگم کو تو یوں لگنے لگا تھا' جیسے ان کی زندگی میں یہ مراد پوری ہی نہیں ہوگی۔

مگر اب یہ دن آنے والا تھا' جس دن کی خواہش میں انہوں نے برسوں ایک ایک دن گن گن کر کاٹا تھا۔ بہو بھی انہیں پسند تھی۔ رجب علی کی شادی ہوتی تو حیدر علی کے لیے بھی راستہ

کھلتا۔

یاسمین بہت اچھی تھی، لیکن ان کی بھانجی نہیں تھی۔ جو محبت انہیں فوزیہ سے تھی، وہ یاسمین سے نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ سگی بھانجی اور پیر صاحب کی بھتیجی میں اتنا فرق ہونا تو لازمی تھا۔

ان کا بس چلتا تو وہ فوراً ہی سخاوت کی بھی شادی کر ڈالتیں۔ وہ چھوٹی عمر میں شادی کر دینے کی قائل تھیں۔ ان کے خیال میں رجب علی اور حیدر علی دونوں کی شادی اب سے پہلے ہو جانا چاہیے تھی۔

خیر اب وہ خوش تھیں۔ دیر سے ہی سہی ان کی زندگی میں یہ خوشی آ رہی تھی۔ وہ خوش ہو کر حویلی کے در و دیوار دیکھتیں جو جگمگا رہے تھے، زیور کپڑے دیکھتیں، مہندی کے تھال سجتے دیکھتیں اور ان کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا۔

☆======☆======☆

چند دن کے شور شرابے کے بعد حالات ایک مرتبہ پھر معمول پر آ چکے تھے۔ نسیم اور بلاؤں کا تذکرہ اب بھی ہوا کرتا تھا، لیکن گاؤں کی فضا میں جو انجانا سا خوف تیرتا رہتا تھا وہ کافی حد تک تحلیل ہو چکا تھا۔ اچھو والے واقعے کی اہمیت تو نسیم کے قصے کے ساتھ ہی دم توڑ گئی تھی مگر خود اچھو ابھی تک دکھ اور اذیت کے خول توڑنے میں ناکام رہا تھا۔

جو تھوڑی بہت گفتگو اس کے متعلق ہوتی تھی اس کا مرکز گاؤں کا واحد اکھاڑا تھا، جہاں نوجوان کسرت کرتے وقت اکثر اس کا ذکر کرتے تھے جبکہ باقی لوگ اس قصے کو تقریباً بھلا ہی چکے تھے۔

پھر بھی اچھو گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں والوں کی یادداشت اتنی بری بھی نہیں ہے کہ اسے دیکھنے کے باوجود بھی انہیں یہ قصہ یاد ہی نہ آ سکے۔

وہ تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ گھر سے نکلتے ہی سب اس کی جانب انگلیاں اٹھا کر ہنسنے لگیں گے، جو نہیں ہنسیں گے ان کے ہونٹ بھی تمسخر سے سکڑ جائیں گے۔ آنکھوں کے گوشے اس کی ذلت کو یاد کر کے چمک اٹھیں گے۔ اور شاید کوئی مذاق اڑاتا فقرہ اس کا کلیجہ بھی چھلنی کر دے، اس لیے وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔

"اچھو۔" منشی فضل دین ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر گھر میں داخل ہوا۔

"کیوں چلاتے ہو، جبکہ جانتے بھی ہو کہ وہ سارا دن اور ساری رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا ہے، بالکل چپ چاپ، گم صم۔" ماں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔

منشی تھک کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"پیر صاحب سے کہہ کر اب اس کی شادی کروا دیتے ہیں، بیوی آ جائے گی تو اسے غمگسار

مل جائے گا۔ دل کے دکھ کہہ دینے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اچھو نے تو ہر بات دل پر لے لی ہے۔ کسی سے کہہ سن کر بوجھ ہلکا بھی تو نہیں کرتا۔"

"اب اس پر شادی یا کسی اور بات کے لیے زور مت ڈالنا۔ کیا خبر غصے میں آ کر کیا کر بیٹھے۔" ماں نے آٹے کی پرات سے سر اٹھایا۔ "اسے کچھ ہو گیا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟" منشی نے سر ہلایا۔ "روز ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑتی ہے۔"

"پھر کچھ کہا شاہ صاحب نے؟"

"ہاں۔" منشی تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کہہ رہے ہیں کہ اچھو آئندہ سے حویلی کے اصطبل میں سائیس کا ہاتھ بٹائے۔"

"کیا؟" وہ دہل گئی۔ "اچھو نہیں مانے گا اور ایک نئی مصیبت نازل ہو گی۔ یا اللہ ہم کس عذاب میں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ اچھو کے کمرے میں چارپائی چرچرائی۔

وہ دونوں دم سادھ کر وہیں دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد کمرے کے دروازے میں اچھو نمودار ہوا اور چلتا ہوا ان کے قریب آ بیٹھا۔ اتنے دن بعد اپنی مرضی سے اسے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر ماں جھٹ پٹ آگے بڑھی اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

"میرا لعل، تو بیٹھ میں کھانا نکالتی ہوں۔"

"پہلے روٹیاں تو پکا لے۔" منشی بولا۔

"لو یہ کتنی دیر کا کام ہے۔ ایک منٹ میں پک جائیں گی۔" اس نے فٹافٹ لکڑیاں جلائیں اور توا رکھ کر روٹیاں پکانے لگی۔

"آج میں نے اپنے بیٹے کی پسند کی مونگ کی ثابت دال پکائی ہے؟" اس نے روٹی توے پر ڈالی۔

وہ چپ کا بیٹھا رہا۔ ماں باپ کے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ کمرے سے باہر نکلا ہے۔

"اس دن بول پڑا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ پھر بولنے لگے گا۔" انہوں نے سوچا۔

صبح جب منشی حویلی جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو چارپائی پر بیٹھا اچھو بھی بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس کے پاس چلا آیا۔ منشی کا دل خوش ہو گیا۔

"باہر چلنا ہے؟ میں تو حویلی جا رہا ہوں تو بھی اپنے یار بیلیوں کو مل آ۔"

وہ دونوں گھر سے باہر نکلے تو گلی میں بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

"اچھو باہر نکلا ہے، اچھو کو دیکھو۔"

احساسِ شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"کتنا کمزور ہو گیا ہے۔"

''ہاں' غریب کو شاہ صاحب نے بہت بری طرح مارا تھا۔''

''چچ' چچ...... بے چارا۔''

''رجب علی شاہ......سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔'' اچھو کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔

لوگوں کو بھولا بسرا واقعہ یاد آ گیا تھا اور ان کی یہ یادداشت اس کے دل پر برچھیاں برسا رہی تھی۔ گاؤں کے بڑے بازار سے اسے گزرتے دیکھ کر کتنے نوجوان اس کی جانب بڑھے۔

''اچھو! تم کہاں چھپے ہوئے تھے اتنے دن سے؟ اکھاڑے کیوں نہیں آئے' ہم آئے تھے تمہارے گھر پر چاچی نے کہا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ہوا کیا تھا؟''

نوجوانوں کو پاس آتے دیکھ کر منشی رک گیا تھا' اس لیے اچھو بھی رک گیا۔ وہ سب کی باتیں سن رہا تھا۔ سر جھکائے' لیکن اس نے کسی کو جواب نہیں دیا۔

''اچھو!'' ایک نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ ''تم بول کیوں نہیں رہے۔''

منشی سے رہا نہ گیا۔ ''یہ سب اس کمبخت گھوڑے کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ منحوس جانور ہمارے گھر آتا نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔''

''اس بے چارے گھوڑے کو کیوں کوستے ہو چاچا' اس نے واپس کر دیا ہوتا تو بڑے شاہ صاحب اس پر ہاتھ کیوں اٹھاتے۔''

''ہاں چاچا! اچھو کو بڑے شاہ صاحب کی حکم عدولی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو اپنے گلے خود ہی مصیبت ڈالنے والی بات ہوئی ناں۔''

''مانا کہ راجہ بہت اچھا گھوڑا تھا' لیکن تھا تو بہر حال جانور......ایک جانور کی خاطر شاہ صاحب کا حکم ٹالنا......توبہ توبہ!''

اچھو اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ اس کے گرد لگے چھوٹے سے مجمع کا موضوع گفتگو اس کی ذات تھی' لیکن اس پر ہونے والی تمام تر بحث میں سب نے اسی کے وجود کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ سب اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے' اسے گھیرے میں لے کر' اسے نظر انداز کر کے۔

''بس اپنی تو قسمت ہی خراب ہے' جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے' اس دن سے بات کرنا چھوڑ رکھی ہے اس نے۔ زبان ہوتے ہوئے گونگا ہو گیا ہے۔'' منشی نے آہ بھری۔

''چاچا سنا ہے بڑے شاہ صاحب نے اچھو کو اصطبل میں کام کرنے کے لیے بلوایا ہے۔''

منشی نے ایک نظر اچھو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو بالکل سپاٹ تھا پھر اقرار میں گردن ہلا دی۔

''تو پھر کیا اچھو کام پر جائے گا؟''

منشی نے ٹھنڈی آہ بھر کر اچھو کی طرف دیکھا۔ اس کی توقعات کے برعکس اچھو نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

''اچھو! تُو واقعی کام پر جائے گا؟'' منشی نے اس کا بازو ہلا کر پوچھا۔

اچھو نے ایک مرتبہ پھر اقرار میں گردن ہلائی اور سر جھکا کر حویلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ منشی بھی اپنا تہبند سنبھالتا اس کے پیچھے لپکا۔

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ' زیب النساء کے کمرے میں بیٹھا اسے اور مہر النساء کو لندن کے قصے سنا رہا تھا۔

''اور آپی! میں نے آپ کو موم کے عجائب گھر کی تصویریں تو دکھائی تھیں ناں۔''

''ہاں' موم کے بنے ہوئے مجسمے یوں لگتے تھے' جیسے جیتے جاگتے انسان کھڑے ہوں۔''

''وہاں سچ مچ انسانوں اور مجسموں میں پہچان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن لندن خوبصورت شہر نہیں ہے۔ جب ہنگامے اور شور شرابے سے میرا دل بھر جاتا تھا تو میں سیدھا کینٹ کاؤنٹی چلا جاتا تھا بہت خوبصورت' بے حد پُرسکون جگہ ہے کینٹ۔ تا حدِ نگاہ گہرا سبزہ یوں لگتا ہے' جیسے سبز ریشم بکھرا ہوا ہو۔''

''مجھے ہریالی بہت پسند ہے۔'' زیب النساء بولی۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ چاہے چھوٹی سی کٹیا ہو' لیکن ہر طرف سبزے سے گھری ہو' اونچے اونچے درخت ہوں' ہولے ہولے بہنے والی ندی ہو اور آسمان پر بہت سے پنچھی ہوں۔''

''جیسا منظر آپ نے بتایا ہے' ایسا تو کوئی پکنک اسپاٹ ہی ہو سکتا ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''ایسا نہ کریں آپی کہ کسی دن پکنک پر چلیں' بہت مزہ آئے گا۔''

''پکنک! وہ کیا ہوتا ہے؟''

''پکنک کہتے ہیں۔'' وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ''کسی خوبصورت مقام پر گھومنے پھرنے اور کرنے کو جب سیر کر کے انسان تھک جاتا ہے تو پھر سب مل کر وہاں کھانا کھاتے ہیں۔''

''سنا بڑی آپا! علی کیا کہہ رہا ہے؟'' زیب النساء مسکرائی۔ ''کبھی ہم ایسا کر سکتے ہیں؟''

''اسے کچھ نہ کہو زیبی' یہ سانس تو یہاں نیاز پور کی فضا میں لے رہا ہے لیکن اس کا دل اور دماغ ابھی تک ولایت میں ہیں۔'' مہر النساء بولی۔

''کیوں؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟'' حیدر علی چڑ گیا۔ ''بات پردے کی ہے ناں تو ہم جہاں بھی گئے' سب سے پہلے وہاں پردے کا اِنتظام کریں گے۔''

مہر النساء ایسے ہنسی جیسے کسی ننھے سے بچے کی ضد دیکھ کر ہنس رہی ہو۔

''آپ یوں کیوں ہنس رہی ہیں آپا! ایسا ہونا ممکن ہے اگر آپ دونوں اس بات کو ممکن بنانا چاہیں تو۔''

''کیوں بابا جان کی نگاہوں سے خود کو گرانا چاہتے ہو علی؟'' مہر النساء یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

''ہم نے خود پر بہت سے بند باندھ رکھے ہیں۔'' زیب النساء نے ہولے سے کہا۔ ''ان میں ایک بھی دراڑ پڑ گئی ناں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پتا نہیں کیا کیا بہہ جائے گا اس سیلاب میں۔

پہلی خواہش کی طرف قدم بڑھنے سے روک لینا مشکل ہوتا ہے ناممکن نہیں' لیکن ایک دفعہ قدم بڑھ جائے تو پھر خواہشوں کا ایسا دلفریب اور لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا' قدموں کو روک لینا ممکن نہیں رہتا۔ اس راستے پر ایک مرتبہ قدم بڑھ جائیں تو واپسی کے سب در خود ہی بند ہو جاتے ہیں۔

میں نہیں چاہتی کہ میں اپنے صبر و ضبط کو کسی امتحان میں ڈالوں۔ بہت کمزور ہوں میں۔ ایسے کسی امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکوں گی۔ مجھے پتا ہے کہ پہلا قدم روکنا بے حد مشکل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہ قدم یہیں رکا رہے۔ یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہ ہوئی تو کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس یہ پوری ہو گئی تو پتا نہیں کون کون سی خواہشیں بے لگام ہو جائیں گی۔''

چند لمحے حیدر علی اسے تکے گیا۔

''آپی آپ کی خواہشیں جائز ہیں تو پھر کیوں بند باندھتی ہیں ان پر؟ کیوں نہیں حق مانگتیں اپنا۔''

''کن سے اپنا حق مانگوں؟ ان سپاٹ دیواروں سے؟ یا پھر ان ساکت و جامد کرسیوں اور مسہری سے؟ جس دن میری صدا ان دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی اس دن حویلی میں قیامت آ جائے گی۔ اس حویلی کی بنیاد اینٹ گارا نہیں وہ نام نہاد معیارِ عزت ہے جس کی اَن دیکھی زنجیروں میں ہم سب بندھے ہوئے ہیں۔ تم چاہتے ہو کہ یہ حویلی زمین بوس ہو جائے۔''

''ہو جانے دیں آپی۔ اسے زمین بوس ہو جانے دیں۔'' وہ بولا۔ ''کوئی بھی مادی چیز انسان سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس جہاں کی سب سے قیمتی چیز انسان ہے۔ اسے ختم نہیں ہونا چاہیے۔ گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہیے۔ اس حویلی کی برجیوں کو آپ کے ناتواں کندھے بہت عرصے تک سہارا نہیں دے سکیں گے۔''

''خدا کے لیے علی ہمیں بغاوت پر مجبور مت کرو۔'' مہر النساء نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ ''ہم خوش نہیں ہیں لیکن اسی طرح رہنا چاہتے ہیں۔''

''آپی میں آپ کو بغاوت کرنے کو نہیں حق مانگنے کو کہہ رہا ہوں۔''

زیب النساء اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کہاں چل دیں؟''

''مجھے نماز پڑھنی ہے۔''

''ابھی بہت وقت ہے۔ آپ کی نماز قضا نہیں ہو گی۔ پلیز ابھی بیٹھیں۔'' حیدر علی نے اس

کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس بٹھا دیا۔

''زرینہ سے ملاقات ہوئی؟'' زیب النساء نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

''ہاں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اب تو روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔''

''تم میں بابا جان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کا حوصلہ ہے؟'' زیب النساء کے انداز میں چیلنج تھا۔

''آپی' میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھ میں حوصلے کی کمی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ باپ کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ جو بات میں نگاہیں نیچی رکھ کر منوا سکتا ہوں' اس کے لیے ان کے سامنے تن کر کھڑا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بات حوصلے کی نہیں محبت کی ہے اور میری محبت نے میرے حوصلے کو سلایا ہوا ہے۔ میں گوری کے لیے سب سے ٹکر لوں گا۔ ضرورت پڑی تو ابا جان سے بھی' لیکن اس سے میری ان کے ساتھ محبت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نہ ہی میں ان کے مرتبہ کو نقصان پہنچا کر اپنی کوئی خواہش پوری کروں گا۔''

''تمہیں اپنی بات میں دوغلاپن محسوس نہیں ہو رہا؟'' مہر النساء نے کہا۔

''آپ کو ہو رہا ہے؟'' حیدر علی نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

''ہاں...... جب تک تمہاری نگاہیں نیچی رہیں گی تب تک تم کچھ بھی نہیں منوا سکو گے۔''

''نہیں آپا! منوانے کے لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا ضروری نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کے لیے گریبان نوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔ ''پتا ہے آپا...... جدوجہد اور حصول مسلسل اور متواتر عمل ہوتے ہیں۔ مجھے بابا جان سے اختلافات ہیں۔ شدید اختلافات۔ بڑے بھائی جان سے بھی ہیں۔ شدید نہیں' شدید ترین۔ بعض اوقات میں مایوس بھی ہو جاتا ہوں لیکن یہ مایوسی وقتی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار ان سے بات چیت کرتے ہوئے جذباتی بھی ہو جاتا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ صدیوں سے قائم یہ طرزِ زندگی' یہ ماحول' ریت رواج اور اندازِ فکر اتنی جلدی تو نہیں بدل سکتا۔ آہستہ آہستہ ہی بدلے گا ناں۔''

''علی جب تم اتنی ساری مصلحتوں کا شکار ہو تو ہم سے کیوں کہتے ہو کہ ہم اپنا حق چھینیں؟'' زیب النساء نے تلخی سے کہا۔ ''تمہارے حوصلے کو محبت نے باندھ رکھا ہے لیکن ہمارے پاس تو حوصلہ ہی نہیں ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہم بھی جدوجہد اور حصول کو متواتر اور مسلسل عمل سمجھتے ہوئے روز بابا جان کے سامنے نگاہیں جھکا کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں؟ تم نظریں نیچی رکھ کر ان سے گوری کا مطالبہ کرو تو ہم بھی ایسا ہی کوئی مطالبہ کرنے ان کے سامنے پہنچ جائیں۔ کر سکتے ہیں ہم ایسا؟

ہم پاکیزگی کے لیے آسمان پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں سے باقی سب لوگ کیڑے مکوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں انسان نہیں رہنے دیا' دیویاں بنا دیا گیا ہے۔ انسانی صفات ہمارے لیے

ممنوع ہو چکی ہیں۔ ہم ایک قدم نیچے اتر آئے تو نہ ہماری جگہ آسمان پر رہے گی نہ زمین پر۔"

کچھ دیر تک حیدر علی سوچ میں گم سگریٹ کے کیش لیتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔

"ہم سب کا سوچنے اور عمل کرنے کا انداز اس لیے مختلف ہے کیونکہ ہم نے زندگی کو مختلف طریقوں سے گزارا ہے اور اس لیے بھی کہ بد قسمتی سے میرے اور آپ کے لیے معاشرے اور اخلاق نے مختلف دائرے کھینچ رکھے ہیں۔ ہم دہرے معیاروں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان معیاروں کو فخر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بابا جان کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کے بیٹے ولایت سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ ان کی بیٹیوں کے کمرے کا رخ تو ہوا بھی نہیں کرتی۔

ایسے معاشرے میں نہ وہ غلط ہے جو میں سوچتا ہوں نہ ہی وہ جو آپ سوچتی ہیں۔ مجھے آگے بڑھنے کا اختیار اسی معاشرے نے دیا ہے اور اسی نے آپ کے قدم زمین سے جکڑ دیئے ہیں۔"

"نہیں۔" زیب النساء نے سر ہلایا۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں بیک وقت غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ پکنک پر جانا بالکل غلط بات نہیں ہے۔" حیدر علی نے ماحول کو خوشگوار بنانا چاہا۔ "ذرا بھائی جان کی شادی ہو جائے پھر ہم پکنک منائیں گے، یہیں اپنی زمینوں پر۔"

"علی ہمیں ان دیواروں سے نکالنے کی بات مت کرو۔"

"بس آپی میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔"

"کسی اور کو بھی لے جانا ہے کیا؟"

مہر النساء نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

"اگر گوری بھی چلی جائے تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"ہم نے اب تک تمہاری گوری پر کوئی اعتراض کیا ہے جو اب کریں گے۔" مہر النساء بولی۔ "میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ پکنک ہمارے نہیں کسی اور کے لیے ہے۔"

"بڑی آپا۔" اس نے مہر النساء کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "یہ پروگرام صرف آپ دونوں کے لیے ہے، گوری پھر کبھی سہی۔"

"علی! تم کتنے خوش فہم ہو۔" وہ ہنسی۔ "تم تو غالباً خیالوں ہی خیالوں میں پکنک منا بھی چکے ہو۔"

"جہاں ہر طرف دیواریں ہی دیواریں ہوں کوئی بھی روزن، کوئی دریچہ نہ ہو وہاں خوش فہمی ہوا کے کسی معطر اور لطیف جھونکے کی طرح ہوتی ہے۔ انسان کو خیالوں کی الگ دنیا تو نہیں

بسانی چاہیے لیکن کبھی کبھار اچھے خواب دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

☆======☆======☆

اصطبل میں داخل ہوتے ہی اچھو نے نگاہیں گھما کر راجہ کو تلاش کرنا چاہا۔ دائیں طرف سے سب سے آخری کونے میں راجہ اپنے تھان پر کھڑا اسے دیکھ کر ہنہنا رہا تھا۔ اچھو تیزی سے اسی طرف لپکا۔ وہ اسی کا راجہ تھا۔ چمکدار سیاہ جلد والا راجہ، اسے دیکھتے ہی اچھو کے دل میں محبت کا سمندر موجیں مارنے لگا۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا شہہ زور تھا۔ بہادری کا کوئی تمغہ ہوتا تو گاؤں بھر میں صرف اسی کو ملتا۔ اس کا خیال تھا کہ بہادر شخص کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آتے لیکن اپنے راجہ کو دیکھ کر نہ جانے کیسے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اور یہاں اس کا راجہ کتنا بے رنگ لگ رہا تھا۔ نہ سر پر سرخ تاج تھا، نہ کانوں کے قریب رنگ برنگے پھندنے تھے اور نہ گلے میں گھنٹی تھی جو اس کے سر کی جنبش کے ساتھ ساتھ میٹھے سروں میں گنگنانے لگتی تھی۔ وہ تو ہر روز صبح کو موتیے کے تازہ پھولوں کا ہار راجہ کی گردن میں ڈالا کرتا تھا۔ اسے سجا سنوار کر رکھا کرتا تھا۔

اس نے بے اختیار راجہ کو چوم لیا اور پھر کتنی دیر تک اس سے لپٹ کر بے آواز روتا رہا۔

"اچھو بڑے شاہ جی آ رہے ہیں۔" بوڑھے سائیس کی گھبرائی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد رجب علی شاہ اور سخاوت اصطبل میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے بڈھا سائیس چھوٹے چھوٹے قدموں سے تقریباً دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ اچھو کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ برجیز میں ملبوس دونوں بھائی بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ دونوں کے دائیں ہاتھ میں چابک تھا۔ اچھو کی نیچی نگاہیں صرف ان کے لانگ شوز اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے چابک دیکھ سکتی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر نفرت اس کے جسم کی سب رگوں میں لہو کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ اس نے بہت مشکل سے خود پر قابو پا رکھا تھا۔

"ہوں۔" رجب علی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "شاید تمہیں معلوم ہو کہ یہاں پر تم پیر صاحب کی سفارش کی وجہ سے کھڑے ہو۔ ایک حماقت تم کر چکے ہو۔ کرنا چاہو تو دوسری بھی کر گزرو لیکن تیسری حماقت کی صرف حسرت ہی رہ جائے گی اور اپنی اس حسرت کے ساتھ تمہارا یہ جسم زمین کے نیچے اور روح آسمان کے اوپر پہنچ جائے گی۔ پیر صاحب کی مزید کوئی سفارش تمہارے کام نہیں آئے گی۔"

ضبط کرنا بہت مشکل تھا مگر اچھو پھر بھی ضبط کر رہا تھا۔

"یہاں تمہیں مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے نہیں رکھا گیا۔ یہاں کام کرنا ہوگا۔ سمجھے؟"

رجب علی کو ہر بات میں ''جی حضور'' سننے کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ اپنی بات کے جواب میں ''جی حضور'' سننے کی خاطر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اچھو کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر اس کے ماتھے پر ڈھیروں شکنیں پڑ گئیں۔

''تم نے ہماری بات نہیں سنی؟''

اچھو نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔

''حضور یہ بول نہیں سکتا۔'' بڈھے سائیں نے جلدی سے مداخلت کی۔

''بول نہیں سکتا؟'' رجب علی کے انداز میں تعجب تھا۔ ''کیوں بکتے ہو۔ ہم نے خود اسے بولتے سنا ہے۔''

''سرکار پہلے بولتا تھا پر اب صدمے سے گونگا ہو گیا ہے۔'' سائیں نے وضاحت کی۔

''کیا صدمہ ہوا ہے تمہیں؟ باپ مر گیا ہے یا ماں کو کفن پہنا کر آ رہے ہو؟'' رجب علی نے اسے گھورا۔

اچھو نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

''حضور اسے معاف کر دیں۔ مولوی صاحب کا دم کیا پانی پیے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔'' سائیں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''ہوں۔ جوان آدمی ہے اسے کسی سخت کام پر لگاؤ۔'' رجب علی شاہ نے کہا اور اسے ایک ہاتھ سے دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔

اچھو کے دل و دماغ میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ رجب علی کے جانے کے بعد اس نے مشقت سے بھرپور دن گزارا تھا۔ اسے سخت سے سخت کام سے بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی لیکن رجب علی کی باتوں نے سب کاموں کو بہت بوجھل بنا دیا تھا۔

دوپہر کو مکھن لگی روٹی اور لسی کے گلاس سے پیٹ کی آگ بجھا کر وہ درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔

''رجب علی شاہ! میں چاہتا تو آج بہت آسانی کے ساتھ تیرا گلا گھونٹ کر تجھے ہلاک کر سکتا تھا۔ میرے بازوؤں میں اتنی جان ہے کہ چند منٹ میں تجھے ٹھنڈا کر دیں۔ مجھے یہ بھی پروا نہیں کہ اس کے بعد میرا کیا حشر ہوگا۔ میری بوٹیاں کتے نوچیں گے' پڑے نوچتے رہیں۔

پھر بھی میں نے تجھے نہیں مارا۔ اس لیے نہیں کہ میں اپنی بے عزتی بھول گیا ہوں۔ اس لیے بھی نہیں کہ مجھے تجھ پر ترس آ گیا ہے اور اس لیے بھی نہیں کہ میں کسی انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ صرف اور صرف اس لیے رجب علی شاہ کہ میں تیرے جسم کو نہیں تیری روح کو موت دینا چاہتا ہوں۔

تیرے کام اور تیرے لذ بٹ سے مجھے کوئی سروکار نہیں مجھے بدلہ لینا ہے تیری عزت اور

تیرے مان سے۔ یہی اصول ہے ناں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان اور جسم کے بدلے جسم۔ میں نے اپنے جسم کے گھاؤ تجھے معاف کر دیئے مگر اپنی عزت اور اپنے مان کے بدلے تجھ سے بھی تیری عزت اور تیرا مان ہی چھینوں گا۔

میں اسی لیے یہاں آیا ہوں' اسی لیے تیری باتیں برداشت کی ہیں اور اسی لیے تیری جان بخشی ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جو میرا ہوگا۔ صرف اور صرف میرا۔''

☆======☆======☆

ہر رات کی طرح اس رات بھی زرینہ سیاہ چادر اوڑھے پرانے کنویں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گو کہ یہ چاند کی تیرہ تاریخ تھی پھر بھی گاؤں کی گلیاں' مکان' دکانیں' سنسان راستے اور سبز کھیت سب نقرئی چاندنی میں نہائے ہوئے تھے۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ سائیں بابا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک بازتوں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

زرینہ مسکرا دی۔

''سائیں بابا بچھڑے لوگ کہیں نہ کہیں مل ضرور جاتے ہیں ہاں مرے ہوئے کبھی نہیں ملتے۔ کبھی واپس نہیں آتے۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''بچھڑنا وقتی بات ہوتی ہے۔ ملنے کے لیے جدا ہونا تو یوں بھی شرط ہے۔ شاہ جی بھی مجھ سے بچھڑے تھے۔ مجھے لگا تھا جیسے میں زندہ ہی نہیں رہی' لیکن ہم دونوں کے قدم اسی زمین پر تھے۔ ہم اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ تو بالآخر مل بھی گئے۔''

انہی سوچوں میں گم وہ کنویں کے قریب پہنچی۔ حیدر علی شاہ پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔

''آج دیر ہو گئی تمہیں۔''

''اماں بابا جاگے ہوئے تھے۔'' وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ ''ان کے سونے کا انتظار کرتی رہی۔''

''میں نے سوچا کوئی مسئلہ ہو گیا ہو گا اس لیے شاید تم نہ آؤ۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں انتظار کرتے رہیں اور میں نہ آؤں۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

"کیا باتیں کر رہے تھے تمہارے اماں ابا؟"

"باتیں بہت خوفناک تھیں۔ آہستہ آہستہ بول رہے تھے اس لیے زیادہ تو نہیں پتا چلا لیکن وہی بات کہ اب میری اور رضیہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔"

"ہوں۔" حیدر علی نے پُر خیال انداز میں کہا۔ "انہوں نے کسی کو پسند کیا ہے تمہارے لیے؟"

"ایسے تو نہ پوچھیں۔ مجھے رونا آ جائے گا۔"

اس نے اس قدر معصومیت سے کہا کہ حیدر علی ہنس پڑا۔

"پھر کیسے پوچھوں؟"

"آپ کو ہنسی سوجھ رہی ہے اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔" اس نے بسورا۔

"مجھے ہنسی کب سوجھ رہی ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے اماں ابا کس خوش قسمت کو اس کارِ خیر کے لیے نامزد کرنا چاہتے ہیں۔"

"شاہ جی! میں آپ سے بالکل بات نہیں کروں گی۔" اس نے منہ پھیر لیا۔

حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا۔ تھوڑی دیر تک زرینہ منہ پھیرے بیٹھی رہی پھر اس کی طرف مڑی۔

"آپ کو تو مجھ سے ذرہ برابر بھی محبت نہیں ہے۔"

"یہ انکشاف کب ہوا تم پر؟"

"ابھی ابھی۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ کو میری پروا ہوتی اور مجھ سے محبت ہوتی تو مجھے مناتے۔"

"اوہو۔ میں الفاظ ڈھونڈ رہا تھا تمہیں منانے کے لیے۔"

"کہاں ڈھونڈ رہے تھے آپ تو سگریٹ پی رہے تھے۔"

"اچھا یہ لو سگریٹ بجھا دیا۔" اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔

"پتا نہیں کیسے چن رہے تھے اماں ابا۔" وہ خود ہی سے بتانے لگی۔ "لیکن مجھے کسی اور سے شادی نہیں کرنی۔ شاہ جی! آپ بڑے شاہ صاحب سے کہیں ناں کہ وہ پیر صاحب سے ہماری شادی کی اجازت لے دیں۔"

"وہ کیوں لیں اجازت۔ میں خود بات کروں گا۔"

"میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کیونکہ سب کہتے ہیں کہ پیر صاحب بڑے شاہ صاحب کی کوئی بات نہیں ٹالتے جبکہ آپ سے وہ......" زرینہ کہتے کہتے رک گئی۔

"مجھ سے کیا؟"

"کہہ دوں؟"

"کہہ دو۔"

"کہ آپ سے وہ۔" زرینہ نے کہا۔ "کچھ ناراض رہتے ہیں۔"

"یہ کس نے کہا تم سے؟"

"یہاں چھوٹی سے چھوٹی بات پھیل جاتی ہے۔ یہ تو پھر بہت بڑی بات ہے۔" وہ بولی۔ "ویسے سب گاؤں والے بڑے شاہ صاحب کی نسبت آپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ بڑے شاہ صاحب بہت سخت ہیں۔ آپ ویسے نہیں ہیں۔ سب بڑے شاہ صاحب سے بہت ڈرتے ہیں مگر آپ ویسے نہ بننا۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے کہ کسی سے سب ڈرتے ہی رہیں۔"

"بڑے شاہ صاحب بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ وہ اتنے سخت نہیں ہیں جتنے بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔"

"وہ جیسے بھی ہیں آپ کے تو بھائی ہیں۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہوں گے۔ ان سے کہیں ناں؟"

"میں خود بابا جان سے بات کروں گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

"اگر وہ آپ سے اور زیادہ ناراض ہو گئے اور آپ کی بات نہ مانی تو۔"

"گاؤں والوں نے فضول میں یہ سب مشہور کر رکھا ہے۔ بابا جان مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔ ہاں ہمارے اختلافات ہیں۔ دعا کرو وہ اختلافات دور ہو جائیں۔"

"میں ضرور دعا کروں گی۔ پھر آپ بات کریں گے تو وہ نہیں ٹالیں گے۔"

"امید تو یہی ہے۔"

"شاہ جی۔"

"ہوں۔"

"کبھی کبھار مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اب ہم جتنے قریب ہیں کچھ عرصے بعد اتنے ہی دور ہو جائیں گے۔"

"وہم ہے تمہارا۔" حیدر علی نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"خدا کرے وہم ہی ہو۔"

"اچھا تم شادی پر تو آؤ گی ناں۔"

"حویلی؟"

"تم حویلی نہیں آنا چاہتیں ناں۔ ٹھیک ہے کل رات حویلی سے یاسین بھائی کی طرف

مہندی لے جائی جائے گی۔ وہاں تو آ سکتی ہوناں تم؟''
''وہ کون سی مختلف جگہ ہے۔ وہ بھی تو حویلی ہی ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔
''گویا تم شادی کی کسی تقریب میں بھی نہیں آؤ گی۔''
''میں آنا نہیں چاہتی مگر آپ حکم دیں تو آ جاؤں گی۔''
''حکم، تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں حکم دوں گا۔ اسٹوپڈ۔ میں اس طرح کے فضول حکم نہیں دیا کرتا۔''
''پھر چند دنوں تک آپ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔'' اس کے لہجے میں افسردگی اتر آئی۔
''دو دن تو مہندی کی تقریب ہے۔ پھر بارات اور ولیمہ۔ مہندی والے دن آنا تو ناممکن ہے۔ بارات والے دن کا بھی وعدہ نہیں ہے لیکن ولیمے والی رات میں ضرور آؤں گا۔''
''یہ تین دن کیسے گزریں گے۔''
''گزر جائیں گے۔ آرام سے گزر جائیں گے۔ تم کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہو جاتی ہو۔''
''فکر تو کرنی پڑتی ہے۔ یاد ہے پچھلی مرتبہ ہم بچھڑے تھے تو کیا ہوا تھا؟ مجھے تو ملنے کی امید ہی نہیں رہی تھی۔''
''اس مرتبہ کچھ نہیں ہوگا۔'' حیدر علی نے اسے تسلی دی۔ ''یہ بتاؤ کہ باقی گھر والے تو شادی میں جائیں گے ناں؟''
''ہاں۔ اماں تو چاہتی ہیں کہ میں بھی جاؤں۔ مجھے پتا ہے وہ زبردستی بھی کریں گی۔''
''پھر؟''
''پھر میں کچھ نہ کچھ بہانا بنا لوں گی۔''
''مثلاً؟''
''مثلاً یہ کہ میرے سر میں درد ہے۔ میری صحت کی ویسے بھی اماں کو بہت فکر رہتی ہے۔ آرام کرنے کا کہہ کر چھوڑ جائیں گی گھر پر ہی۔''
حیدر علی ہنس پڑا۔ ''بہانا بھی بناؤ گی تو اس قدر نکما۔''
''اوہو۔'' زرینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اتنی دیر ہو گئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ اگر ابا جاگ گئے تو مصیبت آ جائے گی۔''
''چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

☆=====☆=====☆

حویلی میں رات کو ہونے والی مہندی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔

حیدر علی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ رجب علی اس کے قریب چلا آیا۔
''اس شور شرابے سے تنگ آ گیا ہوں میں۔ دل چاہ رہا تھا تھوڑی دیر کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھوں۔''
''میرے کمرے میں آ جائیں۔''
حیدر علی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر آ گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔
''بابا جان اور اماں جان کی خوشیاں ہیں ورنہ مجھے اس بینڈ وہنگامے سے وحشت ہونے لگتی ہے۔''
''تین دن کی بات ہے پھر سکون ہو جائے گا۔''
وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ رجب علی نے اپنا پائپ نکال لیا۔
''ایک بہت کام کا بندہ ہے ہمارے پاس۔'' اس نے پائپ میں تمباکو بھرا۔ ''میں سوچ رہا ہوں اسے کس کام پر لگایا جائے۔''
''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟''
''اچھو کی۔'' وہ بولا۔ ''کچھ دن قبل اس نے شکورے کو بری طرح پیٹ ڈالا تھا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ شکورے کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو وہ اس کی آنکھ نکال لے گا۔''
''آج کل کیا کر رہا ہے اچھو۔''
''بابا جان کے کہنے پر اصطبل میں کام کر رہا ہے۔'' اس نے پائپ کا کش لیا۔ ''یہ شکورا بہت بزدل نکلا۔ چھ فٹ قد اتنی جان اور خوفناک مونچھیں۔ صرف ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں۔ ایڈیٹ مار کھا کر آ گیا۔''
''اب جبکہ وہ اصطبل میں کام کر رہا ہے اسے وہاں کام کرنے دیں۔''
''شکورے کو مفت کی روٹیوں کی چاٹ لگنے لگی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اصطبل کا کام کچھ عرصے کے لیے اس کے حوالے کر دوں تا کہ اس کے دماغ میں جو افسری گھس رہی ہے وہ نکل جائے اور اچھو کو شکورے کی جگہ لے آؤں۔ بس ایک پرابلم ہے۔''
''وہ کیا؟''
''جس دن وہ واقعہ پیش آیا تھا اس دن سے وہ خاموش ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتا۔''
''چچ، چچ۔'' حیدر علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''بہت برا ہوا ہے۔ نفسیاتی اثر ہو گا۔ بہت حساس لوگوں کے ساتھ ایسا کوئی بھی پرابلم پیش آ سکتا ہے۔''
''مجھے اس کی نفسیاتی گرہوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک گونگے کے ساتھ میرا گزارا مشکل ہو گا۔'' رجب علی بولا۔ ''اچھو کو گاؤں کا سب سے بڑا شہ زور مانا جاتا

ہے۔ اگر اس نے شکورے کو میرے ذاتی ملازم کی حیثیت سے نہ مارا ہوتا تو میں یقیناً اسے شاباش دیتا۔ بہرحال اب وہ حماقت کی سزا بھگت چکا ہے۔ ایسے شخص کو میرے ذاتی خدمت گاروں میں شامل ہونا چاہیے۔ بس اگر وہ بول پڑے تو میں اسے شکورے کی جگہ دے دوں۔''

''میرا خیال ہے وہ بول پڑے گا۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے نفسیاتی اثرات زائل ہوتے جاتے ہیں لیکن شاید بول پڑنے کے باوجود بھی وہ آپ کے زیادہ کام نہ آئے۔''

''یہ اندازہ کیسے لگایا تم نے؟''

''میرا نہیں خیال کہ وہ زیادہ قابلِ بھروسہ ثابت ہوگا۔ جسم پر لگنے والے زخم بالآخر بھر جاتے ہیں لیکن ایک حساس انسان اپنی انا پر لگنے والے زخم نہیں بھول سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاک کے باعث بول بھی نہیں پا رہا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' رجب علی نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''یہ عام سے جاہل لوگ تم جیسے پڑھے لکھے انسان کی طرح نہیں سوچتے۔ نہ ہی ان کے دماغوں میں انسانی حقوق کا کیڑا کلبلاتا ہے۔ اب تو وہ پہلے سے زیادہ قابل بھروسہ ہوگیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی کسی بھی دوسری حماقت کی سزا کیا ہوگی تم جن لوگوں کی نفسیات کی بات کرتے ہو وہ یہ لوگ نہیں ہیں۔ ان کی نفسیات بالکل مختلف ہے۔''

''آپ بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ آپ کا ان سے رابطہ بھی بہت زیادہ ہے۔ میرا ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اس قدر رابطہ نہیں ہے۔''

''میں تم سے کیا بور باتیں کرنے لگا۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری گوری کیسی ہے؟''

''گوری بالکل ٹھیک ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''بس کچھ افسردہ ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ حویلی نہیں آنا چاہتی اور شادی کی تقریبات کی وجہ سے کچھ دن تک ہمارا ملنا ممکن نہیں۔''

''اوہو۔ ایسا کرو کہ تم وقت نکال کر کسی نہ کسی طرح اس سے ضرور مل لو۔ زندگی میں ایسا شخص صرف ایک مرتبہ ملتا ہے جو صرف ہمارے لیے جیتا ہے اور ہم اس کے لیے' ایسے شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہتے۔''

''گوری سے تو روز ملاقات ہو جاتی ہے لیکن آپ کی شادی صرف ایک مرتبہ ہوگی۔''

''ہوپ فلی۔''

رجب علی نے کہا تو دونوں بھائیوں کا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوا۔

''گوری نے آپ کے لیے پیغام بھجوایا ہے۔''

''میرے لیے؟'' رجب علی نے تعجب سے کہا۔ ''کیسا پیغام! کوئی فرمائش ہے کیا؟''

''فرمائش ہی ہے۔''

''کسی زیور یا کپڑے کی؟''

حیدر علی ہنس پڑا۔ ''نہیں وہ ایسی فرمائش کرتی ہی نہیں ہے اور اگر کرے تو میں خود ہی پوری کر دوں گا۔''

''تمہارا بڑا بھائی ہونے کے ناتے وہ مجھ سے ایسی کوئی بھی فرمائش کر سکتی ہے بلکہ اسے کرنی چاہیے۔''

''نہیں یہ فرمائش ذرا مختلف ہے جو فرمائش اس کی ہے اس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ پوری کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر اسے سچ مچ کی تسلی نہیں ہوئی۔''

''کہو۔'' رجب علی نے دلچسپی سے کہا۔

''اس کے والدین آپ کی شادی کے بعد بابا جان سے اس کی شادی کی اجازت لینے آنے والے ہیں۔ وہ ظاہر تو نہیں کر رہی تھی لیکن درحقیقت بہت پریشان تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آپ بابا جان سے ہماری شادی کی سفارش کریں۔''

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں بابا جان سے بات کروں گا۔''

''پتا ہے' اس نے یہ فرمائش آپ سے کیوں کی ہے؟''

''کیوں؟''

''کیونکہ اس کا خیال ہے کہ بابا جان آپ کی کوئی بات نہیں ٹالتے جبکہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔''

رجب علی نے قہقہہ لگایا۔ ''اس کا خیال اسی فیصد تو درست ہی ہے۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ میری منگنی کی اطلاع اس کے لیے بہت بڑا شاک ثابت ہوگی۔''

''اتنا زیادہ مت سوچا کرو علی۔ وہ تم سے سچ مچ محبت کرتی ہے تو تم سے گلہ ضرور کرے گی' ورنہ نہیں ہوگی۔'' پھر گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرا خیال ہے میں اچھو کو اصطبل سے چھٹی کروا کر اپنے پاس ہی لے آؤں۔ اتنی دیر کمپنی دینے کا شکریہ۔''

☆======☆======☆

شکور' اچھو کو عمومی کام سمجھا رہا تھا۔ بڑے شاہ صاحب کو کیا پسند ہے کیا نہیں۔ کس وقت وہ کیا چاہتے ہیں۔ کن تیوروں کا کیا مطلب ہے وغیرہ۔ اچھو ہر بات ذہن نشین کر رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ قدرت اسی وجہ سے اسے رجب علی کے قریب ہونے کا موقع دے رہی تھی تاکہ وہ اس سے اپنا بدلہ لے سکے۔

آزمائش کے طور پر رجب علی نے اس سے کچھ کام بھی لیے تھے اور مطمئن ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

دوپہر سے ہی حویلی میں مہندی کے سلسلے میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ مہر النساء اور زیب النساء نے ایک جیسے پیلے رنگ کے جوڑے پہن رکھے تھے۔ آج انہیں بھی حویلی کی چار دیواری سے باہر نکلنا تھا۔

سب ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ زیب النساء کے لیے بھی بہت مرتبہ بلاوا آ چکا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن آج بے حد حسین لگ رہی تھی۔

''میں کس قدر خوبصورت ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''لیکن کیا فائدہ اس خوبصورتی کا جب کوئی سراہنے والا ہی نہیں۔ کوئی تو ہو جو میری بھی اس طرح تعریف کرے جیسے علی' زرینہ کی کرتا ہے۔

یہ کتنا اہم دن ہے اس حویلی اور اس خاندان کے لیے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو رہی ہے جو بابا جان کی گدی کے وارث بھی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میری زندگی میں میرے لیے بھی کوئی اہم دن آتا۔''

اسے یوں لگا جیسے مسہری پر کوئی ہنسا ہو۔ نہیں شاید کوئی رویا ہو۔ یا پھر نہ ہنسا تھا نہ رویا تھا۔ وہ تو شاید نزع کی آخری ہچکی تھی۔ یا پھر یہ سبھی کچھ تھا۔

زیب النساء اس آواز کو پہچانتی تھی۔ یہ پھوپھو کی آواز تھی جنہیں فوت ہوئے بھی برسوں گزر چکے تھے۔ اس نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں دیکھا لیکن اب آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ انہیں اپنے مقابل دیکھ سکتی ہو۔

اس کے کمرے کی واحد مسہری جس سے یہ آواز آئی تھی' اس سے اکثر یہ آواز آیا کرتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ شاید صرف گمان تھا۔ کسی کو وہ آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بس صرف اسے آتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ ہنسی یا شاید کراہ اسے کیا بتا رہی تھی۔ وہ بغیر لفظوں کے پھوپھو کی ہر بات سمجھ جاتی تھی۔

وہ اس سے کہہ رہی تھیں کہ ایک اہم دن ان کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ جس دن بابا جان کی شادی تھی۔ تب انہیں کوئی ملا تھا۔ ان کے پاس بھی زیب النساء کی طرح حوصلہ نہیں تھا۔ ہاں ڈر' خوف بہت تھے۔ تب ہی تو وہ گھٹ گھٹ کر ختم ہو گئی تھیں۔

وہ ہنسی' وہ کراہ اس سے کہہ رہی تھی کہ اگر اس کی زندگی میں کوئی اہم دن آئے' فیصلے کی کوئی گھڑی آئے تو اسے حوصلہ اکٹھا کرنا ہو گا۔ ڈر اور خوف جو اس کی روح سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں انہیں اتار پھینکنا ہو گا۔ قدم آگے بڑھانا ہو گا تا کہ وہ گھٹ گھٹ کر دیواروں سے سر

ٹکرا ٹکرا کر اسی مسہری پر جان نہ دے۔

''آپی کا آپ کی خواہشیں جائز ہیں تو پھر کیوں بند باندھتی ہیں ان پر؟ کیوں نہیں حق مانگتیں اپنا؟''

حیدر علی کے سوال کی بازگشت اتنی دیر بعد سنائی دی تھی۔

یہ دیواریں بھی عجیب تھیں۔ سب کچھ سن کر محفوظ کر لیتی تھیں۔ ہر بات خود میں جذب کر لیتی تھیں اور جب وہ اکیلی ہوتی تھی تو ہر لفظ' ہر لہجے کی بازگشت کتنی دیر تک گونجتی رہتی تھی۔

''آپی! آپ کی خواہشیں جائز ہیں تو پھر کیوں بند باندھتی ہیں ان پر؟ کیوں نہیں حق مانگتیں اپنا؟''

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''میں نہیں مانگوں گی اپنا حق۔ میں خوش نہیں ہوں پھر بھی اپنا حق نہیں مانگوں گی۔'' وہ چلائی۔ ''میں قدم اٹھانا چاہتی ہوں پھر بھی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ میں اپنی آرزوؤں کی پرواز بابا جان کے شملے سے بلند نہیں ہونے دوں گی۔''

ہر دیوار تمسخر سے ہنسنے لگی۔

''خود فریبی' خود فریبی' خود فریبی۔'' آئینہ چلانے لگا۔

''نہیں۔ میں خود کو فریب نہیں دے رہی۔ کوئی تسلی دلاسا بھی نہیں دے رہی خود کو۔ مجھ میں حوصلہ ہے اپنے اوپر بند باندھنے کا۔''

لیکن اس کی بات کس نے نہیں سنی۔ دیواریں ہنستی رہیں۔ آئینہ چلاتا رہا۔ وہ پاگل ہونے کو تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک سن کر ہر شے ساکت ہو گئی۔ یوں جیسے کبھی اس پر ہنسی ہی نہ ہو۔ کبھی اس کا مذاق ہی نہ اڑایا ہو کبھی چلائی ہی نہ ہو۔

لکڑی کی مسہری' آئینہ' دیواریں۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا مگر وہ ان کی مکاریوں سے واقف تھی۔ یہ سب چیزیں ایسے ہی کرتی تھیں۔ اس کی موجودگی میں شور برپا کیے رکھتیں اور ہلکا سا کھٹکا بھی ہو جاتا تو ایسے بن جاتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ انہیں کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''آ جاؤ۔''

اندر آنے والا حیدر علی تھا۔

''آپی آپ تیار ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر جلدی چلیں۔ سب جا چکے ہیں۔ آپ نے دیر کر دی۔''

''مم...... میں تیار ہو رہی تھی۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''چلیں جلدی کریں۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ وہاں آپ کی موجودگی کتنی ضروری ہے۔''

زیب النساء نے مسہری پر پڑی بڑی سی سیاہ چادر سے خود کو سر سے پاؤں تک چھپا دیا۔

''سانس لینے کی جگہ تو رہنے دیں۔'' حیدر علی بولا۔

''یوں سانس لینے کی عادت ہے۔''

''جس جگہ سے آپ کو گزرنا ہے وہاں کوئی مرد نہیں ہے ہو بھی تو اس کی نظریں نہیں اٹھیں گی۔ آپ چاہیں تو چہرے سے چادر ہٹا دیں۔''

''نہیں۔ ٹھیک ہے۔''

''لیکن آپ کو دکھائی کیا دے رہا ہے؟''

''مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہمیشہ بابا جان کی آنکھوں سے راستہ دیکھا ہے۔''

''اچھا میرا ہاتھ پکڑ لیں اور آرام سے چلیں۔ کہیں ٹھوکر نہ لگے۔''

وہ احتیاط سے اسے چلاتا ہوا کار تک لایا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

''بیٹھیں آپی۔''

اسے بٹھا کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

''سب گاڑیاں چلی گئی ہیں اور ہمارے لیے یہ چھوڑ گئے ہیں۔ ایک دم چھکڑا۔'' وہ اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں کہاں جواب دے جائے۔ خیر آج کا دن نکل جائے تو کل ٹھیک کرا لیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ صرف دو چار لوگوں کو ڈرائیونگ آتی ہے۔''

حویلی سے باہر نکلے تو حیدر علی اردگرد اسے مختلف جگہوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ زیب النساء خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

مسجد کے قریب پہنچ کر کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ زیب النساء نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' حیدر علی نے کہا اور اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

''کیا ہوا؟'' زیب النساء بولی۔ ''خراب ہو گئی ہے؟''

''دیکھتا ہوں۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ ''آپ بیٹھی رہیں۔''

گو کہ چودھویں کے چاند کی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ انجن کا جائزہ لیا جا سکتا۔

بونٹ بند کر کے وہ پلٹا تو اس کی نگاہ زرینہ کی کھڑکی پر پڑی جو پردے کا ایک کونہ تھامے وہیں کھڑی تھی۔ چاندنی میں نہائی ہوئی وہ کوئی یونانی دیوی لگ رہی تھی۔ غالباً کار کی آواز سن کر

ہی وہ کھڑکی میں آئی تھی۔

''آپی اس وقت تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اب کیا کریں؟''

''تم کیا چاہتے ہو کیا کریں؟'' اس کے انداز میں طنز کی کاٹ تھی۔ ''کچھ تو سوچا ہوگا تم نے پہلے ہی۔ یوں بھی کار بہت اچھی جگہ خراب ہوئی ہے۔''

وہ شرمندہ ہو گیا۔

''یقین کریں آپی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کار پہلے سے خراب تھی۔ باقی تینوں کاریں جا چکی تھیں۔ مجھے بابا جان نے کہا تھا کہ آپ کو لے آؤں۔''

''مجھے بناؤ مت علی۔ میں بچی نہیں ہوں۔ اس کی ماں بہن اور باپ تو مہندی میں آئے ہیں۔ یہ تمہارا انتظار کرنے کے لیے ٹھہر گئی۔ تمہیں اسی کے پاس آنا تھا تو مجھے اپنے ساتھ کیوں گھسیٹ لائے۔''

''آپی میرا یقین کریں۔ میں ابھی کسی نہ کسی صورت آپ کو لے جاتا ہوں۔ شاید کوئی ہمارا پتا کرنے آ رہا ہو۔ تب تک آپ وہاں گھر میرا مطلب ہے زرینہ کے پاس چلی جائیں۔ جیسے ہی دوسری کار آئی ہم چلے جائیں گے۔ یوں راستے کے عین درمیان میں ٹھہرے رہنا مناسب نہیں ہے۔''

''اس کے گھر جانے سے بہتر ہے کہ میں عین سڑک کے درمیان کسی دوسری کار کا انتظار کر لوں۔ تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔''

حیدر علی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ ایک دو مرتبہ پھر کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ دونوں خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ زرینہ الجھے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی سامنے ڈالے کھڑکی میں کھڑے ہو کر انہیں دیکھتی رہی۔

''آپی آپ کا یوں یہاں بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔'' اس نے زیب النساء کو دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی۔

''میرا وہاں جانا بھی مناسب نہیں ہے۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

اچانک رات کے سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ حیدر علی کار سے باہر نکلا۔ سامنے سے اچھو حویلی کا ایک تانگہ لیے چلا آ رہا تھا۔ حیدر علی کو دیکھ کر اس نے لگامیں کھینچ لیں اور نیچے اتر آیا۔ تانگہ غالباً خواتین کو لے کر گیا تھا۔ تب ہی اس کے گرد پردے کا انتظام تھا۔

''اچھو تم حویلی واپس جا رہے تھے؟''

حیدر علی کے سوال پر اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''ایسا کرو۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میرے ساتھ چھوٹی بی بی ہیں اور کار خراب ہو گئی ہے۔ تم واپس جا کر دوسری کار بھجواؤ اور کچھ بندے بھی لاؤ تاکہ یہ کار کنارے کی جا سکے۔ پہلے ہی

جگہ تنگ ہے اوپر سے کار عین درمیان میں کھڑی ہے۔''

اچھو نے اقرار میں سر ہلایا اور مڑنے لگا۔

''یا ٹھہرو اچھو۔ ایسا کرو کہ بی بی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں یہاں انتظار کر سکتا ہوں لیکن ان کے لیے اتنی دیر تک سڑک پر کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔ تانگے کے حساب سے یوں بھی راستہ لمبا ہے۔ کسی کے آنے تک بہت دیر ہو جائے گی۔''

اچھو نے پھر ہاں میں گردن ہلائی۔

''آپی! اگر آپ برا نہ مانیں تو تانگے پر چلی جائیں۔ اچھو آپ کو بحفاظت پہنچا دے گا۔ اگر ہم کسی کا انتظار کرتے رہے تو بہت دیر ہو جائے گی۔''

زیب النساء نے ایک نظر کھڑکی میں کھڑی زرینہ کی طرف دیکھا اور پھر کار سے نکل آئی۔

''میں سمجھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں اتنی تفصیل سے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپی آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے؟ یہ محض اتفاق ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔''

وہ زیب النساء کا ہاتھ پکڑ کر تانگے تک لایا اور پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔

''گھبرانا مت آپی۔ اچھو بھروسے کا آدمی ہے۔ منشی فضل دین کا بیٹا ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے کہ بول نہیں سکتا اس لیے جب تانگہ رکے تو آپ خود ہی اتر آنا۔''

تانگہ چلتا گیا اور حیدر علی اسے تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ اندھیرے میں تحلیل نہیں ہو گیا۔

☆======☆======☆

اچھو کے دل میں اطمینان کی لہریں اترتی جا رہی تھیں اس کے دل کے درد میں کمی ہو رہی تھی۔ خلش مٹتی جا رہی تھی۔

''اچھو قدرت نے تجھے بنا بنایا موقع فراہم کر دیا ہے۔ خود شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے اپنے گھرانے کی عزت تیرے سپرد کی ہے۔

کان کے بدلے کان' آنکھ کے بدلے آنکھ' عزت کے بدلے عزت اور مان کے بدلے مان۔ کتنا سیدھا سادا اور سچا اصول ہے۔'' اس نے سوچا۔

گھوڑے کے سموں کی ٹک ٹک اور تانگے کے پہیوں کی مسلسل چوں چوں نے مل کر نقرئی رات میں موسیقی کا رچاؤ پیدا کر دیا تھا۔ تانگے میں بیٹھنے سے قبل اس کے اعصاب کشیدہ تھے۔ زرینہ کو دیکھتے ہی نہ جانے اتنا غصہ کہاں سے اس کے اندر بھر گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے علی کے نزدیک بہنوں کی اہمیت ختم ہو گئی ہو۔ ہر وقت اس کے لبوں پر گوری کا نام ہوتا تھا۔ وہ چڑ جاتی تھی اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ علی نے گاڑی جان بوجھ کر خراب کی تھی

تاکہ زرینہ سے مل سکے۔ زیب النساء کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔

''وہ ہے کیا چیز جس کی خاطر علی دیوانہ ہو رہا ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''مانا کہ وہ خوبصورت ہے لیکن خوبصورت تو بہت سی عورتیں' بہت سی لڑکیاں ہیں۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے علی کو کہ اس کے خیالوں میں کوئی اور آتا ہی نہیں ہے۔ ہم بھی اس کی بہنیں ہیں۔ خوبصورت بھی ہیں۔ ہماری تعریف تو کبھی نہیں کی اس نے۔ پر کیا کیا جائے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں جو ساری عمر محروم ہی رہتے ہیں۔''

لیکن تانگے میں بیٹھ کر وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ اس کے کانوں کو ٹک ٹک اور چوں چوں کی یہ آوازیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ سُر تال کا ایسا خوبصورت ملاپ اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کے گرد تو صرف کراہیں اور تمسخر آمیز ہنسی بستی تھی۔ لفظوں اور لہجوں کی بازگشت رہتی تھی۔ ان آوازوں کے دائرے بنتے بگڑتے رہتے تھے اور وہ ان سے بچنے کی خاطر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔ آنکھیں میچ لیا کرتی تھی۔ یہ سب آوازیں تکلیف دہ تھیں' اس کی روح کو دھنک کر فضا میں بکھیر دینے والی۔

مگر جو آواز ابھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی وہ بہت خوبصورت تھی۔ روح میں اندر تک سکون کی لہریں اتار دینے والی۔ اسے یوں لگا جیسے اس آواز کو سننے کے لیے اس کے کان کب سے ترس رہے تھے۔

''صرف کان ہی کیا' میرا جسم' مری روح دونوں ہی پیاسے ہیں۔ میں کب جانتی تھی کہ تانگے کی آواز اتنی میٹھی اتنی سریلی ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو۔'' اس نے سوچا اور پھر تلخی سے مسکرا دی۔ ''معلوم ہوتا تب بھی میں کیا کر لیتی؟''

''تو پھر تم کبھی تانگے میں نہ بیٹھتیں۔'' گھوڑے کے سموں کی ٹک ٹک اور پہیوں کی چوں چوں نے اسے جواب دیا۔ ''مگر اب تم اسیر ہو گئی ہو۔ خواہشوں کی اسیر۔ نہ چاہتے ہوئے اور انجانے میں ہی سہی تمہاری پہلی خواہش پوری ہو گئی ہے اور یاد ہے تم ہی تو کہتی ہو کہ پہلی خواہش کو روک لینا آسان ہوتا ہے اگر ایک دفعہ قدم بڑھ جائے تو پھر دوسرے قدم کو روک لینا ممکن نہیں رہتا۔''

چند ثانیوں کے لیے وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر حیرت کی بات یہ تھی کہ گھوڑے کے سموں کی ٹک ٹک اور پہیوں کی چوں چوں کو اس کے بھید کی خبر کیسے ہوئی تھی؟ اس کا دل چاہا کہ وہ پردے کا کونا سرکا کر ان بھیدی پہیوں کو ایک نظر ضرور دیکھے جو اس کے راز کی تشہیر کر کے اب مزے سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ اس نے تانگے کے گرد تنی چادر کو ایک سمت سے اٹھانے کی کوشش کی۔ چادر نہیں اٹکائی گئی تھی لیکن تھوڑا سا زور لگانے سے ہی اس کا سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس نے باہر جھانکا۔ تانگہ کچی سڑک پر چل رہا تھا۔ جس کے دونوں جانب کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ دودھیا چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ کتنا خوبصوت منظر تھا یہ۔ کتنی نرم ہوا چل رہی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لے کر اس ماحول میں خود کو جذب کرنا چاہا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ تو پہیے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے ذرا سا جھک کر نیچے جھانکا۔ چوں چوں کی آواز اس کے قریب آ گئی۔ پہیے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''حیرت سے کیوں دیکھتی ہو۔'' اب کے انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ ''ذرا آسمان کی سمت دیکھو' چاند کتنا حیران ہے اور یہ جو ننھے منے تارے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں' دیکھو تو وہ اپنا کھیل چھوڑ کر تمہیں دیکھنے لگے ہیں۔''

''کیوں؟'' زیب النساء نے بھی ہولے سے پوچھا۔

''یہ سوچ رہے ہیں کہ اتنی حسین صورت انہوں نے آج تک دیکھی کیوں نہیں۔ یہ اب تمہیں جی بھر کے دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں تم پھر گم نہ ہو جاؤ۔''

''ہاں گم تو مجھے ہونا ہے۔'' اس نے آہ بھر کر مدھم آواز میں کہا۔

''ارے نہیں۔ اب تم گم نہیں ہو سکتیں۔ جس زنداں میں تم قید تھیں اس میں روزن پیدا ہو چکا ہے۔ تم پرانی قید سے آزاد ہو گئی ہو۔ اگر آزاد نہ ہوتیں تو یوں کبھی باہر نہ جھانک سکتیں۔ البتہ اس قید سے نکل کر تم ایک اور بھنور میں پھنس چکی ہو' خواہشوں کے بھنور میں۔''

''نہیں۔'' اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہ مانو ہمارا کیا۔''

دونوں پہیے اور سموں کی ٹک ٹک سب اس سے لاتعلق ہو گئے۔ یوں جیسے اسے جانتے ہی نہ ہوں۔ جیسے اس سے کبھی بات ہی نہ کی ہو۔

''سنو۔'' اس نے پکارا۔

لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جھنجھلا گئی۔ پھر اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ سچ مچ سب چاند ستارے گم صم ہو کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ اتنی دور تھے کہ نہ اس سے بات کر سکتے تھے' نہ اس کی بات سن سکتے تھے اس نے سر پیچھے کر کے پردہ برابر کر دیا۔

☆======☆======☆

زیب النساء کا تانگہ اندھیرے میں گم ہو گیا تو حیدر علی واپس پلٹا اور زرینہ کی طرف سے منہ موڑ کر کار سے کمر ٹکا کر سگریٹ سلگا لیا۔ اسے اس بات کا بہت افسوس تھا کہ زیب النساء نے اسے غلط سمجھا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت ان حالات میں زیب النساء کو قائل کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کی باتیں سن کر ہی اس کا زرینہ کے پاس جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ زرینہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔

وہ اسی لیے اس کی سمت پشت کر کے کھڑا تھا تا کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے۔ اسے معلوم تھا کہ خواہ مخواہ خود کو اذیت دینے والی بات ہے لیکن وہ ذہنی طور پر اس قدر تھکا ہوا تھا کہ زیب النساء کی باتیں اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھیں۔ یہ ذہنی تھکن کئی دن سے اس پر طاری تھی لیکن اب زیب النساء کی باتوں نے اس احساس کو شدید کر دیا تھا۔

وہ اپنی گوری کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ماں جی کا مان توڑنا بھی اس کے بس سے باہر تھا اور رجب علی نے جو درمیانی راستہ تجویز کیا تھا اسے قبول کرنا بھی حیدر علی کو گوارا نہیں تھا۔ دوسری طرف اس کی بہنیں تھیں جن کے متعلق وہ ہر وقت سوچتا رہتا تھا۔ ان کی شخصیت کتنی بری طرح مسخ ہو رہی تھی۔ جب زیب النساء نے اس سے کہا تھا۔

''مجھے پتا ہے کہ پہلا قدم روکنا بے حد مشکل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہ یہیں رکا رہے۔''

تو اس کا دل چاہا تھا کہ اپنی اتنی اچھی بہنوں کے سب دکھ اپنے دل میں سمیٹ کر انہیں پُرسکون کر دے۔ ان کے دامن میں دنیا کی سب خوشیاں لا ڈالے لیکن وہ بے بس تھا جب وہ کہتی نہیں کہ وہ اپنے صبر و ضبط کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتیں' وہ خوش نہیں ہیں لیکن اسی طرح رہنا چاہتی ہیں تو اس کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔

خواہ مخواہ ہی چلا آیا تھا وہ یہاں اور اتنی ساری محبتوں کے روگ پال لیے تھے۔ کتنی تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی زندگی اور کتنا مشکل ہو گیا تھا سب حقیقتوں کا سامنا کرنا۔

اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دی۔

''شاہ جی۔''

اپنے پیچھے مدھم سی آواز سن کر وہ مڑا۔ سامنے شربتی آنکھوں میں پھیلا کاجل لیے گوری کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر گوری نے سکون کی گہری سانس لی۔

''میں سمجھی آپ ناراض ہیں مجھ سے۔''

''نہیں' میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔ بلاوجہ ہی ناراض ہو جاؤں گا۔''

''میں وہاں کھڑکی میں کھڑی تھی۔'' وہ بولی۔ ''موٹر کی آواز سن کر آئی تھی۔ آپ نے مجھے دیکھا پھر بھی میرے پاس نہیں آئے۔''

''میرے ساتھ زیبی آپی جو تھیں۔''

''اب تو نہیں ہیں۔''

''دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' حیدر علی کے لہجے میں تھکن تھی۔

زرینہ چند لمحے خاموشی سے اسے تکتی رہی پھر اس کے برابر ہی کار سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

''دل نہیں چاہ رہا تھا یا آپ کی آپی نے آپ کو منع کر دیا ہے۔''

''وہ کیوں منع کرنے لگیں۔'' اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''وہی تو منع کریں گی۔ مجھے پتا ہے۔'' اس کے انداز میں تلخی آ گئی۔

حیدر علی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میری طرف دیکھو گوری۔''

''چھوڑیں...... کیا دیکھیں گے میرے چہرے پر۔ آپ کی آپی کو خبر ہو گئی تو انہیں یہ بھی بہت برا لگے گا۔'' وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔

''گوری۔'' حیدر علی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اس کے سامنے چلا آیا۔ ''کیا کہنا چاہتی ہو' کھل کر کہو۔''

''کیا ہر بات زبان سے کہہ دینا ضروری ہوتی ہے۔''

''اگر سننے والا میرے جیسا کم عقل ہو تو ہاں' ہر بات زبان سے کہنا ضروری ہو جاتی ہے۔''

حیدر علی کی بات سن کر اس نے نظریں چرا لیں۔

''کہو' کیا کہنا چاہتی ہو؟'' وہ جاننے پر مُصر تھا۔

''جو کچھ رشتوں کے حوالے سے ایک عورت سمجھ سکتی ہے وہ آپ مرد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ہمارے درمیان کوئی آئے' خواہ وہ آپ کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔'' وہ بدستور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

اس نے زرینہ کا بازو چھوڑ دیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے' زیبی آپی ہمارے درمیان نہیں آ رہیں۔''

''مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اور آپ ان کی طرف داری اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ آپ کی بہن ہیں۔'' وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

''کس فضول بات پر اڑ رہی ہو گوری۔'' وہ تنگ آ گیا۔

''یہ فضول بات لگتی ہے آپ کو؟ ہاں آپ کے لیے تو فضول ہی ہو گی کیونکہ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی اور وہ آپ کی بہن ہیں لیکن کبھی میری طرف دیکھا ہے آپ نے؟ میں آپ کی خاطر سب رشتے بھول چکی ہوں۔ سب رشتے توڑ بھی سکتی ہوں۔ میری بہن مجھے منع کرتی رہی لیکن میں نہیں مانی۔ سیاہ اندھیری راتوں میں آپ باہر دیکھ لیے گئے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن کسی نے مجھے باہر دیکھ لیا تو پتا ہے کیا ہو گا۔'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔ ''مگر میں نے کبھی نتیجے کی پروا نہیں کی۔ کسی شخص یا کسی ڈر اور خوف کو اپنے اور آپ کے درمیان نہیں آنے دیا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے ان وہموں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔''

''آپ کے پاس تو حقیقتوں کا بھی کوئی علاج نہیں ہے۔''

''میں کسی فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' اس نے خواہ مخواہ ابھر آنے والے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔ ''تم گھر جاؤ۔''

''میں ایسے گھر نہیں جاؤں گی کہ آپ یہیں کھڑے رہیں اور میں اندر چلی جاؤں۔ آپ کو بھی میرے ساتھ آنا ہو گا۔''

''میں یہیں کھڑا ہوں۔ تم جاؤ۔''

''پھر بھی کہتے ہیں کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس کے انداز میں دوبارہ تلخی اتر آئی۔

''تم کیوں زیبی آپی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔'' اس نے اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ''ان کے اپنے دکھ ہی کم نہیں ہیں۔''

''تب ہی تو وہ کسی کو بھی خوش نہیں دیکھ سکتیں۔'' وہ حیدر علی کی بات کاٹ کر چلائی۔ ''ان سے کوئی محبت نہیں کرتا تب ہی تو وہ کسی اور کو محبت کرتے نہیں دیکھ سکتیں۔''

''شٹ اپ۔'' وہ دھاڑا۔ ''میں مزید ایسی کوئی بکواس برداشت نہیں کر سکتا۔''

زرینہ سکتے کی سی کیفیت میں چند لمحے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ حیدر علی اسے ڈانٹ دے گا۔ وہ بھی اس بری طرح سے۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔ پلکیں جھپک جھپک کر اس نے آنسو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن جب وہ سب بند توڑ کر بہہ نکلنے کو بے چین ہو گئے تو وہ گھر کی طرف پلٹ گئی۔

☆======☆======☆

دورویہ کھیتوں کو چھوڑ کر تانگہ دوراہے پر پہنچا تو اچھو نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بغیر وہ راستہ چن لیا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ یہ جنگل حویلی والوں کا پسندیدہ مقام تھا۔ جب بھی شکار کا پروگرام بنتا تھا وہ یہیں آتے تھے۔

''قدرت کے کام نرالے ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''آج میں شکاری ہوں۔ اب سے پہلے کب سوچا تھا کہ اس جنگل میں اس نیت سے داخل ہوں گا۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں سب کو یہ داستان سناؤں گا تاکہ رجب علی دوبارہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ اس کا سر اتنا جھک جائے کہ اسی کے قدموں میں جا گرے۔ پھر چاہے یہ تینوں بھائی مل کر میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹیں۔ مجھے پروا نہیں۔ بس ایک مرتبہ میرے اندر کی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ ایک مرتبہ رجب علی کا سر جھک جائے' بس ایک مرتبہ۔''

تانگہ انجانی راہوں پر رواں دواں تھا اور زیب النساء کا دل چاہ رہا تھا کہ راستہ لمبا ہوتا جائے کتنا دلچسپ اور سنسنی خیز سفر تھا یہ۔ راستہ انجانا تھا' نقرئی چاندنی تھی' فضا میں موسیقی کی کھنک تھی اور وہ تھی' بالکل اکیلی' مکمل طور پر آزاد شاید کسی اور کو یہ آزادی مکمل نہ لگے لیکن اس کے لیے آزادی بھی بہت بڑی نعمت تھی۔

یہاں اس کے گرد حویلی کی موٹی موٹی دیواریں نہیں تھیں اس کے اور آزاد دنیا کے درمیان ایک باریک سا پردہ حائل تھا اور بس۔ یہاں سے اس نے بھیدی پہیوں کو بھی دیکھا تھا اور آنکھ مچولی چھوڑ کر گم صم اسے تکے جانے والے تاروں کو بھی۔ بغیر کسی ڈر اور خوف کے لیکن سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ انہوں نے بھی اسے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر کتنا حیران ہوئے تھے وہ۔

زیب النساء خوشی سے سرشار تھی اور خوشی کا یہ تاثر اتنا بھرپور تھا کہ وہ ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی۔

اچھو نے حیرت سے پیچھے دیکھا جہاں سے ہنسی کی آواز ابھری تھی۔

''یہ کون ہنسا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''چھوٹی بی بی! نہیں۔ وہ کیسے اتنا اونچا ہنس سکتی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ کوئی ہے بھی تو نہیں۔ وہ اکیلی ہی تو بیٹھیں ہیں۔''

اس نے پھر اچنبھے سے پیچھے کی سمت دیکھا جہاں سے ہنسی کی مسلسل آواز آ رہی تھی اور تانگہ روک لیا لیکن ہنسی کی آواز اسی طرح جاری تھی۔ یہ سوچنا تو بعد کی بات تھی کہ وہ ہنسی کس کی تھی۔ ابھی تو وہ اس سُریلی ہنسی میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کتنی خوبصورت' کھنک دار آواز تھی کہ وہ خود بخود مسحور ہوتا جا رہا تھا۔

ہاں' وہ اچھو مسحور ہو رہا تھا جس نے آج تک لڑکیوں کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ جس کے نزدیک عورت کے نرم و نازک وجود سے زیادہ کشش اس پہلوان میں ہوا کرتی تھی جو آنکھوں میں اسے چت کرنے کی خواہش لیے اس کی طرف بڑھتا تھا۔ اس کے پاس تو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنی ماں کے علاوہ کسی عورت' کسی لڑکی کو غور سے نظر بھر کر دیکھے۔ وہی اچھو آج صرف ایک ہنسی سن کر مسحور ہو گیا تھا۔

ہنستے ہنستے زیب النساء کو احساس ہوا کہ تانگہ رک چکا ہے۔ اس کی ہنسی ایکا ایکی تھم گئی۔ اس کا دل بے کل ہو گیا۔

''کیا وہ دلچسپ سفر تمام ہو گیا۔ کیا میری آزادی کی حد یہیں تک تھی؟ اتنی سی آزادی پر خوش ہو رہی تھی میں؟'' اس نے سوچا پھر اچانک اسے خیال آیا۔ ''مگر یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ نہ ڈھول' نہ باجے' اتنی خاموشی۔''

اس نے چادر کا نقاب چہرے پر ڈالا اور تانگے کے گرد تنا ہوا پردہ اٹھا کر باہر دیکھنا چاہا کہ اسی وقت باہر سے کسی نے پردہ اٹھا دیا۔ پردہ اٹھانے والا وہی کوچوان تھا جسے علی نے اچھو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ زیب النساء نے متجسس نظروں سے باہر کی طرف دیکھا لیکن وہ بہت اجنبی اور اندھیری جگہ تھی۔ نہ کوئی حویلی تھی نہ شادی کا ہنگامہ۔ بس درخت ہی درخت تھے اور ان سے چھن کر آنے والی چاندنی۔

ابھی وہ صورتِ حال کو سمجھ ہی نہیں سکی تھی کہ اچھو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو مضبوطی سے

ایا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

''چھ...... چھ...... چھوڑو۔'' وہ ہکلائی لیکن الفاظ ٹھیک طور سے ادا بھی نہیں ہو سکے۔ چھوڑنے کے بجائے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور اچھو نے ایک جھٹکے کے ساتھ یوں کھینچ کر اسے باہر کھڑا کر دیا جیسے وہ جاندار لڑکی نہیں کوئی ہلکی پھلکی سی گڑیا ہو۔

خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کا حلق بند ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سانس کی آمد و رفت بھی ختم ہوتی جا رہی ہو۔ اچھو کی انگلیاں اس کے بازو کی نرم و نازک کھال میں کھبتی جا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔

اگلے ہی پل ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ نقاب الٹا جا چکا تھا۔

☆======☆======☆

کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیئے زرینہ رو رہی تھی۔ حیدر علی کے الفاظ نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کی خاطر اپنی عزیز از جان بہن سے بھی لڑ پڑتی تھی اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی اور حیدر علی نے اپنی بہن کی خاطر اسے اس بری طرح ڈانٹ دیا تھا اور جب وہ پلٹ کر جا رہی تھی تو اسے ایک مرتبہ رسماً ہی سہی رکنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

''یہی فرق ہوتا ہے مرد اور عورت میں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''وہ چاہتا ہے کہ عورت سب بندھن توڑ کر صرف اور صرف ایک بندھن باندھ لے۔ صرف اور صرف ایک شخص کی ہو جائے لیکن عورت مرد کو اس کے سب رشتوں' سب بندھنوں سمیت قبول کرتی ہے اور ساری زندگی انہی رشتوں اور بندھنوں کو پانی دے کر سیراب کرنے میں گزار دیتی ہے۔''

''گوری۔''

کھڑکی کے قریب سے آواز آئی۔ اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

''گوری۔'' حیدر علی نے دوبارہ پکارا۔

زرینہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے کھڑکی کے دوسری جانب حیدر علی کھڑا تھا۔

''آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔''

آنسو پھر بہہ نکلے۔ اس نے انگلی کے پور سے زرینہ کے آنسو پونچھے۔

''پلیز اب مت رونا۔'' اس نے رسان سے کہا۔ ''تمہارے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔''

''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں' اندر آ جائیں۔'' اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

''لیکن یہاں سے نہیں۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔''

وہ مڑ گئی۔ دروازے کی کنڈی کھولی' حیدر علی سامنے ہی کھڑا تھا۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ دونوں زرینہ کے کمرے میں آ گئے۔

''بیٹھیں۔'' اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

حیدر علی نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہاں دو چارپائیوں کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ دونوں چارپائیوں پر صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں جن پر ہاتھ کی کڑھائی کی گئی تھی۔ وہ ان میں سے ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ زرینہ اپنے لیے برآمدے سے پیڑھی لے آئی۔

''اوپر بیٹھو ناں۔''

''نہیں شاہ جی' میں ٹھیک ہوں۔''

وہ دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ حیدر علی نے اس خاموشی کو توڑا۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

''جھوٹ نہیں بولوں گی۔'' وہ بولی۔ ''ہاں میں ناراض ہوں۔''

''مجھے احساس ہے غلطی میری تھی۔ مجھے اس طرح نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا تمہیں لیکن میں پریشان تھا اس لیے تمہاری باتیں برداشت نہیں کر سکا۔''

''آپ مجھے میری وجہ سے ڈانٹ دیتے' مجھے پروانہ ہوتی لیکن آپ نے کسی اور کی محبت کو میری محبت پر ترجیح دے کر مجھے ڈانٹا۔'' اس نے ہونٹ کاٹے۔

''میں نے کسی کی محبت کو تمہاری محبت پر ترجیح نہیں دی۔ تمہاری محبت اپنی جگہ ہے باقی سب کی اپنی جگہ اور زیبی آپی کوئی اور نہیں میری بہن ہیں گوری۔'' اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کہتے تھے کہ آپ کو میری کوئی بات بری نہیں لگتی۔'' بری لگ ہی نہیں سکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ اب میں کچھ بولی تو آپ پھر مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ شاید میرے پاس واپس بھی نہ آئیں اس لیے چھوڑیں اس بات کو۔'' وہ بولی۔ ''یہ بتائیں موٹر کیسے خراب ہو گئی اور اب آپ کیسے جائیں گے؟''

حیدر علی نے گہرا سانس لیا اور بولا۔

''یہ محض اتفاق ہے کہ گاڑی یہاں خراب ہو گئی ہے۔ باقی کاریں جا چکی تھیں۔ سب گھر والے بھی چلے گئے تھے صرف میں اور زیبی آپی رہ گئے تھے۔ یہ کار ویسے بھی کچھ خراب ہو رہی تھی یہاں آ کر بالکل ہی رک گئی۔ پھر تم بھی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس لیے زیبی آپی نے سوچا کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔''

''میں تو مجبور تھی۔ موٹر کی آواز سنتی ہوں تو آپ کے آنے کا گمان ہوتا ہے اور لپک کر کھڑکی میں آ جاتی ہوں' مجھے تو میری محبت نے مجبور کر رکھا ہے۔''

حیدر علی اسے تکنے لگا۔

''اگر اسے میری اور فوزیہ کی منگنی کا علم ہو جائے تو شاید یہ اپنی جان ہی دے دے۔'' اس نے سوچا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ کی آپی نے کچھ کہا ہے' ورنہ آپ مجھے دیکھ کر بھی میرے پاس نہ آتے' یہ کیسے ہو سکتا تھا؟''

''آپی بہت دکھی ہیں گوری' آپی بھی اور بڑی آپا بھی۔''

''دکھی تو میں بھی ہوں شاہ جی۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''تمہیں کیا دکھ ہے؟''

''محبت سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ بہت تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے بس اسی کے لیے جیتا ہے اور اس کی محبت میں کتنی ہی مرتبہ مرتا ہے لیکن چھوڑیں ان باتوں کو ان میں کیا رکھا ہے؟''

''باقی سب گھر والے مہندی پر ہی گئے ہیں؟'' حیدر علی نے موضوع بدلنا چاہا۔

''ہوں۔'' وہ بولی۔ ''اماں مجھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھیں لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ اس سے پہلے بس ختم قرآن پاک پر گئی تھیں۔ کیونکہ وہ صبح کے وقت تھا۔ ڈھولکی پر ایک دن بھی نہیں گئیں۔ بے چاری رضیہ بھی میری وجہ سے نہیں جاتی تھی حالانکہ اس کا دل بہت چاہتا تھا جانے کو۔ آج بھی رکنے کو کہہ رہی تھی مگر میں نے زبردستی بھیج دیا اسے۔''

''مجھے آپی کی بھی فکر ہے۔ انہوں نے کبھی ضد نہیں کی' پتا نہیں کیوں انہوں نے اتنی ضد کر ڈالی۔''

''کیسی ضد؟''

''میں چاہتا تھا کہ وہ یہاں تمہارے پاس ٹھہر جائیں اور میں کار کا بندوبست کر لوں لیکن وہ نہیں مانیں۔''

''وہ کیسے مانتیں۔'' زرینہ نے دل میں سوچا۔ ''یوں سامنا کرنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ چونکی۔ ''سوچ رہی تھی کہ تھوڑی دیر میں آپ چلے جائیں گے اور یہ جگہ کتنی سونی سونی لگنے لگے گی۔''

''اپنے آپ کو میری اتنی زیادہ عادت مت ڈالو گوری۔''

''جب عادت پڑ گئی تب کہتے ہیں عادت نہ ڈالو۔''

''وہ' خیال آیا۔''

''کیا؟''

حیدر علی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ابھی کسی کو بھی آنے میں کم از کم گھنٹہ سوا گھنٹہ لگے

گا۔"

"پھر؟"

"تب کچھ فوٹو گرافی نہ ہو جائے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کیمرا کار میں رکھا ہوا ہے کیوں نہ تمہاری کچھ تصویریں ہو جائیں۔"

"میری تصویریں؟ میں تو ساری کی ساری آپ کے سامنے ہوں۔"

"تصویریں تو یادیں ہوتی ہیں اور پتا ہے یہ یادیں انسان کے لیے سرمایہ کب بنتی ہیں؟"

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"جب جوانی ڈھل جاتی ہے اور انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تب سردیوں کی کسی ٹھٹھرتی ہوئی شام کو راکنگ چیئر پر بیٹھ کر آتش دان کے سامنے کافی پیتے ہوئے اسے وہ دن بہت یاد آتے ہیں جو اس کے اپنے تھے' جب وہ زندگی کی حرارت اپنے جسم کے ایک ایک ریشے میں محسوس کر سکتا تھا اور جب کسی پری وش کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ کائنات کی سب وسعتوں کو ایک جست میں پھلانگنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان خوبصورت دنوں کی کوئی یادگار تو ہونی چاہیے ناں؟"

"ہاں۔" وہ مسکرا دی۔ "جب ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے تب یہ تصویریں دیکھیں گے اور ان دنوں کو یاد کریں گے۔ یہ تصویریں بھی میری امانت ہوں گی آپ کے پاس۔ یاد ہے ناں آپ کو پہلے بھی میں نے ایک امانت دے رکھی ہے۔"

"ہاں۔ تمہاری چین تمہیں اس دن مل جائے گی جس دن تم میری ہو جاؤ گی۔"

"شکریہ۔" وہ ہنس پڑی۔

"شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے جو اتنی دیر بعد ہنسی ہو۔" وہ بھی مسکرا دیا۔ "میں باہر سے کیمرا لے آؤں۔"

☆======☆======☆

سیاہ چادر کے حلقے میں چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے چہرے پر اچھو کی نظریں ایسی ٹکیں کہ وہ پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ وہ تو پرستان کی کوئی پری لگ رہی تھی۔ لگتا تھا زمین پر جنت کی کوئی حور اتر آئی ہو۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ زیب النساء کے بازو پر اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی ہے وہ تو اسے تکنے میں کھویا ہوا تھا جب مدھم سی سسکی کی آواز سن کر وہ واپس پلٹ آیا۔

زیب النساء کے چہرے پر خوف اور تکلیف کے آثار منجمد ہو چکے تھے۔ اچھو کے دل پر کوئی بھاری بوجھ آ گرا۔ اس نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ زیب النساء نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اچھو اس کے بالکل مقابل کھڑا تھا۔ اس نے ایک نظر اس کے چوڑے چکلے مضبوط وجود کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے خوف زدہ ہو کر آنکھیں دوبارہ بھینچ لیں۔

"کیا میں اتنی حسین' اتنی معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دوں؟" اس نے سوچا۔ "ایک ایسی لڑکی کی زندگی جس پر آج سے قبل کسی نامحرم کی نگاہ بھی نہیں پڑی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

اگلے ہی لمحے اس کے دماغ نے صدائے احتجاج بلند کی۔

"لیکن تم اسے ایک لڑکی کی حیثیت سے یہاں نہیں لائے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس وقت یہ صرف اور صرف رجب علی شاہ کی بہن ہے۔ اس رجب علی شاہ کی جس نے تم سے تمہارا مان' تمہاری عزت اور تمہارا غرور چھینا ہے۔ اپنی عزت کا بدلہ لینا تمہارا فرض ہے۔ اس لڑکی کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسے تم بطور انسان نہیں لائے۔ یہ تو ایک چیز ہے' ایک کھلونا ہے اور بس۔ کھیلو اور توڑ دو۔ نہ توڑنا چاہو تو واپس کر دو۔ اس کے بغیر رجب علی شاہ کا سر کبھی نہیں جھکے گا۔"

اچھو نے ہاتھ بڑھایا لیکن زیب النساء کی معصومیت نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ وہ عجیب کشمکش و پنج میں گرفتار ہو گیا تھا۔ زیب النساء کو یہاں لاتے ہوئے اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ رجب علی شاہ کی بہن' اس کی عزت کو اپنے ساتھ لا رہا ہے اور رجب علی کی عزت کو مٹی میں ملانا اس کا واحد مقصد تھا' لیکن یہاں پہنچ کر احساس ہوا تھا کہ وہ رجب علی کی بہن ہی نہیں اپنے آپ میں ایک مکمل شخصیت بھی ہے۔

"کیا کروں؟"

یہ سوال مسلسل اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ غصے میں کچھ دور درخت کے ایک کٹے ہوئے تنے پر جا بیٹھا۔ زیب النساء کو احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اچھو اس کے سامنے نہیں تھا۔ اس کا دماغ اس تمام تر صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ خوفزدہ تو وہ پہلے بھی تھی۔ اب خود کو اکیلا پا کر اسے لگا کہ وہیں گر کر بے ہوش ہو جائے گی۔ بہت مشکلوں سے قریبی درخت کے تنے کا سہارا لے کر وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے سوچا۔ "خدا جانے یہ کون سی جگہ ہے۔ میں کہاں ہوں اور وہ کہاں گیا۔ یہ کیا ہو گیا اچانک۔"

بازو میں ٹیس اٹھی تو اس کے منہ سے سسکی نکل گئی اور دائیں ہاتھ سے بایاں بازو سہلانے لگی۔

"لیکن وہ لمس کتنا عجیب تھا۔" اس نے بازو سہلاتے ہوئے سوچا۔ "اس وقت تکلیف دہ محسوس ہوا تھا۔ پر اب سنسنی خیز لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی تک اس نے پکڑ رکھا ہے۔ اور اس کے ہاتھ کتنے مضبوط تھے یوں جیسے فولاد کے بنے ہوں۔ مگر وہ گیا کہاں۔"

اس نے کن اکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن اسے اچھو کہیں بھی نظر نہ آیا۔ چادر اس کے سر سے سرک گئی۔ بائیں بازو سے چادر ہٹا کر اس نے قمیص کی آستین اٹھا کر چاندنی میں اپنے

بازو کا جائزہ لیا۔ گورے بازو پر سرخ نشان بہت واضح تھے۔ اس نے ان نشانوں پر ہاتھ پھیرا۔ یوں لگتا تھا جیسے پکڑنے والا اپنے ہاتھ کا لمس وہیں چھوڑ گیا ہو۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ اس مرتبہ اس نے خوب غور سے اچھو کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچھو کے نظر نہ آنے پر خوش ہو یا اس ویرانے میں تنہا رہ جانے کے بعد اس کے مل جانے کی دعا کرے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اچھو کا وہاں رہنا زیادہ خطرناک تھا یا وہاں سے چلے جانا۔

غور سے دیکھنے پر سامنے درختوں کے جھنڈ میں ایک کٹے ہوئے تنے پر اس کا ہیولا سا دکھائی دیا۔

اچھو تنے پر بیٹھا بغور اس کی حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ خوفزدہ تھی۔ پھر بازو سہلانے لگی۔ یقیناً اس نے اسے بہت سختی سے پکڑا تھا۔ اپنی اس وحشیانہ حرکت پر اسے خود ہی غصہ آگیا۔ پھر چھوٹی بی بی نے چادر ہٹا دی۔ اس کے لمبے بالوں کی چٹیا بل کھا کر سامنے اس کی گود میں پڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے آستین اٹھا کر اپنے گورے بازو کو سہلانا شروع کیا تو اچھو کا دل چاہا اپنا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے۔ اس کے یہ مضبوط ہاتھ ہمیشہ اپنے جیسے کسی طاقتور مرد پر اٹھے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس نے کسی کمزور لڑکی پر طاقت استعمال کی تھی۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا۔

وہ کتنی معصوم، کتنی پیاری لڑکی تھی۔ فرشتوں کے سے تقدس والی، وہ کیا کرنے چلا تھا اس کے ساتھ اسے اپنی مردانگی پر ہی تو مان تھا لیکن اپنے اس مان کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کتنا بھونڈا طریقہ ڈھونڈا تھا اس نے۔

''یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔'' اس کا دماغ بار بار اصرار کررہا تھا۔

لیکن دل ہر مرتبہ لعنت ملامت کر کے اسے روک دیتا تھا۔

''میں ایک بے قصور لڑکی کو اس کے بھائی کے کیے کی سزا نہیں دے سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بے قصور تو تم بھی تھے۔ تم سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی جس کی اتنی کڑی سزا دی رجب علی شاہ نے۔'' دماغ نے اسے اکسایا۔

''لیکن انصاف کے تقاضوں کے مطابق اس کی غلطی کی سزا اسی کو ملنی چاہیے۔'' اس نے دل ہی دل میں دماغ سے جرح کی۔

''یہ سزا بھی تو اسی کو ملے گی اسی کا سر جھکے گا۔ شادی کے لیے اس سے شاندار تحفہ کیا مل سکے گا اسے۔''

''اس کا سر نہیں اس کا پورا گھرانہ نشانہ ہو جائے گا۔ وہ بھی جنہوں نے جرم نہیں کیا۔''

''جرم سب نے کیا ہے۔'' دماغ نے زور دیا۔ ''اس جرم میں وہ بھی شریک ہیں جو اس کا ہاتھ روک سکتے تھے لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ نہیں روکا۔''

''مگر اس کی بہن تو اس کا ہاتھ نہیں روک سکتی تھی۔'' اس نے دماغ کو سمجھایا۔ ''خطا اس کی تو نہیں تھی پھر سزا میں وہ کیوں شریک ہو؟ اور پھر عورت کو انتقام کا نشانہ بنانا کہاں کی مردانگی ہے؟ بے چاری تو یوں بھی خوفزدہ ہے۔ نہ جانے میں نے اسے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔ وہ اب بھی بازو سہلا رہی ہے۔ افسوس میں نے بہت برا کیا۔''

اس نے بے اختیار اپنا داہنا ہاتھ تنے پر مارا۔ ''کاش میں نے یہ نہ کیا ہوتا۔''

زیب النساء اپنا بازو چھوڑ کر اسے تکنے لگی۔ وہ اپنا ہاتھ تنے پر مار رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ اب اسے اچھو سے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا لمس اسے اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ وہ پہلا مرد تھا جو اس کی زندگی میں آیا تھا۔ جس نے اسے چھوا اور اسے دیکھا تھا۔ خوابوں میں اس کی سمت بڑھنے والے ہیولے سے لپٹی دھند چھٹ گئی تھی۔ خدوخال واضح ہو گئے تھے اور جو شبیہہ ابھری تھی وہ ہو بہو اچھو کی تھی۔

اس جگہ اچھو کی موجودگی اسے دلاسا دے رہی تھی۔ اس کا تنومند وجود اس کے فولاد جیسے ہاتھ اسے کسی بھی مصیبت سے بچا سکتے تھے۔ اس کا تحفظ کر سکتے تھے۔ اس کا خوف ختم ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن وہ اسے یہاں کیوں لایا تھا؟ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''پتا نہیں کیوں۔'' اس نے سوچا۔ ''یا شاید وہ میرے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے مجھے یہاں لایا ہے یہ بتانے کے لیے لایا ہے کہ اسی طرح وہ مجھے ان اونچی اونچی دیواروں سے بھی نکال سکتا ہے۔ کیا میری دعائیں قبول ہو گئی ہیں؟ یا عہد نبھانے کے لیے کوئی مسیحا میری زندگی میں چلا آیا ہے؟ ہاں تب ہی تو وہ لمس اتنا اپنا اپنا سا لگا ہے۔ تب ہی تو اب تک میں وہ مضبوط انگلیاں اپنے بازو پر محسوس کر رہی ہوں۔ ہاں تب ہی تو......

لیکن اگر یہ میرے لیے آیا ہے تو کہتا کیوں نہیں ہے بتاتا کیوں نہیں ہے۔ امید کیوں نہیں دلاتا کہ مجھے سب سے بچا لے گا۔ سزا دینے والا کوئی ہاتھ، غصہ بھری کوئی نظر مجھ تک نہیں پہنچ سکے گی۔ کیوں نہیں کہتا کہ یہ مجھے زمانے کے تمام دکھوں سے چھپا کر رکھے گا۔ ایسی جگہ لے جائے گا جہاں پھوپھو کی روح نہیں ہو گی۔ کراہتی مسہری اور مذاق اڑاتا آئینہ نہیں ہو گا۔ جہاں کی دیواریں لہجوں کی بازگشت بن کر میرے اعصاب نہیں چٹخائیں گی۔ کیوں نہیں کہتا آخر۔'' اس نے امید بھری نگاہوں سے اچھو کی جانب دیکھا۔ ''میں بھی کتنی بے عقل ہوں۔ علی نے خود ہی تو بتایا تھا کہ یہ بول نہیں سکتا۔ تب ہی تب ہی تو اس نے کچھ نہیں کہا۔ چاہتا ہو گا کہ میں خود ہی سب کچھ سمجھ جاؤں لیکن میں کچھ نہیں سمجھی۔ ہاں اسی لیے اس نے تاسف سے اپنے ہاتھ کو تنے پر مارا

تھا۔ کتنا افسوس ہوا ہوگا اسے کہ میں کچھ نہیں سمجھی۔ پر اب میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔ مگر اسے کیسے بتلاؤں کہ میں نے سب اَن کہی باتیں سمجھ لی ہیں۔"

☆======☆======☆

"تصویریں تو میں کھینچ رہا ہوں لیکن روشنی کم ہے۔" حیدر علی نے کیمرے میں ریل ڈالتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کیسی آئیں گی؟"

"دو لالٹین جل رہی ہیں پھر بھی روشنی کم ہے؟"

حیدر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "دو چھوڑ کر چار لالٹین جلا لو تب بھی روشنی کم ہو گی ویسے فلیش تو ہے میرے پاس۔ خیر دیکھتے ہیں۔ ویسے کبھی دن میں کھینچنا ممکن ہو تو بہتر ہے تصویریں کھینچیں۔"

"دن میں تو ناممکن ہی سمجھیں۔" وہ بولی۔ "کوئی ایسی جگہ ہی نہیں ہے جہاں ہم مل سکیں اماں ابا...... کو کیا پورے گاؤں کو خبر ہو جائے گی کہ ہم ملتے رہتے ہیں۔"

"خالہ کبریٰ کے بیٹے نے مصیبت ڈال دی ورنہ اچھی بھلی ملاقات ہو جاتی تھی۔" وہ بولا۔

"خیر چھوڑو۔ کوئی اچھا سا پوز دو۔"

"کیا مطلب؟"

"اب اس کا کیا مطلب سمجھائیں تمہیں۔ پہلے ایسا کرو کہ گھر میں جتنی لالٹین یا موم بتیاں ہوں وہ لے آؤ۔"

"آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔"

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جسے غالباً سٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن عام گھروں کے اسٹور کے برعکس یہ بہت صاف ستھرا اور تمام فالتو سامان بھی قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ زرینہ نے لالٹین اونچی کی۔ شیلف پر چار لالٹین اور بہت سے دیئے پڑے ہوئے تھے۔ وہ یہ سب سامان کمرے میں اٹھا لائے۔

"اگر ہم ان سب کو جلا دیں تو روشنی زیادہ ہو جائے گی؟"

زرینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"مجھے صرف اتنی لائٹ چاہیے جس میں فوکس کیا جا سکے...... گزارا ہو جائے گا۔"

"تو چلیں دیئے جلاتے ہیں۔" اس نے کہا۔

وہ دونوں ترتیب سے رکھے ہوئے دیئے جلانے لگے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا دیئے جلانا اتنا دلچسپ کام بھی ہو سکتا ہے۔" حیدر علی بولا۔

"پہلے کبھی نہیں جلائے؟"

"تمہارے ساتھ پہلے کبھی نہیں جلائے اس لیے۔"

زرینہ نے پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ حیدر علی اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ دیئے کی مدھم لو کے سب رنگ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ حیدر علی کو مسلسل اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ جھینپ کے پھر دیوں پر جھک گئی۔

☆======☆======☆

"کتنی دیر ہو گئی ہے، زیبی اب تک نہیں پہنچی۔" مہر النساء نے اماں جان کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں خود فکر مند ہوں کہ اب تک آئی کیوں نہیں۔"

"شاید اس نے آنے کا ارادہ بدل دیا ہو۔" مہر النساء نے خیال ظاہر کیا۔

"ارادہ کیوں بدل دیا ہو۔ میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ تیار ہو کر جلد از جلد علی کے ساتھ یہاں پہنچے۔"

"پھر کیوں نہیں آئی؟"

"باہر پتا کراؤ کہ علی آیا ہے یا نہیں۔ اگر وہ آ گیا ہے تو اس کا مطلب ہے زیبی نے آنے کا ارادہ بدل دیا ہے اور اگر وہ اب تک نہیں آیا تو زیبی نے اسے بھی اپنے ساتھ دیر کروا دی ہوگی۔"

"میں پتا کرواتی ہوں۔" مہر النساء نے کہا اور حمیدہ کو علی کا پتا کرنے باہر بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد حمیدہ نے اطلاع دی کہ حیدر علی بھی اب تک نہیں پہنچا۔

"بس دونوں آتے ہی ہوں گے۔" مہر النساء مطمئن ہو کر اس کونے کی طرف دیکھنے لگی جہاں رضیہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ کافی دیر سے اسے زرینہ کی غیر موجودگی کھٹک رہی تھی۔

"رضیہ آ گئی ہے، زرینہ کیوں نہیں آئی۔" وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اچانک ایک خدشے نے سر اٹھایا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ علی کو زرینہ نے کسی طور روک لیا ہو؟ لیکن کیسے؟ اور پھر علی اکیلا تو نہیں اس کے ساتھ زیبی بھی ہے۔"

رضیہ اور دوسری لڑکیاں باتیں بھی کر رہی تھیں اور مسلسل ہنس بھی رہی تھیں۔

"دیکھا جائے تو رضیہ اور زرینہ کی شکلیں بہت ملتی ہیں۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "لیکن زرینہ بہت زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت گوری ہے جبکہ رضیہ سانولی ہے بالکل ایسے ہی جیسے زیبی گوری اور میں سانولی ہوں۔ میرے اور زیبی کے درمیان بھی وہی فرق ہوگا جو رضیہ اور زرینہ کے درمیان ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد میں بھی اس قدر فرق ہوتا ہے۔

حُسن کتنا اہم ہوتا ہے عورت کے لیے۔ اگر مردوں کو موقع دیا جائے تو وہ کبھی کم صورت لڑکی کو نہیں چنیں گے۔ علی کو ہی دیکھ لو، گاؤں کی سب سے حسین لڑکی پسند کی ہے اپنے لیے۔ وہ

فوزیہ بے چاری تو کچھ نہیں ہے زرینہ کے مقابلے میں۔ اس کی نگاہیں خود بخود فوزیہ کی طرف اٹھ گئیں۔ اس میں علی کو متوجہ کرنے کی کوئی صفت بھی تو نہیں ہے۔ رنگ صاف ہے لیکن ناک نقشہ بس گزارے لائق ہے۔ علی کی ولایتی سوچ کے سامنے یہ اپنی دیسی سوچ لیے کبھی بھی سر نہیں اٹھا سکے گی۔ جس جہان کی باتیں علی کرتا ہے اس تک تو اس کی سوچ کی پرواز بھی ممکن نہیں۔ یہ بھی اس کے سامنے اپنی شخصیت لیے سرنگوں ہوتی جائے گی دبتی جائے گی۔ جیسے ہر عام عورت کے ساتھ ہوتا ہے' جیسے اماں جان کے ساتھ ہوا۔''

فوزیہ چلتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔

''زیبی آپی نہیں آئیں؟'' اس نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ وہ یونہی مدھم آواز میں باتیں کرنے کی عادی تھی۔

''آتی ہوگی اسے اور علی کو اکٹھے آنا ہے۔''

علی کا نام سن کر فوزیہ کے چہرے پر شرم کے کئی رنگ پھیل گئے۔

''جی۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''کھڑی کیوں ہو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔'' مہر النساء نے اپنے ساتھ صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی۔'' وہ بیٹھ گئی۔'' اس کے چہرے پر اب تک رنگ ہی رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

مہر النساء کو اس پر ترس آنے لگا۔

''اسے کیا معلوم کہ جس کے ذکر پر اس کے چہرے پر اتنے رنگ پھیل گئے ہیں' وہ اسے نہیں کسی اور کو چاہتا ہے۔ کتنی تکلیف دہ حقیقت ہے۔ یہ زرینہ کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن چپ چاپ بغیر دیکھے علی سے محبت کیے جا رہی ہے۔ خود علی کو بھی اس محبت کی خبر نہیں۔ اسے خبر ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ وہ تو زرینہ کے علاوہ کسی اور کی جانب دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔ افسوس' جس نے بڑھ کر اظہار محبت کر دیا' یہ مرد اس کی جانب قدم بڑھا دیتے ہیں اور جو اتنی محبت دل میں چھپائے رکھے اسے درخور اعتنا ہی نہیں جانتے۔''

''کیا سوچ رہی ہیں آپا؟''

فوزیہ کی بات نے اسے چونکا دیا۔

''سوچ رہی ہوں کہ اب علی کی شادی بھی ہو جانی چاہیے۔''

فوزیہ کا چہرہ شرم سے بالکل سرخ ہو گیا۔

''چچ...... چچ۔'' مہر النساء نے دل ہی دل میں افسوس کیا۔ ''اگر اسے علم ہو جائے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔''

☆======☆======☆

اچھو نے اپنے داہنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس ہاتھ سے اس نے چھوٹی بی بی کو پکڑ کر کھینچا تھا۔ اس کی انگلیاں اس کی نرم و نازک جلد میں کھبتی چلی گئیں اور اس نے پروا تک نہیں کی۔ کتنا بے رحم ہو گیا تھا وہ۔

اس نے تو یہ بھی پروا نہیں کی کہ وہ پیر صاحب کی بیٹی تھی۔ سیدزادی تھی۔ ان پیر صاحب کی اولاد تھی جنہوں نے اس کے خاندان پر بے شمار احسان کیے تھے۔

اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ عورت نزاکت اور لطافت کا دوسرا نام ہے۔ جو اندھیری راہوں میں چاند کی طرح اپنے وجود کی روشنی بکھیرتی ہے۔

اس نے گاؤں میں بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں...... تین مرتبہ وہ شہر بھی گیا۔ وہاں بھی بے شمار لڑکیاں نظر آئی تھیں اسے' لیکن کسی میں بھی ایسی کشش' اتنی معصومیت نہیں تھی۔ اس نے بات نہیں کی تھی۔ اچھو کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو شاید کوئی شکوہ کرنا جانتی ہی نہیں تھی۔

''کاش یہ سیدزادی نہ ہوتی' کاش یہ عام سے کسی کسان کی بیٹی ہوتی اور میں ابا سے کہلوا کر اسے اپنا لیتا۔'' اس نے سوچا۔ ''ماں کہتی تھیں کہ آج نہیں تو کل مجھے ضرور کوئی نہ کوئی لڑکی پسند آ جائے گی اور میں کہا کرتا تھا کہ میری زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ کتنا زعم تھا مجھے اپنے آپ پر۔ کیا معلوم تھا کہ ایک لڑکی کی معصومیت میرے دل میں اس طرح بس جائے گی کہ کائنات کا رخ ہی بدل جائے گا۔''

اور پسند بھی آئی تو کون سی لڑکی' جو چاند کی طرح روشن اور پرکشش ہے تو اتنی دور بھی ہے۔ اسے چھونا تو کیا دیکھنا بھی منع ہے۔ جو میرے ہی نہیں کسی کے بھی نصیب میں نہیں ہے۔ آہ میری قسمت۔''

اچھو کے اندر خلا سا سرا ترتا جا رہا تھا۔ سناٹا پھیلتا جا رہا تھا' لفظ گم ہو رہے تھے۔ صرف چھن جانے کا احساس تھا جو دل میں جڑ پکڑ رہا تھا۔

''کیا زندگی کے سب المیے میرے اوپر بیتیں گے؟ اندھیری راتوں کی ساری بے کلی صرف میرا ہی مقدر رہے گی؟ جو وجود خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام بن کر آیا ہے' کیا میرے لیے سزا بن جائے گا؟ کیسے بھولوں گا اس لڑکی کو جس کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے؟ رجب علی شاہ تجھے سزا دیتے دیتے میں نے خود کو ہی عمر قید کی سزا دے ڈالی۔ مجھے کیا معلوم تھا ایسا ہو جائے گا۔ اچانک محبت مجھے اپنا قیدی بنا لے گی۔''

اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو غور سے دیکھا جس کی انگلیوں کی پوروں پر زیب النساء کے لمس کی تازگی وہ اب تک محسوس کر رہا تھا۔

''میں نے سوچا تھا کہ کل میری زبان پر لگے قفل خود بخود کھل جائیں گے مگر ان پر تو ایک اور قفل لگ گیا ہے۔ کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ چاند کو بڑھ کر چھو لینے کی آرزو کو دل کے بہت اندر دفن

کر دینا چاہیے۔

دل پر بوجھ لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شکستہ قدموں سے زیب النساء کی جانب بڑھا۔ زیب النساء بڑی بڑی آنکھیں کھولے قدم بہ قدم اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھتی رہی۔

''وہ آرہا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''میرے لیے' مجھے امید دلانے کے لیے۔ یہ باور کرانے کے لیے کہ حویلی کی دیواریں خواہ کتنی اونچی اور موٹی کیوں نہ ہوں' اس کا راستہ کبھی نہیں روک سکتیں۔ مگر اس کے قدموں میں شکست کی چاپ کیوں ہے؟ شاید اس کا خیال ہے کہ میں اس کی بات نہیں سمجھی۔ پاگل' بھلا ہر بات کہہ دینے کے لیے لفظ ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو بغیر لفظوں کے بھی سب کچھ سمجھ جاتی ہوں۔ ہر وہ شور سن لیتی ہوں جسے اور کوئی بھی نہیں سن سکتا۔

میں تو پھوپھو کی بھی ہر بات سمجھ لیتی ہوں جنہیں مرے ہوئے بھی ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ مجھے یاد ہے' جب میں حویلی سے نکلنے لگی تھی تب بھی انہوں نے کہا تھا کہ اگر میری زندگی میں کوئی اہم دن آئے۔ فیصلے کی کوئی گھڑی آئے تو مجھے حوصلہ اکٹھا کرنا ہوگا' ڈر اور خوف جو میری روح سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں انہیں اتار پھینکنا ہوگا۔ اپنا قدم آگے بڑھانا ہوگا تاکہ میں بھی ان کی طرح گھٹ گھٹ کر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اسی مسہری پر جان نہ دے دوں۔

اور میں بھی یہی سمجھتی رہی کہ میں اپنا قدم آگے نہیں بڑھا سکوں گی۔ ڈر کے بچھو ہمیشہ مجھے ڈنک مارتے رہے' خوف کے سانپ مجھے ڈستے رہے' کبھی عزت کے نام پر۔ کبھی مذہب کے نام پر۔ میرا جسم ان کے زہر سے نیل ونیل ہوگیا۔ سارے کا سارا۔ ڈر اور خوف کا زہر ایک ایک رگ وریشے میں سرایت کرتا گیا۔ میں نے اس ساری زندگی کے لیے مقدر جان کر اس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

مگر آج جسم کا ایک ایک ریشہ احتجاج کر رہا ہے' مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ ''آخر کیوں؟'' میرا اپنا وجود باغی ہو رہا ہے۔ خوف کی جونکیں خود ہی مر مر کے گرتی جا رہی ہیں۔ صرف اس ایک شخص کی وجہ سے' جو مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لے تو دنیا کا کوئی تیر مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ میں تو بہت کمزور تھی۔ بہت ڈرپوک تھی۔ یہ اس ایک شخص کا اعجاز ہے کہ میری کمزوری نے خود ہی دم توڑ دیا ہے۔ ڈر اور خوف نہ جانے کہاں گم ہو گئے ہیں اور میں ٹھنڈی شفاف فضا میں سانس لینے لگی ہوں۔

ہاں میں نے ڈر اور خوف کے بندھن سے خود کو چھڑا لیا ہے۔ مجھے مسہری پر گھٹ گھٹ کر جان دینا منظور نہیں ہے۔ مجھے دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان نہیں دینی۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ زندگی پر میرا بھی حق ہے اور یہ حق میں پوری طرح وصول کروں گی۔ جب ساتھ دینے والا اس قدر مضبوط ہو تو کسی کا ڈر کیسا؟''

اور پھر [illegible] کا لمس۔ اس نے [illegible] سوچتے اپنے بازو پر وہیں ہاتھ رکھ دیا۔ جہاں اچھو

کی انگلیوں کے نشان اب بھی موجود تھے۔

اچھو قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے مقابل پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا۔ زیب النساء اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اچھو نے نظریں جھکا دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ معذرت کے چند الفاظ بول کر دل کو تسلی دے لیکن لفظ کھو گئے تھے اور ذات کے اندر بننے والا خلا بڑھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چادر زیب النساء کے سر پر رکھ دی اور اس کی طرف دیکھے بغیر تانگے کی سمت بڑھ گیا۔ زیب النساء بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔

''کیا یہ کوئی اشارہ تھا؟'' وہ سوچ رہی تھی۔

تانگے پر چڑھنے سے قبل ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے اچھو کی سمت دیکھا اور پھر اندر بیٹھ گئی۔ اچھو نے تانگے کے گرد پردہ برابر کیا اور تھوڑی ہی دیر میں تانگہ چل پڑا۔

اچھو ہر سزا کے لیے تیار تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ حویلی کی سید زادی کو اس کی مرضی کے بغیر جنگل میں لے جانا' اس کا چہرہ دیکھ لینا' اسے چھونے کی جسارت کرنا۔ یہ کوئی چھوٹے جرائم تو نہیں تھے۔ یوں بھی رجب علی اسے بتا چکا تھا کہ اس کی دوسری حماقت کی سزا کیا ہوگی۔ وہ بھی موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ اسے صرف اس بات کا رنج تھا کہ جس لڑکی کو محبت کی نظر سے دیکھا تھا اسی کو تکلیف پہنچانے کا الزام مرنے سے پہلے اس کی روح کو چھید ڈالے گا۔

☆======☆======☆

اتنے سارے دیوں اور لالٹینوں کی وجہ سے کمرا اچھا خاصا روشن ہوگیا تھا۔

''اب کافی ہے روشنی؟'' زرینہ نے سوالیہ نگاہوں سے حیدر علی کی جانب دیکھا۔

''ہاں' بہتر ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب تم تصویریں اتروانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''میں بالکل تیار ہوں۔''

''یونہی کھنچواؤ گی؟''

''کیوں ٹھیک نہیں لگ رہی؟'' اس نے ہاتھ سے قمیص کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی۔

''تم تو کیسے بھی رہو' دنیا کی حسین ترین لڑکی رہو گی۔''

وہ ہنس پڑی۔

''بیک گراؤنڈ دھندلا کرنا پڑے گا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ کمرے میں بیک گراؤنڈ کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں ہے۔''

زرینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اچھا یوں کرو۔'' اس نے پُرخیال نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ''کوئی اور جگہ تو ہے نہیں۔ چارپائی پر بیٹھ جاؤ اور سائل دو' یعنی مسکراؤ۔ ہاں گڈ۔''

کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ فلیش چمکی اور تصویر بن گئی۔ ایک ایک کر کے اس نے کتنی ہی تصویریں کھینچ لیں۔

''تم بہت اچھی ماڈل ثابت ہو رہی ہو۔'' حیدر علی نے کہا۔

''شکریہ۔'' وہ مسکرائی۔

''اب ایسا کرو بال کھول دو۔''

''اچھا۔'' اس نے بال کھول کر انہیں اچھی طرح کنگھی کر لیا۔ حیدر علی سگریٹ ہونٹوں میں دبائے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ریشمی بال گھٹنوں تک لمبے تھے۔

''ٹھیک ہے۔''

''ہوں۔'' حیدر علی نے کیمرا اٹھا لیا۔ ''اب اپنا بایاں ہاتھ بالوں میں پھیرو۔ جہاں میں کہوں' سٹاپ وہاں رک جانا۔''

زرینہ نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنا بایاں ہاتھ بالوں تک لے گئی۔ ایسے میں کُرتے کی کھلی سی آستین کہنی تک سرک گئی۔

''یہ تمہارے بازو کو کیا ہوا ہے؟'' حیدر علی نے پوچھا۔

''کہاں؟ کچھ نہیں ہوا۔''

وہ چلتا ہوا قریب آ گیا اور اس کا بازو تھام لیا جو کہنی کے پاس سے جھلسا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟''

''اچھا آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔ روٹیاں پکاتے ہوئے کبھی کبھار جل جاتا ہے۔''

''کیسے جل جاتا ہے؟ تم دھیان سے نہیں پکاتیں دیکھو کیا حال کر لیا ہے اپنے بازو کا۔''

''کتنا بھی دھیان سے پکایا جائے پھر بھی جل جاتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''لکڑیوں پر پکاتے ہوئے ایسے ہی ہوتا ہے۔ کہیں آنچ بہت زیادہ ہوتی ہے اور کہیں بہت کم۔ ابا کو جلی ہوئی روٹی بہت بری لگتی ہے۔ روٹی بچاتے ہوئے بازو جل جاتے ہیں۔''

حیدر علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''یوں تو بازو پر نشان پڑ جائیں گے۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا جس سے بازو نہ جلے۔''

''ہے تو سہی۔ تیل کا چولہا آ جائے تو بہت فائدہ ہو لیکن تیل کا چولہا بہت مہنگا ہے۔ اماں ہر دفعہ پیسے جمع کرتی ہیں اور ہر مرتبہ وہ پیسے کہیں اور لگ جاتے ہیں۔''

''آئندہ سے تم روٹیاں نہیں پکاؤ گی۔''

''میں نہیں پکاؤں گی تو اور کون پکائے گا؟'' وہ ہنسی۔

''مجھے نہیں معلوم۔ بس تم نہیں پکاؤ گی۔ رضیہ سے کہہ دو وہ پکا لیا کرے۔''

زرینہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''وہ نہیں جلے گی کیا؟''

''اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ تم میری ہو' تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ باقی سب سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''اتنی خود غرضی۔ چچ۔ چچ۔''

''تم اسے خود غرضی کہو یا کچھ اور۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔''

☆======☆======☆

حویلی کے احاطے میں پہنچ کر تانگہ رک گیا۔ یہاں بھی پردے کا پورا انتظام تھا اور باپردہ خواتین کو یہیں اتارا جاتا تھا۔ تانگے کے رکتے ساتھ زیب النساء نیچے اتر آئی۔ اچھو بھی تمام تر حوصلہ جمع کر کے اس کے قریب چلا آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کر لے۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ دنیا اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے اور اس پر کتنے پتھر پھینکتی ہے۔ اسے غرض تھی تو صرف اس بات سے کہ جس لڑکی کو زمانے میں اس نے اپنا دل دے دیا تھا۔ وہ اسے برا نہ سمجھے۔

اچھو کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر زیب النساء کے دل کی دھڑکنیں پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔

''شاید کوئی اشارہ' کوئی یقین دہانی۔'' اس نے پُر امید نظروں سے اچھو کی جانب دیکھا۔

لیکن دوسری سمت گہری خاموشی طاری تھی۔

اچانک کہیں سے کراہیں ابھریں' پھوپھو کی کراہیں جو اس سے کہہ رہی تھیں کہ زندگی میں کوئی اہم دن آئے فیصلے کی گھڑی آئے تو اسے حوصلہ اکٹھا کرنا ہوگا۔ اپنا قدم بڑھانا ہوگا تاکہ وہ گھٹ گھٹ کر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنے کمرے کی مسہری پر جان نہ دے۔

اس نے کھوجتی نظروں سے اچھو کی جانب دیکھا۔ وہاں تاسف تھا' پشیمانی تھی۔

''جو تم کہنا چاہتے تھے اور تم نے نہیں کہا' وہ سب مجھے معلوم ہے۔ تم بول نہیں سکتے مگر میں بول سکتی ہوں' یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سب معلوم ہے۔ کوئی اپنے دل کی دھڑکنوں سے کب تک بے خبر رہ سکتا ہے۔'' زیب النساء کے ہونٹ ہلے۔

اچھو حیرت اور تعجب سے اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا اور وہ مڑ کر تیزی سے حویلی کے اندر چلی گئی۔

''اتنی دیر سے کیوں آئیں؟''

وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو مہر النساء نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''میں سخت پریشان ہو رہی تھی۔''

''آں' ہاں۔'' زیب النساء جیسے خواب کی سی کیفیت سے باہر نکل آئی۔ ''میں کہیں نہیں

تھی۔ یہیں آ رہی تھی۔''

مہرالنساء نے چند ثانیے حیرت سے اسے دیکھا پھر اپنی حیرت کو زبان دیتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا زیبی! تم اپنے آپ میں نہیں لگ رہیں۔''

اس نے جلدی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یوں جیسے کوئی چوری پکڑے جانے کا خوف ہو۔

''نہیں تو۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''نہ بتاؤ۔ ویسے تمہارا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' مہرالنساء بولی۔ ''صرف یہ بتا دو کہ علی کہاں ہے؟ ہم سب تم دونوں کے لیے فکرمند تھے۔ فوزیہ کا تو برا حال تھا۔ وہ منہ سے تو کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن میں جانتی ہوں کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ وہ تو یوں بھی گاڑی کے سفر سے خوفزدہ رہتی ہے۔''

''گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی یا شاید علی نے جان بوجھ کر خراب کر دی تھی اس لیے دیر ہو گئی۔''

''زرینہ سے ملنے کے لیے؟''

''لگ تو یہی رہا تھا۔''

''یہاں بہت شور ہے۔ چلو چل کر کسی پُرسکون کمرے میں بیٹھتے ہیں۔'' مہرالنساء نے کہا۔ ملازمہ انہیں ایک آراستہ کمرے میں چھوڑ گئی۔

''اماں جان کہاں ہیں؟''

''بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں تو چچی جان انہیں آرام کرنے کی غرض سے کمرے میں لے گئی ہیں۔ وہیں اماں جان بھی ہیں اور چچی جان بھی۔''

''اچھا۔''

''اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' مہرالنساء گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔

''ہم آ رہے تھے اور مسجد کے پاس پہنچ کر گاڑی خراب ہو گئی۔ وہیں کمرے کی کھڑکی میں زرینہ بھی کھڑی تھی اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ علی کے ساتھ میں' اس کی بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔''

''پھر تم کیسے آئی ہو؟''

''میں؟'' زیب النساء کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ ''میں تانگے پر آئی ہوں۔''

''کس کے ساتھ؟''

مہرالنساء کی کھوجتی ہوئی نظریں اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں چرا لیں۔

''مجھے نہیں معلوم زیبی کہ تم کس کے ساتھ یہاں تک آئی ہو اور علی نے تمہیں یوں اکیلے ہی [illegible]ں بھیج دیا۔ میں تو صرف اس قدر جانتی ہوں کہ مرد اس دنیا کی سب سے قابلِ نفرت اور سب [illegible] بے اعتبار شے ہے۔''

''نہیں آپا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ پھر نگاہیں جھکالیں۔ ''ایسا نہیں ہے۔''

''تم نے دنیا نہیں دیکھی زیبی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ علی کو ہی دیکھ [illegible] تمہیں نظر انداز کر کے زرینہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔''

''وہ میرے لیے بے اعتبار نہیں ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''اس نے کہا اور تم نے یقین کر لیا۔'' مہرالنساء بولی۔ ''اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو گی۔''

''یہی تو اعتبار ہے۔ اس نے کچھ نہیں کہا پھر بھی میں سب کچھ سمجھ گئی۔''

''اس نے کچھ نہیں کہا؟'' مہرالنساء کے انداز میں بے یقینی تھی۔

''ہاں۔''

''اور تمہارا خیال ہے کہ وہ بے اعتبار نہیں ہے۔ وہ تمہیں چاہنے لگا ہے۔ تم جانتی ہو کہ تم [illegible] بھنور کی طرف بڑھ رہی ہو؟''

''بڑھ نہیں رہی ہوں۔ بڑھ چکی ہوں لیکن آپا وہ مجھے ہر بھنور سے بچانے کی صلاحیت رکھتا [illegible] وہ تمام پتھر اپنے جسم پر روک لے گا' سب تیروں کے سامنے ڈھال بن جائے گا۔ وہ مجھے [illegible] لے گا سب سے۔''

''علی سے میں نے کہا تھا کہ اسے اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے پر تم سے کیا کہوں۔ تم [illegible]تی ہو کہ تم کیا کر رہی ہو اور اس کا انجام کیا ہو گا۔ پھر کیوں کر رہی ہو ایسا' مت کرو یہ۔''

''آپا میں ڈرتی تھی۔ بہت زیادہ اتنے سارے خوف جونک کی طرح میری ذات سے [illegible] ہوئے تھے۔ میں اپنی مرضی' اپنی پسند کی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مبادا میری ضبط کی [illegible]ل میں میرے ہی ہاتھوں نقب لگ جائے لیکن آج عجیب بات ہوئی۔

گھوڑے کی ٹاپوں اور تانگے کے پہیوں نے اچانک میرے بھید کھول دیئے۔ میں تو [illegible]ان ہی رہ گئی۔ پھر اس سریلی موسیقی نے مجھ سے کہا کہ میں اب خواہشوں کی اسیر ہو گئی ہوں۔ [illegible] چاہتے ہوئے انجانے میں ہی سہی' میری پہلی خواہش پوری ہو گئی ہے۔

''اور آپا۔'' زیب النساء بولی۔ ''پہلی خواہش انجانے میں کیا پوری ہوئی' میں کسی اور [illegible]اہش پر بند ہی نہ باندھ سکی۔ تنکے کی طرح آرزوؤں کے ریلے میں بہتی چلی گئی میں۔ آپ نہیں [illegible]تیں وہ لمس کتنا انوکھا' کتنا مختلف تھا۔ یوں لگا جیسے تپتے صحرا پر بوندیں برس گئی ہوں۔ آپا میں [illegible]ابھی تو خود پر بند نہیں باندھ سکتی تھی۔

جب تک حصول کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہو تب تک بہت سے دعوے کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک

مرتبہ امید کی کرن چمک جائے تو سب دعوے ریت کی دیوار کی طرح ایکا ایکی بیٹھ جاتے ہیں۔"

"ہونہہ۔ عورت کتنے ہی خواب دیکھ ڈالتی ہے صرف ایک ثانیے میں۔ تم نے بھی حویلی کی دیوار میں اندر سے نقب لگانا شروع کر دی۔"

"آپا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے اسے نقب لگانا مت کہیں۔"

"تم یہ نہ سوچو کہ مجھے حویلی یا اس کے اونچے برجوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ قطعاً نہیں انہیں تو کب کا زمین بوس ہو جانا چاہیے تھا۔ اور میں تو دور بیٹھے ان کے گرنے کا انتظار ہی کر رہی ہوں۔ مجھے تو تم سے ہمدردی ہے۔ ہر اس عورت سے ہمدردی ہے جو ان دیو ہیکل مردوں کے ساتھ پہنچ کر اپنا آپ کھو دیتی ہے اور ان کے مقابل محض بونی بن کر رہ جاتی ہے۔ مجھے اماں جان سے ہمدردی ہے۔ یاسمین سے ہمدردی ہے' فوزیہ سے ہمدردی ہے اور نہ جانے کس کس سے ہمدردی ہے۔ یہ سب اپنے پورے وجود سمیت ننھی منی بونیاں ہیں۔ یہ کتنی تگ و دو کر لیں' کیے جتن کر لیں اتنی بلند نہیں ہو سکتیں کہ دیو ہیکل مردوں کے سامنے اپنا آپ نمایاں کر سکیں۔"

"آپا وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے وارفتگی سے تکتا ہے۔ اور میں اسے۔ مجھے کوئی جتن نہیں کرنا پڑا۔"

"ابھی تو جتن زرینہ کو بھی نہیں کرنا پڑا۔ ہاں فوزیہ کے مقدر میں اس جتن کے علاوہ کچھ اور شاید ہے ہی نہیں۔ پتا نہیں کیوں آخر کار سب تقسیم الٹ جاتی ہے۔ زرینہ بھی جتن کر لے گی اور تمہیں بھی تگ و دو کرنا ہو گی۔ قدرت کا اصول ہے کہ بالآخر تقسیم ویسی نہیں رہتی جیسی نظر آتی ہے اور ہر عورت کو اپنے حصے کی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔"

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اس کے بغیر میری زندگی کتنی ویران' کتنی بنجر تھی۔ اس کے ایک لمس نے میری روح تک شاداب کر دی ہے۔ اس نے یہ ہاتھ پکڑا تھا۔" زیب النساء نے اپنا بازو آگے بڑھایا۔ "اور میں اب تک تازگی محسوس کر رہی ہوں نہ جانے اتنی ساری زندگی اس کے بغیر کیسے گزار دی میں نے۔"

"باقی زندگی بھی اس کے بغیر گزارنی ہو گی۔"

"نہیں۔" زیب النساء کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "ایسا نہیں ہو گا۔"

"تو کیا کرو گی؟"

"وہ مجھے لے جائے گا۔ یہاں سے بہت دور۔ اتنی دور کہ دکھ کی کوئی پرچھائیں بھی وہاں نہیں پہنچیں گی۔ پچھتاوے کا کوئی بچھو مجھے ڈنک نہیں مارے گا۔"

"اس خوش فہمی سے نکل آؤ۔ پہرے بہت کڑے ہیں۔ آج کے بعد پھر کتنے ہی عرصے کے لیے ہم انہی دیواروں میں قید ہو جائیں گی۔"

"پہرے تو اب بھی کڑے ہیں میری قسمت میں محبت کے پھول کا کھلنا لکھا ہوا تھا

وہ کھل گیا۔ اگر قسمت میں اس کا پھلنا پھولنا لکھا ہے تو وہ تمام تر پہروں کے بیچ سے بھی اس پھول کو پانی دینے چلا آئے گا۔ میں بے چین ہوں تو وہ بھی ضرور بے آرام ہو گا۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کون ہے؟ آ جاؤ۔" مہر النساء نے کہا۔

دروازہ تھوڑا سا کھول کر فوزیہ نے جھانکا۔

"آؤ فوزیہ! باہر کیوں رک گئیں۔"

فوزیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آ گئی۔

"میں زیبی آپی سے نہیں ملی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر اوڑھنی کے پلو سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ دونوں یہاں ہیں۔"

"میں تھک گئی تھی اس لیے زیبی کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئی۔ تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ چپ چاپ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم کہاں تھیں' مجھے وہاں بڑے کمرے میں تو نظر نہیں آئیں۔" زیب النساء نے پوچھا۔

"پھوپھو بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں۔ انہیں کمرے میں لے گئی تھی اور ٹانگیں دبانے لگی تھی۔"

"کوئی عورت نہیں تھی یہ کام کرنے کے لیے جو تم ٹانگیں دبانے لگیں۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔ یوں بھی یہ تو میرا فرض ہے۔" وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بولی۔

"تم فرض نبھاتی رہ جاؤ گی۔ خبر نہیں باقی سب بھی تمہاری طرف نکلنے والے فرض پورے کریں گے یا نہیں۔"

"جی؟" وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"کچھ نہیں۔"

"آپ کو دیر کیوں ہو گئی؟" اس کے انداز میں جھجک تھی۔

"گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ پھر میں تانگے میں آ گئی اور علی گاڑی کے پاس ٹھہر گیا۔"

فوزیہ کے انداز میں بے کلی واضح تھی۔ کتنی دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔

"باہر اندھیرا تو بہت ہو گا۔"

"نہیں اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"ویسے ہی۔" اس نے یوں نظریں چرائیں جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ "اصل میں مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔"

"تم گھبراؤ مت علی اندھیرے سے نہیں ڈرتا۔" مہرالنساء مسکرائی۔

فوزیہ نے شرما کر اپنا چہرہ گھٹنوں میں دے لیا۔ مہرالنساء اور زیب النساء نے ایک دوسرے کی جانب افسوس سے دیکھا۔

"زیبی! باباجان فوزیہ اور علی کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کب کریں گے؟"

"کہہ تو رہے تھے کہ بھائی جان کی شادی کے فوراً بعد کردیں گے۔"

"اچھا نہ رہے اگر آج ہم یہ اعلان کردیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بہت چھپالیا۔ اب گاؤں کی چند لڑکیوں کو ضرور خبر ہونی چاہیے۔ ہوسکتا اس سے بھلے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"آپ کا مطلب ہے رضیہ وغیرہ؟" زیب النساء نے جھجک کر پوچھا۔

"ہاں۔" پھر وہ فوزیہ سے مخاطب ہوئی۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

لیکن فوزیہ بدستور چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔

"دیکھ لیں کہیں علی کو برا نہ لگے۔" زیب النساء متذبذب تھی۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم لڑکیوں کو بلواؤ۔"

باقی لڑکیوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اصل اہمیت رضیہ کی تھی جس کے ذریعے یہ خبر زرینہ تک پہنچ سکتی تھی لیکن اسے الگ بلاکر بتانا غیر مناسب بات لگتی اس لیے کافی ساری لڑکیوں کو بلالیا گیا تھا۔

"جی بی بی۔" وہ اندر آگئیں۔

"بیٹھو...... ہم نے تم لوگوں کو ایک خوش خبری سنانی تھی۔"

لڑکیوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر وہیں قالین پر بیٹھ گئیں۔

"اب تو کافی سارے سال گزر گئے ہیں اس بات کو مگر باباجان کا ارادہ تھا کہ بڑے شاہ صاحب کی شادی کے بعد یہ خوش خبری گاؤں والوں تک پہنچائیں مگر ہم بہنوں کے لیے بہت مشکل ہے کہ اتنی اچھی خبر کو خود تک محدود رکھیں اس لیے سوچا کہ اب آپ لوگوں کو اس میں شریک کرہی لینا چاہیے۔" مہرالنساء کا روئے سخن خصوصاً رضیہ کی جانب تھا جو بہت دلچسپی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں صرف برابر کے خاندان میں رشتہ جوڑا جاتا ہے۔" مہرالنساء نے رضیہ پر چوٹ کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت رضیہ اس بات کو بالکل نہ سمجھ سکی۔

"اس لیے باباجان نے چھوٹے شاہ صاحب کا رشتہ اماں جان کے بھائی کی سب سے

...ماری بیٹی فوزیہ سے طے کردیا ہے۔"

رضیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مبارکباد دے رہی تھیں اور وہ منہ کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک نظر گٹھڑی سی بنی فوزیہ کی جانب دیکھا اور پھر مہرالنساء کی طرف جو آنکھوں میں تنبیہہ لیے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ تمام بات ناقابل یقین تھی۔ چھوٹے شاہ صاحب نے زرینہ سے وعدہ کیا تھا شادی کا۔ خود اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کریں گے پھر یہ فوزیہ درمیان میں کہاں سے آگئی تھی۔ اس کی بہن کی جگہ لینے۔ یکبارگی اسے فوزیہ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی بہن کے حق پر ڈاکا ڈال رہی ہو۔

شاہ صاحب نے زرینہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی

ار۔

تو کیا وہ جھوٹ ... فریب تھا؟ محض وقت گزاری۔ اسے چھوٹے شاہ صاحب سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہ جال انہی کا بچھایا ہوا تو تھا۔ جس میں زرینہ جیسی معصوم لڑکی پھنس گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے اور زرینہ کو ساری بات بتا کر اسے جھنجھوڑ ڈالے۔ اس سے پوچھے کہ کیا اسی محبت پر اسے ناز تھا۔ اسی کی خاطر وہ راتوں کو سارے زمانے سے چھپ کر شاہ صاحب سے ملنے جاتی تھی۔

"اوہ خدا! زرینہ کو علم ہوگا تو اس پر کیا گزرے گی؟ اس پر تو قیامت بیت جائے گی۔" رضیہ نے سوچا۔

☆======☆======☆

"بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب تک کسی نہ کسی کو آجانا چاہیے تھا۔" حیدرعلی نے گھڑی دیکھی۔

"آپ کو بہت جلدی ہے جانے کی؟" زرینہ نے دبے دبے انداز میں شکوہ کیا۔

"تمہارے پاس آکر واپس جانے کو کس کا دل چاہتا ہے۔ میں زیبی آپی کے لیے پریشان ہوں۔"

"آپ دوسروں کے لیے ہی پریشان ہوتے ہیں کبھی میرے لیے بھی پریشان ہوئے؟"

"زیبی آپی دوسروں میں سے تو نہیں ہیں۔" اس کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔ "اور جہاں تک تمہاری بات ہے گوری تو تم مجھ سے الگ کب ہو۔ تم تو ہر جگہ میرے ساتھ رہتی ہو۔ میرے دل میں جو رہتی ہو۔"

"یہ بتائیں دل میں تو صرف میں ہی ہوں ناں یا کچھ اور آپ کے اپنے بھی ہیں آپ کے دل میں۔"

"یہاں صرف تمہارا بسیرا ہے۔"

وہ مسکرادی۔ وہی دلکش مسکراہٹ جسے حیدر علی وارفتگی سے تکتے جاتا تھا۔

''میں یقین کرلوں کہ یہاں صرف میرا بسیرا رہے گا؟''

''امید تو یہی ہے۔''

''یقین نہیں ہے۔''

''یقین کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔''

زرینہ اسے تکتے گئی پھر مسکرادی۔ ''میرا دل خوش کرنے کو ہی اثبات میں جواب دے دیتے۔''

''اس بات سے تمہارا دل خوش ہو جاتا؟''

''پہلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتی تھی پر اب صرف اور صرف آپ کا ساتھ ہی خوشی دیتا ہے اور آپ کی محبت بھری باتیں توانائی دیتی ہیں۔''

''اگر کبھی یہ ساتھ چھن جائے گوری؟''

''خدا نہ کرے۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''واقعی خدا نہ کرے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو؟''

''میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ کبھی نہیں سوچ سکتی۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جس میں آپ کا ساتھ نہ ہو۔ خدا کے لیے پھر ایسی بات کبھی نہ کہنا۔''

حیدر علی دیئے کی روشنی کا عکس اس کے چہرے پر دیکھتا رہا۔

''یہ کس خوف میں مبتلا کر دیا ہے آپ نے مجھے۔'' چند ثانیے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''کہیں ایسا تو نہیں۔'' وہ رک گئی۔ اس کے لہجے میں خدشے تھے۔

''میں اتنی آسانی سے نہیں ہاروں گا گوری۔'' حیدر علی نے کہا۔ ''تم اپنے سب خدشے سب غم میرے حوالے کر دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔''

زرینہ کھل اٹھی۔

''میرا تو خوف کے مارے دم نکلنے کو تھا۔'' وہ ہنسی۔ ''پر اب میں مطمئن ہوں۔''

حیدر علی نے ایک بار پھر کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

''میری دعائیں اثر کر رہی ہیں۔'' زرینہ بولی۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے دعا کی ہے کہ دیر تک کوئی نہ آئے اور آپ دیر تک میرے ساتھ رہیں۔''

''اچھا تو یہ تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔ اب پلیز یہ دعا بھی کر دو کہ کوئی جلد از جلد آ جائے کیونکہ بابا جان اور بھائی شدت سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

زرینہ زور سے ہنس پڑی۔

''تمہیں دیکھ کر دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جب بھی مجھے بیٹی دے، بالکل تمہاری طرح کی دے۔''

''جی؟'' اس نے پلکیں جھپکا کر حیدر علی کی طرف دیکھا اور پھر جھینپ کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

''اتنا شرماتی کیوں ہو۔ بھئی تمہاری بیٹی کو تمہاری طرح کا ہی ہونا چاہیے ناں۔'' اس نے زرینہ کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔ ''اور معلوم ہے میں اس کا نام کیا رکھوں گا۔''

''کیا؟'' زرینہ نے شرمیلے لہجے میں پوچھا۔

''ریشماں۔'' وہ بولا۔ ''وہ ہوگی بھی تو بالکل ریشم جیسی۔''

''آپ کو بیٹے اچھے نہیں لگتے؟''

''لگتے ہیں لیکن بیٹیاں زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔''

''حیرت ہے۔''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''ہے ناں۔ سب کو بیٹے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

''تم اپنی بات کرو۔ تمہیں بیٹے اچھے لگتے ہیں یا بیٹیاں؟''

''مجھے؟'' وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ''مجھے بیٹے اچھے لگتے ہیں، وہ باپ کا بازو بنتے ہیں۔''

''اور تم اپنے بیٹے کا کیا نام رکھوگی؟''

''آپ رکھنا۔'' وہ جھینپ گئی۔

''میں نے بیٹی کا نام رکھ دیا ہے۔ بیٹے کا تمہیں رکھنا ہوگا۔''

''سوچنے دیں۔'' چند لمحے بعد زرینہ نے سر اٹھایا...... ''عبداللہ...... کیسا نام ہے؟''

''بہت خوبصورت۔ تو پھر طے ہے۔ بیٹی کا نام ریشماں اور بیٹے کا نام عبداللہ۔''

حیدر علی کی بات سن کر زرینہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی کو بریک تب لگے جب دور سے کسی گاڑی کی مدھم سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''کوئی موٹر آ رہی ہے شاید آپ کو لینے۔''

''ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔''

''وہاں مسجد سے چلے جائیں۔ کسی نے دیکھا تو یہی سمجھے گا کہ آپ مسجد سے نکلے ہیں۔''

''خدا حافظ۔'' کہہ کر وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

زیب النساء کی بات سن کر اچھو گنگ ہی تو رہ گیا تھا۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس

سے ایسی بات کہہ سکتی ہے۔ اسے تو یقین تھا کہ گھر جا کر وہ رو رو کے ساری بات پیر صاحب اور اپنے بھائیوں کو بتائے گی اور اگلا لمحہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہوگا۔

لیکن اس نے تو ناممکن بات کہہ دی تھی۔

''جو تم کہنا چاہتے تھے اور تم نے نہیں کہا وہ سب مجھے معلوم ہے۔ تم بول نہیں سکتے مگر میں بول سکتی ہوں۔ یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سب معلوم ہے۔ کوئی اپنے دل کی دھڑکنوں سے کب تک بے خبر رہ سکتا ہے۔''

اور وہ اب تک بے خبر تھا۔ یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ جو کچھ اس کے دل پر بیت رہی ہے وہی کچھ زیب النساء کے دل پر بھی گزر رہی ہے۔

مگر زیب النساء تو شجرِ ممنوعہ تھی۔ ہاتھ بڑھا کر چھونا تو درکنار اس کی طرف تو نگاہ اٹھانا بھی ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اور وہی زیب النساء اس سے کہہ رہی تھی کہ کوئی اپنے دل کی دھڑکنوں سے کب تک بے خبر رہ سکتا ہے۔

رات اپنے بستر پر چت لیٹ کر دیئے کی مدھم لو میں وہ زیب النساء کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹکنے کے لیے بار بار وہ نیم تاریک چھت کی کڑیاں گننے لگتا، لیکن زیب النساء اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی ستاروں کی طرح چمکتی آنکھیں، اس کا روشن چہرہ، بالوں کی بل کھاتی چوٹی کچھ بھی تو اس کے ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔

''یا خدا! یہ کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے مجھے۔'' اس نے سوچا۔ ''مجھے کیا خبر تھی کہ صرف ایک لمحہ میری زندگی کا رخ بدل کر رکھ دے گا۔ پتا نہیں تقدیر انسان کو اس راہ پر چلانے کی کوشش کیوں کرتی ہے، جس پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں اور اتنی دھول اٹھتی ہے کہ ایک دوسرے کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔

ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں پھر بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کو نہیں سکتے۔ مذہب، اخلاق اور سماج کبھی یہ بات برداشت نہیں کریں گے۔ مجھے اپنی پروا نہیں میں تو آگ میں بھی کود سکتا ہوں، لیکن ایسا کرتے ہوئے چھوٹی بی بی کی عزت داغدار ہو جائے یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

☆======☆======☆

حیدر علی شاہ جا چکا تھا اور اماں وغیرہ کے آنے سے پہلے زرینہ کو بہت سے کام نمٹانے تھے۔ کمرے کے فرش پر کتنے ادھ جلے سگریٹ بکھرے ہوئے تھے۔ اتنے سارے دیئے اور لالٹینیں پڑی تھیں۔ حیدر علی کے سگریٹوں سے اٹھنے والی مہک ابھی تک فضا میں موجود تھی۔ اسے سب آثار مٹانے تھے، ورنہ اماں بغیر کوئی سوال پوچھے سب کچھ سمجھ جاتیں۔

اس نے جلدی سے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا بنائی، طاقچے میں پڑی اگربتیاں سلگا کر

کمرے میں رکھ دیں اور جھاڑو اٹھا لائی۔

''جھاڑو بعد میں لگاؤں گی، پہلے سگریٹ کے ٹکڑے چن کر باہر پھینک دوں۔'' بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

فرش پر سگریٹ کے ٹکڑوں کے ساتھ نیلے رنگ کا ایک بٹن بھی پڑا ہوا تھا، جس میں نیلا دھاگا پھنسا ہوا تھا۔

''یہ تو شاہ جی کی قمیص کا بٹن ہے۔'' اس نے ہتھیلی پر رکھے بٹن کا بغور جائزہ لیا اور مسکرا دی۔ ''یعنی میرے خزانے میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔''

ایک ادھ جلا سگریٹ اور بٹن اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر اس نے بقیہ ٹکڑے کھڑکی سے پھینک دیئے اور جلدی جلدی کمرے کی صفائی کرنے لگی پھر دیئے اور لالٹین پرانی ترتیب سے واپس رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''شاہ جی نے اب تک مجھے اتنا کچھ دیا ہے، لیکن میں نے آج تک انہیں کوئی تحفہ نہیں دیا۔'' چارپائی پر لیٹ کر وہ سوچنے لگی۔ ''میں انہیں کیا تحفہ دوں؟''

وہ سوچتی رہی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔

''ایک سے ایک اعلیٰ چیز تو پہلے ہی موجود ہے ان کے پاس، میں انہیں کیا دے سکتی ہوں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ دینا تو چاہیے، کیا دوں؟''

سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ کتنی دیر بعد جھنجھوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی۔ سامنے رضیہ کھڑی تھی۔

''تم لوگ آ گئے؟'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

''نیند اتنی گہری ہو تو واقعی کسی چیز کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔''

''حالانکہ میں اتنی گہری نیند نہیں سوتی۔ پتا نہیں آج کیا ہوا۔'' پھر جیسے کچھ یاد آنے پر قدرے جوش سے بولی۔ ''ہائے رضیہ میں نے تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' پھر اس کے لہجے میں قدرے راز داری اتر آئی۔ ''اماں، ابا کہاں ہیں۔''

''مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

''پہلے میری بات سنو، آج اتنا مزہ آیا کہ کیا بتاؤں۔''

رضیہ چند لمحے تک اس کے خوشی اور جوش سے تمتماتے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹے شاہ صاحب کی منگنی کی خبر اسے کیسے سنائے۔

''کیا ہوا، تم کیوں اتنے مشکوک انداز میں مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں گھر خالی چھوڑ کر کہیں نہیں گئی تھی۔ شاہ جی خود یہاں آئے تھے۔''

''اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر تمہیں سبز باغ دکھائے ہوں گے اور تم بھی ان کے جال میں

پھنس گئی ہوگی۔‘‘

’’رضیہ! شاہ جی کے متعلق میں ایسی کوئی بات برداشت نہیں کرسکتی۔‘‘ زرینہ کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

’’یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے‘ شاید تمہیں اس سے بڑی اور کہیں زیادہ تکلیف دہ باتیں برداشت کرنا پڑیں۔‘‘

’’تم نے میری ساری خوشی پر پانی پھیر دیا۔‘‘ اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ ’’تم ہمیشہ یونہی کرتی ہو۔‘‘

’’جاننا چاہتی ہو‘ میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟‘‘

’’کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے جاننے کی۔‘‘ وہ تیزی سے بولی۔ ’’اور تم کچھ بھی کہہ لو میں جس راستے پر چل رہی ہوں اس سے واپس نہیں پلٹوں گی۔‘‘

’’میں جانتی ہوں کہ تم اسی قدر احمق ہو۔‘‘ رضیہ کو بھی غصہ آ گیا۔ ’’اور یہ بتاؤ کہ چھوٹے شاہ صاحب یہاں کیوں آئے تھے‘ کیا ضرورت تھی انہیں یہاں آنے کی؟‘‘

’’اتنے غصے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔‘‘ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ ’’یہ سوال آرام سے بھی پوچھا جاسکتا ہے۔‘‘

’’پہلے آرام سے پوچھا جاسکتا تھا‘ اب نہیں۔‘‘

’’تم تو کبھی آرام سے نہیں پوچھتیں۔‘‘ زرینہ نے شکایتی لہجے میں کہا‘ لیکن اگلے ہی لمحے ساری شکایت ختم کر کے وہ بستر پر آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ’’اصل میں شاہ جی کی موٹر یہاں خراب ہوگئی تھی۔ افوہ! اتنی مشکوک کیوں ہو رہی ہو۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی موٹر یہاں خراب ہوئی۔ زیب النساء بھی تمہاری طرح ہی شکوک وشبہات میں گرفتار ہوئی تھی۔ ویسے آج سے مجھے زیب النساء بہت بری لگنے لگی ہے۔‘‘

رضیہ خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

’’مجھے الجھن ہونے لگی ہے تمہیں ایسے بیٹھے دیکھ کر۔‘‘

’’یہ احساس دوطرفہ ہے‘ مجھے بھی تمہاری حرکتوں سے ایسے ہی الجھن ہوتی ہے۔‘‘

’’تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔‘‘ زرینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

’’نہیں میں نے تو آتے ہی کہا تھا کہ مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔‘‘ رضیہ بولی۔ ’’لیکن پہلے تم اپنی بات مکمل کرلو تاکہ یہ طلسم ایک ہی مرتبہ ٹوٹے۔‘‘

زرینہ چند لمحے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم بے نیازی اس پر غالب آ گئی۔

’’یہ طلسم تو میرے مرنے پر ہی ٹوٹے گا۔‘‘

رضیہ کا دل بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ زرینہ کو یہ سب کچھ بتا دینا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

’’رضیہ! تم ہی تو ہو جس سے میں سب کچھ کہہ دیتی ہوں۔‘‘ وہ ہولے سے بولی۔ ’’تم بھی میری بات نہیں سنوگی تو کس سے بات کروں گی میں۔ شاہ جی سے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اور پھر رضیہ میں کسی ایک طرفہ عشق میں تو بتلا نہیں ہوں‘ وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ میرا ہاتھ تھام لیں۔‘‘

’’تو تھامتے کیوں نہیں ہیں؟‘‘ رضیہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔ ’’اس لیے کہ ان کی......‘‘

اسے اچانک احساس ہوا کہ فوری طور پر زرینہ کو فوزیہ کے متعلق بتانا ٹھیک نہیں ہے نہ جانے اس کا ردِعمل کتنا شدید ہو اور پھر اس وقت تو گھر میں ابا اور اماں بھی موجود تھے۔ زرینہ چلا پڑتی یا صدمے کے مارے اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ نکل جاتا تو ساری بات ہی بگڑ جاتی۔

اور دوسری جانب زرینہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

’’تم نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟‘‘ اس کے ہونٹ ہلے۔

’’کچھ نہیں‘ پریشانی میں خدا جانے میں کیا کچھ بک دیتی ہوں۔ میری باتوں کی پروا مت کیا کرو۔‘‘ رضیہ نے جلدی سے بات بنائی۔ ’’یہ بتاؤ آج چھوٹے شاہ صاحب سے کیا بات چیت ہوئی؟‘‘

’’تم اپنی بات کرو‘ تم کیا کہتے کہتے رک گئی تھیں؟‘‘

’’کہا ناں کہ یونہی فضول سی بات کرنے لگی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔‘‘

’’تو وہ بات بتا دو جس کا تم نے آتے ہی ذکر کیا تھا۔‘‘ زرینہ بھی اَڑی ہوئی تھی۔

’’میرا تو دماغ ہی چاٹ لیا ہے تم نے۔‘‘ رضیہ چڑ گئی۔

اسے چڑتے دیکھ کر زرینہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے تکیے کے نیچے پڑا بٹن اور ادھ جلا سگریٹ اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

’’دیکھو رضیہ! بھلا یہ کیا ہے؟‘‘ اس کے لہجے میں خوشی اور جوش لوٹ آئے تھے۔

رضیہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

’’یہ چیزیں دی ہیں شاہ صاحب نے؟‘‘ اس نے زرینہ کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر دھرے سگریٹ کے ٹکڑے اور نیلے بٹن کو دیکھا۔

’’یہ انہوں نے دیئے کب ہیں‘ وہ ایسی چیزیں نہیں دیتے۔ جب ان کے جانے کے بعد میں کمرے کی صفائی کرنے لگی ناں تو یہ بٹن مجھے ملا۔ سگریٹ کے ٹکڑے تو اور بھی تھے‘ لیکن وہ میں نے پھینک دیئے تھے۔ اتنے زیادہ ٹکڑے نہیں رکھ سکتی تھی ناں۔ بس یہ ایک رکھ لیا۔ آج پہلی

مرتبہ وہ ہمارے گھر میں آئے تھے۔ کوئی نشانی تو ہونی چاہیے تھی ناں آج کے یادگار دن کی۔''

''ہوں۔'' رضیہ نے غائب دماغی سے کہا۔

''پتا ہے کیا ہوا آج؟'' اور پھر رضیہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے تمام روداد سنانا شروع کر دی۔

☆======☆======☆

فجر کی نماز پڑھ چکنے کے بعد اچھو مولوی صاحب کے پاس چلا آیا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

اچھو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نمازی ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے اور سپارہ پڑھنے والے بچوں کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ اس نے سب کے چلے جانے کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ سب کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے انداز نے مولوی صاحب کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اکیلے میں کہنا چاہتا ہے' اس لیے وہ بھی خاموشی سے سب کے باہر جانے کا انتظار کرتے رہے۔

اچھو کے اوپر جو کچھ گزر چکا تھا' اس سے وہ بھی واقف تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ صدمے کے مارے اچھو بات چیت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔

''ہاں بیٹا' اب کہو کیا بات ہے؟ کوشش کرو تو تم پہلے کی طرح سب کچھ بول سکتے ہو۔'' سب کے چلے جانے کے بعد انہوں نے بے حد شفقت سے کہا۔ کچھ تو یوں بھی وہ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے تھے اور کچھ انہیں اچھو کی محرومی کا احساس بھی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ محبت کا برتاؤ اس کی زبان پر پڑے قفل کھول دیتا۔

کچھ دیر تک اچھو سر جھکائے بیٹھے رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔

''میں سمجھتا تھا کہ میری زبان پر پڑے محرومی کے قفل کو صرف اور صرف شدید نفرت اور انتقام کی چابی ہی کھول سکتی ہے' لیکن اب احساس ہوا کہ محبت میں نفرت سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔'' اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ مولوی صاحب بمشکل اس کی آواز سن سکے۔

''الحمدللہ۔'' انہوں نے ہاتھ بلند کیے۔ ''تمہاری آواز دوبارہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔''

''اور مجھے اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ خوشی کی بات ہے یا غم کی۔''

''اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے اور شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو مثبت طریقے سے استعمال کیا جائے۔''

''مولوی صاحب! میں کچھ پوچھنے آیا ہوں۔''

''پوچھو بیٹا!''

''جو کچھ رجب علی شاہ نے میرے ساتھ کیا تھا وہ غلط تھا یا درست؟'' اس نے مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اس کا سوال سن کر مولوی صاحب ایک دم دفاعی پوزیشن پر آ گئے۔ ''انسان کو درگزر سے کام لینا چاہیے۔''

''میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ رجب علی شاہ کا فعل درست تھا یا غلط؟'' وہ ایک لفظ میں جواب لینے پر مُصر تھا۔

''کسی چیز پر یک دم مہر تصدیق ثبت کر دینا یا کسی بات کو ایک لمحے میں غلط قرار دے دینا درست نہیں ہوتا۔'' مولوی صاحب تامل سے بولے۔ ''اللہ تعالیٰ نے بھی اس شخص کو افضل قرار دیا جو ایثار سے کام لیتا ہے اچھا تو یہ ہوتا کہ تم پہلے ہی گھوڑا واپس کر دیتے۔ مجھے علم ہوا ہے کہ بڑے شاہ صاحب نے بہت مرتبہ تمہیں پیغام بھجوایا تھا لیکن تم نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ غور سے دیکھو تو تمہیں اس ساری بات میں اپنی ہی غلطی نظر آئے گی۔ وہ گھوڑا انہیں انہی کے سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ انہوں نے شریف لوگوں کی طرح پہلے تقاضا کیا' حالانکہ وہ زور آور اور طاقتور تھے۔ تم نے انکار کیا۔ انہوں نے بار بار تقاضا کیا اور تم نے بار بار انکار کیا۔ تب انہوں نے یہ قدم اٹھایا جو سب کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا۔

غور سے دیکھا جائے تو اس عمل پر انہیں تم نے مجبور کیا تھا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں نے بڑے شاہ صاحب کے طرزِ عمل کو کلی طور پر درست قرار دیا ہے۔ نہیں...... انہیں بھی تحمل اور برداشت کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔''

اچھو مولوی صاحب کی طرف دیکھے گیا۔

''تم نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنا حق چھین لیں۔ اسلام کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ تحمل و برداشت سے کام لیتے ہیں' لیکن اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے والے کو بخشتے بھی نہیں ہیں۔''

مولوی صاحب کی باتیں سن کر اچھو کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ چند لمحے وہ سر جھکائے بیٹھا رہا پھر مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''یہ بتائیں مولوی صاحب! کہ اسلام مساوات کے بارے میں کیا کہتا ہے؟''

مولوی صاحب نے اپنی دانست میں ایک مشکل موضوع کو بخیر و خوبی نمٹا دیا تھا' اس لیے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

''ہمارا مذہب دینِ فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم تو ہے ہی' لیکن اس کے ساتھ بہترین منصف بھی ہے۔ دنیا کا نظام چلانے کے لیے اس نے انسانوں کے مختلف طبقے بنائے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ انسانوں کے درمیان فرق نہ ہو۔ معاشی لحاظ سے سب برابر ہو جائیں تو دنیا کا

نظام کیسے چلے؟

لیکن یہ جو مختلف طبقے بنائے گئے ہیں یہ صرف دنیاوی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں اور دنیا کی زندگی عارضی اور چندروزہ ہے۔ یہ صرف ایک امتحان گاہ ہے۔ اصل میں یہ ہمیشہ رہنے والی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس زندگی میں بھی طبقات ہیں' لیکن رنگ ونسل' خاندانی جاہ وحشم...... اور معاشی نکتہ نگاہ سے جنم لینے والے نہیں بلکہ یہ طبقے انسان کے اچھے برے اعمال سے وجود میں آئیں گے۔ برتر درحقیقت وہ ہوگا جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہوگا۔

قیامت کے دن کسی سے یہ پُرسش نہیں ہوگی کہ اس کا خاندان کون سا ہے یا یہ کہ جنت میں جانے کے لیے وہ کتنا مال و دولت صرف کر سکتا ہے۔ قیامت کے دن جنت کا حق دار صرف وہی ہوگا جس کے اعمال اچھے ہوں گے' جس نے اپنے جیسے انسانوں کو تکلیف نہیں پہنچائی ہوگی' جس نے بڑے بڑے مرتبے پر رہتے ہوئے بھی صلہ رحمی کا ثبوت دیا ہوگا اور جس نے حقوق اللہ پورے کیے ہوں گے۔

مساوات کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیاوی لحاظ سے چاہے کوئی بھی برتر ہو' فیصلے کے وقت سب انسان برابر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی شخص بڑا ہوگا جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھتا ہے۔''

''ہوں۔'' اچھو نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یعنی اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ کون حویلی والا ہے اور کون جھونپڑی والا۔''

''بالکل۔'' مولوی صاحب نے تائید میں سر ہلایا۔

''اور مولوی صاحب یہ بتائیں کہ لڑکیوں کی شادی کس عمر تک کر دینی چاہیے۔''

''جیسے ہی کوئی اچھا اور مناسب رشتہ ملے اس نیک کام کو سرانجام دے دینا چاہیے۔''

''اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے والدین اس فرض سے غافل ہوں۔''

''ایسے میں ان کے قریب رہنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں' لیکن یاد رہے کہ صرف اس صورت میں جب یہ مکمل یقین ہو کہ والدین اس فرض کی طرف سے غفلت برت رہے ہوں۔ دوسری صورت میں اس طرح ان کی دل آزاری ہوگی۔''

''ایک اور سوال ذہن میں کھٹک رہا ہے۔''

''بلا جھجک پوچھ لو بیٹا!''

''سیّد لڑکی کی شادی غیر سیّدوں میں ہو سکتی ہے؟''

مولوی صاحب ایک مرتبہ پھر متذبذب ہو گئے۔ ''میں اتنا عالم فاضل نہیں ہوں کہ کوئی مستند رائے دے سکوں۔ اتنا ضرور ہے کہ رشتہ اپنی ذات برادری میں طے ہو تو انسان بہت سی الجھنوں سے بچ جاتا ہے۔''

''مولوی صاحب! میں ایک لڑکی سے ملا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھا۔ بہرحال وہ مجھے اچھی لگی' اب میں کیا کروں؟''

''میں تمہیں جانتا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ تم کبھی کسی لڑکی پر بری نظر نہیں ڈالو گے' اگر تمہیں اچھی لگی ہے تو اپنے باپ سے کہہ دو' پیر صاحب اس کی بات نہیں ٹالیں گے اور تمہارا رشتہ وہاں طے کر دیا جائے گا۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے مولوی صاحب کہ وہ سیّد لڑکی ہے۔''

''ہوں۔'' مولوی صاحب سوچنے لگے۔

''کس سوچ میں پڑ گئے مولوی صاحب! کیا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان مساوات قائم نہیں کی؟ کیا برتری کا معیار خاندانی بڑائی ہے یا تقویٰ؟ مانا کہ میں بہت اعلیٰ درجے کا مسلمان نہیں ہوں' لیکن ہوں تو کلمہ گو۔ پھر میں ایک کلمہ گو لڑکی سے کیوں نہیں شادی کر سکتا؟ کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں کسی بڑے گھرانے میں پیدا نہیں ہوا؟ خود آپ نے ہی تو کہا تھا کہ طبقات صرف دنیاوی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہیں' پھر جب اس بات پر اللہ تعالیٰ میری پکڑ نہیں کرتا کہ میرا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے نہیں ہے تو دنیا والوں کو کیا حق ہے کہ اس بات پر وہ میری تذلیل کریں' مجھے گھٹیا جانیں؟''

''غصہ نہیں کرتے بیٹے! غصہ حرام ہے۔'' مولوی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمہارے باپ کو بہت خواہش ہے تمہاری شادی کی مجھے بھی تم بالکل بیٹوں کی طرح ہی عزیز ہو۔ تمہاری خوشیاں مجھے بھی پیاری ہیں۔ میں خود پیر صاحب سے بات کروں گا۔ مجھے امید ہے وہ تمہیں اجازت دے دیں گے' لڑکی کے والد کا کیا نام ہے؟''

''سیّد جلال الدین شاہ۔'' اچھو نے اطمینان سے کہا۔

''جلال الدین شاہ!'' مولوی صاحب نے ذہن پر زور دیا۔ ''کیا آس پاس کے کسی گاؤں کے ہیں؟''

''یہ اور آس پاس کے بیسیوں گاؤں انہی کے ہیں۔''

''انہی کے ہیں۔'' مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے کچھ بھی نہ سمجھے پھر جیسے اچانک ہی ان پر انکشاف ہوا کہ اچھو کا اشارہ کس طرف تھا۔

''لاحول ولاقوۃ' کیا بکواس کر رہے ہو' تمہیں شرم نہیں آئی یہ بات کہتے ہوئے۔ اس سے پہلے ڈوب کیوں نہ مرے تم...... استغفار...... استغفار...... پیر صاحب کی صاحبزادی کے متعلق ایسی نازیبا بات۔ میرے سامنے تو تم نے یہ کہہ دیا لیکن کسی اور کے سامنے مت کہنا۔ ماں باپ روتے رہ جائیں گے' لیکن انہیں تمہاری قبر کا نشان بھی نہیں ملے گا۔''

''بس بس مولوی صاحب بہت ہو گیا۔ زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اچھو بھی بگڑ

گیا۔ ''کبھی آپ کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آپ تحمل اور برداشت کا پرچار کر رہے تھے' اب آپ کا وہ تحمل اور برداشت کہاں گیا؟ آپ نے کہا کہ کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہیے پھر پیر صاحب کہلانے والے جلال الدین شاہ کو یہ کیوں نہیں سمجھاتے آپ کہ وہ اپنی حویلی میں بند بیٹیوں کو ان کا حق دے؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کر رہا' پھر آپ نے اسے اس غفلت پر کیوں نہیں ٹوکا؟

میں نے حویلی کی سیّد زادی سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو کیا برا کیا؟ جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتا کہ کون کس رنگ اور نسل کا ہے' کس حویلی یا جھونپڑی کا ہے تو آپ کے سب فیصلے حویلی کے حق میں کیوں ہیں؟ جب تک آپ کو میری بتائی ہوئی لڑکی کے باپ کے نام کا علم نہیں تھا' تب تک آپ اس بات پر راضی تھے کہ آپ پیر صاحب سے بات کریں گے پھر اب کیا ہوا کہ آپ میری قبر تک جا پہنچے۔

بتائیں آپ کا مذہب کیا کہتا ہے۔ جب کوئی لڑکا کسی لڑکی کے گھر رشتہ لے کر جائے اور لڑکی والوں کو وہ رشتہ نامنظور ہو تو کیا وہ لڑکے کو قتل کر دیں؟ اس کی قبر کا نام و نشان بھی مٹا دیں؟ بولیں کیا کہتا ہے آپ کا مذہب اس بارے میں؟''

''اچھو! اس وقت تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو تمہاری باتوں سے بغاوت کی بُو آ رہی ہے۔''

''ہاں میں باغی ہوں اور کیوں نہ بغاوت کروں؟ رجب علی شاہ نے مجھ سے میری اولاد جیسا گھوڑا چھین لیا' آپ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھا۔ کیوں؟ کیا تحفہ یا ہدیہ واپس لیا جاتا ہے؟ پیروں کی حویلی میں یہ روایت کب سے چلی آ رہی ہے کہ چیز دے کر اس کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے' پھر اس نے مجھے کوڑوں سے پیٹا۔ آپ کے نزدیک یہ بھی درست ہے کیونکہ میں نے حکم عدولی کی تھی۔ نہیں مولوی صاحب' وہ مجھے کسی صورت یہ حکم نہیں دے سکتا تھا اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ مجھ سے میری چیز چھین لے اور مجھے پیٹ بھی ڈالے۔

اس نے مجھے اس لیے پیٹا کیونکہ وہ پیروں کی اولاد ہے' گدی نشین ہے اور میں ان کی حویلی میں کام کرنے والے ایک معمولی سے منشی کا بیٹا اور یہی فرق دیکھتے ہوئے آپ نے اس کی حرکتوں کو درست قرار دیا۔

جب میں نے اتنا کہا کہ میں کسی سید لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو قدرے تامل کے بعد آپ راضی ہو گئے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ میں اپنے جیسے کسی مفلوک الحال گھرانے کی کسی سید زادی کے متعلق بات کر رہا ہوں' لیکن جیسے ہی میں نے حویلی والوں کا نام لیا آپ نے مجھے موت کی دہلیز تک پہنچا دیا۔

واہ مولوی صاحب واہ! ان گنبدوں کے نیچے بیٹھ کر بھی آپ کو سود و زیاں کا خیال ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تو بعد میں حساب دینا ہوگا' پہلے حویلی والے حساب چکتا کرنے آئیں گے۔''

''کیا بکے جا رہا ہے؟'' مولوی صاحب بپھر گئے۔

''کچھ خدا کا خوف کریں مولوی صاحب' یہ چھت بے شک پیروں کے پیسے سے بنی ہے لیکن گھر خدا تعالیٰ کا ہے۔ صرف ایک چھت کے نفع کی خاطر جو سودا آپ کر رہے ہیں وہ بہت برا ہے۔ افسوس' اس چھت کو آپ نے خدا کے گھر کی چھت نہیں سمجھا' بلکہ ان پر لگے شہتیروں کو دیکھ کر آپ کو ان روپوں کا خیال آیا ہے جو حویلی والوں نے اسے بنانے پر خرچ کیے ہیں۔

مولوی صاحب حویلیاں کتنی بھی مضبوط کیوں نہ ہوں ان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں' ان کی دیواریں بھی گر جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا گھر بظاہر کتنا ہی کمزور نظر آئے درحقیقت بہت مضبوط ہوا کرتا ہے۔ آپ نے ان در و دیوار کو اللہ تعالیٰ کا گھر سمجھنے کے بجائے حویلی کی جاگیر سمجھا' کوئی عجب نہیں کہ اس کی جس چھت کی خاطر آپ دوغلے پن کا شکار ہو رہے ہیں کل وہ ڈھے جائے۔''

مولوی صاحب کے لیے یہ انتہا تھی۔ انہوں نے کوئی بات کیے بغیر ہاتھ فضا میں بلند کیا اس سے قبل کہ وہ اچھو تک پہنچتا' اس نے درمیان میں ہی مولوی صاحب کی کلائی پکڑ لی۔

''میں نے آپ کی بہت عزت کی ہے مولوی صاحب! آپ کو ہمیشہ باپ کا درجہ دیا ہے اور اسی لیے اب تک آپ کو 'آپ' کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس عزت کے مستحق نہیں ہیں۔''

اس نے ایک جھٹکے سے ان کی کلائی چھوڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مسجد سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

مولوی نعمت اللہ سے کھانا پینا دوبھر ہو گیا تھا۔ ان کا ایک پرانا شاگرد عین مسجد کے بیچ میں ان کی تذلیل کر کے چلا گیا تھا۔ مانا کہ یہ سب دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن احساسِ توہین بہت شدید تھا۔ رضیہ اور زرینہ کھانے کا پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھیں۔ اماں نے کتنی منتیں کر ڈالیں' لیکن وہ گم صم ہی رہے۔ اصرار بڑھا تو پگڑی سر پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

ان کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر منشی فضل دین سے ملنا چاہتے تھے۔

حویلی پہنچ کر انہوں نے منشی کو اپنے آنے کی اطلاع دی' لیکن منشی سے پہلے ان کی آمد کی خبر رجب علی شاہ کو مل گئی۔ وہ فوراً برآمدے میں چلا آیا۔

''السلام علیکم چھوٹے شاہ صاحب!'' مولوی صاحب نے قدرے جھک کر کہا۔

''یہ کیا کرتے ہیں مولوی صاحب! کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہیں۔'' انہیں جھکتے دیکھ کر رجب علی نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے آپ اس گاؤں میں دین کی روشنی پھیلا

رہے ہیں، آیئے اندر آیئے۔''

وہ مولوی صاحب کو گول کمرے میں لے آیا۔

''کہیے کیسے آنا ہوا؟''

''منشی سے کچھ ذاتی نوعیت کا کام تھا' اس لیے چلا آیا۔''

''آپ کا یہاں آنا میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے لیکن آپ نے حکم بھجوا دیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا آپ کے سامنے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کو بہت رتبے دے اور بہت نیک بنائے شاہ صاحب' آپ نے مجھے بہت عزت دی ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں' یہ عزت کا مقام آپ نے خود کمایا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ بتایئے گھر میں کسی چیز کی کمی تو نہیں؟''

''نہیں شاہ صاحب! اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے۔ پیر صاحب ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور زیادہ بلند مرتبہ دے۔''

''گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہو؟''

''اللہ کا بہت فضل ہے شاہ صاحب۔''

ان کی باتیں جاری تھیں کہ منشی چلا آیا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیدر علی نے اسے مخاطب کیا۔

''منشی! مولوی صاحب کے گھر گندم اور چاول کی دو بوریاں اور ایک اچھا سا تیل کا چولہا پہنچا دینا۔''

''شاہ صاحب آپ کی عنایت ہے پر یقین کیجیے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔''

''مجھے یقین ہے آپ کی بات کا' لیکن آپ خود چل کر ہماری حویلی میں آئیں اور ہم آپ کی خاطر داری نہ کریں' یہ ممکن نہیں ہے۔''

''شاہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' منشی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اب آپ منشی سے بات کیجیے' میں چلتا ہوں۔'' حیدر علی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے کمرے سے باہر نکلنے تک مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے رہے۔

''کہیے مولوی صاحب کیسے آنا ہوا؟''

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''مجھ سے ضروری بات؟'' وہ قدرے حیران ہوا۔ ''کریں۔''

''یہاں نہیں کہیں اور چلو۔''

''کہیں اور کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''مطلب یہ کہ حویلی سے کہیں باہر' اپنے گھر چلو یا پھر میرے ساتھ مسجد میں آ جاؤ۔''

''ایسا ہے۔'' منشی کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ تین دن تو بے حد مصروفیت کے ہیں' اس کے بعد جیسے ہی وقت ملا میں خود چلا آؤں گا۔''

''تب تک شاید بہت دیر ہو چکی ہو۔''

''اس سے پہلے تو ناممکن سمجھیں۔'' منشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شادی کے دن ہیں' سارا کام میرے سر پڑا ہوا ہے۔ ویسے تو بعد میں بھی مصروفیت ہے' لیکن خیر میں کسی نہ کسی ترکیب سے وقت نکال ہی لوں گا۔''

''تم میری بات کو سنجیدگی سے اس لیے نہیں لے رہے کیونکہ تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ تمہارے بیٹے کی جان کو زبردست خطرہ ہے۔''

''کک...... کیا؟'' منشی کا رنگ اُڑ گیا۔ ''مولوی صاحب! آپ اچھو کے متعلق کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں اور اگر تم نے اسے نہ روکا تو شاید تمہیں اس کی قبر کا نشان بھی نہ ملے۔ میں تمہارا اور اس کا خیر خواہ ہوں اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ جو کچھ بھی کرو جلدی کرو۔''

منشی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

''بس مولوی صاحب! ایک منٹ مہلت دیں' میں ابھی آیا۔'' منشی تہبند سنبھالتا ہوا تقریباً بھاگتے ہوئے حویلی کے اندرونی کمروں کی طرف بڑھ گیا۔

انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد ہی منشی تیزی سے چلتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

''آئیں' مسجد ہی چلتے ہیں۔''

وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے مسجد میں آ بیٹھے۔

سپارہ پڑھنے والے بچوں کو مولوی صاحب آج کے دن کے لیے چھٹی دے چکے تھے۔

''جلدی بتائیں مولوی صاحب! میرے اچھو کو کیا خطرہ ہے۔ میرا دم نکلنے کو ہے۔'' منشی نے ہانپتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''آج فجر کی نماز کے بعد اچھو میرے پاس آیا تھا۔ جب وہ بولنے لگا تو میں بہت خوش بھی ہوا تھا' لیکن منشی اس نے دوبارہ زبان مل جانے کے بعد جو باتیں کیں' ان کے کرنے سے بہتر تھا کہ اسے دوبارہ زبان ملتی ہی ناں۔''

''یہ لڑکا میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے مولوی صاحب' مجھے اندازہ ہے کہ اس نے پھر سے شاہ صاحب کی شان میں گستاخی کی ہوگی۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ اس بات کو اپنے تک رہنے دیں۔ میں کسی طرح اسے سمجھا دوں گا پر خدا کے واسطے یہ بات کسی سے نہ

کہنا۔" منشی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نہیں منشی! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اچھو نے کیا کہا ہے۔"

"کیا کہا ہے اس نے؟" منشی نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

"یہ پوچھو کیا نہیں کہا۔ پہلے مجھ سے اسلام کے متعلق سوال کر کے پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا' اگر تب مجھے اصل بات کا علم ہو جاتا تو میں کوئی مصلحت آمیز جھوٹ بول دیتا۔ شریعت میں اس کی اجازت ہے' ایسے سچ سے جو شر پھیلانے کا باعث بنے' مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہوتا ہے لیکن تب مجھے خبر نہیں ہو سکی۔" مولوی صاحب سانس لینے کو رک کے پھر بے حد دھیمی آواز میں بولے۔ "وہ پیر صاحب کی کسی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا؟" منشی اچھل پڑا۔ "جھوٹ نہ کہیں مولوی صاحب آپ کو میرے بیٹے پر ایسا الزام لگاتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔"

"آرام سے بولو منشی' تمہاری اونچی آواز کسی نے سن لی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا' تمہارا گھرانہ البتہ تباہ ہو جائے گا۔"

"میں کہہ دوں گا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"افسوس منشی! میں نے تمہارے بیٹے کو سمجھایا مگر اس نے نا سمجھی کا ثبوت دیا۔ تمہیں بھی مطلع کیا مگر بجائے اس کے کہ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرتے' تم بھی حماقت پر اتر آئے میرا جو فرض تھا میں نے پورا کر دیا۔ باقی تمہارے بیٹے کے مقدر میں ذلت و رسوائی کی موت لکھی ہوئی ہے تو اسے کون بچا سکتا ہے۔" مولوی صاحب اٹھنے لگے۔

"مولوی صاحب' مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔" منشی نے ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں واپس بٹھانے کی کوشش کی۔ "میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔ آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اچھو ایسی حرکت کر بیٹھے گا۔"

"یہ تو تمہیں سوچنا ہو گا کہ تم کیا کرو۔ تمہارے بیٹے نے میری بھی سخت توہین کی ہے۔ میں اسے سمجھاتا' لیکن میری بات وہ بالکل نہیں سنے گا۔ تب بھی میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن اس نے میری بات سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ سید لڑکی کی شادی کے مسئلے کے متعلق کون سے علماء کیا کہتے ہیں۔ کون حمایت کرتے ہیں اور کون مخالفت کرتے ہیں۔ حمایت کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں تو کیوں؟ لیکن تمہارے جاہل مطلق بیٹے کو میں کچھ بتا بھی دیتا تو اس کی عقل میں میری بات کہاں سماتی' اس کا کفو کون ہو سکتا ہے' اسے تو کفو کا مطلب بھی معلوم نہیں ہو گا چلا تھا دینی مسئلے پر میرے ساتھ بحث کرنے۔

اب اسے جو کچھ کہنا سمجھانا ہے منشی وہ تم ہی کہو سمجھاؤ۔ یوں بھی اپنی اولاد کے اعمال کے

ذمہ داران کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ میں یا کوئی اور نہیں کر سکتا۔"

"مولوی صاحب! میں برباد ہو جاؤں گا' تباہ ہو جاؤں گا' میرے حال پر رحم کریں۔ میرے اچھو کے لیے کچھ کریں۔" وہ بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگا۔

"مجھے تمہارے بڑھاپے اور تمہارے بیٹے کی منہ زور جوانی پر ترس آ رہا ہے منشی۔" بالآخر مولوی صاحب پسیج گئے۔ "مجھ سے تعویذ لے جاؤ لگتا ہے کوئی تمہارے بیٹے پر شیطانی عمل کر رہا ہے' جس کی وجہ سے وہ باغی ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تعویذ جلا دینا۔ یہ بدروحوں اور شیطان کو جلا کر بھسم کر دے گا یا تمہارے بیٹے کے پاس سے بھگا دے گا۔ ایک تعویذ پانی میں گھول کر پلا دینا۔ بیٹا تمہارا کہا ماننے لگے گا۔ جو تم کہو گے۔ اسی پر عمل کرے گا اور ایک تعویذ اس کے تکیے میں سی دینا۔ اس کے دل کو قرار آ جائے گا اور تمام برے خیالات دماغ سے نکل جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔"

"مولوی صاحب! آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ مجھ سے آپ کی شان میں گستاخی ہوئی۔ ہے اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔ مرتے دم تک آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔"

وہ یونہی گڑگڑاتا رہا اور مولوی صاحب تعویذ لکھتے رہے۔

☆======☆======☆

مولوی صاحب کو انہوں نے اس سے قبل کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا نہ جانے کس فکر میں گم بیٹھے تھے۔

''اماں پوچھیں تو ابا کو کیا پریشانی ہے۔'' زرینہ انہیں پریشان دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

''ذرا صبر کرو' مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ خود ہی بتا دیں گے۔ میں نے بار بار اصرار کیا تو مزید پریشان ہوں گے۔''

اماں کا کہنا درست تھا' تھوڑی دیر بعد انہوں نے آواز دے کر اماں کو کمرے میں بلا لیا۔

''کہیں ابا کو کوئی سن گن تو نہیں مل گئی۔'' رضیہ نے ہولے سے زرینہ سے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے میرے اور شاہ جی کے بارے میں؟'' زرینہ گھبرا گئی۔

''ظاہر ہے اور کس بارے میں؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''لیکن یہ بات کون باہر نکالے گا؟'' زرینہ بولی۔

''حماقت کا ثبوت مت دو' میں یا حمیدہ باہر کسی کو یہ بات نہیں بتائیں گے' لیکن زیب النساء کو تو کوئی فکر نہیں ہے ناں۔ وہ کسی بھی ذریعے سے یہ بات پھیلا سکتی ہے۔''

''لیکن کیسے؟''

''تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا؟ وہ کسی خادمہ سے سرسری سا ذکر کر دے یا پیسے دے کر اس کام کے لیے کہے تو جانتی ہو بات کہاں تک پھیلے گی اور میری مانو تو یہ دونوں بہنیں ہی قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔''

''مہر النساء بھی؟''

''ہاں' مہر النساء بھی۔''

''بات تو ٹھیک لگتی ہے لیکن ایسا ہو گیا تو کیا ہو گا؟''

''چھوٹے شاہ صاحب کو تو کچھ نہیں ہو گا البتہ تمہاری فاتحہ پڑھی جائے گی۔''

''رضیہ میری اچھی بہن' ذرا سننا تو ابا' اماں سے کیا کہہ رہے ہیں؟'' اپنی نے خوشامد کی۔

رضیہ کمرے کے دروازے کے قریب پیڑھی رکھ کر بظاہر پیاز کترنے لگی' لیکن اس کی تمام تر توجہ اندر ہونے والی گفتگو کی جانب مبذول تھی۔

جیسے جیسے وہ سنتی جا رہی تھی' ویسے ویسے اس کا خوف ختم ہوتا جا رہا تھا کہ ابا کو زرینہ کے متعلق کچھ خبر ہوئی ہے۔ البتہ اچھو کا معاملہ اس کے لیے حیرت انگیز ضرور تھا۔

جونہی مولوی صاحب نے بات ختم کی اور اماں نے تبصرہ شروع کیا' وہ وہاں سے کھسک آئی۔

''کیا رہا؟'' زرینہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔'' رضیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میرے ساتھ آ جاؤ۔ ہنڈیا بھی پکاتی جاؤں گی اور تمہیں بات بھی بتاتی جاؤں گی۔''

☆======☆======☆

اچھو بظاہر پُرسکون تھا' لیکن اس کے اندر کتنے ہی طوفان اٹھ رہے تھے۔ مولوی صاحب کی دوغلی پالیسی نے اس کے اندر آگ لگا دی تھی۔

''اب میں وہی کروں گا جو میں چاہوں گا۔'' اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ ''میں ان دیواروں کو نہیں مانتا جو سماج نے مختلف ناموں سے ہمارے درمیان اٹھا رکھی ہیں اور مجھے سماج کے ان ٹھیکیداروں کی پروا بھی نہیں ہے۔ مجھے پروا ہے تو صرف چھوٹی بی بی اور ان کی عزت کی۔''

ماں سے سونے کے لیے کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا' لیکن نیند تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ مولوی صاحب کی باتیں یاد آتی تھیں تو غصہ کسی طوفان کی مانند اس کی ذات کے اندر ہی اندر توڑ پھوڑ شروع کر دیتا تھا۔

وہ بستر پر لیٹا انہی واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ کوئی گھبراہٹ کے عالم میں گھر میں داخل ہوا ہے۔ یوں کسی کی آمد یقیناً کسی اچھی خبر کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی' اس لیے وہ چارپائی سے اٹھنے لگا' لیکن پھر منشی کی آواز سن کر رک گیا۔

''اچھوں کی ماں! اچھو کہاں ہے؟'' اس کی بدحواس سی آواز سنائی دی۔

''اندر کمرے میں سو رہا ہے' لیکن تم کیوں اتنے گھبرائے ہوئے ہو؟''

''اپنی قسمت میں اب سوائے گھبرانے اور پریشان ہونے کے رہ کیا گیا ہے۔'' چارپائی چرچرائی جس سے اچھو کو اندازہ ہوا کہ منشی چارپائی پر بیٹھ گیا ہے۔

''اب کیا ہو گیا؟''

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا' اس بڑھاپے میں یہ دن دیکھنا پڑیں گے' یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں

تھا۔"

"میں پوچھتی ہوں کہ ایسا کیا ہو گیا جو میرے بیٹے پر غصے ہو رہے ہو۔"

"تمہارے بیٹے پر غصے نہیں ہو رہا' اپنی تقدیر کو رو رہا ہوں۔"

"تو بیٹھے روتے رہو' میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

"بڑی آئی وقت کو آباد کرنے والی۔" منشی چلایا۔

"شی! اچھو سو رہا ہے۔ اتنا کام کر کے غریب تھک جاتا ہے۔"

"اب نہیں اٹھے گا تیرا اچھو! ایک دم قصہ پاک ہو جائے گا اس کا۔" منشی چڑچڑے انداز میں بولا۔

"تمہارے منہ میں خاک' شیطان کے کان بہرے...... جب بھی بولو گے الٹا ہی بولو گے۔"

"جب بڑے شاہ صاحب یہ سب کر گزریں گے' تب پوچھوں گا۔"

"کیا ہوا اب؟" ماں واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ "میرے بھولے بھالے بیٹے سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی ہے کہ سب اس کی جان کے دشمن بنے جا رہے ہیں۔ اے کچھ کہو تو سہی' بتاؤ تو کچھ کہ ہوا کیا ہے؟"

"اب آئی ناں عقل ٹھکانے۔" منشی بولا۔ "یہ پکڑ تین تعویذ یہ جلانا ہے' یہ اسے گھول کر پلانا ہے اور یہ والا اس کے تکیے میں سی دینا تا کہ اب جو خناس اس کے دماغ میں بھرا ہے وہ نکل جائے۔"

"یہ تو میں کر دوں گی' پر بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟"

"عورت ذات کی زبان کا کیا بھروسہ اور تیری زبان کا تو بالکل بھی نہیں ہے۔ ہمدردی سمیٹنے کے چکر میں پورے گاؤں میں بات پھیلا دے گی' اس لیے چپ چاپ وہ کام کرو جو میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے یقین دلایا ہے کہ ان تعویذوں کے اثر سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھ پر اعتبار نہیں تمہیں؟"

"تجھ پر تو اعتبار ہے نیک بخت' پر تیری زبان پر اعتبار نہیں ہے۔"

"یا اللہ ہمیں اس مشکل سے نکال۔"

"یہ تو شکر ہوا کہ مولوی صاحب نے ساری بات مجھے بتا دی' ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" منشی نے کہا۔ "اور ہاں اچھو کو خبر نہ ہونے پائے۔ ان تعویذوں کی تیرے لاڈلے کو پتا چل گیا تو سارا اثر جاتا رہے گا۔"

چارپائی پھر چرچرائی۔ منشی غالباً لیٹ چکا تھا۔

"ہوں تو یہ بات ہے' دل تو چاہتا ہے کہ تعویذ گھلا پانی مولوی کو ہی جا کر پلا دوں۔" اچھو کا مزاج بگڑنے لگا تھا۔ "دوغلے لوگ۔"

☆======☆======☆

"ساری بات واضح ہے۔" زرینہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھو نے کہا کہ وہ ایک لڑکی سے ملا تھا اور وہ اسے اچھی لگی۔ اس پر ابا جی نے اسے مشورہ دیا کہ اسے اس لڑکی سے شادی کر لینا چاہیے اور جواب میں اس نے پیر صاحب کی بیٹیوں کا حوالہ دے دیا۔"

"ہاں۔" رضیہ نے تائید میں سر ہلایا۔

"وہ یقیناً زیب النساء کی بات کر رہا ہوگا' وہی اس کے ساتھ گئی تھی' لیکن غور کرو ملنے کا مطلب کیا ہے۔ اچھو نے کہا تھا کہ وہ لڑکی سے ملا تھا۔"

"زیب النساء نے میرے سامنے وہاں کسی کو نہیں بتایا کہ وہ اچھو کے ساتھ آئی ہے۔ ہو سکتا ہے اس مختصر سے سفر کو اچھو ملنا کہہ رہا ہو۔"

"نہیں۔" زرینہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ملنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لڑکا تانگہ چلاتا جائے اور پیچھے بیٹھی لڑکی پردے میں گم صم بیٹھی رہے۔ بھلا یہ بھی ملنا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ اچھو نے کہا تھا کہ لڑکی اسے اچھی لگی۔ جب تک وہ اچھو سے بات نہ کرے یا اسے اپنا چہرہ نہ دکھائے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اچھو خواہ مخواہ ہی اسے پسند کر بیٹھے۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" رضیہ بولی۔ "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ صرف بڑے شاہ صاحب کی دشمنی میں ایسا کہہ رہا ہو۔ آج ابا جی سے اس نے جو باتیں کی ہیں' ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بڑے شاہ صاحب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔"

"اتنا احمق بھی نہیں ہے کہ وہ ایک بلاوجہ کی بات میں اپنی زندگی داؤ پر لگائے۔"

"وہ صرف اس لیے بھی یہ بات پھیلا سکتا ہے کہ اس سے پیر گھرانے کی عزت میں فرق آ جائے گا۔"

"رشتہ بھیجنے کی جو بات اس نے کی ہے اس سے پیر گھرانے کی نہیں خود اچھو کی عزت میں فرق آئے گا۔ نہیں رضیہ اگر اسے اپنی جان دے کر ہی انہیں بے عزت کروانا ہوتا تو وہ صرف باتوں پر اکتفا نہ کرتا۔ کل بہت اچھا موقع تھا' اس کے پاس حویلی کی عزت خاک میں ملانے کا۔" زرینہ نے کہا۔ "بات کچھ اور ہے۔"

"شاید۔"

"تم ایسا کرنا رضیہ کہ آج جب حویلی جاؤ تو ذرا سن گن لینا' شاید کچھ اور اندازہ ہو جائے اس بات کا۔"

"آج میں حویلی نہیں جا رہی۔"

''کیوں؟'' زرینہ نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا۔

''بس نہیں جارہی' دل نہیں چاہ رہا۔''

یہ حقیقت تھی کہ حویلی جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' لیکن گھر رکنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اماں' ابا کی غیر موجودگی میں وہ اسے شاہ صاحب کی منگنی کی اطلاع دینا چاہتی تھی۔

''کل ان لوگوں نے میرے متعلق پوچھا تو نہیں تھا؟''

''باقی سب نے تو پوچھا تھا' لیکن انہوں نے نہیں پوچھا۔ ویسے ان کی نظروں میں میرے لیے کچھ اچھے جذبات نہیں تھے۔''

''مجھے پروا نہیں ہے اس بات کی۔ میرا ساتھ تو شاہ جی کے ساتھ ہے۔ جب تک وہ اچھے ہیں تب تک سب کچھ ٹھیک ہے' لیکن ایک بات ہے رضیہ' انہیں اپنی بہنوں سے بہت محبت ہے۔''

''ان کی بہنیں بہت رکاوٹیں ڈالیں گی۔''

''یہی خدشہ مجھے بھی ہے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''پر کیا کروں ان کی بہنوں کی وجہ سے ان سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں سکتی ناں۔''

''زرینہ! اپنے ابا جی کے لیے کھانا لے آؤ۔'' اماں کی آواز آئی۔

''اچھا اماں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہم بھی ساتھ ہی کھانا کھالیتے ہیں۔'' رضیہ بولی۔

''تم سالن نکالو میں برتن لگاتی ہوں۔''

زرینہ نے برآمدے میں پڑے تخت پر کھانا چن دیا۔

''آج کے دن کا آغاز تو بہت برا تھا' لیکن چھوٹے شاہ صاحب کی مہربانی کی وجہ سے طبیعت کی بے زاری قدرے کم ہوگئی۔'' مولوی صاحب نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

زرینہ اور رضیہ نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''میں نے سنا ہے چھوٹے شاہ صاحب بہت اچھے ہیں۔'' اماں بولیں۔

''انہیں جتنا اچھا کہو اتنا کم ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''انہوں نے اتنی عزت دی مجھے' ایسے بات کی مجھ سے کہ اب تک میرا جی خوش ہے' اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے میں اضافہ کرے۔''

''آمین۔'' زرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''انہوں نے یہاں دو بوری گندم اور چاول بھیجنے کا بھی حکم دیا ہے اور معلوم ہے اس کے علاوہ کیا عنایت کر رہے ہیں؟''

''کیا؟'' زرینہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ ہم دونوں بچیوں کے کام کی چیز ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''فرمائش تم لوگوں نے

مجھ سے کی' لیکن بغیر جانے بوجھے اسے پورا وہ کر رہے ہیں۔''

''تیل کا چولہا۔'' زرینہ نے جوش اور خوشی کے ساتھ فوراً کہا۔

''میری یہ بیٹی پڑھی لکھی ہے ناں' اس لیے فوراً بوجھ لیا۔'' مولوی صاحب نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

زرینہ ہنستی چلی گئی۔ ساتھ بیٹھی رضیہ نے اسے ٹہوکا دیا۔

''یہ ایسے ہی پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔'' اماں نے منہ بنایا۔ ''بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے' ہنسے جاتی ہے۔ چپ کرو اب آواز باہر جاتی ہے۔ کوئی اچھا لگتا ہے کہ اس چار دیواری سے ہنسی ٹھٹھے کی آواز باہر جائے۔''

ان کے جھڑکنے پر وہ بمشکل ہنسی روکنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

''میں شاہ جی کا شکریہ ضرور ادا کروں گی' انہیں کتنا خیال ہے میرا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''اتنی چھوٹی سی بات بھی ان کے ذہن میں رہ گئی۔''

شام کو اماں' ابا حویلی چلے گئے تو وہ دونوں صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گئیں۔

''شاہ جی کتنے اچھے ہیں۔'' زرینہ نے کہا۔ ''انہیں کتنا خیال ہے میرا۔ ابا جی بھی ان سے خوش ہیں۔ اب اگر پیر صاحب راضی ہو جائیں تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔''

''پیر صاحب کیوں راضی ہونے لگے۔ آج سے پہلے کبھی انہوں نے نچلی سطح پر کوئی رشتہ جوڑا ہے جو اب جوڑیں گے۔'' رضیہ بولی۔

''شاہ جی کی بات کا خیال تو کریں گے۔''

''اور اگر انہوں نے پہلے فیصلہ کر لیا ہو تو؟''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔ ''نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاہ جی کو تو خبر ہوتی ناں اس بات کی۔''

''یقیناً۔'' رضیہ اسے اصل بات بتانے کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی۔

''تو پھر ٹھیک ہے' شاہ جی کو خبر ہوتی تو مجھے بھی خبر ہوتی۔ اس کا مطلب ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کو تو معلوم ہو' لیکن انہوں نے تمہیں نہ بتایا ہو؟''

''نہیں' ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ ہی کیوں کرتے؟''

''تو زرینہ! خود کو کسی بری خبر کے لیے تیار رکھو کیونکہ کم از کم یہ بات انہوں نے تم سے چھپائی ہے۔''

چند لمحے تک وہ رضیہ کو کھوجتی نظروں سے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک دیا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے کہ مجھے باز رکھنے کے لیے تم شاہ جی پر کوئی الزام لگا دو۔"

"میں کوئی الزام نہیں لگا رہی۔ اگر مہر النساء اور زیب النساء نے جھوٹ نہیں بولا جو کہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے نہیں بولا تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ چھوٹے شاہ صاحب کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"نہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں یہ بات کسی صورت نہیں مان سکتی۔"

"تمہیں ماننا پڑے گی۔"

"میں سوچتی تھی رضیہ کہ تمہیں مجھ سے بہت محبت ہے لیکن آج پتا چلا کہ تمہیں مجھ سے ذرہ بھر بھی محبت نہیں ہے ورنہ تم شاہ جی پر ایسا الزام نہ لگاتیں۔" زرینہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

"مجھے تم کو اپنی محبت کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" رضیہ کو ایک دم اس پر غصہ آ گیا۔ "تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ گاؤں کی آدھی لڑکیوں کو میرے سامنے مہر النساء نے یہ بتایا تھا اور اب تک ان لڑکیوں نے پورے گاؤں میں یہ بات پھیلا دی ہوگی۔ شک ہو تو کسی سے بھی پوچھ لو۔"

زرینہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں ان کی منگیتر کا نام نہیں بتا رہی۔ تمہیں مجھ پر شک ہے ناں، اس لیے چاہو تو گاؤں کی کسی بھی لڑکی سے معلوم کر لو۔"

"رضیہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا، لیکن اس کے لہجے میں وہ پہلے والا اعتماد نہیں تھا۔

"تمہارا اپنا بھلا اس میں ہے کہ تم مان جاؤ۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" زرینہ کی آواز بھیگ رہی تھی۔ "میں تو جیتے جی مر جاؤں گی رضیہ۔ میں شاہ جی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"خدا کے لیے زرینہ! واپس پلٹ آؤ۔ انہوں نے تم سے بے وفائی کی ہے، اس لیے تم بھی ان کی خاطر اپنی زندگی برباد مت کرو۔"

"میں تو اس جگہ پہنچ گئی ہوں، جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔" چند لمحے وہ آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔ "وہ کون ہے؟"

"ان کی ماموں زاد فوزیہ۔" رضیہ نے بتایا۔ "جس وقت مہر النساء اس منگنی کے متعلق بتا رہی تھی، اس وقت وہ بھی وہیں تھی شرم سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ مہر النساء کے چہرے کے تاثرات مجھے یہ بتا دینے کے لیے کافی تھے کہ اس اعلان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ یہ سب تمہارے کانوں تک پہنچ جائے۔"

"میں کیا کروں رضیہ؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔" رضیہ نے اسے تسلی دینا چاہی۔ "اتنا وقت نہیں گزرا کہ تم انہیں بھول نہ سکو۔ بس جو ہوا اس پر مٹی ڈالو اور ختم کرو اس قصے کو۔"

"یہ قصہ تو اب میرے مرنے پر ہی ختم ہوگا اور پھر مجھے شاہ جی نہ ملے تو زندہ رہنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔"

"وہ آرام کے ساتھ فوزیہ سے شادی رچا کر خوش بیٹھ جائیں اور تم ان کے لیے جان دے دو۔ ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی مجھے تم سے۔"

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ شاہ جی کو اس رشتے کی خبر ہی نہ ہو۔" زرینہ کے لہجے میں امید تھی۔

"ناممکن انہیں یقیناً خبر ہوگی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کل رات ہی تو انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے وہ۔ سچ مچ مجھ سے محبت کرتے ہیں، بہت زیادہ۔"

"یہ یقین تم مجھے دلا رہی ہو یا خود کو؟"

"میں پوچھوں گی شاہ صاحب سے، ضرور پوچھوں گی۔ تم دیکھ لینا رضیہ، انہیں اس بات کی خبر نہیں ہوگی۔" اس نے رضیہ کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"مجھے ڈر ہے، کہیں خوش فہمیوں کے جنگل میں بھٹکنے کے لیے تم تنہا نہ رہ جاؤ۔"

"شاہ جی کو یقیناً یہ بات معلوم نہیں ہوگی۔" زرینہ نے ہولے سے کہا۔ اس کے لہجے میں بھرپور یقین تھا۔

☆======☆======☆

شادی کے یہ تین دن زرینہ پر تین صدیوں کی طرح بھاری تھے۔ اماں بھی حویلی سے واپسی پر حیدر علی شاہ کی منگنی کی خبر لائی تھیں۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی، لیکن زرینہ کو یقین تھا کہ اس پورے قصے میں حیدر علی بے قصور ہے۔

مولوی صاحب کے ذکر کرنے کے اگلے ہی روز گندم اور چاول کی بوریاں اور تیل کا بالکل نیا چولہا ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس بات سے بھی زرینہ کو بہت تسلی ہوئی تھی یوں بھی اسے تنکے کا سہارا ہی بہت تھا۔

بارات اور ولیمے پر چلنے کے لیے اماں نے اسے کتنا کہا تھا، لیکن وہ حویلی میں قدم رکھنے پر تیار نہیں تھی۔ زیب النساء اور مہر النساء ایک دم ہی بری لگنے لگی تھیں اب تو یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ وہ دونوں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسے بھی اس بات کی خواہش نہیں تھی۔ اسے تو صرف حیدر علی شاہ کی طرف داری درکار تھی۔ اس نے ہی تو کہا تھا کہ وہ کوئی غم اور

فکر نہ کرے اور سب کچھ اس پر چھوڑ دے۔

وہ بہت بے چینی سے حیدر علی سے ملنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک ایک پل اتنا طویل ہوتا جا رہا تھا' وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا' لیکن طویل سے طویل وقت بھی بالآخر گزر ہی جاتا ہے۔ سو یہ تین صدیوں جتنے طویل دن بھی بالآخر تمام ہوئے۔

رات کو اماں' ابا کے سو جانے کے انتظار میں وہ اپنی چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی جب رضیہ گُر بہ قدم چلتے ہوئے اس کے پاس آ گئی۔ زرینہ کو اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا؟'' رضیہ کو اپنے قریب پا کر اس نے پوچھا۔

''تم سوئی نہیں؟''

''آج کیسے سو سکتی ہوں' مجھے تو تین راتوں سے نیند نہیں آئی۔ بھول گئیں؟ آج مجھے شاہ جی سے ملنے جانا ہے۔''

''مت جاؤ۔''

''یہ نہ کہو' کوئی ایسی بات نہ کہو جو میں نہ مانوں۔''

''اگر شاہ صاحب نہ آئے تو؟'' قدرے توقف کے بعد رضیہ نے پوچھا۔

''یہ ناممکن ہے۔''

''بہت سے ناممکن تمہارے سامنے ہی ممکن ہوئے ہیں۔''

''شاہ جی کی منگنی کی اس وقت تک کوئی وقعت نہیں ہے' جب تک وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ پیر صاحب کی حکم عدولی کریں گے۔ تمہاری خاطر اپنی ماں اور بہنوں کو ناراض کریں گے؟ انہوں نے اپنی بہن کی خاطر تمہیں بری طرح ڈانٹ دیا تھا' پھر بھی تمہیں ان سے توقع ہے کہ وہ سب کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لیں گے۔''

''خدا کے لیے رضیہ مجھے تنہا چھوڑ دو' میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو آنسو گرے۔

''تمہاری یہی پریشانی تو مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

چند لمحے وہ دونوں خاموش بیٹھی رہیں' پھر رضیہ بولی۔

''ابا جی' اماں سے ہمارے رشتوں کی بات کر رہے تھے۔''

زرینہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ چپ چاپ رضیہ کو تکتی رہی۔

''میرا رشتہ وہ کمہاروں کی برادری میں طے کرنا چاہتے ہیں' معلوم نہیں کس کا ذکر کر رہے تھے۔''

''میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا ناں؟'' زرینہ کے لہجے میں امید تھی۔

''نہیں' کسی کا نام نہیں لیا۔ تمہارا رشتہ وہ کسی بہت اچھی جگہ طے کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھی؟ اچھی تو ایک ہی جگہ ہے' پر وہ ان کے اختیار میں نہیں ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے زرینہ پر رشک آ رہا تھا۔ سب کو اس کا خیال تھا۔ اماں' ابا اور شاہ صاحب کو۔ اماں بھی ابھی کہہ رہی تھیں۔

''رضیہ کا تو وہیں کمہاروں میں رشتہ طے کروا دیں پیر صاحب سے کہہ کر۔ زرینہ کا البتہ میں خوب دیکھ بھال کر رشتہ طے کرواؤں گی۔ میری پھولوں جیسی نازک سی بیٹی ہے۔ ذرا دکھ پہنچے تو مرجھا کر رہ جاتی ہے۔ بڑی بیگم سے خود جا کر سفارش کرنے کو کہوں گی۔''

اور ابا نے کہا تھا۔ ''ہاں زرینہ مجھے بھی بہت پیاری لگتی ہے' اس کا رشتہ جلد بازی میں طے نہیں کرنا۔ یوں بھی پیر صاحب بہت عزت دیتے ہیں مجھے' جہاں کہوں گا وہیں رشتہ طے کر دیں گے۔''

اور رضیہ کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی تو اس نے خوب سیرتی سے سب کا دل جیتنا چاہا تھا۔ اسے زرینہ سے حسد محسوس نہیں ہو رہا تھا بس ایک خلش تھی کہ وہ ہر معاملے میں پیچھے ہی تھی۔ آج تک اس نے ہر وہ قدم اٹھایا تھا' جس پر چلنے کی اسے اماں' ابا نے تاکید کی تھی اور اس راہ پر بھولے سے بھی قدم نہیں بڑھایا تھا' جہاں چلنے سے انہوں نے منع کیا تھا۔

اس نے کبھی اماں ابا سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی فرمائش تو دور کی بات اس نے کبھی اپنی ضرورت کے لیے بھی نہیں کہا تھا جو کچھ اسے ملتا تھا وہ پہلے زرینہ کی طرف دیکھتی تھی کہ کہیں اسے تو اس چیز کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں کہاں کمی کی تھی اس نے۔

''مجھے تم پر رشک محسوس ہوتا ہے رضیہ۔'' زرینہ نے کہا تو وہ چونک پڑی۔

''مجھ پر؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ حیرت کی بات ہی تو تھی ناں۔ ابھی وہ زرینہ پر رشک کر رہی تھی۔

''ہاں تم پر۔'' وہ بولی۔ ''کتنی بے فکر ہو تم۔ اماں' ابا جہاں کہیں گے شادی کرنے کو وہیں شادی کر لو گی۔ سکون سے گھر کو سنبھال لو گی' میاں کا خیال رکھو گی اور بچے پالو گی۔'' اس کے لہجے میں افسردگی اتر آئی۔ ''اور مجھے دیکھو یوں لگتا ہے جیسے ایک ایک لمحہ سُولی پر بسر ہو رہا ہو۔ نہ جانے کس لمحے تختۂ دار کھینچ لیا جائے۔''

اور اس لمحے رضیہ نے سوچا کہ انسان کتنا غیر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کی تکلیف دیکھتا ہے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ دوسرا کس تکلیف میں مبتلا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' زرینہ کی آواز اسے واپس کھینچ لائی۔

''سوچ رہی ہوں کہ محبت کی تھوڑ زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے یا ڈھیر ساری محبت کا ایک دم چھن جانا۔''

''محبت کا چھن جانا تو بہت بڑی بات ہے میرے لیے تو یہ تصور ہی جانکاہ ہے۔''

''محبت کی تھوڑ بھی بہت سوہانِ روح ہوتی ہے زرینہ۔'' رضیہ بولی۔ ''ترس ترس کر جینا بھی کوئی جینا ہے گلستان نہ سہی' سراب ہی سہی صرف چند لمحوں کا احساس ہی سہی کہ کہیں ڈھیر ساری محبت ہماری بھی منتظر ہے۔''

''اماں' ابا سو گئے کیا؟'' زرینہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی' وہ تو شاہ صاحب کے پاس جانے کے لیے بے چین تھی۔ ڈھیر ساری محبت کا ایک دم چھن جانا واقعی اس کے لیے جانکاہ تھا۔

''باتوں کی آواز نہیں آ رہی سو ہی گئے ہوں گے۔'' رضیہ نے جواب نہ دیا تو زرینہ خود ہی بول پڑی۔

چارپائی سے اتر کر وہ دبے قدموں برآمدے کی طرف بڑھی اور سن گن لینے کی کوشش کی پھر رضیہ کے قریب آ کر ہولے سے بولی۔

''سو گئے ہیں' میں چلتی ہوں' میرے لیے دعا کرنا۔''

رضیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

زرینہ سیاہ چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر حیدر علی شاہ نے اسے دھوکا دیا تو وہ دوبارہ اپنے گھر نہیں جائے گی' وہیں کنویں میں کود کر جان دے دے گی۔

اونچے نیچے راستوں پر تیزی سے چلتی وہ کنویں کے قریب پہنچی تو اسے کوئی ہیولا دکھائی نہ دیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

''اس درخت تک جب میں پہنچتی ہوں تو شاہ جی آگے بڑھ آتے ہیں اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ کنویں تک جاتے ہیں۔ پر آج شاہ جی کیوں نہیں ہیں۔''

وہ مزید تیزی سے چلتے ہوئے کنویں کے پاس والی بینچ پر جا پہنچی۔

''شاہ جی کیوں نہیں آئے۔ وہ تو ہمیشہ مجھ سے پہلے یہاں موجود ہوتے تھے پھر آج کیا ہوا۔ کہیں رضیہ کے خدشات درست تو نہیں ہیں؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ شاہ جی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ بری طرح سے رو پڑی۔

☆=====☆=====☆

حسبِ معمول رات پونے آٹھ بجے حیدر علی شاہ حویلی سے نکلنے کو تھا کہ ملازم نے پیر

صاحب کا بلاوا دیا۔

''ابھی ابھی بلایا ہے؟'' حیدر علی نے گھڑی دیکھی جس کے ڈائل پر سوئیاں تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔

''جی' شاہ صاحب! فوراً طلب کیا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ واپس پلٹا۔

خواب گاہ میں پیر صاحب کے علاوہ اماں جان بھی موجود تھیں۔

''آپ نے مجھے یاد کیا ہے بابا جان۔''

''ہاں۔''

''فرمایئے۔''

''ادھر میرے پاس آؤ ناں۔'' اماں جان نے پیار سے کہا۔

اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اماں جان کے قریب جا بیٹھا۔ جنہوں نے پاس ہی مٹھائی کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔

''اب جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم رجب علی کے فرض سے فارغ ہو گئے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اب تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔''

''اس طرح نہیں پہلے میرے بیٹے کا منہ میٹھا کروائیں۔''

اماں جان نے مٹھائی کے ڈبے سے ایک بڑا سا لڈو نکالا۔ اس سے ان کے چہرے پر خوشی کے کتنے ہی رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ حیدر علی کو پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا کہ اس کی کشتی بری طرح سے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے اماں جان کے پیار اور ان کی محرومیوں کا بھی احساس تھا اور اپنی گوری کی بے انتہا محبت کا بھی۔

کہنے کو تو اس نے ہمیشہ کہا تھا کہ اس کے لیے فیصلہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا' لیکن حقیقت یہ تھی کہ فیصلے کی گھڑی سخت کڑی تھی۔

اماں جان کے بلند ہوتے ہاتھ میں لڈو دبا ہوا تھا۔

''تھینک یو۔'' اس نے لڈو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔

''اونہوں' ماں کے ہاتھ سے۔''

اس نے چپ چاپ ان کے ہاتھ سے تھوڑا سا لڈو کھا لیا۔

''لیکن بابا جان مجھے اس سلسلے میں کوئی جلدی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

ہمیں تو جلدی ہے ناں بیٹا۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''گستاخی معاف بابا جان لیکن ابھی میرا نمبر نہیں آیا۔ مجھ سے پہلے کسی اور کا حق ہے اور آپ کا فرض کسی اور کی طرف نکلتا ہے۔''

''بیٹا اپنے بابا سے ایسی بات نہیں کرتے۔'' اماں یک دم گھبرا گئیں۔ ''اور پھر تمہارے ابا نے بہت اچھی...... بہت پیاری لڑکی کا انتخاب کیا ہے تمہارے لیے۔ کوئی اور لڑکی تمہارے لیے اتنی اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔''

''ہمیں بات کرنے دیں۔'' پیر صاحب نے مداخلت کی پھر وہ حیدر علی شاہ سے مخاطب ہوئے۔

''ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوری طور پر ہم نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ نسبت ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں اور لڑکی والوں کو اتنی دیر تک انتظار میں مبتلا رکھنا اچھی بات نہیں۔''

''کیسی نسبت بابا جان' مجھ سے پوچھے بغیر میری شادی یا منگنی کا فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یعنی تمہاری نسبت طے کرنے کے لیے ہمیں تمہاری اجازت درکار ہوگی۔''

''اجازت نہ سہی' اقرار کی ضرورت تو ہوتی ہے۔''

''علی میرے لعل! باپ کے سامنے کوئی ایسے بولتا ہے۔'' اماں جان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ اس معاملے میں نہ آئیں نذری بیگم' ہم نے اسے تعلیم دلوا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کاش یہ بھی رجب علی کی طرح اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتا۔ تمہیں اندازہ ہے علی کہ تمہاری باتوں نے ہمیں کتنا صدمہ پہنچایا ہے؟''

''بابا جان! آپ کو یا اماں جان کو دکھ پہنچانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف اپنا حق مانگ رہا ہوں۔''

''غور کرو تو ہم نے تمہیں تمہارے حق سے کہیں زیادہ دیا ہے۔ آج جو تم ہمارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو۔ کیا یہی حق لینا چاہتے ہو؟''

''میں آپ کے سامنے سینہ تان کر کیسے کھڑا ہو سکتا ہوں بابا جان۔ اولاد اپنے والدین کے قدموں میں بیٹھے تب بھی ان کی مہربانیوں کا قرض نہیں چکا سکتی۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟''

''صرف یہ حق کہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ مجھے خود کرنے دیا جائے۔''

''فیصلہ تو ہو چکا اور یہ فیصلہ آج نہیں' برسوں پہلے اس وقت ہوا تھا جب تم ولایت میں تھے۔ یوں بھی یہ فیصلہ اولاد کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا۔ آج کل کے کچے ذہنوں کے نوجوان یہ سوچتے ہیں کہ زندگی انہیں گزارنی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ دو افراد کی زندگی کا معاملہ نہیں ہوتا' ایک نئے گھر کی بنیاد ہوتی ہے' ایک نئی نسل کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ ایک پورے خاندان کا

انداز ہوتا ہے۔''

''اگر آپ کا خیال ہے کہ میں کچے ذہن کا ہوں تو گستاخی معاف بابا جان' آپ غلطی پر ہیں۔ میں کبھی اپنے اور اس گھر کے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گا۔''

''سنا نذری بیگم! آپ کا فرمانبردار بیٹا کیا کہہ رہا ہے؟'' پیر صاحب نے بہت مشکل سے اپنے اوپر قابو پا رکھا تھا۔ ''یہ اپنی شادی خود کرے گا' خود لڑکی ڈھونڈے گا اور ہمیں بتائے گا کہ فلاں لڑکی اس حویلی میں بہو بن کر آنے والی ہے۔ یہ عزت ہے اس کی نظر میں اپنے والدین کی۔ اب نام روشن کرے گا۔ آپ کا بیٹا۔ اس حویلی اور اپنے باپ' دادا کا۔''

''نہ بیٹا ایسا نہیں کہتے۔'' اماں جان آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ ''آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا' وہ تمہارا بڑا بھائی رجب علی بھی تو ہے' تمہارے ساتھ ولایت سے آیا ہے' پر اس نے تو ایسا نہیں کیا۔'' پھر وہ پیر صاحب کی طرف مڑیں۔

''بچہ ہے ناں' ابھی نا سمجھ ہے۔ آپ اس کی باتیں دل پر مت لیں۔ میرا بیٹا ہے' میں سمجھاؤں گی تو مان جائے گا۔''

''اسے بتا دیں کہ اس کی شادی فوزیہ بیٹی سے ہی ہوگی' چاہے یہ کچھ بھی کر لے اور اب یہ اس وقت ہمیں اپنا منہ دکھائے جب اپنے کہے پر پشیمان ہو اور جب دل سے ہماری عزت کرنے لگے۔'' پیر صاحب کہتے ہوئے خواب گاہ سے نکل گئے۔

''اماں جان! آخر بابا جان میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟'' ان کے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ ''کیا میں اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں رکھتا؟ میری منگنی میری مرضی کے بغیر طے کر دی گئی اور کسی نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔

اماں جان میں کوئی کھلونا تو نہیں ہوں' جس میں چابی بھر کر اسے چلا لیا جائے یا جہاں دل چاہے اس کا رخ موڑ دیا جائے۔ میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں' میری بھی کچھ خواہشیں ہیں' کچھ خوشیاں ہیں' میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہوگا۔''

اپنے جذبات کے بہاؤ میں وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا کہ اماں جان کی آنکھوں میں برسات اتر آئی تھی' جب سانس لینے کو رکا تو اسے احساس ہوا کہ ان کے بوڑھے گالوں کی جھریوں میں سے آنسو راستہ بنائے چلے آ رہے ہیں۔

''اماں جان!'' وہ اپنی باتوں پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ ''پلیز روئیں مت۔''

وہ ان کے آنسو پونچھنے لگا۔

''کیسے نہ روؤں۔ ایک امید یہی تو رہ گئی ہے اپنے میکے سے کوئی تعلق جوڑنے کی۔ جس دن سے اس حویلی میں آئی ہوں سوائے خوشی غمی کے سب ناتے ٹوٹ گئے اپنے بھائیوں سے۔ سوچا تھا اپنی بھانجی کو اس حویلی میں پھلتا پھولتا دیکھوں گی تو دل میں ٹھنڈ پڑ جائے گی' لیکن تم تو

چاہتے ہو کہ میرا مرنا جینا بھی ختم ہو جائے اپنے میکے کے ساتھ۔''

''پلیز اماں جان! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن آپ کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔''

''تو کیوں کرتے ہو اپنے بابا جان کو ناراض' کیوں ماں کا دل دُکھاتے ہو' جانتے ہو ناں کہ ہمارے ہاں منگنی کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتی۔ خون کی ندیاں بہہ جایا کرتی ہیں اس بات پر اس لیے تم کچھ بھی کر لو شادی تو تمہیں وہیں کرنی ہے' پھر معاملہ الجھاتے کیوں ہو' علی بیٹا بات جو طے پا گئی' وہ ہو کر ہی رہے گی' چاہے غصے میں کرو' چاہے پیار سے' پھر پیار محبت سے کیوں نہیں مان جاتے۔''

''اماں جان! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں' بات یہ ہے کہ.....''

''بات کچھ نہیں ہے۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹی۔ ''صرف اتنا ہے کہ پڑھ لکھ کر تم اپنے بزرگوں کو بے وقوف سمجھنے لگے ہو۔ میرے لعل سوچو تو' جو لڑکی برسوں سے تمہارے نام پر بیٹھی ہوئی ہے' اس کا کیا ہو گا۔ کیا اپنی مانگ کسی اور کے حوالے کر دو گے؟ غیرت سے ڈوب نہ مرو گے کیا؟''

''ایک تو آپ لوگوں کی غیرت کا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لڑکی کو زبردستی میرے سر پر مسلط کر دیا اور اب مجھ سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ میں اس علاقے کی نام نہاد غیرت کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر لاد لوں۔ اماں! میں ایک عام سا انسان ہوں' مجھ میں اتنی خوبیاں نہیں ہیں جتنی آپ لوگ مجھ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری پرواز کی بھی ایک حد ہے۔ مجھ سے اتنی اُڑان کی توقع کیوں رکھتے ہیں آپ لوگ جہاں تک میرا جانا ممکن نہیں ہے۔''

''کیسی اولاد ہو علی! میں نے برسوں گزار دیئے ان دیواروں میں خاموشی سے رہتے ہوئے' اس خوش فہمی میں مبتلا رہ کر کہ میرے بچے میری محرومیاں اور میرے آنسو چن لیں گے لیکن تم نے تو یہ امید بھی توڑ دی مجھے کتنا مان تھا تم پر' وہ مان بھی نہ رکھا۔ میری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہاری ضد کی صورت میں' میں اپنے بھائی اور اس کے بیٹوں کو رو دوں گی یا تمہیں۔

جاؤ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ اپنی پرواز کے لیے سمت کا تعین تم خود کرو۔ تمہارے بابا کیا کہتے یا کرتے ہیں اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں لیکن میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔''

''اماں اماں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''جاؤ بیٹا مجھے آرام کرنے دو۔'' وہ مسہری پر لیٹ گئیں۔

''اماں' میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں ناراض نہیں ہوں' تم جاؤ۔''

لیکن ان کی آواز میں موجود آنسوؤں کی نمی نے اسے بے چین کر دیا۔

''اماں پلیز روئیں مت' پلیز اماں؟''

''میرا تمہارا رشتہ ایسا ہے بیٹا کہ نہ چاہتے ہوئے ہی سہی ہمیں ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا ہے۔ خوشیاں دینے کے روادار نہ ہوں تو غم ہی سہی۔'' اماں نے کروٹ بدل لی۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنی زیادہ محبتیں عذاب لگنے لگی تھیں۔ محبت کے اَن دیکھے جال اتنے مضبوط تھے کہ ان سے نکلنے کی ساری جدوجہد بیکار تھی۔ وہ جتنے ہاتھ پاؤں مارتا تھا' یہ جال اتنی ہی سختی سے اس کے گرد تنتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر پائنتی کی طرف چلا آیا اور اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔ کتنی دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔

''پاؤں ہی پکڑنے ہیں تو اپنے بابا جان کے پکڑو۔ آج تم جو کچھ بھی ہو' ان ہی کی وجہ سے ہو۔ جاؤ علی۔'' بالآخر ماں نے کہا۔

حیدر علی شاہ شکستہ قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کتنی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا وہ۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی خواب گاہ میں جا کر گہری نیند سو جائے۔ ایسی نیند جو کم از کم چند گھنٹوں کے لیے اسے ان پریشانیوں سے نجات دلا دے لیکن گوری کا خیال بھی ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ خدا جانے وہ اب تک اس کا انتظار کر رہی ہو گی یا گھر واپس جا چکی ہو گی۔

اس نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے دس سے کچھ اوپر ہو رہے تھے۔ گہری نیند لینے کی خواہش کو وہ دبا کر حویلی سے باہر نکل آیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتے جب وہ کنویں کے پاس پہنچا تو نقرئی چاندنی میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً وہ اس کی گوری تھی جو برگد کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر بھی وہ وہیں بیٹھی رہی۔

وہ اس کے قریب چلا آیا۔

چاندنی' رات کی تاریکی میں اس کا چہرہ روشن کر رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں' ہونٹ نیم وا' سیاہ چادر ایک کندھے سے ڈھلکی ہوئی' بال کچھ کچھ الجھے ہوئے۔ کتنی دیر تک وہ یونہی اسے دیکھتا رہا۔

نہ جانے اس لڑکی میں کیا تھا کہ جس کی خاطر اس نے اپنی ماں کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔ اماں جان کے آنسوؤں نے اسے اندر تک کاٹ کر رکھ دیا تھا' لیکن ان سب باتوں کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی اسے گوری کو چھوڑنے کا خیال نہیں آیا تھا اور چھوڑنے کا خیال آ بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ تو اسے اپنے وجود کا ہی ایک حصہ لگتی تھی اور اپنے آپ کو کاٹ کر پھینک دینے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کیسے پلٹا کھایا تھا زندگی نے اور کیسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا اسے۔

لیکن یہ لڑکی نہیں تھی ساحرہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی اسے قدم بڑھانے پڑے' وہ گوری کی طرف ہی بڑھیں گے۔

''گوری!'' بالآخر اس نے اسے پکارا۔

وہ کسمسائی۔
''گوری!''
اب کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے حیدر علی شاہ کو کھڑے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں غیر یقینی کی کیفیت ابھری۔
''شاہ جی آپ؟''
''آئی ایم سوری، مجھے دیر ہوگئی، کب سے یہاں انتظار کر رہی ہو؟''
''پتا نہیں، اب تو لگتا ہے جیسے صدیاں گزر گئی ہیں۔'' اس نے ہونٹ کاٹ کر خود بخود آنکھوں میں اتر آنے والے پانی کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔
''اوہو، دیر تو ہوسکتی ہے، روتی کیوں ہو؟ چلو آنسو پونچھو۔''
اس نے چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کیں، کچھ دیر تک حیدر علی اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر بولا۔
''کیا ہوا؟ اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟''
''کیا بات کروں؟''
''کوئی بھی اچھی سی بات۔''
''اچھی باتیں تو ہیں ہی نہیں میرے پاس۔''
''تو بری بات ہی کہہ دو۔''
''اب کیا رہ گیا ہے کہنے کے لیے۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔
''کیا مطلب؟ جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کھل کر کہا کرو۔''
''جب میں نے کہا تھا کہ یہ چند دن کی جدائی کسی لمبی جدائی کا پیش خیمہ نہ ہو تو آپ نے مجھے تسلی دی تھی۔''
''پھر؟''
''آج بھی تسلی دیں گے؟''
''آج ہم جدا کب ہیں؟''
''کل تو ہو جائیں گے ناں۔'' وہ بولی۔
''کیسی باتیں کر رہی ہو گوری۔'' اس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔
''آپ جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ ''میں نے سوچا تھا کہ یہ درد و کرب کی آخری رات ہوگی۔ [illegible] زیست سے نجات مل جائے تو ہر درد ہر کرب سے نجات مل جائے گی، لیکن آپ تو یہ بھی نہیں ہونے دیتے۔''
''میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں گوری پلیز مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔'' حیدر علی کے

لہجے میں تھکن تھی۔
''پریشان مت ہوں۔ کوئی ایک فیصلہ کرلیں، ایسا فیصلہ جس پر آپ کو بعد میں کوئی پشیمانی نہ ہو اور جس کی ذمہ داری صرف اور صرف آپ کے کندھوں پر ہو اور جو......''
''میں رات کے اس پہر یہ لایعنی گفتگو سننے یہاں نہیں آیا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔
''میں جانتی ہوں۔'' پھر قدرے توقف سے اس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہیں معلوم۔''
''کیا؟''
''آپ کی اپنی منگنی کے بارے میں۔'' اس نے کھوجتی نظروں سے حیدر علی کی جانب دیکھا۔
اس لمحے حیدر علی نے غور کیا کہ زرینہ کی آنکھیں روئی روئی سی تھیں، لیکن یہ غور کرنے کی اسے زیادہ مہلت نہ مل سکی۔ وہ اس سے اس کی منگنی کے بارے میں پوچھ رہی تھی، لیکن اسے یہ بات معلوم کیسے ہوئی تھی؟
''آپ کو نہیں پتا ناں؟'' اس کے لہجے میں امید تھی۔
ایک لمحے کو حیدر علی کا دل چاہا کہ وہ جھوٹ بول دے، لیکن جھوٹ بولنا ناممکن تھا۔
''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے گویا اعتراف جرم کیا۔
''آپ مذاق کر رہے ہیں...... ہیں ناں۔'' اس نے اسے جھنجوڑ دیا۔ ''آپ کو نہیں پتا ناں۔''
حیدر علی نے آہستگی سے خود کو چھڑا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''مجھے بہت بعد میں علم ہوا جب میرے لیے پلٹنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے کچھ نہیں بتایا۔ فائدہ مجھے کیا تھا بتانے کا جو کچھ یہ بات جان کر مجھے ہوا تھا۔ وہ تمہیں بھی ہوتا اور میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔''
''مجھے بتا تو دیا ہوتا شاہ جی۔'' وہ رو پڑی۔
''کیا فرق پڑتا۔ حالات تو یہی ہوتے ناں جواب ہیں۔''
''بہت فرق پڑتا۔ کسی اور کے منہ سے یہ بات سننے کے بجائے میں آپ کے منہ سے سنتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کوئی اور بتائے تو سچا انسان بھی جھوٹا لگنے لگتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''پتا نہیں محبت اتنی تکلیف دہ کیوں ہوتی ہے۔ میرے لیے تو پلٹنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔''
''رونے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے۔ مجھے سوچنے دو کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ تم پلٹ نہیں سکتیں تو میں بھی کب پلٹ سکتا ہوں۔ آنسو پونچھو ورنہ میں کچھ بھی سوچ نہیں سکوں گا۔''
لیکن آنسو خود بخود آنکھوں میں اترتے چلے آ رہے تھے۔

"اب تو آپ کے گھر والوں کے ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" قدرے خاموشی کے بعد وہ بولی۔

"ہوں۔"

"پھر؟ خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ شاہ جی۔"

"آج بابا جان نے مجھے بلایا تھا۔ میں یہاں کے لیے نکلنے ہی لگا تھا کہ ان کا بلاوا آ گیا۔ یہ بات زیبی آپی پہلے ہی مجھے بتا چکی تھیں لیکن بابا جان نے آج پہلی مرتبہ یہ ذکر کیا تھا۔"

"پھر؟"

"میں نے انکار کر دیا۔"

"کیا؟ انکار کر دیا؟" اس کے انداز میں خوشی سے زیادہ حیرت تھی۔ "پیر صاحب سے انکار کر دیا۔"

"یہ تو کرنا ہی تھا۔"

"پھر؟" اس کی حیرت اب بھی برقرار تھی۔

"وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ مجھے ہر حالت میں ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرنی ہے۔"

"آپ نے انہیں میرے متعلق بھی بتا دیا؟"

"نہیں۔"

"اور بڑے شاہ صاحب!"

"انہوں نے مجھے ایک درمیانی راستہ بتایا تھا، جو مجھے منظور نہیں تھا۔"

"اور آپ کی اماں جان اور بہنیں؟"

"بہنیں مجھے سمجھاتی ہیں، روکتی اس لیے نہیں ہیں کیونکہ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "اور اماں جان آج مجھ سے سخت خفا ہیں۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں ان کی آنکھوں میں آنسو برداشت کر سکوں گا، مجھے اماں جان بہت پیاری ہیں گوری۔ ہر بیٹے کو اپنی ماں سے محبت ہوتی ہے، لیکن میری محبت کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں پھر بھی میں ان کے آنسو دیکھتا رہا۔" اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ "انہوں نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ کچھ طلب نہیں کیا، لیکن آج پہلی مرتبہ انہوں نے مجھ سے جو چیز طلب کی، وہ انہیں دے دینا میرے اختیار میں نہیں تھا اور میں انہیں روتے چھوڑ کر چلا آیا۔"

کتنی دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"میں آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گی شاہ جی۔" بالآخر اس نے کہا۔ "آپ جو فیصلہ کریں سوچ سمجھ کر کریں۔"

"نہیں میں اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ تمہاری ذات میری طاقت ہے گوری۔ تمہارے بارے میں، میں اکیلے ہی کوئی فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں۔"

"نہیں شاہ جی، مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں اس فیصلے میں شامل ہو سکوں۔ ساری زندگی کا یہ بوجھ میں نہیں اٹھا سکوں گی۔" وہ بولی۔ "ہاں آپ جو فیصلہ کریں گے وہ مجھے قبول ہوگا، بس ایک بات ہے شاہ جی۔"

"وہ کیا؟"

"جب آپ دونوں فریقوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کریں تو آپ کے چہرے پر شرمندگی یا پشیمانی کی کوئی تحریر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بوجھ ہم میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا سکے گا۔"

وہ اسے دیکھے گیا۔ گوری سے اتنی حوصلہ مندی کی توقع نہیں تھی اسے۔

"ابا جی جاگنے والے ہیں، میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو۔" وہ ہمیشہ کی طرح زرینہ کے ساتھ چل پڑا۔

راستہ خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ جب مسجد کی سمت سے سائیں بابا کی پُرسوز آواز خاموشی کا پردہ چیرتے ہوئے ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اِک بازتوں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی"

"یہ سائیں بابا کی آواز ہے۔" زرینہ بولی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ یہ فقیر ہیں، لیکن میں نے آج تک انہیں کسی سے کچھ مانگتے نہیں دیکھا۔"

حیدر علی خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا گیا۔

"یہ کبھی کسی سے بات نہیں کرتے لیکن جب بھی کرتے ہیں وہ سچ نکلتی ہے۔ پتا نہیں انہیں آنے والے وقت کی خبر کیسے ہو جاتی ہے۔"

"وہم ہے تمہارا، آنے والے وقت کی بھی بھلا کسی کو خبر ہوتی ہے۔"

"اللہ والوں کو ہر اس بات کی خبر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ بندے تک پہنچانا چاہتا ہے۔"

چلتے چلتے جیسے ہی انہوں نے موڑ مڑا کھچڑی بالوں والے سائیں بابا لنگڑاتے ہوئے ان کے سامنے آ گئے۔ زرینہ نے گھبراہٹ کے عالم میں چادر کے ایک سرے سے منہ ڈھانپنا چاہا۔

"کس سے چھپ رہی ہے بچی۔" سائیں بابا بولے۔ "روشنی کو سو پردوں میں چھپا لیں

تب بھی وہ نظر آ کر رہتی ہے۔''

زرینہ دم بخود کھڑی ہو گئی۔

''راستہ چھوڑ دو۔'' حیدر علی نے زرینہ کو گھبرا کر رکتے دیکھا تو سائیں بابا کو قدرے جھڑک دیا۔

''کہہ سکتے ہیں شاہ جی آپ اس زمین کے بادشاہ جو ہیں' لو میں نے راستہ چھوڑ دیا۔'' وہ ایک طرف ہٹ گئے تھے۔

''کیا کرتے ہیں شاہ جی! یہ اللہ والے ہیں' خدا کے لیے انہیں کچھ مت کہیں۔'' زرینہ نے اور زیادہ گھبرا کر حیدر علی کا ہاتھ تھام لیا۔

''حویلی کی بہو بننا چاہتی ہے بچی؟'' سائیں بابا نے پوچھا۔

زرینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں تجھے حویلی کی بہو بنے دیکھ رہا ہوں' لیکن ایسے کہ تیرے تن پر نہ سرخ جوڑا ہے اور نہ گلے میں زیور' نہ ڈھول تاشے ہیں' نہ باجے گانے۔ بہت سی آہیں' بہت سی سسکیاں ہیں۔''

''مم...... میں حویلی کی بہو بن جاؤں گی ناں؟'' زرینہ کو اگلی باتوں کی پروا نہیں تھی۔

''ہاں بہت جلد۔''

''سنا شاہ جی آپ نے؟ سائیں بابا جو کچھ کہتے ہیں' وہ درست ہوتا ہے۔'' خوشی اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ''اب چاہے کوئی کچھ کر لے ایسا ہی ہوگا۔''

''اچھا اب گھر چلو۔'' حیدر علی اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا' اس لیے بولا' ورنہ وہ سائیں بابا کو بہت بڑا فراڈ سمجھ رہا تھا۔

''نادان لڑکی! دکھ پر خوش ہو رہی ہے۔ رونے کے بجائے ہنستی ہے۔'' سائیں بابا بڑبڑاتے ہوئے آگے چلے گئے اور وہ آنکھیں پھاڑے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

''فضول باتیں ہیں۔ ان پر یقین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''ایسے بہت سے فراڈ دیکھ چکا ہوں میں۔''

''نہیں شاہ جی! ایسی بات مت کہیں' سائیں بابا کی شان میں گستاخی مت کریں۔''

''کیا ہو گیا ہے گوری' اس نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو بات بنالی۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور ظاہر ہے رات کے اس پہر میرے ساتھ جو لڑکی ہوگی وہ حویلی کی بہو ہی بننا چاہتی ہوگی۔ اتنی سی بات ہے' باقی سب اس نے ڈراما ڈالا ہے۔''

''ایسے مت کہیں ناں۔'' وہ حیدر علی سے الجھ پڑی۔ ''وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں اور اگر یہ باتیں آپ اس لیے کر رہے ہیں کہ میرا دھیان ان کی آخری بات سے ہٹ جائے تو مت کریں ایسا۔ آپ کا ساتھ مل جائے پھر دکھ آئیں یا سکھ میں برداشت کر لوں گی۔ آپ کو کبھی میری

آنکھوں میں آنسو نظر نہیں آئیں گے' کبھی میرے ماتھے پر بل نہیں دیکھیں گے آپ' بس آپ مل جائیں۔''

یوں تو اس نے حیدر علی سے کہا تھا کہ وہ اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالے گی' لیکن جذباتی کمزوری کے اس لمحے نے اس سے سب کچھ کہلوا دیا تھا۔

وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر مسجد تک پہنچے۔ اس کے بعد زرینہ نے کوئی بات نہیں کی تھی' لیکن حیدر علی کو اندازہ تھا کہ اس نے سائیں بابا کی ہر بات کو سچ تسلیم کر لیا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ اسے حویلی کی بہو بننے کی خوش خبری مل گئی تھی۔

کمرے کی کھڑکی میں کھڑی رضیہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ زرینہ اندر داخل ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''خیریت رہی ناں؟'' چھوٹتے ہی اس نے سوال کیا۔ ''کیا کہا چھوٹے شاہ صاحب نے؟''

☆======☆======☆

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر حیدر علی نے پہلا کام یہ کیا کہ نوکروں کے ذریعے سائیں بابا کو بلوا بھیجا۔ حویلی کے بڑے پھاٹک سے جیسے ہی وہ نمودار ہوئے برآمدے میں بیٹھا حیدر علی اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔ نوکروں کو اس نے بھجوا دیا تھا تاکہ کھل کر بات کر سکے۔

''کون ہو تم؟''

''اس اوپر والے کی ایک ادنیٰ مخلوق ہوں۔'' انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے' صحیح صحیح بتاؤ تم کون ہو؟'' اس نے سائیں بابا کو ڈپٹ دیا۔

''کیوں فقیر کو تنگ کرتے ہو۔ میں تمہاری طرح اس زمین کا بادشاہ نہیں ہوں تو پھر کیا ہوا؟ ایک ادنیٰ مخلوق۔''

حیدر علی انہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا حالانکہ ان کی باتوں نے اسے زچ کر دیا تھا۔

''تم درحقیقت اس گاؤں کے نہیں ہو' کہاں سے آئے ہو؟''

''اب تو یہیں کا ہوں' پہلے خبر نہیں کہاں رہتا تھا؟''

''کوئی کام بھی کرتے ہو یا بیکار کے ڈرامے دکھا کر لوگوں کو الو بناتے ہو۔''

''فقیر تو تلاش میں ہے' اس کی سب سے قیمتی چیز کھو گئی ہے۔'' انہوں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا کھویا ہے تمہارا؟''

''میری محبت کھو گئی ہے۔''

''محبت؟'' حیدر علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں میری محبت کھوگئی ہے۔''

''تو محبت کی بھیک مانگ رہے ہو۔ محبت بھی کوئی کشکول میں ڈالنے کی چیز ہوتی ہے؟''

''ابھی تو تلاش ہے' کشکول پہلے دن کی طرح خالی ہے۔''

''تمہاری محبت کہاں کھوئی ہے؟''

''سب کہتے ہیں کہ یہاں کھوئی ہے' بہت سی باتوں کی خبر اوپر والا دے دیتا ہے۔ بس یہ نہیں بتاتا کہ میری محبت کہاں گئی۔ میں بھی لوگوں کو محبت کی خبر دیتا ہوں پر سنو۔'' سائیں بابا نے رازدارانہ انداز میں آواز دھیمی کر لی۔ ''کل جو لڑکی تمہارے ساتھ تھی ناں' اسے اس کی محبت نہیں مل سکتی' لیکن یہ بات اسے کہنا مت۔ ہمیں خوشیاں بانٹنی چاہئیں' غم نہیں۔''

حیدر علی کو ان کے بوڑھے وجود سے الجھن ہونے لگی تھی۔

''اپنی محبت کی تلاش میں مَیں نے کونا کونا چھان مارا۔'' سائیں بابا نے آہ بھری۔ ''بس اس چاردیواری کے اندر نہیں جھانکا' تم اجازت دو تو ایک نظر دیکھ لوں؟ شاید یہیں سے مل جائے۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اب حیدر علی میں مزید برداشت کا حوصلہ نہیں تھا۔ ''اور میں آئندہ اس گاؤں میں تمہیں ڈرامے کرتے نہ دیکھوں۔''

☆======☆======☆

یاسمین میں کوئی بھی ایسی خاص بات نہیں تھی جو رجب علی کو اس کی جانب متوجہ کر کے اپنا اسیر بنا لیتی۔ اس کی عام سی شکل وصورت' حد درجہ لجانا شرمانا اور ہر لمحے کی تابعداری سے رجب علی جلد ہی اکتا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جی جان سے خدمت کر کے شوہر کا دل جیت لے گی لیکن درحقیقت یہ اس کی خدمت اور تابعداری ہی تھی جس کی وجہ سے رجب علی اسے بیوی کے بجائے ملازمہ سمجھنے لگا تھا۔ یوں بھی رجب علی کو اس شادی سے کوئی دلچسپی تھی تو محض اتنی کہ اسے گدی کے وارث کی ضرورت تھی ورنہ یاسمین تو ایک لمحے کے لیے بھی اسے متاثر نہیں کر سکی تھی۔ اس کے پاس متاثر کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ خیر اسے اس بات کی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ جو کچھ اسے گھر میں دستیاب نہیں تھا' وہ باہر سے مل جاتا تھا۔ قیمتاً نہ مل سکے تو طاقت سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کے معمولات میں شادی کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

اس دن بھی وہ سخاوت علی کو پولو کے کھیل کے بنیادی اصول سمجھا رہا تھا جب چکی پر گندم کے دانے پسوانے کے لیے لے جانے والی لڑکیوں کا ایک گروہ کچھ فاصلے سے ہنستا ہوا گزرا۔ ان کی بے فکر ہنسی اور لہراتے آنچلوں کے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ کتنے دن ہو گئے تھے رجب علی شاہ نے ایسی ہنسی نہیں سنی تھی۔ یاسمین بہت کڑے اصولوں کے درمیان پل کر جوان ہوئی تھی۔ اسے صرف زیرلب مسکرانے کی عادت تھی۔ وہ بھی سر جھکا کر۔ اب جو فضا میں مترنم

قہقہے بکھرے تو آوازوں کے تعاقب میں اس کا سر داہنی طرف گھوم گیا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر لڑکیوں نے شرما کر منہ چھپانے کی نیم دلانہ کوشش کی اور کن اکھیوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ رجب علی نے فوراً شکورے کو طلب کیا۔

''یہ لڑکی کون ہے جس نے سرخ اور پیلے پھولوں والی اوڑھنی لے رکھی ہے؟''

''یہ جنت بی بی ہے شاہ صاحب۔'' وہ بولا۔ ''اپنے ہی مزارعے الٰہی بخش عرف بخشو کی چھوٹی بیٹی۔ چند ہی دنوں میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ جیرے پہلوان کے بیٹے کے ساتھ۔''

''اچھو کہاں ہے؟'' رجب علی نے دور ہوتی ہوئی جنت بی بی کی جانب دیکھا۔

''ابھی گندم کے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا شاید آپ نے ہی کوئی حکم دیا تھا۔''

''تم اور اچھو شام کو اس لڑکی کو ڈیرے پر پہنچا دینا۔''

''جو حکم شاہ صاحب۔''

شکورا' اچھو کی تلاش میں گندم کے کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ اچھو گھنے درخت کی چھاؤں میں چارپائی ڈالے بیٹھا مزارعوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

''میرے ساتھ چلو ایک ضروری کام ہے۔'' شکورے نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔

اچھو بغیر کچھ پوچھے اس کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دور اکیلے میں پہنچ کر شکورا رک گیا۔

''بڑے شاہ صاحب نے ایک کام دیا ہے۔''

اچھو منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اور میرے خیال میں شاہ صاحب نے یہ کام اس لیے تمہارے سپرد کیا ہے تاکہ انہیں تمہاری وفاداری کا اندازہ ہو سکے۔''

وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

''ایک لڑکی اٹھانی ہے۔''

''کیا؟'' اچھو چلایا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''اچھو تم بولنے لگے ہو؟'' شکورے کے انداز میں مسرت آمیز حیرت اتر آئی۔ ''مجھے اس بات کی کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔ ہم دونوں ہمیشہ سے دوست تھے۔ میں تمہیں کبھی بھی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا لیکن روزی روزگار کا چکر انسان سے شرافت کی وقعت چھین لیتا ہے۔''

''ہر انسان سے نہیں چھینا کرتا شکورے جس شخص کے اندر شرافت کا بیج پھوٹتا ہے وہ ہمیشہ شریف رہتا ہے۔'' اچھو بولا۔ ''خیر مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ تمہارے اندر یہ بیج یا تو تھا ہی نہیں یا پھر اُگ نہیں سکا۔''

''تم یہ سب کچھ کہہ سکتے ہو۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد تم یہ سب کہنے کے حقدار ہو لیکن میری جگہ آ کر سوچو تو شاید میں تمہیں اتنا برا دکھائی نہ دوں۔

میری چھ بہنیں ہیں جن میں سے صرف ایک کی شادی ہوئی ہے۔ باپ معذور ہے۔ اپنے گھر کے لیے جو کچھ کرنا ہے وہ مجھے کرنا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میری کیا مجبوریاں ہیں۔ اور پھر کیا ایک آرام دہ اور پُرسکون زندگی گزارنے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے؟ اور ایسی زندگی گزارنے کے لیے میں ایمانداری' دیانتداری اور اصول کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔'' شکورے نے پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدتے ہوئے کہا۔ ''بہت سے لوگ بڑے شاہ صاحب کے احکامات بجالانے کے لیے صرف اس وجہ سے ہر وقت تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ پیر صاحب کی اولاد اور گدی کے وارث ہیں لیکن میں اس لیے ان کے احکامات بجالاتا ہوں کیونکہ ان کی تعمیل میری آسودہ زندگی کی ضمانت ہے۔''

''لعنت ہو ایسی آسودہ حالی پر جو لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر کے حاصل ہو۔'' اچھو نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

''نہ اچھو نہ۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا۔'' شکورا بولا۔ ''میرے اندر شرافت کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے' کسی وقت میں تمہاری یہ باتیں بڑے شاہ صاحب کو بتا کر اپنے لیے کچھ اور آسودہ حالی خرید لوں۔''

اچھو نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔

''بہت خوب۔ ضرور کرو ایسا۔ صرف یہ بتا دو کہ اب سے پہلے کتنی مرتبہ رجب علی کی یہی خدمت کر چکے ہو۔''

''بہت مرتبہ۔ مگر اس گاؤں میں یہ دوسری مرتبہ ہوگی۔''

''یہ بتاؤ کہ جو لڑکی اٹھانے لگے ہو وہ تمہارے گھر سے کتنی دور رہتی ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' شکورا چلایا۔ ''میرے گھر کی بات زبان پر لائے تو زبان کو گدی سے باہر کھینچ لوں گا۔''

''چلاتے کیوں ہو دوست۔ میرا تمہارے گھر کا رخ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ رجب علی شاہ کو وہاں تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔''

''میں کہتا ہوں بکواس بند کرو ورنہ۔'' شکورے نے اچھو کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اچھو نے اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ لی۔

''ابھی دنیا میں کوئی ایسا ہاتھ نہیں ہے جو اچھو کے گریبان تک پہنچ سکے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے شکورے کی کلائی چھوڑ دی۔

شکورے نے جھک کر درخت کے تنے سے پشت ٹکالی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔'' اچھو نے رحم بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''تم سا بدقسمت بھی کون ہوگا۔''

شکورا تنے سے ٹیک لگائے لگائے ہی نیچے بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ میری مثال اس کتے کی سی ہے جو مالک کے حکم پر صرف اس لیے دوڑا بھاگا پھرتا ہے کہ انعام میں اسے راتب ملے گا لیکن یہ بات میں خود سے بھی نہیں کہنا چاہتا۔'' وہ بہت مدھم آواز میں بولا۔

''تم خود سے یہ بات کہو یا نہ کہو لیکن تم یہ بات جانتے ہو۔'' اچھو بولا۔

''میں اس دلدل سے صرف اس لیے نہیں نکلنا چاہتا کہ میری بہنیں محفوظ ہیں۔ پہلے وہ آزاد فضاؤں میں تتلیوں کی طرح اُڑتی پھرتی تھیں لیکن رجب علی شاہ کی نیت کا بھید جاننے کے بعد میں نے انہیں گھر میں قید کر دیا ہے نہ وہ کہیں آتی ہیں اور نہ کہیں جاتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خوب سارا پیسہ جمع کر کے انہیں یہاں سے کہیں دور لے جاؤں جہاں ایک مرتبہ پھر وہ تتلیوں کی طرح اُڑنے لگیں۔ اگر میں رجب علی شاہ کے ساتھ نہ ہوتا تو بے خبری میں یہ قیامت کسی دن میرے گھر بھی ٹوٹ سکتی تھی۔''

''تم نے سمجھ لیا کہ اب وہ محفوظ ہو گئی ہیں؟ نہیں شکورے آزادی امتحان ہے تو قید آزمائش۔ اپنی بہنوں کو اس طرح قید مت کرو کہ وہ جال لے کر ہی اُڑ جائیں۔''

شکورا چند لمحے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''نہیں وہ اپنے گھر کی محبت کی ڈور میں ایسی بندھی ہوئی ہیں کہ وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔''

''ہر بھائی کو اپنی بہن پر ایسا ہی مان ہوتا ہے۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ قید کی اذیت کے رنگ کیسے ہوتے ہیں۔''

''مجھے خود خبر نہیں ہوتی کہ میں کب انسان سے شیطان بن جاتا ہوں۔ برائی کب اچھائی پر اس طرح غالب آ جاتی ہے کہ انسانیت کی کوئی رمق میرے اندر باقی نہیں رہتی۔''

''تم میں انسانیت باقی ہے تب ہی تو تم یہ سب باتیں سوچ رہے ہو۔''

''نہیں اچھو۔'' اس کی آنکھوں سے بوجھل بوجھل سا خالی پن غائب ہو گیا اور اس کی جگہ یکائگی اور لاتعلقی نے لے لی۔ ''میں نے زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے مجھے اپنے لیے نہیں اپنوں کے لیے زندہ رہنا ہے اور رجب علی شاہ غلطیوں کی معافی دے سکتا ہے' حکم عدولی کی ہرگز نہیں۔''

''اپنی بزدلی کو مجبوری کے کپڑوں سے مت ڈھانپو۔'' اچھو نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔

''تم یہ بات نہیں سمجھو گے کیونکہ تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ نہ بہن' نہ بیوی' نہ

محبوبہ' جذباتی رشتوں کی ڈور میں بندھ کر انسان بہت کمزور ہو جاتا ہے۔''

اچھوایک لمحے کے لیے زیب النساء کے تصور میں گم ہو گیا۔ وہ روشن چہرہ اور چند الفاظ اس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ شکورا مسلسل کچھ کہہ رہا تھا لیکن اچھو کا ذہن جنگل میں گزرے ان لمحات میں اٹکا ہوا تھا۔ جب پہلی مرتبہ محبت کی کلی اس کے دل میں چٹکی تھی۔

''اور مجھے بہر حال زندہ رہنا ہے۔'' اچھو اپنے خیالات سے باہر نکلا تو شکورے کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ ''تمہیں زندہ رہنے کا شوق ہو تو شام کو آ جانا ورنہ بڑی سڑک پر سہ پہر تین بجے لاری رکتی ہے۔ اس میں بیٹھ کر گاؤں سے بہت دور چلے جانا۔''

''ہوں۔'' اچھو نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''لڑکی کون سی اٹھانی ہے؟''

''اس کا علم تمہیں شام کے وقت ہو جائے گا۔''

''ابھی کیوں نہیں؟''

''میں تم پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتا۔ تم تو اپنی جان سے جاؤ گے' میں خواہ مخواہ ہی مارا جاؤں گا۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ زندہ رہنے کا مجھے بھی شوق ہے اور بھاگ کر میں کہاں جاؤں گا۔ میرے ماں باپ یہاں ہیں۔ انہیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔'' اچھو نے اس سے لڑکی کا نام اگلوانے کے لیے بات بنائی۔

''بہر حال یہ تفصیلات تمہیں شام کو ہی ملیں گی۔'' شکورا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ پہلی لڑکی کون تھی؟'' اچھو نے جلدی سے پوچھا۔

''پہلی لڑکی نسیم تھی۔'' وہ بولا۔ ''اور یہ میں تمہیں محض اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ تم پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ مڑا اور بغیر کوئی بات کیے ایک سمت چل پڑا۔

''بہت برا ہوا۔'' اچھو نے دل میں سوچا۔ ''میں نے ایسی بات شروع کر دی کہ وہ لڑکی کا نام بتانے سے ہی مکر گیا۔ اگر میں تدبیر سے کام لیتا تو اس لڑکی کی مدد کر سکتا تھا پر اب کیا کروں۔'' وہ سوچے گیا پھر اٹھ کر مسجد کی سمت چل پڑا۔

اچھو کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھ کر مولوی صاحب کو خیال آیا کہ شاید تعویذوں کے اثر کی وجہ سے وہ راہِ راست آ گیا ہے اس لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوئے۔

''مجھے یقین تھا کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گے۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔

''مولوی صاحب حقیقت تو یہ ہے کہ میں آپ کے پاس اس لیے نہیں آیا کہ مجھے پچھلی باتوں پر کوئی شرمندگی ہے یا میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔'' وہ بولا۔ ''میں صرف اس

لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ گاؤں کی ہر بیٹی کی عزت کی حفاظت ہم پر فرض ہے اور کم از کم کسی ایک بیٹی کی عزت پر حرف آنے والا ہے۔ اس سلسلے میں صرف آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔''

مولوی صاحب پہلے تو اس کی بات سن کر سٹپٹائے پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''پتا نہیں آپ میری بات پر کس حد تک یقین کریں گے لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' وہ حرف بحرف سچ ہے۔''

''اب کچھ بتاؤ بھی کہ بات کیا ہے۔''

''مجھے بہت باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ آج شام گاؤں کی کوئی لڑکی اغوا ہونے والی ہے۔''

''کیا؟ اغوا ہونے والی ہے؟ تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟''

''میں بالکل اپنے حواسوں میں ہوں اور اپنی معلومات کی حد تک بالکل درست اطلاع پہنچا رہا ہوں۔''

''کون ہے وہ لڑکی اور کون اغوا کرنا چاہتا ہے؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''افسوس کہ مجھے لڑکی کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن اغوا کرنے والے کا نام میں جانتا ہوں۔''

''تب کیا فائدہ۔'' مولوی صاحب کی آواز میں مایوسی اتر آئی۔ ''اس طرح تو شاید ہم بروقت اس لڑکی کی مدد نہ کر سکیں۔''

''لیکن ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اغوا کرانے والا اور کرنے والا کون ہے۔ ان کی نگرانی کر کے جرم کرنے والوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکتا ہے۔'' اچھو نے جلدی سے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' مولوی صاحب نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔ ''اغوا کرنے والا کون ہے؟''

''اس کام کے لیے مجھے اور شکورے کو کہا گیا ہے۔''

''کیا؟ تم لڑکی کو اغوا کرو گے؟''

''مولوی صاحب میری بات تو سن لیں۔'' اچھو نے ان کی بات کاٹی۔ ''یہ اغوا ہم اپنے لیے نہیں کر رہے بلکہ کسی اور نے اس کام کے لیے ہم سے کہا ہے۔''

''کون ہے وہ بدبخت؟'' مولوی صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''پتا نہیں آپ میری بات کا یقین کریں گے یا نہیں لیکن مولوی صاحب یہ حکم ہمیں رجب علی شاہ نے دیا ہے۔ اس سے پہلے اس نے نسیم کو بھی اغوا کرایا تھا۔''

''کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ بڑے شاہ صاحب پر ایسا گھٹیا الزام لگاتے ہوئے تمہیں

شرم بھی نہیں آئی۔ وہ بھی اس مسجد کے اندر بیٹھ کر۔ انسان کو اپنی کمینگی میں اس حد تک نہیں جانا چاہیے کہ وہ کسی کے اجلے دامن پر بغیر سوچے سمجھے کیچڑ ملنے لگے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے گھر میں نہ ہوتے تو میں دھکے دلوا کر باہر نکال دیتا۔"

"میری بات تو سنیں مولوی صاحب۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ تمہارے وجود سے گھن آنے لگی ہے مجھے۔"

"ٹھیک ہے۔" اچھو اپنا غصہ دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جا رہا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر یہ واقعہ پیش آ گیا تو اس کا ذمہ دار صرف رجب علی شاہ ہی نہیں آپ بھی ہوں گے۔"

اچھو لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ شام کا انتظار کرتا اور اس وقت براہِ راست مقابلہ کر کے لڑکی کو بچانے کی کوشش کرتا۔

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹ کر چھت کی طرف تکتے ہوئے زیب النساء کی آنکھوں میں بیتے لمحے اتر آئے۔ ہلکی سی چٹکی ہوئی چاندنی میں درختوں کے سیاہ سائے اور ایک بے حد مضبوط ہاتھ کا لمس۔ اس کا ہاتھ خود بخود اپنے بازو پر جا ٹھہرا۔ ہولے ہولے اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے وہ اچھو کے متعلق ہی سوچے گئی۔

"کیا ہمارے مقدر میں ملن کے وہ چند ہی لمحات تھے جو ایک دم ہتھیلی سے پھسل گئے۔" اس نے سوچا۔ "کیا اب ہم کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے؟"

کتنی دیر تک وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی چھت کی کڑیاں گنتی رہی پھر اچانک ایک خیال سے چونک اٹھی۔

علی نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ اگر ہم پکنک کے لیے چلے جائیں تو ممکن ہے' ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اس خیال نے ہی اس کے اندر توانائی بھر دی۔ تیزی سے وہ مہر النساء کے کمرے کی طرف بڑھی۔

مہر النساء' حمیدہ کو اپنی قمیص پر شیشوں کے کام والا گلا کاڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی جب زیب النساء اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپا' مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔"

مہر النساء نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر جوش و خروش کی علامات بہت واضح تھیں۔

"آؤ بیٹھو۔" مہر النساء نے کہا۔

"حمیدہ تم باہر جاؤ۔" وہ وہیں پیڑھے پر بیٹھ گئی۔

"حمیدہ کو باہر بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر بات سے باخبر ہے۔"

"یعنی آپ نے اسے۔" اس نے اٹکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یقین کرو' حمیدہ کوئی بات باہر نہیں نکالے گی۔" مہر النساء نے اسے یقین دلایا۔ "اسے راز کو راز رکھنا آتا ہے۔"

"بی بی میں تو آپ کے پاؤں کی خاک ہوں۔" حمیدہ سوئی دھاگا چھوڑ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ "آپ یوں سمجھیں کہ بڑی بی بی نے آپ کی بات کنویں میں ڈال دی ہے۔ انہوں نے تو اس لیے مجھے بتایا ہے کہ شاید میں آپ کے کام ہی آ جاؤں۔"

زیب النساء نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا لیکن اس کے چہرے پر سچائی ہی سچائی پھیلی ہوئی تھی۔

"تم میری کیا مدد کرو گی۔" زیب النساء نے کریدا۔

"میری تو چھوٹی سی عقل ہے بی بی۔ مجھے خود سے کچھ نہیں سوجھتا۔ ہاں جیسے آپ کہیں گی ایسے ہی کر گزروں گی۔"

"میں سوچ رہی تھی آپا۔" اس نے حمیدہ کو نظر انداز کر دیا۔ "کہ علی نے پکنک پر چلنے کو کہا تھا۔ میں گھر سے باہر نکلوں گی تو شاید کوئی صورت نکل ہی آئے۔"

"چند ہی دنوں میں تم اچھی خاصی احمق ہو گئی ہو۔" مہر النساء جھلائی۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ ادھر تم پکنک پر چلنے کے لیے کہو گی اور اُدھر علی تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں لے جائے گا۔"

"علی اپنی بات ضرور منوا لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگ جائے لیکن اتنا زیادہ بھی حال نہیں لگے گا کہ سب کچھ ہی ختم ہو جائے۔" وہ اپنی بات پر ہی مصر تھی۔

"خدایا۔ خدایا۔" مہر النساء نے جھلا کر کہا۔ "جانتی ہو علی خود بابا جان کے عتاب کا شکار ہو رہا ہے۔ اس وقت تو وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو تمہارے لیے کیا کرے گا۔ جانتی ہو' بابا جان اس سے کس قدر ناراض ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس گھر کے مکینوں کا کیا بنے گا۔" زیب النساء نے ہونٹ کاٹ لیے۔

"اس گھر؟ یہ گھر لگتا ہے تمہیں؟ یہ گھر نہیں حویلی ہے۔ پیر صاحب جلال الدین شاہ کی حویلی جس کے دروازوں پر لگے تالے آہ و فغاں کی چابی سے نہیں کھلتے۔" مہر النساء کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

"مجھے نہیں پتا کہ پاگل ہونے یا خودکشی کرنے میں مجھے کتنا عرصہ لگے گا۔" زیب النساء کے انداز میں غصہ تھا جسے چھپانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"کیا پھوپھو کے ساتھ بھی یہی بیتا ہوگا؟" مہر النساء نے یوں ہولے سے کہا جیسے اسے

دیواروں کے سن لینے کا خدشہ ہو۔

زیب النساء نے آنکھیں موند کر پیڑھے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

حمیدہ کو ایک دم ان دونوں پر ڈھیر سارا ترس آ گیا۔

''بی بی کسی خدمت کا مجھے بھی موقع دیں۔'' اس نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''تم کچھ نہیں کر سکتیں حمیدہ۔'' زیب النساء نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''کرنے کو تو میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔''

''مثلاً؟'' اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''مثلاً؟'' حمیدہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔ ''میں اچھو بھائی تک آپ کا پیغام پہنچا سکتی ہوں اور......'' وہ جھجک کر رک گئی۔

''اور کیا؟'' زیب النساء نے اپنی بے تابی چھپانے کی کوشش کی۔

''اور۔'' حمیدہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور جھجکتے ہوئے بہت آہستگی سے بولی۔ ''اور رات کو حویلی کا دروازہ بھی کھول سکتی ہوں۔''

زیب النساء کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ایک ٹک حمیدہ کو دیکھے گئی۔

''بی بی اگر میں نے کچھ غلط کہا ہے تو مجھے معاف کر دیں۔'' اس کی خاموشی سے گھبرا کر حمیدہ نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''میری چھوٹی سی عقل ہے۔ مجھے بات کرنی ہی نہیں آتی لیکن بی بی میری نیت بالکل صاف ہے۔''

''ہوں۔'' زیب النساء سوچ میں ڈوب گئی۔

''نہیں حمیدہ! اتنا آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مہر النساء نے اس کی تجویز رد کر دی۔ ''یہ زندگی ہے' کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کے حویلی میں داخل ہونے یا زیب النساء کے حویلی سے باہر نکلنے کا مطلب جانتی ہو؟ بڑے بھائی جان یا بابا جان کو خبر ہوئی تو سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی بی بی! میں تو حکم کی غلام ہوں۔ اس بات کی گناہ گار ضرور ہوں کہ مجھ سے بی بی کے اتنے پیارے چہرے کے اوپر چھائی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ آپ لوگوں سے ایسا پیار ہے میرے دل کے اندر کہ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے لیکن آپ لوگوں کو کچھ ہو جائے حمیدہ کو گوارا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے حمیدہ تم میرا پیغام اس تک پہنچا دینا۔'' زیب النساء کی آنکھوں میں اب تک سوچ کے دائرے موجود تھے۔

تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ مہر النساء نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ ''اگر وہ ہمارے برابر یا ہماری

ذات برادری کا ہوتا تب بھی تمہیں معافی ملنا مشکل تھی اور ایک ایسے شخص کے ساتھ تمہارے تعلقات کا انکشاف ہونے کے بعد کیا ہوگا' تم اس سے ناواقف تو نہیں ہو۔''

''ہاں میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ ذات برادری کے ایک ہونے یا نہ ہونے سے فرق تو اس جگہ پڑتا ہے جہاں شادی ہو جانے کی کوئی صورت ہو۔ یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں' اس لیے ہر صورت میں انجام ایک سا ہی ہوگا اور اس انجام کے لیے میں خود کو تیار کر چکی ہوں۔

مرنا تو ہے ہی' پھر اس منحوس چار دیواری میں اپنی حسرتوں کی چادر اوڑھ کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر نہیں ہے کہ ان بے معنی اور لغو روایتوں کے خلاف علم بلند کر کے مرا جائے۔ یہاں سے باہر نکل کر خوشیاں پا لینے کی کم از کم ایک موہوم سی امید تو ہے لیکن کرب و اذیت کے غبار میں لپٹی ان اینٹوں کے حصار میں تو خوشیاں حاصل کرنے کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔ پھر کیوں نہ میں ایک ایسی جگہ کی طرف جاؤں جہاں حاصل چاہے کچھ نہ ہو' حصول کی امید تو ہے۔''

''خیالی پلاؤ پکانا' لفظوں کی کھیر میں چمچ مارتے رہنا بہت آسان ہوتا ہے زیبی۔'' مہر النساء بولی۔ ''دعوے تو بہت لوگ کر سکتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر ان پر عمل کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔''

''تم مجھے ہر کسی کی فہرست میں شامل کر رہی ہو؟''

''تمہیں نہ کروں تو بھی وہ شخص تو اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے ناں۔''

''آپا ایک بات بتائیں۔ آپ مردوں کو اتنا ناقابلِ اعتبار کیوں سمجھتی ہیں۔'' زیب النساء کے انداز میں کاٹ تھی۔ واضح طور پر اسے اچھو کے متعلق مہر النساء کے خیالات سن کر دکھ ہوا تھا۔

''تم ناقابلِ اعتبار ہونے کی بات کرتی ہو۔ مجھے مردوں سے نفرت ہے۔'' مہر النساء کے چہرے پر بھی نفرت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

''اس لیے کہ آج تک کسی مرد نے آپ کو پسند نہیں کیا؟'' وہ شاید مہر النساء کے وجود کو اندر تک کاٹ دینے پر تلی ہوئی تھی۔

''شاید۔'' اس نے بہت صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ ''لیکن وجہ صرف یہ بھی نہیں ہے۔''

''اور کیا وجوہات ہیں؟''

''اور۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''مرد میں دوغلا پن ہوتا ہے۔ اس کے ایک نہیں دو روپ ہوتے ہیں۔ چاندی کے سکے کی طرح دنیا اور معاشرے کے تھپیڑے اسے اچھالتے ہیں تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ہتھیلی پر کون سا سرا اوپر آئے گا اور مجھے دوغلے پن سے نفرت ہے۔ اس کے روپ بدلتے ہیں۔ دنیا کے سامنے اور گھر کی چار دیواری کے اندر اور اپنے لیے اور دوسروں کے

لیے اور۔

وہ باقی ساری مخلوق کو غلام بنا کر اپنے قدموں تلے رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے غصہ کر کے اور آنکھیں نکال کر غلام بنا لے چاہے محبت سے رام کرے لیکن بنا تا وہ غلام ہی ہے دوست نہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔" زیب النساء نے اس کی بات کاٹنے کی کوشش کی۔

"ہر مرد کی خصلت ایک ہی ہوتی ہے۔ نشانہ ایک ہی ہوتا ہے۔ منزل ایک ہی ہوتی ہے۔ صرف وہاں تک پہنچنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔" مہر النساء نے اسے زیادہ بات نہیں کرنے دی اور فوراً ہی بولی۔ "کیا ہماری اماں جان کو اتنا حق بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی اولاد کا نام اپنی پسند سے رکھ سکتیں؟ وہ میرا نام نرگس رکھنا چاہتی تھیں لیکن بابا جان بھڑک اٹھے تھے۔ کہنے لگے یہ کیسا نام ہے۔ یہ تو ایک فلمی اداکارہ کا نام ہے۔ ہماری بیٹی کا ایسا نام ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اماں بے چاری چپکی رہ گئیں۔

اور پھر یاسمین کو دیکھ لو کتنا آگے پیچھے پھرتی ہے بڑے بھائی جان کے۔ ان کی آنکھ کے اشارے کی منتظر رہتی ہے۔ ان کے ماتھے کی شکنیں دیکھ کر اس کا رنگ اتر جاتا ہے۔ ہونہہ ایسے ملاپ کی تمنا میں انسان پاگل ہو جائے۔ اس کے لیے برسوں انتظار کرے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ ہماری یہ بے رونق اور بے رنگ زندگی زیادہ بہتر ہے۔ کیا ضرورت ہے دنیا میں مزید آقا اور غلام زادیاں پھیلانے کی نہ۔"

"مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے آپا کہ آپ مایوسی کی آخری حدوں کو چھونے لگی ہیں لیکن میں اس حد تک نا امید نہیں ہوئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ایک ایسے سہارے کے لیے تڑپ رہی ہوں جو مجھے نہ تو بابا جان دے سکتے ہیں اور نہ تین جوان بھائی۔ میں اس اولاد کے لیے تڑپ رہی ہوں جسے میری کوکھ سے جنم لینا ہے اور آپا میں مایوس نہیں ہوں۔"

"زیبی تم حماقت پر اتر آئی ہو۔"

"لیکن مجھے اس پر افسوس نہیں ہے۔"

حمیدہ ٹکر ٹکر دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"حمیدہ۔" زیب النساء نے اسے مخاطب کیا۔ "تم میرا زبانی پیغام ان تک پہنچا دو گی۔"

"آپ حکم دیں بی بی۔"

"تم ان سے کہنا کہ۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ "میں نے ان کے دل کی دھڑکن سن لی تھی۔ کیا انہوں نے میرے دل کی دھڑکن نہیں سنی؟ اگر سن لی ہے تو انہوں نے دیواریں ڈھا کیوں نہیں دیں۔ کوئی روزن کوئی دریچہ کیوں نہیں تلاش کر لیا؟"

☆======☆======☆

اچھو صحن میں چارپائی ڈالے آسمان کو تک رہا تھا جب حمیدہ گھر میں داخل ہوئی۔

"سلام چاچی۔" اس نے باآواز بلند چاول چنتی اچھو کی اماں کو سلام کیا۔

"جیتی رہ۔" اس نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی حمیدہ کی طرف دیکھا۔ "آج حویلی نہیں گئی کیا؟"

"نہیں۔" اس کا انداز سرسری سا تھا۔ "گئی تو تھی پر چھوٹی بی بی نے کام سے بھجوایا ہے۔"

اچھو کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی نظریں اب تک نیلے آسمان پر جمی ہوئی تھیں لیکن کان حمیدہ اور اماں کی باتوں پر لگ گئے تھے۔

"اچھا۔" اماں بولیں۔ "کیا کام دیا چھوٹی بی بی نے؟"

"ایک پیغام بھجوایا ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے اچھو کی طرف دیکھا۔

"پیغام؟ کس کے لیے؟"

"ہے ایک لڑکی۔ وہی اپنی شمشاد وہ کچھ کپڑے اپنے گھر لے گئی تھی کڑھائی کے لیے۔ بی بی بار بار تاکید کرواتی ہیں کہ کسی کے سامنے کپڑے لے کر نہ بیٹھ جائے۔ ذرا احتیاط کرے۔ کسی اور کی نظر نہ پڑے کپڑوں پر۔"

"تو گھر کیوں لے گئی کپڑے۔ اسے پتا نہیں ہے کہ بی بیوں کے کپڑوں پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہیے۔"

"تمہیں تو پتا ہی ہے چاچی کہ شمشاد کتنی محتاط ہے اور پھر کسی کی اتنی جرأت کہاں کہ اس کمرے میں داخل ہو جہاں ان کے کپڑوں کی سلائی کڑھائی ہو رہی ہو۔"

"اچھا جانے دے' یہ بتا یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"بس چاچی' چلتے چلتے تھک گئی تھی' سوچا ذرا دم لینے کو رک جاؤں۔" اس نے پھر کن اکھیوں سے اچھو کی طرف دیکھا۔ اتفاق سے اسی لمحے اچھو بھی کن اکھیوں سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے میں وہ سمجھ گیا کہ حمیدہ دراصل اس کے لیے پیغام لائی ہے۔

"کسی ترکیب سے اماں کو یہاں سے اٹھانا چاہیے۔" اچھو نے سوچا۔ "اگر میں درست سوچ رہا ہوں تو ماں کے جاتے ہی حمیدہ اصل بات بتا دے گی۔"

"لائیں چاچی! میں چاول چن دوں۔"

"اللہ عمر دراز کرے۔" انہوں نے چاولوں کا چھابہ اسے تھما دیا۔ "یہ صاف کر دے میری بٹی۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں فقیر دین کی طرف سے ہو کر آئی۔ اس کی بیٹی کے گھر بیٹا ہوا ہے۔ کیا کروں میرا تو بس کہیں نکلنا بھی مشکل ہے۔ اس گھر میں مجھ اکیلی جان کے اوپر اتنے کام ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی بہو آ کر گھر سنبھال لے۔ سارا کام اکیلے کرنا پڑتا ہے۔ کہیں جانا اور آنا جانا بھی نہیں ہو سکتا۔"

اگلے دس منٹ تک اماں بہو نہ ہونے کے نقصانات گنواتی رہیں اور حمیدہ سر جھکا کر ہولے ہولے چاول چنتی رہی اچھو کے دل کی کلی بھی کھل اٹھی تھی۔ ابھی اس نے دعا مانگی بھی نہیں تھی کہ پوری ہوگئی۔ پھر بھی اماں کے شک وشبے سے بچنے کے لیے اس نے ان کے پیچھے زور سے آواز لگائی۔

"اماں جلدی آنا۔"

"تم باپ بیٹے کا بس چلے تو میرے پاؤں میں زنجیر باندھ کر ہانڈی چولہے اور جھاڑو پوچے کے لیے رکھ لو مجھے۔ میرے چچازاد بھائی کے سالے کی بیٹی کے گھر بیٹا ہوا ہے وہ بھی آٹھ بیٹیوں کے بعد۔ پورے دس دن ہوگئے ہیں کاکے کو پیدا ہوئے۔ تم لوگوں کی وجہ سے میں جا کر مبارکباد بھی نہیں دے سکی۔

ابھی نکلی بھی نہیں کہ پیچھے سے آوازیں پڑنے لگیں۔ تم لوگ تو برادری میں میری ناک کٹوانے پر تل گئے ہو۔ سب کہتے ہوں گے کہ نور بھری دینے دلانے سے ڈرتی ہے۔ میں کس کے آگے رونا روؤں کہ نور بھری کا دل بہت بڑا ہے لیکن یہ جو دو جونکیں میری جان کو چمٹی ہیں' ان سے نجات ملے گی تو کہیں آ جا سکوں گی۔

بہو ہوتی تو سو کام سنبھال لیتی لیکن اپنی قسمت میں بہو کا سکھ نہیں لکھا ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ملک الموت آئے گا تو اس سے بھی اجازت لینی پڑے گی کہ ان دونوں لاڈلوں کے لیے ہفتہ دس دن کی روٹی پکا کر رکھ جاؤں پھر جان لے لینا میری۔"

ماں جانے کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اپنے دل کا غبار بھی نکال رہی تھی۔

اچھو اور حمیدہ نے اسے دوبارہ چھیڑنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس کا انجام خاصہ پریشان کن بھی ہوسکتا ہے۔

ماں کے جانے کے بعد اچھو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ہتھیلیوں پر سنسنی محسوس ہونے لگی۔ حمیدہ چپ چاپ اپنے کام میں مگن تھی۔ جب اچھو کے لیے خاموشی ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو حمیدہ نے سر اٹھا کر پہلے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر قدرے مطمئن ہو کر اسے پکارا۔

"کیا ہے؟" وہ بظاہر بے نیاز بنا پڑا رہا۔

"بڑے شاہ صاحب کی مہندی پر چھوٹی بی بی کو آپ لے کر گئے تھے۔"

"گویا میرا خیال درست تھا۔" اس نے سوچا پھر باآواز بلند کہا۔ "ہاں تو؟"

"وہ۔" وہ جھجک گئی۔ "بہت اچھی ہیں چھوٹی بی بی۔"

"پھر؟" اس کی ظاہری بے نیازی ویسے ہی قائم تھی۔

"ایک کے علاوہ کبھی کسی غیر محرم مرد نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔" وہ ویسے ہی آہستگی سے بولی۔

"تو کہنا کیا چاہتی ہے؟" اچھو نے مدافعانہ انداز اختیار کیا۔

"پتا نہیں وہ ٹھیک سمجھ رہی ہیں یا غلط" وہ تذبذب میں تھی۔ "آپ جو اتنا غصے میں بول رہے ہیں' اس سے شک پڑتا ہے کہ ان کا خیال غلط ہی ہوگا۔"

"ارے میں غصے میں کب ہوں۔" اس نے جلدی سے دانت نکالے۔ "میں تو بہت خوش ہوں۔ یہ دیکھو ہی ہی ہی۔" اس نے ہنس کر دکھانے کی بھونڈی سی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حمیدہ گھبرا کر پیغام دیئے بغیر چلی جائے اور حمیدہ اس انتظار میں تھی کہ پہلے اچھو کوئی ایسی بات کرے جس سے اسے یہ تسلی ہو جائے کہ وہ بھی زیب النساء کو پسند کرتا ہے۔ مہر النساء نے اس بات کو خاص طور پر تاکید کی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ اچھو بھی زیب النساء کے لیے اسی انداز میں سوچ رہا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ زیب النساء کو وہم ہوا تھا اور ایسا پیغام اس کی شرمندگی اور شاید موت کا باعث بھی بن سکتا تھا۔

"اچھا چاچی کتنی دیر میں واپس آ جائیں گی۔"

اس کی بات سن کر اچھو کو شدت سے احساس ہوا کہ وقت پر لگا کر اُڑ رہا ہے۔ ماں کسی بھی لمحے پہنچنے والی ہوں گی۔

"مجھے بھلا کس بات کا خوف۔" اس نے خود سے کہا۔ "میں براہِ راست پوچھ لیتا ہوں۔" وہ اٹھ بیٹھا۔

"تمہاری چھوٹی بی بی نے کیا صرف شمشاد کے لیے ہی پیغام بھجوایا ہے یا میرے لیے بھی کچھ کہا ہے۔"

حمیدہ کے ہاتھ رک گئے۔

"شی آہستہ۔" اس کا ہاتھ بے اختیار ہونٹوں پر جم گیا۔

اچھو کو یقین ہوگیا کہ اس کے نام بھی یقیناً کوئی پیغام دیا گیا ہے۔

"جلدی بولو۔ ماں آنے والی ہیں۔"

حمیدہ نے جلدی جلدی تمام بات اسے بتا دی۔

"ہوں۔" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

"چھوٹی بی بی سے کہنا۔" بالآخر اس نے کہا۔ "کہ جذبے اپنا آپ منوا ہی لیتے ہیں اور میرے جذبے تو پہاڑ کو ریزہ ریزہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ حویلی کیا چیز ہے۔ میں جو خاموش تھا تو صرف اس لیے کہ میرے آگے بڑھنے سے ان کی عزت پر حرف آ سکتا ہے اور یہ مجھے گوارا نہیں۔"

☆======☆======☆

"اس سے کہنا کہ عزت دور رکھ کر پوجنے میں نہیں ہوتی اپنا بنا لینے یا کسی کا ہو جانے میں

اصل عزت ہوتی ہے یوں بھی یہ لفظ ''عزت'' تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ وجود کو اندر ہی اندر کاٹتا چلا جاتا ہے۔

حالانکہ عزت کو بھی محبت کی طرح خودرو پھول ہونا چاہیے تھا لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ اسے ہمارے اندر سے پھوٹنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ پہلے ہی ایک خول بنا کر ہمیں اس کے اندر بند کر دیا گیا ہے اور جو چیز وجود کے اندر سے توانائی حاصل نہ کرے' اسے مصنوعی طریقے سے قائم رکھتے رکھتے ہاتھ تھک جاتے ہیں اور جی چاہنے لگتا ہے کہ اسے تہس نہس کر دیا جائے۔

اس سے کہنا کہ میں یہ بیرونی سانچہ توڑ کر عزت اور محبت دونوں کو اپنے وجود کے اندر اُگانا چاہتی ہوں۔''

☆======☆======☆

شام ہو چلی تھی لیکن اچھو کا ذہن صبح کے واقعے سے ہٹ کر زیب النساء کی طرف چلا آیا تھا۔ ایک عجیب سرشاری کی کیفیت طاری تھی اس پر۔ صبح سے حمیدہ دو پیغام لا چکی تھی۔ اس نے یہ پیغام بھی بہت واضح طور پر دیا تھا کہ وہ ان کی ملاقات کا بندوبست کروا سکتی ہے۔

''کیا آج رات ممکن ہے؟'' اس نے امید سے پوچھا تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گی۔ اب یہ نہیں کہہ سکتی کہ بی بی بھی آج رات ملاقات کے لیے راضی ہوں گی یا نہیں؟''

''تم کوشش کرو' بی بی راضی ہو جائیں گی۔''

اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

''کاش اس وقت راجہ ہوتا' میں سب سے پہلے یہ خوش خبری اسے سناتا۔'' اس نے کہا۔

''ایک وہی تو ہے جو میری خوشیوں میں خوش ہوتا ہے۔ خیر اب بھی وہ زیادہ دور تو نہیں ہے۔''

وہ حویلی کی سمت چل پڑا۔

☆======☆======☆

''بی بی مجھے تو یہ آپ کی محبت کا معجزہ لگتا ہے کہ اچھو بھائی کو زبان واپس مل گئی ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ ان سے اشاروں کی زبان میں بات کرنی پڑے گی۔'' حمیدہ' زیب النساء کی ٹانگیں دباتے ہوئے تبصرہ کر رہی تھی۔

''کیا وہ ہمیشہ سے بات چیت نہیں کر سکتے تھے؟''

''نہیں بی بی۔ ایسا اب سے کچھ عرصہ قبل ہوا تھا لیکن چھوڑیں اس بات کو۔ اس میں کیا رکھا ہے۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ رات کو کون سا راستہ استعمال کیا جائے۔'' زیب النساء نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ دیا لیکن انہیں کیسے خبر ہوگی میری موجودگی کی۔''

''یہ بھی آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ انہیں میں نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا لیکن یہ سوچ کر چپ رہی کہ آپ کی مرضی کے بغیر کیسے بتاؤں؟''

''اب سب کام چھوڑ کر پہلے انہیں جگہ بتا آؤ۔''

''جی اچھا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

زیب النساء کے کمرے سے نکلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ اچھو کے گھر گئی تو اس کی ماں کو شک ہونا یقینی ہے لیکن یہ کام ایسا نہیں تھا کہ کسی اور کے سپرد کیا جا سکتا۔ دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اس کے گھر کی سمت بڑھ رہی تھی کہ سامنے سے اچھو آتا دکھائی دیا۔

''واہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے میری سن لی۔'' اچھو کو آتے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔

کھیتوں کے درمیان ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان بھی نہیں تھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' اچھو نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''آپ کی طرف ہی آ رہی تھی۔'' وہ بولی۔

''کیا بی بی نے کوئی پیغام دیا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔

''ہوں۔'' حمیدہ کو اچھو کی آنکھوں کی چمک بہت بھلی لگی تھی۔

''ملنے کو کہا ہے؟'' آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔

''ہوں۔'' وہ بولی۔ ''آپ جلدی میں نہ ہوں تو میں آپ کو جگہ بتا دوں۔''

چند لمحوں کے لیے اچھو سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہی شکورے نے اسے حویلی کے پھاٹک کے باہر بلایا تھا۔ اس کا پیغام ملتے ہی اسے صبح کا واقعہ یاد آ گیا تھا اور وہ سب کام چھوڑ کر حویلی کی طرف چل پڑا تھا۔

اب حمیدہ کی بات نے اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک طرف اخلاقی فرض تھا اور دوسری طرف اس کی محبت کی پہلی بہار۔ یہ طے تھا کہ اگر وہ اغوا ہونے والی لڑکی کو بچانے کی کوشش کرتا تو شاید وہ لڑکی تو بچ جاتی لیکن خود اس کا بچنا ناممکن تھا۔ دوسری طرف زیب النساء اس کے حواسوں پر چھائی جا رہی تھی۔

''کس سوچ میں پڑ گئے؟'' حمیدہ بولی۔ ''ڈر رہے ہیں کیا؟ آپ مرد ہو کر ڈر رہے ہیں اور بی بی عورت ہو کر بھی نہیں ڈرتیں۔''

''میں نہ تو ڈر رہا ہوں اور نہ خوفزدہ ہوں۔ قدرت نے ایک عجیب معمے میں پھنسا دیا ہے۔ سوچ رہا ہوں اس سے کیسے نکلوں؟''

ڈھیر ساری باتیں اپنے آپ ہی اس کے ذہن پر یلغار کر رہی تھیں۔ ایک طرف شکورے کے الفاظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ دوسری جانب زیب النساء کے لب ہل رہے تھے۔ پھر سب صورتیں' سارے الفاظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے بہت دور کسی ویرانے کی طرف بھاگ جائے۔ جہاں نہ محبت کے رنگ ہوں نہ نفرت کے۔ رنگوں سے ایک دم اسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ غبار بہت بڑھ گیا تھا۔

''ایک لڑکی اٹھانی ہے۔'' شکورا چلایا۔

''میں نے آپ کے دل کی دھڑکن سن لی تھی کیا آپ نے نہیں سنی؟ اگر سن لی ہے تو یہ دیواریں ڈھا کیوں نہیں دیں۔ کوئی روزن کوئی دریچہ کیوں نہیں تلاش کر لیا؟'' زیب النساء کے یاقوت سے ترشے ہونٹ ہلے۔

اور اس سمے وہ ہار گیا۔ ان ہونٹوں اور لفظوں کا سحر بہت زیادہ تھا۔ اسے موت کا خوف نہیں تھا لیکن وہ زیب النساء کو حاصل کیے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اور پھر جواز تو بے شمار تھے۔

''میں نے اس لڑکی کو بچانے کی پوری کوشش کر لی۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ یوں بھی اپنی جان داؤ پر لگا کر اسے بچانا پاگل پن ہی ہو گا۔ ویسے بھی اولاد خصوصاً بیٹیوں کی حفاظت ماں باپ اور بھائیوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ نسیم تو اس لیے اغوا ہوئی کہ وہ گھر سے باہر تھی۔ وہ لڑکی گھر سے نہ نکلے تو محفوظ رہ سکتی ہے۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ بی بی سے کہہ دوں گی کہ آپ نہیں آنا چاہتے۔'' حمیدہ اکتا گئی تھی۔

''میں آؤں گا' ضرور آؤں گا۔ تم مجھے جگہ بتا دو۔''

''حویلی کا جو بڑا باورچی خانہ ہے ناں' اس کے پہلو میں ایک دروازہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس سے نکلیں تو حویلی کی بڑی دیوار اور باورچی خانے کی دیوار کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی بن جاتی ہے اس گلی میں باہر کی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ کھلتا ہے۔ اس جگہ سے مرد سودا سلف پکڑانے کے لیے آتے ہیں اس کے علاوہ وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند رہتا ہے۔ آپ اس کے پاس ہی ٹھہرنا۔''

''لیکن اس کے پاس تو قبرستان ہے۔ تمہاری بی بی خوفزدہ تو نہیں ہو جائیں گی؟''

''نہیں' وہ کسی سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتیں۔ جو زندہ لوگوں سے خوفزدہ نہ ہو وہ ان سے کیا خوفزدہ ہو گا جن کا وجود مٹی میں مل گیا۔''

''اچھا میں انتظار کروں گا۔''

''عشاء کی نماز کے بعد جب سب نمازی اپنے گھروں کو چلے جائیں گے تب آنا۔''

''اچھا۔''

''میں یہی بتانے آئی تھی اب چلتی ہوں۔'' وہ واپس مڑ گئی۔

اچھو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شکورے کی طرف چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس بہانے اس کام سے چھٹکارا حاصل کرے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ اگر لڑکی کو اغوا کرنے کے لیے اسے بھی جانا پڑا تو تھوڑی دیر قبل کیا ہوا فیصلہ بغیر سوچے سمجھے خود ہی بدل جائے گا اور سارے جواز دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ سو بہتری اسی میں تھی کہ وہ کسی بہانے اس کام سے جان چھڑا لے۔

لیکن اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ شکورا اس کا انتظار کر کے جا چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اچھو نے سوچا کہ اسے بھی واپس پلٹ جانا چاہیے لیکن پھر یہ سوچ کر وہیں بیٹھ گیا کہ وہاں اس کی موجودگی سے شکورے کو کم از کم اتنا اطمینان تو ہو گا کہ وہ یہ کام کرنے آیا تھا۔

☆======☆======☆

گاؤں میں حیدر علی کا رشتہ طے ہو جانے کی خوشی میں پیر صاحب نے باقاعدہ مٹھائی تقسیم کر دی تھی۔ اپنی دانست میں وہ اس کے تمام راستے بند کر رہے تھے۔ مٹھائی سے بھرا ہوا سب سے پہلا ٹوکرا مولوی نعمت اللہ کے گھر پہنچا تھا۔ زرینہ اس وقت کپڑے دھو کر الگنی پر ڈال رہی تھی جب مولوی صاحب ٹوکرا اٹھائے صحن میں داخل ہوئے۔

''یہ کیا ہے ابا جی۔'' اس نے اشتیاق سے ٹوکرے کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے مٹھائی ہے۔''

''ہاں اور اس کے ساتھ ایسی خبر ہے کہ سناؤں تو روح تک شاداب ہو جائے۔''

''اچھا؟'' وہ قریب آ گئی۔ ''کیا خبر ہے؟''

''اتنا شوق ہے اس لڑکی کو مٹھائی کا۔'' اماں تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''ارے پہلے اپنے ابا کو بیٹھنے کے لیے تو پوچھو۔ گرمی سے آئے ہیں پانی پلاؤ جلدی سے۔''

''ابھی لائی۔'' وہ گھڑوں کی طرف بڑھ گئی۔

''مبارک ہو۔ پیر صاحب نے چھوٹے شاہ صاحب کا رشتہ طے کر دینے کی باقاعدہ تصدیق کر دی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہلوایا ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر کوئی تاریخ بھی جلد ہی طے ہو جائے گی۔'' مولوی صاحب اماں کو بتا رہے تھے۔ ''اور پتا ہے یہ مٹھائی انہوں نے لاہور سے منگوائی ہے۔''

ان سے کچھ دور گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیلتی زرینہ کا ہاتھ کانپا۔ گلاس نیچے گرا اور سارا پانی مٹی میں جذب ہو گیا۔

''ایک تو میں اس لڑکی سے بہت تنگ ہوں۔ پتا نہیں برتن کیوں اتنے پھسلتے ہیں اس کے ہاتھوں سے۔''

لیکن زرینہ نے شاید ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا

گیا تھا۔ کسی چیز کا سہارا لینے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ زمین پر گر پڑی۔

''ارے کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' مولوی صاحب اور اماں اس کی طرف دوڑے۔ رضیہ بھی سُوئی دھاگا چھوڑ کر اس کی جانب لپکی۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ بہت مدھم آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔ ''وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔''

''ہائے کچھ کریں۔ کیا ہو گیا میری بچی کو اچانک۔'' اماں چلائیں۔ پھر رضیہ کو ہونقوں کی طرح کھڑے دیکھ کر جھنجھوڑ دیا۔ ''یہاں کھڑی کیا تک رہی ہو۔ پانی کے چھینٹے ڈالو اس کے منہ پر۔ ارے آپ بھی یونہی کھڑے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے پتا نہیں کیا ہو گیا میری بچی کو اور آپ کچھ کر ہی نہیں رہے۔''

''اماں آپ تو بندے کو بوکھلا دیتی ہیں۔'' رضیہ نے زرینہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ ''دھوپ میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی گرمی سے چکر آ گیا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

پانی کے چھینٹوں سے زرینہ کے حواس بجا ہوئے تو چند لمحوں کے لیے وہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتی رہی پھر رضیہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''ارے کیا ہو گیا ہے؟''

''اماں کچھ نہیں ہوا۔'' رضیہ جھنجھلا گئی۔

''رضیہ اسے کمرے میں چارپائی پر لٹا دو اور پنکھا جھلتی رہو۔'' مولوی صاحب بولے۔

''جی ابا جی۔'' اسے تو زرینہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے بہانہ درکار تھا۔ ''اٹھو زرینہ کمرے میں چلو۔''

رضیہ کے سہارے وہ کمرے میں آ گئی۔

''خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔ جتنی بے وقوفیاں کر چکی ہو وہی کافی ہیں۔ مزید حماقتوں سے اب تو باز آ جاؤ۔'' رضیہ نے مدھم آواز لیکن سخت انداز میں اسے ڈانٹ دیا۔

''میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ بولی۔ ''رضیہ ایسا نہیں ہو سکتا ناں؟''

''سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ابا جی کو بھی خبر ہو سکتی ہے سمجھیں تم؟ تم نے مذاق بنا لیا ہے اپنی زندگی کو۔ [illegible] روتی کس بات پر ہو۔ جو بویا ہے اس کی فصل اُگے گی اور اسی کو تمہیں کاٹنا ہو گا۔

کیا تم بے خبر تھیں اس بات سے؟ نہیں، تمہیں معلوم تھا بالآخر تمہاری حماقتوں کا یہی انجام ہو گا پھر بھی تم جان بُوجھ کر ایک ایک قدم اٹھا کر اپنی تباہی کی سمت بڑھی ہو تو پھر جب اب تباہ ہونے لگی ہو تو کس سے شکوہ کر رہی ہو؟ آنسو کیوں بہا رہی ہو؟''

مجھے سائیں بابا نے بتایا تھا کہ میں۔

''گولی مارو سائیں بابا کو۔'' رضیہ نے غصے میں اس کی بات کاٹی۔

''بس مجھے پتا چل گیا ہے۔ میرا کوئی نہیں ہے۔'' وہ اوندھے منہ بستر پر گر کر رونے لگی۔ ''کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے تمہیں بھی نہیں ہے، کسی کو محبت نہیں ہے۔''

''ہیں...... ہیں۔'' اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''میری چندا ہم سب تجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ''ایسے نہیں کہا کرتے۔ مجھے پتا ہے تجھے کپڑے دھوتے ہوئے دھوپ بہت ستاتی ہے۔ پر میں کیا کروں چندا۔ رضیہ بھی گھر کے کام میں لگی رہتی ہے۔ اسے نہیں کہہ سکتی۔ میری ٹانگ پر ایسا کم بخت پھوڑا نکلا ہے کہ نیچے بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے ورنہ میں خود ہی کپڑے دھو لیتی۔ اب تمہارے ابا سے کہوں گی کہ اس طرف چھت ڈلوا لیں۔ وہ پیر صاحب سے کہہ دیں تو ہفتہ بھر بھی نہ لگے اس کام میں۔ اللہ تعالیٰ پیر صاحب کے درجات بلند کرے ہمارے کام میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔''

ان کی بات سن کر وہ اور زور سے رو دی۔

''اماں اس کی تو عادت ہے خواہ مخواہ رونے کی۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ رو دھو کے ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' رضیہ نے انہیں تسلی دی۔

اماں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں زرینہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''اس طرح روتی ہو تو تمہارے ابا جی پریشان ہو جاتے ہیں۔'' اماں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''چلو باہر آؤ۔ تمہاری پسند کی مٹھائی آئی ہے۔ وہ بھی کھاؤ اور اپنے ابا جی کو بھی تسلی دو۔''

''مجھے مٹھائی نہیں کھانی۔'' وہ بے رخی سے بولی۔ ''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں سو جاؤں گی۔''

''اچھا ہے سو جاؤ۔'' اماں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆======☆======☆

حیدر علی اپنے کمرے میں بند سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اب تک اسے اس مسئلے کا کوئی ایسا حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، جس سے دونوں فریق اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتا۔ اماں جان کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو یاد کر کے اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا تھا۔ ان کے الفاظ کی بازگشت چاروں طرف سے اس پر یلغار کیے ہوئے تھی۔

اور پھر گوری تھی جو اس کی روح تھی، اس کا عشق، اس کی کائنات تھی۔

وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا، جب دروازے پر دستک سنائی دی۔

"لیس!" اس نے بے زاری سے کہا اور بچا ہوا آدھا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

دروازہ کھلا اور رجب علی گھڑ سواری کے لباس میں ہاتھ میں اپنا مخصوص چابک اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

"ہوں' گوری کو یاد کیا جا رہا ہے۔" اس نے حیدر علی کی جانب بغور دیکھا۔

حیدر علی اٹھ بیٹھا۔ "آئیں بیٹھیں۔"

"میری مانو تو آرام کے ساتھ فوزیہ سے شادی کر لو۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یوں بھی شادی اور محبت کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بالآخر صرف شادی باقی رہ جاتی ہے اور چند بچے۔"

"آپ کو اس لیے مذاق سوجھ رہا ہے کیونکہ آپ نے محبت نہیں کی۔" اس نے سگریٹ کیس سے نیا سگریٹ نکال لیا۔ "میں نے سنا ہے بابا جان نے گاؤں میں مٹھائی بھی تقسیم کر دی ہے۔"

"نہ صرف مٹھائی تقسیم ہو گئی ہے بلکہ شاید ہفتہ بھر میں شادی کی تاریخ بھی طے ہو جائے۔"

"کیوں کر رہے ہیں بابا جان ایسا۔" اس کی جھلاہٹ بہت واضح تھی۔ "آپ کو معلوم ہے وہ ابھی کہاں ہیں؟"

"کیوں؟ اب تم ان سے جھگڑو گے؟" رجب علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"نہیں' اپنے باپ سے کون جھگڑ سکتا ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھوں گا کہ ان کے اس قسم کے رویے کی وجہ کیا ہے؟ اور انہیں یہ بتاؤں گا کہ میں کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے کوئی اور لڑکی پسند ہے۔"

"انتہائی حماقت کا ثبوت دو گے یہ بات کر کے۔" وہ نہایت آرام سے بولا۔ "بابا جان اولاد سے بے حد محبت کرتے ہیں' لیکن اپنی عزت آن اور زبان سے زیادہ نہیں۔"

"ایبی وے...... میں نے گوری کو زبان دے رکھی ہے اور میں بھی اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتا۔"

"تم چند دن ٹھہر جاؤ' میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔"

"آپ کیا بندوبست کیا ہو گا' یہ میں جانتا ہوں۔ میں آپ کو پہلے سے بتا رہا ہوں کہ مجھے دو شادیاں نہیں کرنی۔"

"نہ کرو اس میں اتنے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" رجب علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اٹھو میں تمہارا بگڑا ہوا موڈ درست کرتا ہوں۔"

"میرا موڈ نہیں ہے کہیں جانے کا۔"

"بالکل کسی چھوٹے بچے کی طرح روٹھے ہوئے لگ رہے ہو۔ کم آن یار...... یور آر گرون

اپ ناؤ...... اس طرح مسائل کا سامنا نہیں کیا جاتا' اٹھو۔"

"چلنا کہاں ہے؟" وہ بادل نخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت زبردست پروگرام ہے ڈیرے پر۔" رجب علی ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "ہے تو گاؤں کی لیکن ہے' بہت زبردست چیز۔"

حیدر علی کی جھنجھلاہٹ میں غصہ بھی شامل ہو گیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میں دھیان رکھتا ہوں اس بات کا کہ تمہاری گوری محفوظ رہے۔ ایبی وے...... اس کا نام ہے جنت بی بی! ہے تو ذرا دقیانوسی سا نام' لیکن خیر یہاں کرسٹین' سوزن اور ٹیمی کہاں' پھر بھی چل جاتا ہے۔"

"میں کچھ مصروف ہوں' اس لیے میرا آپ کے ساتھ جانا ممکن نہیں۔"

"کیسی مصروفیت؟ سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے کی؟"

"مجھے گوری سے ملنے بھی جانا ہے۔"

"آل رائٹ...... جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری آفر بہرحال برقرار ہے' موڈ ہو تو آ جانا' صبح تک لڑکی وہیں ہو گی۔"

☆======☆======☆

اچھو حویلی کے عقبی پھاٹک کی جانب درخت سے ٹیک لگائے زیب النساء کا انتظار کر رہا تھا۔ بتائے ہوئے وقت سے بھی کتنی دیر قبل وہ یہاں آ گیا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ پہلی محبت کی بے تابی ہی بہت تھی اور کچھ اس خدشے کے پیش نظر بھی کہ رجب علی اچانک کسی کام سے اسے بلوا نہ بھیجے۔ گھر میں رہتا تو پیغام دینے والا باآسانی اس تک پہنچ سکتا تھا' لیکن اب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا۔

یہ تو اچھا ہوا تھا کہ شام کو شکورے نے اس سے زیادہ بحث نہیں کی تھی اور رجب علی کو بھی یہی بتایا تھا کہ اغوا کے وقت اچھو اس کے ساتھ تھا' ورنہ بہت گڑبڑ ہو جاتی۔

پھر شام کے واقعات سے ہٹ کر اچھو کا ذہن آنے والے لمحات کی طرف چلا گیا۔

"پتا نہیں آج وہ کیسی لگے گی' کیسے کپڑے پہنے ہوں گے۔ خیر وہ جیسے کپڑے بھی پہن لے اس پر سج جائیں گے لیکن ہم بات کیا کریں گے؟ پتا نہیں ہماری باتیں کیا ہوں گی؟"

ایسی ہی باتیں وہ تب تک سوچتا رہا' جب تک چھوٹا پھاٹک چراؤں کی ہلکی سی آواز کے ساتھ نیم وا نہیں ہو گیا۔ گو کہ دروازہ کھلنے کی آواز مدھم تھی' لیکن سناٹے میں بہت واضح سنائی دی تھی۔

اچھو ایک دم درخت کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ نیم وا دروازے سے کوئی جھانک رہا تھا'

لیکن اندھیرے کی وجہ سے چہرے کے خدوخال واضح نہیں تھے پھر وہ چہرہ دروازہ کی اوٹ میں غائب ہوگیا۔

چند لمحوں بعد وہ دروازہ تھوڑا سا اور کھلا اور کوئی لڑکی محتاط انداز میں چلتے ہوئے اچھو کی طرف بڑھی۔

''یہ زیب النساء نہیں ہو سکتی۔ اس کی چال بتا رہی ہے کہ یہ زیب النساء نہیں ہے۔ پھر کون ہو سکتی ہے۔ ہاں حمیدہ ہوگی۔''

وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کا اندازہ درست تھا آنے والی حمیدہ ہی تھی۔

''مجھے بی بی نے بھیجا ہے کہ آپ کا پتا کر آؤں۔'' وہ قریب آ کر بولی۔ ''میں ابھی انہیں آپ کا بتاتی ہوں۔''

''اچھا۔''

حمیدہ پلٹ گئی۔

اور وہ پھر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسی دروازے سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے زیب النساء باہر نکلی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اچھو کی طرف بڑھ گئی۔ اسے آتے دیکھ کر اچھو بھی آگے بڑھ آیا اور پھر بغیر کوئی بات کیے اچھو نے زیب النساء کا ہاتھ تھام لیا اور وہ دونوں قبرستان کی چار دیواری سے اندر داخل ہو گئے۔

ایک کافی پرانی قبر کے پاس پہنچ کر زیب النساء رک گئی۔

''میں یہاں کبھی نہیں آئی' لیکن مجھے یقین ہے کہ یہی میری پھوپھو کی آرام گاہ ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''میں یہاں فاتحہ پڑھ لوں۔''

ان دونوں نے ہاتھ بلند کر دیئے۔

فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر وہ وہیں ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئے۔

وہ دونوں گم صم بیٹھے رہے پھر زیب النساء نے ہی خاموشی توڑی۔

''پتا نہیں میں یہاں کب آؤں گی اور میری جگہ کون سی ہوگی۔''

''اونہوں' ابھی تو ہماری زندگی شروع ہوئی ہے۔ ابھی سے یہ باتیں مت کرو۔''

''ہو سکتا ہے' مجھے یہ جگہ نہ ملے۔'' وہ بولی۔ ''اگر ہم ایک ہو گئے تو یقیناً مجھے یہ جگہ نہیں ملے گی لیکن تب مجھے اس بات کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔''

''انسان رشتوں کی ڈور میں الجھا ہوا ہو تو کوئی بات بھی یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔'' وہ بولا۔ ''ہر قطرے میں بھنور پیدا ہو جاتے ہیں گر کے دائرے بنتے جاتے ہیں۔''

''تو کیا میرے نصیب میں یہی قبرستان ہے؟'' اس کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔

''میری دعا اور خواہش ہے کہ نہ ہو۔''

''تو پھر؟''

اچھو تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔

''تم کسی جھونپڑی میں رہ لوگی؟''

''آپ کے ساتھ ہر جگہ رہ سکتی ہوں۔''

''یہ ریشمی کپڑے اور یہ آرام و آسائش جو تمہیں ملی ہوئی ہیں' یہ بھی شاید تمہیں میسر نہ آ سکے۔''

''پروا نہیں۔''

''تمہیں گھر کے کام بھی خود ہی کرنے ہوں گے' کیونکہ ماں سے اب کام نہیں ہوتے۔''

''یہ بھی کروں گی۔''

''میں بہت محنت کروں گا تا کہ تمہیں آرام ملے' آسائش ملے' لیکن اس میں تھوڑا وقت تو لگے گا ناں۔''

''ہوں۔''

''پتا نہیں ماں کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا ہوگا' مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔ ایک طرف تمہارا خاندان ہے اور خود تم' جن کی میری ماں اس قدر عزت کرتی ہیں کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں اور دوسری طرف ساس بہو کا رشتہ...... پتا نہیں وہ اس رشتے کو کس طرح قبول کریں گی؟''

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''

''میں بہت سے زاویوں سے سوچ رہا ہوں۔''

''اتنا سوچنے سے ہمارے درمیان دوری تو نہیں آ جائے گی۔'' اس کی آواز میں اندیشے تھے۔

''میں دعوے کرنے کا قائل نہیں ہوں' بس کر گزرتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''اب یہی دیکھ لو کہ کم از کم اس گاؤں میں ہم اکٹھے زندگی کبھی نہیں گزار سکیں گے۔ ہمیں یہاں سے بہت دور جانا ہوگا' لیکن میں اپنے ماں باپ کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں جہاں بھی جاؤں گا' وہ میرے ساتھ ہی رہیں گے۔''

''لیکن کیا وہ یہاں سے جانے پر تیار ہو جائیں گے؟''

''انہیں تیار ہونا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔ ''یوں بھی تمہارے بھائی کے حکم ماننا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ آج نہیں تو کل اس کے یہ احکامات مجھے کسی بڑی مصیبت میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔''

''کیسے احکامات؟'' وہ گھبرا گئی۔
''انہیں چھوڑو' خواہ مخواہ تمہیں دکھ ہوگا' بس اتنا ہے کہ انہی کی بنیاد پر میں ماں جی اور ابا کو یہاں سے شہر جانے پر آمادہ کروں گا۔''
''پھر؟''
''پھر شہر میں کوئی مکان دیکھ کر انہیں وہاں چھوڑوں گا اور یہاں آ کر تمہیں لے جاؤں گا مجھے اس طرح ملنا اچھا نہیں لگتا۔''
''اور آپ شہر کب تک جائیں گے؟''
''جس قدر جلد ممکن ہو سکا۔ شاید اگلے ایک یا دو دن کے اندر۔''
''ہوں۔''
زیب النساء نے آنکھیں موند لیں۔ وہ بھی ایسے کب ملنا چاہتی تھی' اسے بھی ایک گھر' ایک خاندان چاہیے تھا۔ اچھو کی باتوں نے سکون کی ٹھنڈی لہریں اس کے وجود میں اتار دی تھیں۔

☆======☆======☆

رات کی چادر نے جیسے ہی زمین کو ڈھانپا' زرینہ' حیدر علی سے ملنے کے لیے بے قرار ہو گئی لیکن اماں ابا ابھی سوئے نہیں تھے۔ پتا نہیں آج اتنی دیر تک وہ کیوں جاگ رہے تھے۔
''اماں' ابا سو کیوں نہیں رہے؟'' اس نے بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑیں۔
رضیہ نے بغیر کچھ کہے کروٹ لے کر منہ دوسری دیوار کی جانب پھیر لیا۔
''تم بھی ناراض ہو گئی ہو؟'' وہ رضیہ کی چارپائی پر آ بیٹھی۔
''میری مجال ہے کہ تم سے ناراض ہو سکوں۔ میرا دماغ مت چاٹو' نیند آ رہی ہے مجھے سونے دو۔''
''میں نے کب سونے سے منع کیا ہے۔ بس ذرا دیر کی بات ہے۔ جھانک کر پتا لگانے کی کوشش کرو کہ اماں ابا کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' اس نے منت کی۔
''کیوں؟ کس لیے؟'' رضیہ نے تھوڑا سا اٹھ کر پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔
''لڑو تو مت۔'' زرینہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں احمق نہیں ہوں کہ تم سے لڑوں۔ بھینس کے آگے بین بجانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ پھر لیٹ گئی۔
''تو پھر نہیں دیکھو گی کہ اماں ابا کیا بات کر رہے ہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''مجھے جانا بھی ہے' پتا نہیں وہ سو کیوں نہیں رہے؟''
''تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ۔''
''خدا کے لیے ناراض مت ہو۔'' زرینہ نے منت کی۔ ''بس آج شاید آخری مرتبہ ہو۔''

اس نے آنکھیں موند کر جذبات اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔
''لیکن دعا کرو آخری مرتبہ نہ ہو' دعا کرو ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں' دعا میں اثر ہوتا ہے ناں؟''
رضیہ نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھا' وہ آنسو پیچھے دھکیلنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔
پتا نہیں زرینہ کے چہرے میں کیا سحر تھا کہ اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انتہاؤں کو چھوتا ہوا غصہ بھی خود بخود ختم ہو جاتا تھا اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو کلیجے کو چیر کر رکھ دیتے تھے۔
رضیہ نے گہری سانس لی۔
''تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور ان سے ٹکرا کر بعض اوقات دعائیں بھی پلٹ جاتی ہیں کیونکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے' وہ ہم نہیں جانتے۔''
''ہاں۔'' زرینہ کے انداز میں بے بسی تھی۔ ''لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ہم دعائیں مانگنا چھوڑ تو نہیں سکتے۔''
''تم خود کو کسی بھی برے فیصلے کے لیے تیار رکھو۔'' رضیہ نے کہا۔
''ہوں۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے کھیلنے لگی۔
''اماں' ابا شاید سو گئے ہیں' آوازیں نہیں آ رہیں۔''
''ہاں' لگتا تو ایسا ہی ہے۔''
زرینہ چارپائی سے اٹھ کر دبے قدموں ان کے قدموں کی طرف بڑھی اور پھر اسی خاموشی کے ساتھ واپس پلٹ آئی تھی۔
''سو گئے ہیں۔'' وہ بولی۔
''میں چلتی ہوں۔''
''کیوں جا رہی ہو؟ رہنے دو' جو کچھ ہو رہا ہے' اسے تمہارے آنسو اور تمہاری آہیں بدل نہیں سکیں گی۔''
''آج میں انہیں صرف یہ کہنے جا رہی ہوں کہ اب میں ان سے صرف اسی صورت میں ملوں گی' جب ان کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ میں کسی اور لڑکی کی آہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔''
''نہیں' تم یہ سب اتنی آسانی سے نہیں کہہ سکو گی اور جب کہنا مشکل ہو گا تو بلاوجہ الجھ پڑو گی۔''
''ہاں' لیکن بزرگ کہتے ہیں کہ لڑائی کی رات بے شک آئے' جدائی کی رات کبھی نہ آئے۔ پتا نہیں میرے مقدر میں تنہائی اور جدائی کی کتنی سیاہی ہو' اس لیے رضیہ آج مجھے مت

روکو۔"

وہ اسی پگڈنڈی پر ہولی اور آہستہ روی سے چلتے ہوئے کنویں تک پہنچ گئی۔

حیدر علی حسبِ معمول اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

کتنی دیر تک صرف جھینگروں کے بولنے کی آواز آتی رہی پھر حیدر علی نے خاموشی کو توڑا۔

"کچھ تو بولو گوری۔"

"مجھے جو کچھ کہنا تھا' میں تو کبھی کی کہہ چکی' اب آپ کو بولنا ہے۔"

"میں آج بابا جان کے پاس جا رہا تھا لیکن بڑے بھائی جان نے روک دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں وہی کچھ کریں گے۔"

"آپ کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی؟"

"نہیں' اور میں چاہتا ہوں کہ اس سے قبل ہی بابا جان سے بات ہو جائے۔"

"ہوں۔"

پھر قدرے توقف سے بولی۔

"آج جو مٹھائی آئی تھی' وہ سچ مچ اسی خوشی میں تھی کہ آپ کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کیا گیا ہے؟"

"ہاں' اگر یہ کوئی خوشی تھی تو......"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ......" وہ بات پوری کیے بغیر خاموش ہو گئی۔

"کیا؟"

"کہ وہ آپ کے نکاح کی......" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"شاہ جی میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ......" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"بولو......رک کیوں گئیں؟"

"کہ اب میں اس دن آپ سے ملوں گی' جس دن آپ میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔ میں خود کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ کسی کے ہاتھ میرے حق میں دعا کے لیے اٹھنے کے بجائے مجھے بددعا دینے کے لیے اٹھیں۔ مجھے بددعا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ کے لیے کسی پچھتاوے کا سبب بنوں اور آپ کو پالینے کے بعد بھی ساری زندگی آپ کو کھوجتی رہوں۔"

حیدر علی نے اس کی طرف دیکھا جو بہت مشکلوں سے اپنے آنسو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود بھی ایک قطرہ اس کے گال پر پھسل پڑا۔ اس نے سر جھکا

لیا۔

"ایک چیز مانگوں گوری......دو گی؟"

"آپ جان مانگیں شاہ جی' وہ بھی دوں گی۔" اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

"اپنے یہ آنسو مجھے دے دو۔"

"مانگی بھی تو اتنی بے قیمت چیز۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ ان کی قدر و قیمت کیا ہے؟"

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر آنکھیں موند لیں۔

حیدر علی نے انگلی کی پور سے اس کا آنسو اٹھا لیا اور پھر ایک کے بعد ایک کتنے ہی قطرے اس کے گال پر موتیوں کی لڑی بناتے گئے۔

"تھینک یو۔" حیدر علی نے کہا۔

"تم نے مجھے اپنا زادِ راہ دے دیا ہے' اب ساری زندگی کانٹوں پر چلنا پڑے تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔"

"مجھے بھی آپ نے بہت کچھ دیا ہے۔ شاہ جی......اتنا کچھ کہ اتنے زیادہ کی تو میں نے کبھی تمنا بھی نہیں کی تھی' لیکن میں آپ کی طرح بے غرض نہیں ہوں۔ آپ کی ہر عنایت کے ساتھ میرے لالچ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک کے بعد ایک خواہشوں کی ایسی ڈور کھل گئی ہے کہ دوسرا سرا ہاتھ ہی نہیں آتا۔"

"مجھے تمہاری خواہشیں بہت عزیز ہیں گوری۔"

"میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "قسمت میں ہوا تو پھر ملیں گے۔"

"میں قسمت سے جنگ کرنا جانتا ہوں۔ اگر مجھے آخری لمحے تک لڑنا پڑا تو بھی میں لڑوں گا۔"

چند ثانیے تک زرینہ اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

☆======☆======☆

زیب النساء کے لیے وہ رات اس کی تمام زندگی سے بڑھ کر تھی۔ نہ اظہار کی ضرورت پڑی تھی نہ اقرار کی۔ وہ یوں ملے تھے جیسے جنموں کا ساتھ ہو۔ زندگی میں ایسے حسن اور ایسی رنگینی کا احساس اسے پہلی مرتبہ ہوا تھا...... یوں لگا تھا جیسے کاغذ پر بنی بے رنگ اور بے رونق تصویر ایک دم سے بدل گئی ہو' جیسے وہ ایک انگڑائی لے کر کاغذ کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں سانس لینے لگی ہو' جیسے اس میں قوسِ قزح کے ساتوں رنگ بھر گئے ہوں۔ وہ سر سے پاؤں تک محبت میں غرق ہو چکی تھی' جیسے رنگوں میں نہا گئی تھی۔

حویلی کی ٹھوس اور بلند دیوار میں سانس لینے کے لیے ایک روزن پیدا ہوا تھا اور اس نے

زندگی کی بازی لگا کر اس روزن کو دریچہ بنا دیا تھا' جہاں سے روشنی ہو' خوشبو اور محبت کے سب رنگوں تک اس کی رسائی ممکن ہوگئی تھی۔ خیالوں میں دھند کی دبیز تہہ میں لپٹے جس پیکر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھی اس میں احساس گناہ جاگ اٹھا تھا۔ آج اسی پیکر کو حقیقت کی دنیا میں چھو کر اس نے بار بار یہ یقین کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ خواب وخیال کا قصہ نہیں ہے۔

اس نے زیب النساء کو یقین دلایا تھا کہ وہ اسے یہاں سے بہت دور لے جائے گا۔ اتنی دور جہاں تک نیاز پور کی ہوا بھی نہ پہنچ سکے۔ وہاں وہ دونوں مل کر ایک نئے گھر کی بنیاد ڈالیں گے۔ ایک ایسے گھر کی بنیاد جس کی دیواریں محبت کے گارے کو گوندھ کر بنی ہوں گی' جس کی اینٹیں پیار کی مدھم آنچ پر پکی ہوں گی۔

اسے اس کے علاوہ کچھ چاہیے بھی نہیں تھا۔ اس حویلی کی سر بلند دیواروں نے اس سے مساوات کا صرف ایک ہی وعدہ کیا تھا کہ بالآخر اس میں رہنے اور گاؤں پر حکومت کرنے والے اس کے مکین ایک ہی جگہ کی مٹی اوڑھ کے سوئیں گے۔

لیکن یہ ایک وعدہ اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ مٹی کا پکا تھا یہاں کی نہ سہی' کہیں اور کی سہی۔

☆======☆======☆

''اپنے اس بیٹے کو کوئی عقل دے نیک بخت' ابھی تو میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا کہ اس کی واہی تباہی سننا پڑ رہی ہے۔'' منشی فضل دین چلایا۔

''کیا تکلیف ہوگئی تم دونوں کو سویرے سویرے ارے کبھی صبح کو اللہ اور اس کے رسول کا نام بھی لے لیا کرو۔ اٹھتے ہی ایک دوسرے کو کاٹ کھانے لگتے ہو۔''

''اماں' ابا سے کہیں ناں کہ سکون سے میری بات سن لیں۔''

''کیا بات سنوں' نواب صاحب حکم جاری کر رہے ہیں کہ باپ دادا کی زمین اور گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں' کسی نئی جگہ پر گھر بنالیں۔ واہ واہ کیا شاہی فرمان جاری کیا ہے۔ تیری اولاد نے۔''

''ہائے بیٹا۔'' ماں بھی حیران ہو کر پاس چلی آئی۔ ''گھر چھوڑ دیں اپنا' یہاں سے چلے جائیں۔ رشتے ناتے ختم کر دیں؟ نہ...... نہ...... ایسی بات بھول کر بھی نہیں سوچتے۔ چل میرا اچھا بیٹا جلدی سے یہ دودھ پی لے پھر میں تیرے لیے پراٹھا ڈالتی ہوں۔''

ماں نے دودھ کا بڑا سا گلاس اس کی جانب بڑھایا۔

''ماں آپ کو کیا چاہیے؟ یہ گھر بار' زمین' رشتے ناتے یا اچھو آپ کو جو چننا ہو چن لیں۔''

''کیا بکتا ہے؟''

ماں تو حیران سی کھڑی رہ گئی لیکن منشی سے رہا نہ جاسکا۔

''تُو سمجھتا ہے کہ اس قسم کی دھمکیوں سے ہمیں مجبور کر دے گا۔ نہیں بیٹا۔ پھر میں بھی تیرا باپ ہوں...... زنجیر ڈال کر گھر میں بند نہ کر دیا تو فضل دین نام نہیں ہے میرا۔''

''ارے پوچھو تو کہ صبح صبح کیا آفت آئی ہے جو یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہے۔ رات تک تو ٹھیک تھا۔''

''خاک ٹھیک تھا۔ شام کا گیا آدھی رات کو گھر لوٹا تھا۔ یہ حرکتیں ہوتی ہیں شریفوں کی۔''

''آپ لوگ سکون سے میری بات سن لیں تو آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' اچھو نے تحمل سے کہا۔

''ہم سے زیادہ تجھے سکون کی ضرورت ہے۔ جا اور ٹھنڈا پانی سر پر ڈال تاکہ تیری عقل ٹھکانے آئے۔''

''ماں میں آج سہ پہر کی لاری سے شہر جا رہا ہوں۔''

''ارے کیوں جا رہا ہے میرے لال؟'' ماں نے دودھ کا گلاس چھوڑ کر لپک کے اسے پکڑ لیا۔

''میں کہیں نہیں جانے دوں گی تجھے۔''

پھر منشی کی طرف مڑی۔

''اور تم بھی اپنے غصے کو قابو میں رکھا کرو جی' کیا بیٹے کو گنوانے کا ارادہ ہے۔ تم سے تو آرام سے بات ہی نہیں ہوتی۔ ساری زندگی حویلی میں منشایت کر کے سمجھنے لگے ہو کہ گھر میں بھی سب تمہارے غلام ہیں۔ ہونہہ! ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تم میرے بیٹے کو اس گھر میں......''

''تبھی دو آنکھوں سے دیکھتا ہوں اسے' اندر باہر سے پتا ہے مجھے اس کا۔''

''اب چپ بھی کرو جی۔'' ماں نے کہا اور اچھو کو وہیں چارپائی پر بٹھا کر بولی۔

''میرے بچے! تھوڑی سی سمجھ بُوجھ سے کام لے ناں میرے چندا۔ جس مٹی سے ہمارا صدیوں کا ناتا ہے' اسے کیسے چھوڑ دیں۔ سارے رشتے ناتے ہیں یہاں' اپنا گھر بار ہے' تیرا باپ منشی ہے۔ تُو محنت کرے تو یہ جگہ تجھے بھی مل سکتی ہے۔ دانے اناج کی کوئی کمی نہیں ہے سارا گاؤں عزت کرتا ہے۔ تیرے باپ کی اتنی دھاک ہے کہ سب سر جھکا کر سلام کرتے ہیں۔ ہمارے دکھ اور ہماری خوشیاں تو اس مٹی کے ساتھ ہیں' اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ پیر صاحب کے سائے کی برکت چھوڑ کر کسی بے برکتی جگہ کیسے ڈیرا ڈال سکتے ہیں۔ پرندے بادلوں سے بھی اوپر نکل جائیں' لیکن شام پڑتے ہی اپنے گھونسلوں کو لوٹ آتے ہیں۔''

''ماں اگر گھر کو آگ لگ رہی ہو تو ہم کیا کریں' خود بھی ساتھ جل جائیں؟ یا پچھتاووں کی راکھ کریدتے رہیں' نہیں ماں یہ عقل مندی نہیں ہے' تب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارا دانا پانی اس جگہ سے اٹھ گیا ہے۔ اس نیلی چھتری والے نے کہیں اور کے دانوں پر ہمارے نام کی مہر لگا دی

ہے۔"

"لیکن بیٹا! ہمارا گھر تو نہیں جلا۔" ماں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ "جس دن زور کی ہوا چل رہی ہو اس دن تو میں چولہا بھی نہیں جلاتی۔ ماسی بیداں کے تنور سے پکا پکایا کھانا لے آتی ہوں۔"

"ماں! اس آگ کو آپ نہیں سمجھیں گی۔ یہ تو اچانک ہی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور مجھے پتا ہے کہ مجھ تک پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے اچھو؟" ماں گھبرا گئی۔

"کیوں پھر کوئی بد دماغی دکھا آیا ہے شاہ صاحب کو؟" منشی نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "دیکھ، پہلے تو میں نے تجھے بچا لیا تھا لیکن تیری کھوپڑی یونہی الٹی رہی تو اب کے تجھے کوئی نہیں بچا سکے گا، سمجھا کہ نہیں۔"

"ارے تم دونوں کیا باتیں کرنے لگے کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" ماں مزید پریشان ہو گئی۔

"اچھو! پھر تو کوئی گڑبڑ نہیں کی بیٹا۔"

"ماں، میں تو گڑبڑوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن یہ ہی میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔"

"مجھے یقین تھا کہ پھر کوئی نیا گل کھلا آیا ہے تمہارا بیٹا۔ لکھوا لو مجھ سے کہ یہ اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے روز کوڑے کھائے گا۔"

"بس بہت ہو گئی ابا؟" وہ بگڑ گیا۔ "مت کیا کریں اس شیطان کی وکالت۔"

"کیا...... کیا...... کیا؟ بڑے شاہ کو شیطان کہتا ہے؟ زبان گدی سے باہر کھینچ لوں گا۔ استغفار، استغفار...... یا مولا، اپنی اولاد کے منہ سے یہ سننے سے پہلے میں بہرا کیوں نہیں ہو گیا۔ کاش کہ یہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ ایسی بدبخت اولاد سے تو بہتر تھا کہ میں بے اولاد ہی رہتا۔"

"ہاں میں بدبخت ہوں لیکن وہ آپ کا پیرزادہ بہت اونچے بختوں والا ہے، جس نے کل مجھے حکم بھجوایا تھا کہ اس کے لیے لڑکی اغوا کروں۔"

"کیا بک رہا ہے، میں تجھے جان سے مار دوں گا۔" منشی نے اپنے سینک سلائی سے وجود کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے اسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

"مار لیں جتنا چاہے مارنا ہے لیکن ذرا سورج چڑھ آئے تو آپ کو خود یقین آ جائے گا کیونکہ یا تو اس لڑکی کی لاش بھی نسیم کی طرح کسی کھیت میں مل جائے گی اور یا پھر وہ لڑکی اپنی داستانِ غم خود ہی سب کو سنا دے گی۔" اچھو بولا۔ "آپ یہاں سے نہیں جانا چاہتے نہ جائیں، میں بھی آپ دونوں کو چھوڑ نہیں سکتا، یہ میری مجبوری ہے، لیکن پھر تیار رہیں میرے کفن دفن کے لیے کیونکہ کل لڑکی کے اغوا سے انکار کر کے بھی میں رجب علی کے ہاتھوں بچ نکلا تھا، پر ہر مرتبہ ایسا

نہیں ہو گا۔"

منشی اور ماں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جو کچھ اچھو بتا رہا تھا، وہ ان کے تصور سے بھی بعید تھا، لیکن اپنے بیٹے کو بھی وہ جانتے تھے۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ ایسا الزام بلا سوچے سمجھے ہی کسی پر لگا دے۔

تو کیا سچ مچ ایسا تھا؟ نہیں یہ سب کچھ سچ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ "ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا" کے درمیان معلق ہو گئے تھے۔

پھر منشی کمزور سے لہجے میں بولا۔ "کسی شیطان نے میرے بیٹے پر تعویذ کر دیا ہے، تب ہی اسے الٹے سیدھے خیالات آ رہے ہیں۔ ذرا دن چڑھے تو میں مولوی صاحب سے اس کے توڑ کا تعویذ لاتا ہوں۔"

☆======☆======☆

جنت بی بی کو سرِ شام ہی ماسی بیداں کا چھوٹا لڑکا گلا بلا کر لے گیا تھا۔ وہ بھی ابا، اماں کی اجازت سے اس کے ساتھ چل پڑی تھی لیکن کچھ دور ہی اچانک کسی نے اس کے اوپر کھیس ڈال دیا تھا۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں بھی مارے تھے، لیکن بے سود۔

اور پھر بڑے شاہ صاحب کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر جیسے اس کی آنکھیں ہی پتھرا گئی تھیں۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی، لیکن حیرانی اور صدمہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کی چیخیں حلق میں ہی دم توڑ گئیں۔

پھر جب صبح صادق وہ لٹی پٹی گھر کے دروازے تک پہنچی تو اس کے اندر دہلیز عبور کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ وہیں دروازے پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور صحن میں گھر کے افراد روزمرہ کاموں میں مصروف تھے۔ مُنی حمام تلے رات کے برتن دھو رہی تھی، اماں چارپائیاں دیوار کے ساتھ لگا رہی تھی، ننھی جھاڑو لگا رہی تھی اور باقی بچے اِدھر اُدھر کدکڑے لگاتے پھر رہے تھے، اسے گرتے دیکھ کر سب ہی اس کی طرف بھاگے۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟" کے ساتھ بے شمار سوالوں کی مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

اماں کچھ ہی دیر میں سب سمجھ گئی تھیں اور یہ سب سمجھتے ہی اس نے جنت بی بی کو دُھن کر رکھ دیا تھا۔

"اماں! میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ چلاتی رہی۔

لیکن اماں نے بس نہیں کیا۔

پاس پڑوس کی عورتیں دیواروں سے جھانک رہی تھیں، کچھ ان کے گھر بھی چلی آئی تھیں۔

"میں پوچھتی ہوں کون تھا وہ کمبخت؟" اماں پر جیسے جنون سوار تھا۔

اور ایک اماں ہی کیا سب بڑی بوڑھیاں بولے جا رہی تھیں۔ ابا ادھر نہیں تھا۔ رات کھیتوں میں پانی لگانے کی اس کی باری تھی' ورنہ وہ صرف کپڑے دھونے والے ڈنڈے پر اکتفا نہ کرتا۔ چولہے کے پاس پڑی لمبی سی چھری لا کر ایک ہی دفعہ کام تمام کر دیتا۔

''میں تجھے آج زندہ نہیں چھوڑوں گی' بتا وہ کون تھا؟''

''بتاتی ہوں اماں...... بتاتی ہوں۔'' وہ چلائی۔

کچھ ہمسائیوں نے بھی اماں کا چلتا ہاتھ روکا' اس وقت تک وہ نیل و نیل ہو چکی تھی۔

''انہوں نے کہا تھا نہ بتانا ورنہ......'' وہ نڈھال سی ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''جلدی بتا نہیں تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

''ورنہ وہ مُنی اور ننھی کو بھی اٹھا لیں گے۔'' اس نے اٹک اٹک کر فقرہ مکمل کیا۔

عورتوں نے انگلی دانتوں تلے دبالی۔ ایک مرتبہ پھر بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔

''اور پھر وہ سب کو مار دیں گے۔'' قدرے توقف سے وہ بولی۔

درد کی ٹیسوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔

''ارے کمبخت! وہ تھا کون' اسے بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' اماں نے ایک مرتبہ پھر اس پر حملہ کرنا چاہا' لیکن عورتوں نے پیچھے ہٹا دیا۔

''بڑے شاہ صاحب۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

☆======☆======☆

اس کی بات کا یقین کرنا سب کے لیے تقریباً ناممکن تھا' لیکن ماسی بیداں کے چھوٹے لڑکے گلو نے خوفزدہ ہو کر سب کو بتا دیا کہ جنت بی بی کو بلوانے کے لیے اس سے شکورے نے کہا تھا اور بدلے میں لاہور شہر کی سیر کرانے کا وعدہ کیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اس پر کھیس ڈال کر اسے لے بھی گیا تھا تو تب سب ہی کا یقین ڈانواڈول ہونے لگا۔

''تُو نے اس وقت کیوں نہیں بتا دیا تھا کمبخت۔'' ابا اس پر جھپٹا۔

''مجھے شکورے چاچا نے کہا تھا کہ یہ کھیل ہے۔'' وہ بھاں بھاں روتے ہوئے بولا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ آپا پر کھیس ڈالیں گے تو وہ چیخے چلائے گی بھی' لیکن یہ بھی کھیل ہوگا اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں نے اس کھیل کے بارے میں کسی کو بھی کچھ بتایا تو چاچا مجھے سیر نہیں کرائے گا۔''

''جب جنت کو اٹھایا شکورے نے تھا تو وہ بڑے شاہ صاحب کا نام کیوں لے رہی ہے؟''

یہ وہ سوال تھا جو سب کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

جنت بی بی کے چچا زاد بھائی غصے میں پاگل ہو کر شکورے کو اس کے گھر سے گھسیٹ

لائے۔

''میں ادھر ہی تجھے ذبح کر دوں گا۔'' ایک چلایا۔

''خون پی جاؤں گا تیرا تجھے جرأت کیسے ہوئی ہماری بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی۔''

''اتنی اکڑ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شکورے نے بھی آنکھیں دکھائیں۔ ''لڑکی نے میرا نام نہیں لیا' اس چھوکرے کے کہنے پر تم لوگ مجھے پکڑ لائے۔ ابے او لڑکے۔''

وہ گلے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''بول' میں نے اٹھایا تھا تیری آپا کو؟''

گلے نے سر اٹھا کر شکورے کی طرف دیکھا جو خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر خوفزدہ ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ہاں...... ہاں...... ہاں۔'' وہ آنکھیں بند رکھے رکھے ہی چلایا۔

''اوئے جھوٹ بکتا ہے۔'' شکورے نے اسے ڈپٹا۔

پھر گھر کے صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''اس بچے کی بات پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ لڑکی سے پوچھو کہ اس پر کیا بیتی...... اس نے میرا نام لیا تو یہ میرا سر ہے اور یہ......؟''

اس نے پاؤں سے چپل اتار کر سامنے کھڑے بزرگ کو پکڑا دی۔

''یہ جوتا ہے' اتنے جوتے لگاؤ کہ نہ سر باقی رہے نہ جوتا' لیکن اگر وہ میرا نام نہیں لیتی تو یہی جوتا اتنی دفعہ تم لوگ اپنے سر میں مارو کہ نہ تم لوگوں کا سر باقی رہے اور نہ ہی یہ جوتا۔''

''ارے بھئی جس نے یہ حرکت کی ہے اسے پکڑو' جس کا نام لڑکی لیتی ہے' اسے گریبان سے گھسیٹ کر لاؤ اور یہاں ذبح کر کے خون پیو۔ شکورا بے چارا تو ایسے ہی پھنس رہا ہے۔''

بات تو اس کی منطقی تھی اور مسئلہ یہ تھا کہ جنت اس کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بڑے شاہ صاحب کے نام پر ہی مصر تھی۔

چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اتنا تو سب کو یقین آ گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی بلکہ اسے لے جایا گیا تھا۔ اس بات کا بھی انہیں یقین تھا کہ اسے لے جانے والا شکورا ہی تھا کیونکہ کتنے ہی لوگوں نے اسے اس کھیس کے ساتھ ماسی بیداں کے تنور کی طرف بڑھتے دیکھا تھا' لیکن مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا تھا جہاں جنت' شکورے کے بجائے بڑے شاہ صاحب کا نام لے رہی تھی۔

''لو جی تمہاری لڑکی نے تو بڑے شاہ صاحب کو بھی نہیں بخشا۔'' شکورا اطمینان سے بولا۔ ''کل کو کوئی لڑکی اٹھ کر پیر صاحب پر الزام لگا دے تو وہ بھی مان لینا۔ ہونہہ...... میرا تو یہ مشورہ ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ اگر حویلی میں یہ خبر پیر صاحب یا بڑے شاہ صاحب تک

پہنچ گئی تو تم میں سے کسی کی خیر نہیں۔ پیر صاحب کا تو تم سب کو علم ہی ہے کہ عزت اور آن کی خاطر مرمٹیں گے یا ماردیں گے، لیکن اپنی اجلی پگڑی کو داغدار نہیں ہونے دیں گے اور جہاں تک بڑے شاہ صاحب کا تعلق ہے تو اب وہ یہاں نئے نہیں آئے کہ تم لوگوں کو خبر ہی نہ ہو ان کے غصے کی۔ زمین میں آدھا گڑوا کر اوپر کتے نہ چھوڑے تو میرا نام شکورا نہیں۔ لگا لو یہیں دس دس روپے کی شرط۔''

سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ جنت نے جسے اماں نے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لوگوں کو یوں چپ ہوتے دیکھا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر اس نے چلانا شروع کیا۔

''یہ سب چپ ہو سکتے ہیں لیکن تم میرا منہ بند نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ یہ ظلم بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے، بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے اور مجھے اٹھایا تم نے تھا...... تم نے تھا۔ تم نے تھا۔''

کچھ عورتوں نے اسے زبردستی پیچھے دھکیلا، لیکن وہ مسلسل چلائے گئی۔

''لو جی! اس سے پوچھو کہ جس کے منہ پر پیچھے سے کھیس ڈال دیا جائے اسے کیا پتا کہ اسے اٹھایا کس نے ہے؟ جھوٹے کا جھوٹ ساتھ کے ساتھ کھلتا جاتا ہے۔ یہ لڑکی تو پاگل پن کی اداکاری کر رہی ہے اس کی باتوں میں آ کر کہیں خود کو حویلی کے کتوں کی خوراک بنوانے کی کوشش مت کرنا۔'' شکورا بہت مطمئن تھا۔

''اور ہاں پہلے اس شخص کو تلاش کرو جس نے یہ کام کیا ہے پھر یہ بھی کھل جائے گا کہ لڑکی کو کوئی زبردستی لے کر گیا تھا یا وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر گئی تھی۔

اچھا جی! اب میں چلتا ہوں، ابھی تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ تم لوگوں نے اٹھا دیا۔'' اس نے منہ پھاڑ کر جمائی لی اور بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

شکورے کی دھمکی اس قدر واضح تھی کہ کسی میں بھی اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن سرگوشی میں رجب علی شاہ کا نام پھیلتا گیا۔

☆======☆======☆

''کچھ سنا آپ نے مولوی صاحب!'' اماں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ''کیسا گندا الزام لگایا ہے اس لڑکی نے بڑے شاہ صاحب پر۔''

''او خدایا! کل میں نے اچھو کی بات پر بالکل توجہ نہیں دی تھی۔'' مولوی صاحب نے سر پکڑ لیا۔ ''مجھے یقین آ گیا ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔''

''کل اچھو آیا تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟'' اماں نے پنکھا جھلتے ہوئے پوچھا۔

اپنے اپنے کام کاج میں مصروف رضیہ اور زرینہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''اچھو نے مجھے پہلے ہی اس حادثے سے آگاہ کر دیا تھا لیکن اسے اس بات کا علم نہیں تھا

کہ کس لڑکی کو اغوا کیا جانا ہے۔''

''ہائے اللہ! کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟'' اماں کا پنکھا جھلتا ہاتھ رک گیا۔

''اچھو کو پہلے سے کیسے پتا چل گیا؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔'' انہوں نے کہا اور پوری بات اماں کو بتا دی۔

''بڑے شاہ صاحب ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔'' اماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ہو نہ ہو اس میں بھی اچھو کا ہاتھ ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی سازش ہے بڑے صاحب کے خلاف۔''

''بڑے شاہ صاحب کے متعلق تب بھی بہت باتیں پھیلی تھیں، جب وہ ولایت میں تھے لیکن اچھو کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اس کا کردار کیسا ہے؟''

''جانے دیں مولوی صاحب! وہ بغیر میم کے گاؤں واپس آ گئے تو بے کار کی پھیلائی ہوئی باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ کل کو یہاں بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' اماں بولیں۔

''اور پھر وہ سب آپ بھول گئے جو اچھو نے مسجد جیسی جگہ میں بیٹھ کر کہا تھا۔ توبہ توبہ! اس نے بیبیوں پر بھی تہمت لگانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''سچ کیا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔'' وہ بولے۔ ''مجھے تو یہ پتا ہے کہ میں نے جنت کی آنکھوں میں سچائی دیکھی ہے اور اس سے اچھو کی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔''

''آپ ان لوگوں کی باتوں میں آ کر کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ انہیں یہی کرنا ہوتا تو ولایت میں اس کے مواقع کم تھے، وہاں نہ شادی کر آتے وہ؟ لیکن نہیں، نہیں گاؤں اور خاندان کی عزت کا اتنا پاس تھا کہ وہاں کی وہ بے حیا عورتیں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ اتنا خیال تھا انہیں اپنی دی ہوئی زبان کا کہ بغیر کسی ردوکد کے چھوٹی بیگم سے عقد کر لیا۔ نہ مولوی صاحب، معافی چاہتی ہوں لیکن آپ کی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔''

''بس ایک مرتبہ جنت کے گھر جا کر اس کی باتیں سننے کے بجائے اس کی آنکھیں پڑھ آؤ۔ یقین خود ہی آ جائے گا۔'' مولوی صاحب بولے۔

''ویسے بھی سب گھر والوں نے اس کی زبان بند کرا دی ہے، خوف کے مارے سب نے بے غیرتی کی چادر اوڑھ لی ہے اور چپکے سے بیٹھ گئے ہیں۔ اب تو صرف جنت کی آنکھیں بات ہی کر رہی ہیں اور فریاد بھی۔''

مولوی صاحب کے انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اماں چپ ہو کر رہ گئیں۔

''میں ابھی اچھو سے بات کرتا ہوں۔''

''کیوں پرائے فساد میں پڑتے ہیں، رہنے دیں، اگر لڑکی والے چپ ہیں تو ہمارے بیچ میں کودنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اسی مزاج نے تو مسلمانوں کو خراب کیا ہے' برائی کو روکنا ہر ایک کا فرض ہے۔ کل نسیم تھی' آج جنت ہے' کل کو خدانخواستہ ہماری کوئی بیٹی بھی اس کا شکار ہو سکتی ہے۔ راہ میں لگی کانٹوں کی جھاڑی کو ہٹایا نہ جائے تو وہ پھل پھول کر تناور درخت بن جایا کرتی ہے اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں رہتا۔"

مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میرا اچھو سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

☆======☆======☆

"اب کیا ہوگا؟"

منشی فضل دین اور اماں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اچھو برآمدے میں بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ جب باہر سے اچانک آواز آئی۔

"اچھو۔"

منشی اچھل پڑا۔ "یہ کون ہے؟"

"کہیں کوئی حویلی سے اچھو کو بلانے تو نہیں آیا؟" اماں کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"میں اب اپنے اچھو کو حویلی میں نہیں جانے دوں گی۔"

"ماں خدا کے لیے مولوی صاحب کی آواز کو بھی نہیں پہچانتے آپ لوگ' مولوی صاحب آواز دے رہے ہیں۔" وہ باہر کی جانب بڑھا۔

"میری بات سن اچھو!" منشی نے پاس سے گزرتے ہوئے اچھو کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"یہ مولوی ہے تو اچھا' لیکن پیر صاحب پر جان نثار کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے' کہیں جاسوسی کرنے نہ آیا ہو' تو اس کے سامنے عادت کے مطابق اول فول نہ بکنے لگنا بڑے شاہ کے متعلق۔"

"ابا! مجھے میرے انداز میں زندہ رہنے دیں۔ مجھ سے گیدڑوں کی طرح نہیں رہا جاتا۔ سوچتا ہوں اور کر گزرتا ہوں' کسی کے سامنے منمنانا یا گھگیانا مجھے پسند نہیں ہے۔"

"کچھ سمجھایئے اپنے اس لاڈلے کو۔" منشی نے ماں سے کہا۔ "کیوں خودکشی کرنے پر تلا ہوا ہے؟"

لیکن منشی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اچھو باہر جا چکا تھا۔

"جی مولوی صاحب! آپ ہمارے غریب خانے پر کیسے آ گئے؟"

"مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں کچھ مصروف ہوں' لیکن خیر آپ کو میں کھڑے کھڑے چند منٹ دے سکتا ہوں۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"میں جنت بی بی کے متعلق تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"اب کیا فائدہ' اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا' سارے گاؤں میں وہ بات پھیل چکی ہے' جس کل آپ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔"

"مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ بڑے شاہ صاحب کو...... پھنسانے کا طریقہ تو نہیں ہے؟"

"واہ مولوی صاحب واہ!" وہ تلخی سے بولا۔ "حویلی والوں کے نمک کا ذائقہ اب تک آپ کی زبان پر ہے۔ یہ بتائیں کتنی بوریاں گندم اور چاول نے آپ کا منہ بند کیا ہوا ہے۔ میری بات کا یقین اس لیے نہیں کہ میں اچھو ہوں منشی فضل دین کا بیٹا اور رجب علی کی شرافت کا یقین اس لیے ہے کہ وہ پیر صاحب جلال الدین شاہ کا سب سے بڑا بیٹا اور گدی کا وارث ہے؟

بہت ہو گئی مولوی صاحب! آپ کی انہی حرکتوں کی وجہ سے میرا دل اس جگہ سے اچاٹ ہو گیا ہے اور میں یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہوں' کسی ایسی جگہ کی تلاش میں جہاں صرف پیروں کی اولاد کو ہی قبول نہیں کیا جاتا ہو گا بلکہ مجھ جیسے ادنیٰ انسان کی بھی بحیثیت انسان کوئی وقعت ہو گی۔"

"تم نے میرے متعلق بہت غلط اندازے لگائے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں' اللہ اللہ کرنے والا۔ میرے اندر لوگوں کو پہچاننے کا شعور نہیں ہے اور پھر جو کچھ آج کل ہو رہا ہے' ایسا اس سے پہلے ہمارے گاؤں میں کبھی ہوا بھی نہیں ہے۔ میری عقل حیران ہے کہ کس کی بات کا یقین کروں اور کس کی بات رد کروں۔"

"مولوی صاحب آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا بہت برا کیا لیکن......"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اب آپ کی باتیں سن کر یہ قلق نہیں رہا کہ آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا' اس میں نیتی شامل تھی۔

بس ایک بات یاد رکھیں مولوی صاحب کہ جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہو اس کے متعلق چپ سادھ لیں۔ وقت ہر انسان کے رویے اور نیتیں خود بخود ظاہر کرتا جاتا ہے۔ کل تک آپ کو میری بات کا یقین نہیں تھا آج آپ کو شک ہے' لیکن آنے والا کل ہر سچائی کو از خود ظاہر کر دے گا۔"

"اللہ تعالیٰ کرے ایسا ہی ہو۔" پھر وہ قدرے توقف سے بولے۔ "میں پیر صاحب کے پاس جا رہا ہوں' تم اس واقعے کے اہم کردار ہو' میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں' اب بہت دیر ہو گئی ہے مولوی صاحب! میں کسی کو اپنے ساتھ کا یقین دلا چکا ہوں اور اپنا وعدہ پورا ہونے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آئندہ بھی مجھے ایسے حکم ملتے رہیں گے' جنہیں پورا کرنا مجھے گوارا نہیں ہو گا' اس لیے میں یہ گاؤں' یہ مٹی اور اس سے بندھے سارے رشتے ناتے توڑ کر یہاں سے جا رہا ہوں۔"

''نہیں اچھو! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے' اگر تم جیسے نوجوان بھی میدان چھوڑ گئے تو یہ اس فصل کی آبیاری ہو گی' جسے اس مٹی میں نہیں اگنا چاہیے۔''

''میں نے کہا ناں کہ اب میرے لیے مزید یہاں رکنا ممکن نہیں رہا۔'' وہ بولا۔ ''کل صبح تک میں آزاد تھا' میرے گرد کسی جذباتی رشتے کا حصار نہیں تھا' کسی وعدے کی زنجیر میرے پاؤں میں نہیں تھی' لیکن آج میں اَن دیکھی ڈوریوں میں بندھ گیا ہوں اور اسی لیے میں نے اگر کل ہونے والے گناہ میں حصہ نہیں لیا تو اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی' آپ پیر صاحب کے پاس جانا چاہیں تو چلے جائیں' لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا' پورے گاؤں میں کوئی ایک شخص بھی آپ کی حمایت نہیں کرے گا' ایک انگلی بھی رجب علی کی جانب نہیں اٹھے گی' کسی کی زبان اس کے خلاف الزام لگانے کے لیے نہیں ہلے گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ گناہ گار ہے۔ کوئی اسے گناہ گار نہیں کہے گا' آپ جائیں' میں آپ کے لیے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔''

مولوی صاحب مایوس ہو کر حویلی کی طرف چل پڑے اور اچھو ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر گھر کے اندر چلا آیا۔

''میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔'' ماں نے اچھو کا بازو تھام کر کہا۔ ''میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو اس زمین اور مٹی نے ہمیں کیا دینا ہے۔''

''نیک بخت کبھی سوچ سمجھ کر بھی بات کر لیا کر۔'' منشی بولا۔ ''کچھ نہیں ہو گا تیرے بیٹے کو۔ اچھو تُو اِدھر آ میرے پاس بیٹھ۔''

اچھو خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے تیری آدھی باتیں اچھی لگی ہیں' لیکن آدھی باتیں بالکل اچھی نہیں لگیں۔''

''کون سی ابا؟''

''جو ابھی تُو مولوی کے ساتھ کر رہا تھا۔'' منشی بولا۔ ''مولوی کا تو ہو گیا ہے دماغ خراب جو پیر صاحب کے پاس چل پڑا ہے۔ شکورا پہلے ہی سب کو دھمکا گیا ہے کہ انہیں کسی بھی شکایت کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا اور پھر ہمیں کسی کے پھڈے میں پڑ کر کیا لینا دینا۔ بہت اچھا کیا جو تُو مولوی کی باتوں میں آ کر اس کے ساتھ نہیں چلا گیا۔

لیکن یہاں سے جانے والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ تجھے کیا' وہ شکورا ابھی تو ہے جو شاہ صاحب نے کہا سو وہ اس نے کر دیا۔ تو بھی کرتا جا جو وہ کہتے ہیں۔''

''چاہے وہ کسی کی بہو بیٹی اٹھانے کو کہہ دیں؟''

''تو تجھے کیا۔ تیری ایک بڈھی ماں ہی تو ہے' اس کا بوجھ میرے علاوہ کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ کون سی کوئی بہن ہے تیری کہ تجھے فکر ہو۔ ارے جب اتنی بہنوں کی موجودگی میں شکورے کو شرم نہیں آئی تو تجھے [illegible] ہے فکر کی۔''

''واہ ابا! بہت اچھا سبق دے رہے ہیں آپ۔''

''میں کب کہتا ہوں بیٹا کہ تُو اس سے زیادہ کچھ کر۔ دیکھ میری بات سن......'' منشی کا انداز سمجھانے والا تھا۔

''اللہ تعالیٰ نے بھی شدید بھوک کی حالت میں جہاں جان جانے کا خطرہ ہو حرام کو حلال قرار دیا ہے۔''

''ابا جی! اپنے مطلب کے لیے ہم فوراً ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کو لے آتے ہیں' چاہے غلط ملط ہی کیوں نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ مسلسل حرام کھاتے رہو۔ انہوں نے برے حالات سے بچنے کے لیے ہجرت کا حکم بھی دیا ہے۔ جب ہجرت کرنے کے بعد ہمیں کھانے کو حلال مل سکتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے حرام کی زندگی میں منہ مارتے رہیں۔''

''یہ لڑکا نہیں سمجھے گا' میں بتا رہا ہوں۔'' منشی نے سر پیٹ لیا۔

''کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا اچھو۔'' ماں نے اس کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس مٹی اور رشتے ناتوں سے چمٹے رہنے کا کیا فائدہ جو ہمارا بیٹا ہی نہ رہا۔''

''یہ عورت تو موقع ملتے ہی ٹانگ اڑا دیتی ہے ناقص العقل مخلوق۔'' منشی چلایا۔

''ہمارے بیٹے کو کیوں کچھ ہونے لگا؟ جو یہ اکڑفوں چھوڑ کر پیر صاحب کا حکم ماننے لگے تو کچھ نہیں ہو گا اسے۔''

''ابا جی! مجھے افسوس ہونے لگا ہے کہ جن ہاتھوں نے میری شخصیت کی تعمیر کی' وہ ایک ایسے شخص کے ہاتھ ہیں' جس کی اپنی کوئی شخصیت ہی نہیں۔ میں تو خواہ مخواہ ہی فخر کرتا رہا آپ پر۔

آپ کو یہ گاؤں' یہ مٹی' اس سے بندھے سب رشتے اور حویلی سے ملنے والے سب جائز و ناجائز احکام مبارک ہوں۔ میں بھی کوئی نیک اور پرہیز گار شخص نہیں ہوں' بلکہ میرے گناہ شاید میری نیکیوں سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ یہ بھی بہت بڑا گناہ ہے کہ میں برائی کا راستہ نہیں روک سکا۔ میں انسان ہوں اور میری مٹی میں گناہ اور ثواب دونوں گندھے ہوئے ہیں' لیکن مجھے بہرحال فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور ایک سجدے کا حق نبھانے کے لیے میں اس گندگی میں مزید نہیں لتھڑ سکتا۔

اور اسی لیے اگر آپ یہاں سے نہیں جائیں گے تو بھی میں یہاں سے ضرور جاؤں گا' یہ میرا فیصلہ ہے۔''

☆=======☆=======☆

''کہیے مولوی صاحب! آپ کیسے تشریف لائے؟'' پیر صاحب گول کمرے میں داخل ہوئے۔

''پیر صاحب! آج یہاں آنے کی دو وجوہات ہیں۔''

''کہیے۔''

''میں تنہائی میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے کن انکھیوں سے دست بستہ کھڑے ملازمین کی جانب دیکھا۔

''یہ اپنے ہی لوگ ہیں آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''پیر صاحب! میں آپ سے بہت عاجزانہ درخواست کر رہا ہوں کہ آج ہونے والی گفتگو میں کسی کے سامنے نہیں کر سکتا۔''

''ہوں۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ملازمین کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔

''اب کہیے۔''

''سب سے پہلے تو چھوٹے شاہ صاحب کی نسبت طے ہو جانے کی مبارکباد قبول کیجیے۔''

''بہت شکریہ' جلد ہی آپ تاریخ طے ہو جانے کی خوش خبری بھی سنیں گے۔''

''مجھے اس مبارک گھڑی کا شدت سے انتظار ہے ویسے تو میری چھوٹے شاہ صاحب سے زیادہ ملاقات نہیں ہوئی' لیکن جب بھی ہم ملے ہیں' ان سے مل کر بہت خوشی محسوس ہوئی ہے سارا گاؤں ان کی تعریف کے قصیدے پڑھتا ہے۔''

''شاید اس لیے کہ ابھی وہ زمینوں کے معاملے سے دور ہے۔'' پیر صاحب مسکرائے۔ ''ہم جانتے ہیں کہ گاؤں والے رجب علی کی سختی سے کچھ خوفزدہ رہتے ہیں' لیکن زمینوں کے سب معاملات ہم نے اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ اب وہ انہیں جیسے چلانا چاہے ہم نہیں پوچھتے ہیں یوں بھی یہ سب کچھ اسی نے سنبھالنا ہے' جبکہ حیدر علی نہ کسی کے لینے میں ہے نہ دینے میں۔''

''جی درست فرما رہے ہیں آپ۔''

''ویسے ہم چاہتے ہیں کہ حیدر علی بھی زمینوں کے معاملات میں دلچسپی لے' لیکن وہ تو بس اپنے آپ میں مگن رہتا ہے اور پھر رجب علی بھی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ساری ذمہ داریاں اس نے اپنے کندھوں پر لے رکھی ہیں۔ جب انسان پر اتنی ذمہ داریاں ہوں تو مزاج میں سختی آ ہی جاتی ہے۔''

''بجا فرمایا آپ نے...... شادی کے بعد جب ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی تو چھوٹے شاہ صاحب خود ہی اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔''

''اور کہیے گھر میں سب خیریت ہے ناں' کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''اللہ تعالیٰ کا بہت احسان ہے اور پیر آپ کی بھی بہت عنایت ہے' مجھے تو کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور چیز گھر میں آ جاتی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا پھر قدرے توقف سے

بولے۔

''آج میں بہت مشکل بات آپ سے کہنے آیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بیان کروں؟''

''مشکل؟ کیسی مشکل درپیش ہے آپ کو؟ دیکھیں مولوی صاحب' یہاں کی کوئی بات باہر نہیں نکل سکتی' اس لیے آپ بلا جھجک سب کچھ کہہ دیں۔ کیا کسی بچی کا مسئلہ ہے؟''

''جی مسئلہ تو بچی کا ہے۔'' وہ رک رک کر بولے۔ ''لیکن میری نہیں گاؤں کی ایک بچی کا مسئلہ ہے۔''

''کہیے کیا مسئلہ ہے؟''

''پیر صاحب! میں حویلی کی عزت و آبرو کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں' لیکن آج میرے کان میں ایک ایسی بات پڑی ہے کہ میں دہل کر رہ گیا ہوں۔ میری دعا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہو' لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر دعا قبول نہیں ہوا کرتی۔''

پیر صاحب کے چہرے پر تناؤ کے آثار پیدا ہو گئے۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں' کھل کر کہہ دیں۔''

''میری زبان لڑکھڑا رہی ہے۔''

''ہم آپ کو حکم دیتے ہیں مولوی صاحب کہ جو کچھ کہنے کے لیے آپ آئے ہیں' وہ کہہ دیں۔'' پیر صاحب نے اپنے مخصوص حکمیہ انداز میں کہا' جس کا مطلب تھا کہ اب مزید انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

مولوی صاحب نے گہری سانس لی اور سر جھکا کر بولے۔

''کل رات گاؤں کی ایک بچی اغوا ہوئی تھی۔ تقریباً اسی طرح جیسے پچھلے دنوں نسیم اغوا ہوئی تھی۔''

''گاؤں کی بچی اغوا ہوئی تھی؟ کون سی بچی۔ ہم تک تو کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔'' پیر صاحب بولے۔ ''اور نسیم کا تو سب کو علم ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی تھی اور اگر ہوئی بھی تھی تو اس میں کچھ اس کی اپنی مرضی بھی شامل تھی۔''

''میرے پاس مصدقہ اطلاع ہے کہ نسیم کو بھی اس کی مرضی کے بغیر اغوا کیا گیا تھا اور کل جنت بی بی کو بھی اس کی مرضی کے بغیر ہی اغوا کیا گیا تھا۔''

''ہوں۔'' پیر صاحب نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔

''اور اس اغوا کے سلسلے میں بہت اونچا نام لیا جا رہا ہے۔''

پیر صاحب کچھ بولے بغیر منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''لوگ اونچی آواز میں وہ نام لینے سے کتراتے ہیں کیونکہ انہیں بہت دھمکیاں ملی ہیں۔

سارا گاؤں خوفزدہ ہے اور کچھ کہنے پر تیار نہیں' یہاں تک کہ جنت بی بی کے گھر والوں نے بھی چپ سادھ لی ہے' لیکن کسی کو تو آگے بڑھنا ہے تاکہ آئندہ کے لیے یہ سلسلہ منقطع ہو سکے۔

پیر صاحب! میں بھی بیٹیوں والا ہوں اور اس قدر طاقتور نہیں ہوں کہ ان کی حفاظت کا دعویٰ کر سکوں جو آج جنت پر بیتی ہے' کل کو اس آگ کی تپش سے میرا گھر بھی جل سکتا ہے' گاؤں کا کوئی بھی گھر جل سکتا ہے' کیونکہ ہمارے جھونپڑوں کی دیواریں حویلی کی دیواروں کی طرح نہ تو اونچی ہیں اور نہ ہی مضبوط۔''

''اپنی گفتگو میں حویلی کا تذکرہ مت کریں مولوی صاحب ہم کسی کی گفتگو میں بھی یہ بات برداشت نہیں کر سکتے۔'' پیر صاحب نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے تحمل سے کہا۔

''اور اپنی بات جاری رکھیے۔''

''معاف کیجیے' لیکن اب کیا بات جاری رکھی جا سکتی ہے پیر صاحب! کیونکہ جو اونچا نام سارے گاؤں میں سرگوشیوں کی صورت میں لیا جا رہا ہے وہ اسی حویلی کے ایک فرد کا نام ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' پیر صاحب اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے۔

''کس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اس قبیح فعل کو اس حویلی کے ساتھ منسلک کرے؟ ہم نے آپ کو بہت عزت دی ہے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم آپ کو حویلی پر کیچڑ اچھالنے کی اجازت بھی دے دیں۔''

''آپ مجھے غلط سمجھے ہیں پیر صاحب! میں خدانخواستہ حویلی پر کیچڑ اچھالنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو صرف آپ کو وہ وقت یاد دلانے آیا تھا' جب ایک عام مسلمان خلیفۂ وقت کو بھی عدالت میں کھینچ کر لا سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ایک یہودی نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا تھا تو قاضی نے انہیں بھی کٹہرے میں طلب کیا تھا اور انہوں نے بھی اپنا دفاع ایک عام مسلمان کی طرح کیا تھا لیکن ایسا وہی عظیم انسان کر سکتا ہے جس کے ہاتھ صاف ہوں۔

پیر صاحب! ہم تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہیں۔ آپ اہل بیت میں سے ہیں' میں تو اتنا چاہتا ہوں کہ آپ اس سنت پر عمل کریں۔ غیر جانبدارانہ تحقیق کرائیں۔ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اصل مجرم چھپ سکے۔''

''کیا گاؤں والے حیدر علی کا نام لے رہے ہیں؟''

''نہیں' بڑے شاہ صاحب کا!''

پیر صاحب کے چہرے پر بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہوئی پھر قدرے توقف سے بولے۔

''جو کچھ آپ نے ہمیں پڑھانے کی کوشش کی ہے یہ سبق ہمارے ہی اجداد کا ہے اور ہم اسے بہت پہلے پڑھ چکے ہیں' آپ جا سکتے ہیں۔''

''ایک آخری درخواست کروں گا پیر صاحب۔'' مولوی صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

''کیجیے۔''

''میں بہت کمزور آدمی ہوں اور کسی طرف سے پڑنے والا دباؤ بھی برداشت نہیں کر سکوں گا۔''

''آپ بے فکر رہیں' اب یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے' آپ اسے بھول جائیں۔ اب اس سلسلے میں ہونے والی تحقیق میں ہم آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ پیر صاحب۔''

☆======☆======☆

''جاؤ جاؤ دونوں ماں بیٹے چلے جاؤ۔ میری زندگی میں کچھ تو سکھ چین کے دن آئیں گے۔'' منشی ان دونوں کو سامان باندھتے دیکھ کر چلا رہا تھا۔

''سارا مغز تو یہ دونوں چٹ کر گئے میرا۔ جب دیکھو چخ چخ جب دیکھو بک بک۔ کچھ تو زندگی اچھی گزرے گی میری۔''

لیکن منشی کے تمام تر گولہ بارود کے جواب میں وہ دونوں خاموشی اختیار کیے سامان باندھتے گئے۔

''جب کما کما کر کھلانا پڑے گا تو نانی یاد آ جائے گی۔'' وہ پھر چلایا۔

''پر بتا دوں' نانی کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جس عورت نے زندگی میں کسی کو کوئی فائدہ نہ دیا ہو' اب مرنے کے بعد کسی کو کیا فائدہ دے گی۔''

''بیٹا! نانی کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔'' اب ماں بھی میدان میں اتر آئی۔

''کہیں غلطی سے کسی دن گھبرا کر دادی کو نہ یاد کرنے لگنا۔ بھوت بن کر چمٹ جائے گی تم سے اس کی بدروح۔''

''خبردار جو میری ماں کے متعلق ایک بھی الٹی سیدھی بات کی تو...... زبان کھینچ لوں گا۔''

ماں کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ اچھو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ کرا دیا۔

''میری ماں کے ساتھ تو اس عورت کو خدا واسطے کا بیر تھا'' منشی کے ہاتھ نیا موضوع لگ گیا۔

''کبھی جو سکھ کا سانس لینے دیا ہو اس غریب کو بالآخر مار ہی چھوڑا اسے' پر چین پھر بھی نہیں آیا۔

روٹی پکا کر دی تو کبھی کچی کبھی جلی ہوئی۔ سالن میں نمک ہمیشہ تیز کر دیا۔ کپڑے دھونے کی باری آئی تو اپنے دھو کر الگ ہو گئی۔ جھاڑو لگائی تو صرف اپنے کمرے میں' گھلا گھلا کر مار دیا اس بے چاری عورت کو۔''

''میرا منہ نہ کھلواؤ اچھو کے ابا' کبھی جو میں گننے بیٹھ گئی تمہاری ماں کے کرتوت تو گاؤں میں منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی ہاں۔''

اچھو نے پھر ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اماں! ابا! ہمیں لڑ بھڑ کر الجھانا چاہتے ہیں تاکہ ہم یہیں رک جائیں اور شہر نہ جاسکیں۔ آپ خواہ مخواہ ان کی باتوں میں آتی ہیں' چلیں اب جلدی سے تیار ہو جائیں۔''

''ہونہہ.....'' اچھو کے منہ پر سے ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی کہ اماں نے بغیر کوئی بات کیے صرف صوتی اثرات دے کر منشی کی ساری باتوں کو ملیامیٹ کر دیا اور مڑ کر کپڑے بدلنے کمرے میں چلی گئی۔

''میں کہتا ہوں رک جا...... ورنہ پچھتائے گی۔ بیٹا سونے کا تاج بھی تیرے سر پر رکھ دے پر میں جو تیرا اصلی سرتاج یہیں رہ گیا تو سونا چاندی بھی تجھے کچھ نہیں دے گا۔'' منشی چلایا۔

''ایسے بوسیدہ اور مغز چاٹنے والے تاج کو سر پر سجا کر کیا کروں گی میں' تم اس گھر میں کلو چین سے رہو۔ نہ میری اور نہ میرے بیٹے کی بک بک' جھک جھک' چخ چخ......اب تو مزے میں رہو گے۔'' ماں نے کمرے سے نکلتے ہوئے تیر واپس پھینکا۔

''چلیں ماں؟'' وہ نکل آئی تو اچھو نے سامان اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''چل بیٹا۔''

ابھی وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر باہر نکلنے لگے تھے کہ منشی تہہ بند سنبھالتے ہوئے بھاگا آیا۔

''جب تم دونوں ہی جارہے ہو تو میں یہاں کس کے لیے رہوں گا؟''

☆======☆======☆

مولوی صاحب کی باتوں نے پیر صاحب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ان کے کسی بیٹے پر ایسا الزام بھی لگا سکتا تھا۔ اضطراب کی کیفیت میں وہ کمرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگے۔

''ہمارا بیٹا' وہ بھی رجب علی' ایسی حرکت نہیں کرسکتا' کسی صورت نہیں۔''

انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ان کی نگاہ دروازے سے جھانکتے ہوئے سخاوت علی پر پڑی۔

''باہر کیوں کھڑے ہو بیٹا' اندر آجاؤ۔''

سخاوت مسکراتے ہوئے اندر آگیا' لیکن پیر صاحب کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی دیکھ کر اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔

''کچھ ڈھونڈ رہے تھے بیٹا؟''

''بڑے بھائی جان کو تلاش کررہا تھا۔''

''ہوں۔'' انہوں نے پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''بیٹھو بیٹا! اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ ہمیں تم سے کچھ کام تھا۔''

''حکم دیجیے بابا جان۔''

پیر صاحب کے بیٹھنے کے باوجود بھی وہ مؤدبانہ انداز میں کھڑا رہا۔

''بیٹھ جاؤ سخاوت۔'' انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

سخاوت منتظر نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

''ایک بات کا بالکل سچ سچ جواب دینا۔''

''جی۔'' وہ کچھ نہ سمجھا۔

''تمہیں رجب علی سے زیادہ پیار ہے یا حیدر علی سے؟''

سخاوت کے لیے یہ سوال بہت عجیب سا تھا۔

''یہ تو بہت مشکل سوال ہے بابا جان! مجھے تو دونوں سے ہی بے حد پیار ہے۔''

''خوب سوچو' یقیناً کوئی ایک تمہیں سب سے زیادہ پیارا ہے۔''

سخاوت کتنی دیر تک سوچ میں گم رہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا بابا جان! مجھے تو دونوں سے یکساں پیار ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ بڑے بھائی جان مجھے علی بھائی کی نسبت زیادہ چاہتے ہیں۔''

''یہ کیسے اندازہ لگایا تم نے؟''

''وہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ ہر قسم کا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بتاتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ میری ہر بات میں دلچسپی لیتے ہیں جبکہ علی بھائی ایسا نہیں کرتے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ علی ایسا کیوں نہیں کرتا؟''

''وہ کہتے ہیں کہ اس طرح میری اپنی شخصیت کبھی نہیں بن سکے گی بلکہ میں اس شخص کی عادات میں ڈھلتا جاؤں گا' جو ہر وقت مجھے خود سے نتھی رکھے گا۔

لیکن بابا جان مجھے علی بھائی سے اتفاق نہیں ہے۔ یوں بھی بڑے بھائی جان اتنے اچھے ہیں کہ اگر میں ان کی عادات میں ڈھلتا جاؤں تب بھی یہ کوئی برائی کی بات نہیں ہوگی۔ ویسے بھی ایک جیسی عادات والے افراد زیادہ دور تک ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور ہمیں تو مرتے دم تک اکٹھے رہنا ہے۔''

''بہت خوب۔'' پیر صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ہمارا سیروں خون بڑھ گیا ہے تمہاری باتیں سن کر۔''

''شکریہ!'' وہ مسکرایا۔

''یہ بتاؤ کہ کل شام بھی تم رجب علی کے ساتھ تھے؟''

''جی' شام کو وہ مجھے شطرنج کھیلنا سکھا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ جس طرح شطرنج کی بساط سجائی جاتی ہے' ہو بہو ویسے ہی میدان جنگ کو بھی ترتیب دیا جاتا ہے۔''

''تم کتنی دیر تک رجب علی کے ساتھ تھے؟''

''پوری شام ہم اکٹھے ہی تھے۔ بھائی جان نے بہت سی بازیاں مجھے ہرائی تھیں اور برابر سمجھاتے گئے تھے کہ میں نے کہاں کیا غلطی کی تھی۔''

''ہوں......اور وہ کب تمہارے پاس سے اٹھا تھا؟''

''خیر تو ہے ناں بابا جان؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''بالکل خیر ہے بیٹا! ہم نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟''

''تقریباً ساڑھے سات بجے کا وقت تھا جب وہ میرے پاس سے یہ کہہ کر اٹھے تھے کہ علی بھائی کے پاس جا رہے ہیں۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں کچھ دیر تک خود ہی شطرنج کھیلتا رہا پھر کھانا کھا کر سو گیا۔''

''اچھا بیٹا' اب تم جاؤ' لیکن کسی ملازم سے کہہ کر علی کو میرے پاس بھجوا دو۔''

''جی بہتر بابا جان۔''

تھوڑی دیر میں حیدر علی ان کے روبرو تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ شاید رجب علی نے ان سے گوری کے سلسلے میں بات کی تھی' اس لیے ذہنی طور پر وہ اس موضوع پر گفتگو کے لیے تیار تھا۔

''آپ نے یاد فرمایا بابا جان؟''

''ہوں' بیٹھو۔''

''شکریہ۔'' وہ بیٹھ گیا۔

''آج ہم بہت پریشان ہیں۔''

وہ بولے' لیکن حیدر علی خاموش رہا۔ اس کا خیال تھا کہ پریشانی کا سلسلہ شاید اس کی شادی کے مسئلے تک جا پہنچے گا۔

''اپنے ایسے بیٹے کے خلاف تحقیق کرنا جو جان سے بھی پیارا ہو' بہت مشکل کام ہے۔''

''کیسی تحقیق بابا جان؟'' اس نے بات کو آگے بڑھانا چاہا۔

''ہم اس وقت تمہیں زحمت نہ دیتے' اگر مسئلہ اہم نہ ہوتا۔ یوں بھی تمہیں ہماری پریشانیوں سے کچھ سروکار نہیں ہے' لیکن مجبوری کے تحت ہمیں تمہیں یہ زحمت دینا پڑی۔''

''مجھے بہت افسوس ہے بابا جان!'' حیدر علی شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا۔

''میں نے آپ کو دکھ دیئے ہیں' لیکن میں بھی مجبور ہوں' مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''بس' بس ہم ان باتوں کو دوبارہ چھیڑنا نہیں چاہتے۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ہمیں یہ بتاؤ کہ کل رجب علی رات کے وقت تمہارے پاس آیا تھا۔''

''جی ہاں۔''

''کس وقت اور کتنی دیر تک بیٹھا رہا؟''

''شاید ساڑھے سات بجے یا اس سے کچھ اوپر کا وقت ہو گا اور وہ زیادہ دیر تک رکے بھی نہیں تھے۔''

''ہوں۔'' انہوں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''اب ہم تم سے جو کچھ پوچھیں گے اس کا جواب سوچ سمجھ کر سچ سچ جواب دینا۔''

حیدر علی کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ اس قسم کے سوالات کا مقصد کیا ہے۔

''کیا رجب علی کسی لڑکی کو اغوا کر سکتا ہے؟''

حیدر علی چند ثانیے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔

''تم اس کے بھائی ہو اور اس کی ذات کے ان پہلوؤں سے بھی واقف ہو گے جن سے ہم واقف نہیں ہیں۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بابا جان؟''

''صرف اس سوال کا جواب دو جو ہم نے تم سے پوچھا ہے۔''

حیدر علی سوچ میں گم ہو گیا۔ ''ہاں اور نہیں'' دونوں الفاظ کہہ دینے بہت مشکل تھے۔ ''ہاں'' اس لیے کہ بابا جان کی نظر میں اسے اپنے بھائی کی تذلیل گوارا نہیں تھی اور یہ ایک لفظ اتنا فتنہ فساد برپا کر سکتا تھا' کہ حویلی کے در و دیوار ہل کر رہ جاتے اور 'نہیں' اس لیے کہنا مشکل تھا کہ جھوٹ بولتے وقت اس کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔

''کیا رجب علی کسی لڑکی کو اغوا کر سکتا ہے؟'' پیر صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔

اور اسی سوال میں حیدر علی کو جائے پناہ مل گئی۔

''نہیں۔'' اس نے بلا تامل کہا۔

صرف اس لیے کہ رجب علی نے کبھی کوئی لڑکی خود اغوا نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ کر سکتا تھا۔ جب اتنے ملازمین موجود تھے تو اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ خود یہ کام کرتا جبکہ بابا جان نے پوچھا تھا کہ ''کیا رجب علی کسی لڑکی کو اغوا کر سکتا ہے؟'' اگر وہ ''کر سکتا ہے'' کے بجائے ''کروا سکتا ہے'' پوچھتے تو شاید حیدر علی کے لبوں کی خاموشی نہ ٹوٹتی۔

حیدر علی کے ''نہیں'' کہتے ہی پیر صاحب نے سکون کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ کسی ملازم سے کہہ کر رجب علی کو ہمارے پاس بھیجو۔''

''جی بہتر۔''

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیر صاحب کی باتوں سے اسے یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ کل رجب علی جس لڑکی کا حوالہ دے رہا تھا' اس کی کوئی خبر بابا جان تک پہنچ گئی ہے' لیکن اس سے زیادہ کا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ کسی ملازم کو کہنے کے بجائے وہ خود ہی رجب علی کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک ملازم سے دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ اس وقت اپنے پورشن میں ہے۔ یاسمین بھابی کی ملازمہ کو پیغام دے کر اس نے اندر بھیجا اور خود رجب علی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں رجب علی باہر آ گیا۔

''تم نے مجھے بلایا؟''

''میں نے نہیں بابا جان نے آپ کو یاد کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''کہاں ہیں بابا جان؟''

''وہ گول کمرے میں ہیں' لیکن ان کے پاس جانے سے قبل آپ میری بات سن لیں۔''

''کہو۔''

حیدر علی نے اردگرد دیکھا' لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی جس جگہ رجب علی موجود ہوتا تھا۔ خاص ملازمین کے علاوہ اس جگہ کے قریب جانے سے سب ہی کتراتے تھے۔

''کیا کل ڈیرے پر واقعی کوئی لڑکی تھی؟''

''تمہیں شک ہے؟'' وہ مسکرایا۔ ''لیکن میری آفر آج صبح تک تھی اور اب دوپہر ہونے والی ہے' اس لیے اب وہ آفر ختم ہو چکی ہے۔ ہاں تم چاہو تو آج نیا انتظام کر دیتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے خود پر ضبط کیا۔

''میرا خیال ہے بابا جان تک اس بات کی اطلاع پہنچ چکی ہے اور وہ تفتیش کر رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم بے فکر رہو...... میرے خلاف کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔''

''وہ لڑکی آپ کے خلاف بیان دے سکتی ہے۔''

''تو میری بیوی میرے حق میں بیان دے دے گی۔'' رجب علی نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

''بیوی کا یہ فائدہ تو ہوتا ہے ناں بلکہ میرے خیال میں بیوی کا یہ ایک ہی فائدہ ہوتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ' مجھے کچھ نہیں ہو گا۔''

☆=====☆=====☆

پیر صاحب نے مولوی صاحب کے علاوہ گاؤں کے معززین کو طلب کر لیا تھا۔ رجب علی بھی ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''آج ہم نے ایک بہت سنجیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔'' پیر صاحب کہنے لگے۔

''گاؤں کے ایک بہت معزز فرد نے سیّد رجب علی شاہ کے خلاف ایک انتہائی سنگین الزام عاید کیا ہے۔ یہ الزام ایک بچی کے اغوا کے بارے میں ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ بچی یہاں آ کر تماشہ بنے' اس لیے ہم نے اس کے بجائے اس کے گھر کے مرد حضرات کو بھی یہاں بلا لیا ہے۔ اس وقت دونوں فریقین یہاں موجود ہیں ہم چاہیں گے کہ اس واقعے کے متعلق آپ لوگوں کو جو بھی بات معلوم ہو جائے' وہ بلا جھجک اور بلا کم و کاست بتا دیں۔''

ان کی بات کے جواب میں سب خاموش رہے' کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ رجب علی کی موجودگی میں اس کا نام لے سکتا۔ اس کی آنکھیں وہاں موجود لوگوں کو یہ بتا دینے کے لیے کافی تھیں کہ اپنے خلاف کھلنے والی ہر زبان کو وہ بآسانی بند کر سکتا تھا۔ سو عافیت اسی میں تھی کہ چشم پوشی اختیار کر لی جاتی اور سب نے یہی کیا۔

پیر صاحب نے ایک ایک سے پوچھا' لیکن سب نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ جنت بی بی کے گھر والوں نے بھی اس واقعے کی تردید کر دی۔

صرف ایک شخص ایسا تھا' جس نے اپنی کہانی پہلے کی طرح دہرائی تھی اور وہ تھا ماسی بیداں کا لڑکا گلا۔ وہ اب بھی مُصر تھا کہ آپا جنت پر چاچا شکورے نے کھیس ڈالا تھا اور آپا جنت چیخی چلائی بھی تھی۔

''حضور بچہ ہے پتا نہیں کیا خواب دیکھ لیا ہو گا۔'' لوگوں نے کہا۔ ''ورنہ ہم جانتے ہیں کہ شکورے نے یہ نہیں کیا۔''

''رجب علی۔'' پیر صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کل شام سے صبح تک تم کہاں تھے؟''

''کل شام پہلے ہم سخاوت کے ساتھ تھے پھر حیدر علی کے پاس چلے گئے' اس کے بعد صبح تک ہم یہیں حویلی میں تھے۔'' وہ بولا۔ ''اور آپ کسی سے بھی اس کی تفتیش کروا سکتے ہیں۔''

''سخاوت اور حیدر اس بات کی تصدیق کریں گے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی بابا جان۔'' ان دونوں نے تصدیق کی۔

''اب ایک آخری گواہی رہتی ہے۔ ویسے تو آپ سب زبان سے مان چکے ہیں کہ رجب علی بے قصور ہے' لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے دل اس کے بے قصور ہونے کی گواہی دیں' ورنہ یہ خلش ساری زندگی کانٹے کی طرح ہمارے دل میں پیوست رہے گی۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''اگر تو ہماری بہو بیگم نے کہہ دیا کہ رجب علی بے قصور ہے تو اعتراض اور شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ گو کہ ہمارے گھرانے کی بہو بیٹیوں کا پردہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کی آواز بھی کوئی غیر محرم شخص سنے' لیکن چونکہ آپ میں سے ہی ایک شخص نے ہمیں اہل بیت کی سنت کا حوالہ دے کر ہم سے انصاف طلب کیا تھا' اس لیے اپنے جذبات کو دبا کر ہم اپنی بہو بیگم

سے اس بات کی تصدیق یا تردید آپ لوگوں کی موجودگی میں کرائیں گے' وہ پردے کے پیچھے رہ کر اپنا بیان دیں گی۔''

''بابا جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' رجب علی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''آپ وہاں کمرے میں جا کر خود ان سے پوچھ لیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے' لیکن پردے کے پیچھے ہی سہی' ان کا یہاں آنا انتہائی غیر مناسب بات ہے۔''

''یہ ہمارا حکم ہے رجب علی' ہماری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے' آج ہیں' کل نہیں ہوں گے' لیکن جاتے جاتے ہم اپنا اجلا دامن میلا نہیں کر سکتے۔ کیا جواب دیں گے ہم اپنے ان بزرگوں کو جنھوں نے عدل وانصاف کی اعلیٰ روایات قائم کی تھیں۔ تم تو اس وقت مجرموں کے کٹہرے میں ہو اور تمہیں اس قسم کی بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''گستاخی معاف بابا جان! جب بڑے بھائی جان پر کسی نے کوئی الزام لگایا ہی نہیں ہے' یہاں تک کہ جنت بی بی کے والدین کے مطابق یہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا تو پھر اتنا آگے بڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' حیدر علی نے مداخلت کی۔

''اس تصدیق یا تردید کی ضرورت تو تب پڑتی جب اس بات کی افواہ سے زیادہ کوئی حیثیت ہوتی۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ جرم ہوا ہی نہیں ہے تو پھر تفتیش کس چیز کی ہو رہی ہے؟ ایک شخص نے اپنے آپ کچھ گھڑ کے یا اڑتی اڑتی کوئی بات سن کر ان پر الزام لگا دیا' لیکن ثابت کیا ہوا؟ کچھ نہیں۔ یہ تک تو ثابت نہیں ہو سکا کہ کل کوئی لڑکی اغوا ہوئی تھی۔''

''درست فرما رہے ہیں چھوٹے شاہ صاحب۔'' بہت سے لوگوں نے بآواز بلند حیدر علی کی بات سے اتفاق کیا۔

''پیر صاحب! یہ بات ہمارے لیے بھی تکلیف دہ ہے کہ بہو بیگم یہاں تشریف لائیں۔'' ایک بزرگ نے کہا۔

''گویا آپ لوگ مطمئن ہیں کہ ایسی کوئی بات سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوئی؟'' پیر صاحب نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں۔'' تقریباً سب نے کہا۔

''اور اب اس الزام پر مزید تحقیق کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

''جی بالکل۔''

''اور یہ کہ رجب علی بے قصور ہے۔''

''جی بالکل۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے ہماری عزت رکھی۔'' پیر صاحب کلمہ شکر پڑھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بابا جان گستاخی معاف' پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔'' رجب علی نے پوچھا۔

''ہم شکرانے کے نوافل پڑھنے جا رہے ہیں۔''

''لیکن بابا جان معاملہ ابھی ختم تو نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟''

''ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق دیا جائے۔''

''کیسا حق؟''

''جس شخص پر غلط الزام لگایا جاتا ہے اسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ الزام کے جھوٹے ثابت ہونے پر وہ الزام لگانے والے پر قذف کا مقدمہ پیش کر دے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ ہمیں بطور ملزم اپنے اور اتنے لوگوں کے روبرو لائے ہیں اسی طرح ہم پر الزام لگانے والے کو بھی بلائیں۔''

پیر صاحب چند ثانیے تک خاموش رہے پھر گویا ہوئے۔ ''رجب علی' بات یہ ہے کہ تمہارا یہ حق طلب کرنا غلط نہیں ہے' لیکن ہمارا گھرانہ اتنے اونچے مقام پر کھڑا ہے کہ ہمیں درگزر کرنے کی روایت اپنانی چاہیے۔ طاقت رکھتے ہوئے معاف کر دینے والے کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بنا لیتا ہے۔''

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ۔'' چاروں طرف سے صدائیں آنے لگیں۔

پیر صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے گاؤں کے افراد بھی انہیں سلام کر کے باہر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف رجب اور حیدر علی ہی موجود تھے۔

''یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔'' حیدر علی نے سگریٹ سلگا لیا۔

''کیا اچھا نہیں ہوا؟'' رجب علی نے یوں کہا جیسے اسے کچھ علم ہی نہ ہو۔

''آپ جانتے ہیں کہ میرا اشارہ کس بات کی طرف ہے۔''

''تمہارے نزدیک اچھا ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یعنی یہ کہ یہاں موجود سب لوگ میرے خلاف گواہی دیتے۔''

''نہیں میرے نزدیک اچھا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی۔''

''یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ بابا جان کی نگاہوں میں میری قدرومنزلت میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں آئی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ گاؤں والے میری آنکھوں کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ آئندہ وہ چوں کرنے کی حماقت بھی نہیں کریں گے۔ ویسے حقیقت تو تم بھی جانتے تھے اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی تم نے میرا ساتھ دیا تو کیا یہ بہت اچھا تھا۔''

''نہیں اچھا تو یہ بھی نہیں تھا' لیکن ساتھ میں نے آپ کا نہیں' بھابی کا دیا ہے۔ جانتا

ہوں کہ ان کے لیے حویلی کے اندرونی حصے سے یہاں تک آنا پل صراط سے گزرنے کے برابر ہو گا اور پھر باآواز بلند جھوٹ بولنا' نہیں وہ یہ سب نہیں کرسکتیں اور میں انہیں اس تکلیف دہ صورت حال سے دوچار کرنا نہیں چاہتا اس لیے میں نے جو کچھ کہا' وہ آپ کی نہیں اپنی بھابی کی وجہ سے تھا۔"

رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "اپنی بھابی کا خیال رکھنے کا شکریہ۔"

☆======☆======☆

گول کمرے سے نکل کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھتے ہوئے بھی پیر صاحب کے ذہن میں رہ رہ کے گلے کے الفاظ کانٹوں کی صورت میں چبھ رہے تھے۔ گاؤں کے سارے لوگوں کی گواہی کے بعد محض ایک چھوٹے سے بچے کی بات کو سب کی بات پر فوقیت دینا کسی طرح مناسب نہیں تھا' لیکن وہ بچہ اتنی سختی سے اپنے مؤقف پر قائم تھا کہ اس کی بات کو یک دم رد کر دینا بھی ممکن نہیں تھا۔

شکرانے کے نوافل ادا کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ حویلی کے اس پورشن کی طرف بڑھے جو رجب علی اور یاسمین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اندر اطلاع بھجوانے کے تھوڑی ہی دیر بعد یاسمین خود دروازے پر نمودار ہوئی۔

"باباجان آپ! آپ نے کیوں زحمت کی' مجھے بلوالیا ہوتا۔"

"بیٹیوں کو بلایا نہیں جاتا' ان کے پاس خود چل کر جایا جاتا ہے۔" وہ بولے۔

"آئیں اندر تشریف لائیں۔" وہ انہیں اندر لے آئی۔

"یہاں ہماری بیٹی کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"نہیں باباجان!" وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں بہت خوش ہوں۔"

"رجب علی سے کوئی شکایت؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"ہم آپ سے ایک سوال کا جواب لینے آئے ہیں۔"

"مجھ سے؟" یاسمین نے حیرت سے پلکیں اٹھائیں۔

"ہاں آپ سے' لیکن ہمیں اپنے سوال کا بالکل سچا جواب چاہیے۔"

"پوچھیے باباجان' میں اپنے علم کی حد تک آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔"

"کیا کل رات رجب گھر پر تھا؟"

یاسمین کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ پیر صاحب کو بغور اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے گھبراہٹ میں اپنی نظریں جھکا لیں۔

"جی۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"ہمیں سچ جواب چاہیے۔"

"جی باباجان! یہی سچ ہے۔" اس نے بے چینی سے انگلیاں مروڑیں۔

"لیکن ہمیں ملازمین نے کہا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔" انہوں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

یاسمین کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا' لیکن بولی کچھ نہیں۔

"رات کو ہم نے اسے طلب کیا تھا' اس وقت وہ کہاں تھے؟"

ان کا سوال پوچھنے کا انداز اتنا قطعی تھا کہ یاسمین کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں رہا۔

"یہ ضروری تو نہیں باباجان کہ کوئی گھر پر نہ ہو تو وہ کسی غلط جگہ پر ہی گیا ہوگا۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ "ویسے وہ زیادہ دیر کہیں باہر نہیں رہے تھے۔ ہم نے کھانا بھی اکٹھے کھایا تھا۔"

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' اس کا لہجہ اس بات کی تائید نہیں کر رہا تھا۔

"ہوں' شوہر کی پردہ پوشی اچھی بات ہوتی ہے لیکن اس حد تک پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ گھر کی بنیادیں ہی کمزور ہونے لگیں۔" پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم صرف آپ کے تایا یا سسر ہی نہیں ہیں' آپ کے والد کو بھی ہم نے اپنے ہاتھوں میں پالا ہے۔ اس گھر پر سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف ہو تو اپنے والد کے پاس جانے سے قبل آپ ہمارے پاس آئیں۔"

پیر صاحب کی بات سن کر یاسمین کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں۔ واضح طور پر انہوں نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔

"اب ہم چلتے ہیں' جیتی رہو۔"

اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ چلے گئے لیکن دکھ کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

☆======☆======☆

... ورا' رجب علی کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

"گڑبڑ یہ ہوئی کہ لڑکی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔"

"اس سے تو ہم بعد میں نمٹیں گے۔" رجب علی بولا۔

"لیکن پہلے اس شخص سے نمٹیں گے جس نے یہ بات حویلی کے اندر پہنچائی۔ وہ صرف ... ہے۔ ہمیں کل شام تک اس شخص کا نام معلوم ہو جانا چاہیے' جس نے یہ بات باباجان کو ... ہے۔"

"حضور! یہ حرکت تو گاؤں کا کوئی بھی فرد کر سکتا ہے کیونکہ جنت نے چلا چلا کر سب کے سامنے آپ کا نام لیا تھا اور سارے گاؤں کو پتا چل گیا تھا۔"

“ہمیں لایعنی قسم کی تاویلیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔” رجب علی نے سختی سے
کہا۔

“گاؤں میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ یہ بات بابا جان تک پہنچائے۔ ادھر گول کمرے میں سب نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس میں اتنا جگرا تھا کہ وہ آگے بڑھا۔”

“باقی سب لوگ تو واقعی ڈرتے ہیں۔ ہاں ایک بندہ ہے جس میں بہت اکڑ ہے۔”

“اور وہ کون ہے؟”

“اچھو! ہو نہ ہو یہ کام اسی نے کیا ہے۔ اس پر زیادہ شک کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ماں اور اپنی ماں کے ساتھ گاؤں چھوڑ گیا ہے۔ منشی میں تو اتنا دم خم ہے نہیں' البتہ اچھو خود کو بہت پھنے خان سمجھتا ہے۔”

“اچھو گاؤں چھوڑ گیا ہے اور منشی بھی چلا گیا ہے؟”

“جی سرکار! آپ کو شاید جلد خبر ہو جاتی منشی کی غیر حاضری کی' اگر صبح صبح یہ فسادی [illegible] جاتے۔”

“اور تم ہمیں اب اطلاع دے رہے ہو۔”

“سرکار میرا قصور نہیں ہے' مجھے خود بھی پانچ منٹ پہلے پتا چلا ہے۔ میں بھی اسی مسئلے میں مصروف تھا۔ اس لیے ان کی غیر موجودگی کا احساس دیر سے ہوا۔” شکورے نے اپنی صفائی [illegible] کی۔

“ہو نہ ہو یہ اسی کی شرارت ہے اور اب وہ ڈر کر گھر سے بھاگ گیا ہے۔ جاتے [illegible] سرکار کسی سے مل کر بھی نہیں گیا۔”

“لیکن کل تو وہ تمہارے ساتھ تھا جنت کو تم دونوں نے مل کر اٹھایا تھا ناں!”

“جی' جی بالکل۔” وہ جلدی سے بولا۔

اب وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کل اس نے رجب علی کو یہی بتایا تھا۔

“پر سرکار! ساتھ تو وہ تھا ہی میرے' لیکن بہت بکواس کر رہا تھا' بہت سبق پڑھا رہا تھا مجھے۔”

“سبق تو اسے ہم دیں گے اور ایسا دیں گے کہ لوگ کانپ اٹھیں گے۔ بابا جان کے سامنے اس نے ہماری حیثیت کم کرنے کی جو سازش کی تھی' اس کا اسے ایسا نتیجہ بھگتنا پڑے گا کہ گاؤں کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔” رجب علی نے کہا۔

“اس وقت ہمارے سامنے چند اور ایسے مسائل ہیں جنہیں حل کرنا بہت ضروری ہے [illegible] کے بعد اچھو کو بھی دیکھیں گے۔”

“شکر ہے۔” شکورے نے سوچا۔ “کل تک میں بندہ کہاں سے تلاش کرتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اچھو گاؤں چھوڑ کر گیا تو پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا ورنہ یہی پھندا میری اپنی گردن پہ ہوتا۔”

☆======☆======☆

“بی بی! اچھو بھائی آپ کے لیے پیغام دے گئے ہیں۔” حمیدہ نے زیب النساء سے کہا۔
آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا جائزہ لیتے ہوئے زیب النساء اٹھ کر مسہری پر آ بیٹھی۔

“کیا کہا ہے؟” اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

“وہ آج شہر چلے گئے ہیں۔ منشی اور اس کی ماں بھی اس کے ساتھ ہی ہیں اور وہ کہہ گئے ہیں کہ وہاں کوئی چھوٹا موٹا مکان ڈھونڈ کر وہ جلد ہی واپس آئیں گے۔ تب تک آپ تیار رہنا۔ وہ آئیں بھی اطلاع دیئے بغیر' بس وہ صرف آپ کو لینے آئیں گے اور آپ کو لے کر فوراً ہی واپس چلے جائیں گے۔”

☆======☆======☆

رجب علی کو پیر صاحب نے فوری طور پر لاہور بھجوا دیا تھا۔ حکم یہ تھا کہ وہ حیدر علی کی شادی کی تیاری کر سکے' لیکن حقیقت یہ تھی کہ کچھ عرصے کے لیے وہ اسے گاؤں سے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ جنت بی بی والا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے۔

رجب علی نے انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا' لیکن اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے انہوں نے اس لیے گریز کیا تھا کیونکہ ایک تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ ان کا سب سے پیارا بیٹا اور ان کی گدی کا وارث بھی تھا' لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہیں اپنے گھرانے کی عزت بہت عزیز تھی۔ جس واقعے سے گاؤں والوں نے لاعلمی ظاہر کی تھی اسے کرید کر اپنے گھرانے کو رسوا کرنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ تو تحقیق اور تفتیش پر بھی اس لیے راضی تھے کیونکہ انہیں رجب علی کی بے گناہی کا سو فیصد یقین تھا' لیکن اس نے ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

مولوی صاحب شرمندگی کے مارے منہ سر لپیٹے پڑے تھے۔ ان کی خطا اتنی تھی کہ جو بات کہنے کی کسی اور میں ہمت نہیں تھی۔ وہ انہوں نے کہہ دی تھی۔ سب پیچھے ہٹ گئے تھے اور وہ اگلی صف میں تنہا رہ گئے تھے۔

سب سے زیادہ دکھ تو انہیں اس بات کا تھا کہ ان کی بات جھوٹ ثابت ہو جانے کے بعد ان کے خیال میں وہ پیر صاحب کے سامنے اپنی عزت کھو چکے تھے۔

“میں نے تو پہلے ہی منع کیا تھا مولوی صاحب کو۔” اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"کیا ملا سچ بول کر۔ خود جنت کے گھر والوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بے حال
لڑائی میں پڑ کر کیا فائدہ ملا' جوان لوگوں کو اپنی عزت کا احساس نہیں ہے' ہمیں کیا پڑی ہے ان کا
خیال کرنے کی۔ یہ تو وہی ہوا ناں مدعی سست' گواہ چست۔"

"لیکن اماں بڑے شاہ صاحب یہ کیسے کر سکتے ہیں؟" زرینہ نے دبے دبے لہجے میں
اعتراض کیا۔

"میں بھی یہی سمجھ رہی تھی' لیکن جنت کے گھر جانے کے بعد مجھے اس بات کا یقین آ ہی
گیا۔ اس کے ماں باپ نے اسے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی تھی' لیکن کھڑکی کی سلاخوں
سے جھانک کر میں نے اس کی حالت دیکھی تھی اور تب مجھے یقین آ گیا تھا۔ اس نے خود بھی مجھے
بتایا تھا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"لیکن اماں۔"

زرینہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ حقیقتاً پریشان تھی۔ ہر آنے والا دن اس کے اور حمید گل
کے بیچ پھر فاصلے بڑھا رہا تھا' لیکن سب پریشانیوں کے درمیان بھی دور بہت دور امید کی کرن
چمک رہی تھی۔ سائیں بابا کے الفاظ اس کے ڈوبتے وجود کے لیے محض تنکے کا سہارا ہی سہی لیکن
یہ تنکے کا سہارا ابھی بہت تھا۔

☆======☆======☆

زیب النساء اسی وقت بال سکھا کر مسہری پر لیٹی تھی۔

رات بھیگ رہی تھی۔ آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے اچھو سے ملے ہوئے۔

"نہ جانے وہ کب آئیں گے اور مجھے اس قید سے رہائی نصیب ہوگی۔ نہ جانے کب میں
کھلی ہوا میں سانس لے سکوں گی۔ زندگی ایک دم بدل جائے گی' رنگ ہی رنگ' خوشبو ہی خوشبو
ہر طرف بکھر جائے گی۔ ایک ہفتہ کتنا لمبا ہوتا ہے۔ سات طویل دنوں سے مل کر بنتا ہے' اور
طویل دن جیسے صدیاں ہوں۔"

اچھو سے ہونے والی دو ملاقاتیں اس کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔ ان کا ایک ایک لمحہ کسی فلم کی
مانند اس کی آنکھوں کے سامنے چلتا رہتا تھا۔ کوئی ایک لمحہ ایک پل بھی ایسا نہیں تھا جب ان کا
خیال زیب النساء کے ذہن سے محو ہوا ہو۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ۔" وہ اٹھ بیٹھی۔

اندر داخل ہونے والی حمیدہ تھی۔

"حمیدہ تم؟ اس وقت خیر تو ہے؟"

بی بی وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے جلدی سے اس کے پاس آئی اور سرگوشی میں

بولی۔ "اچھو بھائی نے آپ کے پاس بھیجا ہے' وہ باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں
کہ جس قدر جلد ممکن ہو چلی آئیں۔"

"وہ باہر ہیں؟ مجھے لے جانے آئے ہیں؟" زیب النساء کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ "لیکن
اس قدر اچانک۔"

"انہوں نے کہا تو تھا کہ وہ کسی بھی وقت آ جائیں گے بغیر اطلاع دیئے۔ وہ کہہ رہے ہیں
جلدی کریں۔ بڑی سڑک تک آپ کو پیدل جانا ہوگا' آگے البتہ سواری کا انتظام ہے۔"

"مم...... میں تیار ہوں۔" اس نے سفید باریک ریشمی دوپٹا اٹھایا۔

"لیکن میں سب سے مل کر جاؤں گی۔"

"اتنا وقت نہیں ہے بی بی! اچھو بھائی بہت جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں آئے ہیں۔
بڑے صاحب کے ملازموں نے انہیں دیکھ لیا تو چھوڑیں گے نہیں۔" حمیدہ نے اسے سمجھانے کی
کوشش کی۔

"لیکن میں بابا جان سے تو مل لوں۔"

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کریں۔"

وہ جلدی سے پیر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں ان کے علاوہ اماں جان'
یاسمین بھابی...... اور مہر النساء بھی تھیں۔

"آئیں بٹیا! ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر پیر صاحب
مسکرائے۔

"میرا؟ بابا جان!"

"ہاں آپ کا۔" یاسمین بولی۔

"بیٹھو بٹیا!" اور اماں جان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"میں یونہی آ گئی تھی' بیٹھوں گی نہیں۔"

"کیوں بٹیا!"

"بس بابا جان نیند آ رہی ہے۔" وہ بولی۔

"آپ سب کو خدا حافظ کہنے آئی تھی۔"

"شب بخیر میری چندا۔" اماں جان نے کہا۔

"دیکھیں نذری بیگم سفید لباس میں ہماری بیٹی کتنی پیاری لگ رہی ہے' فرشتوں کی طرح
پاکیزہ' معصوم۔"

اس کے دل پر خنجر سا چل گیا' آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی' اس لیے
نہیں کہ اسے کسی سے نفرت تھی۔ نہیں وہ تو سب کے لیے صرف اور صرف محبت کے جذبات رکھتی

تھی۔ اس کے جانے کی وجہ افراد نہیں، روایتیں تھیں۔ بابا جان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے کا خیال دل پر آرے چلا رہا تھا، لیکن اسے بہر حال جانا تھا۔

''کیا ہوا؟ آپ کی آنکھیں کیوں بھیگ گئیں؟'' پیر صاحب بے چین ہو گئے۔

''کچھ نہیں بابا جان! سوچ رہی ہوں کہ یہ محبت نہ ملے تو کیا ہوگا۔'' وہ چند قدم آگے بڑھ کر پیر صاحب کے قریب آگئی۔

''بابا جان! میرے ماتھے پر پیار کریں۔''

فرطِ محبت سے پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ زیب النساء کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

''شکریہ بابا جان!'' اس نے آنکھیں موند کر آنسو پیچھے دھکیلے اور واپس مڑ گئی۔

''اسے کیا ہوا پیر صاحب؟'' اماں جان کی آواز اندیشوں سے کانپ رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا اماں جان۔'' مہر النساء ایک لمحے میں سب کچھ سمجھ گئی تھی پھر بھی تسلی دینے کی غرض سے بولی۔

''جب میں یہاں آ رہی تھی تو یہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ شاید کوئی برا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔''

☆======☆======☆

حویلی کے عقبی پھاٹک سے باہر نکلتے ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ واپس لوٹ جائے۔ محبتوں کی زنجیر پاؤں جکڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بچپن سے جوانی تک کتنے لمحات ایک پل میں آنکھوں کے سامنے گزر گئے۔

وہ بچپن کے خوبصورت دن بابا جان اور رجب علی بطور خاص اس کے لیے چن چن کر خوبصورت گڑیاں لایا کرتے تھے۔ جب حیدر علی پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا' جب مہر النساء اپنی گڑیوں کے لیے اس کی گڑیوں کے کپڑے چرا لیا کرتی تھی اور پھر دونوں میں خوب لڑائی ہوتی تھی' تب رجب علی ان دونوں میں صلح کرایا کرتا تھا۔

اور ایک دن جب وہ حویلی کے دالان میں بنے تالاب میں پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گر گئی تھی تو کیسے رجب علی اور حیدر علی دونوں نے اسے بچانے کے لیے اکٹھے پانی میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ باہر نکلنے کے بعد بھی وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ کتنی دیر تک رجب علی سے لپٹ کر روتی رہی اور وہ پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے چپ کراتا رہا تھا۔

اور پھر جوانی آئی۔ بے رنگ اور بے رونق' لیکن ماں باپ کی محبتوں سے بھرپور۔ اس کے بعد اچانک ہی ایک روز وہ محبت کے بالکل نئے مفہوم سے آشنا ہوئی تھی۔

زیب! اپنے قریب اچھو کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

''آں...... آپ؟''

''بہت دیر کر دی تم نے میں خاص طور سے موٹر لایا تھا تمہارے لیے...... ایسا نہ ہو کہ ڈرائیور انتظار سے بے زار ہو کر واپس چلا جائے۔''

اس نے باہر نکل کر اپنے پیچھے پھاٹک بند کر دیا۔

''میں پھپھو جانی کی آرامگاہ پر فاتحہ پڑھ آؤں۔''

''اس کا وقت نہیں ہے۔''

''خدا کے لیے اس کام سے مجھے نہ روکیں۔ پھر زندگی میں تو کیا شدید موت کے بعد بھی مجھے یہاں آنا نصیب نہ ہو۔''

''اچھا جلدی کرو۔'' زیب النساء نے اتنے منت بھرے انداز میں کہا کہ اچھو کو اجازت دینا ہی پڑی۔

''شکریہ۔'' وہ دونوں ساتھ ساتھ قبرستان میں داخل ہو گئے۔

''اندھیرے میں تمہارے سفید کپڑے بہت نمایاں ہو جائیں گے۔''

''رات کے اس پہر کون ہوگا' جو ہمیں دیکھ لے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ مگر اب جلدی کرو۔''

☆======☆======☆

حیدر علی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ رجب علی کو بابا جان نے شادی کے سامان کی خریداری کے لیے لاہور بھیج دیا تھا اور وہ جب بھی لاہور جاتا تھا' اس کے آنے کے بارے میں کوئی حتمی دن یا وقت نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ کبھی ہفتہ بھر میں لوٹ آتا تھا اور کبھی مہینے تک بھی واپس نہیں آتا تھا۔

''میرا خیال ہے اس سلسلے میں مجھے خود ہی بابا جان سے فائنل بات کرنا ہوگی۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''بس بہت ہو گئی' اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ پیر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں صرف اماں جان اور وہ بیٹھے ہوئے تھے۔

''میرا بیٹا آیا ہے۔'' اماں جان کھل اٹھیں۔

پیر صاحب نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ حیدر علی نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا پھر اماں جان کی طرف بڑھ گیا۔ ان سے مل کر اور چند منٹ باتیں کر کے وہ پیر صاحب کے قریب چلا آیا۔

''اگر آپ فارغ ہوں بابا جان تو مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''ہمیں بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔'' انہوں نے کتاب بند کی اور عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔

''جی فرمائیے۔''

''ہم نے تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے آج صبح ہی تمہارے ماموں اور ان کے بڑے فرزند آئے تھے۔ ہم چاہتے تو ایک ہفتے کے اندر اندر تمہاری شادی کر دیتے' لیکن اس جلد بازی پر لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل سکتا تھا۔ تمہیں تو شاید کوئی فرق نہ پڑتا لیکن ہم فوزیہ بٹی پر کوئی انگلی اٹھتے نہیں دیکھ سکتے' اس لیے آج سے ٹھیک ڈیڑھ مہینے کے بعد یعنی اگلے مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو ہم تمہاری شادی کر دیں گے' تم تیار رہنا۔''

☆======☆======☆

موسم کتنا سہانا ہو رہا ہے...... ہے ناں؟'' زیب النساء نے کہا۔

''ہاں۔''

وہ دونوں اونچی نیچی پگڈنڈی پر چلتے جا رہے تھے۔

''ہوا کتنی اچھی لگ رہی ہے نرم نرم سی' لگتا ہے بارش ہو گی۔ بارش میں بھیگنا کتنا اچھا لگتا ہو گا۔''

''بہت اچھا لگتا ہے۔ آئندہ جب کبھی بارش ہو تو تم ضرور اس میں بھیگنا۔ میں زکام کی دوائیں ہر وقت گھر میں رکھوں گا۔''

اس کی بات سن کر زیب النساء کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''نہیں' ابھی میرا بیمار پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تمہارے بال ہواؤں میں اُڑتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔''

''میں نہا کر نکلی تھی' اس وقت گیلے تھے' اس لیے نہیں باندھے۔ بعد میں اتنی جلدی میں نکلنا پڑا کہ باندھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ٹھہریں میں باندھ لوں۔''

''نہیں کھلا رہنے دو' یوں بہت اچھے لگ رہے ہیں اور تم تو کھلے بالوں میں قیامت ڈھا رہی ہو۔''

زیب النساء ہنس دی۔

''مجھے تو جلدی میں کوئی موٹی چادر لینے کا بھی خیال نہیں آیا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

وہ باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ موڑ مڑ کے ایک کار ان کے بالکل سامنے آ گئی۔ کار کی ہیڈ لائٹس جگمگا رہی تھیں۔

خوف کے مارے زیب النساء کو خون اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔ ہیڈ لائٹس کی زد میں آتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

☆======☆======☆

اس مرتبہ رجب علی کا ارادہ زیادہ دن تک لاہور میں رکنے کا نہیں تھا۔ اس نے حیدر علی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ گوری کے سلسلے میں بابا جان سے بات کرے گا' اس لیے ایک ہفتے میں ضروری خریداری سے فارغ ہو کر اور باقی سامان کا آرڈر دے کر اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ اسے گاؤں پہنچنے کی اس قدر جلدی تھی کہ دھوپ کی پروا کیے بغیر اس نے اسی وقت سفر شروع کر دیا تاکہ رات تک حویلی پہنچ سکے۔ زیورات کا آرڈر دیتے ہی وہ گاؤں کی طرف چل پڑا تھا۔ یوں بھی اسے کون سا سامان ساتھ لانا تھا۔ جو کچھ خریداری کی تھی وہ ملازمین کو اپنے ساتھ لانی تھی اور اس کا اپنا تو کچھ سامان تھا نہیں۔

لاہور میں گلبرگ والے مکان میں سب کچھ پہلے سے موجود تھا۔ بس ایک ریوالور تھا' جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھنے کا عادی تھا۔ اس کے علاوہ سفر پر نکلتے ہوئے وہ کوئی سامان پاس نہیں رکھتا تھا۔

وہ گاڑی چلاتا رہا اور پچھلی سیٹ پر شکورا اونگھتا رہا راستے بھر وہ حیدر علی اور گوری کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ شاید وہ پہلے ہی بابا جان سے اس سلسلے میں بات کر لیتا' لیکن انہوں نے بالکل اچانک ہی اسے لاہور جانے کا حکم دے دیا اور ان کا حکم ٹالنا اسے کسی صورت پسند نہیں تھا۔ پھر یہ سوچ کر بھی وہ شہر چلا آیا کہ شادی تو بہر حال حیدر علی کی ہونی ہی ہے اس لیے خریداری کر ہی لینی چاہیے لگے ہاتھوں کچھ دن روز کی اکتائی ہوئی زندگی سے باہر نکلنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ رہ گئی گوری والی بات تو وہ آ کر بھی کی جا سکتی ہے۔

انہی سوچوں میں گم اس نے جی ٹی روڈ سے گاڑی گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک پر اتار لی۔ یہاں ہر طرف اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی جھانکتا اور پھر وہیں چھپ جاتا۔ لگتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ جبکہ وہ بارش سے پہلے پہلے حویلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گاؤں کے کچے راستوں پر اپنی کار کولت پت کرنا اسے بالکل گوارا نہیں تھا ایسے میں جیسے ہی اس نے موڑ موڑا' دو ہیولے اس کے سامنے آ گئے۔

''حضور! یہ تو اچھو ہے۔'' شکورا ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

''ہوں۔'' رجب علی نے کار روک دی۔

''اور اس کے ساتھ کون ہے۔''

''پتا نہیں سرکار' پہلی مرتبہ اس کے ساتھ کوئی لڑکی دیکھ رہے ہیں۔''

اچھو اور اس کے ساتھ والی لڑکی دونوں رک چکے تھے۔ لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے اس کا باریک سفید ریشمی دوپٹا اتر کر لہرا رہا تھا' لیکن سب سے خوبصورت اس کے بے حد لمبے بال تھے' جو ہوا کے دوش پر ایسے اُڑ رہے تھے جیسے کسی نے فضا میں ریشم بکھیر دیا ہو۔ چہرے کو چھپانے والے اس کے گورے گورے ہاتھ کسی کو بھی دیوانہ بنا لینے

کے لیے کافی تھے۔ سفید پیراہن میں لپٹی وہ لڑکی بالکل آسمان سے اُتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔

''یہ سرسوتی ہے' لکشمی ہے کہ اُما۔'' رجب علی نے سوچا۔ ''یا پھر ایفروڈائٹ مجسم ہو گئی ہے۔''

لیکن عجیب بات تھی' ایسی مکمل خوبصورتی بہت کم دیکھی تھی اس نے' پھر بھی اتنا حُسن دیکھ کر پہلی مرتبہ اس کے جذبات میں ہلچل نہیں مچی تھی۔ بس وہ اس قدر حُسن دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ آسمان سے اتری اس پری کو دیکھنے کے بعد وہ اچھو کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ اس لڑکی کو قریب سے دیکھنے کی خواہش لے کر وہ کار سے اتر آیا۔

اچھو کی نگاہیں کار پر ہی مرکوز تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی کے باعث وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ کار میں کون ہے' لیکن اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ کار سوار رجب علی یا حیدر علی میں سے ہی کوئی تھا۔ ذہنی طور پر وہ ہر خطرے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اور پھر رجب علی کو اترتے دیکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور زیب النساء کو خود سے قریب کر لیا۔ رجب علی بھی بغور انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کار کے دوسرے دروازے سے شکورا بھی اتر آیا۔

''نمک حرام! تیرا خیال تھا کہ تُو بڑے شاہ صاحب سے بچ جائے گا۔'' شکورا اترتے ہی بولا۔ ''لیکن دیکھ تیری موت خود تجھے کھینچ کر انہی کے روبرو لے آئی ہے۔''

''بڑے بھائی جان!'' زیب النساء نے زیرلب کہا۔

سردی کی ایک لہر اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس ہوئی اور وہ بے ساختہ چیخ پڑی۔

''اچھو! مجھے بچالو۔''

چلاتے ہوئے اس نے اچھو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔

رجب علی جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گیا۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''زیبی۔''

گو کہ وہ زیب النساء کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا' لیکن اس کی آواز تو وہ کروڑوں کی آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ غصے اور نفرت کا زہر اس کے پورے وجود میں سرائیت کر گیا۔ اس کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ عمل کا وقت تھا' لیکن اس جوش میں بھی اس کے حواس برقرار تھے۔ اس قدر بے عزتی کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور بے عزتی بھی اپنی ہی بہن کے ہاتھوں۔ سر موڑے بغیر وہ شکورے سے مخاطب ہوا۔

''شکورے! تم گاؤں چلے جاؤ' ہم تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔''

''لیکن شاہ صاحب آپ کو اس طرح چھوڑ کر......'' کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اسے احساس ہو گیا تھا کہ صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ سنگین تھی' جتنا کہ اسے نظر آ رہی تھی۔

''ہم کہہ رہے ہیں تم گاؤں جاؤ۔'' رجب علی نے سختی سے حکم دیا۔

''جی بہتر۔'' وہ مڑ گیا۔

رجب علی تب تک خاموشی سے وہیں کھڑا رہا' جب تک شکورا اندھیرے میں گم نہیں ہو گیا۔ اچھو بھی اسی طرح خاموش کھڑا رجب علی کو گھورتا رہا تھا۔ جبکہ زیب النساء اسے مضبوطی سے تھامے اس کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔

''زیبی! میرے پاس آؤ۔'' رجب علی کی آواز ابھری۔

''نہیں' نہیں' نہیں۔'' وہ ہسٹیریائی انداز میں چلائی۔

''زیبی! میں دوسری اور آخری بار کہہ رہا ہوں' یہاں میرے پاس آجاؤ۔''

اس کے انداز میں جانے کیا تھا کہ زیب النساء کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اچھو کے بازو پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر دی۔

چند ثانیے رجب علی انتظار کرتا رہا' پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''رک جاؤ رجب علی! مزید ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا۔'' اچھو نے تنبیہہ کی۔

''اس وقت میں وہ اچھو نہیں ہوں' جسے تم نے بے خبری میں پیٹ ڈالا تھا۔ ویسے تو تم سے وہ حساب بھی بے باق کرنا تھا لیکن صرف اور صرف زیبی کی خاطر میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔''

''اب اگر میری بہن کا نام اپنی غلیظ زبان پر لائے تو تمہاری زبان گدی سے کھینچ نکالوں گا۔'' رجب علی نے سفاک لہجے میں کہا۔

''لیکن ہر مرتبہ زیبی بھی تمہیں نہیں بچا سکے گی۔'' اچھو نے اس کی بات نظر انداز کر کے اپنی بات پوری کی۔

''ذلیل انسان! دل تو چاہتا ہے کہ تجھے کتے کی موت ماروں لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ دھرتی تیرا غلیظ بوجھ زیادہ دیر تک اپنے اوپر اٹھائے' اس لیے......'' اس نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

''اس کھلونے سے مارو گے مجھے؟'' اچھو ہنسا۔ ''کم از کم مجھے یہ تسلی رہے گی کہ تمہارے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان کے زور پر میری کمر زمین سے لگا سکو اور یہ بھی کہ مجھے مار دینے کے باوجود بھی تمہاری بہن میری ہی رہے گی۔ یہ محبت کے رشتے ہیں' مرنے یا مار دینے سے انہیں توڑا نہیں جا سکتا۔''

''بس اتنا کافی ہے۔'' رجب علی نے ریوالور سیدھا کر لیا۔

اچھو کے پیچھے چھپی ہوئی زیبی کو ان مکالموں سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ آنے والے لمحات اس پر کیا قیامت ڈھانے والے ہیں' بس ایک دم سے مسلسل دھماکے ہوئے اور اچھو دہرا

ہو کر اپنے خون میں لت پت زمین پر گر گیا۔

چند ثانیے تو زیب النساء کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کیا ہو گیا ہے اور جب' اندازہ ہوا تو اچھو اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ اتنی دور جہاں سے جا کر کوئی لوٹا نہیں کرتا۔

''نہیں۔'' وہ چلا کر اچھو پر جھک گئی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا...... اٹھو..... اٹھو تم نے مجھے سب سے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہر رکاوٹ عبور کر کے مجھے لے جاؤ گے' پھر اب کہاں چلے گئے؟''

اس نے اچھو کے بے جان جسم کو جھنجوڑ دیا۔ اس کا سفید لباس خون سے تر ہو گیا تھا۔ وہ اسے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی تھی' چلا رہی تھی' جب رجب علی نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اسی طرح گھسیٹتا ہوا کار کی طرف بڑھ گیا۔

''چھوڑو مجھے ظالم انسان نفرت ہے مجھے تم سے' تم نے میرے اچھو کو مار دیا۔ میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' اس نے کار کا دروازہ کھول کر زیبی کو اندر دھکیلا۔

''ہلنا مت اس جگہ سے' سمجھیں؟''

رجب علی کے بیٹھنے تک زیب النساء نے کتنی ہی کوشش کی کہ دروازہ کھول کر نیچے اتر جائے لیکن لاک کھولنے میں ناکام رہی۔

رجب علی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور راستے کے درمیان پڑے اچھو کے اوپر سے گزرتا ہوا حویلی کی طرف چل پڑا۔ زیب النساء چیختی چلاتی رہی' لیکن وہ بغیر ایک لفظ بولے گاڑی چلا رہا تھا۔

''ہوں' تو یہ بات تھی۔'' درخت کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے شکورے نے گہرا سانس لیا۔

کچھ تجسس اور کچھ رجب علی کی مدد کے خیال سے وہ وہیں درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔

اس پورے واقعے کا دورانیہ بمشکل دو منٹ تھا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب کے منہ سے شادی کی تاریخ طے ہو جانے کا سن کر حیدر علی چند ثانیے کے لیے تو گنگ ہی رہ گیا۔

''لیکن بابا جان! ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ غصے سے جھلا کر بولا۔ ''کیا میری اتنی حیثیت' اتنی وقعت بھی نہیں ہے کہ میرے کسی معاملے پر مجھ سے مشورہ کر لیا جائے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ ''تم چاہتے ہو کہ تمہاری شادی کی تاریخ تم سے پوچھ کر طے کی جاتی''

''میں یہ چاہتا ہوں بابا جان کہ میری شادی مجھ سے پوچھ کر طے کی جاتی۔''

''کیا برائی ہے فوزیہ میں؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے کہ اس میں کوئی برائی ہے۔'' پہلی مرتبہ اس نے اس موضوع پر کھل کر گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

اس نے ایک نظر اماں جان کی طرف دیکھا' جو بالکل بے نیاز ہو کر سپاٹ دیوار کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''میں کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔''

لیکن ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور رجب علی' زیب النساء کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں کھینچ لایا۔

چند لمحے تو کمرے میں موجود کوئی بھی شخص صورت حال کو نہ سمجھ سکا۔

''یہ ہے آپ کی قابل فخر بیٹی! جو ایک انتہائی گھٹیا اور کمینے شخص کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔''

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ زیب النساء کو قالین پر پھینک دیا۔

''اس گھٹیا انسان کے ساتھ میں نے اسے بھی مار کر گاڑ دیا ہوتا لیکن غصے اور نفرت کے ان لمحات میں بھی مجھے خاندان کی عزت اور وقار کا خیال تھا۔ اوہ خدایا!''

رجب علی نے جذبات اعتدال پر لانے کے لیے مٹھیاں بھینچ لیں۔

وہ سب گنگ کھڑے کبھی رجب علی کی جانب دیکھ رہے تھے اور کبھی خون میں بھیگے کپڑوں میں ملبوس سسکتی ہوئی زیب النساء کو۔

یہ کیا سن لیا تھا انہوں نے۔ دکھ اور تکلیف کے کانٹے پورے وجود میں چبھنے لگے' جو کچھ آج رات ہوا تھا' ایسا تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

سب سے پہلے حیدر علی آگے بڑھا اور نرمی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''اٹھیں آپی!'' اس نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔

اتنی ہمدردی پا کر زیب النساء اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''انہوں نے اچھو کو مار دیا' میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ ہسٹیریائی انداز میں چیخنے لگی۔

اماں جان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں جبکہ پیر صاحب کے چہرے پر دکھ کے ساتھ ساتھ شدید تناؤ کے آثار بھی تھے۔

''میرے ساتھ آئیں۔'' اس نے پیار سے کہا اور اسے کمرے سے باہر لے گیا۔

''یہ سب کیا تھا رجب علی؟'' اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی انہیں اس بات پر

یقین نہیں آیا تھا۔

رجب علی گہرا سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

''میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی‘ میری زیبی ایسا نہیں کر سکتی۔'' اماں جان جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولیں۔

''کاش ایسا نہ ہوا ہوتا‘ لیکن افسوس ایسا ہی ہوا ہے۔'' رجب علی نے کہا۔

''نذری بیگم! آپ آرام کریں اور اس مسئلے پر زیادہ نہ سوچیں۔'' پیر صاحب نے ان سے آنکھیں ملائے بغیر کہا‘ پھر رجب علی سے مخاطب ہوئے۔

''مہر النساء اور یاسمین بیٹی کو اپنی اماں جان کے پاس چھوڑ کر ہمارے گول کمرے میں آؤ۔''

''جی بابا جان!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

حیدر علی کے لیے زیب النساء کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اسے اس کے کمرے میں لے تو آیا تھا‘ لیکن زیب النساء اپنے حواسوں میں نہیں تھی اور بار بار کمرے سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''مجھے نفرت ہے اس حویلی کی اینٹوں سے‘ ان دیواروں سے‘ اس میں رہنے والے ایک ایک مکین سے۔'' وہ چلانے لگی۔

''تم لوگوں نے اسے بے دردی سے مار ڈالا۔ اب میرے لیے کیا رہ گیا ہے یہاں‘ مجھے بھی مار دو‘ مجھے زندہ نہیں رہنا‘ ختم کر دو سب کچھ‘ تہس نہس کر ڈالو ہر اس چیز کو جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔''

''ریلیکس آپی!'' حیدر علی اسے اپنے بازوؤں میں تھام کر مسہری کے قریب لے آیا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں‘ مجھے یقین ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا ہوگا‘ وہ زندہ ہوگا۔ میں ابھی کسی کو بھجواتا ہوں‘ آپ یہاں لیٹ جائیں۔''

''نہیں‘ وہ مر چکا ہے۔ یہ سارا خون‘ یہ دیکھو۔'' اس نے اپنے کپڑوں پر لگے تازہ خون کے دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سب اس کا خون ہے‘ وہ زندہ نہیں ہے‘ میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ تمہیں نہیں پتا اگر وہ زندہ ہوتا تو مجھے بچا لیتا‘ وہ مجھے سب سے بچا سکتا تھا۔''

''اچھا!'' اس نے تسلی دینے کے لیے کہا۔ ''آپ یہاں لیٹ جائیں۔''

''کانٹوں کے اس بستر پر کیسے لیٹوں‘ تمہیں نظر آ رہے ہیں کانٹے؟ نہیں...... تم لوگوں کو کبھی نظر نہیں آئے‘ یہ تو صرف ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔''

''اچھا آپ یہاں بیٹھ جائیں۔'' اس نے زیب النساء کو پیڑھے پر بٹھا دیا۔

چند لمحے وہ سپاٹ دیوار کو گھورتی رہی پھر حیدر علی سے مخاطب ہوئی۔

''علی! وہاں الماری میں میری گڑیاں رکھی ہوئی ہیں‘ وہ مجھے لا دو۔''

''اچھا!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور الماری میں پڑی ڈھیر ساری گڑیاں نکال لایا۔ یہ وہ گڑیاں تھیں جو بچپن میں وقتاً فوقتاً پیر صاحب اور رجب علی اسے بطور تحفہ دیتے رہے تھے۔ حیدر علی نے وہ سب گڑیاں اس کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیں۔

''یہ گڑیاں ہیں نا علی! ان میں اور ہم میں کچھ زیادہ فرق تو نہیں ہے‘ جہاں رکھ دیا‘ وہیں پڑی رہیں اور پھر بھول گئے۔'' وہ جیسے خود سے بولی۔

''بس ان کے قالب میں روح نہیں ہے اور ہم میں روح ہے۔ یہ فرق کم تو نہیں ہے پھر بھی کسی نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ سب ہمیں بے زبان‘ بے روح گڑیاں ہی سمجھتے رہے‘ بس ایک جگہ رکھ کر بھول گئے۔

علی کوئی ایسا قالب جس میں روح ہو کیا وہ بے شناخت رہ سکتا ہے۔ محض کسی کی ملکیت بن کر؟ یہ بے روح گڑیاں میری ملکیت تھیں۔ میں انہیں رکھ کر بھول گئی تھی‘ میں کس کی ملکیت ہوں؟

نہیں علی! کوئی انسان کسی کی ملکیت کیسے ہو سکتا ہے۔ جو شخص سانس لیتا ہو‘ سوچتا ہو‘ وہ کسی کی ملکیت کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی لفظ ''کیوں'' نہیں پوچھا تھا‘ لیکن کیا یہ کبھی میرے ذہن میں آیا بھی نہیں ہوگا؟ نہیں۔ یہ لفظ ہر وقت میرے ذہن میں گردش کرتا ہے‘ لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے ہر کیوں کے جواب میں ایک خاندانی روایت کی مثال موجود ہے۔ میرے ہر سوال کا جواب یہی ہے کہ اس حویلی میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

حیدر علی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے زیب النساء کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

''تم نے آئینہ دیکھا ہے علی؟'' وہ جیسے خود سے ہی مخاطب تھی۔

''بہت دفعہ دیکھا ہوگا‘ لیکن اس کے اندر کبھی نہیں جھانکا ہوگا۔ جاننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم لوگ بہت سی باتیں جانتے ہو‘ لیکن سمجھتے نہیں ہو۔

تم نے کبھی میرے کمرے کے اس آئینے میں پھپھو کو نہیں دیکھا ہوگا‘ نہیں دیکھا ناں؟ میں دیکھ سکتی ہوں۔ حالانکہ وہ میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے فوت ہو گئی تھیں‘ پھر بھی میں انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں‘ میں اپنے کانوں سے ان کی سسکیاں سن سکتی ہوں‘ ان کی ہنسی کی آواز اس کمرے میں گونجتی ہے ان کی آہ و زاری سے کمرا بھر جاتا ہے‘ لیکن یہ دیواریں ویسے ہی سپاٹ رہی ہیں۔ ان میں کوئی روزن‘ کوئی دریچہ نہیں کھلتا‘ کوئی آواز باہر نہیں جاتی۔ ان اینٹوں سے سر ٹکرا کر ان کی ہنسی‘ سسکیوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے ہر طرف چیخیں پھیل جاتی ہیں‘

لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں ہے ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکتی۔ بس کچھ ہوتا ہے تو فقط اتنا کہ میں بار بار مرتی ہوں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔

ایسے ہی ایک دن خود کو گھٹن سے بچانے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ لہولہان کر کے تازہ ہوا کے لیے جگہ بنالی۔ پر تازہ ہوا کا وہ جھونکا اتنا معطر تھا کہ میرے لیے پلٹنا ہی ناممکن ہو گیا۔ آہ......'' اس نے آنکھیں موندلیں۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر زیب النساء کے لب ہلے۔

''وہ بہت اچھا تھا۔ تم لوگوں کے لیے قابلِ نفرت ہے' لیکن میں جانتی ہوں کہ کتنا اچھا تھا۔ مجھے پتا ہے علی کہ میری باتیں تمہاری غیرت پر تازیانہ بن کر لگیں گی' لیکن اب میں ہر حد عبور کر چکی ہوں۔ جب وہ ہی نہ رہا تو مجھے اپنے انجام کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نے میری خاطر ہر رکاوٹ عبور کی۔ یہ حویلی کتنی بڑی' کتنی مضبوط اور کتنی شاندار ہے لیکن اس نے اس کی عظمت کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی چیز بھی تو اس کا راستہ نہیں روک سکی مگر قسمت۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔ ''ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔''

چند ثانیے وہ پھر خاموش رہی۔

''علی!'' بالآخر اس نے آنکھیں کھولیں۔

''ہوں۔''

''اسے یوں نہ پڑے رہنے دینا' اگر اب بھی تمہارے لیے میری ذرا سی بھی اہمیت ہے' مجھ سے تھوڑا سا بھی پیار ہے تو خدا کے لیے اسے وہاں سے اٹھا کر کسی اچھی جگہ دفن کر دینا۔ وہاں باہر تو......!''

اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور مزید بات کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں' میں خود جاؤں گا اور انتظام کروں گا۔'' وہ بولا۔

''یہ خون دیکھ رہے ہو؟'' اس نے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''جس وقت گولی چلی' اتنا خون بہا' اتنا خون بہا......'' اس نے ہونٹ کاٹ کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔

''پھر بھی اس ظالم درندے نے بس نہیں کیا۔ اس نے گاڑی اس کے اوپر سے گزار دی۔ ایسا ظلم تو کبھی کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ وہ میرا بھائی نہیں ہے' میری رگ رگ میں اس کے لیے نفرت بھر چکی ہے۔''

وہ پھر بے تحاشا رو پڑی۔

☆======☆======☆

پیر صاحب کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اندر سے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے ہوں۔ جس

وہ اس قدر پیار کرتے تھے' اس کے ساتھ ایسے واقعے کا منسوب ہو جانا انہیں مار ڈال رہا تھا۔ گول کمرے میں رکھے ہوئے صوفے پر وہ تقریباً ڈھے گئے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت خود کو ختم کر دیں' لیکن دماغ روکے ہوئے تھا۔

پہلے انہیں اپنے خاندان کی عزت بچانا تھی۔ اس حویلی کو سلامت رکھنا تھا' اسے دوبارہ بنیادوں کے ساتھ تعمیر کرنا تھا۔ یہ وقت حالات سے فرار کا نہیں بلکہ ان کا سامنا کر کے انہیں اپنے رخ میں موڑ لینے کا تھا۔

رجب علی آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

''بیٹھو۔'' پیر صاحب نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بغیر کوئی بات کیے بیٹھ گیا۔

''ہمیں بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' پیر صاحب نے پوچھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''بابا جان! یہ نہ پوچھیں میں اس وقت سے اپنے ذہن سے ان لمحات کی یاد مٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

چند ثانیے کی خاموشی کے بعد اس نے پیر صاحب کو پورا واقعہ سنا دیا۔

''ہوں۔'' انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ کتنی دیر اس کمرے میں خاموشی چھائی رہی صرف ایک وال کلاک کی مدھم سی ٹک ٹک وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔

''اپنے کسی ذاتی ملازم سے کہہ کر وہ لاش بڑی سڑک سے پرے پھنکوا دو' لیکن اسے قابلِ شناخت نہیں رہنا چاہیے۔'' بالآخر پیر صاحب نے کہا۔

''بہتر بابا جان!'' وہ بولا۔ ''لیکن اگر میرے جذبات تک رہنے دیا جائے تو میں اس کی لاش یہاں گاؤں میں برگد کے ساتھ لٹکوا کر......''

''بس......'' پیر صاحب نے ہاتھ اٹھائے۔ ''اس وقت اپنے جذبات کو خود پر حاوی مت ہونے دو۔ یاد رکھو گدی سنبھالنے کے بعد تمہیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا' لیکن ان میں سے کسی مسئلے کو بھی جذبات سے سلجھانے کی کوشش مت کرنا' ورنہ وہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھتا جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حویلی کی عزت پر کبھی حرف مت آنے دینا۔ کسی کو بھی اس پر انگلی اٹھانے کا موقع مت دینا۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

رجب علی نے سر جھکا لیا۔

''ہمیں تم سے بھی بہت شکوے ہیں' لیکن ان پر بعد میں بات کریں گے۔ تمہیں بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا ہے۔ صرف پیر صاحب کہلایا جانا کافی نہیں ہوتا' اسے نبھانا پڑتا ہے۔ یہ

محض ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ہماری صدیوں کی کمائی ہوئی عزت ہے۔''

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

''اب جاؤ اور لاش اٹھوانے کا بندوبست کراؤ۔ اس کے بعد ہماری خواب گاہ کی الماری سے سیاہ رنگ کی شیشے کی بوتل لے آؤ۔'' پیر صاحب نے حکم دیا۔

''چابیاں اپنی اماں جان سے لے لینا۔ بوتل تلاش کرنے میں تمہیں مشکل پیش نہیں آئے گی' کیونکہ وہاں صرف ایک ہی بوتل ہے۔''

''بہتر بابا جان!'' وہ باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ زیب النساء نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''پتا ہے علی کون آیا ہے؟'' پھر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''موت کے ہرکارے آئے ہیں' سن رہے ہو؟ ان کے قدموں کی چاپ؟ میں انہی کی منتظر تھی۔ وہ جان کی بازی لگا کر بھی مجھے آزاد کرانے کا بندوبست کر گیا ہے۔''

''نہیں آپی!'' اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پھر اس نے باآواز بلند ''یس'' کہا۔

دروازہ کھلا اور پیر صاحب اور رجب علی شاہ اندر داخل ہوئے۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

پیر صاحب نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ آئے۔

''علی! ہمیں اپنی بیٹی سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''بابا جان! اس وقت میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں' تم اپنی اماں جان کے پاس جاؤ' اس وقت انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔''

اس نے ایک نظر زیب النساء کی طرف دیکھا' جس کی نظریں رجب علی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ان نظروں میں صرف اور صرف ایک جذبہ تھا' شدید نفرت کا جذبہ..... اس نے تو شاید پیر صاحب اور حیدر علی کی گفتگو بھی نہیں سنی تھی۔

حیدر علی یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ پیر صاحب اس سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

''تم نے سنا نہیں علی؟'' اس مرتبہ ان کا لہجہ سخت تھا۔

''بابا جان! آپ میری ایک بات سن لیں گے؟''

''ابھی خواب گاہ میں پہنچ کر ہم تمہاری بات سن لیں گے۔''

''میں اس سے پہلے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' وہ ان کے قریب چلا آیا۔ اور آہستگی سے بولا۔

''زیبی آپی کی ذہنی حالت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے پلیز ان سے کوئی سخت بات نہ کہیے گا۔ وہ اس وقت شدید ترین ڈپریشن میں ہیں۔ پلیز بابا جان وہ جو بھی کہیں اسے برداشت کرلیں۔ مجھے پتا ہے' یہ آپ کے لیے بہت مشکل مرحلہ ہوگا' لیکن اس وقت آپ برداشت کرلیں' بعد میں ہم دیکھ لیں گے کہ اس سلسلے میں کیا جا سکتا ہے' لیکن ابھی......''

''تم جاؤ' ہم جانتے ہیں کہ ایسے موقع پر حالات پر کیسے قابو پایا جاتا ہے۔'' پیر صاحب نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

ان کے الفاظ اور لہجے سے وہ کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کمرے سے نکلنے سے قبل وہ ایک مرتبہ پھر زیب النساء کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ پر پیار کیا۔

''آپی میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔''

زیب النساء خاموش رہی۔

وہ کمرے سے نکل گیا۔

''بیٹا! کیا وہ سب درست ہے جو رجب علی نے ہمیں بتایا ہے؟'' حیدر علی کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''انہوں نے کم بتایا ہوگا' میں بتاتی ہوں کہ کیا ہوا تھا؟'' اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ انجام سے بے پروا ہو چکی ہے۔

''جس طرح یہ گڑیاں میری ملکیت تھیں' اسی طرح میں آپ کی ملکیت میں تھی' جس طرح میں انہیں الماری میں بند کر کے بھول گئی تھی' اسی طرح آپ مجھے اس کمرے میں بند کر کے بھول گئے تھے۔

لیکن مجھ میں اور ان گڑیوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ ان میں روح نہیں تھی' مجھ میں تھی' ان میں دل نہیں تھا' مجھ میں تھا۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھیں' میں سوچ سکتی تھی۔ سو میں بہت کچھ سوچتی تھی۔ بہت سے ''کیوں'' میرے گرد چکراتے رہے' لیکن ادب آداب کی تہوں میں ملفوف ہونے کی وجہ سے مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اپنے ''کیوں'' کا جواب آپ سے طلب کرتی۔ بس اس لیے میں نے نظریں چرانا شروع کر دیں۔ اپنی سوچوں سے بھی اور اپنے سوالوں سے بھی اور ان پر دھول بیٹھتی گئی۔ اتنی زیادہ کہ سب کچھ اس میں دفن ہو گیا۔

جب کبھی یہ سوچیں سر اٹھانے کی کوشش کرتی تھیں تو میں خوفزدہ ہو کر مذہب میں پناہ لینے لگتی تھی۔ جب دھند کی دبیز تہہ سے کوئی ہیولا میری طرف بڑھتا تھا تو میں سجدے میں گر جاتی تھی۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس آنکھ مچولی کے ساتھ دن کیسے گزرتے ہیں' لیکن مجھے معلوم ہے' ان اذیت ناک لمحوں کی چبھن میں اب بھی محسوس کر سکتی ہوں۔

جب یہ چبھن بڑھنے لگی، اتنی بڑھی، اتنی زیادہ کہ میری روح گھائل ہو گئی تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ اپنے دل کا بھی اور اس حویلی کا بھی۔"

پیر صاحب کے چہرے پر ابھرنے والے تناؤ اور کرب کے آثار دیکھنے کے باوجود وہ کہتی چلی گئی۔

"میرے لیے بڑا پھاٹک کھولنا ممکن نہیں تھا، اس لیے میں نے عقبی پھاٹک استعمال کیا۔ آپ اسے چور دروازہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہاں دنیا کا سب سے اچھا انسان میرا منتظر تھا اور جب میں زندگی کی حقیقی خوشیوں کی تلاش میں اس کے ساتھ نکلی تو ایک درندے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس نے میری عزیز از جان ہستی کو......"

"بس ٹھیک ہے۔" پیر صاحب نے ہاتھ بلند کیے۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے، آپ کو یہ سب سننا ہوگا۔" وہ چلائی۔ "سنتے ہوئے آپ کا دل دکھ رہا ہے ناں؟ اس لیے نہیں کہ آپ کو اپنی بیٹی کے، میرے حال پر افسوس ہے بلکہ اس سے آپ کی پگڑی داغدار ہوئی ہے۔ بس چند لمحوں کی اذیت بھی برداشت نہیں کر سکے آپ، مجھے دیکھیں میں نے برسوں ان کانٹوں پر لمحہ گزارا ہے۔"

"زیب النساء۔" پیر صاحب دھاڑے۔

"اونچا بولنے یا چلانے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوگی۔ وہ جو مجھے آپ سے بھی زیادہ عزیز تھا، اس کا خون اس درندے کی گردن پر ہے۔"

اس نے کارنس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے رجب علی کی جانب اشارہ کیا۔ بس پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا۔

پیر صاحب کے لیے بھی یہ انتہا تھی۔ ان کا طمانچہ زیب النساء کے گال پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ چند لمحے تک تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی۔ جس باپ نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا، آج پہلی مرتبہ اس نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

"بس اتنا حوصلہ تھا بابا جان؟" بالآخر وہ بولی۔ "میرا حوصلہ دیکھیں، جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے گولیاں لگتے دیکھا ہے، اسے خاک اور خون میں نہاتے دیکھا ہے، پھر بھی میں قاتل پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے اس کے بے جان وجود کو گاڑی کے ٹائروں کے نیچے کچلے ہوئے دیکھا۔ ظلم تو مجھ پر ہوا ہے لیکن میرا ساتھ کس نے دیا، سوائے میرے آنسوؤں کے؟ میں جانتی ہوں کہ آپ میرے لیے موت کا تحفہ لائے ہیں، میں بھی اسی کی منتظر تھی۔

میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس اپنی بیٹیوں کو زندگی اور موت دینے کے علاوہ کچھ نہیں مجھے میرا تحفہ دے دیں، مجھے اس کے پاس جانا ہے، اپنی پھوپھو کے پاس جانا ہے۔"

پیر صاحب نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی، ڈھکنا کھول کر پانی سے بھرے گلاس

میں اس کے چند قطرے ٹپکائے اور گلاس زیب النساء کی طرف بڑھا دیا۔

گلاس تھام کر چند لمحے وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک ہی سانس میں پورا پانی پی گئی۔

پیر صاحب نے گہرا سانس لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسہری کے قریب لے آئے۔

"لیٹ جائیں۔"

"بس ایک بات بتا دیں بابا جان کہ یہ شیشی آج پہلی مرتبہ کھلی ہے یا اس سے پہلے بھی کھل چکی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جب یہ لی تھی تب اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ آج پہلی مرتبہ اس کا ڈھکن کھلا ہے۔"

"گویا پھوپھو......!" اس نے سوچنے کی کوشش کی، لیکن اس کی سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔

وہ لیٹ گئی اور اس کے لمبے بال بستر پر بکھر گئے۔

پیر صاحب اس کے سرہانے کی طرف بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر ایک بار پھر وہی شفقت اتر آئی تھی جو کسی بیٹی پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں نظر آنے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ سراپا محبت تھے۔

"بیٹا! آپ کی کوئی خواہش ہے؟"

"ہوں!" اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

"آپ بتائیں ہم ضرور پوری کریں گے۔"

"آئندہ جو شخص بھی آپ کی گدی پر بیٹھے گا، اگر اس کی کوئی بیٹی ہوئی تو اسے یہی والا کمرا دینا اسی مسہری اور اسی آئینے کے ساتھ۔" اس نے بمشکل کہا۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

پیر صاحب وہیں بیٹھے رہے اور رجب علی اسی جگہ کھڑا رہا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد پیر صاحب نے زیب النساء کے ٹھنڈے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" وہ بولے تو ان کی آواز میں دکھ تھا، پچھتاوا نہیں تھا۔

کمرے کے آئینے میں ایک اور شبیہہ اتر آئی تھی۔

☆======☆======☆

رانجھا رانجھا کر دی ہن میں آپے رانجھا ہوئی
سدو مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ، میں رانجھے وچ غیر خیال نہ کوئی
میں نئیں اوہ آپ ہے، اپنی آپ کرے دلجوئی
جو کجھ ساڈے اندر وسّے ذات اساڈی ہوئی
جس دے نال میں نیوں لگایا اوہو جیسی ہوئی

چٹی چادر لاہ سٹ کڑیئے ' پہن فقیراں لوئی
چٹی چادر داغ لگیسی ' لوئی داغ نہ کوئی

حیدر علی ٹارچ ہاتھ میں لیے حویلی سے باہر نکل آیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ حادثہ کہاں پیش آیا تھا' لیکن اسے یقین تھا کہ جگہ ڈھونڈنے میں اسے زیادہ تردد کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

وہ جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی اس ممکنہ پگڈنڈی پر ہولیا' جس پر اس کے خیال میں حادثہ پیش آسکتا تھا۔ زیب النساء کی باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ اس کے کہے ہوئے فقرے بار بار حیدر علی کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

''اسے یوں نہ پڑے رہنے دینا' اگر اب بھی تمہارے لیے میری ذرا سی بھی اہمیت ہے' مجھ سے تھوڑا سا بھی پیار ہے تو اسے وہاں سے اٹھا کر کسی اچھی جگہ دفن کر دینا۔''

وہ جانتا تھا کہ جس قسم کے حالات سے اس کی بہنیں گزر رہی تھیں' ان میں یہ سب کچھ رونما ہو سکتا تھا۔ پھر بھی یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

صحیح کہا تھا زیب النساء نے جاننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے' محسوس تب ہی کیا جا سکتا ہے' جب بیتتی ہے' اس سے پہلے تو بس زبانی باتیں ہوتی ہیں۔

کہیں دور سے ابھرنے والی سائیں بابا کی پُرسوز آواز اسے خیالات کی دنیا سے نکال لائی۔

''ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی
بھلا دس کھاں چریں وچھنیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے ایویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

(ہیر نے جوگی سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو' رُوٹھے ہوئے سجن کو کوئی راضی نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسے شخص کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی جو دور گئے سجن کو واپس لے آئے۔ جو میرے دل کا درد مٹا دے' وہ چاہے میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہن لے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کو سچا رب کب واپس بھیجتا ہے۔ لوگ یونہی دل رکھنے والی باتیں کرتے ہیں' ورنہ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوؤں کو کوئی نہیں ملا سکتا۔ اگر باز سے کوا کونج چھین لے تو تم دیکھنا کہ وہ باز خاموش ہو کر اپنی چونچ پروں میں دبا لیتا ہے یا چلاتا ہے۔)

ایک دم حیدر علی کا دل چاہا کہ وہ سائیں بابا سے ملے' کیوں؟ اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ بس

وہ چاہتا تھا کہ ان سے ملے۔ اس کے قدم خود بخود آواز کی سمت اٹھ گئے۔

سائیں بابا کھیتوں کے درمیان لنگڑاتے ہوئے چلتے جا رہے تھے۔

''سائیں بابا!'' اس نے بے اختیار انہیں آواز دی۔

سائیں بابا نے سر گھما کر اس کی جانب دیکھا۔

''سائیں بابا!'' وہ ان کے قریب چلا آیا' لیکن اسے خود خبر نہیں تھی کہ وہ ان سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم میرے پاس آؤ گے۔'' وہ بولے۔ ''تم نے آج رات تارا ٹوٹتے دیکھا ہے؟ نہیں' مجھے خبر ہے کہ تم نے نہیں دیکھا۔''

حیدر علی الجھ گیا۔

''سائیں بابا آپ کون ہیں؟'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''اس اوپر والے کی ایک ادنیٰ مخلوق' جو اپنی کھوئی ہوئی چیز تلاش کرتے کرتے فقیر بن گیا ہے۔''

''آپ نے کوئی تارا ٹوٹتے دیکھا ہے؟''

''ہاں' تم بھی دیکھ سکتے تھے' لیکن وہ ان دو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے لیے انسان کے اندر آنکھ ہونی چاہیے اور یہ آنکھ بہت مشکل سے ملتی ہے۔'' سائیں بابا نے آہ بھری۔

''جب سب کچھ کھو جاتا ہے تب اندر کی آنکھ بیدار ہوتی ہے لیکن تم یہ آنکھ بھی نہیں پا سکتے۔ تمہیں قدرت نے فقیر پیدا نہیں کیا نہ ہی کبھی تمہارے دل میں فقیر بننے کی آرزو پیدا ہوئی کیونکہ دنیاوی آسائشوں کے سانپ تمہارے پورے وجود سے لپٹے ہوئے ہیں...... دولت کے بچھوؤں سے تمہاری تجوری بھری پڑی ہے نفس کا ناگ پھن اٹھائے کھڑا ہے۔''

ایک دم حیدر علی نے اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا احمق محسوس کیا۔ وہ آکسفورڈ کا پڑھا لکھا کن توہمات میں خود کو جکڑ رہا تھا۔

''نفس' دولت' آرام و آسائش' بچھو یا سانپ نہیں ہوتے' انسان کس لیے محنت کرتا اور مقام بناتا ہے۔ اس احمق بڈھے کی طرح سب لوگ گھر بار چھوڑ کر فقیر بن جائیں تو دنیا کتنی صدیاں پیچھے چلی جائے۔ تہذیب انسانی ایک مرتبہ پھر پتھر کے دور میں پہنچ جائے۔ انسان کو کنویں کا مینڈک بنا دینے کے لیے یہ دنیا نہیں بنی۔'' اس نے سوچا۔

''وقت تو مسلسل آگے بڑھنے کے عمل کا نام ہے' حرکت میں زندگی ہے۔ ٹھہراؤ اور جمود موت ہے پھر انسان جانتے بوجھتے کیسے موت کو گلے لگا سکتا ہے؟''

سائیں بابا جو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے' ایک دم ہنس پڑے اور مڑ کر ایک سمت چل دیئے۔

''ہونہہ!'' اس نے سر جھٹکا۔

''جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا' وہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہلانے کا کوئی ذریعہ بھی تو ہونا چاہیے ناں۔ در بدر پھرنے کے لیے بھی تو کسی جواز کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ خود کو مطمئن کیا جا سکے۔''

وہ پھر اسی پگڈنڈی پر ہولیا۔

''جس کے لیے دولت اور آسائش کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ وہ اسی طرح دولت کو برا بھلا کہتا ہے۔ میں نے بہت کم لوگوں کو باہوش وحواس دولت کو ٹھکراتے دیکھا ہے اور ان میں سے بیشتر کو بھی بعد میں پچھتاتے ہی دیکھا ہے۔''

وہ چلتا جا رہا تھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔

موسم اچھا ہو رہا تھا' لیکن اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ سائیں بابا کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر وہ زیب النساء کے بارے میں سوچنے لگا۔

''یہ ہونا تھا۔ میں پہلے ہی بابا جان کو اس تکلیف دہ صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ کاش انہوں نے میری بات پر توجہ دی ہوتی۔ پتا نہیں اب وہ زیبی آپی سے کیا بات کرنے آئے تھے۔ کہیں وہ ان سے کوئی سخت بات نہ کہہ دیں جبکہ اس وقت انہیں تسلی اور دلجوئی کی ضرورت ہے۔''

چلتے چلتے اس کی ٹارچ کی روشنی خون آلود مٹی پر پڑی۔ وہ پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ خون بارش کے پانی کے ساتھ مٹی میں جذب ہو رہا تھا' لیکن اب بھی واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے شہادت کی انگلی سے اس جگہ زمین کو چھوا اور پھر انگلی سونگھنے لگا۔ خون کی ہلکی سی بو نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔

وہ واقعہ یہیں رُونما ہوا تھا۔ حیدر علی نے اردگرد ٹارچ کی روشنی ڈالی' لیکن وہاں کوئی انسانی جسم موجود نہیں تھا۔ ہاں کسی کے گھسیٹے جانے کے واضح آثار موجود تھے۔ اس نے ان نشانوں پر روشنی ڈالی۔ کچھ دور جا کر وہ نشان ختم ہو گئے تھے۔ ابھی بارش بہت ہلکی تھی' ورنہ شاید یہ نشان مٹ چکے ہوتے۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''اسے بڑے بھائی جان نے اٹھوا دیا ہے۔''

بوجھل قدموں کے ساتھ وہ واپس چل پڑا۔

''زیبی آپی کو کیا جواب دوں گا۔ انہوں نے پوچھ لیا تو کیا بتاؤں گا کہ ان کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔''

پتا نہیں اماں جان کا کیا حال ہوگا۔ یہ صدمہ ان کے لیے بہت بڑا ہے' لیکن کڑوی سہی' یہ گولی ہم سب کو نگلنی ہے' کیونکہ ان حالات تک پہنچنے کے ذمہ دار ہم سب خود ہیں۔ زیبی آپی کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا قصوروار ہم ہیں۔''

چلتے چلتے پرانے کنویں کے نزدیک لگے برگد کے درخت کو دیکھ کر وہ رک گیا۔ بہت سی یادوں کی کسک ایک دم جاگ اٹھی تھی۔ گوری شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ آج اس جگہ کوئی نہ تھا' نہ ہنسی کی کھنک تھی' نہ وہ سسکیاں' صرف ویرانی تھی' جس نے اس جگہ ڈیرا جما رکھا تھا۔ مایوسی کی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

''کیا دیا میری محبت نے اسے آنسو' دکھ' اذیت اور مستقبل کا خوف' وہ اب بھی تڑپتی ہوگی میرے لیے' سمجھ رہی ہوگی کہ میں اسے بھول گیا ہوں۔ اسے کیسے بتاؤں کہ اس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت' ہر پل میرے ساتھ ہوتی ہے۔ میرے خیالوں میں' میری یادوں میں۔''

سر جھٹک کر وہ حویلی کی طرف چل دیا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب، رجب علی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے، جہاں یاسمین، اماں جان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ مہرالنساء بھی ان کے قریب ہی مسہری پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔

انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اماں جان نے تڑپ کر ان کی جانب دیکھا، لیکن منہ سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔

رجب علی ان سے نظریں چرا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

پیر صاحب کی آنکھوں میں دکھ اور کرب کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی تھیں، وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔

''آپ کی بیٹی سکون کی نیند سو گئی ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئے تو ان کی آواز میں کوئی لرزش، کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ بس یوں جیسے وہ کوئی عام سی بات بتا کر اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔

اماں جان نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ پتا نہیں ان میں کتنا صبر، کتنا حوصلہ تھا کہ ان کے منہ سے سسکی بھی نہیں نکلی۔

یاسمین نے پیر صاحب کی بات سن کر چونک کر رجب علی کی طرف دیکھا، لیکن وہ صوفے سے پشت ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

اور مہرالنساء نے شاید کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس کی سوچیں اتنی ہی گہری تھیں جتنا اماں جان کا صبر۔ کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ یاسمین اب بھی اماں جان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ ان کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا، لیکن منہ سے ایک بھی سسکی نہیں نکلی تھی۔

کتنے ہی لمحے دبے پاؤں سرکتے گئے۔ کمرے کی جامد خاموشی دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سے ٹوٹی۔ آنے والا حیدر علی تھا۔ ایک نظر اس نے وہیں کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر اندر چلا آیا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر یاسمین نے گھبرا کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔

یہ ان کے خاندان کی روایت تھی کہ بھابی دیوروں کے سامنے بھی نہیں آتی تھیں۔ رشتہ کتنا

بھی قریبی سہی لیکن نامحرم بہرحال نامحرم ہی تھا۔

چادر کی اوٹ سے اس نے رجب علی کی جانب دیکھا، لیکن وہ اس کے بجائے حیدر علی کی طرف متوجہ تھا، جو اماں جان کے پاس آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دبے قدموں کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اماں جان۔'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیکن وہ اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھے بے آواز روتی رہیں۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس آپ حوصلہ رکھیں۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔

''دیکھیں ہم سب موجود ہیں یہاں آپ کے پاس۔ ابھی میں آپی کے پاس بھی گیا تھا، وہ آرام سے سو رہی تھیں اس لیے میں واپس چلا آیا۔''

کچھ دیر تک وہ انہیں تسلی دیتا رہا، لیکن اس کی باتوں کے جواب میں انہوں نے سر تک نہیں اٹھایا۔

پھر وہ پیر صاحب کی طرف مڑا۔ ''بابا جان میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے زیبی آپی سے کیا بات کہی تھی؟''

''کیا تم نے اسے سکون سے سوتے نہیں دیکھا؟'' انہوں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''اسی بات پر تو مجھے حیرت ہے کہ وہ اتنے آرام و سکون سے سو کیسے گئیں۔ ان کی ذہنی حالت اچھی نہیں تھی۔''

''ہمارا خیال ہے کہ یہ بہتر ہی ہوا ہے۔''

''ہاں خیر بہتر تو ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں ابھی اس جگہ گیا تھا، لیکن وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔''

پیر صاحب یا رجب علی نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چند لمحے وہ ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر انہیں خاموش پا کر بولا۔

''اسے گھسیٹ کر اور شاید اٹھا کر کسی اور جگہ لے جایا گیا ہے کیا یہ آپ نے کیا ہے؟''

''یہ تمہارے سوچنے یا حل کرنے کے مسئلے نہیں ہیں۔'' بالآخر رجب علی نے کہا۔

''نہیں، کوئی بھی معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔'' اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''سب سے پہلے تو مجھے اچھو کے بارے میں بتائیں کہ اسے کہاں دفن کیا گیا ہے؟''

''کیا تمہارے خیال میں اسے دفن کیا جانا چاہیے تھا؟'' رجب علی نے تلخ انداز میں کہا۔

''کاش میرے لیے ممکن ہوتا کہ سارا گاؤں اس کی روندی ہوئی لاش دیکھ سکتا۔ یہ دیکھ پاتا کہ اس قسم کی حرکت کرنے والے کی لاش کتے کس طرح گھسیٹتے پھرتے ہیں، کیسے چیل اور کوے اسے نوچ کر کھاتے ہیں۔''

''بس بھائی جان بہت ہو گیا۔'' حیدر علی کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔

''میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اچھو کی لاش نماز جنازہ کے ساتھ دفن ہوگی۔''

''کیوں؟ تم اپنی غیرت اتار کے ایک طرف رکھنے کے بعد اسے کندھا دینا چاہتے ہو؟'' رجب علی طنزیہ انداز میں بولا۔

''آپ کس غیرت کی بات کر رہے ہیں میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اعمال نامہ اس جگہ سب کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کتنے غیرت مند ہیں۔''

''شٹ اپ۔'' رجب علی دھاڑا۔

''ڈونٹ شاؤٹ (چلاؤ نہیں) زبان سب کے منہ میں ہوتی ہے اور اسے استعمال کرنا بھی سب جانتے ہیں۔ آواز کا والیوم اونچا کر کے اگر آپ اپنی غیرت مندی ثابت کرنا چاہتے ہیں تو جان لیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''حیدر علی! تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''حدود کا تعین ہمیں نئے سرے سے کرنا ہوگا بابا جان! جو کچھ ہو چکا اسے کوئی بھی واپس نہیں لوٹا سکتا' لیکن اس واقعے سے سبق حاصل کر کے ہمیں پرانی روایتوں کے شکنجے سے اپنا آپ چھڑانا ہوگا۔''

''اس سے پہلے کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تم یہاں سے چلے جاؤ علی۔''

''نہیں بابا جان! آپ کو مجھے برداشت کرنا ہوگا...... آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ میں اپنی بہنوں کو مزید ایک لمحے کے لیے بھی اس سولی پر لٹکتا نہیں دیکھ سکتا۔ جس پر صدیوں سے اس خاندان کی لڑکیوں کو روایت کے نام پر لٹکایا جا رہا ہے۔''

''ہمیں مجبور مت کرو کہ ہم تم پر ہاتھ اٹھا لیں' چلے جاؤ یہاں سے۔''

''آج آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں یا گولی چلائیں' لیکن آپ کو وہ سب سننا ہوگا جو حقیقت ہے۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔

''آج جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار آپ ہیں بابا جان اور بھائی جان آپ بھی۔ آپ زیبی آپی کو بالوں سے گھسیٹ کر یہاں لائے کیوں؟ اس لیے کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ یہ چار دیواری چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانے جا رہی تھیں' لیکن کیا ایک لمحے کے لیے بھی آپ نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ ایسا کیوں ہوا؟''

''تم اس وقت آکسفورڈ میں اپنے کلاس روم میں نہیں ہو علی' یہاں تمہارا فلسفہ نہیں چل سکتا۔ یہ غیرت کے معاملے ہوتے ہیں۔ اس حویلی کی عورتوں کو ویسے رہنا ہوگا جس سے یہاں کی عزت پر حرف نہ آئے۔ تمہارے فلسفے نے تمہاری غیرت اتار پھینکی ہے' لیکن مجھ میں اب تک غیرت موجود ہے۔''

''مت نام لیں میرے سامنے غیرت کا۔'' حیدر علی غصے سے پھٹ پڑا۔

''کس غیرت کی بات کر رہے ہیں' کیا غیرت اس کا نام ہے کہ آپ روپے پیسے سے لڑکیاں خریدیں اور جہاں طاقت سے کام چل سکتا ہو وہاں اپنے بندوں سے کہہ کر لڑکیاں اٹھوا لیں' لیکن جب آپ کی بہن کسی غیر مرد کے ساتھ نظر آئے تو آپ اسے بالوں سے گھسیٹ کر گھر لائیں۔ اگر آپ کی غیرت کا یہی معیار ہے تو آئی ایم سوری مجھے بے غیرت رہنا ہی پسند ہے۔''

''بس علی! آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔'' پیر صاحب کا غصہ بھی آسمان پر پہنچ چکا تھا۔

''تمہیں یہ لحاظ بھی نہیں ہے کہ تم کس سے بات کر رہے ہو' یہ خیال بھی نہیں ہے کہ یہاں تمہاری بہن اور ماں بھی موجود ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کیا وہ سوال کبھی اماں جان یا بڑی آپا کے ذہن میں گردان نہیں کرتے ہوں گے؟ آپ نے ان سے عمل کرنے کی آزادی چھین رکھی ہے' لیکن آپ ان کی سوچ پر پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ کاش آپ جان سکتے کہ آج زیبی آپی نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر آپ ان کے لیے صدر دروازہ نہیں کھولیں گے تو پھر دروازے خود بخود کھل جائیں گے۔ ان کے صبر و ضبط کو ان کے لیے امتحان نہ بنائیں ورنہ یہ پیالہ چھلک جائے گا' لیکن آپ کو اپنی روایتیں عزیز تھیں' اس لیے میری ان باتوں نے مجھے آپ کی نظر سے گرا دیا۔ اگر اس لمحے آپ نے میری بات سن کر سمجھ لی ہوتی تو آپ کو یہ رات آنکھوں میں نہ کاٹنی پڑتی۔ زیبی آپی کے مجرم آپ ہیں بابا جان آپ......''

''علی' علی!'' رجب علی غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے حیدر علی کا گریبان پکڑ لیا۔ ''تمہاری یہ جرأت کہ تم بابا جان سے اس قسم کی بات کرو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''میرے مرنے سے بھی آپ کے مسئلے حل نہیں ہوں گے' اس لیے میرا گریبان چھوڑ دیں۔''

رجب علی کے لیے یہ انتہا تھی۔ اس نے حیدر علی کے منہ پر گھونسہ لگانے کی کوشش کی' لیکن اس نے ایک طرف جھک کر خود کو بچا لیا اور ایک جھٹکے سے اپنا گریبان بھی چھڑا لیا۔

اماں جان گھٹنوں سے سر اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ مہر النساء بھی ایک ٹک انہی کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔

''مجھے مجبور نہ کریں بھائی جان کہ میں بھی آپ کو اسی زبان میں جواب دوں۔ اس سے زیادہ برداشت کا حوصلہ میرے اندر بھی نہیں ہے۔''

''تم مجھے کیا بتاؤ گے۔'' رجب علی اس پر جھپٹا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ اماں جان کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ

نکل گئی۔

''انہیں الگ کرائیں اللہ کے واسطے انہیں الگ کرائیں۔'' وہ پیر صاحب کی طرف دیکھ کر منت بھرے انداز میں چلائیں۔

''آج فیصلہ ہو جانے دیں نذری بیگم۔''

ان دونوں کی لڑائی سے کمرے کی چیزیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔

جب پیر صاحب نے بھی مداخلت سے انکار کر دیا تو اماں جان بستر سے اتر آئیں۔

''بند کرو یہ لڑائی۔'' وہ دونوں بھائیوں کے بیچ میں آ گئیں۔ ''تم دونوں کیا سب ادب آداب بھول گئے ہو؟''

اماں جان کو اپنے بیچ آتے دیکھ کر دونوں نے ہاتھ روک لیے اور ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔

''اس گھر کے ہر مکین کی محبت میں، میں نے اپنا آپ مٹا دیا۔ اس کا یہ صلہ دے رہے ہو مجھے؟ اپنی کس کس اولاد کے لیے رونا پڑے گا مجھے؟''

حیدر علی نے سر جھکا لیا۔

''دور ہو جاؤ تم دونوں میری نظروں کے سامنے سے۔''

''اماں جان!'' حیدر علی نے کچھ کہنا چاہا۔

''مت بات کرو مجھ سے آج میری اولاد نے میرا ایسا دل دکھایا ہے کہ تم میں سے کسی کے ساتھ بات کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ چلے جاؤ دونوں یہاں سے۔''

حیدر علی بوجھل قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔

☆======☆======☆

''میں سوچ رہی ہوں رضیہ کہ شاہ جی کو تحفہ دوں۔'' زرینہ نے کہا۔

''اوہ خدایا!'' رضیہ کا دل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ ڈالے۔

''تم میں ذرا بھی مستقل مزاجی نہیں ہے۔ ابھی چند دن پہلے تو تم کہہ کر آئی تھیں کہ آئندہ ان سے نہیں ملو گی۔''

''ابھی کم از کم ایک ملاقات تو رہتی ہے ناں۔'' وہ بولی۔ ''جس میں وہ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے اور اگر فیصلہ میرے حق میں ہو گیا تو پھر سب غم ہی ختم ہو جائیں گے اور پھر یہ بھی دیکھو ناں کہ انہوں نے مجھے کتنے ہی تحفے دیئے ہیں، مجھے انہیں کچھ تو دینا چاہیے۔

پتا ہے رضیہ! میں ہر نماز کے بعد صدق دل سے دعا کرتی ہوں کہ سائیں بابا نے جو کچھ کہا وہ پورا ہو جائے اور شاہ جی مجھے وہ خوش خبری سنا دیں جو اس سے پہلے میں سائیں بابا کے منہ سے سن چکی ہوں۔''

''وہ خوش خبری کب تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ تم ایسے دلہن بنو گی کہ نہ تن پر سرخ جوڑا ہو گا اور نہ گلے میں زیور، نہ ڈھول تاشے، نہ باجے گاجے۔ ہاں بہت سی آہیں اور سسکیاں ہوں گی۔''

''شاہ جی مل جائیں تو نہ مجھے سرخ جوڑے کی ضرورت ہے نہ زیور کی اور گھر سے بیٹی کو رخصت کرتے وقت وہ کون سا گھر ہوتا ہے، جہاں ماں باپ روتے نہیں ہیں۔''

''وہ خوشی کا رونا ہوتا ہے، آہیں اور سسکیاں نہیں ہوتیں۔ آہیں اور سسکیاں تو تب نکلتی ہیں جب دل زخمی ہو کر خون خون ہو جاتا ہے۔''

''تو کیا وہ فوزیہ کی سسکیاں ہوں گی؟'' وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

''رضیہ! میں نے تو کبھی کسی کو دکھ دینے کا سوچا بھی نہیں تھا، لیکن ہم میں سے کسی ایک کو تو بوجھ اٹھانا ہی ہو گا۔ مجھ میں کسی کو بھی دکھ پہنچانے کا حوصلہ نہیں ہے، اس لیے فیصلے کا تمام تر اختیار میں نے شاہ جی کو دے دیا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہوں، کوئی منظر نہیں دیکھنا چاہتی نہ خوشی کا نہ غم کا، میں تو بس شاہ جی کا ساتھ چاہتی ہوں عمر بھر کا۔''

''آنکھیں بند کرنے سے کیا ہوتا ہے، جس کا دل دکھتا ہے، اس کی آہیں اور سسکیاں دل سے دیکھی اور سنی جاتی ہیں۔''

''میں اس مسئلے پر سوچنا نہیں چاہتی۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''انسان موت سے پہلے اس کے خوف سے کیوں مر جائے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں انہیں تحفے میں کیا دوں؟''

''مجھ سے کیوں پوچھتی ہو، پہلے بھی تم نے میری کس بات پر عمل کیا ہے؟''

''میں انہیں اپنے ہاتھ کا کاڑھا ہوا رومال دے دوں؟'' اس نے رضیہ کی بات نظر انداز کر دی۔

''تمہاری مرضی۔'' اس نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

زرینہ اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھتی رہی پھر خود بھی باہر چلی آئی۔

مولوی صاحب برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ ان کے پاس چلی آئی۔

''اباجی! آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کہو۔'' انہوں نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے ریشمی کپڑا اور رنگین دھاگے چاہئیں۔''

''کیا کرو گی؟''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ ایک خوبصورت سا رومال کاڑھوں۔''

''اتنے بچے پڑھنے کے لیے آتے ہیں کسی سے کہہ کر منگوا لو یا چاہو تو خود جا کر خرید لاؤ۔''

''اس گاؤں میں تو کوئی بھی چیز نہیں ملتی آپ مجھے شہر سے منگوا دیں ناں۔'' اس نے لاڈ

سے کہا۔

''جب کوئی شہر جائے گا تو منگوا دوں گا۔''

''آپ بھول جاتے ہیں ابا جی لیکن یہ بہت ضروری ہے آپ کو یاد رکھنا ہوگا۔''

''میں تو واقعی بھول جاتا ہوں' لیکن اس کا کیا علاج ہے۔''

''علاج بالکل ہے۔'' وہ فوراً بولی۔

''تو اجازت ہے لو کر دو۔''

''علاج یہ ہے ابا جان کہ میں صبح شام ہر وقت آپ کو یاد دلاتی رہوں گی' پھر آپ نہیں بھولیں گے۔''

''ابا جی یاد نہیں دلاتی رہے گی' آپ کے کان کھاتی رہے گی۔'' رضیہ نے جل کر کہا۔

''یہ تو بتا دو کہ کس رنگ کا کپڑا اور دھاگا چاہیے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اوں۔'' وہ سوچنے لگی۔ ''ہاں سفید رنگ کا کپڑا اور سرخ دھاگا ٹھیک رہے گا۔''

''اُف گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔'' ماں کمرے سے نکلیں۔ ''زرینہ آج سے صحن میں چارپائیاں بچھانی شروع کر دو۔ سارا گاؤں صحن میں سوتا ہے۔ ہمارے گھر میں سب کو گرمی کھانے کا زیادہ ہی شوق ہے۔''

''اماں باہر سونا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' زرینہ نے تائید طلب نگاہوں سے رضیہ کو دیکھا' لیکن وہ جگ ہاتھ میں لیے موتیے کے پھولوں کو پانی دیتی رہی۔

''اندر کمرے میں بھن جائے گی یہ لڑکی۔'' اماں تخت پر جا بیٹھیں۔

''میں بالکل نہیں بھنوں گی۔ میری فکر نہ کیا کریں۔'' وہ بولی۔

''اور آج تو آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیاں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ذرا بارش ہوئی تو چارپائیاں برآمدے میں رکھنے کے لیے دوڑو۔ نہیں اماں مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ چند دن کمرے میں ہی گزار لیں۔''

''نمک کی بنی ہوئی نہیں ہو کہ بارش میں گھل جاؤ گی۔''

''اماں! میں مکئی کا دانہ بھی نہیں ہوں' جو بھن جاؤں گی۔'' اس نے منہ بنایا۔

''بس جو میں کہہ رہی ہوں' وہ کرو۔'' اماں نے اسے ڈپٹا۔ ''ہر گھر میں لڑکیاں یہ کام کرتی ہیں۔ تمہارے نخرے بڑھتے جا رہے ہیں۔''

پھر وہ مولوی صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

''کچھ خیر خبر ملی اچھو کی؟ پتا نہیں گاؤں چھوڑ کر کہاں چلے گئے سب گھر والے۔''

''جانا کہاں ہے' ملتان یا لاہور چلا گیا ہوگا۔'' وہ بولے۔

''ابا جی! ہو سکتا ہے کراچی چلا گیا ہو۔'' زرینہ نے بھی خیال ظاہر کیا۔

''ملتان اتنا قریب ہے اور لاہور کوئی نہ کوئی حویلی سے جاتا ہی رہتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کراچی ہی گیا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں مزدوری بھی آسانی سے مل جاتی ہے اور لوگ تو اتنے زیادہ ہیں کہ بندہ چھپ جائے تو کوئی ڈھونڈ بھی نہیں سکتا۔''

''اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے' واپس یہیں آنا ہوگا۔''

''واپس آ گئے تو خیر نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بڑے شاہ صاحب بہت سخت ہیں' وہ کسی کو معاف نہیں کرتے۔''

''دنیا کا ظلم زیادہ دن نہیں چلتا بالآخر سب نے اوپر والے کے سامنے جمع ہونا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ سب کے ہاتھوں میں اس کا اعمال نامہ تھما دے گا اور ہم انسان حیران ہوں گے کہ اس اعمال نامے میں رائی برابر نیکی اور بدی تک بھی موجود ہوگی' لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے' جو ہر حال میں پورا ہوگا اور اس اگلی دنیا میں ہر کوئی اپنے اعمال کے مطابق جگہ پائے گا۔ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے ہاں وہ ابدی دنیا ہے اور یہ زندگی درحقیقت ہمیں اس دنیا کے لیے دی گئی ہے تاکہ ہم اپنی اگلی زندگی کی خاطر زادِ راہ اکٹھا کر سکیں۔''

''لیکن ابا جی! پیر صاحب تو ایسے نہیں ہیں' وہ تو بہت اچھے ہیں پھر وہ بڑے شاہ صاحب کو روکتے کیوں نہیں ہیں؟''

''جو بات ان کے علم میں ہی نہ آئے' اسے کیسے روک سکتے ہیں وہ؟''

''ہوں۔'' پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بظاہر بہت سرسری انداز میں بولی۔

''ابا جی! باہر کی تعلیم کچھ نہ کچھ اثر تو دکھاتی ہی ہے۔ ابھی ایک بیٹے کی حرکتیں سامنے آئی ہیں' پتا نہیں دوسرا کیسا ہوگا؟''

''شاید۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''انسان کسی کے بارے میں کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔''

زرینہ بجھ کر رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ مولوی صاحب حیدر علی کی تعریف کریں گے یا اس کے متعلق کوئی اور بات بتائیں گے' لیکن انہوں نے تو گفتگو ہی ختم کر دی تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر صحن میں چارپائیاں بچھانے لگی۔

رات کو کھلے آسمان تلے سیدھی لیٹ کر وہ تارے گننے کی کوشش کرتی رہی لیکن تھوڑی ہی دیر میں تاروں اور بادلوں کی آنکھ مچولی میں الجھ گئی۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر سائیں بابا کی پُرسوز آواز ہوا کے دوش پر چار دیواری پھلانگ کر اندر داخل ہوئی۔

''ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
ساڈے چم دیاں جُتیاں کرے کوئی جیہڑا جیودا روگ گواوندائی

بھلا دس کھاں جڑیں وچھیاں نوں کدوں رب سچا گھریں لیاوندائی
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندائی
اک باز توں کانگ نے کونج کھوئی ویکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی''

وہ اٹھ بیٹھی۔ حیدر علی کی یاد شدت سے ابھر آئی تھی۔ وہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی لیکن وہ ہر رکاوٹ عبور کر کے دندناتا چلا آ رہا تھا۔

بارش کا ایک قطرہ اس کے بالوں میں جذب ہوا تو وہ چونکی اور جلدی جلدی بستر سمیٹنے لگی۔ ذرا سی دیر میں سب کی آنکھ کھل گئی۔ اماں ابا تو کمرے میں چلے گئے۔ وہ دونوں بستر سمیٹنے اور چارپائیاں اٹھانے لگیں۔

''اچھی بھلی نیند برباد ہو گئی۔'' رضیہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

لیکن وہ وہیں برآمدے میں تخت پر لیٹ گئی۔

''پتا نہیں شاہ جی کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''اور ایک ان کے فیصلے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل میں تو پیر صاحب کو فیصلہ کرنا ہے۔ اور ان کی ہر بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے جبکہ وہ پہلے ہی فوزیہ کے حق میں فیصلہ کر چکے ہیں' پھر بھی پتا نہیں کیوں سائیں بابا کی بات یاد آ جاتی ہے تو دل کو قدرے سکون ہو جاتا ہے۔ پھر وہ آہیں اور سسکیاں۔''

☆======☆======☆

سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

حیدر علی رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے قدموں تلے انگارے بچھا دئیے ہوں۔ اگر رجب علی کو اپنے کئے پر ذرا بھی ندامت ہوتی تو وہ چپ کر جاتا لیکن جب وہ بار بار اپنے فعل کو غیرت مندی پر محمول کرنے لگا تو حیدر علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ ایک واقعے نے ان کے درمیان وسیع خلیج حائل کر دی تھی۔ ساری رات وہ راکنگ چیئر پر بیٹھ کر جھولتا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ غصہ اور دکھ اس کے وجود کے ایک ایک بند میں جیسے موجیں مار رہا تھا۔

صبح کا وقت اس نے بمشکل کاٹا تھا۔ جیسے ہی سپیدۂ سحر نمودار ہوا' وہ زیب النسا کے کمرے کی طرف بڑھا' دو تین مرتبہ دستک کے جواب میں جب کسی نے اندر سے آنے کو نہیں کہا تو اس نے ہولے سے دباؤ ڈال کر دروازہ کھول لیا۔

کمرے میں نائیٹ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی' اور زیب النساء مسہری پر دراز بے خبر رہی تھی۔ وہ دروازے سے ہی واپس پلٹ آیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اب بھی صورتِ حال پہلے

جیسی ہی تھی' وہ پلٹنے لگا پھر رک گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس صورتِ حال میں آپی اتنی بے فکری کی نیند سو جائیں۔''

اس نے سوچا۔

اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ کہیں کوئی گرہ تھی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی شش و پنج میں مبتلا رہا کہ آگے بڑھ کر زیب النساء کو جگا دے یا سویا رہنے دے۔ پھر یہ سوچ کر پلٹ گیا کہ اگر وہ سچ مچ اتنی بے فکری سے سو رہی ہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہی ہے۔ ہاں اگر مزید کچھ دیر تک نہ جاگی تو وہ اسے جگا دے گا۔

وہ واپس اپنے کمرے میں تو آ گیا تھا' لیکن اس کا ذہن مسلسل زیب النساء کی طرف تھا۔ اس کا یوں سو جانا ایک غیر معمولی بات تھی' جو بار بار حیدر علی کو پریشان کر رہی تھی۔

جب بے چینی حد سے بڑھ گئی کر تو پھر وہ زیب النسا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ ایک مرتبہ پھر ہلکے سے دباؤ سے کھل گیا۔ اس نے اندر جھانکا تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں وقت تھم گیا ہو' جیسے اتنے سامان سے بھرے ہونے کے باوجود وہ کمرا بالکل خالی ہو۔ اسے اپنی گزشتہ رات کی سوچ یاد آئی۔

''وقت تو مسلسل آگے بڑھنے کا نام ہے' حرکت میں زندگی ہے' ٹھہراؤ اور جمود ہے۔''

اور اس وقت کمرے کی ہر چیز ساکت ہو چکی تھی۔ زندہ انسان بے جان چیزوں میں بھی تحرک پیدا کر دیتے ہیں' پر جب زندگی فنا کے گھاٹ اترتی ہے تو لمحے رک جاتے ہیں۔ بے جان چیزیں قائم رہتے ہوئے بھی فنا ہو جاتی ہیں۔ بالکل یوں جیسے چاند اپنی چمک دمک کے لئے سورج کا محتاج ہوتا ہے۔ جس دن سورج کو فنا نے آ دبوچا' اسی دن چاند کا وجود بھی بے معنی ہو جائے گا۔

کمرے میں لمحوں کے ساکت ہو جانے کا احساس ہوتے ہی حیدر علی کا دل بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ چند قدموں کا فاصلہ کوسوں پر محیط ہو گیا تھا' اس کے لئے ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی۔

اور پھر اجل کے ہاتھوں نے زندگی کو شکست دے دی۔ نائیٹ بلب کی زرد روشنی میں بھی یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ کبھی کی اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ چہرے پر پھیلی ہلکی سی نیلاہٹ یہ بتانے کے لئے بھی کافی تھی کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔

چند ثانیے حیدر علی سن ہو کر رہ گیا' اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ ایک ٹک زیب النساء کی طرف دیکھے گیا۔ اس کے سفید کپڑوں پر لگے خون کے دھبوں سے ہلکی سی بو اٹھ رہی تھی اور سفید ہی چادر پر اس کے سیاہ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر ابدی سکون پھیلا ہوا تھا۔

''پتا ہے علی کون آیا ہے؟'' دیواریں چلانے لگیں۔

''موت کے ہرکارے آئے ہیں۔ سن رہے ہو ان کے قدموں کی چاپ۔ میں انہی کی منتظر تھی، وہ جان کی بازی لگا کر بھی مجھے آزاد کروانے کا بندوبست کر گیا ہے۔''

''تم نے آج رات کو تارا ٹوٹتے دیکھا ہے؟'' آئینہ بولا۔

''نہیں، تم نہیں دیکھ سکتے، مجھے خبر ہے تم نے نہیں دیکھا۔''

☆======☆======☆

حویلی کے درو دیوار کے بیچ معمول کے مطابق کام شروع ہو چکا تھا۔ پیر صاحب ابھی ابھی قرآن پاک بند کر کے اپنی خواب گاہ سے باہر نکلے تھے، رجب علی اور سخاوت علی گھڑ سواری کی جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ جب حیدر علی وہاں پہنچا۔

''علی بھائی۔'' سخاوت اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ ''آج آپ جلدی جاگ ہی گئے ہیں تو ہمارے ساتھ رائیڈنگ پر ہی چلے چلیں۔ آپ ہوتے ہیں تو رائیڈنگ کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔''

حیدر علی نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور رجب علی کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تولتے رہے پھر حیدر علی گویا ہوا۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ جیت گئے ہیں؟ نہیں، زیبی آپی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ناقابلِ معافی ہے؟''

''اگر تم میرے بھائی نہ ہوتے علی تو اس وقت زمین کے اوپر یوں تن کر کھڑے نہ ہوتے۔''

''آپ کو ان رشتوں کا احساس ہے؟'' وہ تلخی سے بولا۔ ''نہیں، موت کے ہرکارے کو کسی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا کام تو صرف موت بانٹنا ہوتا ہے، جو آپ اس گھر میں بانٹ رہے ہیں۔ آپی کے قتل پر میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

''اوہ!'' رجب علی نے گہرا سانس لیا۔

''کیا ہوا زیبی آپی کو؟'' سخاوت کے لئے یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔

''وہ بالکل ٹھیک تھیں، کل رات کتنی دیر تک میں ان کے پاس بیٹھا رہا تھا۔''

''رجب علی، زیب النساء کی وفات کا باقاعدہ اعلان کر دو اور یہ بھی کہ اس بات کا علم سب سے وقت سب سے پہلے حیدر علی کو ہوا ہے۔'' پیر صاحب نے حکم دیا۔

''کتنے سنگ دل، کس قدر بے حس لوگ ہیں آپ۔'' حیدر علی چلایا۔ ''اپنے ہاتھ کا پالا ہوا کتا مر جائے تو انسان اس پہ بھی افسردہ ہو جاتا ہے، لیکن آپی کو قتل کر دینے کے بعد بھی آپ کی پشیمانیوں پر شرمندگی کی ایک لکیر، دکھ کا ذرا سا یہ تک نہیں ہے۔''

''قتل۔'' سخاوت زیرِ لب بولا۔ وہ کوئی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''حیدر علی۔ اسے نہ تو قتل کیا گیا ہے اور نہ سزا دی گئی ہے۔'' پیر صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔ ''وہ اس درو دیوار سے آزادی چاہتی تھی، سو ہم نے اس کے لئے نیا گھر تعمیر کر دیا۔ ہمارے بس میں اس قدر آزادی دینا تھا، اس لئے آئندہ ہم تمہارے منہ سے یہ الفاظ کبھی نہ سنیں۔ اپنی اولاد اور خود اپنے سے بھی زیادہ ہمیں اپنی اور اس حویلی کی عزت عزیز ہے اور ہم کسی کو بھی یہ عزت خاک میں ملانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

''بابا جان اس حویلی کی عزت مجھے بھی بہت پیاری ہے، لیکن انسانی جذبات و احساسات سے زیادہ نہیں۔ آج تو میں خاموش ہو رہا ہوں کیوں کہ اب وقت پلٹ نہیں سکتا، لیکن آئندہ ہم بھائی شاید اکٹھے نہ ہو سکیں۔ آج سے میری ان رسموں رواجوں اور ان کے علمبرداروں سے کھلی جنگ ہے۔''

☆======☆======☆

صبح زرینہ کی آنکھ افراتفری اور غیر معمولی چہل پہل کی وجہ سے کھلی۔ ایک آنکھ کھول کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ صحن میں کچھ عورتیں جمع تھیں اور اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔

''اُفوہ! اب اٹھ کر اندر کمرے میں جانا پڑے گا۔'' اسے الجھن محسوس ہونے لگی۔ ان عورتوں کو بھی اور کوئی وقت نہیں ملا تھا آنے کو۔''

اٹھنے کا ارادہ کرنے کے باوجود وہ کسلمندی سے وہیں پڑی رہی۔ نیند ایک مرتبہ پھر حملہ آور ہو رہی تھی، لیکن ان عورتوں کی اونچی آوازیں اس کے کانوں میں جیسے چبھ رہی تھیں۔

''ملانی جی! پتا نہیں اس گاؤں کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔'' ماسی برکتے کہہ رہی تھی۔

''کیا یہی گھڑی رہ گئی تھی دیکھنے کو، یا مولا رحم فرما۔''

''ماسی! تم آہستہ آواز میں رحم طلب کرو گی تو بھی آواز اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گی۔'' وہ جھنجھلا کر بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولی۔

''ضرور تم نے میرا سر کھانا ہے۔''

''اٹھو اب۔'' اماں نے اسے ڈپٹا۔ ''کیا نحوست پھیلا رہی ہو صبح کے وقت سو کر۔''

اس نے سنی اَن سنی کر کے کروٹ بدل لی۔

''اٹھو زرینہ۔'' رضیہ نے اسے جھنجوڑا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' اس نے رضیہ کا ہاتھ جھٹکا۔ ''ایک تو صبح صبح سارا گاؤں سر پر سوار ہو گیا ہے، اوپر سے تم ہڈیاں چرمرا رہی ہو۔''

''اٹھو جلدی کرو، چھوٹی بی بی کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے زرینہ کو بری طرح جھنجوڑ دیا۔

''تو میں کیا کروں؟'' وہ جھلا گئی پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔

''کیا زیب النساء کا انتقال ہو گیا؟''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ ساری نیند غائب ہو چکی تھی۔
کب ہوا؟ تمہیں کس نے بتایا ہے؟''
''یہ جو اتنی عورتیں جمع ہیں' اسی لئے تو آئی ہیں۔''
''میں پوچھ رہی ہوں کب انتقال ہوا کیسے ہوا؟''
''رات کو ٹھیک ٹھاک سوئی تھیں' پتا نہیں کیا ہوا صبح پتا چلا وفات پا گئی ہیں۔''
''اوہ خدایا!'' اس نے سر پکڑ لیا۔
''اماں اور میں حویلی جا رہے ہیں تم چلو گی؟''
زرینہ کا ذہن مفلوج ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔
''تم نہیں جانا چاہتیں۔''
''نہیں' میں جاؤں گی۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''پتا نہیں شاہ جی کی کیا حالت ہو گی انہیں بہت محبت تھی اپنی بہن سے۔''
''شی۔'' رضیہ گھبرا گئی۔ ''تم نے ضرور ڈھنڈورا پیٹنا ہے سارے محلے کو سنا دو یہ بات۔''
''میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔''
''تو پھر بہتر یہی ہے گھر پر رہ جاؤ' وہاں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی تو اپنے ساتھ باقی سب کو بھی مصیبت میں مبتلا کر دو گی۔''
''نہیں رضیہ' ایسی باتیں میں صرف تم سے ہی کہتی ہوں اور تو کسی کے سامنے نہیں کہتی۔''
اس کے انداز میں اتنی معصومیت تھی کہ رضیہ کو اس پر بے اختیار پیار آ گیا۔
''اچھا پھر اٹھو جلدی کرو۔''
وہ اچھل کر تخت سے اتری اور جلدی سے تیار ہونے لگی۔
''اماں چلنا نہیں ہے۔'' چند منٹ میں وہ ان کے سامنے تھی۔
''چلو۔'' اماں نے پاؤں چپلوں میں ڈالے۔
''اچانک کیا ہو گیا زیب النساء کو؟'' رضیہ کے ساتھ حویلی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئی زرینہ مدھم آواز میں بولی کیوں کہ عورتوں کا خاصہ بڑا ہجوم ان کے اردگرد ہی موجود حویلی کی طرف چلا جا رہا تھا۔
''پتا نہیں میں خود حیران ہوں جب چھوٹے شاہ صاحب تم سے ملے تھے تو انہوں نے اس سلسلے میں کوئی ذکر کیا تھا؟''
''نہیں' اگر وہ بیمار ہوتیں تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتاتے۔ ویسے اس دن ہم دونوں ہی پریشان تھے اور ہماری ملاقات بھی ہمیشہ کی نسبت مختصر رہی۔''

''مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے' لیکن شاید آج فوزیہ بھی وہاں موجود ہو۔''
رضیہ نے خیال ظاہر کیا۔
زرینہ کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ ''میرا اس سے کیا تعلق ہے' اس کا ذکر کیوں کرتی ہو؟''
''دشمنی کا بندھن تو سب سے زیادہ مضبوط بندھن ہوتا ہے۔''
''ہوتا تو ہو گا' لیکن میری اس سے دوستی ہے نہ دشمنی' میرے لئے اس کے وجود یا اس کے ہونے نہ ہونے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''
''یہ رویہ بہت اچھا ہے۔'' رضیہ نے تبصرہ کیا۔
''اس طرح نہ تمہیں دکھ کا سامنا کرنا پڑے گا اور نہ پچھتاووں کا' لیکن اسے اپنانا بہت مشکل ہے۔''
''میرے لئے مشکل نہیں ہے۔'' وہ خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی' مگر اس کا لہجہ اس کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا۔
حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رک گئی۔
''چلو جلدی کرو۔'' رضیہ نے اسے گھسیٹا۔
زرینہ نے متجسس نظروں سے حیدر علی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی' جس میں اسے کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔
بائیں ہاتھ اپنے رشتہ داروں کے درمیان وہ بھی موجود تھا۔ سفید شلوار کرتے میں وہ ہمیشہ سے بہت مختلف دکھائی دے رہا تھا۔
اسے دیکھ کر زرینہ بے اختیار رک گئی۔ اس کے ماموں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے تسلی دے رہے تھے۔
''زرینہ! تم پاگل تو نہیں ہو گئی۔'' رضیہ نے پھر اسے آگے کی طرف گھسیٹا۔ ''جلدی چلو۔''
وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہی اندر لے آئی۔ اندر کہرام مچا ہوا تھا۔ گاؤں کی عورتیں بین کر رہی تھیں' لیکن سب سے بری حالت حمیدہ کی تھی۔ وہ دونوں برقعے اتار کر وہیں ایک طرف بیٹھ گئیں۔ زرینہ اتنی عورتوں کے درمیان فوزیہ کو تلاش کرنے لگی۔
ایک طرف مہر النساء گھٹنوں پر سر ٹکائے رو رہی تھی' اس کے قریب ہی بڑی بیگم تھیں۔ ان کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے لیکن ہونٹ بالکل سلے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر یاسمین اور فوزیہ تھیں' جو بری طرح رو رہی تھیں۔
زرینہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔
لمحے دبے پاؤں سرکتے جا رہے تھے۔ ایک ملازمہ انہیں سپارے پکڑا گئی اور وہ دیگر عورتوں کے ساتھ کلام پاک پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ پھر اچانک ہل چل بڑھ گئی۔ رونے اور بین

کرنے کی آواز میں شدت آگئی۔ زرینہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پیر صاحب، رجب علی، حیدر علی اور سخاوت کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ جنازہ اٹھانے کا وقت ہو گیا تھا۔

زرینہ ایک ٹک حیدر علی کی سمت دیکھے گئی، جس کے چہرے پر حزن و ملال بکھرا ہوا تھا اور ضبطِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا تھا۔ اس نے بہت دفعہ حیدر علی کو پریشان ہوتے دیکھا تھا لیکن اسے کبھی اس طرح دکھی نہیں دیکھا تھا۔

کتنے پل گزر گئے، وہ سفید کفن میں لپٹی زیب النساء کی طرف دیکھے گیا پھر کلمہ شہادت کا ورد بلند ہوتے ہی جیسے وہ ہوش میں آگیا اور جنازے کو کندھا دے کر باقی سب کے ساتھ باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

''تم نے فوزیہ کو دیکھا تھا؟'' گھر کے کچے صحن میں دیوار سے ٹیک لگائے رضیہ نے زرینہ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصراً کہا۔ ''لیکن تم نے اس وقت اسے نہیں دیکھا تھا، جب چھوٹے شاہ صاحب باقی سب کے ساتھ اندر آئے تھے۔''

''ہاں، لیکن اس وقت تمہیں ہوش کب تھا۔'' رضیہ بولی۔

''اور ان چند لمحوں میں وہ بھی تمہاری طرح ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔''

زرینہ مضطرب ہو گئی۔ ''لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ اسے نہیں مجھے چاہتے ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یک طرفہ محبت کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔'' اس کی یہ دلیل رضیہ کی تسلی کے لئے کم اپنی تسلی کے لئے زیادہ تھی۔

''اور پھر انہوں نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں آئی ہوئی ہے۔''

''دیکھا تو خیر انہوں نے تمہیں بھی نہیں تھا۔'' رضیہ زمین پر پڑے تنکے سے کھیلتے ہوئے بولی۔

زرینہ زچ ہو گئی۔ ''ان کی جوان بہن فوت ہو گئی تھی، وہ اس کا جنازہ اٹھانے آئے تھے، کیا بھرے مجمعے میں وہ مجھے تلاش کرتے پھرتے۔''

''یہی تو میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اسے نہ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔''

''میں تم سے یہ فضول بحث نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ جھلا گئی۔

اسے صحن کا وہ منظر یاد آگیا جب حیدر علی کے ماموں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے

دلاسا دے رہے تھے اور وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

''ایک بات محسوس کی تھی تم نے؟''

''کیا؟'' زرینہ نے بےزاری سے پوچھا۔

''زیب النساء کا چہرہ کیسے نیلا ہو رہا تھا۔''

''ہاں پتا نہیں کیا ہوا تھا بے چاری کو۔'' وہ بولی۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کی عمر اتنی مختصر ہے تو میں شاہ جی سے اس کے متعلق کبھی نہ لڑتی، پر مجھے کیا پتا تھا۔''

''یہ سب کچھ تو زندگی کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔'' رضیہ نے اسے تسلی دی۔

''ہاں مجھے پتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی۔

''مثلاً آج تمہیں پتا چلے کہ کچھ عرصے بعد مجھے مرجانا ہے تب بھی تم مجھ سے لڑو گی ضرور اور شاہ جی سے ملنے سے روکو گی۔ جب تک میں زندہ ہوں تب تک تو یہ سب چلتا ہی رہے گا۔''

اس کی بات سن کر رضیہ ہنس پڑی۔ ''پاگل کہیں کی۔''

''خیر، میں بھی اتنی جلدی نہیں مرنے کی۔ ابھی تو شاہ جی کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹنے ہیں اور تم سے بھی تو جی بھر کر لڑنا ہے۔ جب تک اچھی طرح تم سے لڑ نہیں لوں گی، تب تک سوچنا بھی مت کہ میں مر سکتی ہوں۔''

زرینہ نے کہا اور دونوں زور سے ہنس پڑیں۔

''لڑکیو! کچھ ادھر کا بھی ہوش ہے حمیدہ آئی کھڑی ہے۔'' اماں نے دوسرے کونے میں بیٹھی رضیہ اور زرینہ کو کھسر پھسر کرتے دیکھ کر پکارا۔

''حمیدہ۔'' زرینہ زیر لب بولی اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کہاں ہے؟''

پھر اماں کے ساتھ کھڑی حمیدہ پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی

''تم کب آئیں'' اس نے حمیدہ کے دھواں دھواں چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

''ابھی آئی ہوں۔'' وہ بولی۔

''میرے کمرے میں آجاؤ۔''

''کہاں گرمی میں مارتی ہو بے چاری کو۔'' اماں بولیں۔ ''کمرا تو تندور بنا ہوا ہے، باہر ہی بٹھاؤ۔''

''اماں ہمیں گرمی نہیں لگتی۔''

وہ حمیدہ کو اندر گھسیٹ لائی۔ رضیہ بھی ان کے پیچھے اندر لپک آئی۔

''خیریت تو ہے نا حمیدہ۔'' اس نے ہاتھ کا پنکھا اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

''میں سخت پریشان ہوں۔'' اس نے سوجی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ''مجھ سے یہ

دباؤ برداشت نہیں ہو رہا' لیکن کوئی ایسا بندہ نہیں ہے' جس سے دل کی بات کر کے میں اپنے اندر کا غبار باہر نکال سکوں۔''

زرینہ اور رضیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''تم ہم سے کہہ دو۔'' بالآخر رضیہ نے کہا۔

''کہہ دینے سے انسان کا دل ہلکا ہو جاتا ہے یقین کرو تم جو کچھ مجھ سے کہو گی' وہ ہم اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

''میں تو اپنے سانس کی آواز سے بھی خوف زدہ ہوں کہ کہیں وہ ہی میرا راز فاش نہ کر دے' مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟''

''اگر ایسی بات ہے تو تم تسلی سے کچھ وقت یہاں گزار دو۔ انسان افسردگی والے ماحول سے نکلے تو ہی ٹھیک سے کچھ سوچ سکتا ہے۔'' زرینہ نے کہا۔

''ہم بھی یہاں ہیں' ہم سے جس قدر ہو سکا' تمہاری مدد کریں گے۔ ویسے بھی تم نے جو مجھ پر احسان کیا تھا میں اسے بھولی نہیں ہوں۔''

''احسان کیا تھا' میں تو دوستی نباہ رہی تھی۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا

''مجھ سے کسی کو دکھی اور افسردہ نہیں دیکھا جاتا۔ سب کے لئے جان کی بازی لگا دیتی ہوں' ہر ایک کے راز کو اپنے اندر دفن کر لیتی ہوں' لیکن آج اندر گھٹن بہت بڑھ گئی ہے۔''

''گرمی سے آئی ہو میں تمہارے لئے لسی لے کر آتی ہوں۔'' رضیہ اٹھی۔

''تمہیں پتا ہے زیب النسا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔'' وہ لسی کے ٹھنڈے گلاس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

زرینہ کچھ بولنے لگی تھی' لیکن رضیہ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

حمیدہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور پھر گہرا سانس لے کر بولی۔ ''اب بھی میں نے کسی کو شریک نہ کیا تو شاید میں اندر ہی اندر گھٹ جاؤں گی۔ تمہیں نہیں پتا چھوٹی بی بی یوں ہی نہیں مریں' انہیں قتل کیا گیا ہے۔''

''کیا؟'' ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''کس نے قتل کیا ہے؟ کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کچھ باتیں مجھے معلوم تھیں اور کچھ بڑی بی بی نے بتا دیں اور میں بڑی بی بی کی بات پر یقین کرنے کے لئے اس وجہ سے مجبور ہوں کیوں کہ اصولاً آج صبح انہیں اپنے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ کل رات ان کے فرار کے لئے حویلی کا چھوٹا پھاٹک میں نے خود کھولا تھا۔''

☆======☆======☆

اچھو کی مسخ شدہ لاش بڑی سڑک کے دوسرے کنارے ذرا پرے گر کے پڑی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اس پر ایک گوالے کی نظر پڑی جو کندھے پر دودھ کے ڈرم رکھے اپنی دھن میں سیٹی بجائے چلا جا رہا تھا۔

صبح صادق کا وقت تھا اور اندھیرا ابھی نہیں چھٹا تھا۔ راستے میں گٹھڑی سی پڑی دیکھ کر اسے تجسس ہوا۔

''یہ کیا پڑا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''لگتا ہے کوئی گٹھڑی ہے۔ شاید کوئی چور چوری کا سامان باندھ کر لے جا رہا تھا اور کسی وجہ سے سارا سامان چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔'' اس نے خود سے ہی اندازے لگانے شروع کیے۔

''ضرور اس چور کے پیچھے کچھ لوگ پڑے ہوں گے اس لئے ڈر کے مارے گٹھڑی یہیں پھینک گیا۔ واہ بھئی رحیمے تیری قسمت آج تو صبح ہی صبح مہربان ہو گئی۔ محنت کسی نے کی' پھل میرے لئے چھوڑ گیا' کوئی کام کی چیز نکلی تو چور کو دعائیں دے کر میں رکھ لوں گا' اور اگر میرے مطلب کی چیز نہ ہوئی تو گٹھڑی کسی معتبر شخص کے حوالے کر کے کوئی چٹ پٹی سی کہانی سنا کر سارے گاؤں پر اپنی دھاک جما دوں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ میں نے چور کو کیسے للکارا' وہ بڑھک ماری کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلا۔

پر نہیں' جب تک یہ نہ بتایا کہ میں نے چور کو دھوبی پٹڑا دے کر گرایا تھا' تب تک دھاک کیسے بیٹھے گی۔ ہاں میں نے چور کو للکارا' وہ گٹھڑی چھوڑ کر میرے سامنے آ گیا۔ یہ جان تھی اس کی' مکھن ملائی پر پلا ہوا تھا' پر میں نے بھی پروا نہیں کی' اپنی جان بھی آخر کسی سے کم تو نہیں ہے پھر تو ایسی لڑائی ہوئی کہ گاؤں والے دیکھتے تو دانتوں تلے انگلی دبا لیتے۔ پہلے وہ مجھے گھسیٹ کر دس فٹ تک لے گیا۔ دس نہیں پندرہ فٹ تک۔ ہاں تو پندرہ فٹ تک گھسیٹ کر لے گیا۔ پھر میں نے کہا رحیمے آج غیرت کا امتحان ہے یہ خیال آتے ہی جیسے جسم میں بجلی بھر گئی۔ پھر میں اسے گھسیٹتے ہوئے بیس فٹ تک لے گیا۔ اس نے اڑنگا دینے کی کوشش کی' لیکن میں نے اٹھا کر اسے ایسا دھوبی پٹڑا مارا کہ کیا کبھی کسی دھوبی نے بھی مارا ہو گا' یاد کرے گا ساری زندگی' بس پھر کیا تھا 'میں نے اسے اتنا پیٹا' اتنا پیٹا کہ سب کھایا پیا بھول گیا۔ جب تک ناک سے لکیریں نہیں نکالیں' تب تک میں نے بھی نہیں بخشا۔

پھر ہاتھ باندھ کر منت کرنے لگا کہ اگر میں اسے گاؤں والوں کے سامنے لے گیا تو اس کی بڑی بے عزتی ہو گی۔ جب آنسوؤں سے رونے لگا تو مجھے ترس آ گیا۔ میں نے کہا رحیمے! جانے دے بال بچوں والا ہے' ایسے ہی ان کے سامنے شرمندہ ہو گا اس لیے یہ وعدہ لے کر چھوڑ دیا کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ میرے معافی دیتے ہی منہ پر کپڑا رکھ کر ایسے بھاگا کہ مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔

بھائیو! اصل میں یہ میری طاقت نہیں تھی' ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا' یہ تو دراصل سچائی اور ایمانداری کی طاقت تھی' جس نے اس کی کمر زمین سے لگائی۔ بس یہ باتیں کروں گا تو خوب واہ واہ ہوگی۔''

سوچتے سوچتے وہ آگے بڑھا اور قدرے ڈرتے ہوئے جھک کر گٹھڑی کو سیدھا کیا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ گٹھڑی نہیں بے جان انسانی وجود تھا۔ چیخیں مارتے ہوئے وہ گاؤں کی طرف دوڑا اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعوں کو بلا لایا۔

اچھو کی نعش ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی' ورنہ اس گاؤں کے تقریباً سبھی کو جوان اور پہلوان اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ سب سے پہلے ورثا کی تلاش میں گاؤں کی مسجد سے اعلان کروایا گیا' لیکن جب کافی دیر گزرنے پر بھی کوئی وارث سامنے نہ آیا تو گاؤں والوں نے اسے لاوارث قرار دے کر دفنا دیا۔

☆======☆======☆

گاؤں چھوڑ کر اچھو لاہور چلا آیا تھا۔ خیال تھا کہ کچھ عرصے میں کراچی چلا جائے گا۔ اتنے بڑے شہر میں سر چھپانے کا ٹھکانہ اور مزدوری ملنا کچھ مشکل نہیں تھا اور پھر اچھو کے خیال میں کراچی پیر صاحب کی دسترس سے بھی دور تھا لیکن اتنی دور جا کر فوری طور پر واپس آنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا جب کہ وہ زیب النسا سے ایک ہفتے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔ سو کچھ عرصہ اس نے لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا اور لوہاری گیٹ میں دو کمرے کرائے پر لینے کے بعد گاؤں چلا آیا۔

اس کا چھوٹا بھائی سلیم بھی وہیں کے سول لائنز کے اسلامیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ یوں اچانک گاؤں چھوڑ کر چلے آنے کی وجہ تفصیل کے ساتھ اس نے صرف سلیم کو بتائی تھی۔ جب وہ زیب النسا کو لینے گاؤں جانے لگا تو سلیم نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی' لیکن اچھو نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ایک دن کی تو بات ہے پھر وہ لاہور چلا آئے گا۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا کہ زیب النسا کو لانے میں کوئی مسئلہ پیش آسکتا تھا تو اچھو کے خیال میں وہ مسائل سے نمٹنا بخوبی جانتا تھا۔

لیکن دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور اچھو کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ماں اور منشی تو پریشان تھے ہی' سب سے زیادہ پریشانی سلیم کو تھی۔

''میرا خیال ہے' مجھے ان کی تلاش میں جانا ہی پڑے گا۔'' اس نے خود سے کہا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ اچھو آخر کہاں رہ گیا؟'' منشی بولا۔ ''یہ کوئی بات تو نہ ہوئی ناں' ہمیں یہاں بند کر کے خود بتائے بغیر چلا گیا۔''

''کام سے گیا ہے' نوکری ڈھونڈ رہا ہو گا بے چارہ!'' اماں بولیں۔ ''تم ہر وقت آسمان سر پر اٹھائے [illegible]

''اتنے دن ہو گئے پر تیرے بیٹے کو نوکری نہیں ملی ہمیں اس ڈربے میں بند کر گیا۔'' منشی چڑ کر بولا۔ ''کہاں ایسا کھلا گھر تھا گاؤں میں' کہاں یہ دو کمروں کا ڈربہ' جیسے انسان نہ ہوں مرغیاں بند کی ہوں' نہ روشن کمرے نہ صحن ہونہہ!''

''مجھے پتا ہے کس چیز کا غم لگا ہے تمہیں۔'' ماں بھی میدان میں اتر آئی۔ ''تمہاری منشائیت چلی گئی ہے۔ جھک جھک کر سلام کرنے والے نہیں رہے۔ لو حد ہو گئی بیٹے کی پروا نہیں کہ اس نے کوئی خیر کی خبر کیوں نہیں بھیجی' لگے ناشکری کرنے' ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے تمہیں۔''

''آپ لوگوں کی لڑنے کی عادت نہیں گئی۔'' سلیم جھلا اٹھا۔ ''جس دن سے آئے ہیں میں تو آپ لوگوں کو لڑتے ہی دیکھ رہا ہوں۔''

''چپ کر۔'' ماں نے ڈپٹا۔ ''تیرے خیال میں ہم لڑ رہے ہیں؟ تو ٹھیک ہے ہم چاہے لڑیں مریں تجھے کیا۔''

''اچھو نے تو کبھی ایسے نہیں کہا تھا' پر یہ شہری بن گیا ہے ناں' اس لئے ذرا منہ کھولیں تو اس کے کان میں درد ہو جاتا ہے۔'' منشی نے بھی منہ پھلا لیا۔

''اف!'' سلیم نے سر پکڑ لیا۔

''ہونہہ!'' ماں سر جھٹک کر جھاڑو دینے لگی۔

''میں جا رہا ہوں اچھو بھیا کو ڈھونڈنے۔'' بالآخر سلیم نے کہا۔

''ہاں اور تُو بھی اس کے ساتھ گم ہو جانا۔'' منشی چلایا۔ ''چپ کر کے بیٹھا رہ' وہ بچہ نہیں ہے کہ گھر کا راستہ بھول جائے گا' جیسے ہی موقع ملا یہیں پر آئے گا۔''

''انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔'' سلیم بولا۔ ''اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ انہیں تلاش کیا جائے۔''

''کیا تُو پولیس میں ہے کہ اسے ڈھونڈے گا'' منشی نے حسبِ عادت اختلاف کیا۔ ''کبھی عقل سے بھی کام لیا کرو۔''

''ابا خدا کے لئے بس کریں۔'' سلیم نے تنگ آ کر ہاتھ جوڑے۔ ''پتا نہیں اچھو بھیا آپ کو کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔''

منشی کو آگ لگ گئی اور جو منہ میں آیا بولنے لگا۔

''بولیں جتنا بولنا ہے بولیں۔'' وہ جھلا گیا تھا۔ ''میں بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہا ہوں۔'' پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔

''ماں! مجھے شاید چند دن لگ جائیں' پر آپ فکر مت کرنا۔''

''ایک وہ چلا گیا ہے' اب اس کی باری ہے۔'' ماں جھاڑو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں نہیں جانے دوں گی تجھے۔''

''ماں کیا بچوں والی باتیں کر رہی ہیں۔ میں کون سالام پر جا رہا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اچھو بھیا کہاں ہوں گے۔ جیسے ہی ملے نوکری پر لات مار کے کان سے پکڑ کر آپ کے سامنے لے آؤں گا۔''

''اس نواب زادے کو دیکھو' یہ اچھو کو لانے نہیں اس کی نوکری پر لات مارنے جا رہا ہے۔'' منشی تنک کر بولا۔'' جیسے اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دینے والا ہے' کہتا ہے شہر میں پڑھ رہا ہے' خاک پڑھ رہا ہے کبھی تو عقل والی بات کرلیا کر نالائق۔''

''اچھا اماں خدا حافظ۔ خدا حافظ ابا!'' سلیم انہیں سلام کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

منشی پیچھے آوازیں دیتا رہ گیا۔ سلیم کو یقین تھا کہ اگر اس نے اب بھی منشی کی بات نظر انداز نہ کی تو پھر شاید اگلے ایک ہفتے تک وہ اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہ دے۔

☆======☆======☆

گاؤں میں سلیم جس سے بھی ملا اس نے اچھو کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا جس دن سے وہ گاؤں چھوڑ کر گیا ہے اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

''ہمارا خیال تھا کہ شہر گیا ہے۔'' ماسی بیداں بولی۔'' اور وہاں گیا ہے تو تم سے تو ضرور ملے گا۔ یہاں بھی تینوں کسی سے ملے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ گھر ویسے ہی پڑا ہے بالکل تھوڑا سا سامان ساتھ لے کر گئے ہیں۔ انتظار کرو' ممکن ہے چند دنوں میں آ جائیں۔''

پورے گاؤں میں چٹ پٹی اور دلچسپ باتوں کے دو ہی مرکز تھے۔ ایک نائی کی دوکان اور ایک ماسی بیداں کا تنور۔ نسیم کی وفات کے بعد سے نائی کی دوکان کی سرگرمیاں کچھ ماند پڑ گئیں تھیں اور اب روزانہ اجتماع ماسی بیداں کے تنور پر ہی منعقد ہوا کرتا تھا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' نور محمد مزارع سالن میں ڈوبی انگلیاں چاٹتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔'' بڑے شاہ صاحب ذرا ناراض رہا کرتے تھے اچھو سے' پر جب سے اچھو حویلی میں ملازم ہوا تھا' تب سے سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔''

''ہوں۔'' سلیم پُرخیال انداز میں بولا۔'' گاؤں میں کوئی خاص بات ہوئی ان دنوں؟ مجھے تو شہر میں کچھ خبر ہی نہیں رہی گاؤں کی۔ ابا بھی سارے جہاں کو چٹھی لکھ کر دیتے ہیں' پر مجھے لکھنے کی باری آتی ہے تو نہیں تھکن یاد آ جاتی ہے۔ میرے پیچھے تو لگتا ہے خاصی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔''

''کوئی ایسی ویسی تبدیلیاں۔'' حیدر علی کے ملازم نواز دین نے کہا۔'' جس دن سے پرانے کنوئیں کی بلائیں جاگی ہیں گاؤں پر آفتیں نازل ہوتی جا رہی ہیں اور عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔''

''آپ کو ان کے جاگنے کی خبر کیسے ہوئی؟'' سلیم نے دلچسپی سے پوچھا۔'' اور کیسی عجیب

باتیں اور آفتیں آ رہی ہیں؟''

''لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ چیخ چیخ کر انہوں نے پورا گاؤں سر پر اٹھا لیا تھا' کوڑے چلنے کی آوازیں شائیں شائیں کرتی سنائی دے رہی تھیں۔ زمین ایسے ہلی تھی جیسے زلزلہ آ گیا ہو' توبہ توبہ۔'' نواز دین نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

'' اور پھر کنوئیں کے پاس ایسی پُراسرار خوشبو پھیلی ہوئی تھی کہ بندہ سونگھ کر مدہوش ہو جائے۔''

سلیم کا تعلیم یافتہ ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کر رہا تھا' لیکن اس نے اس لئے مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ انہی باتوں کے دوران اسے کسی کام کی بات کے انکشاف کی توقع تھی۔

''پھر؟'' اس نے پوچھا۔

''نہ پوچھو پھر کیا ہوا صبح صبح نسیم کی لاش وہیں کنوئیں کے قریب سے ملی۔''

''اچھا!'' سلیم نے حیرانی ظاہر کی حالانکہ اچھو پہلے ہی سے اس واقعے کی حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا۔

''تو اور کیا۔'' نواز دین کھانا چھوڑ کر مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

''یہ تو بہت پُراسرار بات ہے اس کے علاوہ بھی کچھ ہوا؟''

''یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا۔'' وہ سلیم کے قریب کھسک آیا اور دھیمی آواز سے بولا۔

''پھر ایک مرتبہ جنت بی بی تمام رات گھر سے غائب رہی صبح واپس آئی تو اس نے بڑے شاہ صاحب پر الزام لگا دیا۔ پیر صاحب نے تفتیش کی لیکن کچھ ثابت نہیں ہوا معاملہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن ابھی ایک اور آفت نازل ہونی باقی تھی۔ ایک صبح اچانک بلاوجہ چھوٹی بی بی فوت ہو گئیں۔''

''کیا؟'' سلیم کے اعصاب تن گئے۔

''لو تمہیں نہیں پتا؟ سب کہتے ہیں کہ رات تک ٹھیک تھیں پتا نہیں کیا ہوا انہیں اپنے بستر پر سوئیں تھیں لیکن جب صبح چھوٹے شاہ صاحب نے دیکھا تو فوت ہو چکی تھیں بس اللہ تعالیٰ کا کرنا ہوتا ہے۔ بندہ کیا دخل دے سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے جو کم عمر میں فوت ہو جائے وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے کیوں کہ اس کے گناہ کم ہوتے ہیں اور جہاں تک چھوٹی بی بی کا تعلق ہے وہ تو سیدھی جنت میں ہی جائیں گی اتنی نیک پاک تھیں۔''

''حویلی کی بیبیاں ہمیشہ کم عمری میں وفات پاتی ہیں آج تک کبھی کسی نے بھی لمبی عمر نہیں پائی۔'' نور محمد مزارع بھی اپنی معلومات سمیت گفتگو میں داخل ہوا۔

''اس کے علاوہ بھی کوئی عجیب بات ہوئی؟''

''کسی کو کہنا مت۔'' نواز دین مدھم آواز میں بولا۔

"نہیں، میں کسی سے نہیں کہوں گا، تم کہو۔" سلیم کے انداز میں بے تابی تھی۔

"حویلی کے اپنے حالات ٹھیک نہیں ہیں سب ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ بڑے شاہ صاحب اور چھوٹے شاہ صاحب تو ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے پیر صاحب نے سب کچھ بڑے شاہ صاحب کے سپرد کر دیا ہے اور خود صرف بہت اہم معاملات نمٹاتے ہیں۔"

"چھوٹی بی بی کس دن فوت ہوئی تھیں؟" سلیم نے دریافت کیا۔

"جس اتوار کی رات کو بارش ہوئی تھی ناں بس اس سے اگلی صبح کو۔"

سلیم کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ پچھلے اتوار کو اچھو زیب النسا کو لینے کے لئے گاؤں آیا تھا۔ پھر سلیم نے سب کو کریدا لیکن کوئی کام کی بات معلوم کرنے میں ناکام رہا

زیب النسا کی موت نے اس کا ایک خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔ اب تک وہ خود کو یہ تسلی دیتا رہا تھا کہ معاملہ بگڑنے کے خوف سے اچھو، زیب النسا کو سیدھا کراچی لے گیا ہوگا اور مہینے ڈیڑھ مہینے میں انہیں خیریت کی اطلاع بھجوا دے گا۔

لیکن زیب النسا کا انتقال ہو گیا تھا اور اچھو کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

☆======☆======☆

"پتا بھی نہیں چلا اور اتنے ڈھیر سارے دن گزر گئے۔" زیب النسا کے چالیسویں سے واپسی پر زرینہ نے برقع اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔"

"اس بات کو تو چھوڑو شکر کرو کہ حمیدہ پکڑی نہیں گئی۔" وہ خود کو پنکھا جھلنے لگی۔

"پیر صاحب کا خیال تھا کہ زیب النسا کسی مددگار کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اندر ہی اندر سب کو کھنگالا جا رہا تھا، اس طرح کہ کسی کو شک بھی نہ گزرے۔"

"ہاں شکر ہے کہ اس کی بچت ہو گئی۔" رضیہ لیٹ گئی۔

"آج بھی شاہ جی بہت اچھے لگ رہے تھے ہے نا؟" رضیہ نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"میرا خیال تھا کہ پتلون قمیض میں ہی اچھے لگتے ہیں لیکن وہ تو شلوار کرتے میں بھی سب سے الگ سب سے منفرد لگتے ہیں۔"

"دیکھنے میں تو بڑے شاہ صاحب بھی کم نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر کے ہیں۔" رضیہ نے تبصرہ کیا۔

"لیکن کرتوت تو کالے ہیں ناں ایسا بندہ تو مجھے سو دفعہ مرنے کے بعد زندہ ہونے پر بھی اچھا نہ لگے۔"

"ہونے والے جیٹھ کو ایسے کہہ رہی ہو۔" رضیہ ہنسی۔

"مجھے انہیں جیٹھ بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے یہ تو بہت بدقسمتی ہے شاہ جی کی کہ وہ ان کے بھائی ہیں وہ بھی بڑے۔ اگر شاہ جی بڑے ہوتے تو ہمیں اس قدر مسئلہ بھی نہ ہوتا۔ تب تو سارے مسئلے ہی حل ہو جاتے۔ سارے نہ ہوتے تو آدھے ضرور حل ہو جاتے۔"

"یہ تو دو بدقسمتیاں ہوئیں ناں۔" رضیہ ہنسی۔ "سنا ہے اچھو کا بھائی گاؤں آیا ہوا ہے۔"

"ہاں سنا تو میں نے بھی ہے کہ بھائی کے متعلق پوچھتا پھر رہا ہے۔"

"ہمیں اب تک صحیح طریقے سے پتا تو نہیں چلا، لیکن بات واضح ہے، اگر وہ زیب النسا کو قتل کر سکتے ہیں تو پھر انہوں نے اچھو کو کب بخشا ہوگا۔"

"ہاں۔" زرینہ نے اتفاق کیا۔ "لیکن ایک بات کی مجھے خوشی ہے کہ شاہ جی اس حرکت میں ملوث نہیں ہیں یہ سب کام بھی بڑے شاہ صاحب نے کیا ہے۔"

"یہ تو حمیدہ کہہ رہی ہے، ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔" رضیہ نے خیال ظاہر کیا۔

"جب وہ باقی بات غلط نہیں بتا رہی تو یہ کیوں جھوٹ بتانے لگی۔" زرینہ نے فوراً اختلاف کیا۔

"یہ بھی باقی باتوں کی طرح مہر النسا نے بتایا ہے اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ہم جب بھی حویلی میں کلام پاک پڑھنے کے لئے گئے ہیں تو تقریباً ہر مرتبہ ہی دونوں پر ہماری نظر پڑی ہے۔ شاہ جی کتنے افسردہ اور دکھی دکھائی دیتے تھے جبکہ بڑے شاہ صاحب کے چہرے سے کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اگر وہ خوش نہیں تھے تو دکھی بھی نہیں تھے۔

اور پھر ابا جی بتا رہے تھے کہ بظاہر دونوں بھائی ایک دوسرے سے ناراض نظر آتے ہیں اسی لئے تو بڑے شاہ صاحب مجھے زیادہ برے لگنے لگے ہیں کہ وہ شاہ جی سے لڑے تھے۔ ضروری نہیں کہ ہر بات ہماری آنکھ کے سامنے وقوع پذیر ہو تو ہمیں یقین آئے۔ کچھ باتیں حالات بھی بتا دیتے ہیں۔"

"لیکن یہ بات تمہارے لئے نقصان دہ ہے بڑے شاہ صاحب نے پیر صاحب سے تمہارے متعلق بات بھی کرنی تھی۔"

"ہاں۔" وہ بجھ سی گئی۔ "مجھ تک آتے آتے سب کچھ غلط ہو جاتا ہے۔"

☆======☆======☆

ماموں نے اور لوگوں کو بھی تسلی دی تھی لیکن حیدر علی کے ساتھ ان کا رویہ واضح طور پر زیادہ مشفقانہ تھا۔ اس وقت حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ انہیں کچھ کہہ سکتا۔ اس نے اپنے وجود کی ساری توانائی کے ساتھ خون کے ساتھ گردش کرتے غصے کو قابو کیا ہوا تھا۔ ماموں کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں اس پر اس نے توجہ تک نہیں دے تھی۔

ہاں چند دن بعد اسے علم ہوا تھا کہ اماں جان نے فوزیہ کو چالیسویں تک رکنے کے لئے کہا تھا جسے ماموں جان نے قبول کرلیا تھا۔ یہ خاصی حیران کن بات تھی لیکن ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کبھی بھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن چند دنوں میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ کون سی لڑکی فوزیہ تھی۔

پہلی مرتبہ جب وہ مہرالنسا کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پیڑھے پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھی حمیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ حیدرعلی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے کندھے سے سرکی اپنی اوڑھنی ٹھیک کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو ایک ٹک حیدرعلی کو دیکھے جا رہی تھی اور تب وہ پلٹ گیا تھا۔

پھر جب وہ اماں کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا تو فوزیہ ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے بڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ اماں کی ٹانگیں دباتے دباتے اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش اتر آئی تھی۔ تب بھی وہ واپس چلا آیا تھا۔

اور پھر بہت سے مواقع پر اسی طرح لمحوں کے لئے ان کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ فوزیہ بری لڑکی نہیں تھی لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ گوری بہت اچھی تھی اور اس کے دماغ پر اس بری طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے آگے حیدرعلی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اس لئے اس نے فوزیہ کو دیکھنے یا اس پر توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

پھر یہ حادثہ بھی ایسا تھا جس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گوری بھی حویلی آتی رہی ہوگی لیکن اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ حیدرعلی نے اسے بھی دیکھنے یا ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اپنے کمرے میں سگریٹ پیتے ہوئے حیدرعلی انہی گزشتہ دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس کا ملازم نوازدین ایک لفافہ اٹھائے چلا آیا۔

''یہ پیر صاحب نے بھجوایا ہے۔'' اس نے لفافہ آگے بڑھایا۔

حیدرعلی نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن کچھ اندازہ نہ ہوا کہ اس میں کس قسم کی تحریر ہوسکتی ہے۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' اس نے لفافہ چاک کر کے اندر سے طے شدہ کاغذ نکال لیا۔

وہ پیر صاحب کا خط تھا اس کے نام۔ اس نے نظریں تحریر پر جمادیں۔

''پیارے بیٹے حیدرعلی!

سدا خوش رہو!

یہ بات ہمیں بھی پسند نہیں ہے کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے خطوط کے ذریعے گفتگو کی جائے لیکن بدقسمتی سے حالات ایسے ہیں کہ بات کرتے ہوئے ہم دونوں صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں گے اور

یوں بدمزگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا اس سے شاید آپ کا تو کچھ نہ بگڑے لیکن ہماری نظر میں ہمارے منصب کی اور خود ہماری وقعت ختم ہوجائے گی۔

آپ کے علم میں ہے کہ ہم نے شادی کی تاریخ طے کر دی تھی اور آپ کے ماموں جان نے اپنی صاحب زادی کی رخصتی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ بدقسمتی سے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ جس دھوم دھام سے آپ کی شادی کرنا چاہتے تھے فوری طور پر وہ ممکن نہیں رہا لیکن چونکہ زبان سے پھر جانا ہماری روایت کے خلاف اور منصب کے شایانِ شان نہیں ہے اس لئے آپ کی شادی پہلے سے طے شدہ تاریخ پر سادگی سے انجام پائے گی۔ اس تقریب سعید میں تقریباً ایک ہفتہ ابھی باقی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اپنے وعدے اور اپنے الفاظ کا پاس رکھنے کی خاطر ہم اپنی جان سے بھی گزر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی ہمارے وعدے کو حکم سمجھتے ہوئے اس پر عمل کر کے ہمارا مان بڑھائیں گے۔

بہت دعاؤں کے ساتھ

آپ کے والد گرامی

پیر سیّد جلال الدین شاہ

خط کی تحریر پڑھ کر علی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''اوہ خدایا!'' وہ کراہا۔

کچھ دیر تک خود سے الجھنے کے بعد اس نے گوری سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆======☆======☆

اب تک یہ بات ثابت تو نہیں ہوئی تھی لیکن سلیم کا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اچھو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ چار دن سے وہ مسلسل اچھو کو کھوج رہا تھا لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ زیب النسا کی موت میں بھی اسے حویلی والوں کا ہاتھ نظر آ رہا تھا اور اگر ایسا ہی تھا تو اچھو کی زندگی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

لیکن حویلی والوں سے براہِ راست ٹکر لینے کی اس میں ہمت نہیں تھی پھر کیا کیا جائے؟ یہ سوچ اسے مسلسل پریشان کر رہی تھی۔

اس کا معمول تھا کہ دن چڑھے تک سویا کرتا تھا اور پھر مختلف لوگوں سے مل کر ان کی باتوں سے اچھو کے متعلق معلومات اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور رات کو ڈیرے کے قریب سن گن لینے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اب تک اسے کوئی کامیابی نہیں ملی تھی۔

☆======☆======☆

یہی احوال درد کا کہیو
گر صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات ملئے گا!
دن بہت انتظار میں گزرے

زرینہ کے ہاتھ میں دبے کاغذ پر صرف یہ دوشعر تحریر تھے اور انہیں پڑھ کر اس کی بے قراری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

حمیدہ اسے کاغذ تھما کے جا چکی تھی۔ اس مرتبہ وہ بھی سخت خوف زدہ تھی لیکن چھوٹے شاہ صاحب سے انکار کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی سو چپ چاپ خط پکڑا گئی تھی۔

''لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟'' رضیہ نے تجسس آمیز لہجے سے پوچھا۔

''وہ ملنا چاہتے ہیں۔'' زرینہ نے مختصراً کہا۔

''تو کیا تم جاؤ گی؟''

''یہ پوچھنے والی بات ہے؟''

''دیکھو کسی مصیبت میں مت گرفتار ہو جانا۔ زیب النسا کی وفات کے بعد سے میں سخت ڈر گئی ہوں۔''

''پتا نہیں رضیہ! لیکن اب مجھے ڈر نہیں لگتا شاید لگتا ہو لیکن میرے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے اس سے بڑی کوئی آگ باہر نہیں ہو سکتی اس لئے محسوس نہیں ہوتا۔''

''آج کل تمہارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔'' رضیہ نے اسے دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''اماں ابا اپنے کمرے میں نہیں صحن میں سونے لگے ہیں اور ہمیں بھی وہیں سونا پڑتا ہے۔''

''میں بہانا کر کے کمرے میں پڑ رہوں گی۔''

''صحن سے کمرے کی کھڑکی صاف دکھائی دیتی ہے۔'' رضیہ اڑی ہوئی تھی۔

''جانا تو مجھے ہے چاہے کوئی بھی صورت اختیار کرنی پڑے۔'' وہ حتمی لہجہ میں بولی۔

رضیہ کی باتیں کچھ غلط نہیں تھیں۔ گھر کے کام کاج کے دوران بھی زرینہ سوچتی رہی کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

شام کو جب آسمان پر بدلیاں تیرنے لگیں تو وہ اماں کے پاس پہنچ گئی۔

''اماں! آج تو اندر سوئیں گے ناں؟'' اس نے پر امید لہجے میں کہا۔

''اندر کیوں سوئیں گے اتنا ٹھنڈا میٹھا موسم ہو رہا ہے۔''

''رات کو بارش ہو جائے گی۔'' وہ جھلا اٹھی۔ ''آپ نے ضرور ہماری دوڑ لگوانی ہے۔''

''تم نہ لگانا دوڑ۔'' اماں کو غصہ آ گیا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں تم بگڑتی جا رہی ہو۔ پہلے بھی سب کام رضیہ نے سنبھالے ہوئے ہیں یہ بھی کر لے گی۔''

''بس میں باہر نہیں سوؤں گی۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میری بلا سے تم بیداں کے تنور میں جا کے سوؤ۔'' وہ اندر چلی آئی۔

''اللہ کرے چار پائیاں لگانے سے پہلے اتنی بارش ہو کہ کوئی باہر سو ہی نہ سکے۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔

''پھر تو تم ضرور شاہ صاحب سے مل سکو گی۔'' رضیہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''چاہے آندھی آئے چاہے طوفان یا سیلاب' مجھے تو جانا ہے۔'' وہ تنک کر بولی

''ارے بابا! بے شک چلی جاؤ تمہیں کون روک رہا ہے اور اگر روکے تو تم کون سا رکنے والی ہو۔''

لیکن زرینہ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ موسم خوشگوار ہو گیا تھا لیکن تیز بارش تو کیا بوندا باندی تک نہیں ہوئی تھی۔ مغرب کے بعد جب وہ کھانا کھا چکے تھے رضیہ چار پائیاں بچھانے صحن میں چلی گئی۔

''میری چار پائی بچھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

''جو حکم سرکار۔'' رضیہ نے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' زرینہ چڑ گئی۔

''تم سے کس نے کہا ہے کہ میں تمہاری کسی بات سے ہنسی ہوں۔'' اس نے بھی جوابی حملہ کیا۔

''ہونہہ!'' زرینہ نے منہ پھیر لیا۔

''اس کا خیال تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد اماں ابا حسب معمول جلد ہی سو جائیں گے لیکن وہ سونے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''میں کہتی ہوں مولوی صاحب کچھ بچیوں کی فکر کریں۔'' اماں نے کہا تو برآمدے میں تخت پر بیٹھی زرینہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''میں نے کیا کرنا ہے اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ بھی تو کوئی سبب بناتا ہے ناں خود تو نیچے نہیں اترے گا۔'' اماں بولی۔

''بات کرنے سے پہلے سوچ تو لیا کرو کہ کیا کہہ رہی ہو۔'' مولوی صاحب کو ان کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ ''تمہیں اللہ پر بھروسہ نہیں مگر مجھے بہت ہے۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ مجھے بھروسہ نہیں ہے میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ پیر صاحب سے بات کریں انہوں نے کہا تھا کہ بڑے شاہ صاحب کی شادی کے بعد رشتہ طے کر دیں گے اب یہ دن آ گیا ہے کہ چھوٹے صاحب کی شادی تیار ہے لیکن اور کسی کا بھی رشتہ طے نہیں ہوا۔''

''ہر کام کے لئے اوپر والے نے وقت مقرر کر رکھا ہے اور اس کے لئے سبب بھی وہ خود بناتا ہے۔''

''یہ آپ کے لئے بس اتنی چھوٹی سی بات ہے اور میری راتوں کی نیندیں اُڑ چکی ہیں۔ رضیہ کی تو مجھے اتنی فکر نہیں ہے لیکن زرینہ کو دیکھ کر میرا دل ہول جاتا ہے۔''

''کیوں؟'' مولوی صاحب نے بھی وہی سوال پوچھا جو زرینہ کے ذہن میں گردش کرنے لگا تھا۔

''رضیہ کا رشتہ تو تقریباً طے سمجھیں زرینہ کی تو اب تک کہیں بات بھی نہیں چلی وہ صفدر تھا تو وہ بھی نکما نکلا۔'' اماں بولی۔

''رشتے اتنے زیادہ موجود ہیں لیکن لوگ بھیجتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ کچھ اس لئے کہ ہمارا گھرانا بہت معزز اور اونچا ہے اور کچھ اس لئے کہ زرینہ بے حد خوبصورت ہے۔''

''اور صحیح پوچھیں تو مولوی صاحب مجھے اس کی خوبصورتی سے بھی خوف آتا ہے۔ نسیم اور جنت اس سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تھیں کون نہیں جانتا کہ بڑے شاہ صاحب گاؤں میں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔''

''اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔'' انہوں نے گویا اپنی طرف سے بات ختم کردی۔

''مولوی صاحب اس سے پہلے میں نے آپ سے کبھی بحث نہیں کی۔'' اماں بولیں۔ ''لیکن یہ ایسی بات ہے جس پر میں چپ نہیں رہ سکتی۔''

''تم کیا چاہتی ہو کہ میں رات کے اس پہر جا کر پیر صاحب سے بات کروں؟''

''ناراض کیوں ہوتے ہیں' یہ میں نے کب کہا ہے میں تو فقط یہ چاہتی ہوں کہ ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں یا زرینہ کی شادی گاؤں سے کہیں باہر کی جائے۔''

''زرینہ کی شادی کہاں ہوگی اس کا فیصلہ ہم نے نہیں اوپر والے نے کرنا ہے۔ جہاں تک ہمارے کہیں جانے کی بات ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اتنی آسانی سے میدان چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔ جب سب لوگ ڈر اور خوف کی وجہ سے چلے جائیں گے تو ظلم کے پودے کو تناور درخت بننے سے کون روکے گا؟''

''تو کیا یہ کام آپ کریں گے؟'' اماں ہول اٹھیں۔ ''ایک مرتبہ کر کے دیکھ لیا بہت کافی ہے۔ بس اب اپنے کام سے کام رکھیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے دوسروں کے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کی۔ آپ اکیلے رہ جائیں گے اور کوئی نہیں ہوگا آپ کے ساتھ۔''

''اللہ مالک ہے۔'' وہ بولے۔ ''لوگ اپنے دماغ سے سوچتے ہیں' میں اپنے ذہن سے۔''

''آ بیل مجھے مار' اسی کو کہتے ہیں۔'' اماں نے جل کر کہا اور لیٹ گئیں۔

''پرانے دنوں کی حکایتوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا تبدیل ہو چکی

ہے وقت بدل گیا ہے۔ لوگ اور ان کے مزاج بدل گئے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ان کے آواز اٹھانے سے سب کچھ بدل جائے گا حالانکہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔ سب کچھ ویسا ہی رہے گا۔''

مولوی صاحب بھی لیٹ گئے۔ اماں کی باتیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں' لیکن انہوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔

زرینہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے سب کے سونے کا انتظار تھا تھوڑی ہی دیر میں مولوی صاحب خراٹے لینے لگے۔ اماں کے نیند کے انداز سے بھی ان کی گہری نیند کا پتا چل رہا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر تکیے کے نیچے رکھی سیاہ چادر نکال کر اوڑھ لی۔

''زرینہ!''

اپنے پیچھے رضیہ کی مدھم آواز سن کر وہ پلٹی۔

''آج مت جاؤ میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج تمہارا جانا اچھا نہیں ہے۔''

''وہ بات مت کہو رضیہ' جو میں نہ مانوں۔''

''خدا کے لئے زرینہ آج رک جاؤ۔'' رضیہ نے اسے بازو سے پکڑ کر منت بھرے انداز میں کہا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا' آج سے پہلے کبھی کچھ ہوا ہے جو آج ہوگا۔'' زرینہ کے انداز میں لاپروائی تھی۔

''اور آج تو میں نے سیاہ کپڑے پہن رکھے ہیں' چاندنی بھی نہیں ہے۔ تاریک رات میں کسی کو میرا ہیولا بھی دکھائی نہیں دے گا۔''

''دیکھو بارش کا بھی امکان ہے بالکل بھیگ جاؤ گی۔''

''یہ دلیلیں مجھے نہیں روک سکتیں خدا حافظ۔'' وہ کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

رات بے حد تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم بہت خوش گوار ہو رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں گم وہ چلتی گئی۔

کنوئیں پر حسب معمول حیدر علی اس کا منتظر تھا۔ اتنے دن بعد اسے یوں اپنا انتظار کرتے پا کر زرینہ کا دل بھر آیا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھا۔

''آج بہت دیر کردی' میں پریشان ہو رہا تھا۔''

''اماں' ابا دیر سے سوئے تھے۔'' وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے پھر وہ بولی۔ ''بہت افسوس ہوا چھوٹی بی بی کا۔ میں تقریباً روزانہ ہی حویلی آیا کرتی تھی' آپ کو بہت مرتبہ دیکھا بھی تھا۔''

''ہوں۔'' اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دوران

بہت کم مجھے تمہارا خیال آیا تھا۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔''

''وہ تو دکھائی دے رہا تھا' لیکن حیرت ہے کہ بڑے شاہ صاحب آپ کی طرح دکھی نہیں لگ رہے تھے۔''

''گویا تم نے محسوس کر لیا۔''

''شاہ جی! آپ کی حویلی اتنی بڑی ہے کہ مجھے اس سے خوف آنے لگتا ہے۔ یہ عمر بلا وجہ وفات پانے کی تو نہیں ہوتی۔''

حیدر علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے اس حوالے سے بہت کچھ سنا اور محسوس کیا ہے۔''

''کیا سنا اور کیا محسوس کیا؟''

''پتا نہیں مجھے آپ سے کہنا چاہیے یا نہیں' لیکن مجھے بہت سی باتوں کا علم ہے اور کچھ باتوں کا انسان اندازہ بھی لگا سکتا ہے۔''

''مثلاً؟ تم جھجکے بغیر کہہ دو۔''

''آپ کو میں نے نہیں بتایا تھا' لیکن میں چھوٹی بی بی سے ملی تھی۔ مجھے آپ کی حویلی ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی' عالی شان مضبوط اور سب سے بلند' لیکن اس دن آپ کی حویلی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا' مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ کوئی گھر نہیں بلکہ حویلی کی بیبیوں کے لئے بہت بڑا قید خانہ ہے اور پھر اب وہ سب کچھ سچ ہو گیا۔

چھوٹی بی بی نے کہا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہیں کیوں کہ اتنی مضبوط اور بلند دیواروں کے ہوتے ہوئے ان کی آہیں' ان کی سسکیاں اور کراہیں یہاں تک کہ ان کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کا خیال دل سے نکال دوں پر یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ سو میں نے آپ سے کسی بات کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ یوں بھی میرا خیال تھا کہ آپ میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے بلکہ شاید ناراض ہی ہو جائیں۔'' اس نے حیدر علی کی طرف دیکھا۔

''پھر ایک دن اچھو بھائی ابا سے ملے۔ ان کی گفتگو کے بعد معمہ حل کرنا مشکل نہیں رہا۔''

''تم واقعی ذہین ہو گوری' لیکن ان باتوں کا ذکر کبھی کسی اور کے سامنے مت کرنا۔''

اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں تو آپ سے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی شاہ جی' لیکن میرے دل میں ایک پھانس سی اٹکی ہوئی تھی۔''

''کیا؟''

''کیا اس رات حویلی میں چھوٹی بی بی کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس میں آپ بھی شامل تھے؟''

''یہاں تمہارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اگر مجھے ایک فیصد بھی گمان ہوتا تو میں اپنی جان دے کر بھی اپنی بہن کو بچا لیتا' لیکن مجھ سے بھی اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔''

زرینہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اسے حیدر علی کی بے گناہی کا یقین تھا پھر بھی صرف تسلی کے لئے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

''پتا نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سگریٹ زمین پر پھینکا اور جوتے سے مسل دیا۔

''خیر ان باتوں کو چھوڑو' آج میں نے تمہیں اپنا فیصلہ سنانے کے لئے بلایا ہے۔''

زرینہ کے لئے جیسے زمین کی گردش تھم گئی۔ وقت رک گیا۔ وہ سانس روکے حیدر علی کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''مجھے صرف اور صرف تمہارے ساتھ رہنا ہے گوری' چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

''کیا کہا ہے آپ نے؟'' وہ جیسے سرگوشی میں بولی۔

''جو تم نے سنا ہے ٹھیک سنا ہے۔''

''شاہ جی!'' خوشی اور مسرت کی وجہ سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''مجھے یقین تھا پھر بھی میں خوف زدہ تھی۔ اوہ خدایا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنی بڑی خوشی ملنے کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے۔'' وہ ہنسنے لگی اور ہنستی چلی گئی۔

ہوا کے دوش پر اس کی کھنکتی ہوئی مترنم ہنسی پھیل رہی تھی۔

اچانک بوندا باندی شروع ہو گئی' لیکن اسے بھیگ جانے کی بھی پروا نہیں تھی۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے گوری۔''

''کیا؟'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ابا جان کو راضی کر لوں۔'' وہ بولا۔ ''اب تک میری یہ کوشش تھی کہ میری خوشی میں سب شریک ہوں' ورنہ یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے بھی کر سکتا تھا' لیکن میری خواہش تھی کہ اماں اور ابا جان تمہیں بہو تسلیم کر لیں اور تمہیں تمہارا جائز مقام ملے' لیکن یہ محض میری خوش خیالی تھی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میری بیوی تو بن سکتی ہو لیکن وہ تمہیں بہو کا درجہ نہیں دیں گے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ ہمیں ان کی مرضی کے بغیر یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بجھ گئی۔ ''اماں' ابا تو کبھی راضی نہیں ہوں گے۔''

''تم صرف چند پہلوؤں پر سوچ رہی ہو جبکہ میرا ذہن مختلف باتوں کے متعلق سوچ رہا

ہے۔ بابا جان اپنی حکم عدولی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔ بات اگر صرف حکم کی ہوتو بھی شاید وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کر لیں' لیکن یہاں یہ بات وعدے کی ہے جو انہوں نے ماموں جان سے کیا ہوا ہے۔ زبان دے کر پھر جانا ہمارے خاندان کی روایت نہیں ہے' اس سے ہمارے اور ماموں جان کے گھرانے کے درمیان نہ مٹنے والی دشمنی کا آغاز تو ہو ہی جائے گا' خود بابا جان بھی ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے اور اس معاملے میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔"

"تو اب کیا کریں؟"

"میں اپنی خاندانی روایتوں سے ٹکرا لے کر انہیں تبدیل کرنا چاہتا تھا' لیکن' یہ بہت صبر آزما کام ہے اور اس میں جتنا وقت لگے گا وہ ہم دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہے' اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم یہاں سے بہت دور جا کر ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھیں گے' جس کی روایتیں کسی کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنیں گی اور اس مضبوط گھرانے کے ساتھ میں واپس آؤں گا۔ ان روایت سے ٹکرانے اور انہیں ختم کرنے کے لئے۔"

"لیکن جب اماں' ابا نہیں مانیں گے تو ہماری شادی کیسے ہوگی؟ اگر تو آپ لوگوں کی طرف سے پیغام آتا یا پیر صاحب حکم ہی دے دیتے تو ابا جی نے دوسری بات سوچے بغیر ہماری شادی کر دینی تھی لیکن اب جبکہ آپ کی شادی میں بمشکل ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ وہ اس بات کو ہرگز نہیں مانیں گے۔"

"نہ مانیں' میرے والدین بھی تو نہیں مانے پھر بھی میں نے فیصلہ تمہارے حق میں کیا ہے۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ اسے سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کی بات اور ہے' مرد کی بات ہمیشہ اور ہوتی ہے' لیکن عورت ایسا کیسے کر سکتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ عورت کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں' تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تم بتاؤ کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گی یا نہیں؟"

"شاہ جی میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ تذبذب کے عالم میں بولی۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے گوری۔"

"ایسے تو نہ کہیں شاہ جی!" وہ روہانسی ہوگئی۔ "آپ نے فیصلہ کرنے میں اتنے دن لگا دیئے اور مجھے سوچنے کے لئے چند منٹ بھی نہیں مل سکتے؟"

حیدر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ "آئی ایم سوری لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔"

"مجھے فیصلہ کرنا ہے' میرے قدم تو کسی اور رستے پر اٹھ ہی نہیں سکتے' پھر بھی مجھے کچھ وقت تو دے دیں' میں تو آپ کے ساتھ نئی دنیا بسانے چلی جاؤں گی لیکن رضیہ کا کیا ہوگا اور پھر کیا آپ

کے گھر والے میرے گھر والوں کو معاف کر دیں گے یا آپ کے ماموں کا گھرانہ میرے گھر والوں کو بخش دے گا؟

میں تو صرف اتنی مہلت مانگ رہی ہوں' جتنے میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ اپنی خوشیوں کی ہمیں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی اور کیا میرے لئے وہ قیمت ادا کرنا ممکن بھی ہوگا یا نہیں۔"

حیدر علی اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

"آپ کے گھر والے طاقت ور ہیں اور آپ کے ماموں بھی' ان دونوں کے درمیان میرے گھر والوں کا کیا انجام ہوگا۔"

"آل رائٹ! تم سوچ لو' لیکن مجھے کل رات تک جواب چاہیے۔" حیدر علی نے کہا۔

"تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور ایسی صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"اس کے علاوہ میری کوئی مدد نہیں کریں گے آپ؟"

"تم کیسی مدد چاہتی ہو؟"

"کچھ تو۔" اس کے لئے اپنی بات سمجھانا مشکل ہو رہی تھی۔ "اماں' ابا اور رضیہ کو کوئی تحفظ۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا' کیوں کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ بولا۔

"اصل میں' میں اپنے ساتھ صرف اپنی ڈگریاں اور ضرورت کے چند سو روپے لے کر جانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اپنی خوشیوں کی خاطر میں کس حد تک خودغرض ہو سکتی ہوں۔"

"بارش تیز ہو گئی ہے۔" حیدر علی اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی' لیکن اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

"ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔" وہ چلتے چلتے بولا۔

"کیا؟"

"تمہارے گھر والوں کو تحفظ دینے کا یہ واحد طریقہ ہے کہ کل صبح تمہارے گھر آ کر میں براہِ راست تمہارے ابا سے بات کروں۔"

"نہیں خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔" وہ رک گئی۔

"جلدی کرو ورنہ بارش میں بالکل ہی بھیگ جاؤ گی۔" وہ بولا۔

"اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ انہیں کسی اور شہر میں سیٹل کروا دوں۔ اس طرح تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میرے اکاؤنٹ میں خاصے پیسے ہیں اور میرا خیال ہے کہ انہیں استعمال کر لینے سے کوئی ایسا فرق بھی نہیں پڑے گا۔"

آپ کو نہیں پتا ابا جی نہیں مانیں گے' پتا نہیں ان کا ردِعمل کیا ہوگا۔''

''انہیں محفوظ رکھنے کا یہ واحد طریقہ ہے کہ انہیں کسی دوسرے شہر منتقل کر دیا جائے اور اس کے لئے ان سے بات کرنا ضروری ہے۔ میں گفتگو ایسے طریقے سے کروں گا کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی۔''

''آپ کو اندازہ نہیں ہے ابا جی آپ کو ٹال کر یہ اطلاع حویلی بھجوا دیں گے۔''

بحث کرتے اور بارش میں بھیگتے وہ دونوں مسجد کے قریب آ چکے تھے۔

اردگرد دور تک پھیلے گھپ اندھیرے کے درمیان اس کے کمرے میں پھیلی زرد روشنی بہت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ زرینہ چلتے چلتے رک گئی۔

تم کمرے میں روشنی کر کے آئی تھیں؟'' حیدر علی نے دریافت کیا۔

''نہیں تو۔'' اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ہاتھوں میں جیسے سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

''اوہ خدایا!'' اس نے آنکھیں موند لیں۔

حیدر علی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور چند قدم آگے بڑھ آیا۔

کھڑکی سے اندر کمرے میں تین لوگ واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مولوی صاحب جو شدید غصے کے عالم میں لگ رہے تھے' اماں جن کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور مسلسل روتی ہوئی رضیہ' ان میں سے کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' لیکن انداز یہ بتا دینے کے لئے کافی تھا کہ اندر کی صورتِ حال بے حد سنگین تھی۔

''آج ہمیں باتوں میں دیر ضرور ہوئی ہے' لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ مولوی صاحب تہجد کے لئے اٹھ جائیں۔'' وہ بولا۔

''غلطی میری ہے مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ اماں' ابا اور رضیہ تینوں صحن میں سو رہے تھے۔ بارش ہوئی تو اٹھ گئے ہوں گے اور تب ہی مجھے نہ پا کر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

حیدر علی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا

''تم فکر مت کرو میرے ساتھ چلو' جو بات صبح کرنی تھی وہ میں ابھی کر لیتا ہوں۔''

''خدا کے لئے شاہ جی یہ غضب مت کرنا۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''اب میں کس صورت ابا جی کے سامنے نہیں جا سکتی۔ ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی اور وہ بھی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے' وہ بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے لیکن اصولوں کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا آؤ میرے ساتھ۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھ میں ہمت نہیں ہے ان کا سامنا کرنے

کی میں ان کی نظروں سے گر چکی ہوں۔''

''میں جو ہوں تمہارے ساتھ گوری۔''

''اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا' میری شرمندگی تو کم نہیں ہوگی' الٹا انہیں میری دیدہ دلیری پر زیادہ غصہ آئے گا۔ ابا جی پیر صاحب جتنے طاقت ور نہ سہی لیکن اتنی ہمت ہے ان میں کہ اپنی اجازت کے بغیر رات کے اس پہر اور اس غرض سے نکلنے والی بیٹی کے ساتھ وہی سلوک کریں جو آپ کی بہن کے ساتھ آپ کے بابا جان نے کیا تھا۔''

''میرے بابا جان کے علاوہ کوئی بھی باپ اس قدر سنگدل نہیں ہو سکتا۔''

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے' اگر ابا جی نے آپ کے سامنے کچھ نہ کہا تو وہ حویلی میں ضرور اطلاع بھجوائیں گے اور پھر صورت حال کیا ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔'' وہ بولی۔ ''آپ اس وقت چلے جائیں' جو ہوگا میں خود بھگت لوں گی۔''

''پاگل ہوئی ہو۔'' وہ بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ ایسے حالات میں' میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں گا۔''

''میں جانتی تھی کہ کسی روز ایسا بھی ہو سکتا ہے' لیکن میں نے نتیجے کی پروا کبھی نہیں کی تھی۔ میری آنکھیں بند نہیں تھیں' مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں اس لئے اب جو کچھ بھی ہوگا' میں سہہ لوں گی آپ جائیں۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو' جو کچھ بھگتنا ہوگا ہم اکٹھے بھگتیں گے۔''

''لیکن میں آپ کے ساتھ گھر نہیں جاؤں گی۔'' اس کے انداز میں ضد تھی۔

حیدر علی نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی کرنا ہو اسے جلدی کرنا ہوگا' ورنہ معاملہ مزید الجھ سکتا ہے۔ جبکہ زرینہ کسی دلیل سے قائل ہونے پر تیار نہیں تھی۔ اس نے اچانک فیصلہ کیا

چلو گوری میرے ساتھ ہم ابھی شادی کریں گے۔''

''کیا؟''

''ہاں' ہم ابھی شادی کریں گے اور یہاں تمہاری کوئی ضد نہیں چلے گی۔ میں تمہیں نہ موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہوں اور نہ اپنے سے دور کر سکتا ہوں۔ مذہبی اور قانونی طور پر تمہیں اپنا لینے کے بعد کوئی بھی شخص تم پر حق نہیں جما سکے گا اور میرے پاس اسٹینڈ لینے کی ٹھوس بنیاد ہوگی' اپنی بیوی کو کوئی بھی کسی دباؤ کے تحت نہیں چھوڑتا۔''

''شاہ جی میری بات تو سنیں۔'' اس نے کہنا چاہا۔

''میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں' چلو میرے ساتھ۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لے چلا۔

''آپ کو پتا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔''

''مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں سب سے لڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔ میں جو

اتنے عرصے خاموش تھا تو اس کی وجہ میری کوئی کمزوری یا بزدلی نہیں تھی۔ میں صرف خاندان میں دراڑ نہیں ڈالنا چاہتا تھا' لیکن اب یہ دراڑ ڈالی جا چکی ہے اور خود بابا جان اور بڑے بھائی جان نے ڈالی ہے' اب ہم کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے یوں بھی مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں کشمکش سے نکال کر محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ فیصلہ آپ عجلت میں کر رہے ہیں۔'' اس نے احتجاج جاری رکھا۔

''میں یہ فیصلہ تو کر چکا تھا' صرف وقت طے کرنا باقی تھا سو وہ قدرت نے خود ہی طے کر دیا۔''

زرینہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت وہ حیدر علی کو اس فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی' جو وہ کر چکا تھا اور پھر اس صورتِ حال کا کوئی حل خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس لئے تن بہ تقدیر ہو کر اس کے ساتھ چلی گئی۔

جب وہ ڈیرے پر پہنچے تو دونوں بری طرح بھیگ چکے تھے۔ زرینہ کو کچھ فاصلے پر چھوڑ کر اس نے ڈیرے میں موجود تین ملازمین کو سوتے سے جگا کر ان کے گھر روانہ کر دیا اور ان کے جانے کے بعد زرینہ کو اندر لے آیا۔

''یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔'' وہ بولا۔ ''چادر اتار کر نچوڑ لو' آرام کرنا چاہو تو وہ کمرا ہے' یہاں تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' وہ اس کے قریب آ گئی۔ ''میں اکیلے نہیں رہوں گی۔''

''تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ذرا سی ہمت اور بہادری کا ثبوت دینا ہو گا تمہیں' مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔''

''کیسے کام کرنے ہیں؟''

''ایک تو یہ کہ اس وقت میری جیب میں بمشکل ہی پانچ سو روپے ہیں' جو شاید بھیگ کر ردی کاغذ کے ٹکڑے بن چکے ہوں۔ میری ڈگری حویلی میں پڑی ہے مجھے اور تمہیں کپڑوں کی بھی ضرورت ہے اور ان سب سے بھی بڑھ کر ایک نکاح خواں کی ضرورت ہے۔''

''لیکن نکاح تو ابا جی پڑھاتے ہیں۔''

''یہ تمہارا در دِ سر نہیں ہے۔''

''مجھے یہاں نکاح نہیں کرنا' ہم شہر جا کر نکاح کر لیں گے' اگر آپ کا فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا تو اس میں کم از کم اتنی ترمیم کر لیں کہ جلد سے جلد واپس آ کر شہر چلنے کی تیاری کریں' نکاح وہاں ہو جائے گا۔''

''جو کام میرے ہیں وہ مجھ پر چھوڑ دو' میں بحث میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' نکاح خواں ساتھ والے گاؤں سے بھی مل سکتا ہے' لیکن یہ ضروری ہے کہ نکاح آج ہی

اور یہیں پر ہو' ورنہ بعد میں ہم بہت سی قانونی الجھنوں میں پھنس سکتے ہیں۔ جس رات تمہارے اماں ابا نے یہ دیکھا ہے کہ تم گھر میں موجود نہیں ہو اسی رات نکاح ہونا ضروری ہے۔''

بات زرینہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''پھر آپ کتنی دیر میں آئیں گے؟'' وہ پریشان تھی۔

''جس قدر جلد ممکن ہو سکا شاید میں حویلی سے کار بھی لے جاؤں تا کہ نکاح خواں کو جلدی لایا جا سکے۔ تم اتنی دیر آرام کرو۔'' وہ باہر نکل گیا۔

زرینہ چند لمحے اس دروازے کی طرف دیکھتی رہی جس سے نکل کر ابھی حیدر علی گیا تھا۔ ایک دم تنہائی نے اسے آ دبوچا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ حیدر علی سے بہت دور ہو گئی ہو۔ بوجھل قدموں سے وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جس میں آرام کرنے کا حیدر علی نے کہا تھا۔

☆======☆======☆

سلیم کافی دن سے ڈیرے کے پاس سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب تک کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی تھی۔ اس دن جب بوندا باندی شروع ہوئی تو اس نے گھر جانے کا ارادہ کر لیا لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

''شاید آج ہی کے دن کوئی خاص بات ہو جائے اور میں محض اپنی آرام طلبی کے باعث بعد میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔''

یہی سوچ کر وہ برستی بارش میں بھی ڈیرے کے قریب ہی موجود تھا۔ بارش کی وجہ سے نیند تو آنکھوں سے دور تھی لیکن بوریت نے اسے گھیر رکھا تھا۔ پھر اچانک اس کی تمام حسیں بیدار ہو گئیں۔

دور سے ایک لڑکا اور لڑکی ڈیرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ رجب علی اور حیدر علی کو پہچانتا تو نہیں تھا لیکن آنے والے کا لباس دیکھ کر اسے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی کہ وہ رجب علی یا حیدر علی میں سے ہی کوئی تھا۔ ساتھ ایک لڑکی کی موجودگی سے اس نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ وہ رجب علی ہی ہے۔ وہ بغور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا ملازمین کو سوتے سے جگا کر ڈیرے سے ہٹا دینے لڑکی کو اندر لے جانے اور حیدر علی کے باہر آنے کے تمام مناظر اس نے دیکھے تھے۔

''ہوں۔'' اس نے پُر خیال انداز میں ہنکارہ بھرا۔

☆======☆======☆

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ باقی کمروں کی طرح جنریٹر نے اس کمرے کو بھی روشن کر رکھا تھا اور اس روشن کمرے کو دیکھ کر اسے یوں محسوس

ہوا جیسے وہ پریوں کے دیس میں آ گئی ہو۔ کمرے تو اس نے حویلی میں بھی دیکھے تھے خوبصورت اور کشادہ لیکن وہ بھی اس قدر شاندار نہیں تھے۔ دبیز قالین' جھالروں والے پردے جدید ترین فرنیچر اور خوبصورت ڈبل بیڈ جس کی ریشمی گلابی چادر کے اوپر ریشمی دھاگے سے بنا سفید کروشیے کا خوبصورت بیڈ کور بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں رات کی رانی کے تازہ پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی وہ مسحور ہو کر آگے بڑھ آئی۔

''یہ سب کچھ کتنا حسین اور کتنا مختلف ہے۔'' اس نے سوچا۔ اس کے بالوں اور کپڑوں سے قطرہ قطرہ پانی قالین پر ٹپک رہا تھا لیکن وہ کمرا دیکھنے میں محو تھی کافی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ قالین ہلکا ہلکا نم ہو چکا ہے تو وہ چونک اٹھی اور کمرے سے متصل ڈریسنگ روم میں چلی آئی قد آدم آئینے نے اس کے قدم روک لئے اور وہ اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ سیاہ لباس میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی گوری رنگت اور شفاف جلد بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ آنکھوں کا کاجل پھیل رہا تھا اور لمبے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

''اوہو!'' اسے پھر بال سکھانے کا خیال آیا۔ تولئے کی تلاش میں اس نے الماری کھولی لیکن سامنے سجی ڈھیر ساری بوتلیں دیکھ کر بنا سوچے سمجھے بند کر دی دوسری الماری کھولنے کی کوشش کی لیکن اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ تیسرا دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ یہ باتھ روم تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ خوبصورت نیلگوں ٹائلز والے لمبے چوڑے باتھ روم میں بھی ایئر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ہر چیز آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔

ایک دم سے اسے احساسِ کمتری نے آن گھیرا۔

''یہ اتنی ساری چیزیں جو اس کمرے اور غسل خانے میں ہیں مجھے تو ان میں سے اکثر چیزوں کو استعمال کرنا بھی نہیں آتا۔'' اس نے سوچا۔ ''شاہ جی نے مجھ جیسی دیہاتی اور گنوار لڑکی میں کیا دیکھا کہ میری خاطر سب رشتے توڑنے پر آمادہ ہو گئے؟ یہاں تو ہر چیز غیر ملکی ہے وہاں ولائیت کی لڑکیوں کو ان سب چیزوں کا علم ہوگا پھر شاہ جی ان سب لڑکیوں کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے مجھ میں کیا ہے؟'' اس نے مایوسی سے سوچا۔

اس کے ذہن میں اچانک بہت پرانے دنوں کے نقوش تازہ ہو گئے۔

''ولائیت میں بہت خوبصورت لڑکیاں ہیں مجھ سے زیادہ گوری' سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں پھر آپ کی نگاہِ انتخاب مجھ پر کیسے ٹھہری؟'' اس نے پوچھا تھا۔

اور جواب میں حیدر علی چند لمحے اسے تکتا رہا تھا پھر بولا۔ ''شاعر کہتا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے وہاں واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ان میں سے کسی سے ملتے ہوئے میرے دل سے یہ صدا نہیں آئی کہ وہ لڑکی میری ہے۔

تمہیں دیکھا تو میرے دل نے صدا دی کہ میں تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا' لندن کے کلبوں میں' سڑکوں پر' لائبریری میں کتابوں کے ریک کے پیچھے' خاموش ندیوں کے ویران اور بے آباد کناروں پر' کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے یہاں ملوگی۔''

زرینہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ باتھ روم میں داخل ہو گئی۔

ٹاول اسٹینڈ پر صاف ستھرا نیلا تولیا لٹکا ہوا تھا۔ وہ تولیا اٹھا کر بال سکھانے لگی۔

☆======☆======☆

زیب النسا کی وفات کے بعد سے رجب علی پرسکون نہیں تھا۔ ایک خول اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا جو اس لئے ضروری تھا کہ وہ گدی کا وارث تھا اور اسے جذباتی اور اعصابی طور پر مضبوط نظر آنا چاہئے تھا۔ اسے اپنے کئے پر افسوس نہیں تھا اس حرکت پر افسوس تھا جو زیب النساء نے کی تھی اور مسلسل یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ایسی صورتِ حال آئندہ بھی پیش آسکتی ہے۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس واقعے کے بعد سے بھائیوں کے درمیان خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اسے اپنے دونوں بھائی بہت پیارے تھے۔ سخاوت کو تو وہ یوں بھی ہر اہم جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن حیدر علی اس سے بہت دور چلا گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ پرانی باتیں بھول کر علی اس کے گلے لگ جائے لیکن بظاہر یہ ہونا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا منصب اور انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ خود چھوٹے بھائی کے پاس چلا جائے۔ یوں بھی علی کے پاس جانے کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنے کئے پر کوئی افسوس ہے جبکہ ایسا نہیں تھا اور نہ ہی وہ اسے کوئی ایسا تاثر دینا چاہتا تھا۔

بس ایک موہوم سی امید تھی کہ گوری کے سلسلے میں علی کو اس کی مدد کی ضرورت تھی جب کہ شادی میں بھی بمشکل ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس موقع پر وہ اس سے مدد کی درخواست کرتا۔ ایسی صورت میں رجب علی کا خیال تھا کہ وہ بلا تامل علی کی مدد پر تیار ہو جائے گا اور جیسے بھی بن پڑا فوزیہ سے اس کی شادی رکوانے کی کوشش کرے گا۔

''اور یہ کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوگا۔'' یہ موضوع ذہن میں آتے ہی وہ سوچتا۔ ''اگر اپنی سگی بہن کو ختم کیا جا سکتا ہے تو یہ سلوک کسی اور کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ حویلی اور رشتے قائم رکھنے کے لئے میں ہر انتہا پر جا سکتا ہوں بس میرا بھائی میرے پاس واپس آ جائے۔

فوزیہ کی اہمیت ہی کیا ہے۔ وہ نہیں رہے گی تو بابا جان کے الفاظ کا پاس بھی رہ جائے گا اور علی بھی زبردستی کے اس بندھن سے آزاد ہو جائے گا۔''

سگار کے کش لیتے ہوئے وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا۔

''اگر انا آڑے نہ آئے تو میں اب بھی بغیر ایک لمحے کی تاخیر کے حیدر علی کو اپنے گلے لگا لوں۔ بھائی ہی تو بھائیوں کی اصل طاقت ہوتے ہیں۔ حویلی کی دیواروں میں یوں بھی تو رخنے پڑ

جائیں گے اور میں اسے کمزور ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ رجب علی نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ حیدر علی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کمرے کے باہر سے گزر رہا تھا۔ اس وقت حویلی ویران تھی۔ وہ علی کو آواز دیتا تو کوئی بھی اس کی شکست کا یہ منظر دیکھنے کے لئے موجود نہ ہوتا' لیکن علی کی نظروں میں تو اس کی سبکی ہو جاتی ناں۔ سو اس نے آواز دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ فائیل اٹھائے انگلی پر گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرا۔

''علی!'' رجب علی نے بے اختیار آواز دی۔ حیدر علی رک گیا۔

''کہیے۔'' رجب علی کو شرمندگی نے آ گھیرا آخر شکست تو اسی کی ہوئی تھی لیکن ایسی بے اختیاری میں کہ وہ بے بس ہو گیا تھا۔

''مجھے جلدی ہے۔'' اسے خاموش دیکھ کر حیدر علی نے کہا۔

''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' اس نے شرمندگی سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے اپنے اوپر متانت طاری کر لی تھی۔

حیدر علی نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

''تمہیں شادی کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں اسے بہ آسانی رکوا دوں گا۔''

''پیش کش پُرکشش ضرور ہے لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' حیدر علی کے انداز میں بلا کی سرمہری اتر آئی۔

رجب علی دم بخود رہ گیا۔ اتنی بے اعتنائی اور سرد مہری کی اسے بالکل توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پیشکش اس کے اور علی کے درمیان روز بہ روز بڑھتی ہوئی خلیج پاٹ دے گی لیکن حاصل کیا ہوا تھا؟ اس کی انا بھی چور چور ہو گئی تھی۔ جھک جانے کی ذلت بھی اٹھانی پڑی تھی شکست بھی ہوئی تھی اور تعلقات کی خلیج کبھی نہ ختم ہونے کی حد تک جا پہنچی تھی۔

رجب علی دکھ غصے اور احساسِ توہین سے پاگل ہو رہا تھا اگر حیدر علی اس کا بھائی نہ ہوتا تو ایک سیکنڈ سے کم وقت میں وہ اسے شوٹ کر دیتا۔

اندر کا ابال بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے اعصاب پُرسکون نہ ہوئے تو وہ یقیناً حیدر علی کو معاف نہیں کر سکے گا۔ اسے اپنے اشتعال پر قابو پانے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اور ایک ہی صورت میں ممکن تھا صرف ایک اچھی ڈرنک ہی اسے سکون پہنچا سکتی تھی۔

کار کی چابی میز پر ہی رکھی ہوئی تھی وہ ڈیرے پر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا

☆======☆======☆

زیب النسا کی موت کے بعد سے اماں جان بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھیں کم گو تو وہ پہلے ہی تھیں لیکن اب تو بالکل ہی بجھ گئیں تھیں۔ کچھ تو بیٹوں کے درمیان سرد مہری دیکھ کر بھی دل کڑھتا تھا اور کچھ مستقبل کے اندیشے پریشان رکھتے تھے۔

اگر حیدر علی نے عین وقت پر فوزیہ سے شادی سے انکار کر دیا تو؟ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے اس گھر' اس کے مکینوں اور ان کے منہ سے نکلے الفاظ سے قطعاً دلچسپی نہیں رہی تھی اور کوئی عجب نہیں تھا کہ عین وقت پر وہ نکاح خواں کے سامنے انکار کر دے ایسی صورت میں جو قیامت آتی' اس میں سراسر نقصان ان کا اپنا تھا۔ ایک طرف اپنا بیٹا تھا اور دوسری طرف شوہر اور تیسری طرف اپنا سگا بھائی۔ ان کے لئے کسی ایک کا انتخاب کرنا یا کسی ایک کی سلامتی کی دعا مانگنا ممکن ہی نہیں تھا۔

ہر نماز کے بعد سورہ یٰسین پڑھ کر اپنے گھرانے کی سلامتی کے لئے دعا مانگا کرتی تھیں اس وقت انکار کا مطلب تھا ان کے بھائی اور اس کے گھرانے اور خصوصاً فوزیہ کی توہین جو ان کے بھائی کے گھرانے کے لئے برداشت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی دشمنی کی ابتدا ہوتی جو کسی ایک یا دونوں گھرانوں کے مردوں کے خون سے بھی ٹھنڈی نہیں پڑ سکتی تھی۔

ان کے بھائی کے خلاف ہتھیار نکالنا پیر صاحب کی مجبوری ہوتی لیکن بیٹے کے خلاف ہتھیار نکالتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ ہچکچاتے۔

اور ان میں یہ کشت و خون دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' پیر صاحب کتاب بند کر کے عینک اتارتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کچھ نہیں۔'' وہ عادتاً مدھم آواز میں بولیں۔ ''میری سوچ آپ سے اور اولاد سے متعلق ہوتی ہے اس کے علاوہ کیا سوچنا ہے۔''

''جب تک ہم موجود ہیں' تب تک آپ کو ان سوچوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہم جو ہیں حالات سلجھانے کے لیے۔''

اماں جان نے آہ بھری۔ ''جب کشتی بھنور میں پھنس جائے تو خوف تو دامن گیر ہو ہی جاتا ہے۔''

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' پیر صاحب نے کہا۔

ایک ملازمہ دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔

''سرکار! منشی فضل دین کا بیٹا سلیم آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

پیر صاحب چونک گئے اماں جان کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ اس وقت ہم کسی سے نہیں ملتے!''

''حضور! میں نے تو بہت کہا لیکن اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ ابھی اور اسی وقت آپ سے ملنا بے حد ضروری ہے میرے مسلسل انکار کرنے پر کہنے لگا کہ بات اتنی اہم نہ ہوتی تو میں اس وقت مخل نہ ہوتا۔''

''ہوں۔'' وہ پُر خیال انداز میں بولے۔ ''اسے بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔''

''جو حکم سرکار۔'' وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔

''سلیم اس وقت کیوں آیا ہے؟'' اماں مضطرب ہو گئیں۔ ''کہیں اسے خبر تو نہیں ہو گئی؟''

''اگر معاملہ ہماری بیٹی کا نہ ہوتا تو اسے یا کسی اور کو بھی خبر ہو جاتی تو ہمیں پروا نہیں تھی لیکن اب بات اور ہے۔'' وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ''اور اس لئے ہمارا اس سے ملنا ضروری ہے۔''

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

''آپ فکر مت کریں ہمیں معاملات سنبھالنا آتے ہیں۔''

گول کمرے میں سلیم پیر صاحب کے انتظار میں بیٹھا تھا ان کے آنے پر اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔'' وہ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''بیٹھو!'' سلیم کچھ کہے بغیر بیٹھ گیا

''اس وقت ہم کسی سے نہیں ملا کرتے لیکن صرف یہ سوچ کر چلے آئے کہ شاید تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے تب ہی تم رات کے اس پہر اتنی بارش میں یہاں چلے آئے۔''

''جی ہاں۔'' اس نے اپنی بات کے لئے ذہن میں موزوں اور الفاظ اکٹھے کیے۔

''میں کافی دن سے اپنے بھائی کو تلاش کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گاؤں جا رہا ہے لیکن پھر واپس نہیں آیا میں بہت پریشان ہوں۔''

پیر صاحب نے چند لمحے اس کے الفاظ پر غور کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا اسے اچھو کے گاؤں آنے کی غرض کا بھی علم ہے یا فقط اتنا ہی علم تھا کہ وہ یہاں آیا تھا لیکن سلیم کے لہجے میں کوئی دھمکی آمیز بات نہیں تھی۔

''جب اتنے دن تک تم نے ہماری مدد کے بغیر اپنے بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو کیا ایک رات اور صبر نہیں کر سکتے تھے؟'' وہ بولے تو ان کے انداز میں قدرے ناگواری تھی۔

''وہ میرا بھائی ہے اور اس کے لئے میرے دل میں کیا درد اٹھ رہا ہے یہ صرف کوئی بھائی ہی جان سکتا ہے۔'' سلیم نے دبے دبے انداز میں کہا حقیقتاً اسے پیر صاحب کے انداز پر خاصا غصہ آیا تھا۔

''اتنی رات گئے اور بارش میں تمہارے بھائی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہے یہ کام تو صبح ہی ہو سکتا ہے۔'' پیر صاحب بولے۔

''ویسے ہماری اطلاعات کے مطابق تو تمہارا بھائی اور ماں باپ بغیر کسی سے ملے یا کسی کو کچھ بتائے کہیں چلے گئے ہیں۔ کہاں؟ یہ جاننے کی ہم نے کوشش نہیں کی کچھ اس لئے کہ ان کا گھر اور بیشتر سامان ویسے ہی کھلا پڑا ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ ہماری اس کوشش کے باوجود کہ سب لوگ یہیں ہنسی خوشی سے رہیں ہم کسی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔''

اب سلیم کی باری تھی کہ وہ ان کی بات میں حقیقت ڈھونڈے لیکن وہ کوئی اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔

''تم کل صبح آ جانا ہم ان تینوں کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔'' پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے

''سرکار ایک گزارش اور ہے۔''

سلیم کی بات نے ان کے اٹھتے قدم روک دیئے۔

''غالباً بڑے شاہ صاحب آپ کو حویلی میں نہیں ملیں گے۔''

پیر صاحب کو محسوس ہوا جیسے سلیم کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا ہو۔

''ابا جی بتاتے تھے کہ آپ بہت انصاف پرور ہیں۔ وہاں ڈیرے پر ایک لڑکی اور بڑے شاہ صاحب آپ کے انصاف کے منتظر ہیں۔''

پیر صاحب کے چہرے پر سرد مہری چھا گئی۔

''تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جی بالکل! کیوں کہ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بڑے شاہ صاحب اور ایک لڑکی......'' وہ چپ ہو گیا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ رجب علی کے ذکر پر اس کے لہجے میں زہر سا اترنے لگا تھا جبکہ پیر صاحب کو یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا کہ ان کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرنے کا مقصد درحقیقت رجب علی سے انتقام لینا ہے۔

''کیا دیکھا تم نے؟''

''بس ایک لڑکی کو روتے چلاتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ڈیرے کے ملازمین کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا اور پھر بڑے شاہ صاحب کہیں باہر چلے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک واپس پہنچ چکے ہوں گے۔'' اس نے اتنے اطمینان سے جھوٹ اور سچ کی آمیزش کی تھی کہ پیر صاحب انہیں ایک دوسرے سے الگ نہ کر سکے۔

''ہوں۔'' پیر صاحب کے انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ''جانتے ہو قذف' یعنی کسی پر جھوٹا الزام لگانے کی کیا سزا ہے؟''

"جی یہ بھی جانتا ہوں بلکہ حدود کے تمام قوانین پڑھ رکھے ہیں میں نے' دیگر سزاؤں مثلاً اغوا وغیرہ سے متعلق بھی مجھے واقفیت ہے۔" آخری بات اس نے آہستہ سے کہی تھی' لیکن دانستہ آواز اس قدر ضرور رکھی تھی کہ پیر صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے۔

پیر صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ رجب علی اس حرکت میں ملوث ہوگا اور یہی یقین تھا جس کی وجہ سے اس کل کے بچے کی توہین آمیز بات انہیں برداشت کرنا پڑی تھی۔

اس نے ان کی انصاف پروری کو چیلنج کیا تھا۔ دبے دبے انداز میں ہی سہی' ان کے گھرانے کا مذاق اڑایا تھا' انہیں یہ باور کرایا تھا کہ اغوا قابلِ معافی جرم نہیں ہے' ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ منہ موڑ کر چلتے بنتے۔ معاملہ ابھی بگڑا نہیں تھا' وہ اسے سنبھال سکتے تھے۔ خاندان کی عزت و آبرو بچانا بہت اہم تھا۔ گدی کے وارث پر سے یہ داغ دھونا نہایت ضروری تھا۔

سلیم منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"چلو' ہم ابھی ڈیرے پر چلیں گے۔"

☆======☆======☆

حیدر علی کی گاڑی کچے راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد جی ٹی روڈ پر چڑھ گئی۔ ہموار سڑک پر چڑھتے ہی اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

رات کے اس پہر شدید بارش کے درمیان ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اکا دکا ٹرک تیزی سے اس کے پاس سے گزرتے رہے' لیکن اس کی منزل ابھی تین میل دور تھی۔ وہ کسی ایسے گاؤں سے نکاح خواں لانا چاہتا تھا' جو ان کی جاگیر میں نہ آتا ہو' کیوں کہ اپنی جاگیر کے اندر سب لوگوں پر پیر صاحب کا دباؤ تھا اور وہ مزید کسی الجھن اور پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

اکیلے ہوتے ہی بہت سے خیالات نے اس کے ذہن پر دھاوا بول دیا تھا' لیکن وہ ہر خیال سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اماں جان کی منت بھری نظروں' بابا جان کے حکم اور رجب علی کی پیشکش کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ اب اس کے قدم اتنے آگے بڑھ چکے تھے کہ واپسی ناممکن تھی۔ وہ کسی بھی کمزور لمحے کو خود پر غالب نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

بابا جان اور رجب علی کی اسے کچھ زیادہ پروا نہیں رہی تھی' لیکن اماں جان کی خواہش۔

اس نے شعوری طور پر ہر خیال ذہن سے نکال کر تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔

☆======☆======☆

ڈیرے کے باہر گاڑی رکنے کی آواز سن کر زرینہ چونک گئی۔ منہ دھوتے ہوئے پانی کے چھینٹے ڈالتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

"شاہ جی آگئے!" اس کا دل اچھلا تھا' لیکن اگلے ہی لمحے وہ الجھن میں مبتلا ہوگئی۔ "اتنی

جلدی شاہ جی کیسے واپس آسکتے ہیں۔" اس نے خود ہی اپنے پہلے خیال کی تردید کر دی۔ "تو پھر یہاں کون آگیا؟"

نلکا بند کر کے وہ دبے قدموں غسل خانے کے دروازے پر گئی اور نہایت آہستگی سے اسے بند کر کے کنڈی لگا دی۔

"جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ آنے والے شاہ جی ہیں تب تک میں بھی دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

وہ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوگئی۔

☆======☆======☆

گاڑی سے اتر کر رجب علی اندر آیا۔ دو کمروں کی بتیاں روشن تھیں' جب کہ باقی ہر چیز پر تاریکی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ جنریٹر صرف اس وقت چلایا جاتا تھا' جب حویلی کا کوئی فرد وہاں آتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ملازمین لالٹین سے ہی کام چلا لیتے تھے' لیکن خلاف معمول آج وہاں کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔

اس نے تمام حسیات مجتمع کر کے کسی کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"جو کوئی بھی ہے میرے کمرے میں ہی ہے۔" اس نے سوچا اور چند قدم آگے بڑھ کر کمرے کے بند دروازے کے سامنے رک گیا۔

سب سے پہلا خیال اسے یہ آیا کہ شاید کوئی ملازم اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہینڈل گھما کر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول لیا' لیکن وہ روشن کمرا بھی خالی تھا۔ ایک قدم بڑھا کر وہ اندر چلا آیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

سامنے ہی کروشیے کے سفید بیڈ کور پر ایک سیاہ باریک ریشمی چادر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھی۔

"کوئی لڑکی۔" اس نے سوچا۔ "لیکن کون اور کیسے۔"

اس نے آگے بڑھ کر چادر اٹھالی۔ ہلکی سی نمی والی وہ چادر نہ جانے کب سے وہاں پڑی تھی' لیکن اس میں کسی لڑکی کے وجود کی مہک ابھی تک موجود تھی۔

چادر دوبارہ پھینک کر وہ ڈریسنگ روم کی جانب بڑھا۔ ایک دم اس کی بے زاری اور کوفت دور ہوگئی تھی۔ یہاں پہنچنے پر اتنا دلچسپ سرپرائز ملے گا' اس کا اسے گمان بھی نہیں تھا۔ اسے اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کون تھی' کہاں سے اور کیوں آئی تھی' بس اتنا کافی تھا کہ وہ اس کی خواب گاہ میں تھی اور مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے۔

ڈریسنگ روم کے آدھے پردے تنے ہوئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا' لیکن وہاں بھی اس اجنبی لڑکی کی خوشبو کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گویا وہ باتھ روم میں تھی۔ اس نے دروازے پر دستک

دی۔ ایک مرتبہ' دو مرتبہ' تین مرتبہ' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھولنا چاہا' لیکن وہ بند تھا۔

''ہوں۔'' اس نے پُر خیال انداز میں دروازے کی طرف دیکھا۔

☆======☆======☆

وقت اتنا زیادہ نہیں گزرا تھا' لیکن زرینہ کو ایک لمحہ ایک صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ کتنی دیر گزر گئی تھی' لیکن کسی کی آہٹ نہیں ابھری تھی۔ پھر اچانک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو خوف کے مارے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

''شاہ جی ہوتے تو اس انداز میں نہ آتے۔'' اس نے سوچا تھا۔

پھر یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں' لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ کسی کے اپنے تک پہنچنے یا واپس چلے جانے کا۔ جب انتظار ناقابلِ برداشت ہو گیا تو قدموں کی آہٹ سنائی دی جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ واضح ہو رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ وہ دم سادھے ویسے ہی کھڑی رہی۔

پھر اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ خوف کے مارے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ دروازے کی کنڈی پر گئی۔ وہ مضبوطی سے بند تھی۔

دروازے پر دوسری دستک ہوئی۔ اس نے پہلی مرتبہ غسل خانے کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی کھڑکی باہر کھلتی ہو' لیکن وہاں ایک بالکل ننھی منی سی کھڑکی تھی جو خاصی اونچائی پر ہونے کے علاوہ اس قدر تنگ اور چھوٹی تھی کہ اس کے لئے وہاں سے نکل بھاگنا ممکن ہی نہیں تھا۔

تیسری مرتبہ دستک ہوئی تو اس کی آنکھوں میں اپنی بے بسی کے خیال سے آنسو آگئے۔

''اگر شاہ جی ہوتے تو مجھے پکارتے۔ اوہ خدایا' یہ کون آگیا؟''

''لڑکی دروازہ کھولو۔'' باہر سے تحکمانہ انداز میں اسے مخاطب کیا گیا۔

اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ یہ انداز حویلی کے مکینوں کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ وہ حیدر علی نہیں تھا۔ سخاوت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پیر صاحب کی آواز اور لہجے کو وہ پہچانتی تھی۔

اور ان سب کے بعد صرف ایک شخص باقی بچتا تھا۔ رجب علی شاہ۔

زرینہ کی جو تھوڑی بہت امید تھی' وہ بھی اسی پل ختم ہو گئی۔ رجب علی سے اسے کسی رعایت' کسی رحم کی توقع نہیں تھی۔ جو شخص اپنی سگی بہن کا قاتل تھا اسے زرینہ سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

''اگر میں شاہ جی کا حوالہ دے دوں تو؟ انہوں نے شاہ جی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کریں گے۔'' امید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔

لیکن پھر یہ کرن بھی بجھ گئی۔

''ان دونوں بھائیوں کی راہیں تو بالکل ہی جدا ہو گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے' انہیں ہمارے گاؤں چھوڑنے کے منصوبے کا علم ہو تو' وہ ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کریں' جیسا زیب النسا اور اچھو کے ساتھ کیا تھا۔'' اسے جھرجھری آگئی۔ ''مجھے اپنی پروا نہیں ہے' لیکن شاہ جی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

''لڑکی! دروازہ کھولو ورنہ یہ دروازہ توڑنا بھی مشکل نہیں ہے۔''

ایک مرتبہ پھر وہی تحکمانہ لہجہ تھا۔

زرینہ کو خون اپنی رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے ایک نظر اپنے سراپے پر ڈالی۔ اس کے کپڑے اب تک بھیگے ہوئے تھے۔ چادر وہ وہیں کمرے میں رکھ آئی تھی' کہ باہر نکل کر اوڑھ لے گی اور دوپٹا لانے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایسی صورت حال میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

اچانک دروازے پر ٹکر لگی۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور گھبراہٹ کے عالم میں وہ دروازے سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

☆======☆======☆

پہلی ٹکر کے ساتھ ہی اندر موجود لڑکی نے پہلی مرتبہ اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ خوف زدہ چیخ' قدموں کی آہٹ اور چوڑیوں کی کھنک۔ رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ابھی کافی رات پڑی تھی اور اسے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔

ہولے ہولے سیٹی بجاتے ہوئے اس نے الماری کھول کر ایک بوتل اور فریج گلاس نکالا اور کمرے میں آگیا۔ اسے اندازہ تھا کہ دروازے کی کنڈی توڑنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پڑ گئی تو بھی وہ ایک دو سے زیادہ جھٹکے برداشت نہیں کر سکے گی اور آرام سے اکھڑ جائے گی' لیکن اتنے تردد کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کیوں کہ وہ اندر بند لڑکی کے ردِعمل کا اندازہ کر سکتا تھا۔ یوں کسی جگہ بند ہو کر اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے والی افتاد کا انتظار کرنا اعصابی طور پر بہت مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد ہی لڑکی کے اعصاب جواب دے جائیں گے اور پھر کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔

اس نے تھرماس سے برف کے ٹکڑے نکال کر گلاس میں ڈالے' بوتل انڈیلی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔

☆======☆======☆

زرینہ کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ ایک ہی ٹکر کے بعد کنڈی میں لگی کیلیں واضح طور پر اکھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ چند لمحوں بعد دروازے پر دوسری ٹکر

پڑے گی، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

ہولے ہولے سیٹی بجنے اور الماری کھلنے بند ہونے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ رجب علی اس وقت کمرے میں ہی ہے۔

''یا اللہ! کہیں سے شاہ جی کو بھیج دے۔'' اس نے بے آواز روتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

''یا اللہ مجھے اس مصیبت سے رسوائی کا داغ لگے بغیر نکال دے۔ اتنی دیر ہو گئی شاہ جی نہیں آئے۔ یوں لگتا ہے، صدیاں گزر گئی ہیں انہیں جدا ہوئے۔ وہ ہوتے تو کسی کی جرأت نہیں تھی، میرے ساتھ ایسا کرنے کی۔ رجب علی کو بھی نہیں۔

شاہ جی کدھر رہ گئے آپ؟ آپ نے تو کہا تھا میں یہاں بالکل محفوظ ہوں۔ آپ کو نہیں پتا تھا کیا کہ یہاں درندہ بھی آ سکتا ہے؟'' وہ گھٹنوں میں سر دیے زار و قطار رو پڑی۔

وہ روتی جا رہی تھی، لمحے گزرتے جا رہے تھے، لیکن اتنی آہستگی کے ساتھ جیسے صدیاں بیتی ہیں۔ اتنا وقت گزر گیا تھا لیکن حیدر علی نہیں آیا تھا۔ وہ تھک گئی تھی، اس کا ذہن پاگل کر دینے والی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اندیشوں کے سانپ بار بار ڈس رہے تھے، خوف کے بچھو ڈنک مار رہے تھے۔

اسے لگا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ رجب علی اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل، کھیل رہا تھا۔ حیدر علی کا کچھ پتا نہیں تھا اور اپنی قسمت کا اسے کچھ بھروسہ نہیں تھا۔

اس کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ اسے خود اندازہ نہیں ہوا کہ بے آواز روتے روتے کب وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

رجب علی اس کے چیخنے اور رونے کی پروا کیے بغیر پیتا رہا۔ کافی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے خیال میں صحیح وقت اب آیا تھا۔ غسل خانے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تمہاری ضد پوری ہو گئی ہے تو دروازہ کھول دو، ورنہ ہم خود کھول دیں گے۔''

جواب میں رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

''دروازہ کھول دو۔''

''نہیں۔'' زرینہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ''کبھی نہیں۔''

دروازے پر ایک اور ٹکر پڑی اور کنڈی اکھڑ گئی۔

☆======☆======☆

پیر صاحب ڈرائیور کے ساتھ حویلی پہنچے تو رجب علی کی گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی

اندر بجلی بھی روشن تھی۔

اس حد تک سلیم کی بات درست ثابت ہو گئی تھی، کہ رجب علی وہیں موجود ہے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس کی دوسری بات کی بھی تصدیق ہو گئی کہ وہاں کوئی لڑکی بھی موجود تھی، کیوں کہ لڑکی کی چیخ و پکار وہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ پیر صاحب کے اعصاب تن گئے اور غصہ پورے وجود میں کروٹ لینے لگا۔

''تم یہیں ٹھہرو۔'' انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

''جی حضور۔'' ڈرائیور بھیگی بلی بن کر جلدی سے کافی دور چلا گیا۔ سلیم کو وہ پہلے ہی اس کے گھر پر اتار آئے تھے۔

پیر صاحب اکیلے اندر بڑھے۔ کمرے کے دروازے کا ہینڈل آسانی سے گھوم گیا

''رجب علی شاہ!'' انہوں نے ہلکی سی جھری کی اوٹ سے اسے پکارا۔ ان کی اس پکار میں تحکم بھی تھا، دکھ بھی اور جلال بھی۔

☆======☆======☆

دروازے کی کنڈی اکھڑتے ہی رجب علی نے دروازہ کھول دیا۔

سیاہ کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی گھٹنوں میں منہ دیے بری طرح سے رو رہی تھی۔ ابھی وہ قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ خواب گاہ کا دروازہ نیم وا ہوا اور پیر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''رجب علی شاہ!''

اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔

''بابا جان!'' اس نے زیر لب کہا۔

ان کی آمد کے لئے وہ کسی طور تیار نہیں تھا۔ وہ تو خاص طور پر رات کو، کہیں بھی نہیں نکلتے تھے۔

''رجب علی!'' اس مرتبہ آواز میں اتنی سختی تھی، کہ وہ سٹپٹا گیا۔

ایک نظر اس لڑکی پر ڈال کر اس نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا اور کمرے میں آ گیا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے لڑکی کی چیخ و پکار نہ سنی ہو، اس لئے اس کی جا در چھپانا بے کار تھا۔ البتہ بوتل اور گلاس اس نے جلدی سے ڈبل بیڈ کے نیچے کھسکا دیے۔

''جی بابا جان۔'' وہ ان کے سامنے مجرموں کی طرح جا کھڑا ہوا۔

''مت کہو اپنی گندی زبان سے ہمیں بابا جان!'' غصے کی شدت سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے۔''

''پلیز میری بات سنیں بابا جان۔'' اس نے کہنے کی کوشش کی۔

''بند کرو بکواس، ہم تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔ تم نے ہمیں اور حویلی دونوں کو رسوا

کیا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے تمہیں شوٹ کر دیں۔"

"میرا سر حاضر ہے بابا جان۔" وہ بولا۔ "لیکن اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں یہاں آیا تو ایک لڑکی پہلے سے غسل خانے میں بند تھی۔ میرے کہنے پر بھی اس نے دروازہ نہیں کھولا، الٹا شور مچانے لگی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ جب میں یہاں آیا تو ملازمین بھی نہیں تھے۔"

"جھوٹ بولنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے رجب علی! عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ لڑکی پہلے سے موجود تھی، ملازمین بھی نہیں تھے، کیا کوئی شخص تمہاری اس بات پر یقین کر سکتا ہے؟ ہمیں صرف اس بات کا جواب چاہیے کہ تمہاری خواب گاہ میں کوئی غیر لڑکی کیوں موجود ہے اور وہ کہاں سے آئی ہے؟"

"اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے بابا جان!" وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے رہا۔

"کہاں ہے وہ بچی؟"

"جی اندر۔" وہ بولا۔ "بابا جان آپ اس سے تصدیق کروا سکتے ہیں۔ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"تصدیق تو ہم جنت بی بی سے بھی کروا سکتے تھے۔"

"بابا جان!" اس نے ہونٹ کاٹے۔

"یہاں اس کمرے میں خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے حکم دیا۔

وہ چپ چاپ صوفے پر جا بیٹھا۔

پیر صاحب نے نیم وا دروازے پر دستک دی اور گویا ہوئے۔

"بچی! آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔ ہم تھوڑی دیر بعد آپ سے بات کریں گے۔" انہوں نے خواب گاہ کے دروازے کے باہر سے ہی کہا۔

زرینہ کو لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سن لی ہے۔ کم از کم اس افتاد سے تو نجات مل گئی تھی۔

"لیکن میں، پیر صاحب کو کیا بتاؤں گی اور اگر اس دوران شاہ جی آ گئے تو؟" یہ سوچ کر ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "یہ تو وہی آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوئی ناں۔" غسل خانے سے بوجھل قدموں اور بھیگی آنکھوں سے نکل کر وہ خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ جس کا بیرونی دروازہ اب مکمل طور پر بند تھا۔ اندر اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

سب سے پہلے اس نے بستر پر پڑی چادر اٹھائی اور جلدی سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ پیر صاحب کچھ پوچھیں تو کیا بتائے۔

بستر کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ قالین پر ہی بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ آنسو خود بخود ہی

بہتے چلے آ رہے تھے۔

"چاہے یہ میری جان لے لیں، لیکن میں شاہ جی کا نام بھی نہیں لوں گی۔" اس نے تہیہ کیا۔

"شاہ جی کو کچھ ہو جائے یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور پیر صاحب کی آواز آئی۔

"بچی! ہم اندر آ سکتے ہیں؟"

اس کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھول کر پیر صاحب اندر داخل ہوئے۔

"ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہمارے بیٹے کی وجہ سے دکھ پہنچا ہے۔ ہم چاہیں بھی تو کسی صورت اس کی تلافی نہیں کر سکتے، لیکن جس حد تک ہمارے بس میں ہے ہم آپ کی مدد کریں گے۔" ان کا لہجہ بہت میٹھا، بہت مشفقانہ تھا۔

"آپ اپنے والد کا نام بتا دیں اور سب کچھ ہم پر چھوڑ دیں، آپ پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔"

اس نے بے اختیار گھٹنوں سے سر اٹھایا۔

"نہیں۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہم نے آپ سے کہا ہے ناں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر قالین پر ہی بیٹھ گئے۔ "آپ کو ہماری بات کا اعتبار نہیں ہے، ہم سب سنبھال لیں گے، کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی آپ کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔"

"نہیں میں نہیں بتاؤں گی۔" وہ چلائی۔

"آپ کو نہیں پتا۔ ہمیں بیٹیاں بہت پیاری ہیں۔ اس میں کسی اپنے پرائے کی بات نہیں، کیوں کہ بیٹیاں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہم آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ آج سے آپ ہماری بیٹی ہیں اور کسی میں اتنی جرأت ہرگز نہیں ہے کہ ہماری بیٹی کی طرف دیکھ بھی سکے۔"

اس نے ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ وہاں اس کے لئے پیار و محبت کی وہ مٹھاس تھی جو صرف ایک باپ کے چہرے پر ہی نظر آتی ہے۔

"ہاں بیٹا۔" انہوں نے تسلی دی۔

"میرے ابا جی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

"ہماری زندگی میں کوئی آپ کو کچھ کہے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔"

"آپ کو نہیں پتا ناں، آپ نہیں جانتے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

وہ انہیں کیا بتاتی کہ اصل بات کیا تھی، اگر انہیں اصل بات کا علم ہو جاتا تو اسے یقین تھا کہ ان کی محبت اور حفاظت کے عہد باطل ہو جاتے۔ وہ اپنے الفاظ سے نہیں پھرتے تھے۔ وہ اس کی حفاظت ضرور کرتے، لیکن حیدر علی کو وہ کسی صورت معاف نہ کرتے۔

اتنی دیر تک وہ اسے دلاسے دیتے ہوئے اس کے والد کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔

☆======☆======☆

''تو یہ کھیل اس گھر میں اتنے عرصے سے کھیلا جا رہا تھا۔'' مولوی صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا غصہ کس پر اور کیسے نکالیں۔

''اور تم اس میں برابر کی شریک تھیں۔''

''ابا جی! میں نے تو اسے سمجھایا تھا پر......'' رضیہ منمنائی۔

''بکواس بند کرو۔'' وہ چلائے۔ ''میرے لئے وہ لڑکی مر گئی ہے، چاہے وہ کسی شاہ کے ساتھ بھاگتی یا فقیر کے ساتھ، داغ تو ایک سا ہے ناں۔ کاش میرے پاس زہر ہوتا میں یہ بھی نہ سوچتا کہ خودکشی حرام موت ہوتی ہے۔ ذلت کی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے، خواہ وہ حرام موت ہی ہو۔''

''کس چیز کی کمی تھی تم لوگوں کو؟'' اماں دکھ سے بولیں۔ ''جس چیز کی فرمائش کی دیر سے سویر سے وہ تمہارے ابا نے پوری کی۔ اپنی بساط سے بڑھ کر دیا تم لوگوں کو۔ اس کا یہ صلہ دیا ہے۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ تم دونوں کو اکٹھے دفن کر دوں۔ کاش پیدا ہوتے ہی مار دیا ہوتا۔ میں نے تم لوگوں کو۔

ہم نے کبھی بیٹے کی محرومی کا ذکر نہیں کیا تم دونوں کے سامنے کہ کہیں تمہارا دل نہ دُکھے۔ تم یہ نہ سوچو کہ ہمیں تم سے محبت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا ہم نے اور اس کا یہ صلہ ہے کہ ماں باپ کے منہ پر کالک مل دی۔ بس ایک مرتبہ وہ اس گھر میں آ جائے۔'' انہوں نے مٹھیاں بھینچیں۔

''اوہ خدایا! یہ تو وہ دنیا ہے، جہاں پیروں کی حویلی پر لگے داغ بھی لوگوں کو نظر آ جاتے ہیں تو ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ صبح کی روشنی پھیلتے ہی صدیوں کی کمائی ہوئی عزت پل میں تار تار ہو جائے گی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، آوازیں کسیں گے، کہ اس مولوی کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے، جس کی اپنی بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔

اور جو کچھ پیر صاحب ہمارے ساتھ کریں گے یا ان کے برادر نسبتی وہ الگ بات ہے، کتنی ذلت ہوگی ان کے سامنے۔ کیا کہیں گے کہ میں انہیں سبق پڑھا رہا تھا اور خود میرے اپنے گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

بولو کیا کروں میں، کہاں جا کر منہ چھپاؤں، اب تو صرف مٹی ہی مجھے پناہ دے سکتی ہے۔ اتنی بے غیرتی کے ساتھ تم اور تمہاری بہن زندہ رہ سکتے ہیں، میں نہیں۔''

''ابا جی!'' رضیہ ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''مجھے معاف کر دیں، میں بہت بری ہوں، بہت نیچ ہوں، لیکن پھر بھی مجھے معاف کر دیں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا، لیکن مجھ میں آپ لوگوں سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی مجھے پتا تھا کہ آپ کو علم ہوا تو آپ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے اور مجھے اس سے بہت محبت ہے۔''

مسجد میں داخل ہو کر کسی نے آواز دی۔

''مولوی صاحب؟''

ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''مولوی صاحب؟ آواز دوبارہ آئی۔

''کہیں حویلی سے تو بلاوا نہیں آ گیا؟'' اماں کی خوف زدہ آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

''اچھا ہے، اگر وہیں سے بلاوا آیا ہے۔ میں پیر صاحب سے خود درخواست کروں گا۔ ایک ایک گولی وہ مجھے اور میری بیٹی کو مار کر اس رسوائی سے نجات دلا دیں۔'' انہوں نے پاس کے قریب بیٹھی رضیہ کو پیچھے ہٹایا اور مسجد کی طرف بڑھ گئے۔

رضیہ ان کے پیچھے لپکی، لیکن اماں نے واپس کھینچ لیا۔

''اپنے غیرت مند باپ کو اور ذلیل مت کراؤ۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

مولوی صاحب مسجد پہنچے تو پیر صاحب کا ڈرائیور رشیدا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''مولوی صاحب! پیر صاحب نے آپ کو فوراً طلب کیا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تکلیف دینے پر معذرت چاہتے ہیں، اگر آپ کی فوری ضرورت نہ ہوتی تو زحمت نہ دیتے، انہوں نے گاڑی بھی بھجوائی ہے۔''

''چلو میں تیار ہوں۔'' وہ بوجھل قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگے۔

☆======☆======☆

اپنی تمام تر کوشش کے باوجود حیدر علی اتنی جلدی نکاح خواں کے گاؤں تک نہ پہنچ سکا، جس کی اسے توقع تھی۔ بارش بہت تیز ہو چکی تھی اور ونڈ سکرین کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خاص طور پر جی ٹی روڈ سے اتر کر گاؤں کے کچے راستے پر گاڑی ڈالتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ جگہ جگہ پانی اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی کسی بھی جگہ پھنس سکتی تھی۔ پھر اسے اس گاؤں کے راستے بھی معلوم نہیں تھے، پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔

''یہاں اتنی دیر ہو گئی ہے، پھر نہ جانے نکاح خواں تیاری میں کتنی دیر لگائے اور گورڈ

پریشان ہو رہی ہو گی۔'' اس نے سوچا۔

لیکن اس مسئلے کا اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔

☆======☆======☆

''اس وقت تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہیں مولوی صاحب!'' پیر صاحب نے انہیں اپنے نزدیک بٹھالیا۔

''آپ حکم کریں پیر صاحب۔'' ان کے چہرے پر اعصابی کشیدگی ظاہر تھی۔

''خیریت تو ہے مولوی صاحب! آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔ سب اہلِ خانہ تو ٹھیک ہیں ناں؟''

''جی!'' انہوں نے نظریں چرائیں۔

''جب پیر صاحب کو بھی اصل بات کا علم ہے اور مجھے بھی تو پھر یہ اس طرح انجان بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔'' مولوی صاحب نے الجھن سے سوچا۔ ''اب تو آر ہو یا پار' لیکن جو ہو جلد سے جلد ہو۔ ہو سکتا ہے پیر صاحب محض تنبیہہ کر کے زرینہ کو میرے سپرد کر دیں۔'' ایک موہوم سی امید نے سر اٹھایا۔

''یہاں ہمیں ایک مسئلہ پیش آ گیا ہے۔'' پیر صاحب ان کی کیفیت جانے بغیر بولے۔ ''ہمارے بیٹے رجب علی سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ ہمیں رنج ہے کہ اس نے ایسی حرکت کی۔ چاہتے تو ہم یہ تھے کہ اسے سخت سے سخت سزا دیتے' لیکن معاملہ صرف اس کا نہیں ہے ایک بچی کا بھی ہے اور ہر بچی کی عزت ہمیں جان سے بھی پیاری ہے۔''

مولوی صاحب کا دل چاہا کہ چلا اٹھیں۔ ''ایک بیٹا میری بیٹی کو بھگا لے گیا' دوسرا ہمیشہ کی طرح کسی اور کی لڑکی کو اغوا کر لایا۔ کیا اب حویلی کی یہی اقدار رہ گئی ہیں۔ غریب کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے' جسے آپ کے بیٹے دو کوڑی کی کر رہے ہیں۔ ایک محبت کے نام پر جال ڈالتا ہے اور دوسرا طاقت دکھاتا ہے۔''

لیکن تمام تر خواہش کے باوجود بھی ان کے ہونٹ سلے رہے۔ بات صرف ہمت کی کمی کی نہیں تھی بلکہ اس کی بھی تھی' جس کا داغ ان کے دامن پر لگا تھا اور وہ چلا چلا کر اپنے دامن پر لگے داغ کی تو طرف لوگوں کو متوجہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کم از کم تب تک نہیں جب تک خود ہی کسی کی نظر اس داغ پر نہ پڑ جاتی۔

''آپ حکم کریں پیر صاحب۔'' انہوں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

''ہم نہیں چاہتے کہ کوئی بچی یوں رسوا ہو اس لئے آپ ابھی اور اسی وقت ان دونوں کا نکاح پڑھا دیں۔ باقی سب کچھ ہم خود سنبھالیں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''اس طرح بچی بھی محفوظ ہو جائے گی اور رجب علی کو بھی خود ہی سزا مل جائے گی' کہ جس

لڑکی کو وہ اغوا کی نیت سے لایا تھا' وہی اس کی بیوی بنے گی تو پھر آئندہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

''جی!'' مولوی صاحب بولے۔

''آپ یہیں ٹھہریں' ہم ابھی رجب علی کو لاتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں پہنچے جہاں رجب علی ٹانگ پر ٹانگ دھرے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''اٹھو۔'' پیر صاحب بولے۔

''جی بابا جان!'' وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہم اسی لڑکی سے تمہارا عقد کروا رہے ہیں۔''

ایک لمحے کے لئے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

''جی بابا جان؟''

''ہم تمہارا عقدِ ثانی کروا رہے ہیں فوراً آؤ۔''

''بابا جان ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''تم ہمارے حکم سے انکار کر رہے ہو؟''

''آپ کے حکم سے انکار میرے لئے ممکن نہیں ہے' لیکن بابا جان آپ کا یہ فیصلہ عجلت میں کیا گیا ہے۔ میں کسی ایسی لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں' جو نہ جانے کس طرح میری خواب گاہ میں آ گئی۔ کسی کے ساتھ بھاگ کر آئی یا کسی کے انتظار میں یہاں رک گئی اور۔'' اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کسی ملازم کے ساتھ یہاں آئی ہو۔ کیا ایسی لڑکی کی یہ اوقات ہو سکتی ہے کہ وہ حویلی کی بہو بنے۔''

''جب تم اپنی اوقات سے نیچے گر سکتے ہو تو تمہیں سر بھی جھکانا ہی ہو گا۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ تمہیں ہمارا حکم پورا کرنا ہو گا۔''

''آپ کی حکم عدولی کو میں گناہ سمجھتا ہوں' لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے' یاسمین بھی تو ہے' وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گی۔'' اس نے دوسرا سہارا ڈھونڈا۔

''جب تم نے جرم کیا ہے تو تمہیں سزا بھی کاٹنی ہو گی۔ اپنی بیوی کو بتانا ہو گا کہ تمہاری دوسری شادی کن حالات میں ہوئی اور اس کے بعد یاسمین بیٹی جو کچھ کہے' وہ بھی برداشت کرنا ہو گا۔ ہم نے پہلے بھی تمہیں تنبیہہ کی تھی' لیکن تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔'' انہوں نے قطعیت سے کہا۔

''اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمیں اپنی ساری اولاد میں زیب النسا سے زیادہ کوئی عزیز نہیں تھا اور اس سے بھی زیادہ ہمیں اپنی عزت عزیز ہے۔ ایک مرتبہ معاملہ ہم نے دبا دیا' لیکن

☆======☆======☆

خواب گاہ میں اس وقت صرف مولوی صاحب اور زرینہ تھے۔ جونہی پیر صاحب کو احساس ہوا تھا کہ وہاں موجود لڑکی مولوی صاحب کی بیٹی ہے‘ وہ انہیں خواب گاہ سے باہر لے گئے تھے اور پھر کتنی دیر تک سمجھاتے رہے۔

"مولوی صاحب! ہم آپ سے بے حد شرمندہ ہیں" انہوں نے کہا تھا۔ "ہمیں علم نہیں تھا کہ یہ قیامت آپ کے گھر پر ٹوٹی ہے‘ اپنی پریشانی کے درمیان ہم آپ کی پریشانی سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔"

مولوی صاحب کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ اپنی عزت بچانے کا یہ موقع قدرت نے انہیں فراہم کیا تھا اور وہ کسی بھی صورت اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دے سکتے تھے

"یاد ہے پیر صاحب! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ میں بھی بیٹیوں والا ہوں اور اس قدر طاقت ور نہیں ہوں کہ ان کی حفاظت کا دعویٰ کر سکوں کیوں کہ ہمارے جھونپڑوں کی دیواریں حویلی کی دیواروں کی طرح نہ تو اونچی ہیں اور نہ ہی مضبوط۔" مولوی صاحب سر جھکائے کہہ رہے تھے۔ "لیکن آپ کو میری یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔"

"مولوی صاحب! ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم شرمندہ ہیں۔ اور آپ کی عزت ہمیں اپنی عزت کی طرح ہی عزیز ہے۔ اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ سپیدہ سحر نمودار ہونے سے قبل دونوں کا عقد کر دیا جائے۔ صرف یہی صورت ایسی ہے جس سے بگڑی بات بن سکتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ہمیں تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ آپ بیٹی کے اغوا کے وقت ہمارے پاس کیوں نہیں آئے۔"

مولوی صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ کیا بتاتے کہ بیٹی اغوا تو ہوئی ہی نہیں تھی‘ لیکن پیر صاحب سے کچھ کہنا بھی تھا‘ سو دل پر جبر کر کے لڑکھڑاتی زبان میں بولے۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ بات بھی ثابت ہو سکے گی۔ میں تو اتنا چاہتا تھا کہ صبح اپنی بیٹی کے ساتھ ہی خودکشی کر لوں گا۔"

انہوں نے براہ راست یہ تو نہیں کہا تھا کہ زرینہ کو اغوا کیا گیا تھا‘ لیکن وہ پیر صاحب کو یہ تاثر دینے میں ضرور کامیاب ہو گئے تھے۔

"اب آپ بیٹی کے پاس جا کر اسے بھی تسلی دیں۔ وہ بہت خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی ہے‘ اسے بتائیں ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔ اب ہم اپنا وعدہ پورا کر رہے ہیں۔"

اور اب مولوی صاحب‘ زرینہ کے پاس تھے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری اپنی بیٹی میرا دامن داغدار کرے گی‘ میں خودکشی کر لینا

چاہتا تھا‘ لیکن شاید قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا اور میری عزت بچ گئی۔" وہ بولے۔ "پیر صاحب کے حکم سے میں تمہارا اور بڑے شاہ صاحب کا نکاح پڑھوانے لگا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ چیخی۔ "میں یہ شادی نہیں کروں گی۔"

اب تک وہ جس وقت سے خوف زدہ تھی‘ وہ وقت آیا تو وہ ہر خوف سے گزر گئی حیدر علی کے ساتھ کی جو موہوم سی امید تھی‘ وہ ختم ہو گئی تو اس کے لیے جیسے سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔ نہ خوف نہ امید۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو چکی تھی۔

"کیسے نہیں کرو گی۔" مولوی صاحب طیش میں آ گئے۔ "تمہیں ہر حال میں یہ شادی کرنی ہو گی۔"

"میں شاہ جی سے بے وفائی....." اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ مولوی صاحب نے سختی کے ساتھ اس کا منہ بند کر دیا۔

"اب کبھی ان کا نام مت لینا‘ ورنہ تم مجھے زندہ نہیں دیکھو گی۔" انہوں نے ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا دیا۔

"ابا جی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں آپ مجھے مار دیں‘ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

"میں تمہیں نہیں اپنے آپ کو ختم کروں گا‘ میری لاش پر تم چاہے کسی کے ساتھ شادی کر لینا‘ لیکن میری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہو گا۔" وہ بولے۔

"پتا نہیں قدرت کو مجھ پر کس وجہ سے ترس آیا ہے‘ لیکن میں اپنی عزت بچانے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔

میں‘ پیر صاحب سے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں بڑے شاہ صاحب نے اغوا کرایا تھا۔ گو یہ جھوٹ ہے لیکن جیسے زندگی بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حرام کو بھی وقتی طور پر حلال قرار دے دیا ہے‘ اسی طرح میں نے جھوٹ مصلحت کے تحت بولا ہے۔ ٹھیک ہے میں تم پر دباؤ نہیں ڈال رہا۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"تم اپنی مرضی سے کسی کا بھی انتخاب کر لو‘ اپنے باپ کو عزت دے دو یا ذلیل کر دو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ مجھے ذلت کی زندگی قبول نہیں ہے اور چھوٹے شاہ صاحب تک جانے کے لئے تم جس راستے سے گزرو گی وہاں تمہیں اپنا باپ زندہ نہیں‘ مردہ حالت میں ملے گا۔"

زرینہ کو لگا جیسے اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہو‘ جیسے اس کی ہر خواہش دم توڑتی جا رہی ہو‘ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو رہے ہوں۔

ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ حیدر علی کے ساتھ تھی۔ مطمئن نہیں تھی‘ لیکن تنہا بھی نہیں تھی۔ اب ایک دم سے جیسے ساری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ لق و دق صحرا کے بیچ۔

''مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اپنی خواہشوں کی خاطر میں کس حد تک خودغرض ہوسکتی ہوں۔''
اس کے ذہن میں اپنے ہی الفاظ گونجے جو کچھ ہی دیر پہلے اس نے حیدر علی سے کہے تھے' لیکن اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کچھ دیر پہلے کی بات نہ ہو بلکہ صدیاں گزر چکی ہوں۔ اسے یہ بات کہے ہوئے۔

''نہیں' میں اتنی خودغرض نہیں ہوں۔'' اس کے دل نے کہا اور اس نے گردن جھکا دی۔

☆======☆======☆

ندی کی لہریں ہولے ہولے ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتی ایک سمت سے دوسری سمت بہتی چلی جارہی تھیں اور حیدر علی خالی الذہنی کی کیفیت میں ننھے ننھے کنکر پھینک کر بھنور بننے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی زندگی جاگ اٹھی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور ہوا کی سرسراہٹ نے گویا منظر میں جان ڈال دی تھی۔

صبح صادق کے وقت جیسے ہی بارش ختم ہوئی تھی ہر چیز پر نکھار آگیا تھا۔ نیلا شفاف آسمان' دھلے ہوئے سبز پتے' رواں ندی ہر چیز چمک اٹھی تھی۔

لیکن حیدر علی کے لئے کسی چیز میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ اس کے لئے تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی تمنائیں' اس کے خواب سب کچھ۔ وہ جو رگِ جاں سے بھی قریب تھی' اب ایک ایسے رشتے کی ڈور میں بندھ گئی تھی کہ اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ بن گیا تھا۔ وہ اس مقام پر بے بس ہوگیا تھا جسے تقدیر کہتے ہیں' ورنہ اس نے تو پوری کوشش کی تھی۔ جس حد تک اس سے ممکن تھا' اس نے جلدی کی تھی' لیکن تقدیر کے نام پر بہت سی دیواریں اس کے راستے میں آکر اسے گوری سے دور ہی دور کرتی گئیں۔

کہنے کو اس کا راستہ بارش نے روکا تھا۔ کیچڑ میں گاڑی پھنسی تھی۔ نکاح خواں نے دیر کی تھی۔ پیسے لینے کے باوجود ان دو افراد نے بے دلی سے گاڑی کو دھکا دیا تھا۔

لیکن حقیقت کیا تھی؟

حقیقت صرف اور صرف یہ تھی کہ ان کے راستے الگ تھے' جو کسی صورت ایک نہیں ہوسکتے تھے اور یہ بات کاتبِ تقدیر نے بہت پہلے آسمان پر لکھ دی تھی' جو اس کی قسمت میں نہیں تھا' وہ اسے کیسے مل سکتا تھا۔

اس کے پہنچنے تک تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا' سوائے رجب علی کے جو بستر پر اوندھا پڑا سو رہا تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح گوری کو ہر طرف گوری کو تلاش کیا تھا' لیکن وہاں اس کی مہک کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے رجب علی کو جگانے کی کوشش کی تھی لیکن چار خواب آور گولیاں کھانے کے بعد وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اس نے آنکھیں بھی نہیں کھولیں۔

اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ بابا جان کی گاڑی سے ان کا ڈرائیور شیدا نکل رہا تھا۔

''بڑے سرکار نے بڑے شاہ صاحب کو طلب کیا ہے۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

وہ حویلی کا پرانا نمک خوار تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی طوفان گزر چکا ہے۔

''شیدے! تم جانتے ہو یہاں کیا ہوا ہے؟'' اس نے مضطرب انداز میں پوچھا

''یہاں ایک لڑکی تھی' وہ کہاں گئی؟''

پہلے تو شیدا چند ثانیے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اس نے سر جھکا لیا۔

''سرکار! وہ بی بی بالکل محفوظ ہیں اور حویلی کی بہو بن چکی ہیں۔ بڑے سرکار نے بڑے شاہ صاحب کی شادی کروادی ہے ان سے۔''

اور اسی لمحے سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ اتنا تکلیف دہ' اتنا غیر متوقع انجام ہوا ان کی محبت کا۔

''لہر سے لہر ٹکرائے کیسے' کہو؟
اور ساحل سے چھو جائے کیسے' کہو؟
لہر کو لہر سے دور کرتی ہوئی بیچ میں سینکڑوں اور لہریں بھی ہیں اور کچھ بھی نہیں
چاہے دھرتی کے سینے میں جنگل نہ ہوں
چاہے پربت نہ ہوں' چاہے دریا نہ ہوں' چاہے ساگر نہ ہوں۔
نیلے آکاش میں چاند' تارے نہ ہوں' کوئی سورج نہ ہو۔
رات دن ہوں نہ دنیا میں شام وسحر
کوئی پروا نہیں
ایک ہی دھیان ہے
دور ہی دور جیون گزر جائے گا اور کچھ بھی نہیں۔''

☆======☆======☆

صبح ہوتے ہی حویلی سے رجب علی کی دوسری شادی کا اعلان کردیا گیا تھا۔ لوگ حیران تھے' دبے دبے انداز میں حیرت کا اظہار بھی کررہے تھے۔ یہ جاننے کو وہ بے چین تھے کہ حویلی کی یہ نئی بہو کس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی' لیکن تمام تر تجسس اور حیرت کے باوجود پیر صاحب کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مبارکباد دے رہے تھے اور ایک دن کے وقفے کے بعد ہونے والا ولیمہ کھانے کو بھی بے قرار تھے۔

''بہو بیگم کے گھر والوں کی درخواست تھی کہ عقد سے قبل اس کی تشہیر نہ کی جائے۔ چھوٹی بی بی کی وفات کا غم بھی ابھی تک تازہ ہے' ورنہ یہ شادی بھی اسی طرح شاندار طریقہ سے انجام

پاتی جیسے پہلی ہوئی تھی۔'' پیر صاحب کہہ رہے تھے۔

''بہو بیگم اسی گاؤں کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس گھرانے سے تعلق جوڑنا ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے۔''

''گاؤں کا معزز گھرانہ۔'' سب اپنے اپنے ذہن دوڑانے لگے کہ ایسا کون سا گھرانہ ہو سکتا ہے جسے پیر صاحب نے یہ عزت بخشی ہے لیکن منہ سے کچھ کہے بغیر وہ اس بات کے منتظر رہے کہ ابھی پیر صاحب ان کا تعارف کروائیں گے۔

''مولوی نعمت اللہ اور ان کے گھرانے کی شرافت و نجابت کو آپ سب جانتے ہیں۔ بڑے شاہ صاحب' رجب علی شاہ کا عقدِ ثانی ان کی چھوٹی صاحب زادی کے ساتھ ہوا ہے۔''

لوگ حیران تھے کہ ایسا کیسے ہو گیا۔ ضرورتاً دوسری کیا بعض اوقات تیسری شادی بھی کی گئی تھی' لیکن اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ بظاہر بلا وجہ ہی اور اس قدر اچانک دوسری شادی کر لی جائے۔

اور اس سے بڑھ کر حیران کن بات یہ تھی کہ یہ رشتہ کسی سیّد زادی سے کرنے کی بجائے ایک عام سے گھرانے میں جوڑا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مولوی نعمت اللہ گاؤں کے معززین میں سے تھے اور ان کے گھرانے کی بابت سب جانتے تھے لیکن وہ سیّد نہیں تھے۔

کہیں کوئی گرہ تھی جس کا سرا گاؤں والوں کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یہاں سے مبارک باد دے کر وہ جلدی سے مولوی صاحب کے گھر پہنچے۔

''یہ کیا بات ہوئی مولوی صاحب کہ آپ نے اس خوشی میں ہمیں شامل ہی نہیں کیا؟'' سب کو شکوہ تھا۔

''مجھے خود یقین نہیں تھا کہ یہ سب بہ حسن و خوبی انجام پا جائے گا دل میں انجانا سا خوف تھا۔ کہاں میں' کہاں پیر صاحب کا گھرانہ اس سے پہلے کب ایسا ہوا تھا' دل دھڑک رہا تھا۔ میں اہتمام کرتا تو بھی کتنا کر لیتا' پیر صاحب کے گھرانے کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا اس لئے صاحب سے درخواست کی تھی کہ پہلے سے کسی کو نہ بتایا جائے۔'' انہوں نے نظریں چرا لیں کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے انہیں۔

عورتیں گھر میں مبارک باد دے رہی تھیں رضیہ کمرے میں بند رو رہی تھی اس میں کسی کے سامنے جھوٹی خوشی کی نمائش کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اسے اس بات کی ذرا سی بھی خوشی نہیں تھی پھر وہ سب کے سامنے منافقت کیسے کر سکتی تھی۔

رہ رہ کر اسے زرینہ سے ہونے والی اپنی گفتگو یاد آ رہی تھی جب وہ چھوٹے شاہ صاحب کی تعریف کر رہی تھی تو رضیہ نے اس سے کہا تھا۔

''دیکھنے میں تو بڑے شاہ صاحب بھی کم نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر ہیں۔''

''لیکن کرتوت تو کالے ہیں ناں۔'' زرینہ فوراً بولی تھی۔ ''ایسا بندہ تو مجھے سو دفعہ مرنے کے بعد زندہ ہونے پر بھی اچھا نہ لگے۔''

اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ بازی کہاں کیوں اور کیسے پلٹ گئی تھی اور وہ جو اپنا مقدر حیدر علی کے ساتھ جوڑنے جا رہی تھی۔ اچانک رجب علی کی زندگی میں کیسے داخل ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

یاسمین کی ازدواجی زندگی کو لگنے والا گو کہ یہ پہلا جھٹکا نہیں تھا' لیکن سب سے شدید ضرور تھا اس نے ہمیشہ صبر کیا تھا لیکن اس لئے کہ شاید اس طرح وہ رجب علی کو پا لے ناکہ اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے اسے کھو دے۔ اتنے دن کے ساتھ کے بعد وہ صرف یہ اندازہ لگا سکی تھی کہ رجب علی کو اس کی ضرورت تھی ہی نہیں' اس نے تو بس فرض نبھایا تھا شاید اپنے بابا جان کے الفاظ کا احترام کیا تھا اور کچھ نہیں

اور اب اچانک یہ افتاد ٹوٹ پڑی تھی' جس کے لئے وہ کسی طور تیار نہیں تھی۔ اس کا وجود جیسے کسی نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ جس وقت پیر صاحب اس کے پاس آئے' اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر بند باندھے تھے' مگر آنکھوں کی سرخی سب کچھ خود ہی بتا رہی تھی۔

''آپ کو اب تک تو علم ہو ہی گیا ہو گا۔'' وہ بولے۔ ''ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ایسا فیصلہ کرنا پڑا' لیکن یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہم مجبور تھے۔''

اس کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔

''ہم نے آپ سے کہا تھا ناں کہ شوہر کی پردہ پوشی اچھی بات ہوتی ہے' لیکن اس حد تک پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے گھر کی بنیادیں ہی کمزور ہونے لگیں۔''

''میں تو سوچتی رہی کہ میری خاموشی میرا گھر بچانے کی ضمانت ہے۔ میں کیا کروں بابا جان؟'' اس کے انداز میں بے بسی اتر آئی۔

ان کا دل کٹ گیا۔ یاسمین انہیں بہت پیاری تھی۔

''خاموشی وہاں اچھی ہوتی ہے جہاں اسے سمجھنے والا کوئی ہو۔'' وہ بولے۔

''اتنا ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری زندگی تک آپ سے محض اس وجہ سے بے انصافی نہیں ہو گی کہ رجب علی کی دوسری شادی ہو گئی ہے۔ اور آپ کو یہ تو علم ہے ناں کہ ہم اپنے الفاظ سے کبھی نہیں پھرتے۔''

''گاؤں سے پیغام آیا ہے' میرے بابا جان بھی آج آئیں گے۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

''ہمارا ہی بھائی ہے ناں' آنے دو اسے۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ہم اب چلتے ہیں۔''

☆======☆======☆

ایک ایک کر کے حیدر علی کو نہ جانے کون کون سی بات یاد آ رہی تھی۔ جب وہ دونوں پہلی مرتبہ ملے تھے تو وہ کتنی بوکھلائی ہوئی تھی۔ دوپٹا دروازے کی کنڈی میں اٹکنے کی وجہ سے شربت کا جگ اور گلاس زمین پر گر کر چور چور ہو گئے تھے۔ یہی افتاد کم نہیں تھی کہ اس کی نظر حیدر علی پر پڑ گئی تھی اور اس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔ ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ۔'' وہ اس قدر گڑبڑا گئی تھی کہ فقرے میں ربط بھی نہیں تھا۔

اور اس نے آگے بڑھ کر گوری کا دوپٹا کنڈی سے نکالنا چاہا تھا کہ اس نے گھبراہٹ میں دوپٹا ہی کھینچ لیا جو چر کی آواز کے ساتھ پھٹا اور کنڈی کی قید سے آزاد ہونے کے بعد اس کے ہاتھوں سے بھی پھسل گیا۔

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر ہی بھاگ گئی۔

اور وہ دن جب پیاس کی وجہ سے اس نے خالہ کبریٰ کے دروازے پر دستک دی تھی اور جواب میں گوری نے دروازہ کھولا تھا۔

''کتنی دیر کر دی تم نے۔'' دروازہ کھولتے ہی اس نے کہا تھا اور پھر اسے دیکھ کر جیسے ساکت ہی رہ گئی۔

وہ بھی اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ گلابی رنگ کے شلوار کرتے پر دوپٹے سے بے نیاز' بالوں کی چوٹی آگے ڈالے' وہ اتنی حسین اور معصوم لگ رہی تھی کہ وہ صدا جس کا انتظار' اس کا دل نہ جانے کب سے کر رہا تھا' اچانک ابھری۔

''دیر تو واقعی تم نے کر دی ہے حیدر علی' کیوں کہ یہی وہ لڑکی ہے' جس کی تمہیں تلاش تھی' جسے تم نے ہر جگہ ڈھونڈا۔ لندن کے کلبوں میں' سڑکوں پر' لائبریری میں' کتابوں کے ریک کے پیچھے' خاموش ندیوں کے بے آباد اور ویران کناروں پر' کینوس لگے ایزل کے گرد اور پیانو بجاتی لڑکیوں کے درمیان' لیکن وہ تو یہاں تھی' تمہارے اتنے قریب تم سے اس قدر دور۔''

اسے اتنے غور سے اپنی طرف دیکھتا پا کر زرینہ نے پیچھے ہٹ کر ایک دم سے دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر کتنی مشکل سے اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ باہر نکالا تھا جس کی مخروطی انگلیوں میں صراحی دبی ہوئی تھی۔ اور جب وہ باہر نکلی تو چاند سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ صرف شربتی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں۔ پھر جب وہ اسے پانی پلا کر پلٹنے لگی تھی تو اس نے بے اختیار پکارا تھا۔

''سنیے!''

وہ کچھ کہے بغیر رک گئی تھی۔

''اپنا نام تو بتاتی جائیں۔''

''کیا کریں گے جان کر؟'' وہ دونوں خوبصورت آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں تھیں۔

''کسی کی ذات کے اندر اترنے کے لئے سب سے پہلے تعارف کی سیڑھی پر قدم رکھنا پڑتا ہے اور تعارف کی ابتدا نام سے ہوتی ہے۔''

وہ ہولے سے ہنس پڑی تھی۔ ''روشنی' ہوا' خوشبو! اگر ان کے یہ نام نہ ہوتے' تب بھی ان کا وجود مکمل تھا۔ انہیں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ پھر نام میں کیا رکھا ہے۔''

آپ نے شیکسپیر کو پڑھ رکھا ہے؟'' حیدر علی کو ہرگز اس سے اتنی گہری بات کی توقع نہیں تھی۔

''وہ کون ہے؟'' انداز میں سادگی تھی۔

''وہ ایک بہت بڑا انسان تھا۔ بہت اچھی باتیں کہی ہیں اس نے۔''

''اچھی بات کہنے کے لئے بڑا ہونا ضروری نہیں وہ تو فقط انسان ہونا شرط ہے۔'' وہ واپس مڑنے لگی۔

''سنو!'' حیدر علی نے بے ساختہ پکارا تھا۔

''کہیے۔''

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

''جو آپ کو اچھا لگے۔''

''گوری! کیا پھر ملو گی؟''

''اگر تقدیر نے ملایا تو۔'' اس نے مڑ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

اور اب اس کے لئے تقدیر نے ہر راہ بند کر دی تھی۔ بھنور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سب کچھ غرق ہوتا لگ رہا تھا' لیکن حیدر علی کو بچ جانے یا بچا لینے کی خواہش نہیں تھی۔

''وہ میری بھابی بن گئی ہے' کیسی ستم ظریفی ہے قدرت کی' وہ جو میرے لئے ہنستی تھی' میری خاطر روتی تھی' جس کے دل میں' خوابوں میں' سانسوں میں صرف میں تھا' آج وہ میری بھابی ہے' میرے بھائی کی عزت' اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ بن گیا ہے۔''

اس کے سر میں جیسے دھماکے سے ہو رہے تھے۔

اب تو جیسے ایک زمانہ گزر گیا تھا' اس وقت کو جب وہ اور کرسٹی لندن کے اپاٹمنٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور اچانک رجب علی چلا آیا تھا۔ کرسٹی اس سے طلاق چاہتی تھی اور وہ اس بات پر آمادہ نہیں تھا' لیکن انہیں ساتھ بیٹھے دیکھ کر رجب علی نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کرسٹی کو طلاق دے دی تھی۔ پھر جب حیدر علی اس کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے گیا تھا تو اس نے

پائپ صاف کرتے ہوئے نہایت اطمنان سے کہا تھا

''تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ایک فی صد بھی شک گزرتا تو میں ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر تم دونوں کو شوٹ کر دیتا۔''

اب نہ جانے وہ گوری کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ نہیں گوری نہیں زرینہ بھابی کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔

☆======☆======☆

زرینہ کے لئے ایک دم سب کچھ بدل گیا تھا' سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں مر چکی ہے' جسم باقی ہے روح نہیں رہی۔ تمنائیں' خواہشیں اور خواب سب کچھ لمحوں کی دھول میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا' کھو چکا تھا۔ وہ پلٹنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ حیدر علی کو آواز دینا چاہتی تھی لیکن ہونٹوں پر قفل لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پیچھے ماضی کے ٹمٹماتے چراغ تھے لیکن اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی اور سامنے ایسا گہرا اندھیرا کہ راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

اس کا کمرا بے حد خوبصورت اور شاندار تھا' اتنا زیادہ کہ اس نے کبھی خواب میں بھی ایسا آراستہ اور آرام دہ کمرا نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لئے زیور پہنچ چکے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں عورتیں ملبوسات تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ دو خادمائیں اس کے احکامات کی منتظر تھیں' لیکن اسے یہ سب کچھ بہت بے معنی لگ رہا تھا۔ اسے ان میں سے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو سوکھی روٹی اور چٹنی کھا کر بھی گزارا کر لیتی اگر اس کے ساتھ حیدر علی ہوتا۔

رجب علی سے اسے نفرت تھی' پہلے بھی وہ اسے پسند نہیں تھا' اس نفرت کا آغاز جنت بی بی والے واقعے سے ہوا تھا اور پھر زیب النسا کی موت کے بعد۔ حیدر علی کا بھائی ہونے کے ناتے جو تھوڑی بہت عزت رہ گئی تھی' وہ بھی جاتی رہی تھی لیکن یہ ناپسندیدگی اتنی شدت کے ساتھ بھی محسوس نہیں ہوئی تھی' جتنی کل رات' وہ ان لمحوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی تھی۔ جب خوف کا عفریت اسے پوری طرح جکڑ رہا تھا اور رجب علی اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔

اور آج اسی رجب علی کے ساتھ وہ ایک ایسے رشتے میں باندھ دی گئی تھی' جو لمحوں کا نہیں جنموں کا رشتہ ہوتا ہے۔ اس شخص کے ساتھ جس سے اسے شدید نفرت تھی۔

''آپ کو بڑی بیگم نے یاد کیا ہے۔'' ایک خادمہ نے کہا تو وہ اپنے خیالوں سے چونک گئی۔

وہ اس حویلی میں بارہا آئی تھی اور یہاں کے در و دیوار کو جانتی تھی' لیکن آج اماں جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے یہ سب کچھ بہت اجنبی ہو۔ وہی ملازمائیں اور ادھر ادھر پھرتی عورتیں جن کے پاس رک کر وہ کتنی ہی دیر باتیں کر لیتی تھی' جو ہاتھ

پکڑ کر اسے روک لیتی تھیں' جن کے ساتھ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی آنکھوں میں حیرت دلچسپی اور تجسس کے تاثرات رکھنے کے باوجود وہ اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھیں۔

خواب گاہ میں اماں جان اکیلی نہیں تھیں' ان کے ساتھ یاسمین اور مہرالنسا بھی تھیں' اس کے لئے ان دونوں کا سامنا کرنا مشکل تھا' دل چاہا الٹے قدموں واپس بھاگ جائے۔ صرف ایک رات نے اس کی زندگی میں کیسا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ایک دن پرانی دنیا میں لوٹ جانا چاہتی تھی' لیکن اب ہر راستہ بند ہو چکا تھا۔

''اندر آ جاؤ' وہاں کیوں کھڑی ہو؟'' اماں جان نے کہا۔

اس کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ ان کے قریب آ گئی

''وہاں بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

یاسمین اور مہرالنسا ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں اور ابھی وہاں اتنی جگہ ضرور تھی کہ وہ بھی بیٹھ سکتی' لیکن انہوں نے اسے اپنے قریب بٹھانا پسند نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر تک اماں جان تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہیں' پھر گویا ہوئیں۔

''آج سے تم اس گھر کی بہو بن گئی ہو' لیکن یہ رشتہ مجبوری میں باندھا گیا ہے' ورنہ تم جانتی ہو کہ ہمارے خاندان میں ایسے بے جوڑ رشتے کبھی نہیں اپنائے گئے۔

یاسمین رجب علی کی پہلی بیوی ہے اور جو حیثیت اس کی ہے' اسے تمہیں تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ یاسمین رجب علی کے بابا جان کے بھائی کی بیٹی ہے ہمارا خاندان ایک ہی ہے' یہ خون کا رشتہ بھی ہے' اسے حویلی میں سب کی خوشی اور دھوم دھام سے لایا گیا ہے نہ کہ تمہاری طرح تاریکی میں اس طور سے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

تمہیں حویلی میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہے۔ خاص طور پر تم یاسمین کے رہائشی حصے کی طرف کبھی نہیں جاؤ گی' اس کے علاوہ کسی کے کمرے میں آنے جانے کے لئے پہلے اپنے شوہر اور اس شخص سے اجازت لو گی۔

تمہارے میکے سے تم سے کوئی ملنے آئے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے' لیکن تم میکے نہیں جاؤ گی۔

حویلی کی روایات تمہیں بھی معلوم ہیں اور تمہیں ان کی پاس داری کرنا ہو گی۔''

زرینہ کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے آپ میں بار بار مر رہی ہو۔ احساسِ ذلت نے اسے چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''اب تم جا سکتی ہو۔''

اماں جان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپس مڑتے ہوئے ایک نظر اس نے یاسمین اور مہرالنسا کی آنکھوں میں دیکھا۔ یاسمین کی آنکھوں میں اس کے لئے

نفرت ہی نفرت تھی۔

اور مہر النسا۔

اس کی آنکھوں میں تو پوری کہانی تھی۔ اس کے لئے نفرت' الزام' تمسخر اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ لمحہ بھر سے زیادہ وہ ان کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی اور باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

رجب علی کے لئے وہ رات بہت بھاری تھی احساس ذلت مسلسل کچوکے لگ رہا تھا۔ احساس کہ اس کی نئی بیوی کسی اور کی محبوبہ تھی۔ اس کی رجب علی کے کمرے میں موجودگی بلا جواز نہیں تھی' وہ خود وہاں نہیں آسکتی تھی کوئی اسے اس کی اپنی مرضی سے وہاں لایا تھا' تب ہی تو اس نے اتنی لاپروائی سے ڈبل بیڈ پر اپنی چادر پھینکی ہوئی تھی۔

اب ایسی لڑکی اس کی بیوی تھی جو نہ جانے کس کے ساتھ تنہائی میں' نہ جانے کتنے پل گزار چکی تھی' جسے نہ جانے کس کے ہاتھوں نے چھوا تھا' جس سے نہ جانے کس نے محبت کا دعویٰ کیا تھا اور وہ نہ جانے کس سے محبت کرتی تھی' کس کے متعلق سوچتی تھی' جس کی تنہائیوں پر نہ جانے کون قابض رہ چکا تھا اور گاؤں میں نہ جانے کتنے لوگ محبت کے اس افسانے سے واقف تھے۔

اور آج وہ لڑکی اس کی بیوی بنادی گئی تھی۔ اس کی عزت بنادی گئی تھی۔

وہ بابا جان کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا' ورنہ اس کے ساتھ نکاح پڑھوانے کے بجائے اسے شوٹ کر چکا ہوتا۔

''لیکن شوٹ تو اسے کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ ''بس چند دن کی بات ہے تاکہ تب تک یہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو اس کے ساتھ شادی کرنے کے خیال کا سن کر ہی اسے شوٹ کر دیتا۔''

لیکن یہ تسلی خود اسے بے معنی لگ رہی تھی۔ پیر صاحب کو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا' اس لئے نکاح کے ساتھ وہ زرینہ کو اپنے ساتھ حویلی لے گئے تھے۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ رجب علی کی رگوں میں دوڑنے والا خون نفرت سے ابلتا جارہا تھا۔ تسلی کے الفاظ بے معنی ہوتے جارہے تھے۔ اسے خیال تھا کہ ایسے وقت میں اسے خود پر قابو پانا ہوگا' ورنہ معاملہ بالکل ہی بگڑ جائے گا لیکن جب تک اس کا شعور اس کے ساتھ تھا' وہ خود پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے خواب آور گولیوں کی شیشی سے اس نے چار گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ نگل لی تھیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

لیکن صبح اٹھ کر ذلت کے ناگ نے پھر پھن پھیلا لیا تھا۔ بس اتنا تھا کہ اب ایک اچھی نیند لے لینے کے بعد وہ زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتا اور اپنے اعصاب پر کافی حد تک قابو پا سکتا تھا۔

اب تک اس نے ایک نظر بھی زرینہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھنے کی اب کوئی ضرورت بھی

نہیں تھی۔

صبح وہ حویلی میں داخل ہوا تو ہر کوئی مبارک باد دینے میں پیش پیش تھا۔ وہ بے نیازی اور لاتعلقی کے تاثرات کے ساتھ گردن کی جنبش سے سب کو جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

زرینہ اپنے رہائشی حصے میں داخل ہونے ہی لگی تھی کہ حمیدہ اس کے پاس آگئی۔

''یہ سب کیا ہے زرینہ؟'' وہ بدحواس سی لگ رہی تھی۔

''یہ......؟'' وہ ہولے سے بولی۔ ''پتا نہیں۔'' پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''شاید بدقسمتی۔''

''زرینہ بڑے شاہ صاحب۔'' حمیدہ دبے دبے انداز میں گھبراہٹ کے ساتھ بولی۔

چوکھٹ پر زرینہ کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوگئی' لیکن صرف ایک لمحے کے لئے پھر وہ کسی بھی جانب دیکھے بغیر کمرے کے اندر چلی گئی۔ رجب علی نے مختصر سی یہ گفتگو پوری طرح سنی تھی اور نفرت کی چنگاری پھر آگ بننے لگی تھی۔ اس ان دیکھی لڑکی نے ایک عام سی تیسرے درجے کی ملازمہ کے سامنے اس کی بے عزتی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''شاید بدقسمتی۔''

زرینہ کے یہ الفاظ سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر گئے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت زرینہ کو ختم کر دے۔ ان دونوں کی گفتگو سے واضح تھا کہ یہ عام سی خادمہ اس کی بیوی کے ماضی کے راز سے واقف ہے۔ وہ اسے نام سے پکار رہی تھی' اس سے پوچھ رہی تھی کہ یہ اچانک کیا ہوگیا تھا۔

اپنے غصے پر بمشکل قابو پا کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ دانش مندی اسی میں تھی کہ ان کی گفتگو وقتی طور پر نظر انداز کر دی جائے۔

جب وہ اماں جان کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو یاسمین رو رہی تھی اور اماں جان اسے تسلی دے رہی تھیں۔ مہر النسا بھی وہیں تھی' اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر یاسمین نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔ رجب علی نے اسے نظر انداز کر دیا۔

''آؤ بیٹا۔'' اماں جان نے اس کے لئے اپنے قریب جگہ بنائی۔

''بیٹھوں گا نہیں' بس آپ کو سلام کرنے آیا تھا۔''

کچھ دیر تو ماں کے پاس بیٹھ جایا کرو۔''

وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''اماں جان! علی کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ اس کی گاڑی تو یہیں کھڑی ہے؟''

اس کا کیا پتا چلتا ہے کہ کب کہاں گیا۔'' اماں جان بولیں۔ ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''جی کہیے۔''

یاسمین اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

''جو کچھ ہوا میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گی' جو بیت گیا اس پر رونے کا کیا فائدہ۔'' اماں جان نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''تمہاری دوسری بیوی بہت خوبصورت ہے کہیں تم یاسمین سے کوئی زیادتی کوئی برا سلوک تو نہیں شروع کر دو گے؟''

اس کی نگاہوں کے سامنے چوکھٹ پر جمے دو گلابی مخروطی ہاتھ آ گئے' جن کی خوبصورتی کو اپنے غصے میں اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ واقعی ان ہاتھوں کی مالکہ بہت خوبصورت ہو گی۔

''رجب علی۔''

وہ جیسے ہوش میں آ گیا اور ہوش میں آتے ہی وہ گلابی ہاتھ تحلیل ہو گئے۔ اب پھر وہی نفرت تھی' وہی غصہ تھا۔

''اماں جان!'' اس کے انداز اور لہجے سے اس کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

''بس چند دن بعد آپ کو آپ کے سوال کا جواب مل جائے گا۔ میں بابا جان کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا' لیکن انہوں نے یہ فیصلہ عجلت میں کیا ہے۔ میں نے اب تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا اور نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر گلابی مخروطی ہاتھوں کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

''وہ خوبصورت ہے یا بدصورت' اس بات سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔

میں نے بہت مرتبہ بابا جان کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی کہ میرے آنے سے قبل وہ لڑکی وہاں موجود تھی کیوں' کیسے اس کی مجھے خبر نہیں' لیکن انہوں نے میری بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔''

''مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ کیسا رویہ رکھتے ہو' میں صرف اس قدر چاہتی ہوں' کہ یاسمین کا جو وقار اور مقام جو پہلے تھا' وہی اب بھی رہنا چاہیے۔ اس لڑکی کو میں نے یہاں رہنے کے آداب سمجھا دیئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ میں اسے یاسمین کی جگہ لینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اجازت ہے؟''

''ہوں۔''

اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر یاسمین کے ساتھ اس کے والد' رجب علی کے چچا بھی موجود تھے۔ یاسمین غالباً رو رہی تھی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے تسلی دے رہے تھے۔ رجب علی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر یاسمین نے آنسو صاف کر لیے۔

''آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وہ بولے۔

رجب علی کو خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں چلا آیا تھا۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ بلا مقصد اِدھر اُدھر کیوں گھوم رہا تھا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' رجب علی کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''مجھے معلوم ہے یہ بھی معلوم ہے' کہ تمہارے پاس اپنی بیوی کے لئے بھی وقت نہیں ہے۔ پہلے بھی نہیں تھا اور اب تو بالکل نہیں ہو گا۔''

''اگر آپ کو اس بات پر اعتراض ہے تو آپ اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جا سکتے ہیں۔'' اس کا انداز سفاکانہ تھا۔

''رجب علی!'' وہ غصے میں بھر گئے۔

''اس طرح بات کرنے کی اجازت میں نے بابا جان کے علاوہ کسی کو نہیں دی' آپ بھی یہ بات یاد رکھنا۔''

''بابا جان!'' یاسمین نے اضطراب کے عالم میں باپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ان کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ رجب علی ایک نظر دونوں باپ بیٹی پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

''اماں میں حویلی جا کر ایک نظر اسے دیکھ آؤں۔'' رضیہ منت کر رہی تھی۔

''خبردار! جو وہاں جانے کا نام بھی لیا تم نے۔'' اماں نے دبی آواز میں اسے ڈانٹا۔

''وہ وہاں اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکے گی' وہ مر جائے گی۔'' وہ رونے لگی۔

''مر جانے دو۔'' اماں کو مزید غصہ آ گیا۔ ''جو کچھ بھی اس پر بیتے گا وہ اس کے اپنے کئے کی سزا ہے۔''

''وہ حویلی سے بہت ڈرتی تھی' اس کی دیواروں اور اس کی بلندی سے۔ اماں! میں سچ کہہ رہی ہوں وہاں اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اس نے چھوٹے شاہ صاحب......!''

''بکواس بند کرو۔'' وہ طیش میں آ گئیں۔ ''اب نام لیا چھوٹے شاہ صاحب کا تو زبان کاٹ کر رکھ دوں گی۔ وہ بڑے شاہ صاحب کی بیوی ہے اور بس۔ اب ہر پرانی بات ختم ہو گئی ہے۔ وہ بڑے شاہ صاحب کی عزت ہے اور اسے حویلی میں اسی طرح رہنا ہو گا جیسے بیبیاں رہتی ہیں۔''

☆======☆======☆

''اسے حویلی سے وحشت ہوتی تھی اور اب وہ ہمیشہ کے لئے اس حویلی میں دفنا دی گئی ہے۔'' حیدر علی سوچ رہا تھا کتنے خوف زدہ ہو کر اس نے کہا تھا۔

''شاہ جی میں حویلی نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''مجھے حویلی دیکھ کر وحشت ہونے لگتی ہے دم گھٹنے لگتا ہے میرا۔ مجھے لگتا ہے وہاں کمرے نہیں۔'' اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ برگد کے پتوں کے درمیان سے آسمان پر بکھرے ستارے کھوجنے لگی تھی۔

اور پھر کتنی مشکل سے اس نے بتایا تھا۔

''مجھے وہ کمرے نہیں' قبریں لگتی ہیں۔ زندہ انسانوں کی قبریں' جہاں لاشیں چلتی پھرتی ہیں لگتا ہے یہ قبریں اتنی گہری ہیں کہ ان میں روشنی ہوا اور آزادی کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ لگتا ہے کہ ہر کمرے میں روحیں پھڑ پھڑا کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہی ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے وہاں۔ خدا کے لئے شاہ جی مجھے وہاں مت لے جانا۔ آپ کو پا لینے کے بعد یہی ایک خواہش ہے میری میں حویلی میں نہیں جانا چاہتی' اس کے علاوہ میری کوئی تمنا نہیں ہے۔''

اور اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اپنا الگ گھر بنائے گا' اسے حویلی کے دم گھونٹ دینے والے ماحول سے دور رکھے گا۔ وہ تو رجب علی کی شادی میں بھی اسی لئے شریک نہیں ہوئی تھی کیونکہ حویلی کے ذکر سے ہی اسے وحشت ہونے لگتی تھی۔ وہاں چند لمحے گزارنے بھی اسے گوارا نہیں تھے۔

اور اب جیتے جی وہ کبھی بھی حویلی سے باہر نہیں آ سکتی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ ایسے ماحول میں وہ زیادہ عرصے تک نہیں جی سکے گی' لیکن اب اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا' سوائے چند یادوں کے جو ہر لمحہ ہر پل اس کے ساتھ تھیں۔

وہ وقت جب اس نے گوری کی سنہری جلد والی حسین گردن میں سونے کی زنجیر ڈالی' سرخ رنگ کی چنری اس کے سر پر رکھی تھی اور پرفیوم کی پوری بوتل اس کے اوپر انڈیل دی تھی۔

اور پھر جاتے ہوئے گوری نے وہ زنجیر اسے تھما دی تھی۔

''یہ میں تمہارے لئے لایا تھا تاکہ سدا تمہاری مرمریں گردن میں چمکتی رہے۔''

''اس کی چند کڑیاں الگ کر کے مجھے دے دیں باقی اپنے پاس رکھ لیں۔'' گوری نے کہا تھا۔

''وہ کس لئے؟''

''تاکہ آپ کی نشانی میرے پاس رہے پھر جب ہم دونوں مل جائیں گے تو ان کڑیوں کو جوڑ کر دوبارہ زنجیر مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد میں اسے کبھی اپنے گلے سے الگ نہیں کروں گی۔''

''ایسا ہی سہی۔''

اور اس نے خود اسے زور لگا کر زنجیر دو حصوں میں تقسیم کر دی تھی۔ چھوٹا حصہ گوری کو تھما دیا

تھا اور بڑا اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

''یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ شادی کے بعد تمہیں تمہاری یہ امانت مل جائے گی۔''

اور یہ بات سن کر گوری ہنس پڑی۔ اس کے ہنسنے سے فضا میں چاروں طرف دھنک رنگ بکھر گئے تھے۔

اور وہ ہر وقت خوف زدہ بھی تو رہتی تھی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے بہت پہلے اسے آنے والے وقت سے خبردار کر دیا تھا وہ جب بھی اسے یقین دلاتا تھا تو وہ پہلے سے بڑھ کر خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

''پتا نہیں یقین کیا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میرے گرد تو خوف نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں' جدائی کے خوف نے تقدیر میں کیا لکھا ہے' میں اس بات کو کیا جانوں۔''

اور ایک مرتبہ اس نے یہ بھی تو کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے جیسے میرا مقدر کہیں اور جڑا ہوا ہے۔''

ایسے میں اس کی ہر یقین دہانی بے کار ہو جاتی تھی' ساری تسلیاں یونہی رہ جاتی تھیں۔

لیکن اس وقت وہ بہت خوش ہوئی تھی جب سائیں بابا نے کہا تھا۔

''میں تجھے حویلی کی بہو بنے دیکھ رہا ہوں' لیکن ایسے کہ تیرے تن پہ نہ سرخ جوڑا ہے نہ گلے میں زیور' نہ ڈھول تاشے ہیں نہ باجے گاجے۔ بہت سی آہیں' بہت سی سسکیاں ہیں۔''

اور اس پر بھی وہ خوش ہو گئی تھی۔ گوری کو اس کا ساتھ چاہیے تھا اور کچھ بھی نہیں۔ نہ سرخ جوڑا' نہ زیور' نہ دھوم دھام نہ حویلی۔

دن ڈھل رہا تھا' اندھیرا ہر طرف سے یلغار کر رہا تھا۔ جب ندی میں بہنے والی لہروں کو اندھیرے نے نگل لیا تو وہ چونک گیا۔ وقت کیسے گزرا تھا' اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ ویسے ہی جیسے گوری کی موجودگی میں پر لگا کر اڑا کرتا تھا۔

اسی طرح آج اس کی یادوں کے درمیان بھی لمحے بیتنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں سے حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ چلتے چلتے پرانے کنوئیں کے قریب پہنچ کر اس کے قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔ یادوں کی کسک ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھی تھی۔ برگد کی جٹائیں جھولتے ہوئے گنگنا رہی تھیں۔

کلیاں چٹکیں' غنچے مہکے
رنگ برنگے پنچھی چہکے
اپنی اپنی باتیں کہہ کے
کون بتائے کہاں گئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
چھڑی ہوئی ہے کتھا سہانی

ایک کہانی سب کی زبانی
کچھ انجانی' کچھ من مانی
پَل پَل چھِن چھِن رنگ نئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے
دُکھ کے دن اور سکھ کی راتیں
ہونی یا اَن ہونی باتیں!
آنکھ سے اب تک بھید چھپے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے

اس میں یادوں کی کسک سہارنے کی مزید ہمت نہیں تھی' اس لئے وہاں سے چل پڑا۔ حویلی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ڈیرے میں بھی پاگل کر دینے والی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

''کہاں جاؤں؟'' وہ سوچ رہا تھا۔

لیکن کوئی اور پناہ گاہ بھی تو نہیں تھی' اس لئے تھکے ہوئے قدموں سے حویلی کی طرف ہی چل دیا۔

حویلی کے وہی در و بام جو کبھی اپنے اپنے لگتے تھے آج بہت اجنبی لگ رہے تھے' یوں جیسے پل بھر کی شناسائی بھی نہ ہو۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ مسہری پر لیٹ گیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

''اسی چھت کے نیچے ایک کمرے میں گوری بھی ہوگی۔'' اس نے سوچا۔ ''پتا نہیں کیا کر رہی ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھے اس شدت سے یاد کر رہی ہوگی؟ جس شدت سے میں اسے یاد کر رہا ہوں' ہاں یقیناً۔ لیکن نہیں اسے مجھے یاد نہیں کرنا چاہیے' کہیں اپنے پاگل پن میں وہ بھائی جان سے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے۔ اوہ نو!'' وہ اٹھ بیٹھا۔ ''مجھے اپنی پروا ہے' لیکن میں اسے زیبی آپی کی طرح مرتے نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا اور مہرالنسا کی خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی جاگی ہوئی تھی اور اپنی ملازمہ حمیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئیں۔ حمیدہ اٹھ کر باہر نکلنے لگی۔

''تم یہاں قریب ہی رہنا۔'' مہرالنسا نے اس سے کہا۔

حیدر علی اس کے قریب بیٹھ کر کتنی دیر تک مناسب الفاظ تلاش کرتا رہا۔

''زرینہ کے متعلق کچھ کہنے آئے ہو؟'' مہرالنسا نے خاموشی توڑتے ہوئے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''ہوں'

''تو پھر کہو چپ کیوں ہو؟''

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں؟'' پھر چند لمحے کے توقف کے بعد ہولے سے بولا۔ ''آپا میں چاہتا ہوں کہ وہ بھائی جان کے سامنے ہمارے آپس کے تعلقات کا ذکر نہ کرے۔''

''ڈرتے ہو؟'' اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' اس نے اپنے اندر ابلتے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ گوری کو کوئی نقصان پہنچے۔''

''گوری؟ لیکن اب تو وہ زرینہ بن چکی ہے' زرینہ بھابی۔''

''آپا! آپ میرا یہ کام کر سکتی ہیں یا نہیں؟'' اس نے حتمی انداز میں پوچھا۔

''ذاتی طور پر نہیں' ہاں کروا سکتی ہوں کیونکہ مجھے اس کی نہیں تمہاری پروا ہے۔'' وہ بولی۔ اور پھر حمیدہ کو طلب کیا۔ ''چھوٹے شاہ صاحب جو کام بتائیں وہ کر دو۔''

حمیدہ ایک طرف نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ حیدر علی نے گہرا سانس لیا۔ پھر کاغذ قلم لے کر سوچنے لگا۔

''کیا لکھوں؟''

الفاظ نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ ذہن بالکل خالی لگ رہا تھا۔ پھر بالآخر وہ قلم کو کاغذ پر گھسیٹنے لگا۔

''گوری!

ہمیشہ خوش رہو!

آج بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں' لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ اس وقت تو فقط یہ خیال باقی ہے کہ ہمارے درمیان جو بھی رشتہ تھا' وہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی تھی' لیکن تم نے ٹھیک کہا تھا کہ تمہارا مقدر کہیں اور جڑا ہوا تھا۔ یہ تو ہم دونوں تھے جو اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے کسی صورت تیار نہیں تھے۔

کل تک مجھ میں جذبے تھے' حوصلہ تھا' تمہیں اپنا لینے کا جذبہ اور سب سے ٹکرا جانے کا حوصلہ۔ آج میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے' سوائے پچھتاوے کے۔ یہ پچھتاوا کہ کاش میں تمہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتا۔ کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی اور ہم فوراً شہر چلے گئے ہوتے۔ کاش پرانا وقت' صرف ایک پچھلی رات لوٹ آئے۔

لیکن وقت کا پہیہ الٹا چلانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی کے اختیار میں نہیں ہے اور یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہے۔

مگر گوری میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ وقت گزرتا ہے' تو اس کی دھول

میں بہت کچھ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جو چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے' آہستہ آہستہ ذہن سے بھی محو ہو جاتی ہے۔ یہ شاید اچھا ہی ہے' ورنہ زندہ رہنا صرف ایک سزا بن جائے۔

تم سے اتنی درخواست ہے گوری کہ وہ سب کچھ جو بیت چکا ہے اسے شعوری طور پر بھلانے کی کوشش کرو۔ حقیقت کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے' لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ میرے لئے کیا تم اتنا کر سکتی ہو کہ خوش رہو اور بھائی جان کے سامنے اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق کچھ مت کہو؟

میری سب دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے راستے میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھیر دے۔

تمہارا حیدر علی شاہ''

کاغذ تہہ کرنے سے پہلے اس نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی تحریر پر ڈالی۔

''تمہارا حیدر علی شاہ!'' پر اس کی نظریں ٹک گئیں۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے ''تمہارا'' کاٹ دیا اور کاغذ حمیدہ کی طرف بڑھا دیا۔

حمیدہ بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''آپ گوری سے ملیں؟'' حیدر علی نے پوچھا۔

''علی! اسے اپنے اعصاب پر اس طرح سوار مت کرو۔ تم نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا ہے؟ یوں لگتا ہے جیسے نہ جانے کتنے میلوں کی مسافت کی دھول تمہارے چہرے پر ہو۔''

''میں اسے نہیں بھلا سکتا آپا۔''

''مت بھولو' کہ اب وہ تمہاری بھابی ہے' تمہارے بھائی کی عزت ہے اور بھائی کے حوالے سے تمہاری بھی عزت ہے۔ بھابی کا مقام بہت جدا ہوتا ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں آپا! لیکن اسے یاد رکھنا یا بھول جانا کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

''یاد ہے بہت پہلے ایک مرتبہ تم نے زیبی سے کہا تھا۔'' مہر النسا کہتے کہتے چند ثانیے کے لئے خاموش ہوگئی۔ زیبی کے ذکر سے وہ ایک دم ہی افسردہ ہوگئی تھی۔

''اس نے کہا تھا' کہ ہمیشہ رہنے والی محبت تو بہت پریشان کن بات ہے۔ یہ محبت نہیں رہتی روگ بن جاتی ہے۔''

''اور علی! تم نے اس سے کہا تھا' کہ تم محبت کو روگ بنانے کے قائل نہیں ہو۔ تمہیں خستہ حال قسم کے عاشقوں سے وحشت ہی نہیں بلکہ نفرت محسوس ہوتی ہے۔ تم نے کہا تھا' کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو معاشرے کی چند فرسودہ روایات میں خود کو جکڑ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ

دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو درحقیقت محبت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ وہ بزدل ہوتے ہیں اور تم بزدلوں کو پسند نہیں کرتے۔

بزدلی علی صرف یہ نہیں ہوتی بلکہ اپنی شکست تسلیم نہ کرنا بھی بزدلی ہی ہوتی ہے۔ اب جب تقدیر کا فیصلہ تمہارے خلاف ہوگیا ہے' تو تم نے کیوں روگ بنا لیا محبت کو؟ زندگی صرف ایک زرینہ کے نہ ملنے سے ختم تو نہیں ہو سکتی' اپنی شکست پر رونے کی بجائے اسے حوصلے سے قبول کر لو علی' اسی میں تمہاری بہتری ہے۔''

''جب میں نے زیبی آپی سے بات کی تھی' اس وقت تک میں کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوا تھا مجھے پتا ہی نہیں تھا' کہ تدبیر محض تدبیر ہوتی ہے' لیکن تقدیر حرفِ آخر ہوتی ہے۔ کل رات تک میرا ابھی یہی خیال تھا' لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مقدر تھا جسے تبدیل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

''تب ہی تو' کہتی ہوں کہ جب یہ جانتے ہو کہ مقدر بدل نہیں سکتے تو اپنی شکست کو بھی تسلیم کر لو۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے علی کہ بھائی جان نے یہ شادی دل سے قبول کر لی ہے؟'' مہر النسا نے پوچھا۔

اگر میں' گوری کو نہ جانتا تو ضرور کہتا کہ نہیں' لیکن آپا گوری میں پتا نہیں کیا سحر ہے کہ اسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہاں انہوں نے یقیناً یہ شادی دل سے قبول کر لی ہے۔ گوری شاید ایسا نہ کر سکے' لیکن بھائی جان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ہے۔ آج جب بھائی جان اماں جان کے پاس آئے' تو میں وہیں تھی۔''

''کچھ کہا انہوں نے گوری کے متعلق؟'' اس کی بے تابی واضح تھی۔

وہ قدرے سوچ کر بولی۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ اب تک انہوں نے زرینہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ وہ شادی کسی صورت نہیں کرنا چاہتے تھے' کیوں؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ شادی تو بابا جان نے زبردستی کروائی ہے۔''

''وہ زرینہ کو ایک مرتبہ دیکھیں گے تو ہر بات بھول جائیں گے۔'' اس نے بہت آہستگی سے جیسے خود سے کہا پھر' اچانک اسے خیال آیا۔

''حمیدہ نہیں آئی' بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''آتی ہی ہوگی۔'' مہر النسا نے کہا۔

وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ لمحے دبے پاؤں سرکتے گئے۔ بالآخر حمیدہ آگئی۔

اس کی مٹھی میں ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ حیدر علی متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا
''جی یہ!'' اس نے نظریں چراتے ہوئے مٹھی کھول دی' جس میں حیدر علی کا دیا ہوا خط تھا۔
''بی بی کہہ رہی تھیں کہ یہ شاید کسی اور کی چٹھی ہے' جو میں غلطی سے انہیں دے رہی ہوں کیوں کہ نہ وہ کسی گوری کو جانتی ہیں اور نہ ہی کسی......!'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
حیدر علی کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے خاموشی سے وہ خط اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔
''میں کس بات پر دکھی ہو رہا ہوں۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔ ''یہ تو اچھا ہے کہ وہ مجھے بھولنا چاہ رہی ہے' یہی تو میں بھی چاہتا ہوں' یہی تو میں نے اسے کہا تھا کہ جو کچھ بیت گیا' اسے شعوری طور پر بھلانے کی کوشش کرے' پھر اب اس کے الفاظ نے مجھے اندر تک کیوں کاٹ کر رکھ دیا ہے۔'' وہ سوچتا رہا۔ ''اس وقت اسی چھت کے نیچے کسی کمرے میں وہ بھی ہوگی' اپنے شوہر کے ساتھ۔''
یہ احساس اتنا تکلیف دہ تھا کہ رات کاٹنی اس کے لئے مشکل ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

حمیدہ کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ پہلے زیب النسا کا صدمہ تھا اور اب زرینہ کا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ منظر نہیں ہٹ رہا تھا' جب اس نے حیدر علی کا خط اسے تھمایا تھا۔
''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔
اس کے انداز میں اتنی بے نیازی اور لاتعلقی تھی کہ حمیدہ سمجھ ہی نہ سکی کہ اس کا ذہن کس ڈگر پر چل رہا ہے؟
''یہ تمہارے لئے۔ میرا مطلب ہے آپ کے لئے ہے۔'' اس نے جلدی سے تصحیح کی۔
''چھوٹے شاہ صاحب نے بھیجا ہے۔'' اس کے چہرے پر سرد مہری اور لاتعلقی کی دھند اور گہری ہو گئی تھی۔
''ان سے میرا کیا تعلق ہے؟''
وہ بولی تو اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں تمام بناوٹی بے نیازی اور سرد مہری پل بھر میں غائب کر دی تھی۔
''میں تو حکم کی غلام ہوں' انہوں نے کہا اور میں یہاں چلی آئی۔''
''میں انہیں نہیں جانتی۔ ان کا کوئی پیغام لانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا تھا۔
''اچھا!'' وہ جانے کے لئے مڑ گئی۔
''رکو حمیدہ۔''
وہ دروازے تک پہنچی تھی کہ زرینہ کے الفاظ نے اس کے قدم روک دیے۔

''خط دے دو۔'' اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے صرف اسی قدر کہا۔
اس کا لہجہ خود سے ہونے والی جنگ میں شکست کھا جانے کی چغلی کھا رہا تھا۔ خود پر جو بند باندھنے کی کوشش میں وہ مسلسل مصروف تھی۔ وہ جذبوں کی شدت سے ٹوٹ گیا تھا اپنے اندر ہونے والی جنگ میں اس نے خود اپنے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔
حمیدہ نے خاموشی سے خط اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ وہ جذبات اعتدال پر لانا چاہ رہی تھی۔ کتنی دیر تک خط تھامے وہ ہاتھ کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت دل مضبوط کر کے اس نے کاغذ کی تہیں کھولی تھیں' لیکن تحریر پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنے آپ میں نہیں رہی تھی اور بری طرح سے رو پڑی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی' لیکن حمیدہ سمجھ سکتی تھی کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ اس نے زرینہ کو تسلی دینے کی بہت کوشش کی لیکن آنسو پونچھ لینا اس کے بس میں کہاں تھا۔ کتنی مشکل سے خود پر قابو پا کر اس نے خط پڑھا تھا۔
''سنو حمیدہ! اس وقت جو کچھ ہوا' وہ شاہ جی کو مت بتانا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے دل میں ان کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے' وہ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے' لیکن میں کیا کروں' خوش رہنا میرے بس میں نہیں ہے' لیکن۔'' وہ چند ثانیے کے لئے خاموش ہو گئی۔ ''لیکن انہیں کچھ نہ بتاؤں' یہ میرے بس میں ہے۔
حمیدہ! تم ان سے صرف اتنا کہنا کہ شاید یہ خط غلطی سے میرے پاس آ گیا ہے کیوں کہ نہ میں کسی گوری کو جانتی ہوں اور نہ حیدر علی شاہ کو۔''
''تم نے ان کی حالت نہیں دیکھی زرینہ!''
''انہیں دیکھنے کی لئے مجھے ان دو آنکھوں کی ضرورت نہیں ہے حمیدہ۔'' اس نے بات کاٹ دی تھی۔
''ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے جیتے تھے' جیتے ہیں' انہیں دیکھے بغیر میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم ان سے وہی کہو' جو میں نے کہا ہے۔ میں انہیں کسی خلش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔ ان تمام دوریوں کے باوجود ہم ایک دوسرے سے دور نہیں ہو سکتے' لیکن ہمیں ایک دوسرے سے دور ہونا چاہیے' میں اپنے لئے نہیں خود ان کے لئے' ان سے دور ہونا چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے میری مدد کرو حمیدہ اور ان سے صرف وہ کچھ کہو' جس کے لئے میں نے تمہیں کہا ہے۔''
اور حمیدہ کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا تھا' لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

☆======☆======☆

ویسے میں بھی وہ دھوم دھام نہیں تھی جیسا کہ حویلی کا خاصہ تھا۔ زیب النسا کے چالیسویں کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ تقریب بے حد سادہ تھی۔ زرینہ دلہن بنی ہوئی تھی' اس کے گرد ہجوم تھا' لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس ہجوم میں بھی وہ بے حد تنہا تھی۔ تب ہی اس کی نگاہ اماں اور

رضیہ پر پڑی۔ اس کا دل چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اماں کے گلے لگ جائے آنکھیں بند کر لے تا کہ یہ سارا منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے' پھر اس منظر کے تحلیل ہوتے ہی وہ ایک نیا منظر تخلیق کر لے۔

بہت مشکل سے اس نے اپنی اس شدید خواہش پر قابو پایا۔ اماں وہیں دوسری عورتوں کے درمیان ٹھہر گئیں۔ مجبوراً رضیہ کو بھی وہیں رکنا پڑا۔ عورتیں انہیں مبارک باد دے رہی تھیں' وہ مسکرا کر قبول کرتی جا رہی تھیں۔

لیکن یہ زرینہ ہی جانتی تھی کہ وہ مسکراہٹ درحقیقت کتنی مصنوعی تھی اور اس میں کتنے تفکرات چھپے ہوئے تھے اور وہ زبردستی وہاں آئی تھیں کیوں کہ آئے بنا چارہ نہیں تھا لیکن احساسِ جرم اور احساسِ کمتری کے مارے وہ حویلی کی عورتوں سے آنکھیں بھی نہیں ملا رہی تھیں۔

یاسمین تو وہاں موجود نہیں تھی' لیکن اماں اور مہر النسا کا انداز یہ بتا دینے کے لئے کافی تھا کہ وہ انہیں گرم جوشی سے خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ زرینہ نے اپنی توجہ اس طرف سے ہٹالی تھی' اسے معلوم تھا کہ وہ اس مسئلے پر زیادہ دیر تک سوچتی رہی تو پاگل ہو جائے گی۔ شاید چیخنے چلانے اور در و دیوار سے سر ٹکرانے لگے۔ اس لئے عافیت اسی میں تھی' کہ سب کچھ ذہن سے نکال دے' پھر وہیں رہتے ہوئے وہ سب سے بے تعلق ہو گئی۔ یوں جیسے اس کے گرد اتنا بڑا ہجوم نہ ہو بلکہ وہ بالکل تنہا ہے۔ کتنی دیر گزر گئی' اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب اسے وہاں سے اٹھایا جانے لگا۔

اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے گہرا سانس لیا اور سنہری دوپٹا اتار کر بستر پر پھینک دیا۔

''زرینہ!''

اپنے پیچھے رضیہ کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

''میں اندر آ جاؤں؟''

''تمہیں اجازت لینے کی ضرورت ہے کیا؟''

''پتا نہیں' اصل میں بہت کچھ بدل گیا ہے ناں۔''

''کیا بدلا ہے؟'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''تم' تم نہیں رہی اور وہ بھی۔'' رضیہ خادماؤں کی موجودگی کا احساس کر کے خاموش ہو گئی۔

''تم لوگ جاؤ۔'' زرینہ نے ان سے کہا۔

''جی بی بی آپ کا کھانا رکھا ہوا ہے۔'' ایک نے کہا اور پھر وہ دونوں باہر نکل گئیں۔ زرینہ چند ثانیے رضیہ کو دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار اس کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کتنا وقت بیت گیا ان دونوں کو ہی خبر نہیں ہوئی۔

''وہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکے ناں' بیچ منجدھار میں چھوڑ گئے۔''

''نہیں رضیہ ایسا مت کہو' ان سے جو ہو سکا انہوں نے کیا' لیکن قسمت پر کس کا زور ہے۔''

وہ دونوں مسہری پر بیٹھ گئیں۔

''اب مجھے پتا چلا ہے کہ سائیں بابا کا کہنے کا مطلب کیا تھا۔ ٹھیک کہا تھا انہوں نے' میں دکھ پر خوش ہوتی رہی' رونے والی بات پر ہنستی رہی' وہی ہوا ناں جو انہوں نے کہا تھا۔ حویلی کی بہو تو بن گئی' سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہو کر' آہوں اور سسکیوں کے درمیان' ایک لمحے کے لئے بھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ خوشی حویلی کی بہو بننے پر نہیں شاہ جی کی بیوی بننے پر منانا چاہیے تھی اور اب تو ساری زندگی کی آہیں اور سسکیاں ہیں۔''

''بڑے شاہ صاحب تمہارے پاس آئے؟''

''نہیں' میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں کہ نہ آئیں اب تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہیے اور کیا نہیں۔'' آنسوؤں نے پھر اس کی آنکھیں دھندلا دیں۔

''کیا وہ سب باتیں جانتے ہیں؟''

''پتا نہیں' میں نے بہت مرتبہ شاہ جی سے کہا تھا کہ ان سے کہیں' وہ پیر صاحب سے ہماری سفارش کریں۔ شاہ جی نے انہیں میرے اور اپنے متعلق بتایا بھی تھا۔''

''پھر تو وہ جانتے ہوں گے؟'' رضیہ فکر مند ہو گئی۔

''مجھے اپنی پروا نہیں ہے' شاہ جی کی فکر ہے' انہیں کسی صورت یہ گوارا نہیں ہو گا کہ ان کی بیوی کبھی ان کے بھائی کی محبوبہ رہی ہو۔ ٹھیک ہے یہ شادی ان کے لئے بھی زبردستی کا بندھن ہے' مگر اب تو بندھ گیا ہے۔ وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''میرا دل کانپ رہا ہے زرینہ۔'' وہ بولی۔ ''وہ ضرور جانتے ہوں گے۔''

''پتا نہیں' لیکن کل شاہ جی نے مجھے پھر رقعہ بھجوایا تھا۔''

''کیا؟'' رضیہ گھبرا گئی۔ ''کیوں؟''

''یہ کہنے کے لئے کہ میں گزرے ہوئے کل کو بھول جاؤں اور خوش رہنے کی کوشش کروں۔''

''ہونہہ! کتنی آسانی سے یہ مشورہ دے دیا انہوں نے تمہیں۔''

''نہیں رضیہ! تم انہیں نہیں جانتیں' میں جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ انہوں نے دل پر کیسے پتھر رکھا ہو گا۔ وہ کس عذاب کس اذیت سے گزر رہے ہوں گے۔''

''کیا انہیں خیال نہیں ہے کہ بڑے شاہ صاحب کو خود ہی ہر بات کا اندازہ ہو جائے گا۔''

''میں نے سوچا تھا۔'' وہ بولی۔ ''مجھے خیال آیا کہ شاہ جی مجھے ہمیشہ گوری کہتے ہیں' ممکن ہے' انہوں نے ان کے سامنے کبھی میرا نام نہ لیا ہو' گوری ہی کہتے ہوں۔''

''اگر ایسا ہوا تو یہ اچھا ہی ہے۔''

پتا نہیں کہ اتنے برے کے بیچ کچھ اچھا بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''اور تم نے اس رقعے کا کیا جواب دیا؟''

''میں نے خود پر بہت بند باندھے تھے۔ سوچا تھا کہ قسمت میں جتنا رونا تھا' وہ تو میں شادی والی رات ہی رو چکی ہوں' اب یوں بھی آنسو بچے ہی کہاں ہوں گے لیکن ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ کا وہ ٹکڑا تھامتے ہی میرا ضبط جواب دے گیا۔ اتنی شدت سے احساس ہوا کہ اب ہر چیز بدل گئی ہے۔ ہر خواب' ہر تمنا' ہر خواہش فنا ہو گئی ہے' ہر رشتہ ہر تعلق بدل گیا ہے' پہلے آنکھیں بند کرتے ہی ان کی صورت سامنے آ جاتی تھی' اب اس خوف کے مارے میں آنکھیں ہی بند نہیں کرتی کہ اب کسی اور کے متعلق سوچنا بھی گناہ ہے اور جس کے متعلق مجھے سوچنا چاہیے' اس کے لئے میرے دل میں مزید نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پہلے میں ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو لیتی تھی' ان کے لئے ہنستی تھی ان کے لئے روتی تھی۔

لیکن اب دوریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ایک چھت تلے رہنے کے باوجود میں انہیں دیکھ بھی نہیں سکتی اور دیکھ لوں تو احساسِ گناہ کب پیچھا چھوڑے گا۔

یہ سب خیال آتے ہی میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہی' بے بسی کا احساس مجھے مار رہا تھا۔ میں اپنے آپ میں مر رہی تھی۔'' وہ خاموش ہو گئی۔

''پھر؟''

''ان کی شادی ہونے والی ہے ناں؟ انہیں یہ شادی کر لینی چاہیے۔'' وہ بولی۔ ''اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ شاید یہ کسی اور کا رقعہ ہے' جو شاید غلطی سے مجھ تک پہنچ گیا ہے' ورنہ میں نہ کسی گوری کو جانتی ہوں اور نہ حیدر علی شاہ کو۔

مجھے رجب علی شاہ سے اتنی شدید نفرت ہے کہ یہ بات کہنے کی وجہ اس کی عزت کا پاس کرنا نہیں تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں خود حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہتی تھی اور یہی شاہ جی کے لئے بھی چاہتی تھی۔ نہ ان دوریوں کو بانٹنا ہمارے اختیار میں ہے اور نہ وقت کا پہیا الٹا چلانا ہمارے بس میں ہے' اس لئے ہمیں سب کچھ بھول جانا چاہیے۔

میں شاہ جی کو کچھ نہیں دے سکتی تو ان کی زندگی کو لاحاصل کے بیابان میں بھٹکنے کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتی۔'' رضیہ نے محسوس کیا کہ اپنی صاف گوئی میں وہ خود کو بھی اذیت دے رہی تھی' اپنے جسم میں آپ ہی نشتر چبھو رہی تھی اور اس تکلیف کو پورے شعور کے ساتھ محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''بڑے شاہ صاحب تمہارے پاس آئیں گے تو کیا تم انہیں کچھ بتاؤ گی۔'' رضیہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شاید شاہ جی کا نام لئے بغیر سب کچھ بتا دیتی' لیکن اب ان کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔ میرا اور رجب علی کا رشتہ ایسا ہے کہ میں اسے اپنا جسم دینے سے انکار نہیں کر سکتی' لیکن میرے دل اور میری روح تک وہ کبھی نہیں پہنچ سکتا۔''

''تم خود کو اذیت دے رہی ہو زرینہ۔''

اس نے کچھ نہیں کہا اور اپنے زیور اتارنے لگی۔

''آج شاید چھوٹے شاہ صاحب نے ولیمے میں شرکت نہیں کی۔''

رضیہ نے کہا تو بالوں میں اٹکے ہوئے جھومر کو اتارتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے۔

''جب ہم یہاں آ رہے تھے تو وہ دوسری سمت میں جا رہے تھے۔''

''ہوں۔'' اس نے اور کچھ نہیں کہا۔

''یاسمین کو دیکھا تھا تم نے؟'' رضیہ نے پوچھا۔

''نہیں تو' وہ وہاں کب آئی تھی؟''

''آئی تو تھی' لیکن تم اپنے آپ میں نہیں تھیں۔'' وہ بولی۔

''بس تھوڑی دیر کے لئے آئی تھی تاکہ سب کو یہ باور کرا سکے کہ بڑے شاہ صاحب کی دوسری شادی نے حویلی کے رشتوں میں دراڑیں نہیں ڈالیں' لیکن اس کا اترا ہوا چہرا اور سوجی ہوئی آنکھیں' وہ سب باتیں کہہ رہے تھے' جو وہ زبان سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔

''مجھے اس سے ہمدردی ہے' لیکن اس سے زیادہ اس کے لئے میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' اس نے خود کو لاتعلق ظاہر کرنا چاہا تھا۔

''اس سے زیادہ تو تمہیں ہمدردی کی ضرورت ہے۔''

''تم تو آتی رہو گی ناں ملنے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کل بھی اماں کی منتیں کرتی رہی' لیکن انہوں نے آنے کی اجازت نہیں دی پتا نہیں اب بھی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ حویلی کی باقی عورتوں سے کوئی تفصیلی ملاقات ہوئی؟''

''تفصیلی تو نہیں' البتہ جو مختصر سی ملاقات تھی' وہی کافی تھی۔''

''مجھے اندازہ ہے کہ اس دوران کیا بات چیت ہوئی ہو گی۔'' رضیہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا تم سے کہ یہ سب تمہیں اپنے برابر مقام دینے پر تیار نہیں ہوں گی۔''

''مقام دلوانا اس شخص تک ہوتا ہے' جس سے بندھن بندھتا ہے۔ شاہ جی کی بات اور تھی۔'' وہ ایک لمحے کے لئے رکی۔

''اور میں تو یوں بھی دوسری بیوی ہوں' ایسی بیوی جو مسلط ہو گئی ہے خواہ مخواہ۔''

وہ پھر اپنے آپ کو اذیت دینے پر تل گئی تھی۔

''تم خود پر ظلم کر رہی ہو' ایسی باتیں کر کے۔''

''تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟'' اس نے رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''تمہارے انداز میں سفاکی ہے۔''

''حقیقت ہی کہی ہے۔'' وہ بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ'' زرینہ نے کہا۔

ایک خادمہ اندر داخل ہوئی۔

''رضیہ بی بی کو آپ کی اماں بلا رہی ہیں۔''

رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں کوشش کروں گی آنے کی' پر وعدہ نہیں کرتی۔''

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''مجھے پتا ہے میں' اماں ابا کے لئے پرائی ہوگئی ہوں۔''

اسے پیار کر کے رضیہ باہر چلی گئی۔

''بی بی! کھانا تو ٹھنڈا ہو گیا ہے۔'' خادمہ نے کہا۔ ''دوسرا لے آؤں؟''

''نہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''اب میں آرام کروں گی' کوئی خاص بات نہ ہو تو مجھے تنگ مت کرنا۔''

''جی بہتر۔'' خادمہ باہر نکل گئی۔

''چند دن پہلے تک یہ میرا نام لیتی تھی' مجھ سے ہنستی بولتی تھی۔'' اس نے سوچا۔ ''قدرت کی ستم ظریفی ہے۔''

وہ جان بوجھ کر اپنی سوچوں کو ایسی باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

چوکھٹ پر جمے وہ دو گلابی ہاتھ مسلسل رجب علی کا پیچھا کر رہے تھے اور اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔

''میں اس قدر کمزور تو نہیں ہوں کہ انہیں اپنے ذہن سے جھٹک ہی نہ سکوں۔ نہیں وہ ایک ایسی لڑکی کے ہاتھ ہیں جو میری نہیں ہے' جو نہ جانے کس کے ساتھ کون سا تعلق جوڑنے جا رہی تھی کہ قدرت اسے میرے راستے پر لے آئی۔

اگر مجھے اپنی عزت کا پاس نہ ہوتا تو ڈیرے کے ملازمین سے یہ بات با آسانی معلوم کی جاسکتی ہے کہ یہ لڑکی کس کے ساتھ آئی تھی' لیکن اپنے آپ کو اس حد تک گرانا مجھے گوارا نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی ہو' میری بیوی بنا دی گئی ہے اور اپنی بیوی سے متعلق ملازمین سے چھان بین کرنے کو میری غیرت کیسے گوارا کر سکتی ہے۔

پتا نہیں گاؤں میں کس کس کو اس کے معاشقے کا علم ہوگا اور لوگ کیا کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ اس کا جرم نا قابلِ معافی ہے۔ وہ اپنی راہ پر چلتی جاتی تو کوئی حرج نہیں تھا یا پھر باقی لڑکیوں کی طرح میرے راستے میں آکر دبے قدموں گزر جاتی۔ یہ اس کی غلطی نہیں جرم ہے اور اس حرکت کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔''

لیکن اس کے تصور میں پھر وہ گلابی ہاتھ ابھر آئے۔ وہ جھلا اٹھا۔

''شکورے۔'' اس نے آواز دی۔

''جی سرکار۔'' وہ دوڑا آیا۔

''گاڑی تیار کرو ہمیں ڈیرے پر جانا ہے۔''

☆======☆======☆

''تم نے اچھا نہیں کیا علی۔'' مہر النسا کہہ رہی تھی۔

''کیا اچھا نہیں کیا؟''

''آج ولیمے میں تم نہیں تھے۔ یہ بات سب نے محسوس کی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بابا جان' اماں جان کو بتا رہے تھے کہ وہاں سب تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے۔''

''آپ جانتی ہیں میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں اتنے اعلیٰ ظرف کا مالک نہیں ہوں نہ ہی کوئی فلمی کردار ہوں۔ بہتر یہی تھا کہ میں وہاں نہ رہتا۔ میری غیر موجودگی سے باقی سب بھی پریشانی سے بچ گئے ہیں۔''

''اب جب ایسا ہو چکا علی تو تم بھی پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل کٹنے لگتا ہے' اس طرح سوچتے رہے تو تم خود کو ختم کر لو گے۔'' مہر النسا کی آنکھیں بھر آئیں

''مجھے زندہ رہنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔''

''علی' علی۔'' وہ دوڑ کر آئی اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ ''تم ایسا نہ کہو۔ ابھی تو زیبی کا غم بھی کم نہیں ہوا اور تم ایسی باتیں کرنے لگے۔ کیا ہے وہ لڑکی جس کی خاطر تم خود کو روگ لگا رہے ہو۔'' وہ رونے لگی۔

''میں نے دیکھا ہے اسے۔ وہ بالکل مطمئن ہے تمہاری پروا بھی نہیں ہے اسے' بھول چکی ہے وہ تمہیں' خود اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ تمہیں نہیں جانتی' پھر ایسی لڑکی کے لئے جان دے دو گے؟ تمہارے لئے کیا صرف اسی کی اہمیت ہے' میری کوئی اہمیت نہیں ہے؟ میں جو تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں' خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ محبتیں تو علی زندگی دیتی ہیں' یہ کیسی محبت ہے' تمہاری کہ زندگی لینے لگی ہے۔''

''آپا۔'' اس نے مہر النسا کو چپ کرانا چاہا۔

''نہیں ہوں میں تمہاری آپا۔'' وہ پیچھے ہٹ کر چلائی۔

"میں نے زیبی کو منع کیا لیکن اس نے اپنی مرضی چلائی۔ تمہیں منع کرنے کی کوشش کی، لیکن تم نے میری ایک نہ مانی پھر کس منہ سے مجھے آپا کہتے ہو۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"مان لو کہ اب اس کی شادی ہوگئی ہے، مان لو کہ تم دونوں کے درمیان جو بھی تعلق تھا، وہ ختم ہو چکا ہے، مان لو کہ اب وہ تمہارے بھائی کی عزت ہے اور تم اپنے بھائی کی عزت سے نہیں کھیل سکتے۔ کیا تمہیں اتنا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسے بار بار گوری کہہ کر، اس انداز سے اسے یاد کر کے تم اپنے بھائی کی عزت تار تار کر رہے ہو۔

اس کی یاد اتنا ستاتی ہے تو جاؤ اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لاؤ، مگر تم یہ نہیں کر سکتے، کر سکتے ہو؟"

"آپا! میری بات سنیں۔"

"تم لوگ ہر وقت اپنی سنانے کے عادی ہو، لیکن آج میری بات سنو!" اس نے حیدر علی کو ڈپٹ دیا۔

"وہ تمہاری بھابی بن چکی ہے اور بھابی، دیور کا رشتہ وہ نہیں ہوتا، جس کے لئے تم اتنے افسردہ ہو۔ اپنے دیوروں کے لئے وہ ماں اور بہن کی جگہ لے لیتی ہے۔ سمجھے تم؟ اپنی ماں یا بہن کے لئے اس انداز میں سوچ سکتے ہو تم؟"

حیدر علی کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ اٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مہرالنساء کی باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کی سماعت سے ٹکرا کر پورے وجود میں پھیل گئی تھیں۔

"اس کی یاد اتنا ستاتی ہے تو جاؤ اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لاؤ، مگر تم یہ نہیں کر سکتے، کر سکتے ہو؟" در و دیوار چیخنے لگے تھے۔

"وہ تمہاری بھابی بن چکی ہے اور بھابی دیور کا رشتہ وہ نہیں ہوتا، جس کے لئے تم اتنے افسردہ ہو، اپنے دیوروں کے لئے وہ ماں اور بہن کی جگہ لے لیتی ہے سمجھے تم، اپنی ماں یا بہن کے لئے اس انداز میں سوچ سکتے ہو تم؟"

اس کے کمرے کی دیواریں مسلسل یہی بات دہرا رہی تھیں۔ گھوں گھوں چلتا پنکھا طنز سے مسکرا رہا تھا، ایک ایک اینٹ اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ پاگل ہوا جا رہا تھا اور پھر نہ جانے اس جذبے کے تحت وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

نا معلوم رات کا کون سا پہر تھا، لیکن حویلی کے مکین گہری نیند میں تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک ایک کو جھنجھوڑ کر جگائے اور بتائے کہ گوری اس کی ہے۔ صرف اور صرف اس کی۔ اس پر کسی کا حق نہیں ہے سوائے اس کے وہ جو اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے، جس کی گوری سے محبت

مجبوری کا بندھن نہیں ہے، اب بھی وہ ایک دوسرے کو اسی طرح چاہتے ہیں۔ محض دو دن کی دوری ان کے درمیان قائم محبت کے اٹوٹ بندھن کو کیسے ختم کر سکتی ہے۔

اسے ہوش آیا تو وہ زرینہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

رات پل پل بیتی جا رہی تھی، لیکن رجب علی کی آنکھوں میں نیند کا نشان نہیں تھا اس نے پہلو میں لیٹی یاسمین کی طرف دیکھا جو کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد اب سو چکی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کی۔ آنکھیں موندتے ہی کمرے کے دروازے کی چوکھٹ تھامے دو گلابی ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے آگئے۔

ان ہاتھوں نے پورا دن اسے پریشان کیے رکھا تھا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا، لیکن تنہا ہوتے ہی وہ ہاتھ اس کے سامنے آجاتے تھے۔ سختی سے بھنچے، نفرت کا اظہار کرتے وہ ہاتھ، ہاں آنکھیں ہی نہیں، ہاتھ بھی پوری کہانی سنا دیتے ہیں اور وہ ہاتھ اسے نفرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان سنا رہے تھے۔

رجب علی کے اندر جنگ جاری تھی، وہ خود اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ وہ گلابی ہاتھ اس سے بغاوت کر رہے تھے اور اپنے خلاف ہونے والی ہر بغاوت کو کچل دینا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ روندنا، شکست دینا چاہتا تھا، لیکن وہاں تو بات ہی مختلف تھی۔ وہ ہاتھ اسے اپنی طرف بلا رہے تھے، اس سے شکست کھانے کے لئے نہیں، بلکہ اسے شکست دے دینے کے لیے۔ وہ انہیں ذہن سے جھٹکنے کی جتنی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسی قدر اس پر مسلط ہوئے جا رہے تھے۔ تھک ہار کر اس نے انہیں روند دینے، ختم کر دینے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

"وہ لڑکی اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ پیرزادہ رجب علی شاہ کی بیوی بنے۔" اس نے شعوری کوشش سے سوچا۔

"اسے میری ہر ذہنی اذیت کی سزا بھگتنا ہوگی۔ ان ہاتھوں کو سزا کاٹنی ہوگی، جن کی ایک ایک لکیر میں نفرت کا آتش فشاں ابل رہا تھا۔ اس زبان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہوگا جس نے "شاید بدقسمتی۔" کہہ کر ایک تیسرے درجے کی خادمہ کے سامنے میری تذلیل کی تھی۔"

لیکن ہر دلیل بے کار تھی، جو بات وہ اپنے ذہن میں بٹھانا چاہ رہا تھا، اس پر اسے خود بھی زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ نائیٹ بلب کی مدھم نیلگوں روشنی میں اس نے ایک نظر یاسمین کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"مجھے اس لڑکی سے اپنی تذلیل کا حساب لینا ہے۔" اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

☆======☆======☆

زرینہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر حیدر علی کو احساس ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اس

نے بے بسی سے بند دروازے کی سمت دیکھا۔ لکڑی کا بھاری منقش دروازہ اتنا مضبوط' اتنا موٹا تھا کہ اگر اس کی گوری اندر رو رہی تھی' سسک رہی تھی' تو بھی اس کی آہیں باہر تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔

وہ باہر کھڑا اس دروازے کو تکتا رہا۔ دوری محض دو دن یا ایک دروازے کی نہیں تھی' اخلاق اور مذہب کی تھی' بھائی کی عزت کی تھی' وہ دو دن تو کیا' دو صدیوں کی دوری بھی پاٹ سکتا تھا' لیکن مذہب' اخلاق اور عزت کی بیڑیاں نہیں توڑ سکتا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر دروازے سے پلٹ آیا۔

نیند زرینہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ قالین پر پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی وہ سپاٹ دیوار کو تک رہی تھی۔

پچھلے دنوں کے واقعات آپس میں گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے۔ کتنے ہی چہرے' کتنے ہی رویے کتنی ہی باتیں اور کتنے ہی واقعے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ تھے۔ اتنی مضبوطی کے ساتھ کہ انہیں الگ کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے والے کمرے کے دروازے سے رجب علی کو اندر داخل ہوتے بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔

کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں وہ پریوں کے دیس کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ رجب علی اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس' لمبے بال پشت پر بکھیرے' دوپٹے سے بے نیاز۔ اسے تو احساس بھی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔

رجب علی نے شعوری طور پر خود کو غصہ دلانے کی کوشش کی۔ ایک مسلط کی گئی عورت اس قابل ہرگز نہیں تھی کہ اس کی' پیرزادہ رجب علی شاہ کی آمد کو نظر انداز کر دے۔ رجب علی شاہ جو اب اس کا شوہر بھی ہے۔

لیکن نہ جانے اس میں کیا سحر تھا کہ تمام تر کوشش کے باوجود بھی وہ اس پر غصہ نہ کر سکا۔ کتنے لمحے دبے پاؤں سرکتے گئے۔

وہ دیوار کو تک رہی تھی' پلک جھپکائے بغیر اور رجب علی اسے تک رہا تھا۔ وہ اس کی توقعات سے بڑھ کر حسین تھی اور بے حد معصوم بھی۔

اسے زندگی سے ہمیشہ یہ شکوہ رہا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ہوئی' بہت سی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں اور نکل گئیں' لیکن کوئی اس کے قدم نہیں جکڑ سکی۔

مگر آج زرینہ کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ منتر پڑھ کر اس کے قدم جکڑ دینے والی ہستی' اس کی زندگی میں اب آئی ہے۔

☆======☆======☆

حیدر علی اپنے کمرے میں بیٹھا سگرٹ پھونک رہا تھا۔ گوری کے کمرے کے دروازے سے پلٹتے ہی قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ اور رجب علی اس کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حیدر علی اپنے کمرے میں پلٹ آیا تھا۔

''مجھے اس کے بارے میں ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میرے بھائی کی عزت ہے۔'' بار بار وہ خود کو سمجھا رہا تھا' لیکن لفظوں کے اس کھیل سے اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ باتیں کہہ دینا بہت آسان ہوتی ہیں۔ سمجھنی بہت مشکل۔

''اس دن وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی' جب میں نے خوشبو کی ساری شیشی اس پر انڈیل دی تھی۔'' اس کی سوچیں پھر بھٹکنے لگیں۔

''ہنستے ہوئے وہ بہت پیاری لگتی ہے' پتا نہیں اب وہ ہنستی ہو گی یا نہیں؟''

''لیکن اب مجھے اس کے بارے نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میری بھابی ہے۔ یہ بات چاہے روح تک کو گھائل کر دے' لیکن یہ حقیقت ہے۔''

ساری رات یونہی بیت گئی' خود کو سمجھاتے اور یادوں میں بھٹکتے ہوئے' بارہا وہ اس کے کمرے کے دروازے تک جا کر پلٹ آیا۔ مہرالنسا کے الفاظ سیسہ بن کر سماعت میں اترتے رہے۔

صبح فجر کے وقت حویلی میں چہل پہل شروع ہوئی تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

سخاوت اور رجب علی کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

''بھائی جان! آج آپ کا گھڑ سواری کا پروگرام نہیں ہے؟'' سخاوت رجب علی سے پوچھ رہا تھا' جو ہمیشہ کی طرح گھڑ سواری کے مخصوص لباس میں ملبوس نہیں تھا۔

''آج نہیں' پھر کسی دن۔'' رجب علی نے کہا۔ ''آج کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔''

سخاوت کی نظر حیدر علی پر پڑی۔

''آپ علی بھائی سے سفارش کر دیں۔'' اس نے رجب علی سے کہا۔

''تمہارے علی بھائی کو اب میری ضرورت نہیں رہی' تم خود کہہ کر دیکھ لو۔''

حیدر علی ان کی گفتگو کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا' لیکن سخاوت جلدی سے اس کے پاس چلا آیا۔

''علی بھائی!''

''ہوں۔'' وہ رجب علی کو نظر انداز کر کے رک گیا۔

''آج آپ اتفاق سے جلدی جاگ گئے ہیں تو پلیز رائیڈنگ کے لئے چلے چلیں۔''

''میں بابا جان کے پاس جا رہا ہوں' اس کے بعد چلیں گے۔''

"ٹھیک ہے، میں باہر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر پیر صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

آج اس کی چال میں ہمیشہ والی خود اعتمادی کے بجائے ایک عجیب طرح کی شکست تھی، چہرہ تھکا ہوا تھا۔ یوں جیسے میلوں پیدل چل کر آیا ہو۔ ذہانت سے چمکتی آنکھیں نیند کی کمی کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔

اماں جان کو سلام کر کے وہ پیر صاحب کے پاس چلا آیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے بابا جان۔"

"آرام سے یہاں بیٹھ کر بات کرو۔" آج انہیں حیدر علی کی طرف سے کسی انکار کا خدشہ نہیں تھا۔ آج وہ ہمیشہ والا حیدر علی نہیں تھا۔

"میں یہ کہنے آیا ہوں بابا جان! کہ آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے۔" وہ ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

انہوں نے اسے بغور دیکھا۔ سر جھکائے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اپنی بات کے کتنی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

"بابا جان آپ اس حویلی کو بچانا چاہتے ہیں ناں تو پلیز فوری طور پر میرا نکاح کر دیں۔" اس نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔

"میں اور اذیت برداشت نہیں کر سکتا۔"

اور اس لمحے پیر صاحب کے سامنے ہر گرہ خود بخود کھل گئی۔

☆======☆======☆

رضیہ بے دلی سے گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ اماں باہر تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ابا جی مسجد میں تھے۔ فضا پر عجیب سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں حمیدہ گھر میں داخل ہوئی۔

"سلام چاچی!"

"وعلیکم اسلام!" اماں نے کروٹ بدل لی، کسی سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ رضیہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔

"حمیدہ خیر ہے ناں زرینہ تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، زرینہ بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے تسلی دی۔ "میں یونہی ملنے چلی آئی تھی۔"

"آؤ بیٹھو۔" وہ دونوں صحن میں سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

"سب سے پہلے مجھے زرینہ کا بتاؤ وہ کیسی ہے؟"

"ابھی میں اسی کے پاس سے آ رہی ہوں۔ وہ ٹھیک ہے، بس تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔" رضیہ نے ایک نظر تخت پر لیٹی اماں کی طرف دیکھا۔ "اماں نہیں جانے دیتیں۔"

"پتا ہے، آج پیر صاحب چھوٹے شاہ صاحب کے سسرال گئے تھے۔" اس نے انتہائی راز داری سے کہا۔

"ہونہہ! اب ان کی شادی ہو یا نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" رضیہ نے تلخی سے کہا۔ "میری بہن کی زندگی برباد کرنی تھی، سو وہ کر دی انہوں نے۔"

"تم نے ان کی حالت دیکھی نہیں ہے، ورنہ یوں نہ کہتیں۔ کل رات بھی وہ بڑی بی بی کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے تو پوری کوشش کی تھی، لیکن تقدیر پر بھی کسی کا بس چلا ہے؟"

"ہر چیز اپنی جگہ، انہوں نے پوری کوشش کی تھی، میں نے مان لیا، وہ اب بھی اسے یاد کرتے ہیں، یہ بھی مان لیا، لیکن اس پورے قصے میں زرینہ کے ہاتھ کیا آیا وہ اپنی دنیا میں آج نہیں تو کل مگن ہو جائیں گے، لیکن میری بہن اس ماحول میں نہیں رہ سکے گی، گھٹ گھٹ کر مر جائے گی وہ؟" اس نے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"وہ واقعی بہت افسردہ لگ رہی تھی آج۔" حمیدہ نے کہا۔

"کچھ غیر حاضر دماغ بھی لگی مجھے وہ۔ پتا ہے رضیہ، حویلی کا ماحول بہت عجیب سا ہو رہا ہے آج کل، ہر طرف کھنچاؤ کی سی کیفیت ہے۔"

"کک، کیا بڑے شاہ صاحب کو کچھ خبر ہو گئی؟" رضیہ نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

"نہیں، اتنا تو یقین ہے مجھے کہ انہیں کچھ خبر نہیں ہے۔ بڑی بی بی مجھے ہر بات بتا دیتی ہیں۔ پہلے میں ہر بات اپنے اندر رکھ لیتی تھی، لیکن جب سے چھوٹی بی بی پر وہ سب کچھ بیتا ہے۔ میرے اندر بہت گھٹن ہو گئی ہے۔ میں ہر بات کسی سے کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتی ہوں، تب ہی تو تمہارے پاس آ جاتی ہوں۔"

"دل کا یہ بوجھ تم مہر النساء بی بی کے سامنے بھی ہلکا کرتی ہو گی؟"

"نہیں، وہ تو اپنے دکھوں اور غموں کی گٹھڑی اٹھانے کے لئے بھی میری مدد لیتی ہیں۔ میں اپنے اندر کے غبار کا بوجھ ان پر کیسے لاد سکتی ہوں۔ میں تو بس تم سے کہہ دیتی ہوں۔" وہ بولی۔

"زرینہ چھوٹے شاہ صاحب کو یاد کرتی ہے؟"

"ہاں، لیکن زبان سے نہیں، چھوٹے شاہ صاحب کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی ہے۔ دعا کرو ان کی شادی وقت پر ہو جائے۔ شاید یوں وہ ہونی ٹل جائے، جو نہیں ہونی چاہیے۔" حمیدہ تنکے سے مٹی میں لکیریں کھینچنے لگی۔

"پیر صاحب آج ان کے سسرال گئے ہیں۔ بی بی بتا رہی تھیں کہ آج چھوٹے شاہ صاحب کا نکاح ہو جائے گا، لیکن رخصتی وقت پر ہو گی یوں بھی اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ ان کی شادی میں، اور ہاں پیر صاحب خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی ان کے لئے ٹھیک کروا رہے ہیں۔"

خانقاہ حضرت صاحب پیر صاحب کی جاگیر کا قریبی گاؤں تھا۔

''لیکن اتنی عجلت میں نکاح؟'' رضیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے بی بی نے بتایا ہے' بات دراصل یہ ہے۔''

☆======☆======☆

رجب علی خود کو مختلف کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال' فصل کا حساب' مزارعوں کی کھینچ کھینچ۔ کتنے کاموں میں خود کو الجھا رکھا تھا اس نے' لیکن دوپہر کی دھوپ میں شدت آتے ہی جب سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تو وہ حویلی کی بیٹھک میں اکیلا رہ گیا اور تب اسے وہ سب کچھ یاد آیا جسے نظر انداز کرنے کی وہ صبح سے کوشش کر رہا تھا۔

وہ واقعی ساحرہ تھی۔ منتر پڑھ کر قدم جکڑنے والی نہیں' صرف دیکھ کر پتھر کا بنا دینے والی' اسے دیکھ کر رجب علی کو قدیم یونانی گورگن بہنوں کا خیال آ گیا تھا۔ کیٹس کی لابیل دام یاد آ گئی تھی۔ بس فرق تھا تو اتنا کہ وہ طاقت ور تھیں یہ کمزور۔

جیسے ہی زرینہ کی نگاہ اس پر پڑی تھی' کمرا سونے کی چوڑیوں کی کھنک سے بھر گیا تھا اس کے ہاتھ ہی نہیں' آنکھیں' ہونٹ' چہرے پر ابھرنے والی لکیریں' سب ہی کچھ نفرت کی داستان سنا رہا تھا اور رجب علی کی بدقسمتی کہ وہ چاہنے کے باوجود اس سے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے زرینہ سے بہت کچھ کہا تھا۔ نہ جانے کیا کیا لیکن اس کی یادداشت میں صرف اس کی جامد خاموشی باقی رہ گئی تھی۔ زرینہ نے صرف سنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی کچھ بولے' لیکن وہاں صرف ایک چپ تھی۔

رجب علی کو اس چپ سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ تو کہتی' محبت کا نہیں تو نفرت کا ہی اظہار کر دیتی۔ اپنی اس محبت کا اعتراف ہی کر لیتی' جس کی اذیت پل پل رجب علی کے اندر اترتی جا رہی تھی۔ اس کے قرب سے وحشت ہونے لگی تھی تو دور ہٹ جانے کو ہی کہہ دیتی' ہنسنا نہیں چاہتی تھی تو رو ہی پڑتی۔

لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو کسی پتھر سے بنے مجسمے کی طرح لاتعلق اور خاموش تھی۔ وہ خاموشی اتنی دبیز تھی کہ رجب علی خود بخود ہی احساسِ جرم میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ یوں جیسے سب کچھ غلط ہو گیا ہو اور اس سارے کا ذمہ دار وہ ہو صرف اور صرف رجب علی۔

اسے زرینہ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس نے اس کا وجود' اس کی ذات' اس کے ہر رویے کو پل بھر میں رد کر دیا تھا۔ اپنی خاموشی کے ساتھ۔ اس سے پہلے وہ کبھی رد نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ جیتتا آیا تھا ہارنا اسے آتا ہی نہیں تھا اور زرینہ اسے ہرا رہی تھی' وہ زرینہ جو خود بھی ہاری ہوئی تھی۔ ایک ہاری ہوئی عورت سے مات کھانا رجب علی کو گوارا نہیں تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم خود بخود زرینہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر دونوں خادمائیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سادہ نیلے پرنٹڈ سوٹ میں' بندھے بالوں کو دوپٹے سے چھپائے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ رجب علی کو اندر آتے دیکھ کر وہ وہیں صوفے پر ساکت ہو گئی۔

رجب علی کمرے کے وسط میں رک گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس زرینہ سے کہنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں' وہ اس کی محبت کو نہیں سمجھ سکتی اور سمجھ جائے تو بھی اس کی نہیں بن سکتی وہ محبت کے بس اَن دیکھے حصار میں قید تھی' وہاں سے اسے باہر نکالنا رجب علی کے بس میں نہیں تھا۔

''تم نے کھانا کھا لیا؟'' اسے اپنے وہاں آنے کا جواز گھڑنا پڑا۔ زرینہ کو مطمئن کرنے کے لئے نہیں' خود کو مطمئن کرنے کے لئے کہ وہ تو صرف اس سے کھانے کا پوچھنے آیا تھا۔

لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔

''یوں خاموش رہ کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟'' اس کے وجود میں چنگاریاں سی دہکنے لگیں۔

''تم دو کوڑی کی عورت جو اپنے جیسے دو کوڑی کے نہ جانے کس شخص کے ساتھ وقت گزارتی رہی ہو' تم ہم سے مقابلہ کر رہی ہو۔ اس گدی کے وارث سیّد رجب علی شاہ سے۔''

وہ سانس لینے کو رکا' لیکن وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ یوں جیسے وہ یہ سب کچھ اس سے نہیں کسی اور سے کہہ رہا ہو۔

''تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟'' وہ طیش میں اس کی طرف بڑھا' لیکن زرینہ نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

''تم میری پیشانی پر لگا وہ داغ ہو جسے مٹ جانا چاہیے ابھی اسی وقت۔''

اس کے ہاتھ زرینہ کی مرمریں گردن کی طرف بڑھے اور اسے چھوتے ہی جیسے سب کچھ بدل گیا۔

''میری بدقسمتی ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار بھی نہیں سکتا۔'' رجب علی نے شکستگی سے سوچا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

پیر صاحب نے حیدر علی کو خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی میں بھجوا دیا تھا تاکہ اپنی نگرانی میں اسے ٹھیک ٹھاک کروا سکے' لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اسے حویلی سے دور بھجوانا چاہتے تھے۔ اس جگہ سے دور بھجوانا چاہتے تھے جہاں زرینہ تھی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو وہ اس کی شکستگی دیکھ کر خوش نہیں ہوئے تھے' لیکن مطمئن

ہو گئے تھے۔ پر جب انہیں گرہیں کھلنے پر حقیقت کا ادراک ہوا تھا تو وہ بجھ کر رہ گئے تھے۔ ایک لڑکی کی خاطر انہیں اس کا ٹوٹنا گوارا نہیں تھا اور لڑکی بھی ایسی جس کی حیثیت بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔ حویلی کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ وہاں سے دور چلا جائے' اس لئے انہوں نے اسے دوسری حویلی میں بھجوا دیا تھا اور خود اپنے برادر نسبتی کے پاس چلے گئے تھے انہیں اور ان کے گھرانے کو جلد نکاح پر کوئی اعتراض نہیں تھا یوں بھی اب تو بمشکل تین دن رہ گئے تھے رخصتی میں۔

☆======☆======☆

حیدر علی ایک کرسی پر بیٹھا حویلی کی تزئین و آرائش دیکھ رہا تھا۔ اس نے شادی کرنے کا فیصلہ عجلت میں ضرور کیا تھا' لیکن اسے اس پر افسوس نہیں تھا۔ وہ اپنے پاؤں کی بیڑیاں مضبوط کرنا چاہتا تھا' تاکہ کسی دن دیوانگی کے عالم میں کہیں وہ منقش دروازہ کھول نہ بیٹھے' جس کے قریب جانے کا اب اسے کوئی حق نہیں تھا۔

وہ زرینہ کی ہر یاد کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ تمام تر شعور کے ساتھ' کیوں کہ اب وہ اس کی گوری نہیں بلکہ اس کی بھابی تھی۔ بھابی جو ماں اور بہن کے برابر ہوتی ہے جس کی محبت ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح ہوتی ہے۔ دہکتی آگ کی طرح نہیں' جو پل بھر میں سب کچھ راکھ بنا دے۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ دونوں ایک چھت تلے رہیں گے' تب تک وہ بے اختیار رہے گا' خود پر کبھی قابو نہیں پا سکے گا بلکہ شاید اپنے بھائی کی عزت کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور وہ اس حد تک گرنا نہیں چاہتا تھا' وہ یہ فیصلہ کر کے دکھی تھا' لیکن نادم نہیں تھا۔

☆======☆======☆

ہولے ہولے سہی' لیکن دن گزر رہے تھے۔ حیدر علی اور فوزیہ کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام پائی تھی اور وہ دونوں خانقاہ حضرت صاحب والی حویلی میں منتقل ہو گئے تھے۔

فوزیہ بہت خوش تھی۔ حیدر علی نے اسے صرف اپنی نئی زندگی کی ساتھی بنایا تھا۔ اس لڑکی کا اپنی زندگی کے فیصلوں پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس بے چاری کو تو جس کھونٹے سے باندھ دیا جاتا' وہ ہنسی خوشی وہیں بندھ جاتی' پھر اسے کسی بات کا قصوروار ٹھہرانا حماقت ہوتی۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا' پھر سزا کیوں کاٹتی وہ۔

☆======☆======☆

یاسمین ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ رجب علی کے بعد گدی کا وارث وہی تھا' لیکن یاسمین کو اپنی حیثیت روز بروز کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''خاندان اور عزت کچھ نہیں ہوتی۔'' وہ مہر النساء سے کہتی۔ ''یہ حقیقت ہے کہ وہ خوبصورت ہے' میں خوبصورت نہیں ہوں۔ وہ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی میں میری کوئی حیثیت' کوئی وقعت نہیں ہے۔''

''مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' مہر النسا کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''لیکن وہ خوش نہیں ہیں' پتا نہیں کیوں' حالانکہ میں نے ان سے کبھی شکوہ بھی نہیں کیا' کبھی ان کی بے اعتنائی کا گلہ نہیں کیا پھر بھی وہ خوش نہیں رہتے۔''

رجب علی خوش نہیں تھا۔ وہ عجیب مصیبت میں گرفتار تھا۔ دور جا کر اس کے دل میں زرینہ کی محبت انگڑائیاں لینے لگتی۔ اس کے قرب کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ وہ اس کے پاس چلا آتا' لیکن اس کے پاس آ کر اسے دیکھ کر یہ خیال کچوکے لگانے لگتا کہ اس کا جسم تو رجب علی کی ملکیت ہے' لیکن اس کا دل کسی اور کے پاس ہے' اس سے پہلے کوئی اور اسے چھو چکا ہے' اس سے اظہار محبت کر چکا ہے' اسے اپنی آغوش میں پناہ دے چکا ہے۔

تب نفرت کا لاوا اس کے اندر پھوٹنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ اپنی دونالی بندوق اٹھا کر

دونوں گولیاں اس کے جسم میں اتار دے' اس کے جسم سے ابلتا ہوا سرخ لہو دیکھے۔ اسے زمین پر گر کر تڑپتے ہوئے دیکھے' اور محبت اور نفرت کا یہ کھیل ختم ہو جائے۔ اس کی زندگی کا یہ باب بند ہو جائے۔ یہ تکلیف دہ آنکھ مچولی اس کی برداشت سے باہر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

لیکن ہر مرتبہ وہ بے بس ہو جاتا تھا۔ محبت ہر نفرت پر غالب آ جاتی تھی اور اس دن جب اسے یہ خبر ملی تھی کہ زرینہ ماں بننے والی ہے تو وہ کھل اٹھا تھا۔

''شاید اب وہ میرے قریب آ جائے۔'' اس نے سوچا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ خاندان کے باہر کی کسی عورت کو ان کے خاندان میں آنے کے بعد ماں بننے کا حق نہیں دیا جاتا۔ یہ جائیداد اور زمینوں کا ہی نہیں نسلوں کی حفاظت کا بھی مسئلہ تھا' لیکن زرینہ کی خاطر وہ ہر اصول توڑ دینے پر تیار تھا۔

پھر چند دنوں کے وقفے سے فوزیہ اور زرینہ دونوں مائیں بن گئیں۔ فوزیہ بیٹے کی اور زرینہ بیٹی کی ماں۔

''اس کا نام تو تم رکھو گی زرینہ۔'' رجب علی نے پیار سے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھا لیا۔

اسے بیٹے سے زیادہ اپنی یہ بیٹی عزیز تھی۔

''ریشماں!'' اس کے ذہن میں بہت پرانی یادوں کے در وا ہو گئے۔

''ریشم جیسی نرم و نازک''

''ہماری یہ بیٹی ہمارے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ شاید یہ بچھڑے ہوؤں کو پھر ملا دے۔'' اسے حیدر علی کا خیال آ گیا' جو اس کے بیٹے کی پیدائش پر مبارک باد دینے بھی نہیں آیا تھا۔ فوزیہ آئی تھی لیکن وہ نہیں آیا تھا۔

''ہم بھائیوں نے بہت پہلے یہ فیصلہ کیا تھا' میں نے اور علی نے کہ اگر میری کبھی کوئی بیٹی ہوئی اور اس کا بیٹا ہوا تو میری بیٹی اس کی بہو بنے گی۔ میرا بھائی مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے' شاید یہ ہمیں آپس میں ملا دے۔''

زرینہ نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسی روز مٹھائی کے ڈھیر سارے ٹوکروں اور کتنے ہی تحائف کے ساتھ رجب علی خانقاہ حضرت صاحب پہنچا۔

بھائی کی آمد کی خبر سن کر حیدر علی باہر آیا۔

''اتنے خفا ہو کہ ایک بار بھی ملنے تک نہیں آئے۔'' رجب علی نے بیٹھتے ہوئے گلہ کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''ذمہ داریاں سر پر آ پڑیں تو مصروفیت بڑھ جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں کتنا لاابالی تھا۔ ذمہ داریوں سے کوسوں دور بھاگنے والا۔''

''لیکن کوئی مصروفیت اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ خوشی کے موقع پر بھی بھائی اکٹھے نہ ہو سکیں۔''

''آپ خود آ گئے' ورنہ میں آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔'' حیدر علی نے کہا۔

''آپ کو مبارک باد دینے کے لئے بھی اور آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے کے لئے بھی۔''

''تم سمجھتے ہو کہ میں بھول گیا ہوں؟ نہیں میں اپنا وعدہ نہیں بھولا۔''

''تھینک یو۔''

''تم چاہو تو کوئی رسم کر لو' چاہو تو میری زبان پر اعتبار کر لو۔''

''مجھے آپ کی زبان پر اعتبار ہے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''بیٹے کا نام کیا ہے؟''

''عبداللہ!''

''بہت خوبصورت نام ہے۔''

رات کو عبداللہ کو گود میں اٹھائے وہ سوچ رہا تھا کہ زرینہ کو وہ حویلی کی بلند و بالا دیواروں کی قید سے نہیں چھڑا سکا تھا' لیکن اس کی بیٹی کو وہ وہاں قید نہیں رہنے دے گا۔

ریشماں کو وہاں سے نکالنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

☆======☆======☆

بیٹی کی پیدائش کے بعد بھی رجب علی کا اضطراب ختم نہیں ہوا تھا۔ زرینہ اب بھی اس سے اتنی ہی دور تھی۔ بس فرق پڑا تھا تو اس قدر کہ بیٹی کی آمد نے خاموشی کی گہری جھیل میں کنکر پھینک کر کچھ تلاطم پیدا کر دیا تھا۔

وہ ریشماں میں مگن رہنے لگی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح اب بھی رجب علی کی آمد کی خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ دروازے میں کھڑا اسے تکتا رہتا تھا۔ جب وہ مدھم مدھم آواز میں اپنی بیٹی کے ساتھ نہ جانے کیا باتیں کرتی تھی اور کبھی اچانک ہی ہنس پڑتی تھی' تو یوں لگتا تھا' جیسے مندر میں کسی داسی کے گھنگھرو بج اٹھے ہوں۔

اس کی کائنات کا تمام تر محور اس کی بیٹی تھی۔

اس سمے رجب علی یہ بھول جاتا تھا کہ زرینہ کسی اور کی چاہت اور محبت ہے اس کی محبت کی ڈور کہیں اور الجھی ہوئی ہے۔ یہ بات اسے اس وقت یاد آتی تھی جب ریشماں سو جاتی تھی اور کمرے میں صرف وہی دونوں ہوتے تھے۔ تب ہر بات اتنی ہی شدت سے اس کے شعور پر حملہ آور ہو جاتی تھی۔ محبت اور نفرت کی آنکھ مچولی دوبارہ شروع ہو جاتی تھی

رجب علی نے بہت مرتبہ چاہا تھا کہ اس شخص کے متعلق معلوم کرے' جو کبھی زرینہ کی تنہائیوں میں آیا تھا' لیکن اس کی انا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی کے منہ سے اپنی بیوی کے ماضی کے متعلق معلوم کرے۔ اپنی اس قدر تذلیل اسے گوارا نہیں تھی' ورنہ یہ پردہ ہٹا کر پرانے منظر دکھانے والے بہت سے لوگ موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر حمیدہ تھی' جو شاید اس کی بیتی زندگی

کے بہت سے رازوں سے واقف تھی‘ لیکن اپنی بیوی کے محبوب کا نام معلوم کرنے کی ذلت اور توہین سے وہ گزرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس دن بھی وہ دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا اور حمیدہ سے بالوں میں تیل لگواتی زرینہ کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ وہاں کھڑا ہے۔

ریشماں اپنے جھولے میں سو رہی تھی۔

”رضیہ تم سے ملنے کے لئے تڑپتی رہتی ہے‘ لیکن چاچی جی اور مولوی صاحب نے اسے یہاں آنے سے منع کیا ہوا ہے۔“ حمیدہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”تڑپتی تو میں بھی ہوں اس سے ملنے کے لئے‘ اماں اور ابا جی سے ملنے کے لئے‘ لیکن اس مقبرے سے نکل نہیں سکتی۔“ وہ تلخی سے ہنس پڑی۔

”مگر اس سب کی قصوروار بھی تو میں ہی ہوں۔“

”میں نے تمہیں بتانا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔“

”مگر میں تب بھی نہیں جا سکوں گی۔“ وہ ایک بار پھر ہولے سے جیسے خود پر ہنس پڑی۔

”سنا ہے بڑے شاہ صاحب‘ ریشماں کی نسبت چھوٹے شاہ صاحب کے صاحب زادے سے طے کر رہے ہیں؟“

”ایسا ہو جائے حمیدہ تو میں سکون سے مر سکوں گی میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے لئے بھی یہ حویلی مقبرہ بن جائے‘ مجھ پر تو جو گزرنی تھی گزر گئی‘ لیکن میری پھولوں کی طرح نازک بیٹی پر یہ سب نہیں گزرنا چاہیے۔“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

”یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔“

”اس اوپر والے نے میری بیٹی کو سب کچھ میرے جیسا دیا ہے‘ وہی رنگ روپ وہی چہرہ۔ میری دعا ہے کہ اسے میری قسمت نہ ملے۔ شاہ جی میرے لئے کچھ نہ کر سکے مجھے اس کا شکوہ نہیں ہے‘ لیکن انہوں نے میری بیٹی کو اس در و دیوار سے نہ بچایا تو میں سمجھوں گی کہ انہوں نے کبھی مجھ سے محبت ہی نہیں کی تھی‘ وہ سب جھوٹ تھا‘ فریب تھا۔“

دروازے پر کھڑے رجب علی پر جیسے کسی نے بجلی گرا دی۔

”گوری۔“

سارے قصے کی گرہیں اپنے آپ ہی اس کے سامنے کھل گئیں۔

☆======☆======☆

اماں کو خاموش ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی‘ وہ کروٹ بدلے آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ صبح صادق کا وقت ہو چکا تھا مولوی صاحب اذان دینے کی تیاریوں میں تھے۔ اماں کی خاموشی سے اکتا کر ماہ بانو بولی۔

”پھر کیا ہوا اماں؟“

”بہت دیر ہو گئی ہے گھنٹہ ڈیڑھ آرام کر لے پھر نماز پڑھنی ہو گی۔“ وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔

”اماں پلیز‘ بتائیں ناں پھر کیا ہوا؟“ اس نے زبردستی ان کا رخ اپنی جانب موڑا۔ ”کیا پھر رجب علی نے انہیں مار دیا؟“

”کتنی بے حسی سے پوچھ رہی ہو؟“ اماں کو اس کے انداز سے دکھ پہنچا تھا۔ ”وہ میری ایک ہی بہن تھی۔“

”اماں! ظاہر ہے مجھے اتنا دکھ تو نہیں ہو سکتا ناں‘ جتنا آپ کو ہوا ہوگا۔“ ماہ بانو نے کہا۔

”ویسے زیادہ امکان تو یہی ہے کہ رجب علی نے انہیں قتل کیا ہوگا۔ کیوں اماں! میرا اندازہ ٹھیک ہے ناں؟“

اماں گہری سانس لے کر بولیں۔ ”پتا نہیں حمیدہ بتاتی تھی۔“ انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

☆======☆======☆

زرینہ کے بالوں میں تیل لگا کر حمیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے بڑی بی بی کے پاس جانا ہے‘ وہ انتظار کر رہی ہوں گی میرا۔“

”ہوں!“ زرینہ نے سر کی جنبش سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

”ارے ہاں۔“ حمیدہ کو جیسے خیال آیا۔

”تم نے رضیہ کو کوئی خط دینا ہو تو مجھے دے دو۔ اب تو وہ خط پڑھ لیتی ہے۔“

”ہاں!“ زرینہ ہولے سے ہنسی۔

”اس نے ابا جان سے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ بالکل زبردستی‘ پڑھنے کی بہت چور تھی وہ اور اب میری خاطر‘ میرے خط پڑھنے کے لئے اس نے دو چار لفظ سیکھ لئے ہیں۔ پتا ہے حمیدہ‘ بہت مسئلہ ہوتا ہے اسے خط لکھنے میں۔ ایسے لفظ لکھنے پڑتے ہیں‘ جنہیں وہ آسانی سے پڑھ سکے۔ بس اسی لئے ابھی تک خط ادھورا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کن لفظوں میں لکھوں۔“

”جب لکھ لو تب دے دینا۔“

ریشماں کے رونے کی آواز سن کر زرینہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور حمیدہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی‘ لیکن وہاں رجب علی شاہ کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔

اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ شدید وحشت۔ حمیدہ کو اپنا دم رکتا ہوا محسوس ہوا لیکن رجب علی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ریشماں کو گود میں اٹھا کر چپ کراتی زرینہ کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ موقع غنیمت جان کر حمیدہ وہاں سے باہر نکل آئی۔

وہ جلد از جلد مہر النسا کے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔ رجب علی کا غصہ کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ زرینہ کی دوست تھی، لیکن رجب علی کے سامنے زرینہ کی کوئی بلا اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھی۔ یوں بھی گندم میں گھن پستے کیا دیر لگتی ہے۔

مگر پھر تجسس اور دوستی نے اسے روک لیا۔ وہ دبے قدموں ایک مرتبہ پھر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی، جو آدھا کھلا ہوا تھا۔

رجب علی چند قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ زرینہ ابھی تک ریشماں کی طرف متوجہ تھی شاید دبیز قالین پر چلنے کی وجہ سے وہ رجب علی کے قدموں کی چاپ نہیں سن سکی تھی۔

"گوری!" رجب علی نے اسے پکارا۔

یوں لگا جیسے زرینہ کو کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"شاہ جی!" وہ آنکھوں میں حیرت لئے تیزی سے مڑی لیکن رجب علی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے پھر رجب علی تیزی سے پلٹ گیا۔ جو تصدیق وہ کرنا چاہتا تھا، ہو چکی تھی۔ رجب علی کو پلٹتے دیکھ کر حمیدہ بھی وہاں سے تیزی سے کھسک گئی۔

☆======☆======☆

"پھر اماں! ماہ بانو نے دلچسپی سے پوچھا۔

"پھر؟" وہ نیم تاریکی میں چھت کی کڑیوں کو گھورتے ہوئے بولیں۔ "پھر ہم پر اچانک ہی قیامت ٹوٹ پڑی۔ حویلی سے زرینہ کی موت کی اطلاع آئی۔"

"تو کیا انہیں رجب علی نے زہر دیا تھا؟"

"زہر تو وہ دونوں بھائی خود تھے، جو قطرہ قطرہ اس کے جذبات میں اتر کر اسے موت کی نیند سلا گئے۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اسے رجب علی نے زہر دیا ہوگا، لیکن نہ تو اس کا چہرہ زیب النسا کی طرح نیلا پڑا تھا اور نہ ہی اس پر اذیت کا کوئی نشان تھا۔ وہ بالکل پُرسکون تھی۔ غموں سے آزاد ہو چکی تھی۔

حمیدہ کا کہنا تھا کہ رجب علی دوبارہ اس کے کمرے کی طرف نہیں گیا تھا، کوئی بھی وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ نہ جانے اس ایک لفظ "گوری" نے اس کے دل پر کیا اثر کیا تھا۔ پتا نہیں کس گھڑی وہ چپکے سے ختم ہو گئی، بنا کچھ کہے، بنا کوئی شکوہ کئے۔"

"اوہ!" ماہ بانو گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھر قدرے توقف سے بولی۔ "اور اماں وہ مہر النساء؟"

"تجھے کیا، جب دیکھو جان کو آ جاتی ہے۔" اماں نے چڑچڑے انداز میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ وہ

اب بھی مسلسل رو رہی تھیں۔

ماہ بانو نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ مزید کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ زرینہ کی موت کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا تھا۔

مسجد سے فجر کی اذان سنائی دی۔ ماہ بانو بھی کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہوں، یہ تھی ساری رام کہانی۔" اس نے سوچا۔

"دلچسپ ہے، اُما کو ضرور بتاؤں گی۔ وہ یقیناً اسے انجوائے کرے گی، پھر مل کر تبصرہ کرنے میں مزہ آئے گا۔ آج ریشماں سے ملوں گی اور وہ چھوٹتے ہی عبداللہ کا ذکر چھیڑ دے گی، لیکن وہ کیا ہے؟ میرا یہ احساس کہ جیسے کوئی کہانی چپکے چپکے میرے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہے، جیسے کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کا مرکزی کردار میں ہوں، جیسے میں کالج کی سرخ اینٹوں سے بنی عمارت، مسجد کے سفید روشن مینار اور پیر صاحب رجب علی شاہ کی حویلی کے مثلث میں گھر گئی ہوں۔ جیسے یہ تینوں عمارتیں مجھے پکار رہی ہوں، آواز دے رہی ہوں۔

کیا زرینہ خالہ کی کہانی کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے؟

اور ہے تو اس میں میرا کیا کردار ہے، میں کہاں ہوں؟ مجھے کیوں لگ رہا تھا، جیسے یہ کہانی زرینہ خالہ کی نہیں، میری زندگی کا حصہ ہے، جسے جاننے کا مجھے پورا حق ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ صندوقچی بھی کسی پنڈورا کا پٹارا ثابت ہو، جس کے کھلتے ہی تمام بلائیں باہر آ گئی ہوں، پھر کبھی واپس نہ جانے کے لئے۔"

سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر بہت مرتبہ اماں نے جگانے کی کوشش کی، لیکن سفر کی تھکن اور پوری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھ دوپہر بارہ بجے ہی کھلی، وہ بھی بہت مشکل سے۔

"تم سونے کے لئے آئی تھی یہاں؟" اماں کو اس پر غصہ تھا۔

"کل تڑپ رہی تھی ریشماں سے ملنے کے لئے کہ ابھی شام کے وقت ہی ملنا ہے اور اب ایسی پڑی ہو کہ جاگنے کا نام نہیں لے رہیں۔"

"بس اماں! اب تو اٹھ گئی ہوں۔" اس نے بدمزگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"جلدی سے نہا دھو لو، اب ناشتے کا وقت تو گیا، کھانا کھا کر ریشماں سے ملنے چلی جانا۔"

وہ بغیر کوئی بات کہے، چپل گھسیٹتی صحن کے ایک کونے میں بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئی، اور ایک مرتبہ پھر اسے ریشماں کا خیال ستانے لگا۔

"اماں کچھ کھانے کو دیں، بھوک لگ رہی ہے۔" وہ ان کے قریب پیڑھی پر آ بیٹھی۔ "پھر مجھے ریشماں کی طرف بھی جانا ہے۔"

"ابھی آنکھ نہیں کھل رہی تھی اور ابھی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔" اماں نے اسے گھورا اور

چنگیر اس کے سامنے کھسکا دی۔

دستر خوان میں پراٹھے اور فرائی انڈے نے اس کی بھوک چمکا دی۔

''اماں! چائے نہیں ملے گی؟''

''یہ لو۔'' انہوں نے مٹی کا پیالہ اس کے سامنے کر دیا۔

''تھینک یو۔''

''بیٹا! دودھ میں دیسی گھی ڈال کر پیا کرو۔'' بڑی اماں نے اسے لیکچر دینا شروع کیا۔

''اف! بڑی اماں کچھ خدا کا خوف کریں۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اماں! اسے رہنے دیں' یہ اپنی چلاتی ہے' کچھ کہنے کا فائدہ نہیں ہے اسے۔'' اماں بے زاری سے بولیں۔

''ذرا صحت دیکھو اپنی۔ پتا نہیں کیسی مریل مریل لڑکیاں ہوتی ہیں آج کل کی۔ بیٹا جنت میں بھی یہی کچھ ملے گا۔'' بڑی اماں نے اپنی دانست میں سب سے بڑی دلیل دی۔

''لیکن بڑی اماں! مجھے جنت میں جانے کی کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔''

''سن لیا۔'' اماں کو غصہ آ گیا۔ ''میں نے تو اسی لئے اسے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب ہے اس کے پاس۔''

پھر بڑی اماں اور اماں اپنے زمانے اور آج کل کی لڑکیوں کا موازنہ کرتی رہیں اور وہ کان بند کر کے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔ انڈے' پراٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بھی وہ ریشماں اور عبداللہ کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

''ابھی کل کالج میں عبداللہ سے ملاقات ہو گی۔ پتا نہیں وہ کیسا ہو گا۔ شاید اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی ہو۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی ضرور ہو گی۔ وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہوا ہے' تو یقینا اتنا سیدھا تو نہیں ہو گا۔ میں اُما سے ایک مرتبہ پھر ڈسکس کروں گی کہ مجھے اسے ریشماں کے اضطراب اور اس کی محبت کے بارے میں بتا دینا چاہیے یہ نہیں۔

شاید عبداللہ کو خبر ہو اور وہ اس بات کو ہنسی میں اڑا دے۔ اسے بھلا کیا دلچسپی ہو گی ریشماں کی۔ بے قراریوں میں ظاہر ہے۔ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح یہ تو کرنے سے رہا کہ گھوڑے پر بیٹھ کر گنڈاسا اٹھائے اپنی منگ کو حاصل کرنے یہاں پہنچ جائے' سب رسموں کو توڑ کر سب رواجوں کو بھی نظر انداز کر کے۔'' اپنی سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

''دیکھتی ہیں اماں آپ اس کی حرکتیں۔'' اماں نے بڑی اماں کو مخاطب کیا۔ ''کوئی بات ہوئی ہے ابھی بھلا ہنسی مذاق کی؟ اور یہ بی بی لگی ہے ہنسنے۔ اماں میرا دل تو ہولنے لگتا ہے۔ یہی حال زرینہ کا تھا۔ پڑھ لکھ کر اپنے میں گم ہو گئی تھی۔ میں نے سمجھانا چاہا پر سمجھ نہ سکی۔ اب یہ پڑھ لکھ گئی ہے اوپر سے پڑھتی لڑکوں کے کالج میں رہی ہے۔ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں

آتی۔''

''بس بڑی اماں! ہماری اماں کو تو کوئی موقع دے تعلیم کے خلاف بولنے کا۔ ایک سے ایک دلیل گھڑ لاتی ہیں۔ کیا کبھی کسی فلسفی نے ایسی دلیلیں گھڑی ہوں گی۔''

''زیادہ بک بک نہ کر۔'' اماں نے بے زاری سے کہا۔

''زرینہ کی نظر میں بھی میں جاہل تھی اور تیری نظر میں بھی ماں جاہل' فائدہ کیا ہوا اسے اتنی تعلیم کا' پوری دس جماعت تک پڑھا تھا اس نے۔ تجھے بھی کچھ نہیں ملے گا اتنا زیادہ پڑھ کر۔ دیکھ میری جان! لڑکی کا کام دفتروں میں جوتیاں چٹخانا نہیں ہوتا' گھر بسانا ہوتا ہے۔ لڑکی اپنے گھر میں اچھی لگتی ہے۔ شوہر اور بچوں کے ساتھ۔ یہ گھر سے باہر کی فکریں مردوں کے کرنے کی ہوتی ہیں۔ عورت کی راج دھانی اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔''

''بڑی اماں! میں اماں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی ہوں۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ کان صاف ہو جاتے ہیں اور دماغ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ ہاں بڑی اماں آزمائش شرط ہے۔ آپ بھی کر کے دیکھیں' بہت فائدے میں رہیں گی۔''

''دیکھا اماں آپ نے!'' اماں نے بڑی اماں کو مخاطب کیا۔ ''ان باپ بیٹی کی نظر میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''

''اچھا اماں! اب شکوے شکایتوں کا پروگرام تھوڑی دیر بند۔'' اس نے چنگیر اور مٹی کا پیالہ دوسری طرف سرکا دیا۔

''میں تیار ہوں' آپ کو ریشماں کی طرف چلنا ہے یا نہیں۔''

''یا تو اٹھ نہیں رہی تھی یا پھر اب ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔'' اماں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ذرا دم لے لے میں تیار ہو جاؤں۔''

☆======☆======☆

ریشماں ان دونوں کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ اماں دیر تک اس کی بلائیں لیتی رہیں۔ اِدھر اُدھر کی کتنی ڈھیر ساری باتیں کیں انہوں نے۔ پھر اماں نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا

''ریشماں! کچھ تم ہی سمجھاؤ اسے۔ ایسے اچھے رشتے موجود ہیں خاندان میں' لیکن اسے اور اس کے ابا کو کوئی اچھا ہی نہیں لگتا۔ پتا نہیں کس پھونس پروفیسر کے پلے بندھنا ہے اسے۔''

''سعد پھونس پروفیسر بن کر کیسا لگے گا۔ ناک پر موٹی سی عینک' بال سفید' لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتا ہوا۔'' ماہ بانو نے سوچا اور خود ہی ہنس پڑی۔

''لڑکی تمہیں کوئی لڑکا پسند تو نہیں آ گیا؟'' اماں اس کی بلاوجہ کی ہنسی سے بار بار مشکوک ہو رہی تھیں۔''

''اماں! ابھی تو پڑھنا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''چار سال تک تو بالکل بھول جائیں۔''

''اس لڑکی کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اس مرتبہ جا کر تمہارے ابا سے آخری بات کروں گی' ہاں۔''

ماہ بانو نے مسکراہٹ دبالی۔ اسے ڈر تھا کہ اسے یوں مسکراتے دیکھ کر اماں کا پھر پارہ چڑھ جائے گا۔

''میں چلتی ہوں اب' بانو تُو کب آئے گی۔'' اماں نے برقع سنبھال لیا۔

''میری فکر نہ کریں اماں میں آجاؤں گی۔'' وہ ریشماں کی مسہری پر آرام سے لیٹ گئی۔

''فکر نہ کریں۔'' اماں کو غصہ آ گیا۔

''تیری فکر ہی تو میری جان کو چمٹی ہوئی ہے۔ کیا کہیں گے تیرے تائے چاچے کہ یہاں تو آ گئی ہے ملنے اور انہیں پوچھا بھی نہیں' باتیں بنیں گی۔''

''بننے دیں باتیں' وہ تو یوں بھی بنیں گی۔ نہ گئی تو یہی کہیں گے ناں کہ ماہ بانو پتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگی ہے۔ کسی سے ملتی جلتی نہیں ہے اور ملنے چلی گئی تو ارشاد ہوگا' کہ اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے' ماڈرن ہوگئی ہے۔ بن بن کر بولتی ہے۔ ہمارے گلاس میں پانی پینا تک گوارہ نہیں ہے۔ اب ریشماں تم خود بتاؤ' ان گندے میلے گلاسوں میں بھلا کوئی پانی پی سکتا ہے؟ ہمارے گھر میں بھی سونے چاندی کے برتن نہیں ہیں' لیکن صاف تو ہیں ناں اور اماں جب باتیں ہی سننی ہیں تو نہ جا کر سننا زیادہ بہتر ہے۔''

''عاجز آ گئی ہوں اس لڑکی کی منطق سے۔ اب ماں کو سبق پڑھائے گی کیونکہ بہت پڑھ لکھ گئی ہے ناں۔'' اماں باہر نکلنے کو مڑیں۔

''دو گھنٹے بعد تمہارے نانا جی آ کر لے جائیں گے' اکیلی مت آنا۔''

''خالہ جی صرف دو گھنٹے کے لئے۔'' ریشماں نے کہا۔ ''دو گھنٹے میں تو ہم ٹھیک سے کوئی بات بھی نہیں کرسکیں گے۔''

''بیٹا! میں زیادہ دیر تک چھوڑ دیتی' اسے تو پروا نہیں ہے' لیکن اور رشتے داروں کے گھر بھی تو جانا ہے۔ یہ تو کان بند کر کے مزے سے الگ بیٹھ جاتی ہے۔ باتیں مجھے سننا پڑتی ہیں۔ ہاتھ گناہ نہ پاؤں گناہ لیکن بات ہوتی ہے' تو یہی کہ بھابی جی نے بھائی اور بھتیجی کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔

کوئی پوچھے کہ ان کے بھائی اور بھتیجی کو میں نے باندھ رکھا ہے کیا؟ میرے کہنے پر بھی نہیں ملتے تو میں کیا زبردستی کرسکتی ہوں۔'' پھر اماں' ماہ بانو کی طرف مڑیں۔

''لڑکی! تم بھی تیار رہنا دو گھنٹے بعد۔''

''اماں یہ سوچ کر جلدی بلوا رہی ہیں کہ میں تائے چاچے سے ملنے جاؤں گی تو یہ ان کی بھول ہے۔'' اماں کے جانے کے بعد وہ بولی۔

''لوگوں کے رشتے دار اتنے اچھے ہوتے ہیں' ایک ہم ہیں رشتے داروں کا ذکر آتے ہی کہیں بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔''

ریشماں ہنس پڑی۔ ''تمہارے رشتے دار تو پھر اچھے ہیں' میرے والے دیکھو۔''

''خیر تمہارے تو اسپیشل رشتے دار ہیں اللہ تعالیٰ نے سب کے ایک ایک سانچے بنائے تھے اور پھر بنا کر توڑ دیے۔''

پھر ماہ بانو کو جیسے بالکل اچانک یاد آیا۔ ''اوئے ریشماں! یاد آیا۔''

''کیا؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''عبداللہ!'' ماہ بانو سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''عبداللہ پاکستان آ گیا ہے۔ کل کالج میں فیئر ویل فنکشن ہے اور سنا ہے کہ وہ اس میں شامل ہوگا۔''

''سچ؟'' ریشماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میرا دوست ہے ایڈی اور عبداللہ کا بھی' وہ بہت گہرا دوست ہے' اس کے توسط سے پتا چلتا ہے مجھے۔''

''ہائے بانو' تم کیسے دوستی کر لیتی ہو لڑکوں سے؟ تمہیں خالو بھی کچھ نہیں کہتے؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ لڑکے کوئی ایسی مخلوق نہیں ہوتے کہ انہیں الگ سے اتنی اہمیت دی جائے۔ بھئی عام انسان ہوتے ہیں وہ بھی میری اور تمہاری طرح کوئی ایسی خاص چیز نہیں ہوتی ان میں کہ انہیں اس طرح حیرت سے دیکھا جائے۔ جیسے بچے چڑیا گھر کے جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ رہ گئے ابا جی' تو انہوں بھلا کیا کہنا ہے۔''

''اف! میرے ابا جان سن لیں تو جان سے ہی مار دیں۔'' ریشماں نے جھرجھری لی۔

''خیر' یہ تو ان کا پرانا مشغلہ ہے۔'' ماہ بانو نے اطمنان سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب کو چھوڑ' میری بات اور ہے' تمہاری اور۔''

ریشماں گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

''اوہو' معاف کرنا' مجھے خود پتا نہیں چلتا کہ کیا بول گئی۔ دفع کرو اس بات کو' میں تو تمہیں بتا رہی تھی کہ کل عبداللہ کالج آئے گا۔''

''کاش! تم اس وقت آتیں جب وہ آ چکے ہوتے تم ان سے مل چکی ہوتیں اور مجھے بتاتی

کہ وہ کیسے ہیں' دیکھنے میں بھی اور ویسے بھی۔ پتا نہیں' وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ سوچتے بھی ہوں گے یا نہیں۔''

''یعنی میں ابھی نہیں آئی ہوتی' بڑی بے مروت ہو۔'' ماہ بانو نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''میں مری جا رہی تھی تم سے ملنے کے لئے اور جنابہ فرما رہی ہیں کہ کاش' تب آئی ہوتی' جب ان کے محترم آ چکے ہوتے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ پتا نہیں پھر کب آؤ گی تم' کب ان کے متعلق پتا چلے گا' تمہیں اندازہ نہیں ہے میری بے چینی کا۔''

''مجھے خوب اندازہ ہے تمہاری بے چینی کا۔'' وہ پھر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئی۔

''اگلی مرتبہ نہ جانے کب آنا ہو لیکن جب بھی آؤں گی یقین کرو تمام تر معلومات سے لیس ہو کر آؤں گی۔''

''تم ایسا کرنا بانو۔'' ریشماں بولی۔ ''کہ ان کی ایک ایک بات خوب غور سے سننا انہیں اچھی طرح دیکھنا بالکل یوں جیسے تم نہیں انہیں میں دیکھ رہی ہوں اور پھر ان کی ہر بات مجھے اس طرح بتانا کہ میری نظروں میں ان کی تصویر بنتی چلی جائے۔ مجھے محسوس ہو کہ میں خود ان سے مل کر آئی ہوں جیسے لمحہ لمحہ ان کے ساتھ رہی ہوں میں۔''

''ایسا کروں گی۔'' ماہ بانو نے چٹکی بجائی۔ ''ان کی تصویر لا دوں گی تمہیں دن رات دیکھتی رہنا مزے سے۔''

ریشماں ہنسی۔ ''ہاں یوں بھی ان بلند و بالا دیواروں کے درمیان میں اس امید پر آسانی سے وقت کاٹ رہی ہوں کہ آنے والا وقت میری جھولی میں بہت سی خوشیاں ڈالے گا اتنی زیادہ کہ میں سمیٹتے سمیٹتے تھک جاؤں گی اور خوشیاں ختم نہیں ہوں گی۔''

''ویسے ایک بات ہے ریشماں۔''

''کیا؟''

''ہو سکتا ہے تمہاری امیدیں پوری نہ ہوں۔'' ماہ بانو نے محتاط انداز میں کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے ناں یہ بھی کہ جیسا تم چاہو ویسا ہو جائے یہ ضروری تو نہیں ناں کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ سب کچھ ہمیں مل جائے۔''

چند لمحے تک ریشماں اسے تکتی رہی۔

''ہوں' ہو سکتا ہے لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ دیکھو بانو! میں تمہاری طرح پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ میری سوچ بھی انہی دیواروں تک محدود ہے پتا نہیں میں اپنی بات سمجھا پاؤں گی یا نہیں۔ تپتے صحرا میں کچھ نہ ہو تو بھی سراب کے پیچھے بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں' میں خالی ہاتھ ہوں' میرے پاس امید کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ جینے اور جیے جانے کے لئے کوئی منزل تو

ہونی ہی چاہیے ناں۔ صحرا میں پانی کی تلاش میں بھٹکنے والوں کو سراب حوصلہ تو دیتا ہے ناں۔ منزل پر پہنچنے کے لئے اسی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جینے کے لئے امید کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس بھی صرف یہی زادِ راہ ہے یہی میرا سہارا ہے اور یہی سرمایہ۔''

ماہ بانو اسے دیکھے گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''دیکھ رہی ہوں کہ ان دیواروں میں قید لڑکی میں کتنا حوصلہ ہے کتنا عزم ہے۔ جو زادِ راہ تمہارے پاس ہے ناں ریشماں در حقیقت یہی سب کچھ ہے جینے اور جیے جانے کی امید کہ آج نہیں تو کل منزل ضرور ملے گی۔ سرابوں کو دیکھ کر حوصلہ ہارنا نہیں ہے بلکہ اور تیزی کے ساتھ اپنے سفر پر رواں دواں رہنا ہے۔''

ریشماں ہنس پڑی ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی۔

''قسم سے تم ۔۔۔ تھوڑی خوبصورتی بھی میرے پاس ہوتی ناں ریشماں تو اب تک سعد پاگل ہو چکا ہوتا۔''

''تم میں کیا کمی ہے بھلا وہ سعد تو پاگل ہے جو اب تک تم سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا اس نے۔''

''مجھ میں کیا کمی ہے؟ اتنی کالی ہوں میں یہ جو نانی جی کے گھر سے پرے بھینس بندھی کھڑی ہے ناں اس سے رنگت کا مقابلہ رہتا ہے میرا اور میں ہمیشہ جیت جاتی ہوں۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو بانو اب تم اس قدر بھی کالی نہیں ہو سانولی رنگت ہے تمہاری یہ تو اتنی پیاری لگتی ہے مجھے تو بہت پسند ہے۔''

''تمہاری پسند کا کیا کرنا ہے میں نے۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''اماں جان کہتی ہیں کہ ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ کا جس نے ہمیں ہر نعمت دی ہے۔ ایک رنگت سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''تم اپنی اماں جان کے اقوالِ زریں اپنے تک رکھا کرو اور شکر بھی تم ہی ادا کرو کیوں کہ تمہیں تو واقعی ہر نعمت ملی ہے مجھے جس دن ہر نعمت ملی میں بھی شکر ادا کیا کروں گی۔''

''بانو! جب تمہیں وہ ملیں گے تو تم کیا کہو گی ان سے؟''

''مجھے کیا کہنا ہے تم چاہو تو رقعہ لکھ کر دے دو محبت کی ایک لازوال داستان کے عنوان سے ذرا جذبات کا مرچ مسالہ تیز رکھنا تاکہ کچے دھاگے سے سرکار بندھے آئیں۔''

ماہ بانو نے شرارت سے اسے دیکھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''مذاق مت کرو ٹھیک بتاؤ۔''

''ارے بھئی مجھے کیا کہنا ہے وہ تمہارا عبداللہ ایڈی کا فرینڈ ہے میں اور اُما بھی ایڈی کے دوست ہیں پہلے رسمی بات چیت ہوگی پھر میں اور اُما دیکھیں گے کہ وہ ہماری دوستی کے قابل بھی ہے یا نہیں اگر ہوا تو اسے اپنے گروپ میں شامل کرلیں گے نہ ہوا تو میں اپنے رستے پے اور تم اپنی راہ چلو کہہ کر خدا حافظ کردیں گے۔''

''یہ کیا بات ہوئی' میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں اس سے دوستی کرنا ہوگی اور اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک عادت مجھ کو بتانا ہوگی یوں جیسے میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔''

''اچھا بابا! دماغ نہ کھاؤ۔'' ماہ بانو نے کہا۔ ''پہلے ہی میرا موڈ خراب ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''کل فیئر ویل ہے اور میرے پاس پہننے کو کپڑے اور جیولری کچھ نہیں ہے۔ میں ابا جی کو کہتی تو وہ کہیں سے بھی پیسوں کا بندوبست کردیتے لیکن میں ان پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔ مائم کا ڈریس تو ہے میرے پاس وہ تو ہم سب مائم کرنے والوں کا ایک جیسا ہے لیکن صبح فن فیئر کے لئے کوئی پرانا سوٹ نکالنا ہوگا۔''

''افوہ! میں نے سوچا کہ پتا نہیں کیا غضب ہوگیا کہ تمہارا موڈ خراب ہے۔'' ریشماں بولی پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔

''کریمن!''

کریمن دوڑی آئی۔

''جی بی بی!''

ریشماں نے آہستہ سے اس سے کچھ کہا اور وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

''اور تمہاری پڑھائی کہاں تک پہنچی؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''بس چل رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''سبط حسن جو کچھ پڑھتا ہے مجھے بھی زبردستی پڑھانے بیٹھ جاتا ہے' کہتا ہے اس طرح اسے سب کچھ ذہن نشین ہوجاتا ہے۔''

''بہت پیار ہے تمہیں سبط حسن سے؟''

''ظاہر ہے میرا بھائی ہے پیار تو ہوگا۔'' ریشماں بولی۔ ''وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے بہت زیادہ۔''

''خیر یہ ضروری تو نہیں کہ بہنوں کو بھائیوں سے اور بھائیوں کو بہنوں سے پیار ہو یہاں تو سگے بہن بھائی ایک دوسرے کو نہیں پوچھتے یہ تو پھر سوتیلا بھائی ہے۔''

''ماہ بانو ایسے کبھی مت کہنا' مجھے نہیں پتا کہ میری سگی ماں مجھ سے کتنی محبت کرتی' میرے سگے

بہن بھائی ہوتے تو وہ مجھے کتنا چاہتے لیکن اماں جان نے مجھے کبھی سوتیلا نہیں سمجھا' بھائیوں نے کبھی سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ سب مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھے اپنی سگی ماں کا خیال بھی نہیں آتا اور پھر سب سے بڑھ کر بابا جان ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کتنے اچھے ہیں۔''

''بابا جان!'' ماہ بانو ہنسی۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ کتنے اچھے ہیں پیر صاحب رجب علی شاہ۔''

''اس طرح کیوں ہنسیں تم؟''

''کچھ یاد آ گیا تھا ویسے پورے گاؤں میں بہت شہرت ہے تمہارے بابا جان اور بھائیوں کی اچھائی کی۔''

ریشماں نے نگاہیں چرالیں۔

''گاؤں والوں سے میرا کیا واسطہ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں اور بس۔''

کریمن کے آنے سے دونوں کی گفتگو میں وقفہ آ گیا۔

''یہ گٹھڑی کیا اٹھا لائیں؟'' ماہ بانو نے کریمن کے ہاتھ میں چادر میں لپٹے کپڑوں کی طرف دیکھا۔

ریشماں کے اشارہ کرنے پر کریمن گٹھڑی بستر پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''یہ تمہارے لئے!'' ریشماں نے کپڑے اس کے سامنے پھیلا دیے۔

''میرے لئے کیوں؟''

''تم نے بتایا تھا ناں کہ کالج کے فنکشن کے لئے تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں۔''

''اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم اپنے کپڑے اٹھا کر مجھے پہننے کے لئے دے دو۔'' ماہ بانو نے برا مان کر کہا۔

''یہ بالکل نئے ہیں۔ سبط ابھی چند دن پہلے لایا تھا قسم سے میں نے ابھی تک نہیں پہنے۔ میں تمہیں اترے ہوئے کپڑے تو نہیں دے رہی۔''

''تم نے بہت غلط سمجھا ہے ریشماں! میں نے باتوں باتوں میں تم سے یونہی ایک مسئلہ کہہ دیا تھا' جس طرح تم اپنے مسئلے کہہ دیتی ہو۔ میرے پاس بہت سے ایسے کپڑے ہیں' جو میں کل پہن سکتی ہوں۔''

''لیکن وہ پرانے ہیں ناں۔''

''پرانے ہیں تو کیا ہوا' کالج والے نکال تو نہیں دیں گے ناں مجھے کہ تم پرانے کپڑے پہن کر آئی ہو لہٰذا کالج میں نہیں جا سکتیں۔''

''دیکھو ماہ بانو! اس میں میری بھی ایک غرض ہے۔'' ریشماں نے جیسے اعتراف جرم کیا۔

''تمہاری غرض۔ تمہاری کیا غرض ہے؟''

''میں ان سے مل نہیں سکتی' انہیں دیکھ نہیں سکتی' میں چاہتی ہوں......'' وہ لمحہ بھر کے لئے رکی۔

''اُف! میں تمہیں سمجھا بھی تو نہیں سکتی۔ دیکھو بانو! میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے ویسے ہی ملو' جیسے میں ان سے ملتی۔''

ماہ بانو نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ''تمہیں معلوم ہے' تم بار بار مجھ سے کیا فرمائش کر رہی ہو۔ میری اکلوتی محبت کا گلا گھونٹنے پر کیوں مُصر ہو۔ سعد کچا چبا جائے گا مجھے ویسے بھی میرے معاملے میں بہت حساس ہے وہ۔''

ریشماں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں واقعی تمہیں سمجھا نہیں سکی۔''

''میں تو وہی سمجھی ہوں جو تم نے کہا ہے اور بار بار کہا ہے۔''

''میں یہ کہہ رہی تھی' کہ اتنے اچھے کپڑے میرے کس کام کے ہیں۔ یہ کریمن ہے ناں' کتنی بدصورت ہے اور کتنی میلی میلی رہتی ہے پھر بھی یہ مجھے اپنے سے بہتر لگتی ہے۔ کیونکہ اسے ایک چاہنے والا' سراہنے والا میسر ہے۔ پتا ہے اس کا چکر چل رہا ہے رجو کے ساتھ۔'' ریشماں نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''چکر چل رہا ہے اس کا۔'' ماہ بانو نے قہقہہ لگایا۔ ''اس کریمن کا؟''

''ہاں' رجو سے۔''

''رجو سے؟'' ماہ بانو نے دلچسپی سے کہا۔ ''لیکن یہ رجو ہے کون؟''

''اس کا عاشق۔''

''وہ تو ہے' لیکن ہے کون وہ؟''

''بھئی' مجھے کیا پتا' میں یہاں ہوتی ہوں' مجھے کیا خبر کہ رجو کون ہے؟''

''کہہ تو تم ایسے ہی رہی تھیں جیسے وہ کوئی خاص چیز ہو۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''تو کوئی عام چیز ہے بھلا۔'' وہ ہنس پڑی۔

''میری خاص الخاص ملازمہ کا محبوب ہے' بہت آہیں بھرتے ہیں دونوں۔''

''یہ ظاہر ہے تمہیں کریمن نے بتایا ہوگا۔''

''تو اور کیا؟''

''چھوڑ دیار' جیسے اسے رجو کی آہوں کی بہت خبر ہوگی۔ بھئی زمانہ بہت فاسٹ ہے' آہیں بھرنے کی فرصت کسے ہوتی ہے آج کل۔

''دفع کرواسے' میں تمہیں بتا رہی تھی کہ اس کریمن کی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے بھی چاہے' میری بھی تعریف کرے۔ اس خوبصورتی کا کیا فائدہ اگر اسے دن کے چوبیس گھنٹے یہ دیواریں ہی تکتی رہیں۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔''

''میں یہ چاہتی ہوں کہ مجھے نہ سہی' وہ میرے کپڑوں کو ہی دیکھ لیں۔ ان کے دیکھنے سے ان میں ان کی خوشبو رچ جائے گی۔ شاید وہ ان کی تعریف کر دیں' پھر میں یہ کپڑے پہنوں گی۔''

''اوہ خدایا!'' ماہ بانو نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''تم بھی کریمن اور رجو کی طرح بہت فالتو ہو' ایک ہم ہیں ہر روز Submission کی فکر۔ روز کے سونمبر اور ایورج کی پریشانی۔ ہمیں تو سر کھجانے کا بھی وقت نہیں ملتا۔''

''بھئی' فالتو تو میں ہوں۔'' وہ ہنسی۔ ''لیکن تم میری جگہ ہوتیں بانو تو تم بھی یہی کرتیں۔ وسیلہ نہ ہو تو پیدا کر لیا جاتا ہے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو جاؤں گی' تو تمہارا کیا جائے گا۔''

''میرا تو خیر کچھ نہیں جائے گا' اسی خوشی میں کہیں تمہارا کچھ نہ چلا جائے۔''

''میری پروا مت کرو' بس تم یہ کپڑے لے جاؤ۔''

''پھر سیّدانی جی! آپ میرے اترے ہوئے کپڑے پہنیں گی؟''

''طنز کر رہی ہو مجھ پر۔''

''نہیں یار! طنز کیا کرنا ہے' لیکن تم لوگوں کی روایتیں مختلف ہیں۔''

''میں اس بات کو نہیں مانتی' سبط بھی یہی کہتا ہے کہ یہ سب فضول باتیں ہوتی ہیں۔ بس مجھے تو اتنا ہی پتا ہے کہ وہ ان کپڑوں کو دیکھیں گے اور میرے لئے یہی بہت ہوگا۔''

''بہت سامان ڈھونا پڑے گا۔ کپڑے کافی زیادہ ہیں۔'' اس نے ایک اور بہانا کیا۔

''تم فکر مت کرو' کریمن پہنچا دے گی۔''

''تم نے انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''یہاں گاؤں میں وقت کتنا تھم تھم کر چلتا ہے۔ بندہ بور ہی ہو جائے۔''

''مجھے تو ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ یہ کیا بندہ چوبیس گھنٹے لٹو کی طرح گھومتا رہے۔'' ریشماں بولی۔

''تم بور بھی نہیں ہوتیں؟ کچھ تو تیزی ہو وقت میں۔'' وہ باتیں کر رہی تھی کہ کریمن اندر داخل ہوئی۔ ''بی بی کو مولوی صاحب لینے آئے ہیں۔''

''میں چلوں' نانا جی باہر انتظار کر رہے ہوں گے۔'' ماہ بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اماں جان سے نہیں ملو گی؟''

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے ملنے کا۔'' ماہ بانو نے منہ بنایا۔ ''میرے جانے کے بعد تم ہی مل

لینا۔"

"ایسے کیوں کہتی ہو' وہ تمہاری کچھ نہیں' لیکن میری تو ماں ہیں۔"

"ماں اپنی ہی ہوتی ہے۔" اس نے چادر اٹھائی۔

"میں بحث نہیں کروں گی تم سے' کیوں کہ تم بہت تھوڑی دیر کے لئے آئی ہو۔"

مولوی صاحب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس بڑھاپے میں عمر کا کم غموں کا ہاتھ زیادہ تھا۔ سفید داڑھی اور سر کے سفید بالوں میں گھرا ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر خود ہی دل ان کا احترام کرنے کو چاہنے لگتا تھا۔

ان کے ساتھ جاتے ہوئے ماہ بانو کا دل چاہا کہ ان کے بیتے برسوں کو کریدے ان سے پوچھے کہ زرینہ خالہ کے سلسلے میں وہ کس احساسِ جرم میں مبتلا ہوئے؟ ریشماں سے بھی وہ بس عید' شبرات وغیرہ پر مل آتے تھے۔ کیا کبھی ان کا دل نہیں چاہا' کہ ریشماں بھی ان کے پاس آئے یا وہ اپنی نواسی کو جی بھر کر پیار کریں؟

لیکن وہ لاٹھی پکڑے' سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ پتا نہیں وہ سوچتے رہتے تھے یا واقعی گم گو تھے۔

"پتا نہیں ان کا کتنا قصور تھا اس سارے قصے میں۔" ماہ بانو نے سوچا۔ "اگر بیچ میں انا اور عزت کے یہ بے ہودہ فلسفے نہ ہوتے تو کتنی آسانی سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا' لیکن ہمارے یہاں لوگوں کی عادت ہے دوسروں پر مسلط ہو جانے کی' دوسروں کی زندگیاں بھی خود ہی گزارنے کی۔ کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں سمجھتا' یا پھر شاید سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ آسان سی بات کو بھی پتا نہیں کیوں اس قدر پیچیدہ کر دیتے ہیں۔"

گھر میں صرف بڑی اماں تھیں۔

"بڑی اماں! اماں کہاں ہیں؟" اس نے صحن سے ہی کمروں کا جائزہ لیا۔

"وہ رشتے داروں سے ملنے گئی ہے۔ کہہ کر گئی ہے کہ تم اپنے تایا کی طرف آ جانا۔"

"اماں تو حد کر دیتی ہیں۔" وہ بان کی کھری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"باتیں بھی سنتی ہیں اور پھر ان ہی میں گھستی ہیں۔"

"تم نے اور تمہارے باپ نے چھوڑ رکھا ہے رشتے داروں کو' اب کیا وہ بھی چھوڑ دے؟" بڑی اماں نے اسے گھورا۔

"تم دونوں پھر بھی رشتے داروں کے پیارے بن جاؤ گے' میری بیٹی! بیچاری خواہ مخواہ ماری جائے گی' سب یہی کہیں گے کہ اس نے ہمارے بھائی اور بھتیجی کو ہم سے الگ کر دیا ہے۔"

"آپ لوگوں کی نرالی منطق ہے۔ ویسے میں بھی تایا چاچوں کی کوئی اتنی پیاری نہیں ہوں۔ خیر جانے دیں' میں جا رہی ہوں۔

"وہاں سب کو سلام کہنا میرا بھی۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں بھی اماں کی طرح رشتے داروں میں گھسنے جا رہی ہوں' ہرگز نہیں۔ اتنی فالتو نہیں ہوں میں۔ موسم اتنا اچھا ہو رہا ہے' میرا دل چاہ رہا ہے' ندی کنارے جا کر کچھ پینٹ کرنے کو۔ پینٹنگ کا سامان تو ہے نہیں میرے پاس' اب ندی میں کنکر پھینکوں گی' لہریں گنوں گی اور اسکیچ بک میں کچھ اسکیچ کروں گی۔"

"تجھے اللہ نیک ہدایت دے' کبھی کسی کی سن بھی لیا کر۔"

وہ بڑی اماں کو نظر انداز کر کے کمرے میں چلی آئی اور جلدی سے بیگ کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

"میں گھنٹا بھر میں آ جاؤں گی بڑی اماں۔"

"دیر نہ لگانا۔" پیچھے سے حسبِ معمول ہدایت نامہ جاری ہوا۔

ندیا کنارے بیٹھ کر گھٹنوں پر رکھی اسکیچ بک کے صفحے پر اسکیچ بناتے ہوئے وہ گزرے دنوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ ان دنوں کے متعلق' جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بے خیالی میں وہ وینس کی تصویر کے کتنے ہی اسکیچ بنا چکی تھی۔ چونکی تو وہ اس وقت جب ایک مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"وینس!"

اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا اور ایک لمحے میں ہی آنے والے کا بغور جائزہ لے لیا۔

وہ حیدر علی شاہ جیسا تھا۔ مشابہت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے سراپے میں حیدر علی کے خدو خال ڈھونڈنے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔

"عبداللہ!" ماہ بانو نے ایک لمحے میں اسے پہچان لیا۔ دھندلا خاکہ واضح ہو گیا وہ اچھا تھا۔ بے حد ہینڈسم' دل ہی دل میں وہ اس کا اور ریشماں کا موازنہ کرنے لگی اور اسے یہ فیصلہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ یہ کپل بہت سجتا ہے۔

عبداللہ دلچسپی سے اپنا تنقیدی جائزہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ ماہ بانو کو جیسے ہی احساس ہوا' اس نے نگاہیں اسکیچ بک پر جما دیں۔

"جی وینس!" وہ بولی۔

"ویسے مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ آپ کے ادا کئے ہوئے اس ایک لفظ کا مطلب کیا تھا۔ تعریف' تنقید یا محض شناخت اور پہچان۔"

"شناخت اور پہچان کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تنقید۔" وہ بولا۔

"اصل میں غلط ہوتی ڈرائنگ میرے لئے کافی تکلیف دہ ہوتی ہے۔"

ماہ بانو نے اسے گھورا۔ "غلط ہوتی ڈرائنگ۔"

"ہوں۔" پھر اس نے اردگرد کسی موزوں جگہ کی تلاش میں دیکھا۔

"میں بیٹھ سکتا ہوں۔"

"آپ کی اپنی جاگیر ہے' میں کیسے منع کر سکتی ہوں۔" عبداللہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"یہ تنقید ہے' طعنہ ہے یا محض شناخت اور پہچان۔"

ماہ بانو کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"سب کچھ ہے۔ شاید یہ ہماری پوری قوم کی نفسیات ہے' اعتراف کر رہی ہوں۔" وہ ہنسی۔

"جو چیز ہمارے پاس نہیں ہوتی' کسی اور کے پاس دیکھ کر ہم میں تلخی گھل جاتی ہے اور محنت کرنے کی بجائے ہم خواہ مخواہ فرسٹریٹ ہو جاتے ہیں۔"

"فرسٹریٹ تو اس لئے ہوتے ہیں کہ آج کل یہ ان ہے۔ تازہ تازہ امپورٹڈ آئیٹم ہے' جسے ہر کوئی بغیر کرنسی کے حاصل کر سکتا ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"جیسے پہلے کوئی بور نہیں ہوتا تھا' پھر ہم نے مغرب سے بوریت کو امپورٹ کیا اور اب بور ہونا آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے' اس لئے پوری قوم کے لئے ایک جدید اور نئے رومینٹک آئٹم کی ضرورت تھی۔"

ماہ بانو اس کی بات سن کر ہنس دی۔

"میری شناخت اور پہچان تو ہو گئی بلکہ مجھ پر تنقید بھی ہو گئی اور میں نے طعنہ بھی برداشت کر لیا لیکن اب تک آپ نے اپنے بارے میں نہیں بتایا' اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ وینس بے چاری سے کیا قصور سرزد ہو گیا تھا کہ آپ اس پر یہ ستم ڈھا رہی ہیں۔"

"میں ماہ بانو ہوں۔ یہاں مستقلاً نہیں رہتی' اپنے نانا جان اور بڑی اماں سے ملنے آئی تھی اور اپنی کزن سے بھی۔"

"وہ لگ ہی رہا تھا کہ آپ یہاں مستقلاً نہیں رہتیں ویسے آپ کے نانا کون ہیں؟"

"مولوی نعمت اللہ۔" ماہ بانو نے اس کا ردِعمل دیکھنے کے لئے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں لیکن وہاں کوئی خاص ردِعمل نہیں تھا۔

"اچھا!" اس نے بغیر تاثرات کے کہا۔ "میں سگریٹ پی لوں' آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

"نہیں' یہاں میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتی۔" وہ مسکرائی۔

"چلیں اپنی جاگیر کا کچھ تو فائدہ ہوا۔"

اس نے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔

"اور وہ بات تو رہ گئی۔"

"کون سی؟"

"یہ جو وینس کے ساتھ سلوک ہو رہا ہے یہ کیوں؟"

"اب میری ڈرائینگ اتنی بری بھی نہیں ہے۔" اس نے اسکیچ بک پر بنی وینس کے اسکیچ کا تنقیدی جائزہ لیا۔ "ٹھیک ہے ابھی آرٹ کالج جوائن کیے مجھے بمشکل چند مہینے ہوئے ہیں' لیکن کچھ نہ کچھ تو سیکھ ہی لیا ہے۔"

"آرٹ کالج۔" وہ یقیناً چونکا ہو گا' لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔

"تو آپ آرٹ کالج میں ہیں۔"

"جی۔"

"اتفاق سے میں بھی وہیں زیرِ تعلیم ہوں۔"

"جی مجھے علم ہے۔"

"ایڈی کو جانتی ہیں آپ؟"

"ہوں' میرا فرینڈ ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" وہ دلچسپی سے بولا۔ "وہ میرا بھی فرینڈ ہے بہت اچھا فرینڈ۔"

"وہ بھی معلوم ہے' لیکن اس وینس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اس میں کیا غلطی ہے؟"

"یہ دیکھو' کتنی فلیٹ سی لک دے رہی ہے۔ تصویر کو جاندار ہونا چاہیے۔ ادھر دو میں بتاؤں۔" اس نے سگریٹ ہونٹوں تلے دبایا اور اس کی اسکیچ بک اور پنسل لے کر اسے سمجھانے لگا۔

لیکن وہ اس کی باتیں سننے کی بجائے کچھ اور سوچ رہی تھی۔

"واقعی اگر زرینہ خالہ حیدر علی شاہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھیں تو یہ کچھ غلط نہیں تھا۔ کالج میں کم ہی اتنے ہینڈسم بندے ہوں گے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے' کہ اس کی گرل فرینڈ ضرور ہو گی۔"

وہ کالج کی گوسپ ذہن میں دہرانے لگی۔ کس کا افیئر کس کے ساتھ ہے اور کس کے متعلق کیا مشہور ہے' لیکن عبداللہ کے متعلق اس کا ذہن خالی رہا۔

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ سال بھر کی چھٹی پر ہے۔" اس نے سوچا۔ "ساری گوسپ تو انہی لوگوں کے متعلق سننے کو ملتی ہے' جو کالج میں نظر آتے رہتے ہیں۔

ویسے ایڈی اور سعد دونوں ہی بتا سکتے ہیں اس کے متعلق۔ ویسے تو کالج آنے پر اس کا ریکارڈ بھی سامنے آ جائے گا خود بخود ہی۔"

"کہاں گم ہو؟"

عبداللہ نے کہا تو وہ چونکی۔

''کچھ نہیں' تصویر دیکھ رہی تھی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔'' یہ بتاؤ کہ کل تم کالج آرہے ہو؟''

اس نے عبداللہ کی بے تکلفی کے بعد اس سے بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگائی یوں بھی کالج میں آپ آپ کب چلتا تھا۔

''ہاں' اور تم؟ کیا ابھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں' یہاں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کل کالج جانا تو بہت ضروری ہے' ورنہ ایڈی جان سے مار دے گا' میں مائم کلب میں ہوں ناں۔'' عبداللہ ہنس پڑا۔

''ایڈی کا خبط اب تک ویسا ہی ہے۔''

''ویسے کبھی کبھار اس سے چڑ بھی جاتی ہوں' لیکن یہ حقیقت ہے' میں اس سے بہت امپریس ہوں۔ وہ اتنا کام کرتا ہے اور تھکتا بھی نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ اتنا Creative ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے اتنے آئیڈیاز ہیں اس کے پاس اور ہر ایک پہلے سے زیادہ دلچسپ اور منفرد۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کا بقیہ حصہ دور اچھال دیا۔

''مائینڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو!''

''تم وہی ماہ بانو ہو ناں' جس کی اُما سے بہت دوستی ہے۔''

ماہ بانو چونک گئی۔ ''تم اُما کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں تم دونوں کو جانتا ہوں' جیسے تم مجھے جانتی تھیں۔ ہاں پہچاننے میں کچھ دیر ہوگئی۔''

''پھر بھی؟'' اس نے کریدنا چاہا۔

''بھئی ایڈی کی اور میری دوستی بہت گہری ہے۔ میں دور تھا' لیکن کالج کی خبریں اور ایڈی کے دوستوں کا تعارف سب مجھ تک پہنچتا رہا تھا۔''

''اچھا!'' وہ مسکرائی پھر اچانک اسے خیال آیا۔

''اوہو! میں نے دیر کر دی۔ اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں تھینک یو' میں چلی جاؤں گی' ویسے بھی اس سے آگے پیر صاحب کی جاگیر شروع ہو جاتی ہے اور وہاں تم نے قدم رکھا تو تمہارا قلع قمع ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''اتنی آسانی سے کوئی نہیں کر سکتا میرا قلع قمع۔''

''مان لیا لیکن ضروری ہے کہ تم آگ میں کود پڑو۔'' اس نے بیگ کندھے پر ڈالا۔

''اور میرے ابا جی ہوتے تو کوئی حرج نہ ہوتا' لیکن میری اماں جان نے مجھے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا تو ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا اور لڑکا بھی وہ جو سیّد حیدر علی شاہ کا بیٹا ہو۔''

''تمہیں دیر ہو رہی ہے اس لئے یہ بعد میں پوچھوں گا کہ خصوصی طور پر سیّد حیدر علی شاہ کا ذکر کیوں۔''

''ابھی تو یہ بتاؤ کہ تم لوگ اپنی کار پر جاؤ گے۔''

ماہ بانو ہنس پڑی۔ ''ہم بے کار ہیں۔''

''اوہ! آئی ایم سوری۔'' وہ بولا۔

''مجھے بھی رات کو لاہور کے لئے نکلنا ہے' تم چاہو تو تم لوگ میرے ساتھ ہی چلے چلو۔''

''تھینک یو تم نے کہہ دیا یہی بہت ہے' لیکن فی الحال میں آفر قبول نہیں کر سکتی۔'' وہ مڑ گئی۔

''گڈ بائے۔'' پیچھے سے عبداللہ نے کہا۔

''گڈ بائے۔''

اور وہ کچے ناہموار راستے پر احتیاط سے چلتے ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

اماں غصے میں بھری اس کا انتظار کر رہی تھی' اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی برس پڑیں۔

''کہاں گم ہوگئی تھی؟ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ رشتے داروں کی طرف نہ گئی۔ چلو خیر ہے۔ لیکن بندہ اپنا اتا پتا بتا کر جاتا ہے۔''

''سوری اماں! ویسے میں بڑی اماں کو بتا کر گئی تھی کہ میں ندیا کنارے جا رہی ہوں کچھ پینٹ کرنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن ظاہر ہے یہاں نہ ایزل ہے نہ کینوس بورڈ میں نے سوچا اسکیچ بک سے ہی کام چل جائے گا۔''

''ہٹ پرے' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا الا بلا ہے۔ بڑی اماں کو جیسے سمجھ آتی ہوگی تیری باتوں کی۔ تانگہ منگوایا ہے میں نے' چلنے کی تیاری کر۔''

''جی اماں!'' وہ کمرے میں گھس گئی۔

بس کی گھوں گھوں میں نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ چونکی تو اس وقت جب اماں نے اس کا کندھا ہلایا۔

''اللہ جانے اس لڑکی کو اتنی نیند کیوں آتی ہے۔'' وہ بے زار تھیں۔

''لاہور آ گیا؟'' اس نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا لیکن اردگرد کے ماحول نے خود ہی اسے بتا دیا کہ گاڑی رکنے کی وجہ لاہور آنا نہیں بلکہ غالباً گاڑی خراب ہونا ہے۔

''یہ گاڑی کم بخت خراب ہوگئی ہے۔'' اماں نے بتایا۔''پندرہ منٹ تو گزر گئے ہیں' ٹھیک ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔''

''ہو جائے گی ٹھیک۔'' اس نے کھڑکی سے باہر اندھیرے میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

''میرا خیال ہے کہ انجن میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔''

''ابھی وہ سامنے سیٹ والا بڈھا آیا تھا' کہہ رہا تھا کہ بہت دیر لگ جائے گی۔'' اماں نے کہا۔

''ابھی ہم پہنچے کہاں ہیں؟''

''پہنچنا کہاں ہے۔ ابھی شروع ہوا ہے سفر۔'' اماں بولیں۔

''پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''ہر مصیبت ایسے ہی وقت ٹوٹتی ہے' اب پتا نہیں کب گھر پہنچیں گے یہ بھی نہیں پتا کہ آرام کا وقت بھی ملے گا یا نہیں۔''

''تمہیں اپنے آرام اور سونے کے علاوہ بھی کسی چیز کی فکر ہوتی ہے۔'' اماں کا پارا چڑھ گیا تھا۔

''یہ نہیں سوچتی کہ دو عورتیں اکیلی اس ویرانے میں خوار ہو رہی ہیں۔''

''اماں' دو عورتیں اکیلی نہیں ہوتیں اور یہ ویرانہ بھی نہیں ہے۔ سڑک پر دونوں طرف دکانیں وغیرہ ہیں۔ ابھی دیکھتے ہیں گاڑی ٹھیک ہوگئی تو خیر ہے' دیر کی صورت میں اتر کر کوئی اور گاڑی دیکھیں گے۔''

پون گھنٹہ گزر جانے پر بھی جب گاڑی ٹھیک ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو ماہ بانو مزید بے زار ہوگئی۔

''اماں اتریں' یہاں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کوئی دوسری بس دیکھتے ہیں۔ ساری رات یہاں تو نہیں بیٹھ سکتے ناں۔''

''بانو ایسا کرو کہ سامنے سیٹ والے بڈھے سے کہو کہ کوئی گاڑی رکوا دے' یوں سڑک پر کیسے کھڑے ہوں گے ہم۔''

''اماں یہ بڈھا بے چارہ تو کسی تیزی سے گزرتی بس کی ہوا کے ساتھ ہی فنا ہو جائے گا۔ یوں بھی انسان کو اپنا کام خود کرنا چاہیے۔'' اس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا۔ ''چلیں اٹھیں' ہم کوئی بچے نہیں ہیں کہ اتنا سا کام بھی نہ کر سکیں۔''

وہ دونوں بس سے اتر کے سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئیں۔ ہلکی ہلکی نرم ہوا نے ماہ بانو کی ساری سستی دور کر دی۔ بسیں آتی رہیں مگر رفتار دھیمی کرتیں اور زن سے گزر جاتیں۔ یوں بھی سب ہی پہلے سے اوورلوڈ تھیں۔ مزید مسافر بٹھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے تو خیر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا' لیکن اماں کا تھکن سے برا حال تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اماں کو کہاں بیٹھائے کہ ایک کار تیزی سے ان کے سامنے سے گزری تھوڑی دور تک گئی اور پھر ریورس گیئر میں پیچھے پلٹ

کر ان کے نزدیک آ کر رک گئی۔

''پتا نہیں کون لوفر ہوگا؟'' ماہ بانو نے سوچا اور منہ پھیر لیا۔

''خیر تو ہے ماہ بانو؟''

انگریزی میں پوچھے گئے سوال اور اپنا نام سن کر وہ چونک گئی۔

''عبداللہ!'' اس کے ذہن میں خیال آیا۔

''یہ کون ہے؟'' اماں چونک گئیں۔

''اماں! یہ کالج میں میرے ساتھ پڑھتا ہے۔'' اس نے فوری طور پر یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ نو وارد عبداللہ ہے۔

''کیا کہہ رہا ہے؟''

''ایک منٹ!'' وہ کار کی کھڑکی پر جھک گئی۔

''ہماری بس خراب ہوگئی ہے نہ یہ ٹھیک ہوتی لگ رہی ہے اور نہ کسی اور بس کے رکنے کے آثار ہیں۔''

''آؤ میں چھوڑ دوں گا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''میرے ساتھ میری اماں جان بھی ہیں۔''

''کار میں بھی بہت جگہ ہے۔''

''ایسا ہے عبداللہ۔'' اس نے انگریزی میں کہا تاکہ اماں نہ سمجھ سکیں۔

''میرے ابا جی کے سامنے تو کوئی حرج نہیں' لیکن میری اماں ذرا پرانے خیالات کی ہیں انہیں اچھا نہیں لگے گا اگر تم مجھ سے فالتو بات کرو گے تو۔''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ٹھیک ہے نہیں کروں گا۔''

''اور پلیز اماں کو اپنے شجرہ نسب سے بھی آگاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''اور کوئی حکم؟''

''یہ حکم نہیں درخواست ہے شاہ صاحب!'' وہ ہنس کر پیچھے ہٹ گئی۔

اماں اس کے نزدیک آ چکی تھیں اور خاصی مشکوک لگ رہی تھیں۔

''یہ ہے کون جس کے ساتھ تم ہنس رہی ہو؟'' انہوں نے دبی آواز لیکن سختی سے پوچھا۔

''اماں کالج میں ساتھ پڑھتا ہے' بتایا تو تھا آپ کو۔'' وہ بولی۔ ''یہ بھی لاہور جا رہا ہے' ہمیں گھر پر اتار دے گا۔''

''رہنے دو کوئی بس وغیرہ آتی ہی ہوگی۔''

''اماں پلیز! وہ شریف انسان ہماری مدد کر رہا ہے اور ہم انکار کر دیں' یہ کتنا برا لگے گا۔''

چند لمحے اماں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

''چلو ٹھیک ہے۔''

ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ اماں اتنی آسانی سے کیوں مان گئی تھیں۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ وہ کس قسم کے لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہے تا کہ آئندہ ابا جی کے سامنے اپنے تجربے کو بطور دلیل پیش کر سکیں۔

''اماں! آپ آگے بیٹھیں۔'' اس نے کہا۔

''اے ہائے غیر مرد کے ساتھ آگے بیٹھ جاؤں' دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟''

''ایٹی کیٹس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' اس نے دبے انداز میں اماں کو سمجھانا چاہا

''وہ ہمارا ڈرائیور تو نہیں ہے۔ کس قدر بدتمیزی کی بات ہے کہ وہ مشکل وقت میں ہمارے کام آ رہا ہے اور ہم اسے ڈرائیور بنا دیں۔ آپ آگے نہیں بیٹھیں گی تو مجھے بیٹھنا پڑے گا۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' اماں نے کہا۔

''پلیز اماں! وہ آپ کی اولاد کے برابر ہے۔ مجھ سے بمشکل دو تین سال بڑا ہوگا' کچھ نہیں کہے گا آپ کو۔''

بادل نخواستہ اماں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

ماہ بانو نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر پہلے اپنا سامان اندر رکھا پھر خود بھی بیٹھ گئی۔

''میں ڈکی میں سامان رکھ دیتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔''اس طرح تمہیں تکلیف ہوگی۔''

''نہیں شکریہ' میں ٹھیک ہوں۔'' ماہ بانو کے انداز میں تنبیہ تھی' جیسے کہہ رہی ہو کہ میں نے تم سے کہا تھا۔ اماں کے سامنے مجھ سے کوئی فالتو بات نہ کرنا۔

کار چل پڑی۔ اندھیرے کی وجہ سے عبداللہ اور حیدر علی شاہ کی مشابہت کا اندازہ نہ ہوا تھا۔

''صبح کی روشنی کے ساتھ جیسے ہی اماں کو یہ احساس ہوگا تو کیا ہوگا۔'' ماہ بانو نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔''پتا نہیں اماں کا ردعمل کیا ہو؟ نہ جانے وہ اس سے ریشماں کے منگیتر کی حیثیت سے محبت اور پیار سے ملیں گی یا اس میں حیدر علی شاہ کا پرتو دیکھ کر اس کی ذات کو رد کر دیں گی۔

اتنا بہر حال طے ہے کہ دونوں صورت حال میں میری شامت ضرور آئے گی لمبی چوڑی انکوائری سے گزرنا پڑے گا مجھے [illegible] کہ میں عبداللہ کو کب سے جانتی ہوں؟ اور اس سے پہلے اماں کو اس کے متعلق سب کچھ بتایا کیوں نہیں' عبداللہ کیسا ہے؟''

اندھیری سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

اور کار خاصی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ ماہ بانو کے تنبیہی لہجے کے بعد عبداللہ نے اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اماں بھی اس کی طرف سے پوری طرح نہ سہی' لیکن

قدرے مطمئن ہو گئی تھیں۔ ماہ بانو نے اطمنان سے آرام دہ نیٹ میں دھنس کر آنکھیں موند لیں۔

اسے اچھی نیند تو نہیں کہا جا سکتا' لیکن بہر حال وہ اونگھنے لگی تھی۔ ایسے میں اسے صرف اس قدر اندازہ ہو رہا تھا کہ اماں اور عبداللہ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں کچھ باتیں اس کے کان میں بھی پڑ رہی تھیں لیکن وہ ان پر دھیان دینے کیے موڈ میں نہیں تھی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا' جب وہ لاہور میں داخل ہوئے۔ ماہ بانو آنکھیں ملتی ہوئی سیدھی ہو گئی۔

''اب کہاں چلنا ہے خالہ جی؟'' اس نے ماہ بانو کی بجائے اماں جان کو ہی مخاطب کیا۔

''ہمیں یہیں اتار دو' آگے ہم چلے جائیں گے۔ خود ہی۔'' اماں سے پہلے وہ بول پڑی۔

''ایسے ہی تمہیں زحمت ہوگی۔''

''زحمت!'' اس نے بیک ویو مرر سے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔''اگر یہاں تک آنے میں زحمت نہیں ہے تو مزید چند کلو میٹرز چلنے میں بھی نہیں ہوگی۔''

''یہاں تک تو تمہیں ... یوں بھی آنا ہی تھا۔'' اس نے اپنی ہدایات خود ہی بالائے طاق رکھ دیں۔

''آگے تمہیں جانا ہوگا گلبرگ وہاں' ہمیں نہیں جانا۔''

''بانو!'' اماں نے اسے گھورا۔''میں کر لیتی ہوں بات۔''

پھر عبداللہ کی طرف مڑیں۔''بیٹا بھائی چلنا ہے وہیں ہے ہمارا گھر۔''

''افوہ!'' ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے جو بات اس نے اُما کو نہیں بتائی تھی وہ اماں نے اتنی سہولت سے عبداللہ کو بتا دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو یہ خبر ہو کہ اس کا تعلق غریب گھرانے سے ہے۔ کالج میں تقریباً سبھی طلبہ اور طالبات بہت امیر کبیر یا اپر مڈل کلاس گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسے اپنے ابا جی پر فخر تھا کہ وہ مٹی کو زبان عطا کر دیتے ہیں لیکن کہیں یہ چبھن بہر حال موجود تھی کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کی طرح دولت مند نہیں ہے۔

اور پھر سعد تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سعد اس سے بد دل ہو یا اسے چھوڑ دے۔ اسے اس لمحے سے خوف محسوس ہوتا تھا جس لمحے سعد اسے صرف اس کے سوشل اسٹیٹس کی وجہ سے رد کر دیتا کبھی کبھار وہ دل کو مضبوط کرتی تھی۔

''اگر اسے میری نہیں بلکہ دولت کی ضرورت ہے تو اچھا ہے وہ ابھی الگ ہو جائے ایسے شخص کا ساتھ چھوٹ جانا ہی بہتر ہے۔''

لیکن اندر ہی اندر وہ چاہتی تھی کہ سعد اس آزمائش میں مبتلا نہ ہو۔

''آخر کسی کو آزمانے کا فائدہ بھی کیا ہے۔'' وہ سوچتی۔

''اگر کوئی آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو سارا بھرم بھی جاتا رہتا ہے۔ آزما لینے سے صرف

دکھ ملتے ہیں اذیت اور تکلیف ملتی ہے۔ اچھا ہے کہ ہم کسی کو ایسی آزمائش میں ڈالیں ہی نہ جس سے بھرم بھی چلا جائے۔''

اماں عبداللہ کو گھر کا پتا سمجھا رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں چڑتی جا رہی تھی۔ ریشماں اور عبداللہ سے ملنے کا سارا لطف غارت ہو گیا تھا۔

''اتنی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بالآخر ان سے رہا نہ گیا تو چڑ چڑے انداز میں بولی۔ ''ہمارے گھر تک ان کی کار نہیں جا سکتی۔''

''جہاں چار پہیے نہ جا سکیں' وہاں یہ دو ٹانگیں چلی جاتی ہیں۔'' عبداللہ خوشدلی سے کہنے لگا۔

کار کچھ فاصلے پر کھڑی کر کے وہ تینوں بھاٹی گیٹ کی تنگ اور پُر پیچ گلیوں میں چل پڑے۔ سامان ماہ بانو اور عبداللہ نے اٹھا رکھا تھا' جو کچھ زیادہ نہیں تھا دستک کے جواب میں ابا جی نے دروازہ کھولا اور ان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''ابا جی! السلام علیکم!'' وہ آتے ہی ان سے لپٹ گئی۔

''اندر آ جاؤ بیٹا!'' ابا جی نے ماہ بانو کو پیار کر کے الگ کیا۔

''ابا جی! یہ میرا کالج فیلو ہے۔'' اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہماری گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی' پھر ہم اسی کے ساتھ آئے ہیں۔''

''اندر آ جاؤ برخوردار باہر کیوں کھڑے ہو۔'' ابا جی نے شفقت سے کہا۔

میں اب چلتا ہوں' کچھ تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے اس نے معذرت کر لی۔

''چائے پی کر چلے جانا چائے سے تھکن اتر جاتی ہے۔''

''رہنے دیں ابا جی یہ ایسی جگہ پر چائے پینے کے عادی نہیں ہیں۔'' ماہ بانو بلاوجہ تلخ ہو رہی تھی۔

''ویسے ایک کپ چائے پینے کو دل بہت چاہ رہا ہے۔'' عبداللہ نے ماہ بانو کی بات نظر انداز کر دی ابا جی اسے اندر لے آئے۔ ماہ بانو اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''بانو! چائے تو بنا دینا۔'' اماں نے باہر سے آواز دی۔

''اماں! میں تھکی ہوئی ہوں۔'' اس نے بیگ بستر پر پٹختے ہوئے کہا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

اس کی بات کے جواب میں صرف کچن سے برتن کھڑکنے کی آوازیں سنائی دیں

''اس وقت سو جانے میں ہی عافیت ہے۔'' اس نے کمرے کی بتی بجھا کر بستر کا رخ کیا۔

''ابھی جب اماں جان کو اندازہ ہو گا کہ عبداللہ حیدر علی شاہ کا بیٹا ہے تو بہت شامت آئے گی میری۔ کالج میں آج نہیں تو کل سعد کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ان تنگ و تاریک گلیوں

میں رہنے والے ایک کمہار کی بیٹی ہوں تو پتا نہیں اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ سب کام اکٹھے ہی غلط ہوتے ہیں' اور ایسا ہوتا بھی صرف میرے ساتھ ہی ہے۔''

نرم سنبل کا تکیہ سر تلے رکھنے کی بجائے اس نے سر کے اوپر اس طرح رکھ لیا کہ باہر کی آوازیں کم سے کم اس تک پہنچ پائیں۔ یہی سب باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ صبح نو بجے اماں جان کے جھنجوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی۔

''پاگل کر دیا ہے مجھے اس لڑکی نے' اٹھو اب کیا نحوست پھیلا رکھی ہے۔''

نیند سے بوجھل آنکھیں لئے جب وہ غسل خانے کی طرف بڑھ رہی تھی تو اماں نے اسے روک لیا۔ ''پہلے میری بات سنو۔''

''جی۔'' اس نے رسی پر لٹکا تولیہ اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

''یہ عبداللہ تمہارے کالج میں پڑھتا ہے اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''جب سے میں کالج میں آئی ہوں تب سے چھٹی پر ہے۔ ہاں ایڈی کا دوست ہے' اس لئے مجھے پتا تھا لیکن میں اس سے ملی نہیں تھی۔''

''ملی نہیں تھی تو اسے جانتی کیسے تھی؟'' اماں نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ''اسے پہچانا کیسے تم نے؟''

''عقل سے' کل ندیا کنارے اس سے ملاقات ہوئی تھی وہیں میں نے اسے پہچان لیا۔ ظاہر ہے ہمارا کالج ایک ہی ہے' ایڈی دونوں کا مشترکہ دوست ہے' اس لئے ہماری بھی ہیلو ہائے ہو گئی' اتنی سی بات ہے اور آپ کو بتایا اس لئے نہیں کہ اس کا موقع نہیں ملا تھا۔''

تو ابھی بتا دیتی تم؟''

''اماں' ابھی تو میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا' آنکھیں بھی نہیں کھلیں میری' ذرا حواس تو ٹھکانے آتے پھر بتاتی ناں۔'' وہ غسل خانے کی طرف مڑ گئی۔

''یاد رکھنا' وہ ریشماں کا منگیتر ہے۔'' پیچھے سے اماں کی آواز آئی' لہجے میں تنبیہہ تھی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ''مجھے معلوم ہے۔'' اور غسل خانے میں گھس گئی۔

جب تک وہ نہا کر باہر نکلی' اماں جان کی کہی ہوئی آخری بات اور ان کا لہجہ اسے چبھتا رہا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ صبح سے اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا' جب اماں نے نہایت اطمینان سے عبداللہ کو گھر کا پتا بتا دیا تھا اور اس کے بعد جاگتے ہی اماں کی تفتیش اور بالآخر تنبیہہ۔ یہ سب اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

ناشتے کے دوران اس سے رہا نہ گیا۔

''اماں جان! آپ نے عبداللہ سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی۔'' اس نے پوچھا۔

''ایسی ویسی سے کیا مطلب؟''

"مطلب اس کے بابا جان یا زرینہ خالہ کے متعلق کوئی بات؟"

"مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے تم نے۔"

"اور ریشماں سے متعلق کوئی بات؟"

نہیں بابا!" وہ بولی۔ "اتنا ضرور پوچھا تھا کہ وہ حیدر علی کا بیٹا ہی ہے ناں اور اس نے اثبات میں جواب دیا۔"

"ہوں!" وہ سوچ میں گم ہوگئی۔

"میری بات سننا بانو!" اماں کے انداز میں رازداری آگئی۔

"جی!" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آج کل کے لڑکے بہت خراب ہوگئے ہیں۔" اماں نے تمہید باندھی۔ "آوارہ گردی میں وقت برباد کرتے ہیں۔ یہ عبداللہ تمہارے ساتھ کالج میں ہے' ذرا اس پر نظر رکھنا۔"

"نظر رکھنے کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دیکھتی رہنا کہ یہ کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں ہے یا یہ بھی آج کل کے لڑکوں کی طرح آوارہ گردیوں میں وقت تو برباد نہیں کرتا۔"

"اگر ایسا ہو تو پھر؟"

"پھر مجھے ضرور بتانا کہیں میری بھانجی کی زندگی خوار ہی نہ ہو جائے۔"

"اماں! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے مجرم بہنوئی آپ سے پوچھ کر اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ نہیں کریں گے اور دوسرے یہ بھی بھول جائیں کہ وہ ریشماں کی شادی اب بھی وہاں کرنے پر راضی ہوں گے۔"

"ہائے ہائے! یہ رشتہ تو بچپن میں طے ہوگیا تھا' اب اس سے کوئی کیسے پھر سکتا ہے۔"

"یہ تو آپ بھی مانتی ہیں ناں کہ بچپن کے رشتے ضروری نہیں کہ بڑے ہوکر بھی قبول کر لئے جائیں اور یہ بھی آپ کو پتا ہے کہ جس دشمنی کی ابتدا زرینہ خالہ کے وقت سے ہوئی تھی' وہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ پیر صاحب ایسی جگہ بیٹی دے دیں گے؟ ایسے میں بیٹی دے دینے کا کیا مطلب ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے جھک گئے اور جھکنا کیسے گوارا کر سکتے ہیں وہ۔"

"اس گھر سے ہمیں دکھ ہی دکھ ملے ہیں خوشی ایک بھی نہیں ملی۔" اماں نے آہ بھری۔

"بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے۔ جس دن سے رجب علی شاہ کو علم ہوا کہ اس کی بیوی زرینہ اور حیدر علی کی گوری ایک ہی ہے' تب سے وہ خود پر قابو ہی نہیں رکھ سکا۔ حالانکہ بات ختم ہو چکی تھی' لیکن اس کے دل سے اذیت کا یہ کانٹا نہیں نکل سکا اور اس نے حیدر علی کو ہر جگہ زک دینے کی کوشش کی۔

حیدر علی آخر اس کا بھائی تھا۔ کچھ زیب النسا کے قتل کو وہ معاف نہیں کر سکا تھا۔ کچھ گوری کے بچھڑنے کا صدمہ تھا۔ رہی سہی کسر اس کی بے وقت موت نے پوری کر دی۔ حیدر علی کو اب تک یقین ہے کہ زرینہ کو قتل کیا گیا تھا اور یوں دونوں بھائیوں کے درمیان ایسی دشمنی کی ابتدا ہوئی' جو آج ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔"

"تب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ ریشماں کی وہاں شادی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہاں حیدر علی شاہ اور عبداللہ وغیرہ اڑ جائیں تو اور بات ہے۔" ماہ بانو نے کہا۔

"پتا نہیں اس غریب کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کچھ ماں نے بھگتا اور کچھ اب بیٹی بھگتے گی۔"

"یوں بھی عبداللہ کے بابا نے اسے اسی دشمنی کی وجہ سے باہر بھجوا دیا تھا' اگر رجب علی اور اس کے بیٹے اس رشتے کے سلسلے میں مخلص ہوتے تو کبھی عبداللہ کو نقصان پہنچانے کا سوچتے بھی نہ۔"

"اب تو دو ہی صورتیں ہیں کہ ریشماں بیچاری وہیں زیب النسا کے کمرے کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہے یا پھر عبداللہ سے اس کی شادی ہو جائے' لیکن پتا نہیں عبداللہ کیسا ہے۔"

"دیکھنے میں تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔" ماہ بانو نے تبصرہ کیا۔

"دیکھنے میں تو اس کا باپ بھی ٹھیک ہی لگتا تھا لیکن کیا دیا اس نے زرینہ کو؟ اگر وہ زرینہ کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ اتنی جلدی نہ مرتی۔ بھلے اس کے پاس کپڑا' لتا اور اتنا زیور نہ ہوتا' روکھی سوکھی کھاتی' لیکن آزاد فضا میں سانس تو لیتی۔ ہماری تو زندگی کو گھن لگا دیا' ان بھائیوں نے۔"

"اماں! کچھ قصور زرینہ خالہ کا بھی تھا۔ پتا نہیں اُس دور کی لڑکیاں اتنی احمق کیوں ہوتی تھیں کہ محبت کو روگ ہی بنا لیتی تھیں۔"

"میں اسے سمجھاتی بھی تھی' لیکن وہ سمجھنے کی حد سے گزر چکی تھی۔ پتا نہیں کیا جادو کیا تھا حیدر علی نے اس پر۔" اماں کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"بیٹا میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ یہ مرد بہت بے اعتبارے ہوتے ہیں۔ وقت گزاری کے لئے محبت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور پھر ایک طرف کو چلتے بنتے ہیں۔ اب حیدر علی کو دیکھ لو۔ زرینہ کی خاطر دیوانوں کی طرح پھرا کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا لیکن ہوا کیا؟ جب وہ اسے نہیں ملی تو چند دن کے اندر اس نے شادی کر لی اور اب خوش اور مطمئن ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے درمیان اسے یہ یاد بھی نہیں ہوگا کہ کوئی گوری کبھی اس کی زندگی میں آئی تھی۔"

"خیر اماں یہ تو نہیں کہہ سکتے' اس لئے کہ یہ جو اتنی طویل دشمنی ان کے درمیان چلی آ رہی ہے' یہ زرینہ خالہ کی یادگار ہی تو ہے۔"

"یہ دشمنی زرینہ کے لئے نہیں نبھائی جا رہی' یہ تو جھوٹی انا کی جنگ ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی زرینہ سے سچی محبت ہوتی تو اس کی بیٹی کی خاطر ریشماں کے لئے یہ دشمنی ترک کر دیتے' لیکن یہ تو اس کی اکلوتی بیٹی' اس کی آخری نشانی کو بھی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"اوہو' باتوں میں خیال ہی نہیں رہا' میں اتنی لیٹ ہو گئی' اُما صلواتیں سنا رہی ہو گی مجھے۔" وہ جلدی سے اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو اماں نے بے اختیار اسے چوم لیا۔ خوبصورت بلوچی فراک اور شلوار میں کھلے بالوں کے ساتھ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"کہیں نظر نہ لگ جائے میری بیٹی کو۔"

"چھوڑیں اماں' کالے رنگ کو نظر نہیں لگتی۔" اس نے بیگ کندھے پر ڈالا۔

"بہت ناشکری لڑکی ہے تو۔"

"اچھا اماں! اب میں چلوں۔ درمیان میں گھر نہیں آؤں گی میں' وہیں ہوسٹل میں تیار ہو جاؤں گی۔ رات کو شاید دیر ہو جائے۔" اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

"کتنی دیر؟"

"اوں!" اس نے حساب لگایا۔ "دس ساڑھے دس تو آرام سے بج جائیں گے۔ ہو سکتا ہے ذرا اور دیر بھی ہو جائے۔"

"دس ساڑھے دس!" اماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی دیر کالج میں رہنے کی۔"

"اماں پلیز! میرا ٹائم تو یوں بھی شام کو ہی ہے۔ پھر پروگرام بمشکل آدھا ہوا ہو گا' پھر بھی میں اٹھ جاؤں گی۔"

"آج آجائیں تمہارے ابا تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔"

وہ کان لپیٹ کر باہر نکلنے لگی۔

"سنو! میں تمہارے ابا کو بھیج دوں گی۔ اکیلی مت آنا۔" اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"اچھا!" وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

کالج کی رونقیں عروج پر تھیں۔ رنگ اور خوشبو کا جیسے سیلاب آیا ہوا تھا۔ فن فیئر کی وجہ سے ہر طرف اسٹال لگے ہوئے تھے۔ کچھ طلبہ فینسی پیپر ڈریسز پہنے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ ایک طرف پھانسی گھر اور جیل خانہ تھا۔ دوسری طرف کھانے پینے کے اسٹال تھے۔ اس کونے میں مہندی' راکھی' پھولوں اور سہروں کے اسٹال تھے۔

وہ اُما کو ڈھونڈتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس سے مل کر وہ تسلی کر لینا چاہتی تھی کہ آج وہ واقعی

اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد ہی اس کا ارادہ سعد سے ملنے کا تھا۔

اُما اور نیہاں دہی بڑے کھاتے ہوئے مسلسل بولے جا رہی تھیں۔ اُما کو غصہ تھا کہ اب تک ماہ بانو نہیں آئی۔ آدھا دن تو گزر چکا ہے۔ ماہ بانو کو آتے دیکھ کر وہ دہی بڑے کی پلیٹ چھوڑ کر اس کی طرف بڑھی۔

"اگر آج تم اتنی اچھی نہ لگ رہی ہوتیں تو یقین کرو' اتنی دیر سے آنے پر میں نے تمہیں قتل کر دیا ہوتا۔" اُما اس کے گلے لگ کر بولی۔

"تھینک گاڈ!" اس نے سکون کا سانس لیا۔

"میں نے آئینے کی بات کا یقین نہیں کیا' اماں کی تعریف پر کان نہیں دھرے' لیکن اب تم نے کہا ہے تو مجھے یقین آگیا ہے کہ میں واقعی اچھی لگ رہی ہوں۔"

پھر وہ اُما کے کان کے پاس منہ لے گئی۔

"سعد کہاں ہے؟"

"ابھی تو اِدھر ہی تھا۔" اُما نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"مووی بنا رہا تھا۔"

"چلو اسے دیکھتے ہیں۔" ماہ بانو نے اسے کھینچا۔

"میرے دہی بڑے۔" اُما چلائی۔

"چھوڑو بھی میرے ساتھ آؤ۔"

"ارے یاد آیا۔" اُما کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "اِدھر میرے ساتھ آؤ۔" وہ ماہ بانو کو مخالف سمت میں گھسیٹنے لگی۔

"اُف! کیا کر رہی ہو' پہلے میرے ساتھ چلو۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔"

ماہ بانو نے اُما کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اُما اسے بھیڑ سے ہٹ کر الگ گوشے کی طرف لے گئی اور دونوں سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں' کیا بات ہے؟"

"وہ عبداللہ آگیا ہے۔" اُما نے اپنی طرف سے دھماکہ کرنا چاہا۔

"پتا ہے اور میں مل بھی چکی ہوں۔"

"کیا؟"

"جی ہاں۔"

"پھر تو میں فضول میں تمہیں کھینچ لائی۔ اس تو اچھا تھا کہ تم سعد سے مل کر اپنی تعریفیں کروا لیتیں۔"

ماہ بانو ہنس پڑی۔

''ویسے یار! یہ عبداللہ ہے کتنا ہینڈسم' اگر تمہاری کزن کا فیانسی نہ ہوتا تو میں ابھی اس پر عاشق ہونے کو تیار تھی۔''

''ہائے' میں نے تمہیں بتانا تھا۔'' ماہ بانو کو جیسے ایک دم یاد آیا۔

''کیا؟''

''میں گاؤں گئی تھی' ریشماں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔''

''ہائے سچ؟'' اُمانے دلچسپی سے کہا۔

''اور سب سے مزے کی بات' میں نے عبداللہ اور ریشماں کے خاندان کی دشمنی کا سراغ بھی لگالیا ہے۔''

''اگر تمہیں سعد سے ملنے کی جلدی نہیں ہے تو پلیز' جلدی سے بتادو۔ تمہارے لہجے سے اندازہ ہورہا ہے۔ کہ کوئی بہت خاص بات پتا چلی ہے تمہیں۔''

''بات تو خاص ہی ہے' میں تمہیں سب کچھ سنانے کو بے چین ہورہی تھی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''سعد سے بھی ملاقات ہوجائے گی لیکن یہ بہت مزے کی بات ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آئندہ عبداللہ سے ملتے ہوئے تمہیں بھی ان سب باتوں کا علم ہو۔''

ماہ بانو نے شروع سے آخر تک تمام کتھا اُما کو سنا ڈالی۔ بس اس قدر خیال رکھا کہ تمام تر روداد سنانے کے باوجود اس کی موجودہ مالی پوزیشن کا اندازہ اُما کو نہ ہو سکے۔

''یہ تو واقعی بہت دلچسپ اور بہت خطرناک ہے۔'' اس کی بات کے اختتام پر اُمانے کہا۔

''ہاں تب ہی تو میں یہ سب کچھ تمہیں سنانے کے لئے بے چین تھی۔''

''اور عبداللہ کے ساتھ تمہاری ملاقات کالج میں ہی ہوئی؟ تم نے اسے پہچانا کیسے؟ ایڈی نے تعارف کرایا تھا؟ اُمانے پوچھا۔

''نہیں اس سے ملاقات کل ہوئی ندیا کنارے۔'' اور ماہ بانو نے عبداللہ سے ملاقات کی تفصیل بھی اسے سنادی اور ذرا سی احتیاط کے ساتھ۔

''ایک بات تو بتاؤ بانو! تمہاری اماں کو ان سب باتوں کا اتنی تفصیل کے ساتھ کیسے علم ہوا؟''

''کسی نہ کسی ذریعے سے سب کچھ اماں جان تک پہنچتا رہا تھا سب سے زیادہ معلومات انہیں حمیدہ سے حاصل ہوئی تھیں پھر زرینہ خالہ کے خطوط سے۔ ان دنوں زرینہ خالہ اور اماں جان کے درمیان بات چیت کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا۔ اماں جان کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن صرف زرینہ خالہ کے خطوط کی خاطر انہوں نے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا شروع کیا۔

اچھو کی موت کے طریقے کی تصدیق شکورے نے کی جو چھپ کر رجب علی شاہ کو دیکھ رہا تھا یہ سب اس نے میرے نانا جی کو بتایا تھا۔ اس وقت جب اس کا ضمیر اسے تنگ کرنے لگا تھا۔ کچھ خالی جگہیں اماں جان اور حمیدہ نے مل کر اپنی عقل سے پُر کرلیں۔

پھر یہ بھی تھا کہ حیدر علی عبداللہ کے بابا اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے مہرالنسا کے پاس آجاتے تھے اور مہرالنسا ہر بات حمیدہ سے کہہ دیتی تھی۔ زرینہ خالہ بھی اماں جان سے کچھ نہیں چھپاتی تھیں اس لئے اس تمام چکر سے باہر کھڑے ہونے کے باوجود بھی اماں جان اس سے بے خبر نہیں تھیں۔''

''میں اور نظریے سے پوچھ رہی تھی۔'' اُمانے کہا۔

''میرا مطلب تھا کہ ریشماں کے حوالے سے تم نے اس سے کوئی بات نہیں کی اگر تم یہ بات کرو تو تمہارے خیال میں اس کا کیا ردعمل ہوگا؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی ہے یا نہیں۔''

''میں ایسا نہیں چاہتی خیر چند دن میں یہ سب معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''ایسا نہیں ہونا چاہیے وہ اس قید خانے کی اذیت صرف اس وجہ سے برداشت کررہی ہے کہ ایک دن عبداللہ اسے وہاں سے لے جائے گا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''لیکن یہ سب بہت مشکل ہے پتا نہیں ہمیں کس چیز کی دعا کرنی چاہیے اور کس چیز کی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں وہ ہو جس میں سب کی بہتری ہے۔''

''پتا نہیں لوگ اتنے گہرے گہرے عشق کیسے کرلیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ حقیقی زندگی میں ایسا ممکن ہے۔'' اُمانے تبصرہ کیا۔

''دیکھو ایک شخص انگلینڈ سے پڑھ کر آتا ہے اور یہاں گاؤں کی میٹرک پاس لڑکی کے عشق میں گھٹنے گھٹنے گرفتار ہوجاتا ہے۔ مجھے تو یہ عجیب سی بات لگتی ہے۔ اور پھر یہیں پر بس نہیں ہے وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ مجھے بتاؤ بانو تم پہلی نظر کی محبت میں گرفتار ہوسکتی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''اور نہ میں ایسا عشق کرسکتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے جدائی کی تکلیف ضرور ہوگی لیکن بس کچھ عرصے' میں نہیں سمجھتی کہ یہ جدائی روگ بن کر میری جان ہی لے لے گی۔''

''ویسے یہ معلوم نہیں کہ تمہاری خالہ کی جان کس نے لی تھی۔ جدائی نے یا رجب علی شاہ پر ہونے والے انکشاف نے۔''

''اینی وے' میں ایسے فلسفے کو نہیں سمجھ سکتی شاید اس لئے کہ ہم لوگ بہت مادہ پرست ہیں۔ ہم محبت کرنے سے پہلے سکیورٹیز دیکھتے ہیں' یہ دیکھتے ہیں کہ جس سے ہم محبت کرنے لگے ہیں وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے پوری پلاننگ کرتے ہیں' محبت کرنے کے لئے بھی۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''یوں بھی پہلی نظر کے عشق میں ہم کیا دیکھ سکتے ہیں' صرف شکل وصورت اور بس۔'' اُما نے تبصرہ کیا۔ ''اور شکل صورت میں کیا رکھا ہے اگر ذہنی ہم آہنگی نہ ہو ایک دوسرے کے لئے عزت اور احترام کا جذبہ نہ ہو تو محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ میرے خیال میں تو محبت بھڑک کر اپنی لپیٹ میں لے لینے والا جذبہ ہی نہیں ہے یہ تو آہستگی سے قطرہ قطرہ جسم اور روح میں سرایت کر جانے والا جذبہ ہے۔''

اپنے نزدیک کھنکار کی آواز سن کر وہ چونکیں سامنے ردا کھڑی تھی۔ ردا کا پھولوں کا اسٹال تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خوبصورت کلی تھی سرخ گلاب کی۔

''ردا تم!'' اُما چونکی۔ ''ہمیں پتا ہی نہیں چلا تمہارے آنے کا۔''

''ہم دیکھ رہے تھے کتنی دیر سے تم دونوں ایک دوسرے کے کان کے قریب کھسر پھسر کرنے میں مگن تھیں۔'' ردا بولی۔ ''بہر حال اس وقت میں تم دونوں کے لئے یہ پھول لائی ہوں۔''

''ہاؤ نائس۔'' ماہ بانو کھل اٹھی۔ ''کس نے بھیجے ہیں؟''

''اُما کے کارڈ پر نام موجود ہے اور تمہیں!'' اس نے ماہ بانو کی طرف اشارہ کیا

''پھول بھیجنے والے نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کو کہا تھا اور ہمارے اسٹال پر راز داری کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ تم چاہو تو تم بھی پھول بھیجنے والے کو اپنی طرف سے پھول بھجوا سکتی ہو صرف چالیس روپے میں' آگے تمہاری مرضی کہ کارڈ پر نام لکھو یا نہیں۔''

''جلدی دو ہم بھی دیکھیں کہ اتنے خوبصورت پھول کس نے بھجوائے ہیں۔'' اُما نے بے تابی سے کہا۔ ''ویسے ماہ بانو کے متعلق میں بالکل ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتی ہوں' کیوں بانو ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

ردا انہیں پھول اور کارڈ دے کر چلی گئی۔ اُما کو پھول ایڈی نے بھجوایا تھا اور ماہ بانو کو؟ ماہ بانو نے تجسس سے اردگرد دیکھا اسے یقین تھا کہ پھول بھیجنے والا اس وقت اس کی بے چینی اور حیرانی سے محظوظ ہونے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوگا۔

اور وہ واقعی اس کی طرف متوجہ تھا۔ تین کی ٹولی میں ایڈی' سعد اور عبداللہ کھڑے تھے اور سب ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔

''ایڈی!'' اُما نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اور بانو میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں پھول سعد نے بھجوائے ہیں۔ لیکن یقین کرلو کہ تم واقعی آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔''

ماہ بانو نے ایک نظر ان تینوں کی طرف دیکھا پھر کارڈ پر نگاہ ڈالی۔ پھول سعد نے نہیں بھجوایا تھا' کیوں کہ یہ رائٹنگ سعد کی نہیں تھی۔

''عبداللہ۔'' ماہ بانو نے آہستہ سے اُما سے سرگوشی کی۔

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں' تو یہ پھول عبداللہ نے بھجوایا ہے۔''

''بہت بد ذوق ہے سعد۔'' اُما ہنسی۔

''تھینکس عبداللہ۔'' ماہ بانو وہیں سے چلائی۔

اس نے ہاتھ ہلا کر شکریہ کا جواب دیا۔ ''تم ایڈی کو شکریہ بھی نہیں کہو گی؟'' ماہ بانو اُما کی طرف مڑی۔

''آئیڈیا!'' وہ چٹکی بجا کر بولی۔

''میں شکریہ اس طرح ادا نہیں کروں گی' آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے ماہ بانو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ان تینوں کے قریب سے وہ اطمینان سے گزرتی چلی گئیں۔

''بہت بے مروت ہو اُما!'' ایڈی بولا۔

لیکن وہ سنی اَن سنی کر کے بھیڑ میں داخل ہو گئیں۔ ظہیر اور طاہرہ کے اسٹال پر پہنچ کر اُما بولی۔

''ایک سہرا چاہیے۔'' اُما بولی

''کس کے لیئے؟''

''ایڈی کے لیے۔''

پیسے دے کر وہ کچھ دور جا کھڑی ہوئیں' اور آئس کریم کھاتے ہوئے انہی تینوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

کالج کی یہ دلچسپیاں سب کے لیے تھیں۔ ایک ایک فرد کتنے ہی لوگوں کو پھول بھجواتا تھا۔ اس کا مطلب محض دوستی ہوتا تھا۔ کوئی وعدہ یا اظہار نہیں......... ویلنٹائن ڈے پر بھی سب دوست ایک دوسرے کو پھول دیا کرتے تھے اور پھولوں کے ختم ہو جانے پر صرف پتے بھی پکڑا دیا کرتے تھے۔ کالج کا ماحول دوسرے تعلیمی اداروں سے بہت مختلف تھا۔

اور پھر ظہیر اور طاہرہ نے ایڈی کو سہرا پہنا کر ہی دم لیا۔ اردگرد موجود بیشتر طلبہ نے تالیاں بجا کر باآواز بلند' یوں مبارک باد دینی شروع کی جیسے واقعی وہ ابھی نکاح پڑھوانے جانے لگا ہو۔ وہ دونوں بھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔

''ویسے ایڈی! پھول اور سہرے پر بس کرتا نظر نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ پھیرے لگانے پر بھی تیار ہو جائے گا۔'' ماہ بانو محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

اُما بھی ہنس پڑی۔ ''بھئی اتنا آسان نہیں ہے' میرے ساتھ پھیرے لگانا۔ میرا سوئمبر بہت مشکل ہوگا۔ اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔'' اُما اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

''وہ کیا؟''

"مجھے ساری زندگی رونے دھونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ تو جو لڑکی بھی شادی کرے گی ساری زندگی اپنی قسمت کو روتی رہے گی۔"

"اونہوں' ایڈی کی کمپنی تو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اتنا برا لائف پارٹنر ثابت ہوگا۔" ماہ بانو نے تبصرہ کیا۔

"اتنا برا نہیں' بہت برا۔ دیکھا نہیں تھا مائم کے دنوں میں' مصیبت میں مبتلا کیا ہوا تھا ہمیں' ذرا سے کام کو سر پر سوار کر لیتا ہے۔ یوں سمجھتا ہے' کہ اس کے علاوہ تو سب نکمے ہیں' اور کوئی یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔"

"کر تو سب سکتے ہیں' لیکن اس کی طرح نہیں کر سکتے جیسے ایڈی کرتا ہے۔" ماہ بانو نے حتمی انداز میں کہا۔

"وہ تینوں یہیں آ رہے ہیں۔" اُما نے کہا۔

"سہرا اچھا ہے' اپنی شادی کیلئے سنبھال کر رکھ رہا ہوں۔" ان کے قریب آ کر ایڈی نے سہرا احتیاط سے لفافے میں ڈال دیا۔

"چلو کم از کم تمہیں یہ احساس تو ہو گیا ہوگا کہ میں بے مروّت بالکل نہیں ہوں۔ ایک پھول کے بدلے میں ایسا خوبصورت سہرا کبھی کسی نے کسی کو نہیں دیا ہوگا۔"

"ایک پھول کہہ کر اس کی توہین مت کرو' اس میں' وہ کیا ہوتا ہے یار۔"

وہ عبداللہ کی طرف مڑا پھر بولا۔ "ہاں وہ جذبِ دل کی شدتیں وغیرہ اور نہ جانے کیا کچھ ہے' اور یہ سب کچھ اس چالیس روپوں کے علاوہ ہے' جو میں نے اپنی سگریٹوں کا کوٹہ کم کر کے یہاں خرچ کیے ہیں۔"

ایڈی نے جس انداز میں کہا' وہ سب ہنس پڑے۔

"اور وہ جو میری جذبِ دل کی شدتیں وغیرہ ہیں' انہیں ابھی تک اظہار کا مناسب طریقہ بھی نہیں سوجھ رہا۔" سعد نے مصنوعی آہ بھری۔

"تمہیں یہ طریقہ ٹرین چھوٹنے کے بعد ہی سمجھ میں آئے گا۔" ماہ بانو نے جل کر کہا' پھر عبداللہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پلیز! میری بات سننا عبداللہ۔"

"سناؤ۔"

ماہ بانو نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اتنی بھیڑ بھاڑ میں صرف ایک گوشہ ہی ایسا تھا' جہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے بھی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی' جو کچھ وہ عبداللہ سے کہنا چاہتی تھی' وہ سب کے سامنے نہیں کہہ سکتی تھی۔

"[illegible] طرف [illegible] بات کرنی ہے۔" وہ بولی۔

"تو ہم چلے جاتے ہیں' ایڈی نے کہا۔

"نہیں ہم چلتے ہیں۔" ماہ بانو نے جلدی سے کہا۔ عبداللہ کندھے اُچکا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے' ماہ بانو کی نگاہ سعد پر پڑی' جس کی آنکھوں میں واضح طور پر ناپسندیدگی تھی۔ اسے ماہ بانو کا اس طرح عبداللہ کے ساتھ چلا جانا یقیناً برا لگا تھا۔

ماہ بانو کو اُلجھن ہونے لگی' اسے اس قسم کے شکوک وشبہات بہت برے لگتے تھے۔

صبح ہی اماں جان نے تنبیہ کی تھی کہ عبداللہ ریشماں کا منگیتر ہے۔ یوں جیسے ماہ بانو کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اور اب سعد نے مُنہ بگاڑ لیا تھا۔

"ہاں کہو کیا کہنا ہے؟" بالآخر اُس کے رکنے پر عبداللہ نے کہا۔

ماہ بانو نے ساری اُلجھنیں ذہن سے جھٹک دیں' اور سوچنے لگی کہ بات شروع کرنے کے لئے کون سے الفاظ مناسب رہیں گے؟

"دیکھو عبداللہ! تم سعد کو یہ مت بتانا کہ میں بھاٹی میں رہتی ہوں۔" اُس نے سوچا' لیکن پھر خود ہی اس فقرے کو رد کر دیا۔ "یہ مناسب نہیں ہے' جب سعد نے کبھی اظہار نہیں کیا تو میں اس کا نام کیوں لوں' ہاں یہ ٹھیک رہے گا کہ عبداللہ! تم میرے بہت اچھے دوست ہو' اس لیے......"

"اونہوں' وہ میرا اچھا دوست کیسے ہو گیا' کل ہی تو اس سے ملاقات ہوئی تھی' لیکن پھر کہوں تو کیسے۔ خواہ مخواہ ہی اسے یہاں تک گھسیٹ لائی۔"

عبداللہ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا اتنی مشکل بات کہنی ہے کہ جس کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔"

ماہ بانو چونک گئی۔ "تم اچھی فیس ریڈنگ کر لیتے ہو۔"

وہ کیاری کے ساتھ لگی اینٹوں پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

"اتنا سوچو گی تو بات نہیں کر سکو گی۔" اس نے سگریٹ نکال کر سُلگا لیا۔

"جو بات مجھے کرنی ہے' وہ سوچے سمجھے بغیر کر بھی نہیں سکتی۔" پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ جب ہم کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتے تو احساسِ کمتری ہمیں فرسٹریشن میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا ہی سب سے زیادہ خطرناک بات ہے۔ یا تو یہ احساس انسان کو سب سے آگے لے جاتا ہے۔ یا پھر پیچھے چھوڑ دیتا ہے کہ انسان قافلے سے بچھڑ جاتا ہے۔" وہ بولا۔

"میرا شمار تم ان لوگوں میں کر سکتے ہو جنہیں ہر وقت قافلے سے بچھڑ جانے کا خوف رہتا ہے۔ میرے احساسِ کمتری کو کبھی کوئی مثبت راہ نہیں ملی۔"

"اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکا بانو تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

''میں اسی لئے تمہیں یہاں لائی تھی۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

عبداللہ بغیر کچھ کہے اُس کی بات کا منتظر رہا۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ غلط ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن مجھے مسلسل یہ کانٹا چبھتا رہتا ہے کہ یہاں جو اتنے لوگ ہیں' میں ان سے کم' بہت پیچھے ہوں۔''

''پاگل ہو' تم کس اعتبار سے اُن سے کم ہو سکتی ہو' تم میں کس چیز کی کمی ہے؟ شکل صورت' تعلیم' مینرز' تم ہر لحاظ سے مکمل ہو۔'' عبداللہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تھینک یو عبداللہ' لیکن تم اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتے ناں' کہ مکمل تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔''

''آل رائٹ' مکمل کوئی بھی نہیں ہوتا' تو پھر تم احساسِ کمتری میں کیوں مبتلا ہو' اگر تم میں کسی بات' کسی چیز کی کمی ہے' تو ہر ایک میں کسی نہ کسی بات' یا کسی چیز کی کمی ہوگی۔''

ماہ بانو ہنس پڑی۔ ''تم بہت اچھے دوست ہو' عبداللہ میں صبح سے قنوطیت میں مبتلا تھی' لیکن اب تم سے بات کر کے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔''

''ہنسنا اچھا ہوتا ہے' ہنستی رہو گی تو بہت سی بے معنی باتوں پر قنوطیت میں مبتلا ہونا چھوڑ دو گی۔'' اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر باقی حصہ جوتے تلے مسل دیا۔

''بات یہ ہے عبداللہ! کہ یہاں کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا کہ میرا تعلق کس قسم کی فیملی سے ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے ہی کبھی کسی کو نہیں بتایا' یہاں تک کہ اُما کو بھی نہیں۔''

''کیوں؟ اچھی بھلی فیملی تو ہے۔ تمہاری اماں ذرا پرانے خیالات کی ہیں' لیکن ایسا تو میری اماں جان کے ساتھ بھی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ اور تمہارے ابا جی میرے بابا جان کی طرح بہت خوش مزاج اور روشن خیال ہیں۔ میری اور تمہاری فیملی میں صرف اتنا فرق ہے کہ میں اکلوتا نہیں ہوں' تم اکلوتی ہو' ویسے بیٹوں کی حد تک میں بھی اکلوتا ہی ہوں۔''

''اس کے علاوہ جو سب سے بڑا فرق ہے وہ ہے اسٹیٹس' بینک بیلنس اور جائیداد کا۔''

''بانو۔'' عبداللہ کے انداز میں حیرت تھی۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمہاری سوچ اتنی سطحی ہو گی۔''

''تم ایسا اس لئے کہہ رہے ہو' کیونکہ تم میرے مقام پر نہیں ہو' میں نہیں جتی کہ مجھے اپنے ابا جی اور اُن کے ہاتھ کے بنائے ہوئے مٹی کے برتنوں پر فخر نہیں ہے۔ میں آج اس مقام پر ہوں تو صرف اپنے ابا جی کی محنت کی بدولت' تم اندازہ نہیں کر سکتے عبداللہ کہ مجھے ان سے کتنا پیار ہے لیکن...... '' وہ پل بھر کو چپ ہوئی پھر بولی۔

''لیکن یہ کانٹا چبھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ اتنے دولت مند نہیں ہیں' جتنے یہ سب ہیں۔''

اس نے کالج میں چلتے پھرتے' ہنستے بولتے چہروں کی طرف دیکھا۔

''تمہاری محبت اور تمہارے فخر پر مجھے شک ہونے لگا ہے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتے ہو۔'' وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ ''کیوں کہ تم میری جگہ پر نہیں ہو۔ جیب میں آٹھ دس ہزار روپے روز ڈال لینے کے بعد میں بھی یہ بات کر سکتی ہوں۔ اتنی ہی آسانی سے جتنی آسانی سے تم نے یہ بات کہی ہے۔''

''تم زندگی سے اپنے لیے کیا چاہتی ہو' جائیداد' بینک بیلنس' کپڑے' جیولری اور بس۔''

''میں یہ سب نہیں چاہتی۔'' اُس نے عبداللہ کی بات کاٹی۔

''میں صرف تھوڑا سا سکون چاہتی ہوں۔ اور یہ چاہتی ہوں کہ تم کالج میں کسی کو میری مالی حیثیت کے بارے میں نہ بتاؤ اور بس' میں تمہاری شکر گزار رہوں گی۔''

''تمہارا کیا خیال تھا کہ میں یہاں آ کر یہ سب باتیں نشر کر دوں گا' بہت امیچور ہو۔''

''میرا یہ خیال نہیں تھا' باتوں باتوں میں بھی تو ذکر نکل آتا ہے۔''

''ویسے مجھے جاننے کا حق تو نہیں ہے' لیکن اگر تم جواب دینا چاہو تو اتنا بتا دو کہ یہ راز داری کیوں؟ میں مانتا ہوں کہ یہاں بہت سے لوگ اسٹیٹس کانشس ہیں' لیکن زیادہ تر لوگ ابھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے' کیا ایسا کسی خاص فرد کے لیے چاہتی ہو؟''

ماہ بانو کو پھر اُلجھن ہونے لگی۔ وہ بہت جلد اصل بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

''اگر ایسا ہو تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔'' اُس نے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''اب تم نے دوست کہا ہے' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس سے فرق پڑتا ہے۔ جو شخص اتنی سی بات پر تم سے متنفر ہو سکتا ہے' وہ کبھی تمہارا اچھا دوست ثابت نہیں ہو سکتا۔''

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا' لیکن اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تم سے بس اتنی توقع ہے کہ تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔''

وہ دونوں اُما اور ایڈی کے پاس چلے آئے جو وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سعد اُن کے پاس سے جا چکا تھا۔

''چلو اُما! اب ہاسٹل چلتے ہیں' شام کے پروگرام کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔'' ماہ بانو نے کہا۔

اُما' ایڈی اور عبداللہ کو گڈ بائے کر کے چلی آئی۔

''خیریت ہے اُلجھی اُلجھی سی لگ رہی ہو۔'' ہاسٹل میں اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے ماہ بانو سے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔''

''عبداللہ کو ریشماں کے متعلق بتایا تم نے؟''

وہ سمجھ رہی تھی کہ اتنی دیر تک ماہ بانو عبداللہ سے ریشماں متعلق بات کرتی رہی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''پھر اتنی دیر کیا گپیں لگتی رہیں' سعد کو بھی ناراض کر دیا۔'' اس نے دوپٹا اور بیگ بستر پر پھینک دیے اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

''سعد ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے' میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ خواہ مخواہ رعب برداشت نہیں کر سکتی میں۔'' چڑچڑی تو وہ پہلے ہی ہو رہی تھی۔ اُما کی بات سن کر اس کا پارہ اور چڑھ گیا۔

''اوپر سے اس عبداللہ نے نصیحتوں کی پٹاری کھول لی۔ جس کو دیکھو' وہ مجھے احمق سمجھتا ہے۔ سعد کا خیال ہے کہ میں اتنی بے وقوف ہوں کہ اس کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر اسے راضی کرنے دوڑی چلی آؤں گی۔ ہونہہ! اور عبداللہ' اس کے خیال میں' میں امیچور ہوں۔ یوں بھی نصیحت کرنے پر خرچ ہی کیا آتا ہے۔ نہ ایکسائز ڈیوٹی نہ محصول چنگی' لہٰذا جب دل چاہا پٹاری کھول کر نکالی اور دوسرے کو تھما دی۔''

اُما اس کی بات سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔ سعد کی حد تک تو وہ سمجھ گئی تھی' لیکن عبداللہ اس کے عتاب کا نشانہ کیوں بن رہا تھا اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ بالآخر بہت سوچ کر اسے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی۔

''وہ نصیحتیں کیوں کرنے لگا؟ کہیں تم نے اُس سے اُس کی گرل فرینڈز کے متعلق تو نہیں پوچھ لیا؟''

اُما نے کچھ اتنے بھول پن سے پوچھا تھا کہ ماہ بانو کا سارا غصہ پل بھر میں اتر گیا۔

''واہ! کیا دور کی کوڑی لائی ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔

''تو پھر؟''

''کچھ نہیں' بس اب میرا غصہ اُتر گیا ہے' کوئی اور بات کرو۔''

''کرتی ہوں' لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے عبداللہ سے ریشماں کے متعلق بات کی؟''

''ارے نہیں [illegible] مجھے کچھ اور بات کرنی تھی۔''

''[illegible] نے باتوں باتوں میں ایڈی [illegible] سے پوچھا تھا۔'' وہ بستر پر ماہ بانو کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

''[illegible] پوچھا تھا؟''

''یہی کہ عبداللہ کا کوئی افیئر چل رہا ہے [illegible]''

[illegible] از [illegible] آئی۔

''اس نے اتنا بتایا ہے کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ سنجیدگی سے انوالو نہیں ہوا۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں رہی لیکن بات بس دوستی تک ہی رہی۔ اس کی چوائس کی لڑکی اب تک نہیں ملی۔''

''ایڈی نے اس کی منگنی کا ذکر اب تک نہیں کیا؟''

''نہیں۔ شاید وہ عبداللہ کی مارکیٹ ویلیو خراب نہیں کرنا چاہتا۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''لیکن تم نے عبداللہ سے کیا بات کی؟'' اُما اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہیں تھی۔

''بتاتی ہوں' لیکن پہلے تم بتاؤ کہ ایڈی کی جذب دل کی شدتیں وغیرہ کہاں تک پہنچیں؟''

''وہ خواہ مخواہ کی حماقت پر اُتر آیا ہے۔'' اُما نے کہا' پھر آگے بڑھ کر رازداری سے بولی۔

''آج تو حد ہی کر دی اس نے' پتا ہے کیا کہا مجھ سے؟''

''کیا؟''

''کہنے لگا کہ مجھے... ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''کیا؟'' ماہ بانو چلائی۔ ''سچ کہہ رہی ہو؟''

''تو اور کیا۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں نے کہا کہ مجھ پر اب تک ایسا کوئی انکشاف نہیں ہوا' تو پتا ہے اُس نے کیا کہا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ اس وقت تک انتظار کر سکتا ہے۔ جب تک مجھ پر یہ انکشاف نہیں ہو جاتا۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ وہ ایک پھول پر بس کرتا نظر نہیں لگ رہا' کاش میں نے تم سے اس وقت شرط لگائی ہوتی۔'' ماہ بانو ہنس پڑی۔

''تمہارا کیا خیال ہے ایڈی سیریس ہے اس معاملے میں؟''

''مجھے تو سو فیصد یقین ہے۔ کیوں تمہیں کوئی شک ہے اس بارے میں؟''

''شک کی بات نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''پر ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ دیکھو ناں یہ تو خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں مبتلا کرنے والی بات ہوئی۔ ہماری دوستی میں آج تک مذہب حائل نہیں ہوا' لیکن ایڈی جس طرف بڑھ رہا ہے' وہاں ہر قدم پر مذہب درمیان میں آئے گا اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنے اپنے مذہب کو رد نہیں کر سکتا۔''

''یہ تو ہے' ایڈی کو بھی یہ سمجھنا چاہیے۔''

''وہ تو پاگل ہے' لیکن مجھے پاگل نہیں بننا۔'' اُما نے کہا۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے بانو' کہ میں نے یہاں کتنی مشکلوں سے داخلہ لیا ہے۔ ڈیڈی اور ممی کا کہنا تھا کہ میں' وہیں داخلہ لے لوں' وہاں نہیں لیتی تو انڈیا چلی جاؤں' لیکن یہاں نہ آؤں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ یہ شہر اس ملک کا حصہ ہے' جس سے میں جنون کی حد تک محبت کرتی ہوں' لیکن ممی' ڈیڈی مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے ہاں سے کوئی بھی یہاں آنا پسند نہیں کرتا' لیکن میں یہیں آنا چاہتی تھی۔ ممی ڈیڈی کا دل تو میرے رونے دھونے اور بھوک ہڑتال سے پسیج گیا' لیکن وجے' میرا بھائی' وہ کسی بھی صورت مجھے یہاں بھجوانے پر راضی نہیں تھا۔ پھر انہی دنوں اسے امریکہ جانا پڑا' اور اس کی غیر موجودگی میں' میں یہاں پر آ گئی۔ وہ اب تک مجھ سے ناراض ہے' بات نہیں کرتا مجھ سے۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے گھر والوں کو اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کے لوگ کتنے کھلے دل کے ہیں۔ تم چار سال اس کالج میں رہو گی' شہر کی سڑکوں پر نکلو گی' ملو ملاؤ گی اور اس تمام عرصے میں کوئی بھولے سے بھی یہ نہیں پوچھے گا کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو' یا تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''لیکن یہ بات وہاں کوئی نہیں جانتا۔ جب میں ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دوران سب کو بتاتی ہوں کہ ہمارا کالج چھوٹا سا پاکستان ہے۔ جس میں پاکستان کے ہر علاقے کے' ہر زبان بولنے والے طالب علم موجود ہیں اور ہر ایک کی ہر ایک سے دوستی ہے تو سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں درحقیقت اپنی صفائی پیش کر رہی ہوں۔''

''ایسا کرو کہ کسی دن اپنے گھر والوں کو یہاں لے آؤ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔''

''میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک اور اس کے لوگوں سے محبت کرتی ہوں۔ بھارت میں بابری مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے تو میرا دل دکھتا ہے اور اس کے جواب میں مندر گرائے جاتے ہیں' تو بھی میرا دل دُکھتا ہے۔ ہمارے گھرانے کے مسلمانوں کے گھرانوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ ہم ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں' کھاتے پیتے ہیں' بلکہ اپنے روز مرہ معمولات میں ہم مذہب کو اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے' لیکن شادی بیاہ وغیرہ ایسے معاملات ہیں' جن میں کوئی بھی مذہب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

''ہم مسلمان لوگوں کا حال بھی مختلف تو نہیں ہے' ہم بھی رمضان اور محرم کے علاوہ صرف شادی بیاہ پر ہی اسلام کا نام لیتے ہیں۔ ایڈی کے گھر والے خواہ کتنے ہی آزاد خیال سہی' لیکن وہ اسے کسی ہندو فیملی میں شادی کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔''

''نہ میرے لئے وہ اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہے اور نہ میں اس کے لیے' اسی لئے میں نہیں چاہتی کہ یہ بات آگے بڑھے۔''

''پتا نہیں کیوپڈ کے سب تیر غلط ہی کیوں لگتے ہیں۔''

''اندھا ہے نا' لیکن کام دیوتا اندھا نہیں ہے۔''

''کام دیوتا' وہ کون ہے؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''ہم ہندوؤں کا کیوپڈ اندھا نہیں ہے' پر شرارتی بہت ہے' جب شیو جی آنکھیں بند کئے تپسیا میں مصروف تھے اور ان کی اُما انہیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی' تو اس وقت سب دیوتاؤں کے کہنے پر کام دیوتا نے ہی محبت کا تیر چلانے کے لئے اپنی کمان سیدھی کی تھی۔'' اما بولی۔

''کیوپڈ ہو یا کام دیوتا' تیر ہمیشہ غلط ہی چلتا ہے۔'' ماہ بانو کے ذہن میں زرینہ خالہ کا خیال آ گیا۔ اُما صرف ہنس کر رہ گئی۔

''پتا نہیں اُما! کیا بات ہے' لیکن ایک احساس میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔''

''کیسا احساس؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماہ بانو کی طرف دیکھا۔

''زرینہ خالہ کی کہانی ختم ہوئے برسوں بیت چکے ہیں۔ ایک زمانہ ہو گیا ہے' اُن کا وجود مٹی میں ملے ہوئے۔ حالات کی جھیل میں کنکر گرنے سے اگر کوئی ہلچل ہوئی تھی' تب بھی اب سطح پُرسکون ہو گئی ہے' لیکن مجھے لگتا ہے اُما! کہ جیسے اس سکون کی تہہ میں بہت سے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔''

''وہ تو ہے' جس دشمنی کا بیج بویا جا چکا ہے اس کا پھل تو کاٹنا ہی پڑے گا۔''

''نہیں اُما! تم میری بات نہیں سمجھیں' پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے' جیسے یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی' جیسے یہ کہانی نئے کرداروں کے ساتھ دوہرائی جانے والی ہے اور ان نئے کرداروں میں سے ایک کردار میں بھی ہوں۔''

اُما خاموشی سے اسے تکتی رہی۔

''زرینہ خالہ کی صندوقچی کھولتے ہوئے یہ احساس بہت شدید تھا۔ پھر میں نے ان کی کہانی سنی تو سوچا کہ اس میں تو کچھ نہیں بچا۔ یہ باب تو مدت ہوئی بند ہو چکا ہے' لیکن میرا یہ احساس میری سوچ پر حاوی ہو گیا۔''

''تم میری بات سے اتفاق تو نہیں کرو گی لیکن ....'' اُما کے انداز میں تذبذب تھا۔

''لیکن کیا؟''

''دیکھو میرا مذاق نہ اڑانا' خود مجھے بھی اپنی بات کی حماقت کا احساس ہے' لیکن میں صرف ایک توجیہہ پیش کر رہی ہوں۔'' وہ اب بھی متذبذب تھی۔

''تم کہو تو۔''

''تم دو جنموں کو بھی نہیں مانتیں' میں بھی اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں' لیکن یونہی ایک خیال سا آیا تھا۔''

ماہ بانو کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ آ گئی۔ وہ اُما کا مذاق اُڑانا نہیں چاہتی تھی' اس لئے ٹشو پیپر منہ کے آگے رکھ کر کھانسنے لگی۔ اُما کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کیا سوچ رہی تھی۔ ابھی وہ کچھ کہنا

ہی چاہتی تھی کہ دروازہ کھول کر نیہاں اندر داخل ہوگئی۔

اُما اور نیہاں روم میٹ تھیں۔

''میں نے تم لوگوں کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اُس نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

''بالکل نہیں۔'' اُما نے خوش دلی سے کہا۔

نیہاں بہت ترنگ میں لگ رہی تھی۔ کندھے پر رکھا بیگ اُس نے بستر پر پھینکا' ہاتھ میں تھامے ڈھیروں پھول بھی کمرے میں اُچھال دیے۔

سوائے ایک پھول کے۔

ماہ بانو اور اُما نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ نیہاں گنگنانے لگی۔

''موسم گنگنا رہا ہے' دل دیوانہ گا رہا ہے
رستہ مجھ سے کہہ رہا ہے لگ جائے نہ ٹھوکر
دھیرے چل' دھیرے دھیرے چل۔''

پھر وہ اُن دونوں کی طرف مڑی۔

''شاعر بہت بدذوق لگتا ہے اتنے خوبصورت موسم میں ٹھوکر کا ذکر کرتا ہے' اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ کمبخت نے تھوڑی دیر تو اتنے حسین موسم کا لطف لے لینے دیا ہوتا۔''

اُما ہنس پڑی۔ ''ایسے موسم میں ہی تو ٹھوکر لگنے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔''

''شاعر نے حل بھی تو بتا دیا ہے یعنی دھیرے دھیرے چل' دھیرے چلو گی تو ٹھوکر سے محفوظ رہو گی۔'' ماہ بانو بولی۔

''جیسے تم نے یہ گلاب پکڑ رکھا ہے' احتیاط سے پکڑو گی تو کانٹے نہیں چبھیں گے۔'' اُما نے کہا۔

نیہاں دھم سے بستر پر بیٹھ گئی۔

''اس گُلاب کے کانٹوں سے مجھے چبھنے کا خوف محسوس نہیں ہو رہا' نہ ہی اس موسم میں ٹھوکر لگنے کا ڈر ہے۔''

''یہ بھی گئی کام سے۔'' اُما بولی۔ ''زور کس پر ہوا'' ''بھی'' پر۔''

''اور دونوں کن شکار ہوا ہے؟'' اُس نے اپنی سُرمئی آنکھیں اُن کے چہروں پر گاڑ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

''ہم دونوں میں سے کوئی شکار نہیں ہوا' یونہی کالج کے بارے میں عمومی بات کی تھی۔'' ماہ بانو نے جلدی سے کہا۔

''اچھا میں [illegible] اور بھی ہنسی۔

''لیکن ہم کچھ نہیں سمجھے' تم بتاؤ کہ یہ پھول تمہیں کس نے دیا ہے؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''چھوڑو بھی' اُس نے تو صرف دوستی کی غرض سے دیا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں کو دیا ہے' لیکن خوش ہو جانے میں کیا حرج ہے۔'' وہ ہنسی۔

''کیا حماقت ہے' ہم لڑکیوں کی' اتنی بے معنی باتوں پر بھی خوش ہو جاتی ہیں۔'' اُما نے کہا۔

☆======☆======☆

''زرینہ کی موت حیدر علی شاہ کے لئے ایک ایسا صدمہ تھی' جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ فوزیہ اُس کی پسند نہیں تھی' لیکن اپنی ناکامی کا بدلہ اپنی بیوی سے لینا' حیدر علی کو کسی طور گوارہ نہیں تھا۔ اُس نے فوزیہ کو وہ سب کچھ دیا تھا۔ جس کی کوئی بھی عورت خواہش کر سکتی تھی۔ اُسے ایک لمحے کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ حیدر علی کی زندگی میں زبردستی داخل ہوئی تھی۔

اُس نے فوزیہ کو گھر پر پڑھایا لکھایا تھا اور ہر اہم اور غیر اہم بات فوزیہ سے ڈسکس کرنے کے بعد فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے فوزیہ کو اس کے ذہین ہونے کا احساس دلایا تھا۔ خود فوزیہ بھی بہت ذہین تھی۔ ایک مرتبہ جھجک دور ہو جانے کے بعد اس نے پڑھنے لکھنے میں بہت محنت کی تھی۔ گو کہ اس کے پاس کسی قسم کی ڈگری نہیں تھی' لیکن وہ ہر موضوع پر بحث کر سکتی تھی۔ نوکروں اور نوکرانیوں کی پوری فوج ہونے کے باوجود ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی کھانے پکانے میں مہارت رکھتی تھی۔ جس حویلی میں وہ رہتے تھے' اس کی سجاوٹ بھی بے مثال تھی۔ حیدر علی کے لئے وہ ایک بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔

رجب علی کے ساتھ اُن کے گھرانے کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو گئے تھے۔ زرینہ کی موت نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا تھا۔ فوزیہ بڑی حویلی چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار یاسمین بھی اُن کی طرف آتی تھی' لیکن دونوں بھائی پھر کبھی ایک دوسرے کی حویلی نہیں گئے۔ رجب علی نے ریشماں اور عبداللہ کے رشتے کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کی مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں بھائیوں کے دل میں بہت زیادہ غم و غصہ تھا' جسے قطعاً وہ دونوں چھپائے ہوئے تھے۔

غم و غصے کے اس طوفان کو باہر نکلنے کا بہانہ اس وقت ملا جب حیدر علی شاہ نے عبداللہ سے چھوٹی زہرہ اور زینب کو اسکول میں داخل کروایا۔ یہ خاندانی روایات کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ اُن کے گھرانے کی لڑکیوں کو تو چاند اور سورج کی کرنیں بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں' اور حیدر علی نے اُنہیں اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ آج معاملہ اسکول کی حد تک تھا۔ وہ دونوں بچیاں تھیں' لیکن کل کو جوان ہونے پر یہ بات کالج تک بھی پہنچ سکتی تھی' جس جس نے یہ بات سُنی دانتوں تلے اُنگلیاں دبا لیں۔

پیر صاحب جلال الدین شاہ کو فوت ہوئے دو سال ہو چکے تھے اور رجب علی اُن کی گدی

سنبھال چکا تھا۔ سو اب یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ خاندان کی روایات کی پاسداری کرے۔ اور خاندان کی روایات کہتی تھیں کہ بھائی کی بیٹیاں صرف بھائی کے گھر میں ہی بیاہی جا سکتی ہیں۔ زینب اور زہرا کی پیدائش پر رجب علی کے گھرانے میں خود ہی یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ دونوں اُن کے گھر کی بہو بنیں گیں۔ یہ بات تو رسمی طور پر طے کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

حیدر علی شاہ اس معاملہ پر خاموش تھا اور تب تک خاموش رہنا چاہتا تھا' جب تک رجب علی کے گھرانے کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو۔ یاسمین باتوں باتوں میں کبھی ذکر کر دیتی تو فوزیہ بات ٹال دیا کرتی تھی۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹیاں اپنی زندگی بڑی حویلی کے قید خانے میں گزاریں۔ جب تک اس نے حیدر علی کے ساتھ زندگی کا یہ نیا رُخ نہیں دیکھا تھا' تب تک اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی' لیکن ایک روشن اور بہتر ماحول دیکھنے کے بعد اب اس کا ذہن کسی تنگ اور گھٹے ہوئے ماحول کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ رجب علی کو زینب اور زہرا کے اسکول میں داخل ہونے کی خبر ملی تو' اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا' لیکن یہ اطلاع غلط نہیں ہو سکتی تھی ایک تو اطلاع لانے والا اس کا قابل اعتماد ملازم تھا اور دوسرے اسے حیدر علی کی روشن خیالی کا اندازہ بھی تھا۔ یہ سننے کے بعد لمحہ بھر بھی اس کے لئے گھر میں ٹکنا دوبھر ہو گیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں علی؟'' وہ حیدر علی کی حویلی میں لال انگارہ بن کر داخل ہوا تھا۔

''کیا؟'' حیدر علی نے تحمل سے پوچھا۔

وہ جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا اور اس سارے طوفان کے لئے تیار بھی تھا۔

رجب علی دانت پیس کر رہ گیا۔ اسے حیدر علی کے مزاج کا بھی اندازہ تھا۔

''تم نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا ہے؟'' اُس نے بھی تحمل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''جی ہاں' ویسے پڑھ تو وہ بہت پہلے سے رہی ہیں۔ میں اور فوزیہ گھر میں اُنہیں پڑھاتے رہے ہیں' اب آج ہی اُنہیں اسکول میں داخل کروایا ہے۔''

''تم ایسا نہیں کرو گے علی۔''

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں' اس لئے کہ مجھے آپ کا جواب معلوم ہے' مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

رجب علی کچھ دیر تک سگار انگلیوں میں گھماتا رہا۔ حیدر علی کو دیکھتے ہی برسوں پرانی کئی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں۔ بہت مشکل سے اس نے اِن یادوں کو ذہن سے جھٹکا تھا۔

حیدر علی اس کا بھائی تھا۔ جس سے وہ بیک وقت شدید محبت اور اتنی ہی شدید نفرت بھی کرتا تھا۔ اس وقت وہ چاہتا تھا کہ اس کی محبت غالب رہے' لیکن نہ جانے کیوں بار بار نفرت سر

اُبھار رہی تھی۔ اس سے کچھ کہنے سے قبل' رجب علی اپنی اسی نفرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آل رائٹ' مجھے اعتراض نہیں ہے اور یہ رعایت اس لئے ہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے' تم بچیوں کو پڑھانا چاہتے ہو تو ضرور پڑھاؤ لیکن اس طرح جیسے تم نے فوزیہ بھابی کو گھر میں پڑھایا ہے' دونوں بچیاں اسکول نہیں جائیں گی۔''

''زہرا اور زینب میری بیٹیاں ہیں اور ان کے متعلق اس قسم کا کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف مجھے اور فوزیہ کو ہے' مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات رد کر رہا ہوں۔''

''بہت غلط کر رہے ہو علی۔ آج کے دن تم اُنہیں اسکول لے گئے' یہ کوئی چھوٹی خطا نہیں ہے' لیکن تمہاری محبت سے مجبور ہو کر میں اسے نظر انداز کر رہا ہوں۔ کل وہ گھر سے نہیں نکلیں گی۔''

''میں نے کبھی آپ کے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کی اور مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی ایسا نہیں کریں گے۔'' حیدر علی نے کہا۔

''تم مداخلت کر بھی نہیں سکتے کیونکہ میں نے خاندان کی کسی روایت سے انحراف نہیں کیا اور میں تمہارے معاملات میں مداخلت اس لئے کر سکتا ہوں کیونکہ میں تمہار بڑا بھائی اور پیر ہوں۔'' رجب علی نے کہا۔ ''تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ گاؤں میں کیسی کیسی باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کتنی تھو تھو ہو رہی ہے۔ کیا اب سیّدوں کے' پیروں کے' خاندان کی بیٹیاں غیروں میں جا کر پڑھیں گی؟ گھر سے نکلیں گی؟ نہ تو ہمیں ان سے نوکریاں کروانی ہیں اور نہ اُن کی کمائی کھانی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کو خود بھی اپنی بات کے بے معنی ہونے کا احساس ہے۔ پڑھنے لکھنے کا مطلب نوکری کروانا یا کمائی کھانا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو سکیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹیاں بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اولاد کو اُن کا جائز حق دینا والدین کا فرض ہے۔''

رجب علی نفرت کے جذبے کو خود سے دور رکھنے کی جتنی بھی کوشش کر رہا تھا' حیدر علی اتنا ہی اسے ہوا دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم اپنا فرض پورا کرو میں اپنا فرض پورا کروں گا۔ میرا فیصلہ ہے کہ کل سے بچیاں گھر سے باہر نہیں جائیں گی۔''

''پھر جب ہم دونوں کا فیصلہ اٹل ہے تو کل کا سورج بھی کوئی دور نہیں ہے' نتیجہ کل پر چھوڑ دیں۔''

''اب بھی وقت ہے علی' زینب اور زہرا تمہاری بیٹیاں ہی نہیں' میری ہونے والی بہوئیں بھی ہیں۔ یہ بات مت بھولنا۔'' رجب علی کا انداز دھمکی دینے والا تھا۔

''لیکن یہ بات کب طے ہوئی ہے؟''

''یہ بھی اُسی طرح اٹل رشتہ ہے' جس طرح عبداللہ اور ریشماں کا رشتہ ہونا اٹل ہے۔'' رجب علی کو غالباً اندازہ تھا کہ یہ حیدر علی کی دُکھتی رگ تھی۔

''وہ بات آپ خود طے کر گئے تھے' لیکن زینب اور زہرا کے سلسلے میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان کی قسمت کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا اور وہ ابھی اتنی چھوٹی ہیں کہ اپنی رائے نہیں دے سکتیں' پھر یہ مناسب وقت بھی نہیں ہے۔ ہاں اگر دس بارہ سال بعد آپ یہ پیشکش کریں گے تو میں ضرور غور کروں گا اس پر۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' رجب علی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

''عبداللہ اور ریشماں کا رشتہ اُن کی مرضی کے بغیر طے ہوا ہے۔ پیر گھرانے کی کسی بیٹی کی شادی نہیں ہوتی اور یہ تم بھی جانتے ہو' اس لئے یہ رشتہ رسمی طور پر طے کرنا ضروری تھا' لیکن چھوٹے بھائی کی بیٹیاں ہمیشہ بڑے بھائی کے گھر بیاہی گئی ہیں۔ یہ ایسی روایت ہے' جس کے بعد رسمی طور پر کچھ طے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم دونوں بچیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھتے رہو اور میں دونوں کو اپنی بہویں سمجھتا رہوں گا اور اس کے بعد جو تم سے ہو سکے' وہ تم کرو' اور جو مجھ سے ہو سکے گا' وہ میں کروں گا۔ بہو گھر کی عزت ہوتی ہے اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا میں جانتا ہوں۔''

رجب علی دھمکی دے کر جا چکا تھا۔

فوزیہ کو علم ہوا تو وہ فکر مند ہوگئی۔

''اب کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے' میرے فیصلے پر عمل کرنے سے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں روک سکتا۔''

''لیکن وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں' میں اپنی بیٹیوں کو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''دونوں بچیاں مجھے اتنی پیاری ہیں کہ اُنہیں نظروں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ورنہ میں انہیں کسی دوسرے شہر میں بورڈنگ میں داخل کروا دیتا۔ حیدر علی نے کہا۔

''یہ تو بالکل مت کریں۔ وہ پتا لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور بچیوں کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو کیا ہوگا۔ یہاں ہم دونوں ہیں وہ لوگ جو قدم بھی اٹھائیں گے سوچ سمجھ کر ہی اُٹھائیں گے۔''

زینب اور زہرا قریبی شہر کے اسکول میں پڑھ رہی تھیں' جبکہ عبداللہ ان دِنوں لاہور میں بورڈنگ میں داخل تھا۔

اگلی صبح حیدر علی بچیوں کو لے کر اسکول جا رہا تھا۔ اُن کی کار کے پیچھے ایک جیپ میں گن مین اور محافظ سوار تھے۔ خود اُن کی کار میں بھی ایک گن میں موجود تھا۔ کافی راستہ خیریت سے طے

ہو چکا تھا۔ بڑی سڑک تھوڑی ہی دور تھی' ارد گرد پھیلے ہوئے وسیع کھیتوں سے اُن کی گاڑیوں پر فائرنگ کی گئی۔ دوسری طرف سے بھی جوابی کارروائی کی گئی۔ دونوں فریقین کا خاصا نقصان ہوا' لیکن حیدر علی اور دونوں بچیوں کو معمولی چوٹیں آئیں۔

اس واقعے کے بعد دونوں فریقیں کے درمیان کھلی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ حیدر علی نے عبداللہ کو بیرونِ ملک بھجوا دیا۔ دونوں بیٹیاں مری کانونٹ میں داخل کروائیں اور کسی کو اس بات کی خبر نہ لگنے دی کہ ان کے بچے کہاں ہیں۔

تمام تر غصے کے باوجود حیدر علی نے کبھی رجب علی کی اولاد کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ رجب علی اُن کی حویلی سے ایسا نکلا تھا کہ اب وہاں صرف فاتح کی حیثیت سے ہی داخل ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے حیدر علی کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جب یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تینوں بچے کہاں ہیں' تو جائیداد اور زمین کے بارے میں فساد ہوئے۔ کتنے مربعے کس بھائی کو ملنے چاہئیں' کون سی زمین کی کتنی پیداوار ہے' کسے زیادہ پیداوار والی زمین مل رہی ہے' وغیرہ۔

سخاوت علی' رجب علی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی وہ ویسا ہی تھا۔ اس کی اور رجب کی زمین اور جائیداد سب سانجھی تھی۔ حیدر علی کے خلاف وہ بھی بڑے بھائی کے خلاف صفِ آراء تھا۔

دن بیتتے چلے گئے۔ ''نفرت کا بویا ہوا بیج بڑھ کر تناور درخت بن گیا۔ جب حیدر علی کو احساس ہوا کہ اب عبداللہ کی جان کو خطرہ کم ہو گیا ہے تو اُسے واپس بُلا لیا گیا۔ یوں بھی اب اُن کے گھر کو ایک نوجوان بیٹے کی ضرورت تھی۔

رجب علی کے چھ بیٹے تھے اور تقریباً سب ہی جوان تھے۔

''زہرا سینئر کیمبرج کر چکی تھی' جبکہ زینب کر رہی تھی۔ پہلے تو ماں باپ دونوں بیٹیوں سے ملنے خود ہی چلے جاتے تھے' پر اب بیٹیاں اپنے گھر بھی آنا چاہتی تھیں۔ معاملات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ عبداللہ کی پاکستان میں موجودگی ضروری ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

ماہ بانو کے جانے کے بعد ریشماں اُس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

اس کی دنیا اس قدر محدود تھی کہ وہ ایک ہی بات کے متعلق کئی دِنوں تک سوچتی رہتی تھی' اور اکتاتی نہیں تھی۔

''نہ جانے اس کی ان سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔'' اُس نے سوچا۔ ''پتا نہیں وہ کیسے ہوں گے۔ کریمن کہتی ہے بہت اچھے ہیں۔ جب وہ اپنی خالہ سے ملنے اُن کے گاؤں جاتی ہے تو انہیں دیکھ کے آتی ہے' اور میں اُس کی آنکھوں میں ان کی شبیہہ کھوجتی رہ جاتی ہوں۔

اماں جان بھی تو بہت تعریف کرتی ہیں ان سب کی' اگر وہ سب اتنے اچھے ہیں تو پھر خدا جانے یہ دوری کیوں ہے۔ پتا نہیں نفرت کے بادل کب چھٹیں گے؟'' وہ تصور میں ماہ بانو کو اُن کپڑوں میں دیکھنے لگی جو ابھی کل ہی اُسے دیے تھے۔

''وہ اچھی لگ رہی ہوگی' بہت اچھی' پتا نہیں کیوں اسے کبھی یہ یقین نہیں آیا کہ وہ خوبصورت ہے' حالانکہ وہ تو بہت پیاری ہے۔''

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ' کریمن' دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ رجو سے مل کر آئی تھی۔ ''رجو سے مل کر آئی ہو؟'' اس نے کریمن سے پوچھا۔ کریمن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں حیرت کی چمک اُتر آئی۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا بی بی؟''

''یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے' تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔''

کریمن ہنس دی۔ ''پتا ہے بی بی' آج میری فرمائش پر رجو نے مجھے چاٹ کھلائی اور یہ پراندہ بھی وہی لایا تھا' میرے لئے۔'' اس نے اوڑھنی ایک طرف سرکا کر تیل سے بھیگے بالوں والی چوٹی آگے کر دی۔

''تو بہت خوش نصیب ہے کریمن' بغیر روک ٹوک کے جہاں جانا چاہتی ہے چلی جاتی ہے' لوگوں سے ملتی ہے' ہنستی ہے روتی ہے اور جسے پسند کرتی ہے اس سے مل بھی لیتی ہے۔'' ریشماں کے لہجے میں حیرت اُتر آئی۔

''نہ بی بی۔ یہ سب دور کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کے اپنے دکھ ہوتے ہیں' جو دُکھ مجھے ہیں وہ آپ کو نہیں اور جن دُکھوں سے آپ تڑپتی ہیں وہ میرے نہیں۔''

''تجھے کیا دُکھ ہے؟''

''مجھے۔'' کریمن نے ریشماں کے پاؤں دباتے ہوئے کہا' ''رجو مجھے اچھے اچھے کپڑے اور خوبصورت گہنوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے شادی کے بعد تجھے سونے میں پیلا کر دوں گا۔ پگلا کہیں کا' کہاں سے لائے گا اتنے گہنے' ڈاکہ ڈالے گا کیا؟'' وہ خود ہی ہولے سے ہنس دی۔

''تیرے پاس دکھانے کو کچھ نہیں اور دیکھنے والا موجود ہے اور میرے پاس اتنے زیور' اتنا کپڑا لتا موجود ہے لیکن دیکھنے والا کوئی نہیں۔''

ریشماں نے ایک لمحے کے لئے اپنا اور کریمن کا موازنہ کیا۔

پیلاہٹ گھلے سانولے سے رنگ والی کریمن' تیل میں ڈوبے بالوں کی پتلی سی چٹیا' عام سے نقوش' ناک اور کانوں میں سفید اور سرخ نقلی نگینوں کے زیور۔ یہ تھی کریمن۔

دوسری جانب ریشماں تھی' شہد میں گھلی رنگت' گھنے سیاہ لمبے بال' بڑی بڑی خوابناک شربتی آنکھیں' بھرے بھرے رسیلے ہونٹ اور مناسب جسم۔

وہ قدرت کی ستم ظریفی پر ہنس پڑی۔

''کیا ہوا بی بی' اللہ خوش رکھے' آپ ہنسیں کیوں؟''

''کچھ نہیں' سوچ رہی تھی کہ جس پھول سے ہوا اٹکھیلیاں نہ کرے' جسے تتلی نہ چومے' جس کے اوپر بھنورہ نہ منڈلائے' اس پھول کا رنگ اور مہک کس کام کے۔''

پتا نہیں کریمن نے اس کی بات کس حد تک سمجھی تھی' لیکن وہ بولی کچھ نہیں' سر جھکائے اس کے پاؤں دباتی رہی۔

''میں تھوڑی دیر کے لئے اماں جان کے پاس جاؤں گی۔'' ریشماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

خواب گاہ میں اماں جان کے علاوہ پیر صاحب رجب علی شاہ صاحب موجود تھے اور دونوں کے درمیان غالباً کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ پیر صاحب کا انداز حتمی تھا' جبکہ اماں جان دبے دبے انداز میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مناسب تو یہی تھا کہ ایسے میں ریشماں 'واپس پلٹ جاتی' لیکن اُن کی گفتگو نے اس کے قدم روک دیے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''مانا کہ ہماری اُن لوگوں کے ساتھ دشمنی ہے' لیکن وہ معاملہ مختلف ہے۔'' اماں جان کہہ رہی تھیں۔

''آپ کو زہرا اور زینب کی تعلیم پر اعتراض تھا' لیکن میں تو بات ریشماں کی کر رہی ہوں۔ وہ ماشاءاللہ جوان ہو چکی ہے۔ وہ جن کی امانت ہے' ہمیں اُن کے سپرد کر دینی چاہئے۔''

''یہ بات بھول کر بھی مت سوچنا' یہ بات برسوں پہلے ختم ہو چکی ہے۔''

''لیکن پیر صاحب! ہم زبان دے کر اس سے کیسے پھر سکتے ہیں؟'' اماں جان نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

''یہ برسوں پہلے اس وقت کی بات ہے' جب نہ علی کی شادی ہوئی تھی اور نہ ہماری' تب ہم نے کہا تھا کہ ہماری کوئی بیٹی ہوئی تو وہ کنواری نہیں رہے گی۔ ہم اپنے بھائی کے گھر سے رشتہ لیں گے' لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمارے ایک نہیں دو بھائی ہیں۔''

''میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔''

''بہت آسان بات ہے۔ ہم ریشماں کی شادی اپنے بھائی کے گھر کریں گے حیدر علی کے گھر نہیں سخاوت کے گھر۔ ریشماں' سخاوت علی کی بہو بنے گی۔''

''کیا؟'' اماں کچھ نہ سمجھی تھیں۔

''یہ ہمارا فیصلہ ہے۔'' پیر رجب علی شاہ صاحب کا انداز حتمی تھا۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے' اُن کی تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔''

پیر صاحب نے اطمنان سے سگار کی راکھ جھاڑی۔ ''یہ قصور ہمارا تو نہیں' اگر تین شادیاں

کرنے کے باوجود بھی اس کی قسمت میں اولاد نہیں لکھی' تو یقیناً اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی' بندہ کیا کرسکتا ہے۔''

''یہ ظلم نہ کریں پیر صاحب۔''

''اس سے آگے ایک حرف نہیں یاسمین بیگم۔ ہمیں اپنے آگے ہلنے والی زبان زیادہ پسند نہیں ہے۔'' پیر صاحب کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

اماں جان کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیے۔ ''یہ مسئلہ تو ختم ہوا۔''

''وہ دوسرا مسئلہ کیا تھا۔ جس کا تم نے کل رات ذکر کیا تھا؟''

''اماں جان نے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ پتھر سے سر ٹکرا رہی ہیں۔ اُن کی بات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا' لیکن ماں تھیں' جس چیز کو اولاد کے حق میں بہتر سمجھتی تھیں اُسے پورا کرنے کی اپنے تئیں کوشش کرتی رہتی تھیں۔

''خادم حسین اور امداد علی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ دونوں ماشاءاللہ جوان ہو چکے ہیں' اُن کا گھر بس جاتا تو اچھا ہوتا۔ گدی کا وارث آجاتا تو سب مطمئن بھی ہو جاتے۔ یوں بھی دونوں کے رشتے گھر کی بات ہے۔'' اماں جان نے پُر اُمید نگاہوں سے پیر صاحب کی طرف دیکھا۔

''اپنے دشمن کے گھر سے بیٹیاں لانا میری بھی دلی خواہش ہے' لیکن وہ دونوں لڑکیاں زہرا اور زینب' اس حویلی کی بہو بننے کے قابل نہیں ہیں' نہ جانے علی اُنھیں کہاں پڑھاتا رہا ہے۔ وہ یہیں پاکستان میں تھیں یا باہر تھیں اور پتا نہیں کتنے لوگ اُنھیں دیکھ چکے ہوں گے۔ کوئی عجب نہیں کہ اُن کی دوستی لڑکوں کے ساتھ بھی ہو۔''

اماں جان کو ایسے ہی اعتراضات کی توقع تھی۔ کہنے کو اُن کے پاس بہت کچھ تھا' لیکن وہ سب کچھ پیر صاحب سُننے پر آمادہ نہ ہوتے' اس لئے وہ چپ رہیں۔

''البتہ یہ مصدقہ اطلاعات ہیں کہ ان دِنوں زہرا حویلی میں ہی ہے اور وہ خادم حسین کی منگ ہے' وہ اس حویلی کی بہو بنے یا نہ بنے' اس کا نام ایک مرتبہ میرے بیٹے سے جُڑ چکا ہے اور اب کسی طور الگ نہیں ہوسکتا۔ وہ کسی اور کی بہو کسی اور کی بیوی نہیں بن سکتی۔''

''میری بالکل سمجھ میں نہیں آرہا پیر صاحب' نہ آپ اسے بہو بنانے پر تیار ہیں اور نہ ہی یہ چاہتے ہیں کہ اس کی کہیں اور شادی ہو تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''حیدر علی یہ جانتا تھا کہ اُس کی بیٹیاں ہماری بہو بنیں گی۔ اس حویلی کی عزت بنیں گی' پھر بھی وہ اُنھیں اپنی ڈگر پر چلاتا رہا۔ اس نے حویلی کی عزت تار تار کردی' اگر ہم چاہنے کے باوجود اس وقت اپنی عزت کی حفاظت نہیں کرسکتے تھے' تو اب اتنا تو کرسکتے ہیں کہ اس عزت کو مٹی میں ملانے والے کو اسی طرح مٹی میں ملا دیں۔''

''یعنی؟''

یعنی یہ کہ اس جمعرات کو زہرا یہاں ہوگی اور وہاں حیدر علی ہاتھ مل رہا ہوگا۔''

اماں جان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''آپ...... آپ ایسا نہیں کرسکتے' وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے' اس کی عزت ہے۔''

''وہ ہماری بھی عزت ہے' ہمارے ہاں بھی اسے پوری عزت ملے گی۔

''آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟'' اماں جان نے ملتجی انداز میں پوچھا۔

''اس کی جگہ اس حویلی میں تو رہی نہیں' ہاں قبر کی مٹی سب کے عیب ڈھانپ لیتی ہے۔''

☆======☆======☆

فنکشن بہت دلچسپ تھا۔ ماہ بانو کو درمیان میں ہی اٹھ جانا پڑا۔ اماں کہہ چکی تھیں کہ ابا کو بھیجیں گی اور وہ اباجی کو انتظار کروانا نہیں چاہتی تھی۔ عبداللہ اس کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ جانے لگی ہو؟ ابھی تو بہت فنکشن رہتا ہے۔''

''اماں نے دس بجے کی اجازت دی تھی۔''

سب کو بائے کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا لیکن رات کے وقت موسم کافی خنک ہو جاتا تھا۔ تیز تیز چلتی وہ پارکنگ میں آگئی۔ ابھی وہ نیم تاریکی میں اچک اچک کر اباجی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے ابھرنے والی قدموں کی چاپ سن کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کے پیچھے روش پر انگلی میں کی چین گھماتا عبداللہ آرہا تھا۔

''تمہاری وجہ سے مجھے بھی پروگرام ادھورا چھوڑنا پڑا۔''

''میری وجہ سے؟'' ماہ بانو نے کہا۔

''تو اور کیا۔ میں نے سوچا کہ پتا نہیں تم کیسے جاؤ گی۔ پتا نہیں تمہارے ساتھ کوئی ہوگا یا نہیں۔ یہی سوچ کر اٹھ آیا۔''

''یہ مہربانی صرف مجھ پر ہی ہے یا تم سب غریبوں پر اسی طرح ترس کھاتے ہو؟''

''تت تت۔ تم اپنی غریبی پر کس قدر شرمندہ رہتی ہو ہر وقت۔ ویسے میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر غریب کی مدد کروں۔ اور اگر وہ غریب کوئی خوبصورت لڑکی ہو تو کیا کہنے۔''

''اف عبداللہ۔'' ماہ بانو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔ ''میری کوئی کمزوری ہے تو پلیز اس پر مجھے شرمندہ مت کرو۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمی یا خامی تو ہوا ہی کرتی ہے۔ پتا ہے مجھے اچھا نہیں لگتا جب میں دیکھتی ہوں کہ میرے اباجی اتنے ذہین اور پڑھے لکھے ہیں لیکن ایک ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

اور رہ گئی یہ بات کہ غریب لڑکی خوبصورت بھی ہو تو یہ مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ یہاں تم غلط÷

دروازے پر دستک دے رہے ہو کیونکہ میں غریب ہونا تو مانتی ہوں لیکن خوبصورتی ہرگز ہرگز، نہیں۔''

''میں تمہیں یہ یقین دلانے کی کوشش نہیں کروں گا کہ تم خوبصورت ہو یا نہیں۔ یہ بتاؤ کہ گھر کیسے جاؤ گی؟''

''ابا جی لینے آجائیں گے۔ ان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

''اب تک آئے نہیں؟''

''بس دس ساڑھے دس کا ٹائم دیا تھا ناں اماں جان نے۔ ویگن پر آتے آتے دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔''

''اتنی دیر کے لئے اندر چلی چلو'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں۔ اس طرح پتا نہیں کتنی دیر ابا کو انتظار کرنا پڑے۔ تم جاؤ پروگرام دیکھو۔''

''ہم مل کر انتظار کر لیتے ہیں۔''

وہ دونوں عبداللہ کی وائن کلرڈ ٹیوٹا کراؤن سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

''اب گاؤں کب جاؤ گے؟''

''ابھی کل تو آیا ہوں۔ اب کچھ دن ٹھہر کر ہی جاؤں گا'' اس نے کہا۔

''مجھے بہت نیند آرہی ہے۔ پتا نہیں ابا جی کب آئیں گے۔''

''کل سارے سفر میں تم سوتی رہی ہو۔ صبح کالج بھی دیر سے آئی ہو جس کا مطلب ہے کہ گھر میں بھی تم نے نیند پوری کر لی تھی پھر اب اتنی جلدی پھر نیند آرہی ہے۔''

''وہ کوئی نیند تو نہیں تھی نا۔ صبح بھی اماں جان نے اتنی جلدی جگا دیا۔ تمہیں نہیں آرہی نیند تو مجھے بہت حیرت ہوگی۔''

''تمہیں بھی سرامکس (Ceramics) سے کوئی دلچسپی ہے؟'' عبداللہ نے گفتگو کا رخ تبدیل کیا۔

''بہت زیادہ۔ جو کچھ ابا جی بناتے ہیں وہ سب کچھ میں بنا لیتی ہوں۔ انھیں بہت سے مشورے بھی دیتی ہوں لیکن ابا جی کے بنائے ہوئے برتنوں کی کیا اہمیت۔

مارکیٹ میں اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کا بنایا ہوا برتن کتنا خوبصورت اور معیاری ہے۔ مارکیٹ میں اصل اہمیت ہے قیمت کی۔ گھڑا ٹیڑھا بنا ہوا ہے یا نہیں، ہنڈیا اور گلدان کیسے ہیں اس بات کی کسی کو پروا ہے۔ جو چیز سستی ہے وہ خریدی جاتی ہے۔''

''تو تم مارکیٹ تبدیل کر سکتی ہو۔ اپنے برتنوں میں تھوڑی سی جدت پیدا کرو پھر دیکھو کہ اس کا ریٹرن کتنا ہے۔''

''تو ہے پہلے [illegible] کے حوالے سے میں سرامکس میں بہت جدت

دے سکتی ہوں لیکن مارکیٹنگ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر اس کے لئے سرمایہ بھی چاہیے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔''

''مارکیٹنگ تو اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ میں آج صبح تمہارے گھر میں دیکھ رہا تھا۔ وہاں صحن میں کافی سارے برتن پڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ انہیں بنانے والے میں وہ حسن جمال ہے جو کسی عام کمہار کے پاس نہیں ہوتی۔

تمہارے ابا جی سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوئیں۔ وہ بھی مجھے بہت مختلف لگے۔ کمہار لفظ سن کر جو ایک تصور ذہن میں آتا ہے وہ ویسے نہیں تھے۔ مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی ان سے مل کر۔ وہ تعلیم یافتہ ہی نہیں، بہت باشعور بھی لگ رہے تھے مجھے۔''

جب ابا جی کے متعلق کوئی ایسے بات کرتا تھا تو ماہ بانو کو بہت خوشی ہوتی تھی۔

''ہاں، وہ بہت باشعور ہیں۔ ان کے پاس صرف ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے ڈگری۔ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔''

''باقاعدہ تعلیم نہ لینے کے باوجود جو اتنا علم حاصل کرے، وہ شخص میرا آئیڈیل ہوتا ہے۔ میری اماں جان ہیں ناں انہوں نے بھی کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بابا جان نے انہیں خود پڑھایا لکھایا۔ تم ان سے ملو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ اماں جان نے کبھی کالج کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''

اماں جان کی سنائی ہوئی کہانی سے ماہ بانو کے ذہن میں عبداللہ کی اماں جان کا ایک دھندلا سا خاکہ بن گیا تھا۔

''کیسی ہیں تمہاری اماں جان؟ میرا مطلب ہے ویسی ہی ہیں جیسی تمہارے خاندان کی دوسری عورتیں ہیں؟''

''تم میرے خاندان میں کس کس سے ملی ہو؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''میں؟ گاؤں میں میرا آنا جانا ہے، حویلی میں بھی ہے۔ وہاں جو عورتیں ہیں سب ہی سے واقفیت ہے۔'' اس نے بھی گول مول سا جواب دیا۔

''میں نہیں جانتا کہ میرے خاندان کی عورتیں کیسی ہیں۔ صرف اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ کیسی ہوں گی۔ تم تو جانتی ہو کہ ہمارے یہاں پردہ کتنا سخت ہوتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میری اماں اور دونوں بہنیں سب سے مختلف ہیں۔ بہنیں تو خیر کانونٹ میں پڑھی ہیں لیکن تم اماں جان سے بھی علاقائی، انگریزی یا اردو کسی بھی زبان میں بات کر سکتی ہو۔

ہمارا رہن سہن کا انداز بھی سب سے مختلف ہے۔ اماں جان اور دونوں بہنیں پردہ نہیں کرتیں البتہ گاؤں جاتے وقت چادریں لے لیتی ہیں اور گاڑی میں بھی پردے لگے ہوئے ہیں۔ ہم تبدیل ہو گئے ہیں لیکن گاؤں والے اب تک نہیں بدلے اس لئے وہاں تو یہی انداز ہیں۔

رہنا پڑتا ہے۔''

ماہ بانو اس کی باتیں سن رہی تھی لیکن اس کا ذہن ریشماں کی طرف تھا۔ وہ اس شش و پنج میں تھی کہ اسے ریشماں کے متعلق بتائے یا نہیں، لیکن ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ گیٹ سے ابا جی داخل ہوئے۔

''ابا جی آگئے۔''

وہ دونوں آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر کی رسمی گفتگو کے بعد جب وہ جانے لگے تو عبداللہ بولا۔

''اس وقت اگر کوئی دقت ہو تو میں گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

تھینک یو ویری مچ بیٹا...... ہم چلے جائیں گے۔'' ابا جی نے کہا۔

''ابا جی کتنی ٹھنڈک ہوگئی ہے۔'' گیٹ سے نکل کر ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ماہ بانو نے کہا۔

''باہر ٹھنڈک ہے لیکن گھر کا موسم بہت گرم ہے۔''

''اماں جی کا موڈ بگڑا ہوا ہوگا لیکن کوئی بات نہیں میں ٹھیک کرلوں گی۔''

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں بیٹھی ریشماں گہری سوچ میں گم تھی۔ اماں اور ابا جان کی گفتگو اس کے لئے نا قابلِ یقین تھی۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے بابا جان سے بے پناہ محبت تھی۔ اِدھر اُدھر سے ان کے متعلق بہت سی باتیں اس کے کان میں پڑتی رہتی تھیں لیکن اس کی محبت اسے مجبور کرتی تھی کہ وہ ان باتوں پر یقین نہ کرے۔

وہ جانتی تھی کہ برسوں پہلے بابا جان نے چچا جان اور ان کی بیٹیوں پر فائرنگ کروائی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انہوں نے عبداللہ کو نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس سے قبل ہی چچا جان نے اسے ملک سے باہر بھجوا دیا تھا۔ کہاں بھجوایا تھا۔ اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بابا جان نے جائیداد اور زمین کی تقسیم کے وقت بھی چچا جان کے حقوق غصب کئے تھے۔

لیکن وہ ان حقیقتوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھی۔ ان کے متعلق سوچتی تک نہیں تھی، کیونکہ اپنے ابا جان کو ایک لمحے کے لئے بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور بابا جان سے اس کی یہ محبت یک طرفہ بھی نہیں تھی۔ وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ کم از کم ریشماں تو یہی سمجھتی تھی۔

مگر آج اپنے کانوں سے یہ سب سننے کے بعد جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر دشمنی اپنی جگہ، لیکن عبداللہ سے منسلک ہر چیز سے بھی اسے بے پناہ محبت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی بھی حویلی میں رہے اس کی محبت ہر جگہ ہر فرد سے ہے، آج نہیں تو کل آتش فشاں پھٹے گا ضرور

'اور اس کی لپیٹ میں وہ سب لوگ آئیں گے جن سے وہ محبت کرتی ہے اور اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ اسے کسے بچانا یا کس کے ساتھ لاوے میں بہہ جانا ہے۔ پر یہ سب جاننے کے باوجود بھی وہ اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

جاننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اب تک وہ آنکھیں بند کر کے مشکل کے گزر جانے کا انتظار کرتی رہی تھی لیکن آج اس پر انکشاف ہوا تھا کہ اب آنکھیں کھولنے کا وقت آچکا تھا۔ اسے جاننے سے بڑھ کر یہ سب کچھ سمجھنا تھا۔

وہ بابا جان کی محبت کے حصار سے نہیں نکل سکتی تھی۔ اور عبداللہ سے محبت کرنا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ دو کشتیوں میں سوار تھی۔ کسی ایک کا انتخاب کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کہ کشتیاں ڈوبیں نہ ڈوبیں، دو کشتیوں کا سوار ہمیشہ ڈوب جاتا ہے لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ ان دونوں کشتیوں کو صحیح سالم منزلِ مقصود تک پہنچانا چاہتی تھی کسی بھی قیمت پر۔

''لیکن کیسے؟'' یہ وہ سوال تھا جس کا جواب پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ سوچ رہی تھی۔

اپنے متعلق وہ اتنی پریشان نہیں تھی۔ سخاوت چچا کے گھر کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کی طرف سے اسے فوری خطرہ نہیں تھا۔ جس مسئلے کو جلدی نمٹایا جانا ضروری تھا وہ زہرا کا مسئلہ تھا۔ آج ہفتہ تھا جو ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس کے پاس کچھ کرنے کے لئے صرف چار دن تھے لیکن وہ کیا کرے؟ سوچ سوچ کر اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

رات کو سونے کے لئے لیٹتے کے ساتھ ماہ بانو کے ذہن میں گزشتہ دو روز میں ہونے والے واقعات کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور سب خیالات جھٹک کر جلد از جلد سونا چاہتی تھی لیکن خیالات کا ہجوم تھا جو اُمڈا چلا آ رہا تھا۔

''مجھے کیوں لگتا ہے کہ میرے گرد کوئی کہانی بُنی جا رہی ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''عبداللہ اچھا ہے، بہت اچھا دوست ثابت ہوگا لیکن پتا نہیں کیوں جیسے اندر کہیں سے وارننگ مل رہی ہے کہ مجھے اس سے دور ہٹ جانا چاہئے۔ ہٹ تو جاؤں لیکن کیا صرف چھٹی حس کی بنیاد پر؟ ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اور دور ہٹ جاؤں تو ریشماں سے کیے ہوئے وعدے کا کیا ہوگا؟

آج اُماں نے عجیب سی توجیہہ پیش کی۔ میرے احساس کی، دوسرے جنم کی۔ وہ متذبذب تھی لیکن صرف زبانی طور پر، اس کی آنکھوں میں یقین تحریر تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ کیا میں زرینہ خالہ کا دوسرا جنم ہوں؟ پھر ریشماں کا مقام کون سا ہے؟ عبداللہ کہاں اسٹینڈ کرتا ہے؟''

اپنی اس سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آگئی۔ ''میں بھی کتنی احمق ہوں۔ وہ تو ہندو ہے۔ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہو سکتی ہے لیکن مجھے کیا ہوا ہے کہ میں بھی اسی سوچ کو اپنے ذہن میں جگہ دے بیٹھی۔ بات چھٹی حس تک رہے تو قابلِ قبول ہے لیکن دوسرا جنم۔'' وہ پھر ہنس پڑی۔ ''حد

ہوتی ہے ناں حماقت کی۔"

اُما کا خیال آیا تو اسے ایڈی کا خیال بھی آ گیا۔"اور ایڈی کیا حماقت کر رہا ہے۔ اگر وہ صرف وقت گزاری کے خیال سے ایسا کر رہا ہے تو برا کر رہا ہے اور اگر فلرٹ نہیں کر رہا تو مزید بر اکر رہا ہے۔ مانا کہ انسان محبت میں اندھا ہو جاتا ہے لیکن اب ایسا بھی کیا اندھا ہونا۔ خیر یہ اچھا ہے کہ اُما اس حماقت کا جواب اثبات میں نہیں دے رہی۔

اور نیہاں نے اُما کی روم میٹ ہونے کے باوجود بھی اس نے بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ اسے کون پسند ہے۔ کبھی ذکر تک نہیں کیا اُما سے' پتا نہیں آج کیسے کہہ دیا۔ شاید اتنی خوش تھی اس لئے' لیکن نام پھر بھی نہیں بتایا۔ مگر وہ ہو گا کون؟ یقیناً کوئی بہت توپ چیز ہوگا۔ وہ کسی عام سے شخص کو پسند نہیں کر سکتی۔ خیر اب کل سے کالج میں اس پر نگاہ رکھیں گے خود ہی پتا چل جائے گا۔"

یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اگلا دن گھر پر ہی گزرا۔ فنکشن کے بعد ایک دن کی چھٹی تو وہ شور شرابا کر کے ہی لے لیتے تھے۔ ماہ بانو ابا جی کے پاس چلی آئی۔

"چلیں ابا جی میں آپ کی مدد کر دوں۔" وہ پیڑھی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ "مٹی کی ہانڈیاں بن رہی ہیں۔"

"ہوں۔" ابا جی نے مٹی چاک پر رکھی اور چاک گھومنے لگا۔

"دیں' میں بنا دوں۔" ماہ بانو نے کہا۔

"تم یہ برتن بھٹی میں رکھ دو۔ یہ ہانڈیاں میں ہی بنا لوں گا۔ تم ٹیڑھی میڑھی کر دیتی ہو' توجہ نہیں دیتیں۔"

"چھوڑیں ابا جی۔" اس نے برتن اٹھا کر بھٹی میں رکھے۔ "جو لوگ آپ سے یہ ہانڈیاں خریدتے ہیں وہ بہت بدذوق ہوتے ہیں' اس لئے میں زیادہ توجہ کوالٹی کی بجائے تعداد پر دیتی ہوں۔ حسن جمال سے بالکل کورے ہیں یہ لوگ۔" اس نے بھٹی کا درجہ حرارت نو سو ڈگری (900 C) سینٹی گریڈ کر دیا اور واپس آ بیٹھی۔

"جو کام بھی کرو بانو اس میں پیسے کو ضرور اہمیت دو لیکن پیسے سے زیادہ اہمیت اس خوشی کی ہوتی ہے جو اپنی پسند کا کام کر کے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔"

وہ ابا جی کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہی جو چاک پر بہت مہارت سے مٹی کے عام سے پیڑے کو شکل دے رہے تھے۔

"ابا جی۔" بہت دیر بعد وہ بولی۔ "آپ نے اتنا کچھ پڑھا ہے۔ کیا بزنس اور مارکیٹنگ وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ پڑھا ہے۔"

"بیٹا میں بے استاد تھا۔ کوئی استاد نہیں ملا مجھے۔ اکنامکس کے متعلق عمومی باتیں تو سمجھ آ جاتی ہیں لیکن ہارڈ کور اکنامک ایشوز (Hard Core Economic Issues) وغیرہ

کے متعلق مجھے کچھ نہیں پتا۔ اسی طرح بزنس اور مارکیٹنگ کے متعلق بھی میری معلومات صفر نہیں تو اس سے صرف چند پوائنٹ اوپر ہو گی۔"

"کل میری اور عبداللہ کی ڈسکشن ہو رہی تھی۔ اگر ہمیں مارکیٹنگ کے متعلق پتا ہو اور سرمایہ مل جائے تو ہم اپنا بزنس کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس Skil ہے اور میرے پاس Creativity دیکھیں ابا جی۔" اس نے پیڑھی مزید آگے سرکا لی۔ "سرامکس کی مارکیٹ میں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک تو جدی پشتی کمہار ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو کہیں سے سیکھ کر اس مارکیٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً جیسے ہمارے کالج سے۔

جن لوگوں کا یہ آبائی پیشہ ہے یعنی وہ کمہار ہیں ان کے پاس ہنر ہے۔ ان کا مقابلہ کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس نے کہیں سے یہ علم سیکھا ہو لیکن کمہاروں کے پاس جس چیز کی کمی ہے وہ ہے تخلیقی صلاحیت۔ وہ مارکیٹ کے نئے ٹرینڈز کو نہیں جانتے۔ انہیں نہیں پتا کہ Cramic Pieces کی کیا قدر و قیمت ہے۔ ان کی ساری زندگی اسی قسم کی ہانڈیاں' صراحیاں اور گھڑے وغیرہ بنانے میں گزر جاتی ہے۔ ان کے پاس جدت کی کمی ہے۔

اور ابا جی جو لوگ کہیں سے سیکھ کر اس میدان میں اترتے ہیں ان میں تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے۔ جدت بھی ہوتی ہے اور مارکیٹ کے نئے ٹرینڈز کو بھی سمجھتے ہیں ان میں کمی ہوتی ہے Skill کی۔ ان کا ہاتھ اتنا پختہ نہیں ہوتا جتنا کہ کمہار کا ہوتا ہے۔"

ابا جی مسکرا دیئے۔ "لیکن میری بیٹی میں دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ہنر بھی اور تخلیقی صلاحیت بھی۔"

"نہیں ابا جی میرے پاس ہنر کہاں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے لیکن مجھ میں وہ بات نہیں جو آپ میں ہے۔ میرے پاس بس صرف تخلیقی صلاحیت ہے۔ ابا جی اگر میں ڈیزائن کروں اور آپ بنائیں تو ہم مارکیٹ میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں۔"

ابا جی کو سنجیدہ سنجیدہ سی پُر جوش ماہ بانو بہت اچھی لگی۔ وہ مسکرا کر پھر چاک پر رکھے مٹی کے پیڑے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میرا خیال ہے ابا جی کہ آپ نے میری باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میں کسی خواب و خیال کی دنیا کی باتیں نہیں کر رہی۔ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں ہم اگر جدوجہد کریں تو۔"

"نہیں بانو میں انہیں خواب و خیال کی باتیں نہیں سمجھ رہا لیکن تم نے خود کہا کہ اس کے لیے مارکیٹنگ کی سمجھ بُوجھ ہونا ضروری ہے اور سب سے بڑھ کر سرمائے کی ضرورت ہے جو کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ابا جی انسان قدم بڑھانے کے متعلق سوچے تو راہیں خود بخود ملتی جاتی ہیں۔"

"اچھا سرمایہ مل جائے تو تم کیا کرو گی۔ کس قسم کی چیزیں بناؤ گی؟"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''میرے پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم نیا چاک لیں گے یہ چاک پرانا ہے اور اس پر کچھ بناتے ہوئے زیادہ وقت اور محنت خرچ ہوتی ہے اور میں بناؤں تو ہر چیز کا زاویہ الٹا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم بھٹی بھی تبدیل کریں گے۔ ٹھیک ہے ہم گملے وغیرہ بھی بنائیں گے لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہم زیادہ تر کام Stone Ware اور پورسلین Porcelain میں کریں۔''

''یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے کیونکہ میں نے زیادہ تر کام عام چکنی مٹی سے ہی کیا ہے یا پھر Stone Ware میں۔''

''اور صرف یہی نہیں ہے ابا جی اگر ہم صرف ٹائلز Tiles بنانے لگیں تو بھی کاروبار کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔''

''اچھا اس پر سوچیں گے تم یہ ہانڈیاں بھٹی میں رکھ دو اور وہ دوسری نکال لو۔''

وہ ہانڈیاں بھٹی میں رکھنے لگی تو ابا جی مٹی کا ایک اور پیڑا چاک پر رکھ کر سوچنے لگے کہ ماہ بانو کو اتنی اونچی اڑان کا خیال کیسے آیا۔

''اسی لئے تو میں نے اسے آرٹ کالج میں داخل کروایا تھا۔'' انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی سوچ لیا کہ اس کی اُڑان محدود نہ ہو اور اسے اُڑنے کے لیے وسیع و عریض آسمان ملے۔ کمہار کتنا بھی آگے کے لئے کیوں نہ سوچ لے' وہ ایک کے بعد ایک نہایت احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتا ہے اور بعض اوقات سیڑھیاں چڑھ بھی نہیں سکتا۔ وہیں کھڑا رہتا ہے جہاں سے سفر شروع کرتا ہے۔

لیکن آرٹسٹ کی تخلیقی صلاحیتیں اسے چین نہیں لینے دیتیں۔ وہ پیچھے کی نہیں آگے کی سوچتا ہے۔ اس وقت کے بارے میں سوچتا ہے جسے برسوں بعد آنا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ایک ہی جست میں باقی سب سے آگے نکل جاتا ہے۔ کسی عام شخص کی طرح پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر دوسری سیڑھی کے متعلق نہیں سوچتا بلکہ اس کی سوچ دسویں سیڑھی کے متعلق ہوتی ہے اور وہ دسویں اور وہاں سے بیسویں سیڑھی پر جست لگاتا ہے۔''

''انھیں ابا جی میں بناتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

ابا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ذرا توجہ سے ٹیڑھی میڑھی نہ کر دینا۔''

اس دن ماہ بانو نے کتنے ہی برتن بنائے۔ یہ کام کرتے ہوئے اسے ایک عجیب سی سرشاری کا احساس ہوتا تھا۔ کبھی کبھار وہ سوچتی تھی کہ شاید یہ خون کا اثر تھا کہ اسے بھی اس کام میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ ابا جی کو۔

لیکن اس کا کام کرنے کا انداز جدا تھا۔ وہ ایپرن پہننا کبھی نہیں بھولتی تھی۔ بال باندھ کر کام کرتی تھی اور عام برتن بناتے وقت یہ بات ہمیشہ یاد رکھتی تھی کہ خریدنے والوں کو ان کی

خوبصورتی سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ کم قیمت کے برتن خریدنا چاہتے ہیں اور بس۔

مگر گلدان اور سجاوٹ کی دوسری اشیا بناتے ہوئے وہ ان کی خوبصورتی کا پورا خیال رکھتی تھی۔

ابا جی اور اماں سارا دن اس کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی اس کی مدد بھی کر دیتے تھے۔ اور وہ سارا دن مٹی اور چاک سے کھیلتی رہی۔

☆======☆======☆

ریشماں کا اگلا دن بھی اسی سوچ میں گزرتا جا رہا تھا کہ وہ زہرا کے لئے کیا کر سکتی ہے۔

''بی بی میں دیکھ رہی ہوں آپ کل سے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ خیریت تو ہے؟'' اس کے دوپٹے پر گوٹا لگاتی کریمن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے بی بی۔ پریشان تو آپ ہوتی ہیں لیکن اس قدر پریشان میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کل سے آپ نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔''

''وہم ہے تمہارا اور کچھ بھی نہیں ہے۔'' ریشماں نے بات ٹالنے کی کوشش کی اور کاپی کھول کر اس سبق پر نظریں جما دیں جو کل ہی اس نے سبط حسن سے پڑھا تھا لیکن نظریں صفحے پر ہونے کے باوجود بھی اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک ترکیب آئی۔ گو کہ اس پر عمل کرنا بہت مشکل تھا۔

''میرے پاس بانو کا لاہور کا پتا موجود ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''اگر میں اسے خط لکھ کر تمام صورت حال بتا دوں تو وہ یقیناً یہ سب کچھ انھیں بتا دے گی اور وہ یا تو خود کچھ کریں گے یا پھر چچا جان کو بتا دیں گے' لیکن خط جائے گا کیسے؟ اور مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ بانو ان سے ملی بھی یا نہیں؟ وہ کالج آئے یا نہیں؟''

اس نے کوئی اور زیادہ بہتر اور قابل عمل ترکیب سوچنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔ اس نے ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ حویلی میں کریمن پر خاص نظر رکھی جاتی تھی۔ اسے ٹھیک طور سے معلوم نہیں تھا لیکن دبے دبے انداز میں کی گئی یہ بات بہت مرتبہ اس کے کانوں میں پڑی تھی کہ اس کی پھوپھی کی بغاوت میں ان کی ذاتی ملازمہ کا بھی ہاتھ تھا جس کی پاداش میں اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ اصل واقعہ کیا تھا۔ اس کا اسے مکمل طور پر علم نہیں تھا۔ البتہ اس بات کا اسے احساس تھا کہ کریمن پر نظر رکھے جانے کا ان واقعات سے گہرا تعلق تھا۔

مگر وہ اب بھی حرکت میں نہ آئی تو پھر شاید بہت دیر ہو جاتی اور اس کے لئے وہ خود کو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ بالآخر اس نے کریمن کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

''کریمن میں واقعی پریشان ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں آپ پر صدقے بی بی!'' وہ دوپٹا اور گوٹا چھوڑ کر اس کے قدموں میں آبیٹھی۔ ''آپ حکم کریں۔''

''لیکن اس بات کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے ورنہ بہت برا ہوگا۔ میرے ساتھ تو شاید اتنا برا نہ ہو لیکن تمہاری خیر نہیں ہوگی۔''

''آپ حکم تو دیں' کریمن کی جان بھی حاضر ہے۔ آج تک یہاں کا نمک کھایا ہے۔ میں تو آپ کی خدمت پر مامور ہوں بی بی' لیکن آپ نے کبھی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے میری اوقات سے بھی بڑھ کر رکھا' اپنے قدموں میں جگہ دی۔ آپ بس حکم کریں۔''

''میں نے بانو کو ایک خط لکھنا ہے' وہ مجھے بہت یاد آرہی ہے۔ جی چاہتا کہ خط لکھ کر کچھ باتیں کرلوں لیکن تم جانتی ہو' میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''پھر بی بی؟''

''نہ میرے پاس لفافہ ہے اور نہ میں خط ڈاک میں ڈال سکتی ہوں۔ اگر تم ساتھ دو تو میری مشکل حل ہوجائے۔''

''لیں بی بی' یہ کوئی کام ہوا۔ میں کل ہی آپ کو لفافہ لا دوں گی۔ آپ خط لکھ کر رکھیں باقی کام کریمن پر چھوڑ دیں۔''

''لیکن دھیان سے جانتی ہوناں کہ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں۔ کریمن اپنی جان دے دے گی لیکن آپ پر آنچ نہیں آنے دے گی۔''

رات کو کاغذ قلم پکڑے کتنی دیر وہ سوچتی رہی کہ کیا لکھے۔

''پیاری بانو۔'' اس نے لکھنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ریشماں کا دل زور سے دھڑکا۔ کاغذ اور قلم تکیے کے نیچے چھپا کر جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔ دروازہ کھول کر اندر آنے والا خادم حسین تھا۔

''بھائی آپ؟'' اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

''ہوں۔ کیسی ہو؟'' وہ مسہری کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے نظریں چرا کر کہا۔ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ نہ پڑھ لے جو ریشماں چھپانا چاہتی تھی۔

''تم تو واقعی پریشان لگ رہی ہو۔'' خادم حسین نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

''میں نہیں تو۔'' اس نے بے جان سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر کھانا کیوں نہیں کھایا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے کل سے ٹھیک سے کھایا پیا نہیں

ہے۔ کیا ہوگیا میری گڑیا سی بہن کو۔''

''نہیں بھائی' کچھ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''مجھ سے بھی چھپاؤ گی میں سچ مچ ناراض ہو جاؤں گا۔'' اس نے بہت پیار سے کہا۔

ریشماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سر جھکالیا۔

''کیا ہوا گڑیا رو کیوں رہی ہو۔'' وہ بے چین ہو کر اس کے برابر آبیٹھا اور اس کا رخ اپنی طرف پھیر کر بولا۔ ''کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟ مجھے بتاؤ۔''

وہ کچھ نہ بولی۔

''بھائیوں نے کچھ کہا ہے؟ سبط نے تو نہیں ڈانٹا سبق نہ یاد کرنے پر؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''پھر؟ اماں یا بابا جان نے کچھ کہا؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں سر ہلایا۔ آنسو اب گالوں پر اتر آئے تھے۔

''کچھ تو بولو ہوا کیا؟ کسی نے کچھ نہیں کہا تو پھر کیا بات ہے؟ شہر سے کچھ منگوانا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے بمشکل کہا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔ ''بھائی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے''

''ڈر لگ رہا ہے لیکن کیوں کس سے؟ جس بہن کے چھ جوان بھائی ہوں' اسے کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے ریشماں کے ہاتھ ہٹا کر اس کے آنسو پونچھے۔

''مجھے آنے والے وقت سے ڈر لگ رہا ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

خادم حسین کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی ''دیکھو گڑیا تمہارا ایک ایک آنسو میرے دل پر گر رہا ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ ہم میں سے کوئی بھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ وقت' آنے والا وقت' سب تمہارے ہیں۔ بولو کیا چاہیے تمہیں۔ کپڑا' زیور' کتابیں یا کچھ بھی اور۔ تم کہو تو سب کچھ تمہارے سامنے ڈھیر کردیں گے۔''

چند لمحے وہ بھائی کے چہرے کو تکتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''مجھے تحفظ چاہیے' وہ دے دیں۔''

''تحفظ۔'' خادم حسین ہنس پڑا۔ ''چھ بھائیوں کی موجودگی میں تم خود کو محفوظ نہیں سمجھتیں؟''

''مجھے اپنے لئے نہیں' سب کے لئے تحفظ چاہیے۔ بھائی یہ دشمنیاں ہمیں لاشوں کے تحفوں کے علاوہ کیا دیں گی۔ ہم اس پر خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کا خون بہایا' اور وہ جشن منائیں گے کہ انہوں نے ہمارا خون بہایا لیکن یہ کون سوچے گا کہ یہ سارا خون تو اپنا ہی ہے۔ کیا بات تھی کہ دادا جان کے ہوتے ہوئے ہمارا خون ایک تھا' ان کے آنکھیں بند کرتے ہی ہر رشتہ بدل گیا' کیا کبھی خون کا رشتہ بھی بدل سکتا ہے؟''

''یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں ہیں۔اس بات کا خیال تو ان لوگوں کو کرنا چاہئے تھا جنہوں نے جنگ شروع کی تھی اور جب جنگ شروع ہو جاتی ہے تو اس کی آگ آسانی سے نہیں بجھتی۔ان لوگوں نے قدم قدم پر خاندان کی روایات کی دھجیاں بکھیریں۔خود کو تو تماشا بنایا ہی تھا ہمیں بھی سارے گاؤں میں تماشا بنا دیا۔اب ہم پیچھے ہٹنے کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے۔''

''بھائی۔زہرا کو قتل کرتے ہوئے کیا آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ آپ کی منگیتر ہے۔آپ کی عزت ہے؟''

خادم حسین کے چہرے پر سختی چھا گئی۔''تمہیں یہ سب کس نے بتایا ہے کہ میں زہرا کو قتل کرنے لگا ہوں؟''

''میں اماں جان کے پاس جا رہی تھی۔وہاں بابا جان کہہ رہے تھے۔میں نے سن لیا۔'' پھر بھائی کی طرف دیکھ کر وہ گھبرائی۔''میں نے جان بوجھ کر نہیں سنا بھائی۔''

خادم حسین نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکائی۔''مجھے پتا ہے تم نے جان کر نہیں سنا لیکن گڑیا کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف ہمارے لئے ہیں۔تمہارے نہیں۔مجھے پتا ہے تمہارا نازک سا دل ہے۔تمہیں دشمنوں کو بھی تکلیف میں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔اسی لئے ہم نے تمہیں ان باتوں سے دور رکھا ہوا ہے۔یہ مردوں کے معاملے ہوتے ہیں اور انہی کو طے کرنے ہوتے ہیں۔''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ دشمن نہیں ان کے اپنے ہیں۔سب کا خون ایک ہی ہے۔پھر جہاں اس کا عبداللہ ہے' وہ لوگ دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس نے سب کچھ اپنے اندر دفن کر دیا۔

''اچھا اب کوئی اچھی سی بات کرو۔یہ بتاؤ کہ میں جو تمہارے لئے کپڑے لایا تھا' وہ سلوا لئے۔'' خادم حسین نے پوچھا۔بات کرتے کرتے اس نے مسہری پر پڑا تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

ریشماں نے بہت مشکل سے اثبات میں سر ہلایا۔اس کی نگاہ تکئے کے نیچے رکھے کاغذ اور قلم پر تھی۔

''یہ کیا ہے۔'' خادم حسین نے کاغذ اٹھا لیا۔''پیاری بانو۔'' اس نے پڑھا۔''یہ کیا ہے؟''

''یہ۔'' ریشماں نے جلدی جلدی ذہن پر زور دیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا کہے۔پھر اچانک اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔''میں پڑھ تو سب کچھ لیتی ہوں اردو بھی' انگریزی بھی لیکن سبط ہر وقت یہی زور دیتا رہتا ہے کہ مجھے لکھنے پر خاص توجہ دینی چاہئے۔کہتا ہے فارغ وقت میں اردو انگریزی دونوں میں مضمون لکھا کروں یا پھر خط۔یہ میں خط لکھ رہی تھی

پریکٹس کے لئے۔''

''اور یہ بانو کون ہے؟''

''میری خالہ ہیں ناں' خالہ رضیہ' ان کی بیٹی ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔''اور پتا ہے' میں نے دو خط آپ کو بھی لکھے ہیں۔''

''پھر وہ مجھ تک پہنچے کیوں نہیں؟'' خادم حسین نے خوش دلی سے کہا۔

''مجھے پتا ہے ناں کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا جب سبط مجھے پڑھاتا ہے۔بابا جان کو تو بہت برا لگتا ہے۔ویسے انہوں نے کبھی ڈانٹا نہیں لیکن پھر بھی مجھے پتا ہے کہ انہیں یہ اچھا نہیں لگتا۔''

''تمہیں پڑھنا اچھا لگتا ہے ناں' تم پڑھو۔ہمیں صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔''اور اب کھانا کھا لو۔ناراضگی بندوں سے ہوتی ہے کھانے سے نہیں۔''

☆======☆======☆

اس دن مجسمہ سازی (Sculpture) کی کلاس تھی۔اُما اور ماہ بانو ساتھ ساتھ بیٹھی کام کر رہی تھیں۔اُما بلی بنا رہی تھی اور ماہ بانو بطخ۔ساتھ ساتھ دونوں کی باتیں بھی جاری تھیں۔

''میں نے خواہ مخواہ بطخ بنانا شروع کر دی۔اس کے پاؤں بنانا کس قدر مشکل ہیں۔'' ماہ بانو نے مٹی سے سنے ہاتھوں سے ماتھے پر آئے بال پیچھے کر کے پن لگا لی۔

''میری بلی تو اتنی اچھی بن رہی ہے کہ جب پوری بن جائے گی تو دیکھنا میاؤں میاؤں کرنے لگے گی۔''

''اس لئے کہ تمہیں پتا ہے بلی میاؤں میاؤں کرتی ہے اگر مجھے پتا ہوتا کہ بطخ کیسے بولتی ہے تو تم دیکھتیں چونچ بننے کے ساتھ ہی یہ بھی بولنے لگتی۔''

''تو میں ابھی بتا دیتی ہوں بطخ بولتی ہے قیں قیں کر کے۔'' اُما ہنسی۔پھر اچانک اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور ارد گرد کا جائزہ لے کر بولی۔''شی' سنو بانو یہ افشاں وغیرہ کیا کہہ رہی ہیں۔مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔''

ماہ بانو نے ناک سکیڑی۔''مجھے تو نہیں آ رہی بو۔''

''سنو تو۔''

ماہ بانو نے بھی کان قریب کھڑی افشاں اور اس کی سہیلیوں کی باتوں پر لگا دیئے۔

''ہاں سچ کہہ رہی ہوں' اس کا نام ہے عبداللہ۔'' نوین کام کرنے کے ساتھ ساتھ کہہ رہی تھی۔

''بھئی میں اس کی بات کر رہی ہوں۔وہ اسمارٹ سا لڑکا جو کل ایڈی کے ساتھ تھا۔'' افشاں نے کہا۔

''تو میں کس کی بات کر رہی ہوں۔اسی کی تو کر رہی ہوں۔مجھے اچھی طرح سے پتا ہے

اس کا نام عبداللہ ہے۔''نوین نے زور دے کر کہا۔

''حیرت ہے آج تک وہ کالج میں نظر کیوں نہیں آیا۔میری نظریں اتنی خراب نہیں ہو سکتیں۔اس کا تو مجھے سوفی صد یقین ہے۔''افشاں بولی۔

''تمہارا یقین سوفی صد درست ہے کیوں کہ جب سے ہم کالج میں آئے ہیں۔تب سے وہ کل پہلی مرتبہ کالج آیا ہے۔''

''عبداللہ۔''افشاں نے دہرایا۔''اولڈ فیشن نام ہے لیکن بندہ خود بہت ہینڈسم ہے۔''

ماہ بانو نے آنکھیں پٹپٹائیں اور ان سے مخاطب ہوئی۔''تم آج کل کسی چیز کو اولڈ فیشنڈ نہیں کہہ سکتیں یہ سراسر غلط ٹرم ہے۔''

''کیا مطلب؟''افشاں اس کی طرف مڑی۔

''بھئی یہ Post Modernism کا دور ہے اور اس دور میں کسی چیز کو Old Fashioned ہونے کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔''

اسے خبر نہیں تھی کہ عبداللہ کچھ ہی دیر پہلے Sulpture Studio میں داخل ہوا تھا اور اس نے افشاں کا اپنے بارے میں کمنٹ اور پھر اس پر ہونے والی بحث سن لی تھی۔

''جب مشق ستم میری ذات بن ہی رہی ہے تو کیا میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں؟''اس نے مداخلت کی۔

''اوہ تم۔تم کب آئے؟''اُما بولی۔

''زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''پھر وہ ماہ بانو کی طرف مڑا۔''بات یہ ہے کہ میرا نام میری اماں جان نے رکھا تھا اور جب وہ یہ نام رکھ رہی تھیں تو انہیں خبر بھی نہیں تھی کہ یہ Post Modernism کس بلا کا نام ہے۔'یہ صرف پسند ناپسند کی بات تھی' آرٹ اور فلسفے کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''تو تمہارا نام تمہاری اماں جان نے رکھا تھا۔''ماہ بانو نے مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی۔

''تم اس بارے میں مشکوک کیوں ہو؟''

''کیوں کہ میری سی آئی ڈی کی اطلاعات مختلف ہیں۔''

''ذرا اپنی سی آئی ڈی کی وضاحت کرو کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ جب میں اس دنیا میں وارد ہوا تھا تو تم یہاں موجود نہیں تھیں۔''وہ بولا۔

''تاریخ کے اوراق الٹنے سے پتا چلتا ہے ہمایوں بابر کا بیٹا تھا۔سکندر نے پورس کو شکست دی تھی اور کنفیوشس' کنفیوژن کا بھائی نہیں تھا۔ظاہر ہے جب یہ سب تاریخ ساز واقعات رونما ہو رہے تھے تو ہم وہاں نہیں تھے پھر ہمیں کیسے پتا چلا ان کے بارے میں؟''

''کیونکہ [illegible] تمہاری سی آئی ڈی کا محکمہ نہیں تھا۔''عبداللہ ہنسا۔

''میں اپنا سورس (ذریعہ) نہیں بتاؤں گی اور نہ تم اس تک پہنچ سکو گے لیکن ذرا سی تصحیح کر لو کہ تمہارا نام تمہاری اماں جان نے نہیں بابا جان نے رکھا تھا اور وہ بھی اپنی پسند سے نہیں کسی اور کی پسند سے۔''

''کسی اور کی فوراً وضاحت کرو۔''پیچھے کھڑی نیہاں نے کہا۔

''یہ وضاحت بے فائدہ ہوگی اس لئے اسے رہنے دو۔''ماہ بانو پھر بطخ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''بانو' تمہاری اس بطخ کا شجرہ ذرا مشکوک سا لگ رہا ہے۔''اُما نے مٹی کی بطخ کا بغور جائزہ لیا۔''کیوں عبداللہ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟''

''ہوں' مجھے بھی لگ رہا ہے جیسے بطخوں کی نسل میں کوئی کبوتر گھس آیا ہے۔''عبداللہ نے کہا۔

''مذاق مت اڑاؤ ورنہ میں زمین پر پھینک کر اسے توڑ دوں گی۔''ماہ بانو نے دھمکی دی۔

''کسی اور کا کیا بگڑے گا۔''نیہاں بولی۔

''اور یہ پر دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی اُڑنے لگے گی۔''عبداللہ نے کہا۔

''سچی سے یہ بہت بری بنی ہے؟''ماہ بانو پیچھے ہٹ کر اس کا جائزہ لینے لگی۔

عبداللہ گندھی ہوئی مٹی اٹھا کر بطخ کی شکل بہتر بنانے لگا۔

''تمہارے کپڑے خراب ہو جائیں گے' رہنے دو۔''ماہ بانو نے کہا۔''اور یہاں جاسوس بھی بہت ہیں' میڈم کو پتا چل جائے گا کہ یہ تم نے ٹھیک کی ہے۔''

''تم لوگ اتنے ڈرتے کیوں ہو؟''وہ بدستور مٹی کی بطخ کو ٹھیک کر رہا تھا۔

وہ دونوں کام میں منہمک تھے کہ سعد اندر چلا آیا۔تھوڑی دیر ان کے پاس کھڑا رہا پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوا۔

''کب تک فارغ ہوگی؟''

''ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ کچھ کھا پی لیا جائے۔''وہ بولا۔

''نائس آئیڈیا۔میرے پیٹ میں بھی چوہے دوڑ رہے ہیں۔''پھر وہ عبداللہ کی طرف مڑی۔''تھینکس عبداللہ تم نے بہت مدد کی' لیکن میرا خیال ہے کہ باقی کام کچھ کھانے پینے کے بعد ہی کریں گے۔''

''آل رائٹ۔''اس نے کندھے اچکائے۔

''تم بھی میرے ساتھ چلتے۔''اس نے بیگ اٹھاتے ہوئے رسماً کہا۔

''نو تھینکس (نہیں شکریہ) میں کچھ کام کروں گا ابھی۔''

سعد اور ماہ بانو میوزیم کی طرف چلے گئے۔ سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس لے کر بیٹھے تو ماہ بانو نے محسوس کیا جیسے سعد کسی سوچ میں گم ہے۔

''تم کیوں اتنے چپ چپ سے ہو؟''

''مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کہو۔'' ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھا۔

''تم عبداللہ کو کب سے جانتی ہو؟'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا؟

''تمہید باندھنے یا فالتو سوالات کرنے کی ضرورت نہیں ہے صاف صاف بات کرو کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' ماہ بانو اس کے انداز سے کسی حد تک سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں خود بخود سختی آ گئی تھی۔

''دو ہی دن میں تم دونوں بہت فری ہو گئے ہو حیرت ہو رہی تھی۔''

ماہ بانو کو تاؤ آ گیا۔ ''حیرانگی کو چھوڑو اور وہ بات کرو جو تمہارے خیال میں ضروری تھی۔''

سعد کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کو اس کا انداز گفتگو اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لئے اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ وہ تم سے اس قدر فرینک ہو رہا ہے۔''

''بات یہ ہے سعد کہ تمہارا دماغ بہت چھوٹا ہے۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا کہ تم مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ کر رہے ہو اور پوچھ بھی اس بات کے متعلق رہے ہو جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔''

''وجود نہیں ہے۔'' اس کا انداز تلخ ہو گیا تھا۔ ''تو پھر کل وہ کیا تھا کہ تم مجھے نظر انداز کر کے اس کے ساتھ ایک کونے میں جا بیٹھی تھیں۔ اور کیا اس میں بھی کوئی شک ہے کہ کل فنکشن کے درمیان تم دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تم دونوں کو باتیں کرتے اور آج......''

''شٹ اپ۔'' وہ چلائی۔ ''بہت کر لی تم نے بکواس۔ ٹھیک ہے اگر ایسا ہے' تب بھی تم کون ہوتے ہو مجھ سے صفائی طلب کرنے والے؟ یہ میری زندگی ہے' اور میں اسے کیسے گزارتی ہوں' اس کا فیصلہ تمہیں نہیں مجھے کرنا ہے۔''

''گویا تمہاری زندگی میں میری کوئی وقعت' کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

''کیوں ہو؟ تم ہوتے کون ہو' کیا رشتہ ہے میرا تمہارا؟ کچھ نہیں۔ میں تمہیں اس طرح رعب ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی ہو بانو۔''

ماہ بانو کا بس نہیں چلا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دے۔ شدید غصے کے عالم میں کولڈ ڈرنک کی

بوتل پٹخ کر بغیر مزید کوئی بات کئے وہ وہاں سے چلی آئی۔

''اُما یہ مطلع ابر آلود لگ رہا ہے' ہے ناں۔'' وہ Sculpture Studio میں داخل ہوئی تو عبداللہ بولا۔

وہ بغیر کچھ کہے مٹی کی بطخ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ غصے سے اب تک اس کا برا حال تھا۔ کسی سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے اردگرد سبھی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اُما' عبداللہ اور ایڈی نان اسٹاپ بول رہے تھے' دوسری طرف نیہاں سر جھکائے مٹی کے چوہے کی دُم بنا رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ ان تینوں کی گفتگو میں ٹکڑے بھی لگا رہی تھی۔ دائیں طرف کچھ سینئیرز اپنے کام میں مصروف تھے۔ مختلف کونوں میں کام کرتے مختلف گروپوں کے ساتھ موجود کیسٹ پلیئرز سے ابھرنے والے گانے اس تک پہنچتے پہنچتے گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے۔

''کب تک اس بطخ سے جھگڑتی رہو گی بانو۔'' اُما اس کے پاس آئی۔ ''چلو مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھا لیں۔''

ماہ بانو کی بھوک تو غصے سے ہی اُڑ چکی تھی لیکن اُما کے سامنے دل کا غبار نکالنے کی غرض سے وہ اس کے ساتھ ہو لی۔

''پہلے تو تم یہ پیپسی پیو تا کہ موڈ بہتر ہو سکے۔'' اُما نے اس کے سامنے بوتل رکھی۔ ''اور اب بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔''

ماہ بانو نے سعد سے ہونے والی گفتگو اسے بتا دی۔

''تم نے اسے بتا دینا تھا کہ اصل بات کیا تھی۔ اسے غلط فہمی ہوئی تھی' اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اُما نے کہا۔

''میں صفائیاں پیش کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ شکی طبیعت والے لوگ مجھے زہر لگتے ہیں۔ اور پھر وہ مجھ پر کیسے حق جتا سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے یا میں نے اس سے کوئی کمٹمنٹ نہیں کی۔ میں کسی کو اپنے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''لیکن بانو تم اس سے محبت کرتی ہو' اور محبت میں تو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔'' اُما نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''محبت گئی بھاڑ میں۔ کیا کبھی ایسا ہوا کہ محبت شکلوں سے کی جائے؟ نہیں محبت انسان کی ذات سے کی جاتی ہے' رویوں سے کی جاتی ہے۔ اور سعد کی یہ حرکتیں' یہ رویے مجھے اس سے دور لے جا رہے ہیں۔ میں اس سے دور نہیں جانا چاہتی' لیکن وہ مجھے مجبور کر رہا ہے اس بات کے لئے۔''

''اچھا ایسا کرو کہ آج تمام دن اس کے پاس مت جاؤ۔ کسی بھی ایسی جگہ مت جاؤ۔ جہاں اس کی موجودگی کا امکان ہو۔'' اُما نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا؟''

''اس سے ہوگا یہ کہ تمہارا غصہ اتر جائے گا۔اور جب تمہارا غصہ اترے گا تو تم زیادہ بہتر طور پر سوچ سکو گی۔یہ ضروری ہے۔چاہے تب بھی تمہارا فیصلہ یہی رہے۔دراصل ہمیں کوئی بھی فیصلہ غصے یا جذبات میں آ کر نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ ایک دن کیا' ماہ بانو نے تین دن گزر جانے کے باوجود بھی سعد سے بات نہیں کی۔تیسرے دن کالج سے گھر پہنچ کر ابھی اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے کہ اماں جان ایک لفافہ اٹھائے اندر آئیں۔''

''بہت عجیب بات ہے بانو!'' وہ بولیں۔

''کیا بات ہے؟'' وہ بے زاری تھی۔آج ڈرائینگ کی کلاس میں سر چکرا کر رہ گیا تھا۔اس پر بری طرح سے تھکن سوار تھی۔

''یہ خط آیا ہے تمہارے نام۔''

''میرے نام؟ کس نے لکھا ہے؟''

''باہر نام ریشماں کا لکھا ہوا ہے۔''

''ریشماں کا؟'' اس نے تعجب سے کہا اور لفافہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔''لیکن ریشماں مجھے کیسے خط لکھ سکتی ہے۔آپ نے خط کھولا بھی نہیں۔''

''تمہارے نام تھا۔کیسے کھولتی۔اب جلدی سے دیکھو خیر کی ہی کوئی خبر ہے ناں؟''

اماں جان چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ماہ بانو نے جلدی جلدی لفافہ چاک کیا۔

پیاری بانو!

بہت پیار! یہ خط بہت مشکل سے لکھ رہی ہوں' اسے پڑھ کر جلا دینا۔کسی کے ہاتھ لگ گیا تو میری خیر نہیں۔اتنا بڑا رسک کبھی نہ لیتی' اگر مسئلہ بہت اہم نہ ہوتا۔کل اتفاق سے مجھے ایک بہت خطرناک منصوبے کا علم ہوا ہے۔خدا کے لئے کسی طور پر خبر ان تک پہنچا دو کہ ان کی بہن زہرا کی زندگی خطرے میں ہے۔جمعرات کو اسے اپنی گاڑی پر شہر جانا ہے۔

ان سے کہو کہ اسے کسی بھی صورت گھر سے نہ نکلنے دیں۔بانو! اگر تم نے میرا یہ کام کر دیا تو میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔میرا خط بہت بے ربط ہے لیکن اس وقت بہت افراتفری کے عالم میں لکھ رہی ہوں' ذہن بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔اب اجازت دو۔

خدا حافظ

بہت پیار کے ساتھ تمہاری بہن

ریشماں!

''کیا لکھا ہے' خیر تو ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''جی اماں بالکل خیریت ہے۔یونہی اس کا دل چاہ رہا تھا خط لکھنے کو سو لکھ دیا۔'' اس نے کاغذ واپس لفافے میں ڈالا' اور لفافہ بیگ میں ڈال دیا۔''میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں۔''

''جلدی کرو' میں کھانا نکالتی ہوں۔'' اماں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ماہ بانو بستر پر بیٹھ گئی

''یہ اشارہ واضح طور پر عبداللہ کی طرف ہے۔کیا تکلیف ہوتی تھی اسے نام لکھتے ہوئے۔ان' ان سے بھلا کیا پتا چلتا ہے کہ کس کے متعلق بات کر رہی ہے۔'' ماہ بانو نے سوچا۔

''مجھے تو اس کی بہنوں کے اصل نام بھی نہیں معلوم۔وہ زینی اور گڑیا کہہ کر بات کرتا ہے۔اوہ خدایا جمعرات تو کل ہے۔'' اسے اچانک یاد آیا۔

اس نے گھڑی پر وقت دیکھا۔شام کے پانچ بج رہے تھے۔اسے یاد آیا کہ صبح کالج میں عبداللہ ذکر کر رہا تھا کہ رات کے وقت وہ گاؤں جانے کے لئے نکل جائے گا۔کس وقت؟ یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔

اس کے پاس وقت بہت کم تھا' اسے جو کچھ کرنا تھا۔فوری طور پر کرنا تھا۔

۔۔کھانے پر فاتحہ پڑھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی' دوپٹہ لے کر' بیگ کندھے پر ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

ماہ بانو کو بیگ کندھے پر ڈال کر کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر اماں جان ٹھٹک گئیں۔

''کہاں چل دی؟ میں کھانا نکال رہی تھی؟''

''اماں کو اصل بات بتا دی تو خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔کوئی عجب نہیں کہ اماں بھی عبداللہ کی طرف جانے کی ضد کرنے لگیں۔'' اس نے سوچا۔

''یہ بیگ پھر کیوں کندھے پر لٹکا لیا؟'' اماں نے پھر پوچھا۔

''مجھے اچانک یاد آیا ہے کہ میرا پورٹ فولیو اُما کے پاس رہ گیا ہے' کھانا بھی وہیں کھا لوں گی۔'' اس نے بہانا کیا۔

''ایک تو گھر واپس آنے میں اتنی دیر کر دیتی ہو اور پھر آتے ہی کبھی یہاں' کبھی وہاں۔شریف گھروں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کیا؟'' اماں جان کو غصہ آ گیا۔

''میرا جانا بہت ضروری ہے۔پورٹ فولیو اِدھر اُدھر ہو گیا تو مصیبت آ جائے گی۔''

اماں کو اصل بات بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔انہیں اس کا لڑکوں سے میل جول پسند نہیں تھا اور لڑکا بھی ہو عبداللہ۔انہوں نے تو پہلے ہی دن اسے اس سلسلے میں وارننگ دے دی تھی۔اسے یقین تھا کہ اس بات کا علم اگر اماں جان کو ہو گیا تو وہ اس کے ساتھ چلنے پر مُصر ہو جائیں گی۔اس کا جلد از جلد جانا بھی ضروری تھا۔پتا نہیں عبداللہ کو کس وقت گاؤں جانا تھا۔اس موقع پر

وہ اماں سے لمبی بحث نہیں کر سکتی تھی۔

''بی بی! میں باز آئی تمہاری ایسی پڑھائی سے۔'' اماں کا موڈ بگڑ گیا۔

''وہ ساتھ والوں کی بیٹی بھی تو کالج میں پڑھ رہی ہے۔ صبح سات ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی ہے اور ساڑھے بارہ بجے یا ایک بجے تک لوٹ آتی ہے۔ تمہارا کالج نرالا ہے جس کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں ہے' نہ آنے کا نہ جانے کا۔''

''اماں یہ کالج مختلف ہے' میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟''

''اتنی کوڑھ مغز نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکوں۔ دنیا دیکھی ہے میں نے' جانتی ہوں کہ لڑکیاں کالج سے اتنی دیر لگا کر گھر واپس آئیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''

''خدا کے واسطے اماں! مجھے پاگل مت بنائیں' میں اپنی کتنی ہی صفائیاں پیش کروں گی' تب بھی آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ جب آپ ایسی باتیں کرتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ دوں۔'' اس نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

''اور مجھے تمہارا اس ہندو لڑکی کے ساتھ ملنا جلنا بھی بالکل پسند نہیں ہے۔ غضب خدا کا' اب ایک مسلمان لڑکی ہندوؤں سے دوستی کرے گی۔''

''اماں پلیز! میں سب کے خلاف بات سن سکتی ہوں' اپنے خلاف بھی' لیکن اُما کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں سن سکتی۔''

''اسی لڑکی نے تمہیں بگاڑا ہے۔'' اماں نے فتویٰ صادر کیا۔ ''اچھی بھلی تھی' جب دوسرے کالج میں پڑھ رہی تھی یہاں آتے ہی پر نکل آئے ہیں تمہارے' اور باپ کو بھی مجال ہے جو ذرا سی پروا ہو۔''

عبداللہ کو جلد از جلد خبردار کرنا ضروری تھا اور اماں بحث پر مُصر تھیں۔ اس وقت باہر نکلنے کا مطلب تھا اماں جان کی شدید ناراضگی' لیکن اس کے سوا چارہ کار بھی کوئی نہیں تھا' سو اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''خدا حافظ اماں جان!''

اماں تو غصے سے بے حال ہو گئیں۔

''تم ذرا گھر واپس آؤ' ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری۔ دیکھتی ہوں کل سے کالج کیسے جاتی ہو' آ جانے دو اپنے ابا کو۔''

دروازے سے باہر نکلنے تک ماہ بانو ایسی کتنی ہی باتیں سن چکی تھی۔

ویگن کے اسٹاپ تک پیدل جانا عذاب لگ رہا تھا۔ پہلے ہی گرافکس کی کلاس میں وہ حد سے زیادہ تھک چکی تھی۔ پرنٹس بھی کتنی مشکلوں سے اچھے نکلے تھے۔ صبح نو بجے سے لگاتار سہ پہر چار بجے تک کام کرنے کے بعد گھر میں اماں جان کا غصہ بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ اسے اپنے

اوپر ترس آنے لگا۔

''یہ بھی کوئی زندگی ہے۔'' ویگن میں بیٹھ کر اس نے سوچا۔ ''سارا دن گدھے کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ روز کی روز مارکنگ کی وجہ سے چھٹی بھی نہیں کی جا سکتی۔ کبھی دیر تک رکنا پڑے تو اماں شک و شبہے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

آج صبح ناشتے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا پیا۔ درمیان میں بھوک لگی تب بھی کام کی زیادتی کی وجہ سے کینٹین تک نہیں جا سکی۔ پریس سے پرنٹ نکالتے نکالتے کندھے جواب دے گئے۔ مسلسل سات گھنٹے کھڑے رہنے سے ٹانگوں میں الگ درد ہو رہا ہے' مگر اماں کو پروا ہی نہیں۔ انہیں صرف یہی خیال رہتا ہے کہ میں لڑکوں کے ساتھ کالج میں پڑھ رہی ہوں اور بس۔

یہاں یہ حال ہے کہ کام پر جُت جانے کے بعد سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی' عشق کرنے کی کیا ملے گی۔ تین دن ہو گئے ہیں سعد کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔ وہ کمبخت بھی نہیں آیا منانے کے لیے۔ ظاہر ہے' وہ بھی فارغ نہیں ہے' جیوری چل رہی ہے اس کی' وقت کہاں ہے اس کے پاس ہفتے تک۔ فارغ ہوگا پھر ہی آ سکتا ہے اور اگر وہ نہ آیا تو میں بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ ایسی فالتو نہیں ہوں میں کہ جو وہ کہے میں سن لوں۔''

ویگن ایم۔ اے۔ او کالج کے اسٹاپ پر رکی تو وہ بھی خیالات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں پلٹ آئی۔ ہوسٹل میں وہ سیدھی اُما کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دستک کے جواب میں نیہاں کی بیزار سی آواز آئی۔

''یس!''

ماہ بانو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اُما دوپٹا آنکھوں پر رکھے سو رہی تھی۔ نیہاں وارڈ روب ٹھیک کر رہی تھی۔

''بانو تم ہو۔'' نیہاں جو دروازے کی طرف ہی متوجہ تھی' اسے اندر آتے دیکھ کر بولی۔

''تم گھر نہیں گئیں؟''

''گئی تھی' کام سے آئی ہوں۔'' وہ اُما کی طرف بڑھی۔ ''اُٹھو اُما!''

''مت اٹھاؤ' بے چاری تھک کر ابھی ہی سوئی ہے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔'' نیہاں نے کہا۔

''اُما اُٹھو! کیا گھوڑے بیچ کر سوئی ہو؟'' ماہ بانو نے نیہاں کی بات نظر انداز کر کے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

نیہاں کچھ کہنے لگی تھی پھر ارادہ بدل دیا اور کندھے اُچکا کر دوبارہ کپڑوں کی الماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اُما پہلے تو کسمسائی پھر دوپٹا ایک آنکھ سے سرکا کر اس کی طرف دیکھا۔

''بانو تم! خیریت تو ہے' تم تو گھر گئی تھیں''؟ ماہ بانو کو غیر متوقع طور پر وہاں دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔

''گئی تو تھی' لیکن ساتھ ہی پھر نکلنا پڑا۔'' وہ وہیں بستر پر بیٹھ گئی۔

''خیریت ہے ناں؟'' اُما کی مندی مندی آنکھیں اب کھلتی جارہی تھیں۔

''پتا نہیں' میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا' اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو' پہلے اپنا سانس تو ٹھیک کرلو۔ پھر بات کریں گے۔'' اُما اب سیدھی ہوکر بیٹھ گئی تھی۔

''سوری تمہیں سوتے سے جگادیا۔''

''فضول باتیں مت کرو' دوستوں میں اتنا تکلف اچھا نہیں لگتا۔''

''اما! کچھ منگوادوں کھانے کے لیے؟'' نیہاں کپڑے چھوڑ کر ان کی طرف پلٹی۔

''ہاں پلیز' بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''تو کھانا کیوں نہیں کھایا؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''کیا کھاتی بینگن بنے ہوئے تھے' مجھ سے تو کھائے نہیں جاتے' پھر تھکن بھی تھی۔ نیند اور بھوک اکٹھی محسوس ہوں تو میں سونے کو ترجیح دیتی ہوں' سوچا تھا اُٹھ کر کچھ کھاپی لوں گی۔'' اُما بولی۔

''اور میرا خیال ہے بانو کہ تم نے بھی بس جانے آنے کی بات کی ہے' کھانا نہیں کھایا۔''

''اماں کی ڈانٹ کھائی ہے بس۔'' وہ ہنسی۔ ''اچانک بہت تیزی میں گھر سے نکلنا پڑا۔ اماں کو بہت غصہ آتا ہے' جب میں کھانا کھائے بغیر گھر سے نکلوں۔''

''میں کچھ کھانے کا انتظام کروں۔ اس بے ہودہ ہوسٹل میں تو ڈھنگ کا کھانا کھانے کو بھی ترس گئے ہیں۔'' نیہاں کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا اب یہ بتاؤ کہ وہ کیا بات ہے' جس کی خیریت ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔'' اُما نے آلتی پالتی مار کر تکیہ گود میں رکھ لیا اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''مجھے آج ریشماں کا یہ خط ملا ہے۔'' نیہاں کے جانے کے بعد ماہ بانو نے بیگ سے خط نکال کر اما کی طرف بڑھایا۔

''تمہیں پتا ہے ناں کہ میری اردو ریڈنگ بہت کمزور ہے۔'' اُما بولی۔

''میں پڑھ کر سنا دیتی ہوں۔'' بانو نے کہا اور کاغذ کی تہیں کھول کر بآواز بلند خط پڑھنے لگی۔

''ہوں۔'' خط سن کر اُما سوچنے لگی۔

''ویسے تو اس نے نام نہیں لکھا' لیکن اس طرح وہ صرف عبداللہ کے متعلق لکھ سکتی ہے' لیکن کیا تمہیں اس کی بہنوں کا نام معلوم ہے؟''

''نہیں گاؤں میں تو کوئی ان کا نام نہیں لے سکتا' بس چھوٹی بی بی اور بڑی بی بی کہتے ہیں۔ کبھی ان کی حویلی جانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا کہ اسی طرح معلوم ہوجائے۔ عبداللہ نے جب بھی ان کا ذکر کیا ہے تو گڑیا اور زینی کہہ کر ہی پکارا ہے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بات عبداللہ کے علاوہ کسی اور کے گھر کے متعلق نہیں ہوسکتی۔''

''تم اتنی پُریقین کیسے ہو؟''

''بہت سی وجوہات ہیں۔ ریشماں کی زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے۔ زہرا یا وہ جو کوئی بھی لڑکی ہو' اسے جو بھی نقصان پہنچایا جائے گا اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح ریشماں کے گھر سے ہوگا' تب ہی یہ بات اس کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی اور کے متعلق ایسی بات ہوتی تو وہ اتنا بڑا رسک کبھی نہ لیتی۔ ٹھیک ہے اس نے عبداللہ کا نام نہیں لیا' لیکن وہ اس کا نام لیتی بھی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ یہ مسئلہ عبداللہ کے علاوہ کسی کے ساتھ ہوتا تو میں بھلا اس کی مدد کیسے کرسکتی تھی؟ اسے معلوم ہے کہ عبداللہ میرے ساتھ پڑھ رہا ہے۔ میں اس سے مل سکتی ہوں' بات کرسکتی ہوں' اسی لیے تو اس نے مجھے خط لکھا ہے۔''

''آل رائٹ۔'' اُما نے ہاتھ اُٹھائے۔ ''میں نے مان لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عبداللہ کو کیسے بتایا جاسکتا ہے۔ وہ تو شاید آج گاؤں واپس جارہا ہے۔''

''ایک تو میری عادت بری ہے' میں اول تو ٹیلی فون انڈکس رکھتی ہی نہیں ہوں اور رکھ لوں تو وہ دو ہی دن میں گم ہوجاتی ہے۔'' ماہ بانو بولی۔

''تمہارے پاس عبداللہ کا نمبر ہے ناں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''عبداللہ کا نہیں البتہ ایڈی کا ہے۔''

''ایڈی سے عبداللہ کا نمبر معلوم ہوسکتا ہے۔'' ماہ بانو نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''بشرطیکہ وہ اس وقت گھر پر ہوا۔ ان لڑکوں کا یہ بھی تو پتا نہیں چلتا کہ کب گھر پر ہوتے ہیں اور کب گھر سے غائب۔''

''چلو ٹرائی تو کرتے ہیں۔''

وہ دونوں فون کرنے جارہی تھیں کہ سامنے سے نیہاں آتی دکھائی دی۔

''تم دونوں کہاں چل دیں؟ میں نے برگرز منگوائے ہیں' آتے ہی ہوں گے۔''

''ایک فون کر آئیں پھر برگرز سے بھی انصاف کرتے ہیں۔'' اُما نے کہا۔

اتفاق سے ایڈی گھر پر ہی تھا۔ ہاں یہ اتفاق ہی تھا' ورنہ وہ گھر پر کم ہی ٹکتا تھا۔

''تمہارے پاس عبداللہ کا فون نمبر ہے؟'' اُما نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں ہے تو۔'' وہ بولا۔ ''لیکن یہ عجیب بے مروتی ہے' تم مجھ سے فون پر بات کر رہی ہو اور بجائے اس کے کہ پہلے میری حالتِ زار دریافت کرو۔ چھوٹتے ہی تم نے عبداللہ کے متعلق انکوائری شروع کر دی۔''

''بانو کو اس سے ضروری کام ہے' ورنہ جہاں تک تمہاری خیریت کا تعلق ہے تو وہ روز ہی پتا چلتی رہتی ہے۔ ہر روز تو کالج ٹپک پڑتے ہو بلاناغہ۔''

''کبھی ہسٹری پڑھی ہے تم نے؟ نہیں پڑھی ہوگی۔ ایک بی بی تھی لیلیٰ اور ایک تھا اس کا مجنوں۔ جب مجنوں کو لوگوں نے پتھر مارے تو جانتی ہو لیلیٰ نے کیا کیا تھا؟ اس نے نہایت پُرسوز آواز میں گایا تھا کہ......

''کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔''

اور یہ آج کے زمانے کی لیلیٰ ہے'' اس نے ایک مصنوعی آہ بھری۔

''جس نے پہلی مرتبہ اپنے مجنوں کو فون کیا ہے اور فون پر ہی خود اپنے مجنوں کو پتھر مارنے لگی ہے واہ! بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔''

''تم کر چکے اپنی بکواس؟'' اُما جھلا گئی۔ ''تم سے عبداللہ کا فون نمبر مانگا ہے' دو گے یا نہیں؟''

''تم جان مانگو' وہ بھی حاضر ہے۔'' وہ فدا ہونے والے انداز میں بولا۔

''ایڈی! اگر تم میرے دوست نہ ہوتے تو اب تک میں تمہارا سر پھاڑ چکی ہوتی۔ بکو عبداللہ کا نمبر کیا ہے؟''

''تم نے اسے کہنا کیا ہے؟''

''پلیز ایڈی' کچھ خدا کا خوف کرو۔ میں ہوسٹل سے فون کر رہی ہوں۔ تین لڑکیاں اب تک جھانک کر جا چکی ہیں کہ میں کب فون بند کروں گی۔''

''اچھا نمبر لکھو۔'' اس نے نمبر لکھوایا۔

''اور اب بتاؤ اسے کیا کہنا ہے۔''

''تم سے جو کام تھا' وہ ختم ہوا' بائے بائے۔'' اُما فون رکھنے لگی۔

''ٹھہرو تو' عبداللہ تمہیں اس نمبر پر نہیں ملے گا۔'' ایڈی کی آواز آئی۔

''کیوں' کیا وہ گاؤں جا چکا ہے؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے؟''

''تو پھر وہ کس نمبر پر ہے؟'' اما زچ ہوئی۔

''وہ اس وقت قالین پر آلتی پالتی مارے' سگریٹ اور چائے سے شغل کرتے ہوئے فلم دیکھ رہا ہے' میرے کمرے میں' میرے بالکل پاس۔ ساتھ ہی مجھ پر چلا بھی رہا ہے کہ میں اپنے لیلیٰ مجنوں کے قصوں میں اسے فلم نہیں دیکھنے دے رہا۔''

''ایڈی! میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔ اتنی دیر سے میں کیا بک بک کر رہی تھی' فون دو عبداللہ کو۔'' وہ تنگ آ کر چلائی۔

'چلو تاریخ کا ریکارڈ تم نے خود ہی درست کر دیا' ورنہ اب سے پہلے تم یہ ڈس انفارمیشن پھیلا رہی تھیں۔ کہ بکواس تم نہیں بلکہ میں کر رہا تھا۔''

''تم عبداللہ کو دیتے ہو فون یا نہیں؟'' وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

''دے دیتا ہوں' اس میں اتنا چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ کان کا پردہ پھاڑ دیا۔ یہ لو بات کرو اس سے۔''

تھوڑی دیر میں اس طرف سے ماہ بانو اور دوسری طرف سے عبداللہ لائن پر تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔'' ماہ بانو بولی۔ ''تم اتنا بتا دو کہ تمہاری کسی بہن کا نام زہرا ہے؟''

''ہاں میری چھوٹی بہن ہے۔ میں نے غالباً تمہارے سامنے اس کا ذکر گڑیا کہہ کر ہی کیا تھا' تب ہی تمہیں اس کا اصل نام معلوم نہیں تھا۔''

''اچھا عبداللہ! میری بات غور سے سنو' مجھے بہت باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جمعرات کو تمہاری بہن شہر جا رہی ہے یا ایسی ہی کوئی بات ہے۔ بہر حال اس کا گھر سے نکلنے کا پروگرام ہے۔'' ماہ بانو بولی۔ ''اور مجھے پتا چلا ہے کہ اس دوران پیر صاحب یعنی تمہارے بڑے بابا کے آدمی اسے اغوا یا قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

''ہیلو۔'' ماہ بانو نے کہا۔ ''عبداللہ تم نے میری بات سنی ہے۔''

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس بات کا کیسے پتا چلا؟''

''یہ نہ پوچھو' میرا نیاز پور سے کوئی کچا رشتہ نہیں ہے' میں وہاں جاؤں یا نہ جاؤں' وہاں کی خبریں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔''

''اگر یہ خبر تم تک پہنچی تو پھر بابا جان تک بھی پہنچی ہوگی۔ شاید انہوں نے مجھے فون بھی کیا ہو' لیکن میں صبح سے گھر پر نہیں تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ خبر تمہارے بابا جان تک نہیں پہنچی۔''

''تھینک یو بانو' میں ابھی بابا جان سے بات کرتا ہوں' یوں بھی میں گاؤں کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''سنو عبداللہ۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں مشورہ دینے کا مجھے کوئی حق تو نہیں ہے' لیکن دوست ہونے کے ناتے سے مشورہ دوں تو برا تو نہیں مانو گے؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم تو ہمارے گھرانے کو بچانے کے لیے ہمارا ساتھ دے رہی ہو' تمہیں پورا حق ہے کوئی بھی مشورہ دینے کا' برا ماننے کا سوال ہی نہیں ہے۔''

''ایک دوسرے کے مقابلے میں اتر آنے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ کل تم لوگ اپنی حویلی سے نہ نکلو۔ میں جانتی ہوں کہ میری بات سن کر تمہارے دل میں کیا خیال آ رہا ہوگا۔ یہی ناں کہ اس طرح تمہارے دشمن تمہیں بزدل سمجھیں گے' لیکن عبداللہ کسی کے کچھ سوچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے عزت اور غیرت کے معیار تو یوں بھی دنیا سے نرالے ہیں۔ بجائے اس کے کہ تم بھی اتنا پڑھ لکھ جانے کے باوجود انہی معیار کو اپناؤ۔ بہتر ہوگا کہ تم انہیں تبدیل کرو' ان کے ذہن کو بھی وسعت اور کشادگی دو' تم میری بات سن رہے ہو ناں؟''

''ہاں' میں تمہاری بات سن رہا ہوں۔ تمہارا مشورہ بھی بہت اچھا ہے۔'' وہ بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اب میں بابا جان سے بھی بات کر لوں اور جلد از جلد گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤں۔''

''اچھا عبداللہ خدا حافظ۔'' اس نے فون رکھ دیا اور اُما کی طرف مڑی۔

''اُما! وہ میرے مشورے پر عمل کرے گا۔''

''جتنا تم کر سکتی تھیں بانو' وہ تم نے کر دیا۔ باقی اوپر والے پر چھوڑ دو۔'' اُما نے اسے تسلی دی۔

''دعا کرو خیریت رہے۔ ان لوگوں کی دشمنیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔''

''اچھا چلو کھانا کھا لو' اب تک تو سب کچھ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔'' اُما بولی۔

کمرے میں نیہاں دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔

''اتنی لمبی بات کر رہے تھے فون پر تم لوگ' آدھا ہوسٹل گالیاں دے رہا تھا۔''

''اس ایڈی کے بچے نے مصیبت ڈال دی تھی۔ جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔'' اُما نے برگرز کو چیک کیا جواب ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

نیہاں اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ''ظاہر ہے ایڈی کے بچے تمہیں مصیبت نہیں ڈالیں گے تو اور کسے ڈالیں گے۔ یقین کرو' آخر دم تک تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں تمہیں قتل کر دوں گی نیہاں۔'' اُما نے اسے تکیہ مارنے کی کوشش کی۔

''تم بتاؤ بانو' میں غلط کہہ رہی ہوں کچھ؟ آخر ہم بھی منہ میں زبان اور کھوپڑی کے گرد دو کان رکھتے ہیں۔ ماتھے کے کچھ نیچے دو آنکھیں بھی نکا رکھی ہیں۔ کیا اب بھی پتا نہیں چلے گا کہ ایڈی کیا کھچڑی پکا رہا ہے......؟'' نیہاں بولی۔

''تم کھانا شروع کرو بانو۔ یہ تو باتوں پر شروع ہوتی ہے تو نان اسٹاپ بولتی ہے۔'' اُما نے ماہ بانو کو برگر اور کولڈ ڈرنک پکڑائی' اور خود بھی کھانے لگی۔

''اب کوئی اس سے پوچھے کہ ایڈی کھچڑی پکا رہا ہے میں تو نہیں پکا رہی' مجھے خواہ مخواہ گھسیٹ رہی ہے یہ۔''

''اس بات پر تو میں نیہاں سے اتفاق کرتی ہوں۔ مانا کہ کھچڑی ایڈی پکا رہا ہے' یہ بھی تو دیکھو پکا کس کے لیے رہا ہے۔''

''واہ بانو! دل خوش کر دیا۔'' نیہاں خوش ہو گئی۔

''تم دونوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ ٹھیک ہے کہ وہ حماقت پر اتر آیا ہے' لیکن میں تو حماقت پر نہیں اُتری۔ اس کے اس فعل کی ذمہ داری میں تو نہیں لے سکتی۔''

''رہنے بھی دو اُما۔ شروع شروع میں سب لڑکیاں یونہی نخرے دکھاتی ہیں اور جب یہ دیکھتی ہیں کہ لڑکا مزید نخرے اُٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے تو خود ہی سیدھی ہو جاتی ہیں۔ دیکھ لینا بانو' چند دنوں کے بعد یہ بھی آہیں بھرنے لگے گی۔''

''تمہارے منہ میں خاک' میں کیوں آہیں بھرنے لگی۔'' اُما بولی۔ ''بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اسی لیے عشق و عاشقی کے چکر میں نہیں پڑتی کہ مجھے آہیں نہ بھرنی پڑیں۔''

''چچ...... چچ...... افسوس ہوا یہ سن کر' بس اتنی سی بات سے ڈر گئیں۔'' نیہاں بولی۔

''میری بات چھوڑو' تم جو اس دن اتنی ترنگ میں تھیں وہ کیا تھا؟'' اُما نے بھی جوابی حملہ کیا۔

''وہ کیا ہونا ہے۔ نیہاں کے پیچھے آہیں بھرنے والے بہت ہیں۔'' بانو نے بھی لقمہ دیا۔

''یہ تو مسئلہ ہے' میرے پیچھے وہ آہیں بھرتے ہیں جو مجھے پسند نہیں ہیں۔ جو پسند ہے' وہ سرسری سی ہیلو ہائے سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا۔''

''وہ ہے کون؟'' اُما کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''ہاں' ایسا کون ہو سکتا ہے' جو تمہیں صرف ہیلو ہائے پر ٹرخا دیتا ہے۔'' ماہ بانو نے بھی دلچسپی سے کہا۔

''چھوڑو' اب تک کسی کو نہیں پتا اس بات کا' جب تم لوگوں کو پتا چلے گا تم میرا بہت مذاق اڑاؤ گے۔ ہر وقت تو وہ نولفٹ کا بورڈ لٹکائے پھرتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اس کا گلا دبا دوں۔''

''ایسا کون ہو سکتا ہے؟'' ماہ بانو نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مت دماغ کھپاؤ۔'' نیہاں بولی۔ ''تم لوگوں کو بالکل اندازہ نہیں ہوگا۔''

''تم کس پرانے زمانے کے انداز میں عشق کرنے لگیں۔ چھپ چھپا کر' زمانے کی نظر سے بچا کر۔ یار ذرا فاسٹ ہو۔ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔'' ماہ بانو نے ہنس کر کہا۔

''اگر وہ بھی مثبت جواب دیتا تو میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات نہ چھپاتی' مگر اب مجھے اپنا مذاق بنوانا گوارا نہیں ہے۔''

''اوہو بانو! مجھے تمہیں بتانا تھا۔'' اُما نے جلدی جلدی برگر کا آخری نوالہ منہ میں ٹھونسا۔

''کام اتنا زیادہ تھا کہ کالج میں بتا ہی نہیں سکی اور بعد میں تھکن اتنی تھی کہ سوچا کون زبان چلائے۔''

''تو اب چلالو ناں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''ایڈی چاہتا ہے میں اس کے مجسمہ سازی کے لیے ماڈلنگ کروں۔'' اُما نے بتایا۔

''پھر تم نے کیا کہا؟'' بانو نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میرے پاس وقت ہی کہاں ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''لعنت ہو۔ اس نے کہا اور تم نے انکار کر دیا۔'' نیہاں چلائی۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے اُما! وہ مجسمہ سازی کا کیٹس ثابت ہوگا اور یوں فینی یعنی تمہارا نام بھی امر ہو جائے گا۔''

''پرواز اتنی اُونچی لینی تھی تو کیٹس کے بجائے ڈونا ٹیلو یا مائیکل اینجلو کا نام لیتیں۔'' اُما ہنسی۔

''کیسے لیتی' مجھے ان کی فینیوں کے ناموں کا پتا ہے بھلا۔'' نیہاں بولی۔

''اس بات کو چھوڑ' یہ بتاؤ کہ ایڈی نے کیا کہا پھر؟'' ماہ بانو نے پوچھا۔

''اس نے کیا کہنا تھا پھر وہی لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد والی داستان شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ میرا مجسمہ کالج کی کسی اسائمنٹ کے لیے نہیں بلکہ پرسنل کولیکشن کے لیے بنانا چاہتا ہے۔''

''پھر بھی تمہیں رحم نہیں آیا بے چارے پر چچ...... چچ'' نیہاں نے سر ہلایا۔

''تمہیں کتنوں پر رحم آتا ہے جو تمہارے پیچھے چلے آتے ہیں؟'' اُما نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''بات یہ ہے اُما۔'' نیہاں بولی۔ ''کہ انسان کو اتنا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ کون اس کے ساتھ مخلص ہے۔ دیکھنے میں ایڈی بھی کتنا لاپروا نظر آتا ہے' لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی کمٹ منٹ کو وہ کتنی سنجیدگی اور ذمہ داری سے پورا کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا' جسے پورا نہ کر سکے۔ وہ تمہیں کبھی درمیان میں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔''

''اور جو تمہیں پسند کرتے ہیں نیہاں ان میں سے بھی تو کوئی مخلص ہوگا۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''نہیں کوئی ایک بھی نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''مجھ میں انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت ہے' تم دیکھنا میری طرف سے کوئی مثبت ردِعمل نہ پا کر یہ سب دوسری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ یہ دور اتنا فاسٹ ہے کہ سوائے چند ایک احمقوں کے کوئی بھی اپنا سر کسی پتھر سے پھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے آج

کل؟''

''اور جسے تم چاہتی ہو؟ خود ہی کہتی ہو کہ اس نے نو لفٹ کا بورڈ لٹکایا ہوا ہے۔'' ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

''میں ان چند احمقوں میں سے ہی ایک ہوں' وہ جو مرضی ہو' میں تو مخلص ہوں ناں اس کے ساتھ لیکن یہ تم نہیں سمجھو گی۔'' نیہاں نے کہا۔

''نہ اُما سمجھے گی' ہاں ایڈی سمجھ جائے گا۔''

''چھوڑو نیہاں۔'' اُما کے انداز میں تلخی آ گئی۔ ''یہ سب باتیں ہوتی ہیں' نہ کوئی کسی کے لیے جیتا ہے نہ کسی کے ساتھ مر سکتا ہے۔ کم از کم آج کے دور میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا کر سکتا ہے ایڈی میرے لیے؟ کس کس سے لڑے گا وہ؟ اپنے ماں باپ سے' میرے ماں باپ سے' اس معاشرے سے' آخر کس کس سے؟ کیا میری خاطر اپنا مذہب تبدیل کر لے گا وہ؟ نہیں...... نہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور نہ میں...... اور نیہاں مذہب کی دوری اتنی چھوٹی نہیں ہوتی جسے آسانی سے پاٹ لیا جائے۔

میں نے مان لیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' یہ بھی مان لیا کہ اگر ہمارے درمیان مذہب کا یہ فرق نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنا لیتا' مگر اب کیا ہے؟ اب وہ چاہے تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بہت بزدل ہوں معاشرے کے پتھر نہیں کھا سکتی۔ میرے ماں باپ' میرے لیے خود ہی فیصلہ کریں گے اور جو بھی فیصلہ کریں گے' وہ میرے لیے بہترین ہوگا۔''

''تمہاری سوچ عقل کی تلوار پر چل رہی ہے اُما! میں نہیں کہتی کہ تم غلط کہہ رہی ہو' اس لیے کہ تم غلط نہیں تمہاری بات بالکل درست ہے۔'' نیہاں بولی۔ ''لیکن تمہاری اس سوچ کی بنیاد تمہارا خوف ہے۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ تم بزدل ہو' معاشرے کے پتھر نہیں کھا سکتیں۔ اور یہی وجہ ہے اُما کہ تم محبت نہیں کر سکتیں۔

تم صرف اتنا چاہتی ہو کہ تمہارے ممی ڈیڈی تمہارے لیے راستہ بنا دیں تاکہ تم اطمینان سے اس راستے پر اپنا سفر مکمل کر سکو' اپنی زندگی کے اس سفر میں بھی تم محبت نہیں کرو گی' صرف وفاداری کرو گی اور رشتے نبھاؤ گی۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اُٹھاؤ گی تاکہ تمہاری وفاداری پر حرف نہ آئے' رشتوں پر آنچ نہ آئے' اور اس کے باوجود ساری زندگی اس خوش فہمی کا شکار ہو گی کہ تم محبت کر رہی ہو۔ حقیقت تو یہ ہے اُما کہ تم صرف زندگی کا سفر طے کر رہی ہو گی۔''

''مجھے بحث نہیں کرنی۔'' اُما نے فیصلہ انداز میں کہا۔

''تم کچھ نہیں بولو گی بانو؟'' نیہاں نے اس کی طرف دیکھا پھر ہولے سے ہنس دی۔

''لیکن تم بھی کیا بولو گی' تم بھی تو صرف زندگی کا راستہ طے کرنا چاہتی' ہو محبت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔''

ماہ بانو جیسے چونک گئی۔ ''اوہو میں تو باتوں میں بھول ہی گئی' گھر بھی جانا ہے ابھی۔''

''میں بھی بھول گئی' مجھے بھی اپنی وارڈروب ٹھیک کرنی ہے۔'' نیہاں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو میں تمہیں گیٹ تک چھوڑ آؤں۔'' اُما نے کہا۔

گیٹ تک کا فاصلہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔ ماہ بانو سڑک کی بھیڑ میں شامل ہوگئی۔ اُما تب تک وہیں کھڑی رہی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆======☆======☆

حسب توقع گھر کی فضا خاصی کشیدہ تھی۔ آج کل اندھیرا بھی جلدی پھیل جاتا تھا۔ اس کے گھر میں داخل ہونے تک اندھیرا ہر طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور بیرونی دروازے کی کنڈی لگا کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔

اماں اور ابا جی کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ آواز باہر صحن تک آ رہی تھی۔ وہ سیدھی ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اماں نے تو ٹھیک سے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ البتہ ابا جی کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہاں وہ اس کی اچانک گھر سے روانگی کا سبب ضرور پوچھتے اور پھر اگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاتی تو پیار سے سمجھانے سے لے کر جھڑکنے تک وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

''ابا جی! مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھتے اور وہ غلط بیانی سے کام لے کر سب کے درمیان غلط فہمیاں پھیلا دیتی' اس نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''بتاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''پہلے تو آپ اس سے یہ پوچھیں کہ یہ کالج سے اتنی دیر سے گھر کیوں آئی اور پھر آتے ہی واپس چلی گئی اور اب یہ وقت ہوا ہے کہ محترمہ آئی ہیں' شریف گھرانے کی لڑکیوں کے یہ لچھن ہوتے ہیں۔''

''اماں جان! میں یہی تو بتانے لگی ہوں۔'' وہ بولی پھر ابا جی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ابا جی! آپ کو پتا ہے ناں کہ..... گرافکس کرتے ہوئے کتنا وقت لگتا ہے۔ پہلے تو میری پلیٹ اچھی بھلی بنی تھی' وہ خراب ہو گئی' اسے ٹھیک کیا پرنٹس ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ میری تو رونے والی حالت ہوئی تھی۔ اتنی مشکلوں سے پرنٹس نکالے۔ میں اتنی پریشان تھی کہ بھوک کے باوجود کچھ کھانے تک نہیں جا سکی۔ یہ دیکھیں میرے ہاتھ کتنے کالے ہو رہے ہیں' پرنٹس نکال نکال کر۔'' اس نے اپنے ہاتھ ان کے سامنے پھیلا دیے۔

''اور ابا جی یہ دیکھیں میرے پرنٹس۔'' اس نے پورٹ فولیو سے پرنٹس نکال کر ان کی گود میں رکھ دیے۔ [illegible] یہ کام مکمل [illegible] کی تو اماں نے ریشماں کا خط تھما دیا۔'' اس نے

بیگ سے خط نکال کر ابا جی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اس میں کیا ہے؟'' انہوں نے کھولے بغیر پوچھا۔

''آپ پڑھ لیں بلکہ اماں کو بھی سنا دیں۔'' اس نے کہا اور پرنٹس دوبارہ پورٹ فولیو میں رکھنے لگی۔

ابا جی نے بآواز بلند خط پڑھنا شروع کیا۔ اماں کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

''ان لوگوں پر اللہ کی مار ہو' کمبخت کب باز آئیں گے یہ ظلم کرنے سے کل تو جمعرات ہے' ہائے اب کیا ہوگا' بانو کے ابا کچھ کریں۔''

''جو کرنا تھا میں کر چکی ہوں۔''

''کر چکی ہو۔'' انہیں حیرت ہوئی۔

''اس خط کو پڑھ کر میں اطمینان سے تو نہیں بیٹھ سکتی تھی ناں۔'' ماہ بانو بولی۔

''عبداللہ کو اس سازش سے باخبر کرنا ضروری تھا' اس لیے میں فوراً ہوسٹل گئی۔ میرے پاس عبداللہ کا فون نمبر نہیں تھا' میرا خیال تھا شاید اُما کے پاس ہو۔''

''تو تم اسی وقت مجھے بتا دیتیں' میں بھی تمہارے ساتھ چلی چلتی۔'' اماں بولیں۔

''مجھے پتا تھا کہ آپ دہشت زدہ ہو جائیں گی اور اسی لیے میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا۔''

''پھر تمہاری بات ہوئی عبداللہ سے؟'' ابا جی نے دریافت کیا۔

''جی' بات ہوئی۔ نمبر تو خیر اُما کے پاس بھی نہیں تھا لیکن ہم نے ایڈی کو فون کیا۔ اتفاق سے عبداللہ وہیں تھا۔ اسے یوں بھی آج گاؤں جانا تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی ہے۔ یہ کام نپٹا کر میں نے کھانا کھایا۔ اتنی سخت بھوک لگی ہوئی تھی کہ اگر کچھ کھائے پیئے بغیر باہر نکلتی تو کہیں سڑک کے درمیان بے ہوش پڑی ہوتی۔''

''ہائے اللہ نہ کرے۔'' اماں نے پیار سے اس کے بالوں کو سنوارا۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور اماں پھر آپ سنتی بھی کب ہیں۔ بلا وجہ ڈانٹتی جاتی ہیں۔'' ماہ بانو کی آنکھوں میں بلا وجہ آنسو آ گئے۔

''روتے نہیں ہیں چندا۔'' اماں نے اسے پیار کیا۔

''اب تو تسلی ہو گئی ناں رضیہ بیگم۔'' ابا جی نے اماں سے کہا۔

''روٹی پکا دوں بانو؟'' اماں نے ابا جی کی بات نظر انداز کر کے اس سے پوچھا۔

''نہیں اماں' اب تو کھا لیا۔ نیہاں نے برگر اور پیپسی منگوا دی تھی۔ اُما اور نیہاں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہاں ہوسٹل میں بینگن پکے تھے ناں۔''

''اب اپنی چیزیں سمیٹو اور وہاں تارپین کا تیل پڑا ہوا ہے اس سے ہاتھ دھو لو۔ انہی سیاہ کالے ہاتھوں سے کھانا کھایا ہے تم نے۔ خدا جانے کیا کرتی ہو کالج میں' سارے ہاتھ سیاہ کالے

کر آتی ہو۔'' اماں نے کہا۔

''اچھا اماں! اب مجھے کوئی تنگ نہ کرے۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پینٹنگ کرنی ہے' کھانا کھانا ہوا تو میں خود نکال لوں گی۔ درمیان میں مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔''

وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں چلی آئی۔ دوپٹا اور بیگ بستر پر پھینک کر اس نے ایزل بورڈ لگایا اور کام کرنے لگی۔ تھکے ہونے کے باوجود کام کے دوران اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ سر اُٹھایا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تمام چیزیں سمیٹ کر وہ تھک کر بستر پر لیٹ گئی اور خالی الذہنی کی کیفیت میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

اس کا چھوٹا سا کمرا اس کے سامان سے بھرا ہوا تھا پھر بھی اس میں نفاست تھی۔ لکڑی کی الماری بیک وقت وارڈ روب اور ڈریسنگ ٹیبل کا کام دیتی تھی۔ آرٹ کا سامان رکھنے کے لیے ابا جی نے اس کی پرانی رائٹنگ ٹیبل کے نیچے ہی دو کیبنٹ بنوا دی تھیں۔ ایک طرف ایک بک شیلف تھا' جس کے ساتھ ہی ایزل بند کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔ کمرے کی اکلوتی چھوٹی سی کھڑکی پر باریک تنکوں کی چق تھی۔ دروازے پر اس نے ریمبراں کی ایک پینٹنگ کی نقل پینٹ کر دی تھی۔ دیواروں پر اس کی بنائی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ کچھ مٹی کے برتن بھی سجاوٹ کی غرض سے رکھے ہوئے تھے' جن پر اس نے مختلف چیزیں پینٹ کر رکھی تھیں۔

اس وقت وہ تھکن سے بے حال تھی اور جلد از جلد سو جانا چاہتی تھی' مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جسمانی تھکاوٹ تو جو تھی سو تھی' ذہنی تھکاوٹ اس سے بڑھ کر تھی۔ وہ سُستی کے ساتھ بستر سے اُٹھی اور بتی بند کر کے پھر آلیٹی۔

بہت سے خیال' بہت سی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کی سوچ میں وہ سب لوگ تھے جو کسی نہ کسی طرح اس کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے' لیکن کوئی بھی خیال واضح نہیں تھا' اسے رہ رہ کے نیہاں پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے ملنے سے پہلے وہ ذہنی طور پر اس قدر منتشر نہیں تھی۔

عجیب لڑکی تھی نیہاں بھی۔ ماہ بانو کی اس سے کبھی زیادہ دوستی نہیں رہی تھی' لیکن چونکہ کالج بہت چھوٹا سا تھا اور ہر شخص دوسرے کو جانتا تھا' اسی طرح ماہ بانو بھی نیہاں کو جانتی تھی۔ وہ دونوں کلاس فیلو بھی تھیں' پھر بھی ماہ بانو اس سے زیادہ قریب نہیں ہو سکی تھی۔ بعد میں وہ اور اُما روم میٹ بن گئیں۔ اُما اس کی بہت تعریف کرتی تھی' لیکن ماہ بانو کی تب بھی اس سے زیادہ دوستی نہیں ہوئی۔

نیہاں کے پاپا سول سرونٹ تھے اور ان کی فیملی اسلام آباد میں تھی۔ نیہاں بہت خوبصورت تھی۔ اس کی خوبصورتی میں زیادہ حصہ اس کے گورے رنگ کا تھا۔ یہی نین نقش اگر کسی سانولے چہرے پر ہوتے تو بہت کم لوگ اس کے چہرے کی طرف متوجہ ہوتے' مگر اب اسے دیکھ کر مجموعی طور پر

خوبصورتی کا تاثر ہی اُبھرتا تھا۔ اس میں نزاکت بھی تھی۔ باقی سب کی طرح گرافکس کرتے ہوئے' اس کے ہاتھ سیاہ نہیں ہو جاتے تھے۔ غالباً کالج کی وہ واحد اسٹوڈنٹ تھی جو یہ کام دستانے پہن کر کیا کرتی تھی۔

اس کے کپڑے ہمیشہ بہت عمدہ ہوتے تھے' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس میں اسٹائل بہت زیادہ تھا' اگر وہ عمدہ کپڑوں کے بجائے عام سے کپڑے بھی پہن لیتی تو باقی سب سے منفرد دکھائی دیتی۔ میک اپ کے نام پر وہ صرف کاجل لگایا کرتی تھی۔ اس کے پہننے' اوڑھنے اُٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' غرض یہ کہ ہر چیز میں عجیب سی بے نیازی جھلکتی تھی۔ اس بے نیازی اور لاپروائی نے اس میں کشش بھر دی تھی۔

اور یہی وہ چیزیں تھیں' جنہوں نے ماہ بانو کو اس سے دور کر رکھا تھا۔ وہ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ...... بول چال اور انداز نشست و برخاست سے خائف رہا کرتی تھی' احساسِ کمتری اسے ایسے کسی بھی شخص سے قریب ہونے سے روکتا تھا۔

ہاں اُما تھی' جس سے وہ بہت قریب تھی۔ شاید وہ اُما سے بھی اس قدر قریب نہ ہو سکتی' اگر پہلے دن اُما بھی اس کی طرح متجسس اور اکیلی اکیلی نہ ہوتی تو' ان کا تجسس اور اکیلا پن انہیں ایک دوسرے کے نزدیک لایا تھا۔

نیہاں نے اپنے منہ سے اعتراف نہ کیا ہوتا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لڑکی بھی کسی کے ساتھ اتنی سنجیدگی سے عشق کر سکتی ہے۔ وہ تو بہت خوش باش اور بے فکر دکھائی دیتی تھی اور اس کی یہی بے فکری اور بے نیازی ماہ بانو کو اس سے دور لے جاتی تھی۔ اُما اکثر نیہاں کے متعلق کہتی تھی۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے بانو کہ وہ کتنی اچھی اور ہمدرد لڑکی ہے۔ اتنی اچھی روم میٹ کسی کو نہیں مل سکتی۔''

''ہوا کرے' میں کیا کروں۔'' جواب میں ماہ بانو بے نیازی دکھا دیتی تھی۔

آج ماہ بانو کو اپنے اندر دور کہیں خوشی کا ہلکا سا احساس جاگتا ہوا لگ رہا تھا۔ ہاں نیہاں بھی عام سی انسان تھی۔ بے حد عام سی لڑکی۔ وہ اتنی بے نیاز نہیں تھی۔ جتنی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی شخصیت میں بھی چھوٹی سی دراڑ تھی جو آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔

نیہاں کی ذات کا جو پہلو ماہ بانو کو اس سے دور رکھتا تھا' وہ آج چٹخنے لگا تھا۔ نیہاں ہار بھی سکتی تھی۔ فکر مند بھی ہو سکتی تھی' کتنی دلچسپ بات تھی ناں۔

ماہ بانو کا احساسِ کمتری کبھی کبھار اسے بہت تکلیف میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس نے پہلے دن نیہاں کو دیکھا تھا' وہ اسے اچھی لگی تھی۔ اس کا انداز بھی اسے اچھا لگا تھا' لیکن وہ اپنے دل میں یہ بات ماننے پر قطعاً تیار نہیں تھی۔ وہ نیہاں جیسی بن جانا چاہتی تھی' مگر بن نہیں سکتی تھی۔ نیہاں جس کے پیچھے آدھا کالج دیوانہ پھرا کرتا تھا' مگر اس نے ہمیشہ ہر ایک کے لیے نو لفٹ کا بورڈ لگائے

رکھا۔ یوں اس کے پروانوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔

ماہ بانو' نیہاں جیسی بننا چاہتی تھی کیونکہ اس کے اندر بھی سراہے جانے کی خواہش تھی اسے محبت اور رومانس وغیرہ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی' جتنی اس بات سے تھی کہ نیہاں کی طرح اس کے پیچھے بھی آدھا نہ سہی چوتھائی کالج تو دیوانہ ہو۔ وہ صرف اپنی اَنا کی تسکین چاہتی تھی' لیکن یہ بات بھی وہ اپنے دل تک میں ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

مگر آج وہ پورے انصاف کے ساتھ اپنا تجزیہ کرنا چاہتی تھی۔

ماہ بانو نے کالج میں ایسے انداز میں رہنا شروع کیا' جس سے سب خود ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے ہے۔ اس نے بھی کبھی کسی کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُما کی بھی نہیں۔

دراصل جس وقت اس کی اُما سے ملاقات ہوئی تھی تب اسے احساس نہیں تھا کہ یہ ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ جب تک وہ دونوں گہری دوستی تک پہنچیں' تب تک یہ غلط فہمی پورے طور پر کالج میں پھیل چکی تھی اور اس وقت ماہ بانو میں ہمت نہیں تھی کہ اُما کو سب کچھ بتا دے۔

پھر ایسے میں ہی سعد اس کی طرف بڑھا۔ سعد بے حد عام سا لڑکا تھا۔ دیکھنے میں ویسا ہی تھا جیسے کالج کے بیشتر لڑکے تھے' لیکن وہ واحد لڑکا تھا جو اس کی طرف بڑھا تھا اور جب بات صرف ایک شخص کی ہو تو نولفٹ کا بورڈ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے ہاتھ میں انتخاب کا حق تھا ہی نہیں۔

نیہاں کے نولفٹ کے باوجود اسے سراہنے والے بے شمار تھے' لیکن وہ سعد کو لوٹا دیتی تو اس کے پاس ایک بھی سراہنے والا نہ بچتا۔ سو اس نے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ انا کی تسکین چاہیے تھی۔ نیہاں کی طرح نہ سہی' اس طرح سہی۔ اور وہ خود کو مطمئن کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

سعد نے کبھی اس سے محبت کا دعویٰ نہیں کیا تھا' وفاداری کی قسمیں نہیں کھائی تھیں۔ ماہ بانو کو اس بات سے صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ اس طرح ان دونوں کی دوستی کو ایک رنگ مل جاتا۔ یوں وہ دعویٰ کر سکتی تھی کہ اس سے بھی کوئی محبت کرتا ہے' مگر سعد نے کبھی کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔

اپنے اندر کے اس خمار میں گھر کر ماہ بانو کو نیہاں اپنے سے بہت دور بہت اونچی نظر آتی تھی۔ ایسی جگہ جہاں تک ماہ بانو کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی' تب ہی تو وہ اس سے ہمیشہ خائف رہتی تھی۔ ہمیشہ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یوں جیسے نیہاں کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

مگر آج نیہاں اس اونچائی پر نہیں تھی۔ وہ سیڑھیاں اُترتی آ رہی تھی اور ماہ بانو کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی وہ آخری سیڑھی اتر کر اس کے برابر آ کھڑی ہوگی' جیسے ابھی دونوں کا قد بالکل

برابر ہو جائے گا۔

اپنے اندر اُٹھتی خوشی کے اس احساس پر ماہ بانو کو شرم بھی آئی۔

''میں کتنی خود غرض ہوں۔ نیہاں کی ذات چٹخنے کا تماشا دیکھنا چاہتی ہوں میں خود کیا ہوں؟ احساسِ کمتری میں مبتلا بیمار سوچ رکھنے والی لڑکی۔''

لیکن اس کے اندر دور کہیں اُٹھنے والی ہلکی سی خوشی اس پر بھی ماند نہیں پڑی۔ شاید ان دونوں احساسات کے خانے الگ الگ تھے۔ شرمندگی کا احساس اپنی جگہ تھا' لیکن خوشی بھی اس کے اندر دفن نہیں ہوئی تھی۔

اتنے سارے انسانوں میں میرا خانہ کون سا ہے؟ اس نے سوچا۔ نہ تو میں نیہاں' ریشماں اور زرینہ خالہ کی طرح ٹوٹ کر محبت کر سکتی ہوں اور نہ ہی اُما کی طرح اماں اور ابا جی یا تقدیر پر بھروسا کرنے کو تیار ہوں۔

میں اُما کی طرح نہیں کہہ سکتی کہ میرے ماں باپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے وہی بہترین ہوگا اور میں اسی پر عمل کروں گی اور نہ ہی نیہاں کی طرح کسی کے متعلق یہ کہہ سکتی ہوں کہ کم از کم میں تو مخلص ہوں ناں اس کے ساتھ لیکن یہ کوئی نہیں سمجھ سکے گا۔

میں کیا ہوں' میرے جیسے کیا کچھ اور لوگ بھی ہیں ہمارا خانہ کیا ہے؟

نہیں سعد' یہ طے ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی' صرف زندگی کا راستہ آرام سے طے کرنے کے لیے اپنے علاوہ تمہیں بھی اس خوش فہمی کا شکار رکھنا چاہتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ حالانکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ تم صرف میری بیمار انا کی ضرورت ہو' اگر مجھے تمہارا بہتر متبادل مل جاتا تو میں آنکھ اُٹھا کر بھی تمہاری طرف نہ دیکھتی۔

ہاں سعد! یہ حقیقت ہے' بہت تلخ سہی' لیکن یہی سچ ہے۔ اس حقیقت کو میں نے اب تک خود سے بھی چھپا رکھا ہے۔ میں خود بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

آج میں نے اپنے دل کو بہت ٹٹولا ہے۔ تم اس میں کہیں بھی نہیں ہو' اس میں صرف اور صرف سود و زیاں ناپنے کا ایک ترازو ہے' جسے میری بیمار انا نے اُٹھا رکھا ہے۔ شاید ایسی رات پھر میری زندگی میں کبھی نہ آئے۔ میں خود سے یہ اعترافات پھر کبھی نہیں کر سکوں گی' اس لیے آج میں خود کو اور تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنے آپ سے محبت ہے اور بس۔

یہ رات بہت تاریک ہے میرے اعترافات کی گواہ صرف اس کی تاریکی ہے۔ میں اتنی بہادر نہیں کہ دن کی روشنی میں سب کو اپنے اندر کی سیاہی دکھا سکوں۔ یہ باب جو آج رات کھلا تھا' آج رات کو ہی بند ہو جائے گا۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' لیکن مجھے ایسی کوئی دوسری رات چاہیے بھی نہیں۔

اب میں محبت کروں گی یا نہیں، لیکن خود سے جھوٹ نہیں بولوں گی، خود کو دھوکا نہیں دوں گی۔"

ماہ بانو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنے اندر نہیں جھانکنا چاہتی تھی، مگر آج اس نے اپنے اندر جھانکا تھا تو اسے وہ سب نظر آ گیا تھا، جس سے وہ ہمیشہ نظریں چراتی رہی تھی۔ اپنی ذات کے اندر کے خوف کی وجہ سے وہ اس سیاہی کو باہر نہیں نکالنا چاہتی تھی، لیکن اس رات اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے سب سیاہی دھو ڈالی۔

ساری رات وہ پریشان خیالی کا شکار رہی۔ عجیب عجیب سے خواب دکھائی دے رہے تھے۔ نیہاں سیڑھیاں اُترتی آ رہی تھی۔ وہ جتنی سیڑھیاں اُترتی تھی، ماہ بانو اسی قدر زمین میں دھنستی جا رہی تھی۔ نیہاں اس پر بھی بے نیاز اور بے فکر دکھائی دے رہی تھی، لیکن ماہ بانو مسلسل چلا رہی تھی، بچاؤ کے لیے سب کو پکار رہی تھی۔ اور پھر اس کا یہ خواب ٹوٹ گیا۔

☆======☆======☆

عبداللہ کو ماہ بانو کی بات کا یقین نہیں آیا تھا، لیکن اس نے ایڈی کی طرف سے ہی بابا جان کو فون کیا۔

"کل گڑیا کا ارادہ تو ہے شاپنگ پر جانے کا۔" بابا جان نے بتایا۔ "لیکن ہمیں کسی حملے کی اطلاع نہیں ملی۔ ایسی کوئی سازش بنائی گئی ہوتی تو ہمیں ضرور علم ہو جاتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ یہ بات بھائی جان کی حویلی سے نکل کر لاہور تک پہنچ چکی ہے۔"

"لیکن بابا جان! جس نے مجھے اطلاع دی ہے، اسے یہ علم تھا کہ گڑیا نے جمعرات کو گھر سے نکلنا ہے، اس لیے اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ جس سازش کے متعلق اس نے ہمیں خبر دی ہے، وہ واقعی بڑے بابا جان کی حویلی میں بن چکی ہو۔ یوں بھی وہ ایسی کوئی بھی گھٹیا حرکت کر سکتے ہیں۔"

"خیر ہم بھی یہاں چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہوئے۔ تم ایسا کرو عبداللہ کہ فوراً گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤ لیکن ذرا دھیان سے۔" انہوں نے کہا۔

"اور یہ تمہاری اماں بھی کچھ کہنا چاہتی ہیں ان سے بھی بات کر لو۔"

اماں بہت پریشان تھیں۔ پہلے تو وہ اس سے خیر خیریت پوچھتی رہیں۔

"عبداللہ! تم بے احتیاطی کرتے ہو بیٹا۔" انہوں نے کہا۔ "گاؤں آتے ہوئے ساتھ گن مین ضرور لانا، مجھے تو یہ بھی ڈر ہے کہ انہیں تمہارے آنے کی بھنک مل گئی تو وہ راستے میں ہی تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔"

"آپ بے فکر رہیں اماں جان! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"کیسے بے فکر ہو جاؤں، جب تک تم گھر نہیں پہنچ جاؤ گے میری جان اسی طرح سولی پر ٹنگی

رہے گی۔" وہ بولیں۔

"اور میری ایک بات یاد رکھنا۔ ایک گاڑی اپنے آگے رکھنا اور ایک پیچھے، دیکھو بیٹا لاپروائی مت دکھانا۔"

"جیسے آپ کی مرضی، میں بس آدھے گھنٹے تک نکل رہا ہوں، خدا حافظ۔"

"انہیں علم نہیں ہے اس بات کا؟" عبداللہ نے فون رکھا تو ایڈی نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بانو کی بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں ہے، بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔"

"انکل آنٹی تو پریشان ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں، انہیں میری بھی فکر ہے۔ اماں نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ مسلح محافظوں کی ایک گاڑی میرے آگے اور ایک پیچھے ہونی چاہیے۔" وہ ہنس پڑا۔

"اب میں اماں کو کیا سمجھاؤں کہ جس گولی پر میرا نام لکھا ہو گا، وہ ہر حفاظتی حصار توڑ کر مجھ تک ضرور پہنچے گی۔ یہ گن مین یہ کیز وغیرہ صرف اپنی تسلی کی باتیں ہیں۔ اور پھر یہ گن مین بھی تو کسی کے بیٹے، کسی کے بھائی ہوں گے، جو صرف چند سو روپوں کے عوض اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ میری جان ان میں سے کسی سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے۔" اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ "یہ سب بیکار اور فضول باتیں ہیں۔"

"ہاں ہیں تو، لیکن انہی بیکار اور فضول باتوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ تم یہ معاشرہ اور اس کا نظام تبدیل نہیں کر سکتے۔" ایڈی نے کہا۔

"اسی بات کا تو افسوس ہے کہ میں یہ نظام اور معاشرہ تبدیل نہیں کر سکتا اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس اس بات کا ہے کہ میں آرٹ پڑھ رہا ہوں۔ میرا ذہن اور میری روح حسن اور خوبصورتی تلاش کرنا چاہتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہر تلاش کا اختتام بدصورتی پر ہوتا ہے۔ میرا ذہن کسی بدصورتی کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا، خواہ وہ خیالات میں ہو۔ یا رویوں میں اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے ہر بدصورتی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جا رہے ہو؟"

"ہاں، وہاں اماں اور ابا جان پریشان ہوں گے۔ گڑیا کو خبر ہوئی تو وہ بھی پریشان ہو جائے گی۔" عبداللہ نے کہا۔

اماں جان کی ہدایت کے برعکس وہ اکیلا ہی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اماں سے بحث نہیں کرتا تھا چاہے اسے ان سے کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن کرتا وہی تھا جسے وہ درست سمجھتا تھا۔

سارا راستہ آرام سے طے ہو گیا تھا' لیکن گاؤں کی طرف مڑنے والی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر جیسے ہی اس نے اپنی نسان پٹرول اُتاری تو اسے بریک لگانا پڑے۔ بالکل سامنے ہی چار گاڑیوں نے سڑک بند کر رکھی تھی وہ تیزی سے اپنی جیپ ریورس کر کے بڑی سڑک پر لے جانا چاہتا تھا کہ سب سے اگلی گاڑی سے بابا جان نیچے اُترے۔

''اوہ بابا جان!'' اس نے گہری سانس لی اور جیپ بند کر کے نیچے اُتر آیا۔

''بابا جان آپ نے کیوں زحمت کی؟'' وہ ان سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

''مجھے گھر میں چین نہیں آ رہا تھا' تمہاری اماں بھی پریشان تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ تم بغیر کسی محافظ کے آؤ گے۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود ہی تمہیں لینے یہاں تک چلا آؤں۔''

''چلیں باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔''

وہ دونوں ایک ہی جیپ میں بیٹھ گئے۔

''یہ نسان پٹرول شاید آپ نے نئی لی ہے۔ میں نے پہچانا نہیں تھا۔'' عبداللہ نے جیپ کا جائزہ لیا۔

''ہاں تمہارے جانے کے اگلے ہی دن پہنچی تھی۔''

''تو بس ٹھیک ہے' اب کی مرتبہ لاہور جاتے ہوئے میں یہی لے جاؤں گا۔''

''تم سے زیادہ پیاری تو نہیں ہے' جو چاہو وہی گاڑی لے جاؤ۔'' بابا جان مسکرائے۔

حویلی میں اماں جان اور زہرا بے چینی سے ان کا انتظام کر رہی تھیں۔

''تم اپنے ساتھ محافظ نہیں لائے ہو گے؟'' اماں جان نے کہا۔

''آپ یہی چاہتی تھیں ناں کہ میں آپ تک خیریت سے پہنچ جاؤں' سو وہ میں پہنچ گیا۔'' وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''میں نے زینی کو مری فون کر کے کہہ دیا ہے کہ وہ بھی محتاط رہے۔'' اماں نے بتایا۔

''گڑیا! تم نے کس کس کو اپنے کل کے پروگرام کے متعلق بتایا تھا؟'' عبداللہ نے اس سے پوچھا۔

''''سب ہی کو پتا تھا' آپ کو تو پتا ہے ناں کہ میں جو پروگرام بناتی ہوں' اس کا اچھا خاصا اعلان کرتی ہوں۔ اس کا بھی سب کو پتا تھا۔ گھر کے اندر کام کرنے والی ملازمائیں' ڈرائیور' گن مین۔''

''پھر تو یہ بات کوئی بھی باہر نکال سکتا ہے' ہو سکتا ہے کسی نے محض باتوں میں تذکرہ کر دیا ہو اور نیاز پور والوں نے اسے ایک اچھا موقع سمجھتے ہوئے اس کی مناسبت سے اپنا پروگرام بنا لیا ہو۔'' عبداللہ نے خیال ظاہر کیا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بابا جان اندر چلے آئے۔ عبداللہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''میں فون پر تم سے لمبی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' اب بتاؤ تمہیں یہ خبر دی کس نے ہے؟'' وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

''میری کالج فیلو ہے ماہ بانو' بہت اچھی لڑکی ہے اس کا تعلق بھی نیاز پور سے ہے۔''

''ہوں۔'' بابا جان سوچ میں پڑ گئے۔

''کس قسم کی رشتہ داری ہے اس کی نیاز پور میں؟''

''اس کی اماں اور اباجی دونوں نیاز پور کے ہیں' لیکن عرصہ ہوا' وہ لوگ لاہور میں سیٹل ہو گئے ہیں' پھر بھی گاؤں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''کیا نام ہے اس کے والد کا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نام تو مجھے معلوم نہیں ہے' البتہ اتنا پتا ہے کہ وہ کمہار ہیں۔''

بابا جان سوچ میں پڑ گئے' لیکن چونکہ عبداللہ کو ماہ بانو کے اباجی کا نام معلوم نہیں تھا' اس لیے وہ انہیں شناخت کرنے میں ناکام رہے۔

''اس کے والدین نے تو بہت عرصہ پہلے گاؤں چھوڑ دیا تھا' البتہ اس کے نانا اب بھی نیاز پور میں رہتے ہیں۔'' عبداللہ کو اچانک یاد آیا۔

''تمہیں اس کے والد کا تو پتا نہیں ہے' نانا کا کیا پتا ہو گا۔'' بابا جان نے کہا۔

''نہیں' ان کا پتا ہے' نام ذہن میں نہیں آ رہا' لیکن یہ یاد ہے کہ وہ نیاز پور کی مسجد کے امام ہیں۔''

بابا جان چونک گئے۔ ''مولوی نعمت اللہ؟''

''اوہ یس! یہی نام ہے' بانو نے بتایا تھا۔''

وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہے پھر سر اُٹھایا۔

''تو مولوی صاحب کی ایک نواسی تمہارے ساتھ پڑھتی ہے؟''

''جی' لیکن مولوی صاحب کی غالباً ایک ہی نواسی ہے اس کا کوئی اور بہن بھائی نہیں ہے۔''

''سنیں علی!'' اماں جان نے بابا جان کو متوجہ کیا۔ ''یہ وہی مولوی صاحب ہیں ناں' جن کی چھوٹی بیٹی پیر صاحب سے بیاہی گئی تھیں؟''

''ہاں۔'' بابا جان نے مختصراً کہا۔

''پتا نہیں اماں آپ کو کیسے اتنے لمبے لمبے رشتے یاد رہتے ہیں؟'' زہرا بولی۔

''شادی ہوتی ہے تو خود ہی سب رشتے یاد ہو جاتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''ٹھہریں مجھے سمجھنے دیں۔ ایک ہوئے مولوی صاحب' ان کی ایک چھوٹی بیٹی ہے' اس کی شادی ہوئی کسی پیر صاحب سے' لیکن اماں یہ پیر صاحب کون ہیں؟'' زہرا نے دریافت کیا۔

''تمہارے بڑے ابا اور کون؟'' اماں نے کہا۔

’’توبہ میرے کوئی نہیں ہیں بڑے ابا جان۔‘‘ زہرا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

’’میرے تو بس ایک ہی بابا جان ہیں‘ میرے اپنے۔‘‘ اس نے ان کی گردن میں بازو ڈال دیے۔

’’تو یہ ماہ بانو اپنی ریشماں کی خالہ زاد ہوئی ناں۔‘‘ اماں نے بابا جان سے کہا۔

’’ہاں۔‘‘ بابا جان نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’یہ کیا آپ لوگ رشتے ملانے بیٹھ گئے‘ کام کی بات کریں۔‘‘ عبداللہ کو اُلجھن ہونے لگی تھی۔

’’دیکھا بابا جان!‘‘ زہرا نے ہولے سے ان کے کان میں کہا۔ ’’ذرا نام لیا ریشماں کا اور یہ بیزار ہو گئے۔‘‘

بابا جان نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عبداللہ کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کے چہرے پر کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں‘ اس لیے اس نے جلدی سے موضوع تبدیل کر دیا۔

’’کل پروگرام یہ ہو گا کہ گڑیا گھر پر ہو گی‘ گاڑی پر شہر میں جاؤں گا‘ پھر دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ کیا کریں گے۔‘‘

’’تم نہیں جاؤ گے عبداللہ۔‘‘ اماں جان نے ایک لمحے میں اس کا پروگرام رد کر دیا۔

’’گاڑی میں صرف مسلح محافظ ہوں گے‘ وہ نپٹ لیں گے خود ہی۔‘‘

’’اچھا کل کی کل دیکھی جائے گی۔‘‘ اس نے بات ختم کرنا چاہی۔

’’ہرگز نہیں۔‘‘ ماں نے اسے ڈپٹ دیا پھر بابا جان کی طرف مڑیں۔

’’آپ اسے سمجھائیں علی‘ یہ اس وقت بات ٹال رہا ہے‘ لیکن کل وہی کرے گا‘ اس کی جو مرضی ہو گی۔‘‘

’’تم خود کیوں جانا چاہتے ہو عبداللہ؟‘‘ بابا جان نے پوچھا۔

حالانکہ وہ اس کا جواب جانتے تھے۔ اس قسم کے جواب وہ بارہا انہیں دے چکا تھا۔ وہ اس کی جگہ ہوتے تو اپنے بابا جان کو بھی یہی جواب دیتے‘ بلکہ وہ تو اس سے بھی سخت اور ترش باتیں اپنے بابا جان سے کہہ دیا کرتے تھے۔

مگر اب جگہیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب وہ بیٹے تھے تو اس قسم کی بات اپنے بابا جان سے دوٹوک انداز میں کہہ دیا کرتے تھے۔ اب وہ باپ تھے اور ان کے سامنے انہی کا بیٹا کھڑا تھا۔

وقت نے سوچ میں کتنا فرق پیدا کر دیا تھا۔ جوانی میں نتائج کی پروا نہیں ہوتی تھی‘ آگ کا سمندر راستے میں آ جاتا تو وہ یہ سوچے بغیر اس میں قدم رکھ دیتے کہ اس سے پاؤں جل بھی سکتے ہیں

اور اب جب زندگی کی ندی میں عمر کا پانی آہستہ روی سے بہنے لگا تھا تو سوچنے کا انداز

بالکل بدل گیا تھا۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا بہادری نہیں حماقت لگتا تھا۔ اب زندگی حساب کتاب میں کٹنے لگی تھی۔ دشمن کے مقابلے میں ہمارا نقصان کتنا ہو گا اور فائدہ کتنا..... فلاں بات کا نتیجہ کیا نکلے گا‘ فلاں عمل کا ردعمل کیا ہو گا‘ بس اب یہی حساب کتاب رہ گیا تھا۔

’’بابا جان آپ وہ گولی روک سکتے ہیں‘ جس پر قضا نے میرا نام لکھ رکھا ہے؟‘‘

عبداللہ کی آواز انہیں اپنی سوچ سے باہر کھینچ لائی۔

’’اور کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنے وقت سے پہلے یا وقت کے بعد اس دنیا سے جائے۔ کل میں اس لیے جانا چاہتا ہوں بابا جان کہ میری زندگی آپ کے ان مسلح محافظوں یا مزارعوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

وہ چند سو روپوں یا گندم چاول کی دو چار بوریوں کی خاطر ہمارے سامنے ڈھال بنتے ہیں تو مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لفظ انسانیت سے گھن آنے لگتی ہے مجھے۔

میں کوئی نیک پارسا انسان نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس دنیا میں رہنا ہے اور میرا وجود میرا ضمیر اس کی غلاظتوں سے آلودہ ضرور ہو گا‘ بس میری خواہش صرف اتنی ہے کہ یہ آلودگی کم سے کم ہو۔‘‘

’’بھائی آپ کو تو موقع ملنا چاہیے فلسفی بننے کا۔‘‘ زہرا نے ٹانگ اڑائی۔

’’اتنے فلسفے میں پڑیں گے تو زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ مس فٹ ہو جائیں گے۔ اس معاشرے میں۔

سیدھی سی بات ہے‘ نیاز پور والوں کی طرح ہم نے اپنے مسلح محافظوں یا مزارعوں کو برسوں اپنا نمک کھانے کا طعنہ دے کر کسی ملازمت کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ ہماری خدمت کرتے ہیں‘ تو ہم بھی انہیں حق خدمت دیتے ہیں‘ بات برابر ہو گئی۔

اگر ایک گن مین ہماری ڈھال بنتا ہے تو اس لیے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ کام کرنے پر راضی ہوا ہے۔‘‘

’’جو گن مین ہماری ڈھال بن رہا ہے یا جو مزارعے برسوں سے یہاں آباد ہماری زمینوں پر کام کر رہے ہیں‘ ان کے پاس یہ کام کرنے کے علاوہ آپشن کون سی ہیں؟ صدیوں کی غلامی نے انہیں اس قابل چھوڑا ہی کب ہے کہ ان کاموں سے ہٹ کر وہ کچھ اور سوچ سکیں۔ رہٹ کے گرد گھومنے والا بیل ہر روز میلوں کے حساب سے سفر کرتا ہے‘ لیکن رہتا اسی دائرے میں ہے‘ جہاں اس سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اور یہ مزارعے‘ یہ سسٹم سب کچھ رہٹ کے بیلوں کی طرح ہے جو ہمیشہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اگلا موڑ مڑتے ہی سب کچھ تبدیل ہو جائے گا‘ لیکن تبدیل کچھ بھی نہیں ہوتا‘ نہ ہو گا۔ ہاں صدیاں گزرتی جائیں گی۔‘‘ عبداللہ اُٹھ کھڑا

ہوا۔

''میں سونے جا رہا ہوں' جو پروگرام میں نے بنایا ہے' وہ فائنل ہے۔ اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔''

عبداللہ سونے کے لیے کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا' لیکن اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ اماں اور بابا جان کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا' اس لیے چلا آیا تھا۔ ابھی اسے کل صبح کے لیے منصوبہ بندی کرنی تھی اور وہ بھی پو پھٹنے سے پہلے پہلے۔

آدھ گھنٹے تک اس نے سب کے سونے کا انتظار کیا پھر اپنے دو قابلِ اعتماد محافظوں کے ساتھ باہر نکلا۔ اسے حویلی سے بڑی سڑک تک تمام راستے کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنا تھی کہ اگر حملہ ہوا تو کس طرف سے ہوگا۔ یہ کام اکیلے ممکن نہیں تھا۔ تمام راستے کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد ایک جگہ وہ رُک گیا۔

''اگر کل کوئی حملہ ہوا تو وہ اسی جگہ پر ہوگا۔'' اس نے کہا۔

اس طرف سڑک بہت ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھی۔ ویسے تو جیپ اس طرح کے راستوں پر رفتار کم کیے بغیر گزر سکتی تھی لیکن عام حالات میں تقریباً سبھی یہاں رفتار کم کر دیتے تھے۔ اردگرد دھان کے کھیت تھے' یوں تو دھان کی کٹائی شروع ہو چکی تھی' لیکن سڑک کے گرد واقع کھیت دور دور تک اسی طرح لہلہا رہے تھے۔

''مگر یہاں تو بہت مشکل ہے شاہ صاحب!'' فتح محمد نے کہا۔

''کھیتوں میں تو کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ہے' اس طرح کھیتوں میں گھسنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا اور پھر یہ تو کھیت بھی ہم ہی لوگوں کے ہیں۔''

''نیاز پور والوں کے نقطہ نظر سے حملے کے لیے یہی سب سے محفوظ اور مناسب مقام ہے۔ یہاں مسلح محافظوں کی دو تو کیا دس گاڑیاں ہوں تب بھی وہ بیک وقت سب کو ناکارہ بنا سکتے ہیں۔''

''آپ کی بات درست ہے۔'' فتح محمد نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

''لیکن شاہ صاحب! حملہ کرنے کے لیے سب سے پہلے انہیں خود کھڑا ہونے کی جگہ چاہیے۔''

''سوچو فتح محمد' ہم ان کی جگہ ہوتے تو سب سے پہلا کام کیا کرتے؟'' عبداللہ نے کہا۔

''سب سے پہلے تو ہم اس بات کا انتظام کرتے کہ دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے اور ہمیں کم سے کم۔'' فتح محمد کے بھائی نور محمد نے کہا۔

''اور اس کام کے لیے یہ جگہ کامیاب ہے' اس کے بعد ہم کیا کرتے؟''

''میں سمجھ گیا شاہ صاحب۔'' فتح محمد کی آواز میں جوش تھا۔ ''سیدھی سی بات ہے کہ ہم ان

کھیتوں میں اپنے لیے جگہ بناتے۔''

''گڈ۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''میں تمہیں اسی پوائنٹ پر لانا چاہتا تھا۔ اب تم دونوں ٹارچوں کی روشنی میں دائیں ہاتھ کی طرف کے کھیتوں کا جائزہ لو اور میں بائیں سمت جاتا ہوں۔''

''شاہ صاحب! ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ ایک طرف کے کھیت میں دیکھ لیتا ہوں۔ دوسری طرف کے نور محمد دیکھ لے گا۔ آپ گاڑی میں بیٹھیں۔''

''جو میں کہتا ہوں' وہ کرو۔''

''میرا مطلب تھا شاہ صاحب کہ کھیتوں میں سانپ بچھو وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ آپ کو تکلیف نہ پہنچے۔'' فتح محمد نے صفائی پیش کی۔

''میں نے کہا ناں فتح محمد کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' عبداللہ نے قدرے سختی سے کہا اور بائیں طرف والے کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس طرح ایک ٹارچ کی روشنی میں کھڑی فصل میں گھسنا خاصا مشکل اور خطرناک کام تھا' لیکن ان کے پاس وقت بہت کم تھا اور یہ جائزہ انہیں پو پھٹنے سے پہلے پہلے مکمل کر لینا تھا۔

راستہ تلاش کرتے کرتے عبداللہ کے بازوؤں پر خراشیں بھی آ گئی تھیں۔ بالآخر آدھ پون گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا' جو اس مقصد کے لیے نیاز پور والوں نے بنایا تھا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں یوں ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں بھی فصل کھڑی ہے' جب کہ درحقیقت وہاں سے فصل کاٹ کر باقی پودوں کے سہارے یوں ہی کھڑی کر دی گئی تھی۔

ایک مرتبہ راستہ ملا پھر باقی کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ کٹی ہوئی فصل کے درمیان راستہ بناتے ہوئے اس جگہ تک جا پہنچا جو حملہ کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ یہاں سے سڑک پر ہچکولے کھاتی گاڑی کو بہت آرام کے ساتھ نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ وہ اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد واپس پلٹ گیا۔

جیپ کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے سگریٹ سلگائی۔ اس لمحے اسے ماہ بانو کا خیال آیا اور اس کا دل ماہ بانو کے لیے شکرگزاری کے جذبات سے بھر گیا۔

''اگر اس نے اطلاع نہ دی ہوتی تو......'' اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے تو ٹھیک سے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا تھا' مگر مجھے اس اطلاع کی صداقت پر یقین بھی تو نہیں تھا۔

اس نے سامنے پھیلے کھیتوں کی طرف دیکھا فتح محمد اپنے بھائی کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے تھے شاہ صاحب!'' اس نے جوش سے کہا۔ ''وہاں تو باقاعدہ جگہ بنی

ہوئی ہے۔''

''واپس چلو۔'' اس نے سگریٹ کا بقیہ حصہ فضا میں اچھال دیا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

صبح جب اماں نے ماہ بانو کو جگایا تو وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔

''یہ کیا؟'' اماں گھبرا گئیں۔

''بانو کے ابا...... بانو کے ابا!''

ماہ بانو اُٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا اماں؟ خیر تو ہے؟'' اس نے بکھرے بال سمیٹ کر ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا بنایا۔

''لیٹی رہو' تمہیں تو اتنا سخت بخار ہے۔'' اماں نے زبردستی اسے لٹانا چاہا۔

''ٹھیک ہو جائے گا خود ہی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''مجال ہے جو یہ میری سن جائیں۔'' اماں بڑبڑائیں پھر آواز بلند بولیں۔

''اجی سنتے ہیں!''

ابا جی مٹی سے بھرے ہاتھوں سمیت اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیا ہوا؟''

''ذرا دیکھیں تو بانو کو کس قدر تیز بخار ہے۔''

''اماں بخار ہی ہے ناں ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ایسے تو نہیں ٹھیک ہو جائے گا ناں۔'' ابا جی نے کندھے پر رکھے کپڑے سے ہاتھ صاف کیے اور پھر اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ کر حرارت کا جائزہ لینے لگے۔ ''یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

''تب ہی تو آپ کو آواز دی ہے۔''

''تم ایسا کرو بانو کی ماں' مجھے تھرمامیٹر لادو اور اسے ناشتا بھی کروادو تاکہ بعد میں دوا لے سکے' پھر میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔''

''اس نقار خانے میں میری بھی کوئی سنے گا؟'' ماہ بانو نے بے چارگی سے کہا۔

''کیا ہے؟''

''آج میری ڈرائنگ کی کلاس ہے' میں کسی صورت چھٹی نہیں کر سکتی۔''

''بھاڑ میں گئی ایسی پڑھائی۔'' اماں کو غصہ آ گیا۔ ''میری بچی بخار میں پھنک رہی ہے اور کالج والوں کو پرواہی نہیں۔''

''ایک دن نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا' آج چھٹی کر لو' کل تو پھر جمعہ ہی ہے۔'' ابا جی نے کہا۔

''ممکن ہی نہیں ہے ابا جی! روز ہی روز مارکنگ ہوتی ہے۔ میری ایوریج خراب ہو جائے

گی۔''

بڑی مشکلوں سے اماں اور ابا جی کو قائل کر کے وہ کالج جانے کے لیے تیار ہوئی۔ اس کا سر بری طرح دُکھ رہا تھا۔ آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ عام طور پر کالج جانے سے پہلے وہ ناشتا نہیں کرتی تھی' لیکن اماں نے زبردستی ڈبل روٹی اور انڈہ ٹھنسوایا۔ ابا جی نے دواؤں کے بکس سے دوا نکال کر دی تب اُسے گھر سے نکلنے کی اجازت ملی۔

''چلو میں تمہیں کالج چھوڑ آؤں۔'' ابا جی نے کہا۔

''میں چلی جاؤں گی۔''

''ضد نہیں کرتے۔'' ابا جی نے اسے پیار سے ڈپٹا۔

بخار کی وجہ سے بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی' لیکن وہ کام کرتی رہی۔ اُما اپنا کام چھوڑ کر بار بار اس کے پاس آ جاتی تھی۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟'' وہ تشویش سے پوچھتی۔

''اب کچھ بہتر ہے' صبح دوا کھالی تھی' اب تو سر میں درد بھی نہیں ہے اور بخار بھی محسوس نہیں ہو رہا۔'' وہ کہتی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

نیہاں اس کے ساتھ ہی کام کر رہی تھی۔ جینز اور کھلی ٹی شرٹ میں ملبوس' سر پر نیلی کیپ رکھے جس سے اس کے سنہری بال باہر نکل رہے تھے۔ کان کے اوپر پنسل اٹکائے' واک مین سنتے ہوئے' وہ ہمیشہ کی طرح بے نیاز اور لاپرواہ دکھائی دے رہی تھی۔

''کتنی خوش قسمت ہے یہ۔'' ماہ بانو نے سوچا۔ ''اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میری طرح کسی احساسِ کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہے۔''

''کس سوچ میں گم ہو؟'' اُما کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''نہیں کسی میں بھی نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تو آؤ' کچھ کھا پی آئیں۔ قسم سے بہت بھوک لگ رہی ہے' تم دوا بھی کھا لینا۔''

سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس لے کر وہ باقی سب سے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔

''پتا نہیں عبداللہ نے میری ہدایات پر عمل کیا ہے یا نہیں۔'' ماہ بانو نے کہا۔

''بہت مشکل ہے' ہم اس کی خیریت کی دعا ہی کر سکتے ہیں۔'' اُما بولی۔

''پیر صاحب اور ان کے بیٹے تو پڑھے لکھے جاہل ہیں ہی' لیکن عبداللہ کو ایسی جہالت کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ کیا فرق پڑتا ہے' اگر آج کے دن ان کی حویلی سے کوئی بھی باہر نہ نکلے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ ان کے درمیان دشمنی تو ختم تو نہیں ہو جائے گی۔ آج تو کسی نہ کسی طرح انہیں اس سازش کی خبر ہو گئی' لیکن ہر مرتبہ تو ایسا نہیں ہوگا ناں۔ وہ کل پھر ایسا ہی کوئی اور منصوبہ بنائیں گے اور عبداللہ یا اس کے گھر والے بے خبری میں اس کا شکار ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں پیر صاحب اور ان کے گھر والوں کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ عبداللہ وغیرہ بھی کوئی تر نوالہ نہیں ہیں۔"

"دہشت گردی اور تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دیا جاتا۔ یہ زمینیں تو یوں بھی بڑا فساد ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ زمینیں' جائیداد اور بنک بیلنس وغیرہ...... اسی طرح پڑا رہ جائے گا' نہ یہ سب کچھ پیر صاحب جلال الدین شاہ اپنے ساتھ لے کر جا سکے ہیں' نہ ہی ان کے بیٹے لے جا سکیں گے۔"

"تم اپنا دل مت جلاؤ' جو تم کر سکتی تھیں تم نے کر لیا۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہے تمہارے ہاتھ میں۔" اُما نے اسے تسلی دی۔

وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنکس کے گھونٹ لینے لگیں۔ ماہ بانو انہی سوچوں میں گم تھی۔ جب اُما نے اسے ٹہوکا دیا۔

"بانو! سعد آ رہا ہے۔"

ماہ بانو نے سر اٹھا کر دیکھا' سعد انہی کی طرف آ رہا تھا۔

"ہیلو' کیسی ہو تم دونوں؟" اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

"بالکل ٹھیک' تم سناؤ۔ پچھلے چند دن سے نظر ہی نہیں آ رہے۔" اُما بولی۔

"جیوری میں پھنسا ہوا تھا' آج بھی بہت مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔"

"ایکسکیوز می!" اُما خالی بوتل زمین پر رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے لائبریری میں کچھ کام ہے میں چلوں اور بانو میں وہیں سے کلاس میں چلی جاؤں گی' تم آ جانا۔"

اُما بہانا بنا کر اُٹھ کھڑی ہوئی تو سعد اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"بہت ناراض ہو؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بول اُٹھا۔

"نہیں۔" ماہ بانو نے عام سے لہجے میں کہا۔

"میں نے اس دن جو کچھ کہا تھا' وہ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دراصل فیئر ویل والے دن جب تم آڈیٹوریم سے باہر نکلیں تو یہ سوچ کر میں بھی تمہارے پیچھے گیا کہ تمہیں وہاں اتنی رات گئے اکیلے نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ شاید تمہیں پریشانی ہو۔ پتا نہیں کوئی تمہیں پک کرنے بھی آیا ہوگا یا نہیں۔

میں نے عبداللہ کو بھی اُٹھتے دیکھا تھا' لیکن اس وقت میرے ذہن میں کوئی بات نہیں آئی تھی' مگر پھر باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ تم دونوں اس کی کار سے ٹیک لگائے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ خیال گزرا کہ تم کسی کا انتظار کرنے نہیں بلکہ عبداللہ کے ساتھ پروگرام بنا کر باہر نکلی ہو۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا بانو' مجھے ایسے نہیں سوچنا

چاہیے تھا۔"

"اگر میں پروگرام بنا کر باہر نکلی تھی تب بھی تمہیں کیا پریشانی تھی؟" ماہ بانو نے بالآخر بات کلیئر کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ہاں میں نے تم سے کوئی کمٹمنٹ نہیں کی' نہ تم نے مجھ سے۔ مجھے تم پر حق جتانے کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے بانو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں یہ بات اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے بعد تم سے کہنا چاہتا تھا' مگر آج اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ ہمارے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے' وہ ختم ہو سکے اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے لیے وہی سب کچھ محسوس کرتی ہو' جو میں تمہارے لیے محسوس کرتا ہوں۔"

ماہ بانو چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"مجھے افسوس ہے سعد تم نے کچھ دیر کر دی ہے۔"

"دیر کر دی ہے۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ "تو کیا عبداللہ؟" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کل رات میں نے دیر تک اپنا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ تم سمیت ابھی کسی سے بھی مجھے محبت نہیں ہوئی۔ اور عبداللہ سے متعلق جو وہم تم اپنے دل میں پال رہے ہو' اسے جھٹک دو۔"

وہ بھی کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل وہیں رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں اب' ابھی بہت کام رہتا ہے۔"

سعد خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

ابا جی نے کہا تھا کہ وہ واپسی پر بھی اسے لینے آئیں گے۔ ابھی ہوسٹل کے لیے بس چلنے میں بھی کچھ وقت رہتا تھا اور سب طلباء کی عادت تھی کہ جب تک بس کھڑی رہتی تھی' تب تک تقریباً خالی رہتی تھی۔ جب چلنا شروع ہوتی تھی تو سب اِدھر اُدھر سے بھاگ کر اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سو اتنی جلدی کسی کے بس پر چڑھنے کا امکان بھی نہیں تھا۔

پارکنگ میں اُما اور ماہ بانو بیٹھی ہوئی تھیں۔

"لیکن تم نے سعد سے یہ کیوں کہا؟" اُما حیرانی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"اس لیے کہ مجھے واقعی اس سے محبت نہیں ہے۔" اس نے آرام سے کہا۔

"محبت نہیں ہے' لیکن کیوں؟ کیسے؟" اُما کچھ نہیں سمجھی۔

"یہ حقیقت ہے اُما' مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ نیہاں نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم صرف زندگی کا سفر اپنی ضرورتوں کے مطابق طے کرنا چاہتے ہیں اور بس۔"

"تم نے نیہاں کی فضول باتوں کو سنجیدگی سے تو نہیں لے لیا؟"

''اس نے فضول باتیں نہیں کی تھیں۔ بات صرف اتنی ہے اُما کہ ہم اپنے اندر جھانکتے ہوئے ڈرتے ہیں یا پھر شاید صرف میں ہی اپنے اندر جھانکنے سے ڈرتی ہوں۔''

''دیکھو بانو! ہم میں سے ہر ایک کے پاس اپنی بات کے ثبوت کے طور پر ایک دلیل ہوتی ہے چاہے کوئی غلط ہی کیوں نہ ہو۔ نیہاں کے پاس بھی بے شمار دلیلیں ہوں گی۔ تم محض کسی کی باتوں سے امپریس ہو کر اپنی زندگی کو اپنے لیے تکلیف دہ مت بناؤ۔'' اُما نے اسے سمجھایا۔

''نہیں اُما ایسا نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں کسی خود فریبی میں مبتلا رہنا نہیں چاہتی۔ ہمیں حقیقت کو تو قبول کرنا چاہیے ناں۔''

بس اسٹارٹ ہو چکی تھی' لیکن حسب معمول طلباء اپنے آپ میں مگن تھے۔ نیہاں ان کے قریب آ گئی۔

''اُما اپنی چیزیں مجھے دے دو' میں بس میں رکھ آؤں۔''

اُما نے اپنی چیزیں اسے پکڑا دیں۔ وہ بس کی طرف بڑھ گئی۔ جاوید جو کالج میں جیمز کے نام سے پکارا جاتا تھا' اس سے دو چار باتیں کیں اور بس میں چیزیں رکھ کر اتر آئی۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے بانو؟'' اس نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''چلو کل آرام کر لینا۔ میرا تو پورا ہفتہ اس امید پر گزرتا ہے کہ ابھی جمعہ کی چھٹی آئے گی اور کچھ آرام نصیب ہوگا۔'' نیہاں بولی۔

''میں جمعہ کا سارا دن اپنے باجی کے ساتھ گزارتی ہوں' مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''کل کا دن تو میں بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں گی۔ آج شام میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔'' نیہاں نے کہا۔

''اوہ میں کمرے میں اکیلی رہ جاؤں گی۔'' اُما بولی۔

جب بھی نیہاں اسلام آباد جاتی تھی تو ماہ بانو کا بہت دل چاہتا تھا کہ اُما کو اپنے گھر لے جائے۔ نیہاں کے جانے سے وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔

لیکن ماہ بانو اسے اپنے گھر لے جا نہیں سکتی تھی۔ ان کا چھوٹا سا گھر ان کے لیے بھی کم پڑتا تھا اور پھر اماں تھیں' وہ تو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھیں' کہ ان کے گھر کوئی ہندو لڑکی داخل ہو۔ انہیں تو ماہ بانو کی اُما سے دوستی بھی بالکل پسند نہیں تھی۔

کبھی کبھار اسے یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے اُما اس کے گھر آنا چاہتی تھی' لیکن چونکہ کبھی ماہ بانو نے اسے نہیں بلایا تھا' اس لیے اس نے بھی اس بات کا اظہار مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ تینوں خاموش تھیں۔ کچھ تھکاوٹ کا بھی اثر تھا۔ ماہ بانو نے نیہاں کی طرف دیکھا' اس کے خوبصورت چہرے پر سوچ کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کی گہری نیلی آنکھیں کسی خاص

نقطے پر مرکوز تھیں۔ ماہ بانو نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا' بس میں کھڑکی کے قریب بیٹھا جیمز کوئی اخبار پڑھ رہا تھا۔

اس نے دوبارہ نیہاں کی طرف دیکھا۔ اس وقت نہ وہ بے نیاز تھی نہ لاپروا۔ جیمز کو دیکھتے ہوئے وہ یقینی طور پر اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بنیاد کوئی بھی نہیں تھی' لیکن اس کے ذہن میں بہت قوی احساس نے سر اٹھایا۔

''تو گویا وہ جیمز ہے۔'' ماہ بانو نے سوچا۔

اُما بیزاری سے اپنے لمبے بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔ اس کی توجہ نیہاں اور جیمز کی طرف نہیں تھی۔ اسی وقت بس رینگنے لگی۔ ڈرائیور نے ہارن دینے شروع کیے۔ نیہاں سوچ کے حصار سے نکل آئی۔ اُما بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کب جاؤ گی بانو؟'' اس نے پوچھا۔

''بس ابا جی آتے ہی ہوں گے۔''

''دیکھو اب مکمل آرام کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہفتے کے روز آج سے زیادہ بیمار پڑی ہو۔''

''تم فکر نہ کرو' میں فائننگ فٹ ہو کر کالج آؤں گی۔''

بس گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور اب سب طلبہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''اچھا بانو! بائے۔''

اُما اور نیہاں بھی بس کی طرف بھاگیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ جیمز اور نیہاں کے متعلق سوچنے لگی۔

جیمز جس کا اصل نام جاوید تھا' ایڈی اور عبداللہ کا ہی کلاس فیلو تھا۔ ایڈی اور عبداللہ نے کالج میں اکٹھے ہی داخلہ لیا تھا۔ جیمز ان سے ایک سال بعد کالج آیا تھا۔ پھر سیکنڈ ایئر کرنے کے بعد ایڈی نے کالج سے ایک سال کی چھٹی لے لی تھی۔ اسے امریکہ جانا تھا' سال بھر بعد اس نے کالج جوائن کر لیا تھا اور یوں وہ تھرڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔

ایڈی کی غیر موجودگی میں عبداللہ نے تھرڈ ایئر مکمل کر لیا تھا اور فورتھ ایئر میں جانے سے قبل ایک سال کی چھٹی لے لی تھی۔ اسے ورلڈ ٹور پر جانا تھا۔ اب اس نے جنوری کے آغاز سے دوبارہ کالج جوائن کرنا تھا۔ فورتھ ایئر کے طالب علم کی حیثیت سے۔

ایڈی اور عبداللہ کے ایک ایک سال ضائع کرنے کی وجہ سے اب جیمز ان کا کلاس فیلو تھا۔

جیمز کی دوستی پورے کالج سے تھی۔ اس کا کوئی مخصوص دوست یا گروپ نہیں تھا۔ جب ماہ بانو وغیرہ فرسٹ ایئر میں آئے تھے تو کتنے عرصے تک وہ جیمز ہی اس کا حقیقی نام سمجھتے رہے تھے۔ یہ تو بہت بعد کی بات تھی کہ انہیں اس کے اصل نام کا علم ہوا۔

وہ لگتا بھی تو بالکل جیمز تھا۔ شکل صورت سے بھی وہ بالکل کوئی یورپی لگتا تھا۔ گوری رنگت جو

دھوپ سے جھلس کر سنہری ہو گئی تھی۔ سنہرے بال' گہری نیلی آنکھیں' اس کی فزیک بھی بہت اچھی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ آرٹسٹ سے زیادہ وہ باڈی بلڈر لگتا تھا۔

جب اُما اور ماہ بانو کو علم ہوا کہ وہ دراصل جیمز نہیں' جاوید ہے' تو انہوں نے اس پر بہت سے تبصرے بھی کیے تھے۔

''اسے دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی پاکستانی ہے۔'' ماہ بانو نے کہا تھا۔

''ویسے مجھے ایک دو مرتبہ شک گزرا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اس کی انگریزی اچھی ہے' لہجہ بھی امریکی ہے' پھر بھی کہیں کہیں پاکستانی انداز جھلک ہی جاتا ہے۔'' اُما نے کہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی ممی فارنر ہوں گی۔'' ماہ بانو نے خیال ظاہر کیا تھا۔

سب کا دوست ہونے کے باوجود' وہ کسی سے بھی بہت قریب نہیں تھا۔ وہ سب کی مدد کرتا تھا' لیکن اس نے کبھی کسی سے مدد طلب نہیں کی تھی۔ اس کی دوستی بے شمار لڑکیوں کے ساتھ تھی' لیکن اب تک اس کا کوئی اسکینڈل نہیں بنا تھا۔

وہ ہوسٹل میں نہیں رہتا تھا' کہاں رہتا تھا؟ یہ بات ماہ بانو کو معلوم نہیں تھی' نہ ہی کبھی اس نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ ضرورت ہی کیا تھی اس کی۔ آج وہ ہوسٹل جانے والی بس میں بیٹھا ہوا تھا' جس کا مطلب تھا کہ اسے ہوسٹل میں کچھ کام تھا۔ نیہاں نے رُک کر غالباً اس سے یہی پوچھا تھا۔

اسے نیہاں کا خیال' آیا' جو بس میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے جیمز کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

ماہ بانو نے کبھی جیمز کو اس میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا تھا۔ خیر اس نے تو کبھی نیہاں کو بھی اس میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا تھا۔

دل ہی دل میں اس نے نیہاں اور جیمز کا موازنہ کیا۔ دونوں کی رنگت سپید تھی۔ آنکھیں نیلی اور بال سنہرے تھے اور دونوں ہی ساتھ کھڑے ہو کر بہت اچھے لگتے تھے۔

اپنے خیالات سے وہ اس وقت چونکی جب گیٹ پر کھڑے ہوئے ابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ بیگ کندھے پر ڈال کر پورٹ فولیو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' انہوں نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھا۔

''اب بالکل ٹھیک ہوں' کالج میں بھی دوا لی تھی۔''

''بخار تو نہیں ہے؟'' وہ بولے پھر اس کے ہاتھ سے پورٹ فولیو لے لیا۔

''یہ مجھے دے دو' تھک جاؤ گی۔''

دونوں ساتھ ساتھ [illegible] اسٹاپ کی طرف چل دیے۔

''آج اکیلی بیٹھی تھیں؟'' انہوں نے کہا۔

''ہاں' اُما تو ہوسٹل چلی گئی تھی' باقی کچھ دوست چلے گئے تھے اور کچھ اندر کام کر رہے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری اماں تمہارے لیے سخت پریشان تھیں۔''

''وہ تو یوں ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں......'' اس نے جواباً کہا۔

ویگن پر بیٹھ کر گھر روانہ ہوتے وقت اس کے ذہن میں ایک مرتبہ پھر عبداللہ کا خیال آ گیا۔

☆=====☆=====☆

حویلی میں سب سے پہلے اس کا سامنا بابا جان سے ہوا۔

''تم آ گئے؟''

''آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟ میں تو سوچ رہا تھا کہ سو چکے ہوں گے۔'' عبداللہ نے کہا۔

وہ دونوں گول کمرے میں آ گئے۔ فتح محمد اور نور محمد بھی ان کے پیچھے چلے آئے۔

''اب بتاؤ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟'' انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اطلاع درست تھی' ہم حملے کی جگہ دیکھ کر آ رہے ہیں۔'' وہ بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ہوں۔'' بابا جان نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

عبداللہ نے کاغذ پنسل لے کر اس جگہ کا خاکہ بنایا اور انہیں متوقع حملے سے متعلق اپنے لگائے ہوئے اندازے بتانے لگا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو؟ انہیں کہاں روکو گے؟''

''مجھے حیرت ہے بابا جان کہ انہوں نے ہمارے ہی کھیتوں میں اپنے لیے جگہ بنا لی اور یہاں کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ گڑیا کے گھر سے نکلنے کا ذکر کسی نے یوں ہی باتوں باتوں میں کر دیا ہوگا' مگر اب مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان نیاز پور والوں کا کوئی مخبر موجود ہے ذرا اس مسئلے سے نپٹ لوں تو پھر یہ دیکھتا ہوں کہ یہ حرکت کس کی ہے؟

ابھی فوری طور پر ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک تو یہ کہ نیاز پور والوں کو ان کے اپنے علاقے میں روک دیا جائے۔ دوسری یہ کہ انہیں اس وقت پکڑا جائے جب وہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''دوسری آپشن زیادہ بہتر ہے اور ہمارے لیے محفوظ بھی۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ انہیں ان کے علاقے میں روک سکیں' کیونکہ اس کے لیے ہمیں ان کے علاقے کا بھی مکمل

جائزہ لے کر منصوبہ بندی کرنا پڑے گی۔ وہاں اپنے آدمی پہنچانے ہوں گے، جس کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ فائرنگ، ہمارے علاقے میں کریں گے تو یہ بات عدالت اور پولیس میں ان کے خلاف جائے گی۔'' بابا جان نے کہا۔

''میں بھی یہی سب سوچ رہا تھا۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''بابا جان! آپ آرام کریں اور سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

پو پھٹنے لگی تھی، جب عبداللہ نے محافظوں کو اکٹھا کر کے انہیں تفصیل سے اپنا منصوبہ سمجھایا۔ اب جبکہ انہیں علم ہو چکا تھا کہ حملہ آور کس جگہ پر موجود ہوں گے، تو انہیں اپنے لیے ایسی جگہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ جہاں سے وہ ان کا نشانہ لے سکتے تھے۔

''لیکن شاہ صاحب!'' فتح محمد نے تذبذب سے کہا۔ ''اس منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم ممکن نہیں کیا؟''

''کیسی ترمیم؟''

''آپ نے کہا ہے کہ ہم سب چند مخصوص جگہوں پر بالکل تیار کھڑے ہوں گے اور آپ جیپ پر سڑک سے گزریں گے۔ اس موقع پر شاہ صاحب ہمیں حق نمک ادا کرنے دیں۔ جیپ سڑک سے گزرے یا نہ گزرے وہ لوگ ہمارے نشانے پر ہوں گے۔ یوں بھی ہمارے کھیتوں میں ان کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟ شاہ صاحب اگر پھر بھی جیپ سڑک پر لانا ضروری ہے تو آپ اپنی جگہ یہ کام مجھے دے دیں۔''

''جی شاہ صاحب! یہ تو سراسر خودکشی ہوگی۔'' نور محمد نے بھی کہا۔

''میرے بس میں ہوتا نور محمد! تو تم لوگوں سے اس قدر کام بھی نہ لیتا۔ یہ ہماری جنگ ہے، ہماری آگ ہے مجھے پسند نہیں کہ تم لوگ اس آگ کا ایندھن بنو۔''

''تو ٹھیک ہے شاہ صاحب، جیپ سڑک پر لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح تو آپ سیدھے ان کے نشانے کی زد پر ہوں گے۔''

''ویسے تو یہ حماقت ہے۔'' اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ''لیکن میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ ان لوگوں کی دشمنی اب سے پہلے بابا جان سے تھی اگر آج انہوں نے مجھ پر حملہ کیا تو یہ جنگ بابا جان کی نہیں رہے گی میری بن جائے گی اور پھر اس کا فیصلہ میں کروں گا۔''

''لیکن وہ آپ کو با آسانی نشانہ بنا سکتے ہیں وہاں سے۔'' نور محمد نے احتجاج کیا۔

''اتنی آسانی سے نہیں نور محمد۔'' اس کی آنکھوں میں چمک اُتر آئی۔

''اب تم لوگ بھی آرام کرو تا کہ فریش ہو جاؤ۔ میں بھی اب آرام کروں گا۔''

وہ حویلی میں آ کر آرام سے سو گیا۔

ساڑھے دس بجے ایک محافظ کے ہمراہ عبداللہ حویلی سے باہر نکلا اور اس سڑک کی طرف

بڑھ گیا۔

☆=====☆=====☆

ریشماں نے کریمن کے ہاتھ خط پوسٹ کروا دیا تھا اور کریمن کتنی مرتبہ یقین دلا چکی تھی کہ اس نے خط اپنے ہاتھ سے لیٹر بکس میں ڈالا تھا پھر بھی ریشماں بے چین تھی اور اتنی یقین دہانی کے باوجود بھی بار بار کریمن سے اس کا ایک ہی سوال تھا۔

''تو نے اپنے ہاتھ سے خط ڈالا تھا ناں؟''

''صحیح کہتی ہوں بی بی! میں نے اپنے ہاتھوں سے ڈالا تھا۔ اب تو کب کا لاہور بھی پہنچ چکا ہوگا۔''

ریشماں کے لیے ایک ایک لمحہ کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے اخبار اُٹھا لیا۔

اس معاملے میں بھی اس کے ساتھ عجیب سلوک ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھنا چاہتی تھی پہلے وہ بابا جان کے ہاتھ سے گزرتا تھا۔ اس تک کبھی پورا اخبار نہیں پہنچا تھا۔ کتابیں بھی گنی چنی آتی تھیں۔ بہت عام سطحی سی کہانیوں والی جو کسی اخلاقی مقولے کو بنیاد بنا کر لکھی جاتی تھیں۔ اسلامیات سے متعلق کتابیں اس کے پاس سب سے زیادہ تھیں۔ سبط حسن نے کتنی مشکلوں سے اسے اجازت دلوائی تھی۔ انگریزی شاعری پڑھنے کی۔ ان میں بھی نظمیں خوب دیکھ بھال کر منتخب کی جاتی تھیں۔ یہ اور بات کہ سبط ان نظموں کے ساتھ ساتھ اسے دوسرے شاعروں کی دوسری خوبصورت نظموں کا حوالہ بھی دیتا جاتا تھا۔ ویسے تو بابا جان ہمیشہ ہی کہتے تھے۔

''بیٹا آپ کسی کتاب کا نام لیں، ہم آپ کو منگوا کر دیں گے۔''

لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا اور بابا جان کو جھوٹا پڑتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے کبھی ان سے ایسی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ ہاں اپنی مرضی سے وہ کتابیں لاتے رہتے تھے۔ کبھی اردو یا انگریزی میں قرآن پاک کی تفسیر لے آتے تھے، کبھی اسلام کے حوالے سے کسی لیکچر کی آڈیو کیسٹ اسے دے دیتے تھے۔

انہیں اس کی پڑھائی لکھائی بالکل پسند نہیں تھی۔ پتا نہیں سبط کو کیا ہوا تھا کہ اس نے ریشماں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ جونہی وہ چھٹیوں میں گھر آتا تھا دونوں بہن بھائیوں کا سارا دن پڑھائی لکھائی میں گزر جاتا تھا۔

وہ منع کرنا چاہتے تھے جب یاسمین بیگم کے منہ سے انہوں نے سنا کہ سبط حسن ریشماں کو پڑھا رہا ہے تو وہ اسے منع کرنے ریشماں کے کمرے میں گئے تھے۔

وہ دروازے میں کھڑے تھے۔ سبط غالباً اسے پڑھا کر جا چکا تھا اور اب وہ سبق دہرا رہی تھی۔ ہر طرف سے بے خبر ہو کر۔ اسے تو ان کی آمد کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔

ان کے دل میں ہلکی سی کسک جاگ اُٹھی۔ اسی طرح زرینہ بھی ان کی آمد سے بے خبر رہتی تھی' اپنے آپ میں مگن۔

دروازے میں کھڑے ہو کر وہ ریشماں کو تکتے رہے۔ اس کے چہرے پر خوشی اور جوش کے بہت سے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی خوشی انہوں نے زرینہ کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ سب رنگ وہ اس کے چہرے پر بھی دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان تک پہنچنے سے پہلے وہ خوشی اور مسرت کے یہ رنگ حیدر علی کو دے آئی تھی۔ ان کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔

کتنی خواہش تھی کہ زرینہ خوش رہے' مسرت کی ایک کرن ہی سہی' خوشی اس کے چہرے کو منور تو کرے۔

مگر ان دونوں کے درمیان بہت فاصلے تھے۔ انہوں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ محبت کی تھی۔ صرف ایک لڑکی نے منتر پڑھ کر ان کے قدم جکڑے تھے۔

پر ان کی اَنا اور رُتبے نے ان کی محبت کو ان سے دور کر دیا تھا۔ اگر حیدر علی فوزیہ کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا تو وہ بھی زرینہ کے ساتھ خوش رہ سکتے تھے لیکن یہ خیال اس وقت ذہن میں آیا تھا۔ جب وہ نہیں رہی تھی۔ ان سے بہت دور جا چکی تھی کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ تب انہیں احساس ہوا تھا کہ محبت حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اور جو لوگ کچھ کھونے پر تیار نہیں ہوتے وہ بالآخر اپنی محبت ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔ تتلیوں سے لمحے اُڑ جاتے ہیں۔ انگلیوں پر یادوں کے کچھ رنگ رہ جاتے ہیں۔

پتا نہیں یہ سب باتیں انسان اس وقت کیوں نہیں سمجھتا جب وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جب وقت نکل جاتا ہے تو کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔

ریشماں کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دروازے میں بابا جان کھڑے اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو کتاب اپنے پیچھے چھپا کر نظریں جھکا دیں۔

ان کے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ ریشماں ان کی زرینہ کی نشانی تھی۔ وہ اس کے چہرے سے خوشی اور مسرت کی کرنیں نہیں چھیننا چاہتے تھے۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا کر رہی تھی ہماری بٹی؟'' انہوں نے پیار سے کہا۔

وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''پڑھائی ہو رہی تھی؟''

اس نے کتاب والا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

''آپ کو اچھا نہیں لگا بابا جان؟'' اس نے بمشکل تمام کہا۔

''ہمیں اچھا لگا' بہت اچھا لگا۔'' انہوں نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

ریشماں نے بے یقینی سے پلکیں جھپکا کر ان کی طرف دیکھا۔

''سبط کو تو خود کچھ نہیں آتا۔ وہ آپ کو کیا پڑھائے گا۔ آپ بیٹھیں' ہم آپ کو پڑھاتے ہیں۔'' انہوں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی بیٹھ گئے۔

ریشماں نے روبوٹ کی طرح ان کے کہنے پر عمل کیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر تک بابا جان اسے پڑھاتے رہے۔ وہ بہت اچھا پڑھا رہے تھے لیکن وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کتاب بند کر دی۔

''پڑھتے وقت ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔'' انہوں نے کہا۔ ''کہ کتاب انسان کو بنا بھی سکتی ہے اور تباہ بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے پڑھتے وقت ہمیشہ اچھی کتاب کا انتخاب کرنا چاہیے۔ یہ بات آپ یاد رکھیں گی ناں؟''

ریشماں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

اور وہ اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ اس کے بعد اس کی پڑھائی جاری رہی۔ بابا جان نے پھر کبھی اسے نہیں پڑھایا تھا۔ انہیں جو بات کہنی تھی' وہ کہہ چکے تھے۔ اور ریشماں نے اسے ہمیشہ یاد رکھا تھا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ انہوں نے اپنے اصول توڑ کر اسے پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ یہ محدود سی اجازت اسے اپنے لیے نعمت لگتی تھی۔

اب وہ تاریخ پڑھ سکتی تھی۔ جغرافیہ پڑھنے کی بھی اجازت تھی۔ اسلامیات سے متعلق کتابیں تو بابا جان خود لا دیا کرتے تھے۔ اسی میں اس کا وقت گزر جاتا تھا۔

مگر اس دن وقت بالکل نہیں گزر رہا تھا۔ اخبار چھوڑ کر وہ اماں جان کے پاس چلی آئی۔ ان کے گرد ہر وقت عورتوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ کوئی ان کی ٹانگیں دبا رہی ہوتی...... کوئی حویلی سے متعلق معاملات میں ہدایات لے رہی ہوتی تھی۔ کچھ اپنے مسائل کے حل کے لیے پیر صاحب سے سفارش کروانا چاہتی تھیں اور کچھ یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔

''کیا ہوا بیٹا! چپ چپ لگ رہی ہو۔'' اماں جان نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں۔''

اماں جان پھر اپنے ارد گرد موجود عورتوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ریشماں سے رہا نہ گیا۔

''اماں جان بھائی کہاں ہیں؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''امداد تو ابھی اُٹھ کر گیا ہے۔ سبط کو پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ جس دن سے آیا ہے گم صم سا ہے۔ وہ بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی گیا ہے۔ باقی سب مردانے میں ہی ہوں گے۔''

وہ بے چین تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ انہیں حویلی سے کب نکلنا تھا۔ گو کہ اماں جان باتوں میں مصروف تھیں لیکن ان سے اس کی بے چینی چھپی نہ رہ سکی۔

''کیا ہوا ریشماں' پریشان لگ رہی ہو؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
اس نے ایک نظر اماں جن کے گرد موجود عورتوں کی بھیڑ کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

''اچھا تم سب جاؤ میں بعد میں بلا لوں گی تمہیں۔'' انہوں نے تمام عورتوں کو رخصت کر دیا۔

''ہاں اب بتاؤ کیا ہوا؟'' سب عورتوں کے جانے کے بعد انہوں نے اس سے پوچھا۔
''اماں' بھائی اب بھی جائیں گے وہاں؟'' اس نے پوچھا۔ ''وہیں حیدر بابا کی بیٹی......''
اس سے اپنی بات مکمل نہ کی جا سکی۔

اماں جان نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔
''یہ مردوں کے معاملات ہوتے ہیں۔ وہ انہیں بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔'' انہوں نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

''اماں جان رشتے تو سب قابلِ احترام ہوتے ہیں۔ حیدر بابا اور ان کی اولاد کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ہمارے گھرانے کی رگوں میں ہے' کبھی کوئی اپنا خون بھی بہاتا ہے؟''

''یہ اس حویلی کی روایت ہے کہ جب اپنے خون اور غیرت کے درمیان انتخاب کا مرحلہ آتا ہے تو ترجیح غیرت کو ہی دی جاتی ہے۔ تم دعا کرو کہ تمہارے بھائی ہر آفت سے محفوظ رہیں۔'' اماں جان نے بہت پیار سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''میں کیسے کوئی دعا کروں۔'' اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے چیخ رہی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر وہ ان کے کمرے سے نکل گئی۔

☆=====☆=====☆